سید حسن

معارف نمبر ۱۵

مجلس مصنفین علیگڑھ کا ماہی علمی رسالہ

جولائی سنہ ۱۹۴۶ء

[مدیر و ناشر]

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

قیمت سالانہ چار روپے

(بیت المصنف)

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام محمد خاں صاحب جواہر خاں
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ طبع شد

مُصنّف

جلد ۴ | بابت ماہ جولائی ۱۹۴۶ء | نمبر ۱۵

فہرست مضامین

داغِ دگر!

دیدہ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

'مصنف' کے گزشتہ شمارہ میں مخدومی مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم کا مقالۂ تعزیت سپرد قلم کرنے کے بعد دعا کی تھی کہ خدایا! ایسا کرم فرما کہ دوبارہ ایسی دردانگیز تحریر سے صفحات مصنف کو سوگوار بنانے کی نوبت نہ آئے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ۔ ع

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے

۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو مولانا نے داغِ مفارقت دیا۔ اپریل اور اس کے بعد مئی کے چند دن 'محض سوگواری' میں یا بالفاظ دیگر "بخیریت" گزرے تھے کہ۔ ع

صد بیاباں بگذشت و دگرے پیدا شد

میری بھتیجی جسے اپنے بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا ہے علیل ہو گئی — ہنوز سخت بیمار ہے اور بہار زیر علاج ہے۔ میرے اور میری رفیقۂ حیات سیدہ انیس فاطمہ کے اوقات عزیزہ لڑکی کی جانب سے شدید تشویش کے عالم میں گزر رہے تھے کہ ہم لوگوں پر اچانک ایک اور ایسا غم ٹوٹ پڑا کہ اس وقت سے

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

۲۹ جون کی سہ پہر کو ہمارے بڑے لڑکے سید شاہد علی کے متعلق نینی تال سے تار ملا کہ انکی حالت "ناامیدی" کی ہے — اس قسم کے "ناامیدی" کے تار دیکھنے کا مجھے تجربہ ہے — چنانچہ اس کے موصول ہوتے ہی دل میں جو خوفناک گمان گزرا، وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا — تفصیل جگر خراش ہے — نہ میں سنا سکتا ہوں اور نہ آپ سن سکتے ہیں۔

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

"شاہد" ہمارا جگر گوشہ تھا، ہم اس کی کیا تعریف کریں۔ مخدومی مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ا 'کانفرنس گزٹ' کی زبانی چند کلمے سنئے۔

"سید شاہد علی نے ۳۰ جون ۱۹۴۲ء کو چند گھنٹے ہیضہ میں مبتلا ہو کر بمقام نینی تال انتقال کیا۔ عمر صرف ۱۹ سال تھی۔ اسی سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ مرحوم نہایت شریف طبع، سلیم الفطرت، مہذب اور فرماں بردار بچہ تھا۔ اس لئے ہر شخص اس کو عزیز رکھتا تھا۔ پڑھنے اور کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اور باوجود جسمانی کمزوری اور ناتوانی کے اپنے ہم عمروں سے زیادہ محنت کرتا تھا۔ اپنے تعلیمی مستقبل کے متعلق مرحوم کے دل میں بڑے بڑے حوصلے تھے لیکن۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تلاوت کلام پاک نہایت دل گداز لہجہ میں کرتا تھا اور اذان ایسی دل آویز اور پُر اثر دیتا تھا کہ بس سنتے ہی رہیے۔
اپنی خود غرضی سے میں شاہد کو سمجھایا کرتا تھا کہ یہ قومی اور تصنیفی کام بہت منحوس ہوتے ہیں۔ ان میں مبتلا رہنے والے ہمیشہ برباد اور پریشان حال رہتے ہیں مگر اس نے میرا کہنا نہ مانا اور مجھ سے چھپ چھپ کر اپنے ہم عمروں کی قومی انجمنیں اور کلب بناتا۔ تقریریں کرتا۔ اور جوشیلے مضامین لکھتا تھا۔ کہتا۔

"میں مجاہد ہوں اسلام اور مسلمانوں کے لئے اپنی جان قربان کرونگا"

کاش اُسے یہ موقع نصیب ہوتا؟ لیکن نہیں؟ کیا معلوم؟ اس کے کئے ہوئے قومی کام سے ملک و ملت کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا اور خدائے قادر مطلق نے ایک جان لے کر ہزاروں خطروں سے حفاظت کر دی ہو مگر پھر خیال ہوتا ہے کہ اس کو پیدا ہی کیوں کیا تھا؟ ع

یہ معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

۳۰ جون ۱۹۴۲ء سے ابتک عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں نے بالمشافہ اور بذریعہ ڈاک میری اور میری رفیقۂ حیات کی غمخواری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہے۔ دلجوئی کا ایک سب سے موثر طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ قریب ہر شخص نے ذاتی اور دوسروں کی صدہا نوجوان موتوں کے دل خراش قصے سنائے، تاکہ ہمیں اپنا سانحہ غیر اہم نظر آنے لگے۔ مگر اس سے تسکین کے بجائے بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ ہمارا دل درد مند دوسروں کی تکلیف سے بھی ہمیشہ اتنا ہی بے چین ہوتا رہا ہے جتنا کہ اپنے لڑکے کے لئے۔ ہر میری رفیقہ حیات کو آج مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ہم تو اپنی زندگی دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر چکے تھے ہمیں یہ کہا جاتا تو انعام ملتا کہ ہمارا سب سے اچھا بچہ ہم سے جدا نہ کیا جاتا

ہاں! اے فلک پیر جوان تھا ابھی "شاہد" کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن! کیا ہماری خدمت! اور کیا ہمارا بچہ! ۔

اگر گوئی کہ حالی حسن داند ــــ زلیخا بر نشاند این

مصطفٰے اکبر

دگر دانی کہ بر من جبر گشتند — نظر بر کشتگانِ کربلا کن !!

بہ دنیا گر کسے پائندہ بودے
ابو القاسم محمد زندہ بودے

اندازہ ہوا کہ ہر دس انسانوں میں بمشکل ایک شخص ایسا ہوگا جو ایسے ہی الم ناک سانحوں سے نہ گزرا ہو جن سے کہ ہم گزرے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اپنی اور انسانیت کی بہبود و ترقی کے کاموں سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں؟ کیا دل شکستہ ہو کر اور ہاتھ پیر توڑ کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں؟ دیکھئے! علامہ سلیم پانی پتی مرحوم فرماتے ہیں: ؎

مثلِ پروانہ تم اک پل ہیں نہ جلنا سیکھو — تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو
دل کو گرمانا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب — کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو
زندگی نام ہی حرکت کا ہے تم افسردہ نہ ہو — نبض کے خون کے مانند اچھلنا سیکھو
عزم جو دل میں ہو پورا اسے تم کر کے رہو — طفلِ سرکش ہو اور ضد سے مچلنا سیکھو
چشمۂ آب ہو تم، سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں؟ — سنگِ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو
نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے، مانند نہنگ — ورطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو
آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو — موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو
ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پروا کیا ہے — سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو
کلفتِ دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی — اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہو گئے پامالِ حوادث نہ ترقی سے رکو
دوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

ہماری تمام تر جزع و فزع کمزوریٔ ایمان اور نصب العین حیات پر پورا ایقان نہ ہونے کا نتیجہ ہے ورنہ اس عالمِ فانی میں سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے ہر ذی روح کو جلد یا بدیر فنا ہونا ہے ؎

بس نامور بہ زیرِ زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بروئے زمیں بر نشاں نہ ماند

بریلوی
سید الطاف علی

باقیاتِ شاہد

(از شاہد مرحوم)

مجھے جانے دو

"زمانہ گزر رہا ہے اور یوں ہی گزرتا جائیگا۔ سورج روز نکلے گا اور روز مغرب میں چھپ جائیگا۔ چاند نکلے گا اور اپنی ٹھنڈی روشنی سے دُنیا کو منور کریگا۔ بادِ صبا روز اپنا میٹھا راگ الاپتی ہوئی چلے گی۔ برسات میں جب موتی برسیں گے پپیہا پی ہو، پی ہو کا شور مچائیگا۔

لیکن میں ——— میں اس دُنیا میں نہ ہوں گا۔ میں جا رہا ہوں ——— میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں ——— میں اس دُنیا سے دُور جانا چاہتا ہوں ——— یہ دُنیا بے وفا ہے۔ یہ دُنیا ظالم ہے۔ اندھی ہے۔ دولت کی بھوکی ہے۔ اے چاند! اے تارو! ——— مجھے جانے دو ——— میں بہت تھک گیا ہوں ——— مجھے دریا کے آغوش میں ایک گہری نیند سونے دو۔ مجھے دریا کی لہروں سے ہمکنار ہونے دو ——— مجھے نہ روکو ——— دیکھو! میں جاتا ہوں۔ جاتا ہوں......"

——— × ———

مسلمان اور تعلیم

"مسلمان وہ قوم ہے جس کا کسی زمانہ میں دنیا میں بول بالا تھا۔ جس کے عالموں کے سامنے دُنیا کے بڑے بڑے عالم سر جھکاتے تھے۔ جس کے ہنر اور ترقی کو آجکل یورپ اختیار کئے ہوئے ہے اور بامِ عروج پر پہنچ چکا ہے۔ سائنس مسلمانوں کا علم تھا جو آجکل یورپ کے پاس ہے۔

مسلمانوں کے مدرسوں میں پہلے دُور دُور سے غیر اقوام کے طلباء تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، جیسے قرطبہ کی یونیورسٹی جو اپنے زمانہ میں ساری دنیا میں مشہور تھی۔ وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو بڑے بڑے اعزاز ملتے تھے۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ غیر اقوام کی یونیورسٹیوں میں بڑی سعی و کوشش کے بعد ہمیں تعلیم حاصل کرنے کو ملتی ہے۔ ہندوستان میں غیر قوموں نے مسلمانوں کو پستی میں گرانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہوئے۔ اور جس کے زیادہ تر ذمہ دار ہمارے آقائے نامدار انگریز بہادر ہیں۔

اسلامی عہد میں بنگال کے ہر محلے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی ایک مدرسہ تھا۔ لیکن غدر میں مسلمانوں کی حکومت گئی۔ دولت گئی۔ عزت گئی۔ اُسی کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی رخصت ہو گئی۔ خدائے وحدہٗ لاشریک نے انسان کے روپ میں ایک شخص کو فرشتۂ رحمت بنا کر بھیجا جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال لیا۔ اُس شخص کا نام سرسید ہے......"

عورتوں کی تعلیم

''مسلمان عورتوں میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ کہیں کہیں روشنی نظر آتی ہے۔ ورنہ بالکل اندھیرا ہے۔ عورتوں کی تعلیم میں سب سے زیادہ اس زمانے کے علماء جان مخل ہوئے۔ عام عورتوں کی تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں زنانہ تعلیم کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ صوبۂ سی۔ پی میں بھی مسلمانوں کی حالت خراب ہے۔ یہی حالت صوبۂ بمبئی اور مدراس کی ہے جہاں ایک بی۔ اے پاس لڑکی کو بڑی اونچی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے اچھی حالت مسلم یونیورسٹی اور مسلم گرلز کالج علیگڑھ کی وجہ سے صوبۂ یو۔ پی کی ہے.......''

مسلمان اور دولت

''بعض بڑے مسلمانوں کے پاس بہت دولت ہے لیکن وہ اُس کو اچھے کام میں نہیں لگاتے ہیں۔ شادی۔ بیاہ کی تقریبوں اور کھیل تماشوں میں سینکڑوں روپے صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی قومی کام سامنے آتا ہے۔ تو گم سُم ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں کہ ہر قومی چندے میں آگے آگے رہتے ہیں لیکن اُن سے کئی گنے ناچ۔ دنگل۔ قمار بازی اور محرم وغیرہ میں اپنا روپیہ لگا دیتے ہیں۔

اگر یہ فضول خرچ لوگ قوم کو پیسہ دیں تو چند دن میں قوم بن جائے۔ مسلمانوں کا بڑا طبقہ غریب ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ جاہل ہے اور اُس میں عقل نہیں ہے۔ دوسرے کوئی شخص کسی اچھے کام کو شروع کرتا ہے تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے۔ غریب طبقے کے پاس دل ہے مگر اُس کے پاس کھانے تک کو نہیں ہے، دیں تو کہاں سے دیں، اور اگر کسی مال دار آسامی کے پاس جایا جائے تو فرماتے ہیں کہ یہ تو روز کے جھگڑے ہیں ایسے فضول کاموں میں کون روپیہ دے۔ وار فنڈ میں البتہ روپیہ دیں گے۔ دعا دیں گے اور خاں صاحب، خان بہادر کا خطاب حاصل کریں گے۔ افسوس ایسے لوگوں کے پاس دولت ہے جنھیں قوم کا درد نہیں — عقل نہیں.........''

مسلمان اور تجارت

''کسی زمانہ میں تجارت مسلمانوں کا عام پیشہ تھا۔ ساری دنیا میں اپنی کامیاب تجارت کے واسطے مشہور تھے۔ بڑے بڑے سمندروں میں مسلمانوں کے جہاز چلتے تھے لیکن اب مسلمان تجارت میں بہت پیچھے ہیں۔ ملاحی کے پیشہ سے بھی دور ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ تجارت اور ملاحی کے پیشوں کو دوبارہ اختیار کریں۔ کیونکہ یہ اُن کے آبائی پیشے ہیں اور ہر قوم کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ نیوی میں بھرتی ہوں۔ جب کسی کے سامنے نیوی کا ذکر کیا جاتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ پروپگنڈا کر رہا ہے لیکن مسلمان برابر بھرتی ہو رہے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں

جبکہ وہ دوسری قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں گے ...."

اختلافات

"مسلمان ہی نہیں دوسری قومیں بھی آپس کے اختلافات میں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ایسی وبا ہے جو قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ سلطنتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اس وبا کے مسلمان شکار ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ آجکل بھی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ ہم ہی اچھے ہیں۔ ہم ہر ایک غلطی سے پاک ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب کوئی پارٹی قدم اُٹھاتی ہے تو اس کو ناکامیابی ہوتی ہے۔ مثلاً حُروں نے سر اُٹھایا۔ اُن کا سر کچل دیا گیا۔ اسی طرح خاکساروں اور احراریوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ لیکن ابھی مسلم لیگ قائم ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ قائم رہے ...."

غداری

"ہر قوم میں غدار پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی غدار پیدا ہوئے۔ اگر ان غداروں کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے وقت چاہئے۔ زمانۂ ماضی میں بڑے بڑے غدار پیدا ہوئے۔ مثلاً میر جعفر جس کی وجہ سے بنگال سے مسلمانوں کی حکومت گئی۔ لیکن خود اُس کا بھی انجام بُرا ہوا۔ اُس کے بعد دوسرا غدار مرزا الٰہی بخش تھا جس نے مغلیہ خاندان کے آخری چراغ کو گل کرنے میں مدد دی یہ حضرت بہادر شاہ کا خسر اور رازدار تھا۔ انگریزوں کو بھی جا کر قلعہ کے حالات بتاتا تھا۔ جب بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں پہونچے تو جنرل بخت خاں سپہ سالار افواج بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ میرے پاس ایک لاکھ فوج ہے۔ آپ حکم دیں تو میں ابھی ہندوستان کو فتح کر سکتا ہوں لیکن الٰہی بخش نے کہا حضور بادشاہت تو اب بالکل گئی اور واپس نہیں آسکتی۔"

جنرل بخت خاں مایوس واپس لوٹ گیا۔ جنرل بخت خاں کو بادشاہ سے کوئی آس نہ رہی تو وہ مع فوج غائب ہو گیا۔ غالباً ہمالیہ کے پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ زمانۂ حال میں بھی غدار ہیں۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تو اُس کو اپنے اندرونی غداروں کا تدارک کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو اُس کو واحد نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلم لیگ کو ابھی کوئی امتحان نہیں دینا پڑا ہے۔ امتحان کے وقت غداروں کا حال معلوم ہوگا . . . ."

بِرفت آں گُلبنِ خُرّم بہار دے

دریغے ماند و فریادے و داوے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب سراج الدولہ شہید رحمۃ اللہ علیہ اور دکن

(از جناب نواب مولوی رئیس الاسلام صاحب فاروقی گوپاموی)

ہندوستان میں دو نواب سراج الدولہ ہوئے۔ ایک جو کہ اس وقت عام طور مشہور ہیں۔ اور ان کی یادگار پُرجوش طریقہ پر بنگال میں بالخصوص اور تمام ہندوستان میں بالعموم منائی جارہی ہے۔ وہ علی وردی خاں صوبیدار بنگال کے پوتے تھے۔ جو ۱۷۵۶ء میں اپنے دادا کی جگہ پر بعمر (۲۱) سال وہاں کے صوبیدار ہوئے تھے اور جو آخرکار اپنی فوج کے بخشی میر جعفر کی سازش کا شکار ہوکر ۱۷۵۷ء میں بعمر (۲۲) سال مشہور لارڈ کلایو کے مقابلہ میں شہید ہوگئے۔

دوسرے نواب سراج الدولہ بہادر جو "علی وردی خاں" سے بھی ممتاز تھے وہ دکن میں ناصر جنگ کی سازش سے فرانسیسی گورنر ڈوپلے کے مقابلہ میں میدان کارزار ہی میں بعمر (۷۷) سال شہید ہوئے۔

میں آخرالذکر نواب سراج الدولہ کی اُن جنگی اور اسلامی خدمات کو یہاں بیان کروں گا جو انھوں نے دکن میں انجام دیں۔

نواب سراج الدولہ کا نام نسب اور اُن کا وطن

نواب سراج الدولہ بہادر کا نام محمد جانِ جہاں تھا۔ جس کو حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے بدل کر ازالۂ التباس کی خاطر محمد خان جہاں کر دیا تھا جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔

موصوف اس مشہور قصبہ گوپامؤ ضلع ہردوئی اودھ کے رہنے والے تھے۔ جو ایک زمانے میں علماء و صلحاء کا مرکز تھا۔ ملا وجیہ الدین۔ صاحب فتاویٰ عالمگیری۔ قاضی مبارک اولیاء۔ قاضی مبارک شارح مُسلّم۔ ملا قطب الدین۔ قاضی ارتضا علی خاں رحمہم اللہ وغیرہم۔ اسی ممتاز قصبہ کی وہ بزرگ ہستیاں تھیں جو "جریدۂ عالم" پر اپنا "دوام ثبت" کر گئیں۔ اسی گھرانے کے نواب سراج الدولہ بہادر بھی تھے۔

نواب سراج الدولہ بہادر کے والد شیخ اقدس کے حالات

نواب سراج الدولہ بہادر کے والد کا نام حاجی محمد انور اور لقب نواب محمد انوار الدین خاں بہادر شیخ اقدس تھا۔ جو شاہجہانی اور عالمگیری عہد کے منصب دار درجۂ اول تھے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلے حضرت شاہجہاں کے تسبیح خانے کے مہتمم ہوئے اور اس کے بعد بقول خافی خاں مصنف تاریخ منتخب اللباب[۱]:-

"دارا شکوہ اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان خانہ جنگی کی وجہ سے جب ملک کی اندرونی حالت خراب ہونے لگی۔ اور حکومت کے انتظامات میں خلل واقع ہونے لگا تو وہ اپنے وطن گوپامؤ چلے گئے۔"

اپنے وطن مالوف قصبہ گوپامؤ میں آکر خانہ نشین ہوگئے۔ اور باطمینان تمام عبادت و ریاض و مجاہدہ میں مصروف ہوگئے۔ ۱۶۵۹ء میں حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے تخت و دیہیم حاصل کرنے کے بعد حضرت حاجی صاحب کو وطن "گوپامؤ" سے طلب فرماکر نہ صرف سابقہ خدمت پر بحال فرمایا بلکہ سابقہ جاگیر کے علاوہ مزید جاگیر سے بھی سرفراز کیا۔ اس زمانے کے ایک واقعہ کو خافی خاں مصنف تاریخ منتخب اللباب نے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے[۲]:-

"جب حاجی محمد انور جو ایک زبردست عالم تھے اور بزرگی کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں تھے۔ حضور میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارے باپ دادا میں کسی کو اس دربار کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ دولت صرف میں نے ہی اختیار کی۔ بادشاہ جہاں پناہ نے اس راست گوئی سے خوش ہو کر منصب مناسب خطاب خانی اور پیشکاری مرحمت فرماکر سرفراز فرمایا۔"

۱؎ منتخب اللباب۔ محمد شاہی جلد دوم صفحہ ۴۱۲ ۲؎ منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۴۱۲

اس واقعہ کو بہ تبدیل الفاظ مصنف تزک والاجاہی نے لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت شاہنشاہ نے یہ جواب سنکر شیخ اقدس کے لقب سے ملقب فرماکر ارشاد فرمایا:[۱]

"بے شک شیخ اقدس آپ نے سچ کہا"

حاجی محمد انور شیخ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہنشاہ عالمگیر نے جب "دو ہزار ذات اور دو ہزار سوار" کا منصب عطا فرماکر ان کو اول درجہ کا امیر بنایا تو نوابی اور خانی کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مصنف تاریخ منتخب اللباب:[۲]

"خطاب سے انکار کردیا۔ ان کی دیانت سچائی اور خدمت گزاری کو اگر زبانِ قلم مفصل بیان کرے تو بڑی لمبی داستان ہو جائے۔"

تھوڑے عرصہ کی خدمت کے بعد حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے بارگاہِ شہنشاہی سے حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین کی اجازت چاہی۔ چنانچہ اجازت مرحمت فرمائی گئی اور اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا:[۳]

"کہ ہماری طرف سے بھی چند لاکھ روپئے مکہ معظمہ لے جاکر خدام کو پیش کردینا۔"

اس ارشاد کے ہوتے ہی حضرت شیخ اقدس نے تیاری شروع کردی اور خزانۂ عامرہ سے نذر و نیاز اور سادات و شرفائے حرمین شریفین میں تقسیم کرنے کے لئے تین[۴] لاکھ روپئے عنایت ہوئے آپ دہلی سے چل کر اپنے وطن مالوف گوپامئو تشریف لائے اور اہل خاندان کا انتظام کرکے اور اُن سے رخصت ہوکر بعزم حج بیت اللہ روانہ ہوگئے۔ بندر سورت پر پہونچ کر یہ خیال کرتے ہوئے کہ "اہلِ حرم کی خدمت زیادہ سے زیادہ رقم سے کی جائے تو زیادہ سے زیادہ سعادت نصیب ہو" حضرت شیخ اقدس نے شاہی رقم مبلغ تین[۳] لاکھ سے وہ سامانِ تجارت خریدا جس میں کافی نفع کی توقع تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جدہ شریف پہونچتے پہونچتے اُس سامانِ تجارت کی رقم

"مع اصل کے نو[۹] لاکھ روپیہ ہوگئی"

---

۱ تزک والاجاہی قلمی صفحہ ۱۸
۲ منتخب اللباب حصہ دوم صفحہ ۴۱۲
۳ " " " صفحہ ۱۷
۴

دربارِ نبوی میں حاضر ہونے کے بعد حضرت شیخ اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے حسب درخواست شاہی نذرِ شاہی کو چھ لاکھ روپئے کے ساتھ پیش کر کے حسب ضابطہ رسیدیں حاصل فرمائیں۔ جو واپسی کے بعد بارگاہِ شاہی میں پیش کر دی گئیں۔

حضرت شیخ اقدس نے مدینہ منورہ میں تین سال مسلسل اپنے محب صادق حضرت شیخ عبدالرحمٰن العاشقیؒ کے پاس "جو وہاں کے اولیا، کبار میں سے تھے" قیام فرمایا۔ اور ہر سال حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ اس دوران میں آپ کی تقدیس کا اس قدر شہرہ ہوا کہ خلیفۃ المسلمین سلطان محمد چہارم اور سلطان مصطفےٰ دوم سلاطین روم نے [۱] :-

"سند فراشی آن ہردو مقام"

مرحمت فرمائیں جو اس وقت تک اس خاکسار کے پاس نہ صرف محفوظ ہیں۔ بلکہ اُن کی اب تک برابر تجدید بھی ہوتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ خاکسار کے والد محترم حضرت نواب حاجی محمد ناظر حسین خاں مرحوم ۱۳۳۱ھ مطابق سنہ ۱۹۱۰ء حج بیت اللہ اور زیارتِ حرمین شریفین کے لئے حاضر ہوئے تو خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خامس نے تجدیداً سند فراشی عطا فرمائی۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۵۳ھ مطابق سنہ ۱۹۳۵ء خاکسار جو وہاں حاضر ہوا تو حکومت سعودیہ نے بھی بربنائے اسناد سابقہ والد مرحوم کو جو اُس وقت تک بقیدِ حیات تھے "سند فراشی" تجدیداً مرحمت فرمائی۔

حضرت شیخ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا بمقام اورنگ آباد دکن بتاریخ [۲] ۵ رمضان المبارک سنہ ۱۱۱۰ھ مطابق سنہ ۱۶۹۹ء انتقال ہوگیا۔ اور نعش مبارک گوپامئو لائی گئی۔ جو آپ کے جد بزرگوار مخدوم شیخ عبدالمجی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن ہوئی۔

حضرت شیخ اقدس کی وفات کے وقت ان کے اکلوتے بیٹے محمد جان جہاں الملقب بہ نواب سراج الدولہ کی عمر تقریباً (۲۰) و (۲۱) سال کے درمیان تھی۔ درسیات کی تکمیل ہو چکی تھی۔ لیکن نازپروردہ جانِ جہاں دنیا کے گرم و سرد سے بالکل بے خبر تھے۔ دفعتہً والد کے انتقال سے ان کو ایک گونہ پریشانی ہوئی۔ مگر پھر بھی چونکہ عالم تھے۔ باپ۔ دادا اور صلحاء وقت کی صحبتیں اُٹھا چکے تھے۔

---

[۱] تزکِ والاجاہی صفحہ ۱۹

[۲] تزکِ والاجاہی صفحہ ۲۰

بہر حال استقامت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور باپ کے زمانے کے طریق کو اسی طرح جاری رکھا۔ اسی عرصہ میں ایک روز بقول مصنف تزک والا جاہی خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ اقدس اپنے بیٹے کو تسکین دیتے ہوئے فرماتے ہیں:[1]

"اقامت بے حاصلت دریں جا ناگوار است رنج و عنا انچیست و پا بدامن کشیدن در تحصیل فوائد سیر و سفر از آئین مصلحت نیست کشائش باب روزیت در گرد عزیمت شاہی است و فلک در کامت مستعد سر براہی۔

خواب میں باپ کا یہ ارشاد سنکر عرض کیا:[2]

"اندیشۂ عدم آشنائی اہل لشکر خار بداماں است و برآمد کار در ہجوم اغیار"

والد بزرگوار نے جواب الجواب میں فرمایا:[3]

"بہ توکل خدا بلا وسواس بہ لشکر ظل سبحانی برو و مستعد پژوہش مقصد شو و مخلص خال امیر واسطہ کار و برآمد مدعایت را مددگار خواہد شد"

یہ خواب کیا تھا گویا باپ کی طرف سے بیٹے کو تفصیلی ہدایات تھیں۔ یا اُس آئندہ بہبود و فلاح کی اطلاع تھی جو بیٹے کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ بہر حال اس خواب کے بعد بیٹے نے سفر کا قطعی ارادہ کیا ہی تھا کہ شاہی فرمان مشعر تعزیت نواب سراج الدولہ کے نام شرف صدور لایا۔ جس میں حاضر دربار ہونے کا حکم تھا۔ نقل فرمان عالمگیری حسب ذیل ہے:۔

نقل فرمان عالیشان حضرت ظل اللہ محمد اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہند

شرافت و نجابت مرتبت۔ اعتماد و رفعت منزلت۔ زبدۂ خانزاداں یک رنگ فدوی خاص الخاص با فرہنگ لایق العنایت والاحسان محمد جان جہاں مورد مراحم و عنایات والا بودہ بدانند کہ دریں آوان ملالت اقتران وقوع ارتحال فدوی خاص الخاص شیخ اقدس حاجی محمد انوارالدین خان بہادر ملال خاطر شد کہ مرد خدا ترس و شخص دیندار بود و خدمات بادشاہی را بہ دیانت و امانت در رونق سرانجام داد و مارا از خود راضی داشت۔ خدایش بیامرزد ہمچون

---

[1] تزک والا جاہی صفحہ ۲۶ [2] تزک والا جاہی
[3] " "

اشخاص دریں زمانہ کمتر اند

اینچہ بر جستیم کم دیدیم و بسیار است و نیست

نیست در معنی بجز انسان کہ بسیار است و نیست

باید کہ آں زبدۂ خانزاداں رامی برضائے الٰہی باشند و توجہات ما بدولت و اقبال را بر حال خود روز افزوں

دانند و خود را بحضور اشرف و اعلیٰ برسانند۔

خواب کی تعبیر سامنے آگئی۔ تیاری تو شروع کر ہی دی تھی۔ بادشاہ کے حکم نے جس میں نہ صرف حاضری کا حکم تھا بلکہ تلقین صبر کے علاوہ باپ کی بزرگی کا وہ شاہانہ اعتراف تھا جس کا شاید ہی کوئی ملازم شاہی مستحق قرار پایا ہو۔ تیاری کی تکمیل کر کے وطن سے روانہ ہوئے۔ اور بالآخر حاضر دربار شاہی ہوئے۔

دربار میں حاضری اور دیوان خانۂ شاہی کی پیشکاری اور خطاب خانی

اردوئے معلیٰ میں پہونچتے ہی جو اورنگ آباد میں تھا شیخ اقدس کے مخلص دوست نواب مخلص خان بہادر نے بارگاہِ جہاں پناہی میں نوجوان محمد جان جہاں کو پیش کیا۔ پیش ہوتے ہی باپ کی جاگیر اور منصب سے اور باپ ہی کی خدمت پر مامور ہوئے۔

نواب مخلص خان بہادر نے جو بخشی ملک تھے جس وقت ماموری کی فرد بغرض منظوری بارگاہ جہاں پناہی میں پیش کی تو حضرت شہنشاہ نے منظوری مرحمت فرماتے ہوئے اپنے دست خاص سے جان جہاں کی بجائے خان جہاں نام تجویز فرما کر ارشاد فرمایا:۔

"بروں در ملازمین ما میرے موسوم بجان جہاں خاں بایکیم است و نام فرزند حاجی انوار الدین خان بہادر خان جہانی ں بالخاء باید نمود"

اُس وقت سے خطاب خانی کے ساتھ بجائے محمد جان جہاں کے محمد خان جہاں مشہور ہو گئے۔ ابھی خدمات انجام دیتے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ شاہی حلقہ میں مقبولیت شروع ہو گئی جس کا سبب مرحوم والد کا اثر تو تھا ہی جو بادشاہ اور شاہی امراء کے دلوں پر نقش تھا۔ لیکن ساتھ ہی انکی ذاتی کارگزاری، دیانت اور محنت بھی اس کا باعث ہوئے۔ چنانچہ ایک روز دیوانخانۂ شاہی کہ جس میں شاہنشاہ کا عبادت خانہ بھی تھا۔ داروغہ حمید الدین خاں نے جن کا پیشکار ایک ہندو تھا

اہ جہاں پناہی میں معروضہ پیش کیا کہ چونکہ دیوان خانہ شاہی جس میں تسبیح خانہ شاہی بھی
ل ہے اپنے تبرکات کی وجہ سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس
لسی غیر مسلم کا دخل مناسب نہیں۔ ان وجوہ سے اس جگہ پر کسی مسلمان کا تقرر ہونا چاہئے حضرت
ں پناہی نے معروضہ پڑھ کر :۔

"بہ نفقہ مکہ معظمہ" زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً و بر "مدینہ منورہ" روحی فداک
یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وبر "نقرۂ کم خواہد" کہ ہندو ... ان خانہ دخل داشتہ
باشد جزاک اللہ فی الدارین دستخط فرمودہ"

اس معروضہ کی پیشانی پر دست خاص سے تحریر فرمایا :۔

"محمد خان جہاں خاں فرزند حاجی انوار الدین خاں اگرچہ جوان ... دہ وارد است اما ہنوز خدمہ
دتزویر لشکریاں دنیا فتہ دیا در اک سرعت آنہا شناختہ در امور مرجوعہ ... با ہوش و صالح و عابد
است اور ابریں خدمت مقرر نمائند و اختیار آں بدستش سپارند۔"

ف منتخب اللباب نے نواب سراج الدولہ بہادر کی بارگاہ شاہی میں حاضری کے متعلق لکھا ہے :۔

"خان جہاں خاں پسر حاجی محمد انور نے وطن سے پہونچ کر شرف باریابی حاصل کیا۔ بادشاہ
جہاں پناہ نے بطور خانہ زاد پروری فرمایا کہ حاجی محمد انور کو زیادہ نوازنا چاہتے تھے لیکن ان کی زندگی
نے وفا نہ کی۔ لہٰذا اب ہم تم کو نوازیں گے۔ اس کے بعد خان جہاں خاں کا لقب عطا فرما کر از راہ خانہ زاد
پروری مناسب منصب عطا فرمایا اور حمید الدین خان بہادر داروغہ دیوان خاص کا پیشکار فرما کر ضمیمہ
واقعہ نگاری و نیز امین ہفت چوکی فوج بلوشاہزادہ محمد کام بخش کی خدمات سے بھی سرفراز فرمایا۔"

اس بیان سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ کو حضرت شیخ اقدسؒ
وفات کا بیحد قلق تھا حتیٰ کہ حسب دلخواہ نوازشات نہ کر سکنے کا بھی افسوس رہا۔ لیکن شاہنشاہ
طرف سے اس کی تلافی کی گئی اور ان کے صاحبزادے کو طلب فرمایا جا کر نوازشات پر نوازشا
ع ہوگئیں۔ اور وہ قلیل عرصہ میں شاہی منصب دار بھی کر دئے گئے۔

خانہ کی خدمات اور نواب ...دولہ کی ذکاوت و ذہانت

دیوان خانہ شاہی اور تسبیح خانہ مبارک کی خدمات نے نواب سراج الدولہ
کو شاہنشاہ عالمگیر کا ایسا مزاج شناس اور ان کی ذکاوت نے

ایسا اشارہ شناس کر دیا تھا کہ شاہنشاہ کے دل میں ان کی عزت اور توقیر نے گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک بادشاہی فوج چند کوہستانی مفسدوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کی گئی۔ کوہستانی علاقوں کی دشواریوں کی وجہ سے شاہی فوج کو ایک حد تک ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کی وجہ سے مفسدوں کے اور حوصلے بڑھ گئے۔ شاہی سردار فوج نے واقعہ نگار کے ذریعہ سے کمک کا مطالبہ کیا۔ اُس زمانے میں جملۃ الملک اسد خاں وزیر سلطنت تھے۔ جس وقت یہ معروضہ ان کے سامنے پیش ہوا وہ فوراً اُس کو لے کر بارگاہ جہاں پناہی میں حاضر ہونے کیلئے چلے اور اُن کو یہ یاد نہ رہا کہ وہ وقت جہاں پناہ کا تسبیح خانہ مبارک میں بیٹھ کر عبادت اور خاموشی ذکر و شغل کا تھا۔ وہاں پر پہونچکر جب ان کو یہ خیال آیا تو اُن کو دوگونہ سخت مشکل پیش آئی۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ ان کی نظر محمد خان جہاں خاں پر پڑی اور اُنھوں نے خان موصوف سے خواہش کی کہ کسی طرح سے بھی وہ عرض مدعا کر کے منظوری لے لیں۔ معاملہ نازک بھی تھا اور اہم بھی۔ یہی مواقع ہوتے ہیں جہاں صرف ذکاوت کام کرتی ہے۔ عصر و مغرب کے درمیان کا یہ وقت تھا جس وقت شہنشاہ عالمگیر مراقبہ فرمایا کرتے تھے۔ بہر حال نواب سراج الدولہ بہادر نے وزیر سلطنت کے حکم کی تعمیل میں اس نازک مسئلہ کی ذمہ داری کو اپنے سر لے لیا اور پردہ کے پاس جا کر نہایت ادب سے لشکر کا اجمالاً حال بیان کر دیا اور وہیں خاموش کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں حضرت شاہنشاہ عالمگیرؒ نے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ اکبر

کی تلاوت فرمائی۔ محمد خان جہاں خاں پردہ کے اندر سے یہ سنتے ہی واپس آئے اور اُنھوں نے وزیر سلطنت کو حکم پہونچایا:۔

”رحمٰن خاں و رحیم خاں دو رسالدار خاص چوکی را با رسالہ اکبری متعینہ حضور بر اعانت لشکر رواں گردانند“

وزیر سلطنت نے یہ حکم پاتے ہی فوراً تعمیل کی اور وہ رسالہ معہ اپنے دونوں سرداروں کے روانہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر شاہی کو مفسدوں کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔

حضرت شاہنشاہ رحمۃ اللہ بعد ادائے نماز عشا جس وقت دربار عام میں تشریف فرما ہوئے تو وزیر سلطنت نے محض تعمیلی اطلاع کے طور پر واقعات کو سمع اقدس تک پہونچایا۔ حضرت جہاں

نے سخت متعجب ہوکر دریافت فرمایا :-

رسا نند حکم کیست و سند تحقیقش چیست

وزیر سلطنت نے اس سوال پر محمد خان جہاں خاں کا نام لے دیا۔ حضرت شاہنشاہ نے انکی طرف متوجہ ہوکر ان سے دریافت فرمایا۔ اُنھوں نے دست بستہ عرض کیا :-

"چوں قرأت بسم اللہ الرحمن الرحیم و اللہ اکبر، بعالم ملکوت تسبیح خانہ خلاف معمول برابر عرض حال لشکر سامعہ نوازی فرمود بہ خیال آنکہ فعل بادشاہی خالی از کار نباشد و کلام خسروی ہیچگاہ سامع رابے بہرہ مقصود ندارد۔ ورک فدوی کہ مستعد کامیابی بود از الفاظ اقتباس اشارات نام رسالہ داران در رسالہ نمود۔

شہنشاہ نے انتہائی خوش ہوکر اپنے محمد خان جہاں کی اس ذکاوت اور قوت استنباط پر آفرین فرمائی اور اُن کے باپ کے خطابات کے علاوہ خانی اور بہادری سے اُن کو سرفراز فرماتے ہوئے دو ہزار ذات اور دو ہزار سوار کا منصب بھی عطا فرمایا۔ اور روز بروز اُنکے مراتب بڑھتے گئے۔

نواب سراج الدولہ بہادر کا پہلا جنگی کارنامہ اور شاہی سرفرازیاں	شہنشاہ عالمگیر نے نواب محمد خان جہاں انوارالدین خان بہادر کی ذکاوت دیانت اور محنت کا " اپنی خدمت خاص میں رکھ کر " تھوڑے ہی عرصہ

میں تجربہ فرما لیا تھا۔ اب اس کے بعد ان کی شجاعت اور جنگی صلاحیت کا امتحان شروع ہوگیا۔ چنانچہ وہ ایک مہم کے مورچہ پر ایک بار دریافت حال کے لئے بھیجے گئے تاکہ وہاں کی جنگ اور بہادروں کے حالات سے مطلع ہوکر بارگاہ جہاں پناہی میں تفصیلات پیش کریں۔ نواب محمد خان جہاں انوارالدین خان بہادر نے وہاں پہونچ کر عجیب منظر دار و گیر دیکھا۔ دونوں طرف سے آتشباری ہو رہی تھی قلعہ کے محفوظ لوگ شاہی فوج کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ اور شاہی بہادر دلیری کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اپنی جاں نثاری کا ثبوت دے رہے تھے۔ دونوں طرف سے کافی تعداد میں مقتول و مجروح ہوئے۔ نواب محمد خان جہاں خاں نے جب یہ منظر دیکھا تو اُنھوں نے بقول مصنف تاریخ منتخب اللباب :-

" اس دار و گیر میں عجب بہادری اور جنگی تدبیر کا مظاہرہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ملعون جہنم واصل ہوئے۔"

نواب محمد خان جہاں خاں نے کامیابی سے واپس ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ بادشاہ نے اس کامیابی پر:-[1]

"ان کی تحسین کر کے عنایات سے ممتاز فرمایا چونکہ وہ بادشاہ کے پہلے ہی سے منظورِ نظر اور قدردان بادشاہ کی عنایات سے مالامال تھے۔ اس کے علاوہ بہادری۔ شجاعت اور دیانتداری کے آثار چہرہ پر نمایاں تھے۔ اس لئے دوسرے شاہزادوں اور فرزندوں کے مقابلہ میں شاہی عنایات میں بھی ممتاز ہوئے۔

شاہنشاہ عالمگیر کا وصال اور شاہ عالم بہادر شاہ کا عہد اور تعلقہ بندر سورت کی حکومت

نواب خانِ جہاں خاں کو ابھی ملازمتِ شاہی میں داخل ہوئے کم و بیش آٹھ سال ہوئے تھے کہ حضرت شاہنشاہ عالمگیر رح کا وصال" بروز جمعہ بتاریخ ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۸ء۔ ۵ سال ڈھائی ماہ کی حکمرانی کے بعد یعنی ۵۰ سال چند ماہ" دکن میں ہوگیا۔ اور وہیں خلدآباد ضلع اورنگ آباد میں اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ برہان الدین کے پاس دفن ہوئے۔ نواب خان جہاں خاں کے لئے یہ سانحہ باپ کے سانحہ سے زیادہ سخت تھا۔ لیکن شاہنشاہ عالمگیر کے جانشین نے ایسے دیانتدار اور ہوشیار خدمتگزار کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی۔ بلکہ اپنی شاہانہ عنایات سے مراتب میں اور اضافہ ہی فرمادیا۔ چنانچہ شہامت جنگ کا خطاب مرحمت فرما کر نواب خانِ جہاں خاں کو تعلقہ سورت کا حاکم مقرر فرمایا۔ جہاں وہ ۱۱۲۳ھ تک خدمات مفوضہ انجام دیتے رہے۔ کہ اسی عرصہ میں چار سال دو ماہ کی حکمرانی کر کے فروری ۱۷۱۱ء میں بعمر ۷۱ سال شاہ عالم بہادر شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اور اُن کا بیٹا جہاندار شاہ تخت نشین ہوا۔

جہاندار شاہ کا عہد ایسی کیفیت کا تھا جس کو اگر ڈوم گردی کہا جائے تو بجا ہے۔ اور جس کی عمر گیارہ ماہ سے زائد نہ ہوئی۔ شرفاء اور اعیان کیلئے نہایت درجہ تکلیف دہ یہ زمانہ تھا۔ چنانچہ ہر شریف و امیر اُس زمانے میں شاہی ماحول سے دُور رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور جو شریف امراء دارالخلافہ سے دُور تھے وہ دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ اسی گروہ میں نواب خان جہاں خان بہادر بھی تھے جنھوں نے قریب سے دوری کو پسند کر کے دور دراز صوبوں میں رہ کر

---

[1] "تاریخ منتخب اللباب" جلد دوم۔ صفحہ ۴۴۴۔

خدمات انجام دینے کو ترجیح دی۔

اب دربارِ شاہی میں سادات بارہ کا دور دورہ تھا۔ دونوں بھائی قطب الملک سید عبداللہ خاں اور امیر الامراء سید حسن علی خان سپہ سالار نہ صرف ملک سیاہ و سفید کے مالک تھے بلکہ بادشاہ کے جسم و جان کے بھی مالک بنے ہوئے تھے۔ جس بادشاہ کو چاہا قتل کرادیا اور جس کو چاہا تخت پر بٹھادیا۔ جس کی چاہیں آنکھیں نکلوالیں اور جس کو چاہا قید کردیا۔ آخر میں محمد شاہ کی تخت نشینی جو دونوں سید بھائیوں کی رہین منت تھی ہوئی اور خلفشار کم نہ ہوا بلکہ بڑھا تو نواب نظام الملک فتح جنگ اپنے صوبۂ دکن کی طرف کسی نہ کسی بہانے سے روانہ ہوگئے۔ اور اورنگ آباد آخر رمضان المبارک ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۳ء میں پہونچ گئے۔

نواب سراج الدولہ اور دکن اُسی وقت نواب خاں جہاں خاں انوارالدین خان بہادر شہامت جنگ بقول مصنف تاریخ منتخب اللباب:[۱]

"دارالخلافہ سے نواب نظام الملک بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب نظام الملک بہادر نے ایسے تجربہ کار اور مستعد بہادر کے پہونچنے کو بڑی کامیابی جانا۔ بیحد مہربانی فرماتے ہوئے حیدرآباد کا صوبیدار مقرر کیا۔ انھوں نے نواح حیدرآباد اور ضلع سیکاکول وغیرہ کے سرکشوں اور مفسدوں کی ایسی خوبصورتی سے گوشمالی کی کہ اس علاقہ میں جہاں شورش کا بازار گرم رہتا تھا امن وامان بدرجہ کمال قائم ہوا۔ اور پوری مالگزاری اور واجبات جو حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے اس وقت تک وصول نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے سب وصول کر لئے۔ اس رستم زماں اور تہمتن وقت نواب سراج الدولہ کے مالی اور ملکی انتظامات اور کاوشوں کا بیان کرنا اس مختصر میں ناممکن ہے۔"

شہنشاہ محمد شاہ بادشاہ نے اپنے عہد میں نواب محمد خاں جہاں انوالدین خاں کے مراتب اور مناصب میں اضافہ کرتے ہوئے سراج الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور نائب وزارت پر نامزد کردیا۔ نواب آصف کے حضور میں پہونچنے کے بعد اُنھوں نے نواب سراج الدولہ بہادر نائب وزیر کو معہ چند ہوشیار امیر کے رفع فساد کے لئے متعین فرمایا۔ چنانچہ نواب سراج الدولہ بہادر مچھلی پٹن سیکاکول اور راجمند

---

[۱] "منتخب اللغات" جلد دوم صفحہ ۵۶۲۔

کی طرف چھوٹی سی جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جہاں پہونچکر اُنھوں نے مفسدوں کی وہ سرکوبی کی کہ آخرکار وہ اطاعت کرنے پر مجبور ہوئے۔ فسادیوں کے سرغنہ سوم بھا اور تھم مرام راجہ مقامی زمیندا مقتول ہوئے۔ اور ملک میں امن قائم ہوگیا۔ مصنف آثورنامہ رقمطراز ہے: ؎

"شد اں ملک درعہد اوچوں بہشت
نیامد دگر فتنہ از دیو زشت"

نواب سراج الدولہ بہادر کا یہ وہ کارنامہ تھا جس نے اُس نواح میں بہادری اور شجاعت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ اس فتح کے تھوڑے دنوں کے بعد تعاقہ راج بندر کے ایک سرگروہ انوارالدین ولد حاجی نے پھر سر اُٹھایا اور ایک زبردست لشکر تیار کرکے افواج آصفی کو کئی شکستیں دیں۔ آخرکار نواب آصف جاہ بہادر نے نواب سراج الدولہ بہادر کو اس کی سرکوبی کے لئے بھی متعین فرمایا۔ نواب سراج الدولہ نے اُسی طرح سے اس مفسد کا بھی خاتمہ کیا۔ جس طرح اس سے قبل اور مفسدوں کا کرچکے تھے۔ ان دونوں فتوحات نے نواب سراج الدولہ بہادر کی شہرت میں چار چاند لگا دئے۔

نواب سراج الدولہ بہادر نائب وزیر نے بارگاہ جہاں پناہی میں ان فتوحات کی تفصیلات کو لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا۔ شہنشاہ نے نواب سراج الدولہ بہادر کے جنگی کارناموں کو سن کر خوشنودی فرمائی۔ اور اس کے صلہ میں ذریعہ فرمان والاشان صوبہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد کی نظامت مرحمت فرمائی۔ نقل فرمانِ شاہی حسب ذیل ہے:- [۵]

نقل فرمان شاہی

امارت وایالت مرتبت۔ رفعت وابہت منزلت۔ شیر بیشۂ روز جنگ منہدم ساز باغیانِ شقاوت آہنگ۔ دُرِ دریائے شجاعت و مردانگی۔ گوہر معدن معدلت و فرزانگی۔ فدوی خاص بااختصاص بے ریو رنگ سراج الدولہ محمد انوارالدین خان۔ خان جہان خان بہادر شہامت جنگ بہ عنایت بادشاہانہ

---

[۵] "تزک والا جاہی" قلمی صفحہ ۳۰۔

ونوازشات خسروانہ معزز ومباہی بودہ بداند کہ دریں ایام میمنت ومسرت فرجام عرضداشت آں فدوی خاص با اختصاص متضمن تاخت دیورش بہادرانہ وکشش وکوشش مردانہ۔ برگروہ شقاوت پژوہ وتحصیل از بادشاہی از جزہ سران نشاء بے راہی از نظر اقتادگاں پایہ سریر برخلافت گرفت وباعث فراواں تحسین وموجب بیکراں آفریں گشت ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند بردست و بازوئے تو ہزار آفریں کنند

دریں آوان سعادت تواماں وزمان بہجت اقتراں از راہ خانہ زاد پروری و فدوی نوازی آں لائق انسانیت والاحسان را بہ تفویض صوبیداری فرخندہ بنیاد حیدرآباد سرفراز سربلند فرمودیم باید کہ شکر وسپاس ایں مواہب عظیم بہ تقدیم رسانیدہ درسبق وتنظیم امور صوبیداری مذکور سرگرم نوکری بادشاہی باشد و عنایات ونوازشات ما بدولت واقبال برحال خود روز افزوں داند ——

اس فرمان کے شرف صدور رلاتے ہی نواب آصف جاہ بہادر نے نواب سراج الدولہ کو سیکاکول سے طلب فرما کر شاہی فرمان سے ان کو سرفراز فرمایا اور صوبۂ حیدرآباد کی حکومت ان کے سپرد کی اور خود معہ لشکر کے کرناٹک کی طرف بغرض انتظام انصرام ملک کرناٹک روانہ ہو گئے۔

صوبۂ حیدرآباد دکن اور نواب سراج الدولہ

فرمانِ شاہی ملنے اور نواب آصف جاہ بہادر کے توثیق حکم پانے کے بعد صوبۂ حیدرآباد کے انتظام میں نواب سراج الدولہ بہادر ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

اب صوبۂ حیدرآباد درو بست نواب سراج الدولہ بہادر کے ماتحت تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے زراعت کی توفیر اور مالگزاری کے ازدیاد کی طرف توجہ کی۔ اس کے ساتھ ہی جتنی غیر شرعی باتیں شیطانوں نے وہاں جاری کر رکھی تھیں ان کو دور کرنا شروع کیا۔ نشہ بازی اور تمام حرام چیزوں کو قطعاً منع کر دیا۔ بدعات کو ایک لخت موقوف کیا۔ اس قسم کے احکام جاری کرنے سے وہ جماعت کسی حالت میں بھی خوش نہیں ہو سکتی تھی جو غیر شرعی باتوں سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ حیدرآباد میں ایک محلہ بیگم پورہ بھی تھا۔ جس کو نواب آصف جاہ بہادر کی بیگم صاحبہ یعنی نواب ناصر جنگ بہادر کی

والدہ نے بسایا تھا۔ نواب سراج الدولہ بہادر نے احکام شرعی وہاں بھی نافذ فرمائے۔ نفس پرست اور شرارت پسند کارپردازان بیگم صاحبہ نے ان احکام شرعی کی تعمیل سے گریز کیا۔ اس وقت نواب سراج الدولہ نے بیگم صاحبہ کو پیام بھیجا کہ یہ مکروہات نہ ہونے چاہئیں۔ بیگم صاحبہ نے نواب سراج الدولہ بہادر کو جواب بھیجا کہ یہ علاقہ ہمارا ہے جو آپ کے حدودِ اختیار سے باہر ہے۔ لہٰذا یہاں دخل نہ دیجئے یہ جواب پاکر نواب سراج الدولہ بہادر نے غیر شرعی امور کی بیخ کنی کو ضروری سمجھتے ہوئے اس بیگم پورہ کو بالکل غارت کر دیا۔ جب ناصر جنگ بہادر کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے نواب سراج الدولہ بہادر کے اس عمل پر احتجاج کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجا۔ نواب سراج الدولہ بہادر نے جواب بھیجا:-[۱]

"کر در شرائط امور دینی وضوابط احکام الٰہی وحدودِ شرع نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاس احدے نا منظور۔

ورعایت کسے درین امور غیر دستور آمدست۔"

اس جواب کو سنکر بیگم صاحبہ کو بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے فوراً آصف جاہ بہادر کو جو اُس زمانہ میں کرناٹک میں ترچناپلی کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے لکھ کر بھیجا۔ نواب آصف جاہ بہادر نے جواب دیا:-[۲]

"دین داری وصلاحیت شعاری وخدا ترسی درہمت کردار سراج الدولہ بہادر متحقق آں نیست کہ در معاملاتش کسے را یارائے تعرض باشد۔ اگر شمارا بایں موافقت نیفتد ترک سکونت حیدرآباد نموده اختیار اقامت اورنگ آباد بہ عمل آید۔"

آصف جاہ بہادر کا یہ حکم پہونچتے ہی سب کی زبانیں بند ہوگئیں اور منہیات کا قلع قمع ہوگیا۔

اسی زمانہ میں ایک گجراتی ساہوکار نے جو بیحد دولتمند تھا۔ اپنی زوجہ کو مار ڈالا۔ اور جب مقدمہ عدالت میں آیا تو اس نے ورثا کو اپنے زر سے رام کرکے راضی کرلیا۔ عدالت نے بھی بجائے قصاص کے دیت پر فیصلہ کیا۔ جب یہ معاملہ بغرض فیصلہ آخر نواب سراج الدولہ بہادر کی خدمت میں آیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ:-[۳]

"مالداراں بہ پیزر زر در قتل بیچارہ مفلساں از شمشیر و سزا ایمن مانند۔"

---

[۱] تزک والا جاہی۔ قلمی۔ صفحہ ۳۶ [۲] ایضاً

[۳] ایضاً

فیصلۂ دیت کو مسترد فرما دیا اور قاتل کے لئے قصاص کا حکم نافذ فرمایا۔ اس فیصلے سے نواب سراج الدولہ بہادر کی انصاف پروری اور عدالت پژوہی کا علاقہ بھر میں سکہ بیٹھ گیا اور کمزور لوگ قوت والوں سے بے خوف ہو گئے۔

بابو نائک سردار مرہٹہ کے مقابلہ میں نواب سراج الدولہ کی فتح

ہنوز صوبۂ حیدرآباد کی تنظیم مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ پنڈت پردھان ملقب ذاتی بہ پیشوا نے اپنے ایک سردار بابو نائک نامی کو ایک لاکھ سوار کی جمعیت سے صوبۂ دکن کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ اُس علاقہ کے "چوتھ" وصول کر کے لائے۔ گویا پنڈت پردھان نے اپنی قوت کے زعم میں یہ سمجھا کہ تمام صوبہ جات دکن و کرناٹک کا وہ بادشاہ تھا۔ نواب آصف جاہ بہادر کو جب کرناٹک میں اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے فوراً نواب سراج الدولہ بہادر کو لکھا کہ[۱۱]

"لحاظ بر کمی لشکر متعینۂ آں سوبار و کثرت افواج غنیم نابکار و بودن ناموس و لواحقین امرا وغیرہ وادک زرمعمول صلاح حفاظت واند و قرار داد مصالحت نسبت بر احوال بریت واسطہ امن و عافیت شمارند۔"

حکم آصفی کو پڑھ کر نواب سراج الدولہ بہادر نے جواباً ارقام فرمایا:[۱۲]

"اگرچہ اداے وجہ مبارزت واقدام آئین مصالحت نظر بہ صلاح حال و مناسب قصور استعداد جدال از مصالح جہانبانی است لیکن ایصال جزیہ بہ کفار خلاف حمیت مسلمانی است۔

غنیم بدکیش جز ہزیمت بیش از بیش نہ خواہد دید و سرکش غنیم جزیہ فروتنی ہر آئینہ دیہیم سر نخواہد کشید۔"

یہ جواب لکھ کر نواب سراج الدولہ بہادر نے دشمن کے مقابلہ کی تیاری کی اور اپنا لشکر جو دشمن کے مقابلہ میں سو میں ایک کی نسبت رکھتا تھا، قصبہ میدک کی طرف روانہ کیا حتیٰ کہ "موضع اندول" کے میدان میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ تین[۳] شبانہ روز دونوں میں وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ دشمن نے منہ کی کھائی اور وہ زبردست نقصان اُٹھا کر پونا کی طرف بھاگ گیا۔ اللہ کی مدد پر بھروسہ کر کے نواب سراج الدولہ بہادر نے جو کچھ نواب آصف جاہ کو لکھا وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ اس جنگ اور مرہٹہ کی ہزیمت کو اجمالاً مصنف "انوارنامہ" نے اس طرح لکھا ہے:۔

---

[۱۱] تزک والا جاہی۔ قلمی۔ صفحہ ۲۷ [۱۲] ایضاً

پس از چند در جود حاتم شدہ — تا بہ فرخندہ بنیاد ناظم شدہ
(یعنی حیدرآباد)
سپہ مرہٹہ بود با او بہ نام — ز طلب "ستارہ" بہ آورد گام
بہ نواب حیدر وزیر سند آمد (یعنی سراج الدولہ) — فرستاد پیغام آں بے سند
بہ آں گفت آں ابر فیض اتم — بہ کافر چرا پیشکش میدہم
بہ ہر سومہ حصہ چار ریں — کر بود شہ در اضلاع دکن زمیں
بہ کفار دوں در خور جزیہ اند — بہ باخوارگان دور از قبیلہ اند
بمن ہست شمشیر جزیہ ستاں — بمن جزیہ زیبد نہ با منکراں
چو بشنید آں دیو ناپاک زاد — برانگیخت فوج و در آمد چو باد
سپہدار ایں نیز شد پر شتاب — رواں شد برو چوں بہ شب آفتاب
چو لشکر بہ میدان میدک رسید — عدو بر مقابل در آمد پدید
بہ نزدیک اندول افتاد جنگ — ز پستی بر اوج فلک رفت دنگ
سہ روز و سہ شب سخت پر خاش بود — بہر پشتہ از کشتگاں لاش بود
بروز چہارم ز شمشیر تیز — چو روبہ در انداخت سر در گریز[لہ]

اس اجمال کے بعد مصنف انورنامہ نے دشمن کے مال غنیمت وغیرہ کو بیان کرتے ہوئے صو حیدرآباد کی اصلاح وغیرہ کو بیان کیا ہے۔

بابو نائک کی اس ہزیمت پر اُس کے آقا پنڈت پردھان پیشوا پونا نے بڑا ہی پیچ و تاب کھ اور نواب سراج الدولہ بہادر سے انتقام لینے کا تہیہ کر کے تین لاکھ کی جمعیت سے خود اس نے حیدر پر حملہ کا اعلان کر دیا۔ نواب آصف جاہ بہادر کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے مصلحتاً مراؤ قلعہ تر جناپلی بذریعہ صلح حاصل کر کے وہاں سے جانب حیدرآباد کوچ کیا۔ دریائے کرشنا کو عبو ہی تھا کہ دشمن کی فوج نے آگے سے آکر راستہ روک دیا اور ایک حد تک محاصرہ کر لیا۔ جب سراج الدولہ بہادر کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے ایک بیٹے نواب محمد علی کو ج

لہ "انورنامہ" قلمی صفحہ ۹۱۔

ِاسس کی ریاست کے والا جاہ ہوئے، حیدرآباد میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور باقی تینوں بیٹوں۔
نوظ خاں بہادر شہامت جنگ۔ عبدالوہاب خاں بہادر نصرت جنگ اور محب اللہ خاں بہادر کو
لے کر معہ اپنی فوج چترا پکے وہ لشکر آصفجاہی کی طرف روانہ ہوئے۔ اور اتنی جلد وہ لشکر
پہونچے کہ سب کو حیرت ہوگئی۔

اس کے ساتھ ہی دشمن کے محاصرہ کی وجہ سے لشکر میں جو رسد کی تنگی ہوگئی تھی وہ بھی جاتی رہی۔
اب سراج الدولہ بہادر کے پہونچتے ہی[51]:-

"نواب آصف جاہ شکرانہ لطیفہ وصولش کسپاس مفرح نزدش بتقدیم رسانیدہ دامن
دل از گرد فر بفکر یافشاندو از بے اختیاری جوشش این مصرع برآند۔ ع
اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"

ں کے بعد نواب آصف جاہ بہادر نے مشاورتی جنگی مجلس منعقد کی جس میں حسب ذیل اشخاص تھے[52]:-

"سید لشکر خاں دیوان اول۔ سید شریف خاں دیوان دوم۔ شہنواز خاں دیوان سوم۔
خدا بندہ خاں دیوان چہارم۔ خواجہ عبداللہ خاں ناظم پایاں گھاٹ۔ نواب سراج الدولہ بہادر ــــــ"

لس کا تمام رجحان صلح تھا۔ جس کی وجہ با استثنا نواب سراج الدولہ بہادر سب کے نزدیک یہ تھی کہ
شکر میں بوجہ طویل سفر مقابلہ و مجادلہ کی سکت نہیں تھی۔ اس بحث و تمحیص کے دوران میں نواب
راج الدولہ بہادر خاموش ہی رہے اور انھوں نے مطلقاً لب کشائی نہ فرمائی۔ شہنواز خاں
مصنف مآثر الامراء) نے جو نواب سراج الدولہ سے چشمک رکھتے تھے۔ نواب سراج الدولہ بہادر
سے طنزیہ طور پر کہا[53]:-

"صاحب! خاموشی دریں مقدمہ چراست دشمشیر مرہٹہ کش کہ بر سر بابو نائک کشیدہ بر پشت
گریز پایاں رویدہ بہ چہ سبب در نیام است و در معرکہ صیدہ پنجہ کشیدن و بمقام حملہ اہمال
گزیدن تعجب است۔"

نہ نواز خاں صمصام الدولہ کے اس طنزیہ سوال سے خون فاروقی جوش میں آیا اور سراج الدولہ بہادر

---

[51] تزک والا جاہی۔ قلمی صفحہ ۳۹ [52] ایضاً [53] تزک والا جاہی۔ قلمی صفحہ ۴۰

نے جواب دیا:-[۱]

"خاموشیم را جہت آنست کہ در مباحثہ ورکہ آرائے زنان تذکرہ شمشیر کشی مرداں بکار نیاید و شجاعت با مشورت اتفاق ندارد۔"

شہنواز خاں یہ جواب سُنکر بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے اس لئے اُنھوں نے کہا کہ پنڈت پردھان میں اور بابو نانک میں فرق ہے۔ بابو نانک قطرہ تھا پنڈت پردھان دریا ہے۔ اس پر نواب سراج الدولہ بہادر نے فرمایا:-[۲]

"عمق آب شمشیر مبارزاں از ثریا تا ثرے است"

شہنواز خاں نے اس کے جواب میں کہا کہ:-[۳]

"اگر زمی دارید و کارے می فرمائید ہمیں چوگان ہمیں گوئے و ہمیں میداں۔"

نواب سراج الدولہ بہادر یہ آخری جملہ سنکر مجلس سے سیدھے نواب آصف جاہ بہادر کی خدمت میں پہونچے اور عرض کیا کہ:-[۴]

"از ارباب سیف و ستیز بیم مشورت را عیب جوانمردی می دانیم

بجو عاجز شود مرد چارہ سگال ز بیچارگی می گریزد بہ غال"

یہ عرض کرکے وہاں سے چلدئے اور کوس جنگ بجوا دیا۔ نواب آصف جاہ بہادر سے چلتے وقت یہ بھی عرض کیا تھا کہ یا تو پہلے ہی مقابلہ میں انشاءاللہ دشمن کو دست بستہ لاکر پیش کر دیا جائیگا ورنہ اس کام میں اپنا سر دیدوں گا۔

بہرحال نواب سراج الدولہ بہادر نے فوراً اپنی فوج تیار کی اور دشمن کے مقابلہ کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ پنڈت پردھان یہ سن کر نواب سراج الدولہ جنگ کے لئے آمادہ ہیں سخت گھبرایا۔ اور آپس میں اُس نے مشورہ کیا۔ اُس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈت پردھان نے جنگ مناسب نہ سمجھی اور پیام صلح بھیجدیا جس میں اُس نے "چوتھ" سے دست برداری کا اعلان کیا۔ اس شرط پر نواب سراج الدولہ بہادر نے صلح منظور کی اور حسب وعدہ پنڈت پردھان کو نواب

---

[۱] تزک والا جاہی۔ قلمی صفحہ ۸۹ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً

ﮦﻒ جاہ بہادر کے حضور میں لاکر پیش کر دیا۔
مسلمان فاتحین کی یہ خصوصیت تھی کہ ہزیمت یافتہ یا صلح کردہ دشمن کو نہ تو دشمن سمجھتے تھے۔ ۔نہ ان کو ذلیل کرتے تھے۔ بلکہ ان کی عزت و جاہ میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ جنگ و صلح ،یہ وہ اصول تھے جن کی وجہ سے مسلمان بیشتر کامیاب و کامراں رہے۔ غرضکہ جس وقت ۔ت پردھان کو جو ایک حد تک ہزیمت خوردہ تھا، نواب سراج الدولہ بہادر لائے اور نواب ﺼﻒ جاہ بہادر کو علم ہوا تو وہ خود اُس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور بقول تزک والا جاہی:۔

"با وی بر یک مسند جلوس فرمود بعد انصرام رسوم مکالمت و انسجام مروم مصادقت داجرائے تواضع خلاع وعطر پان و ادائے شرائط توقیر غیر زیبہ ہندوستان آئین و داع ہمہ دیگر حسن شہود یافت۔"

ں ملاقات کے بعد پنڈت پردھان مع اپنے لشکر کے بجانب پونا روانہ ہوا اور نواب آصف جاہ ﺎدر نے اسی جگہ قیام فرماکر ملک کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ عبداللہ خاں کو ناظم ارکاٹ کرکے ﻣﺖ سے سرفراز فرمایا۔ عبداللہ خاں رخصت ہوکر اپنے خیمہ میں آئے اور نواب آصف جاہ بہادر ﮔﮯ روانہ ہوئے، ہنوز نواب آصف جاہ بہادر نے ایک کوس کی منزل بھی طے نہیں کی ہوگی ﻟﮧ ان کو اطلاع ملی کہ:۔[1]

"(نواب عبداللہ خاں) بعد ادائے ضروریات و تہیۂ نماز صبح موافق معمول بر چوکی نشست وضو ﻯ ساخت۔ چنانچہ تا شستن پائے چپ رسید ناگاہ پائے حیاتش از کرسی ثبات بلغزید وحیین جاں بزمین سجدۂ جاوداں نہاد۔"

ﻭاب آصف جاہ بہادر نے یہ افسوسناک خبر سنتے ہی اسی جگہ قیام فرما دیا اور ارکاٹ کی نظامت کے متعلق اپنے مشیروں سے مشورہ شروع کر دیا اور اُن سے نامزدگی کے لئے کہا۔ مشیروں میں سوائے ﻧﺪ اللہ خاں مرحوم کے وہ سب حضرات تھے جو مجلس جنگ کے اراکین تھے۔ اس موقع پر بھی ﺍﺏ سراج الدولہ بہادر نے اپنا وہی عمل رکھا اور وہ مجلس مشاورت میں خاموش بیٹھے رہے۔ آپس میں

---

[1] "تزک والاجاہی" قلمی۔ صفحہ ۴۱

مختلف لوگوں کے نام زبانوں پر آئے لیکن کوئی شخص نہ ہو سکا۔ آخر کار حسب دستور سابق چھتر
نواز خاں نواب سراج الدولہ بہادر سے مخاطب ہو کر بولے کہ:-[۵۱]

" صاحب! در اوقات مشاورت چرا لب را مُہر خاموشی می دہید و بہ چہ سبب زبان را

آشنائے بیان نمی کنید"

نواب سراج الدولہ بہادر نے فرمایا کہ:-[۵۲]

" خاموشیم صدائے دارد کہ پریروز در معاملہ پنڈت پیرو دعان بگوشش خاص و عام رسیدہ

واز آن خاطر سخن آراں افسردہ شد"

اس عرصہ میں نواب آصف جاہ بہادر تشریف لے آئے۔ اور اُنھوں نے نامزدگی کے متعلق دریافت
کیا۔ خدا بندہ خاں نے عرض کیا کہ سراج الدولہ بہادر نے اپنے تئیں اس کام کے لئے پیش
کیا ہے۔ یہ سُنکر نواب آصف جاہ بہادر بیحد خوش ہوئے اور فرمایا کہ:-[۵۳]

"بسیار خوب است و بایں کار ہمچنیں کس مطلوب"

چھتر نواز خاں نے یہ سنتے ہی عرض کیا کہ:-

"اگرچہ خوب است اما پیر"

نواب آصف جاہ بہادر نے فرمایا کہ:-

"ہر چند کہ پیر است لیکن خوشش سراں است و باتدبیر"

غرض کہ نواب آصف جاہ جیسا مردم شناس اور قدرداں وزیر نے فی الحقیقت خوب ہی اُن کو
منتخب کر رکھا تھا۔ البتہ وہ مشیروں کا امتحان اور نواب سراج الدولہ بہادر کا عندیہ لینا چاہتے
تھے۔ اُنھوں نے نواب سراج الدولہ بہادر کو طلب فرما کر فرمایا کہ:-

"جہت اقامت نظامت آرکاٹ گوہر فطرت والائے شما از سلک مخصوصان عنایات

باجیدیم و آب و تابش بروشنی جوہر کاردانی ہمہ ہا پسندیدیم۔ امروز چہار شنبہ و سیزدہم

ماہ صفر است و برائے دادن خلعت خواہ امروز خواہ فردا بخوشنودی خاطر شما۔

---

۵۱ تزک والاجاہی - قلمی - صفحہ ۴۱ - ۵۲ ایضاً - صفحہ ۴۲ -
۵۳ " " صفحہ ۴۴ -

چونکہ نواب سراج الدولہ بہادر اس قسم کی تاویلات دن اور تاریخ کی قیود سے مبرا تھے اس لئے انھوں نے کہا کہ جس روز اور جس وقت یہ خدمت دی جائے وہی دن اور وہی وقت باعث برکت ہے ہر روز خدا کا بنایا ہوا اور مبارک ہے۔ نواب آصف جاہ بہادر نے یہ سن کر اسی وقت خلعت عطا فرما کر سند نظامت سے نواب سراج الدولہ بہادر کو سرفراز فرمایا۔ سند نظامت ملتے ہی نواب سراج الدولہ بہادر نے اُن نوائطوں کی رہائی کی سفارش کی جو خواجہ عبداللہ خاں سابق ناظم کے اشارہ سے آصفی قید میں تھے اور لشکر کے ہمراہ تھے۔ نواب آصف جاہ بہادر نے ہر چند نواب سراج الدولہ بہادر کو ان کے فتنہ و فساد سے آگاہ کرتے ہوئے اس سفارش سے روکا لیکن نواب سراج الدولہ بہادر نے کہا :-

"وائے بر حاکمیکہ غافل از خلل اندازی محکوم باشد و افسوس بر خواجہ کہ ما بکار آزادہ فتور بندہ گرداند۔ چہ امکانست کہ ازیں کساں خلل در نظامت من آید و ہنر کاردانی من مبدل بہ عیب ہیچ کارہ کے شود"

آخر کار نواب آصف جاہ بہادر نے سب کو رہائی دی۔ اس کے بعد نواب آصف جاہ بہادر نے رخصت پان دینے کے لئے اپنے ہاتھ میں پاندان لیا اور چاہتے تھے کہ نواب سراج الدولہ بہادر کو وہ رخصتی پان دیں۔ کہ انھوں نے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ سے مل کر رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ چونکہ نواب ناصر جنگ اُس وقت باپ سے مقابلہ کرنے کی وجہ سے معتوب و اسیر تھے۔ حتیٰ کہ ان کا خطاب بھی باپ نے چھین لیا تھا۔ اور عام حکم دیدیا تھا کہ کوئی شخص ان کا خطاب زبان پر نہ لائے بلکہ ان کا نام "میر احمد" کہا کرے۔ نواب سراج الدولہ بہادر کی زبان سے باوجود ممانعتی احکام کے نواب آصف جاہ بہادر اس خطاب کو سن کر سخت مکدر ہوئے۔ اور انھوں نے اعتراضاً دریافت فرمایا کہ:- [1]

"آیا حکم من بہ شما نہ رسید کہ کس خطابش بزبان نہ راند و باسم اصلی میر احمدش خواند"

جواباً نواب سراج الدولہ بہادر نے عرض کیا:- [2]

"ہر چند کہ حکم خداوندی آگہی افروز لیکن پاس صاحبزادگی ادب آموز"

---

[1] تزک والا جاہی قلمی صفحہ ۸۹

[2] ایضاً۔

سنکر نواب آصف جاہ بہادر کو اور زیادہ بُرا معلوم ہوا اور فرمایا کہ ہم سے تم جنگ کرتے ہو یا ان نے ہو یا نہیں۔ جواباً عرض کیا:[۱]

"تعلق از جنگ ندارم زیرا کہ از حضور ظل سبحانی متعین حضرت شدہ ام اگر پان عنایت میشود عنایت است وگرنہ بدون پان کامیاب رخصت۔"

اب سراج الدولہ بہادر کی اس صاف گوئی سے نواب آصف جاہ بہادر کو مزید طیش آیا۔ اور اُنھوں نے پاندان زمین پر رکھدیا۔ چنانچہ بغیر پان کے آداب رخصت بجا لاتے ہوئے اب سراج الدولہ اپنی پالکی پر سوار ہوکر اپنے کیمپ کو چلدئے۔ نواب آصف جاہ نے پیچھے پیچھے ان بھیجا اور نواب ناصر جنگ سے ملنے کی اجازت بھی دیدی۔ چنانچہ وہ وہیں سے نواب ناصر جنگ ملاقات سے رخصت ہونے چلے گئے۔ نواب ناصر جنگ اس شریفانہ جرأت سے بیحد متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ سمجھے کہ شاید نواب سراج الدولہ نے یہ اس لئے کیا نواب ناصر جنگ آیندہ حکمراں ہونے والے ہیں۔ اِس غلط فہمی کا ازالہ اُسی وقت ہوگیا۔ گفتگو ختم ہوتے ہی جس وقت ناصر جنگ نے بوقت مصافحہ "اقرار" کے لئے کہا تو اُنھوں نے فوراً اُس کی وضاحت چاہی، نواب ناصر جنگ نے کہا:[۲]

"از شما عہد رفاقت می خواہم"

یہ جملہ سنتے ہی نواب سراج الدولہ بہادر گرم ہوئے اور فوراً ہاتھ چھڑا کر فرمانے لگے:[۳]

"نمی توانم کہ پیمانش بمیان آورم وتا آنکہ این پیر (نواب آصف جاہ) در قید حیات است ممکن نیست کہ رفاقتش گزارم۔"

نواب ناصر جنگ یہ جواب سن کر گھبرا گئے اور کہنے لگے "یہ میرا مطلب نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ باپ کے بعد آپ میرا ساتھ دیں۔ میرے بھائی آصف الدولہ غازی خاں بہادر فیروز جنگ کا ساتھ نہ دیں۔" اس کے جواب میں نواب سراج الدولہ بہادر نے فرمایا:[۴]

"باس این معنی، در صورت رضامندی ظل سبحانی، آسان است۔"

یہ فرماکر رخصت ہوئے اور معہ اپنے حشم و خدم کے روانہ ہوگئے۔

۱ه تزک والاجاہی قلمی صفحہ ۴۴۴ — ۲ه ایضاً

۳ه " " " صفحہ ۴۴۵ — ۴ه ایضاً

چونکہ میرے مقالہ کا عنوان "نواب سراج الدّولہ بہادر گوپاموی اور صوبہ دکن" ہے اس لئے میں اُن کی آرکاٹ اور کرناٹک کی زندگی کو اس میں بیان نہیں کروں گا۔ فی الحقیقت اس موضوع پر ایک بسوط کتاب بنام "تاریخ امرائے فاروقی گوپامئو" میرے عموی محترم حضرت مولانا مولوی محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم۔ اے منشی فاضل (فاضل مصر) سابق پروفیسر فارسی علی گڑھ یونیورسٹی وحال انسپکٹر مدارس حکومت نظام دکن مدوّن فرما رہے ہیں جو انشاء اللہ عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے گی۔ اس کتاب میں تفصیلاً اس خاندان کے حالات درج ہیں۔ میرے مقالہ کی ترتیب حضرت ممدوح کے مسودہ اور اُن کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ شاید میں اس کی تکمیل نہ کر سکتا۔

اس کو ختم کرنے سے قبل میں اس قدر اور اجمالاً عرض کروں گا۔ کہ نواب سراج الدّولہ بہادر کے بڑے صاحبزادے نواب بدر الاسلام خان بہادر افراسیاب جنگ اپنے والد کی بجائے دربار شاہی میں نائب وزارت پر مامور تھے۔ اور نواب محمد علی (جو بعد میں والاجاہ ہوئے) و نواب محمد محفوظ خان بہادر شہامت جنگ و نواب عبدالوہاب خاں بہادر نصرت جنگ اپنے والد کے ہمراہ تھے۔ جو بوقت ضرورت فوجی و ملکی خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

شمائل نواب سراج الدّولہ بہادر اور تقسیم اوقات

نواب سراج الدّولہ بہادر اس علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جہاں علم و عمل میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ایسے ماحول کا پرورش یافتہ جس قدر زیادہ پابند اوقات ہو وہ کم ہے۔ اِن کے والد نواب حاجی انوار الدین خان بہادر اگر ایک طرف امیر تھے تو دوسری طرف اُسی مرتبہ کے فقیر بھی۔ یہی خصوصیت نواب سراج الدولہ بہادر کی بھی تھی۔ اقربا پروری۔ احبا نوازی اور غربا پروری میں یکتائے روزگار تھے۔ انصاف کے وقت انصاف ہی سامنے رہتا تھا۔ شخصیت کے اثر سے مُبرا تھے۔ غرض کہ ابتدائے سن رشد سے لے کر تا وفات جو بعمر (۷۷) سال عین میدان کارزار میں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں واقع ہوئی اوقات کی پابندی میں کبھی فرق نہ آیا۔ چنانچہ مصنف "تزک والاجاہی" نے صفحہ ۲۹ میں لکھا ہے:۔

> آخر شب میں بیدار ہوتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہو کر وضو فرماتے اور نمازِ تہجد ادا کر کے فجر کے وقت تک تلاوت کلام پاک فرماتے رہتے۔ پھر فجر کی نماز ادا فرمانے کے بعد ناشتہ فرماتے۔

ناشتہ کے بعد تھوڑی دیر آرام لیتے۔ اس کے بعد اٹھ کر پھر وضو کرتے اور تسبیح ہاتھ میں ہوتی اور زبان پر اللہ اللہ ہوتا۔ اسی حالت میں دوپہر تک ملکی معاملات کو دربار عام میں انجام دیتے۔ پھر تھوڑی دیر آرام کرتے۔ ظہر کے وقت بیدار ہوتے اور بعد وضو نماز ظہر ادا فرماتے۔ اس کے بعد تیسرے پہر تک خانگی امور کی دیکھ بھال فرماتے۔ پھر دوپہر کا کھانا نوش فرما کر دیوان خانہ میں علماء اور امراء کی صحبت گرم رہتی۔ دیگر انہیں کے ساتھ عصر، مغرب اور عشاء کی نماز ادا فرماتے۔ بعدہ ۱۲ ہزار درود شریف پڑھکر آرام کیا کرتے۔"

ممدوح کا یہ نظام الاوقات تھا جس میں بحالتِ جنگ بھی کبھی فرق نہ آیا۔

ایک بار آپ کے ایک عزیز قریب نصر اللہ خاں بہادر جو نواب سراج الدولہ بہادر کے ساتھ سیکاکول (حیدر آباد دکن) میں تھے کسی وجہ سے رنجیدہ ہو گئے اور ترک ملازمت کر کے اُن کے پاس سے جانے لگے۔ نواب سراج الدولہ بہادر نے ہر چند اُن کو سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانے اور یہ کہتے ہوئے جانے لگے ؎

پائے گدا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست

آپ نے فرمایا کہ:[1]

"تم یہ غلط کہتے ہو۔ تمہارا پاؤں بھی لنگڑا ہے اور تمہارے لئے ملک خدا بھی تنگ ہے۔ اس حالت میں جہاں جانا چاہتے ہو نہیں پہونچ سکوگے۔ اور پھر میرے پاس واپس آؤگے۔"

غرضکہ نصر اللہ خاں بہادر فاروقی اپنے جوش میں چلدئے اور کچھ منزل جا کر ایسے علاقہ میں پہونچے۔ جہاں باہم زمینداروں میں جھگڑا تھا اور لڑائی ہو رہی تھی۔ اسی جگہ ان کے بھی ایک گولی لگی اور یہ لنگڑے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لنگڑے ہو کر آخرکار نواب سراج الدولہ بہادر کے پاس واپس آ گئے۔ نواب سراج الدولہ بہادر ان کو دیکھتے ہی بہت غمگین ہوئے اور اُن کو تسلی و تشفی دے کر ان کا علاج کرایا اور جیسے رہتے تھے رہنے لگے۔

اسی قسم کے بہت سے واقعات سوانح نگاروں نے لکھے ہیں جن کا بیان کرنا باعث طوالت ہے۔ لہٰذا نور نامہ کے حسب ذیل اشعار پر جو نواب سراج الدولہ کے ذاتی اور خاندانی

---

[1] تزک والا جاہی۔ قلمی۔ صفحہ ۲۲۔

حالات پر اجمالی روشنی ڈالتے ہیں اکتفا کرتا ہوں ؎

بود انوارالدین سپہ سروراں — ز روئے بزرگی بزرگ سراں
بود نام او نور افروز دیں — بود ذات او حامیٔ مسلمیں
بحق تا دم آخریں جست راہ — تہجد نہ کردہ قضا ہیچ گاہ
امیر و جہاں پرور و دادگر — ز امرائے ہم عہد خود نامور
سخاوت ز اقبال او تاب یافت — شجاعت ز شمشیر او آب یافت
بسا عمدگاں راز احساں کشید — بسا سرکشاں زیر فرماں کشید
نخستیں بہ دہلی وطن گاہ داشت — بگوپامئو رفت و بنگاہ داشت
واز آنجا بر آمد بہ دکن زمیں — کہ سودہ بر اوج چرخ بریں

آگے چل کر یہی مصنف فرانسیسیوں کے مقابلہ اور مقاتلہ نیز نواب سراج الدولہ کی شہادت کے واقعات کو لکھتے ہوئے لکھتا ہے ؎

بدستور محفوظ خاں برسمند — بہ پیش پدر چوں پل ارجمند
بمیدان مردی علم برنہاد — بہ خیل معاند قدم بر کشاد
ازاں خیر دین و نجیب اللہ خاں — چو خورشید شمشیر آتش فشاں
بسا فرق غلطید در خاک و خوں — کہ اندراں خوں شدہ سرنگوں
جوانان گوپامئو تیغ زن — پراگندہ کردند ہر انجمن

ولے سعی آنہا دگرگوں شدہ
فلک قرعہ واژگوں برزدہ

محمد رئیس الاسلام گوپامئوی

معلوماتِ شاعری

(از جناب سیّد مسعود حسن صاحب تعلقدار تاج پور و پنشنر جج)

آج پڑھے لکھوں میں تقریباً اسّی فی صدی شاعر نظر آتے ہیں اور ایک معمولی سے معمولی قصبے میں بھی جہاں آبادی کافی ہو مشاعرے کے دن شاعروں کی تعداد شام سے صبح تک جگانے کیلئے کافی ہو سکتی ہے اسی سے آپ شہروں کا اندازہ لگا لیجئے۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ اس فن کی عمومیت کے باوجود اس کے جاننے والے اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گن لئے جائیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب اُن کی علم کی کمی اور صحیح ذوق کا فقدان ہے۔ مشاعروں کی واہ واہ دوسرے نوجوانوں کو شعر گوئی کے لئے اُبھارتی ہے۔ ادبی رسالے جن میں بہت کم معیاری رسالے ہیں اُن کا غلط کلام شایع کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اس طرح وہ اصلاح سے مستغنی ہو کر بزعم خود استاد بن کر رہ جاتے ہیں۔ شاعروں کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے جو بظاہر کتنا ہی دلکش ہو لیکن حقیقت میں اردو ادب کے لئے بلائے جان سے کم نہیں ؎

اتنی ہی عشق کی مٹی ہے پلید جس قدر حسن کی ارزانی ہے

چنانچہ انھیں خامیوں اور کمزوریوں کو محسوس کرنے کے بعد میرا ارادہ ہوا کہ شعر کے متعلق ایک مختصر مگر جامع رسالہ مرتب کروں جس میں تمام ضروریات شعر کا بیان ایسے انداز میں ہو جو نو مشق شعراء کو ابتدا ہی سے غلط روی میں نہ پڑنے دے اور وہ شعر کے تمام محاسن و عیوب سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تاکہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں اور ادبی جماعتوں میں اُن کی ہنسی نہ اُڑائی جائے۔ آج خدا کا شکر ہے کہ وہ رسالہ میرے کار منصبی کی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود مرتب ہو کر ہدیۂ ناظرین ہے۔ میری بڑی خوش بختی ہوگی اگر میری یہ سعی مشکور ہوئی۔

عروض

عَروض عین کے زبر کے ساتھ اُس علم کا نام ہے جس سے بحروں کے اوزان معلوم ہوتے ہیں۔ اور موزوں ناموزوں میں تمیز کیجاتی ہے سب سے پہلے اس فن کی ترتیب کی طرف جس نے توجہ کی وہ عرب کے ایک فاضل خلیل ابن احمد تھے۔ مشہور ہے کہ ایک دن مکہ معظمہ میں ان کا گزر اس جگہ سے ہوا جہاں دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ پاٹے پر کپڑے پٹکنے کی آواز ایسی بھائی اور اُس میں ایسی موزونیت محسوس ہوئی کہ بے ساختہ اُن کی زبان پر یہ جملہ جاری ہو گیا واللہ یظھر من شیٔ۔ یعنی بخدا اس سے ایک چیز ظاہر ہوتی ہے اور یہی واقعہ اس فن کے ایجاد کا محرک ہوا۔ چنانچہ انھوں نے عربی اشعار کو جو مختلف بحروں میں تھے ایک جگہ جمع کر کے انھیں چند بحروں کے اندر منظم کیا اور ان بحروں کے لئے چند ارکان بنائے جن کو اصول افاعیل یا تفاعیل کہتے ہیں اور وہ آٹھ ہیں جنکو بعض دس گنتے ہیں۔ کیونکہ مستفعلن اور فاعلاتن کو متصل اور منفصل دونوں طریقے سے لکھتے ہیں۔

ارکانِ عشرہ

فَعُوْلُنْ ۔ فَاعِلُنْ ۔ مفاعِیْلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ ۔ مَفَاعِلَتُنْ ۔ مُتَفَاعِلُنْ ۔ فَاعِلَاتُنْ
مَفْعُوْلَاتُ ۔ مُسْ تَفْعِ لُنْ ۔ فَاعِ لَاتُنْ ۔

ارکان مذکورہ بالا کو میرے کرم فرما مرزا احمد شاہ بیگ جوہر مرحوم مرادآبادی نے بہ نظر سہولت منظوم کر دیا ہے جو حسب ذیل ہے :-

دس ہیں ارکان عروضی مستقل ۔ متصل ہیں آٹھ ۔ دو ہیں منفصل
فاعلن ۔ مستفعلن ۔ متفاعلن ۔ فاعلاتن ہم مفاعیلن سے من
ہے ۔ مفاعلتن فعولن بعد ازاں ۔ اور مفعولات ہے رکن آٹھواں
منفصل مس تفعِ لن بھی سے لیجئے ۔ فاعِ لاتن منفصل کل دس ہوئے

جزو ارکان

یہ ارکان تین جزو سے مرکب ہوتے ہیں۔ سبب ۔ وتد ۔ فاصلہ

سبب ۔ سبب کلمہ دو حرفی کو کہتے ہیں۔ اگر دوسرا حرف ساکن ہو سبب خفیف ہے جیسے

مر۔ دغیرہ اگر دونوں متحرک ہوں سبب ثقیل ہے جیسے مِن بیدل میں مِن (نون میں اضافت)

وتد۔ کلمہ سہ حرفی کو کہتے ہیں۔ اگر تیسرا حرف ساکن ہو وتد مجموع ہے۔ جیسے دہن دغیرہ اگر درمیانی حرف ساکن اور اول اور آخر کا متحرک ہو وتد مفروق ہے۔ جیسے یارمن میں یار (ے میں اضافت ہے)۔

فاصلہ۔ اگر کلمہ چار حرفی ہو اور اس کے ابتدائی تین حرف متحرک ہوں تو وہ فاصلہ صغریٰ کہلائے گا۔ جیسے۔ صنما۔ فقرا۔ قلمی۔ اگر کلمہ پنج حرفی ہو اور اس کے ابتدائی چار حروف متحرک ہوں تو وہ فاصلہ کبریٰ کہلائے گا مگر اس کی مثال شاذ ہے۔

فعولن۔ ایک وتد مجموع اور ایک سبب خفیف سے مرکب ہے۔ فاعلن ایک خفیف اور ایک وتد مجموع سے مرکب ہے اور اسی طرح سے دیگر ارکان بھی مختلف جز وسے مرکب ہیں۔

مذکورۂ بالا سہ گانہ اصول کو فارسی کے مندرجہ ذیل شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

از سرِ کوے وفا قدمی نگزری جز ہنرِ اہلِ صفا بکسے ننگری

بحر

بحر لغوی معنی دریا یا سمندر کے ہیں اور اصطلاح عروض میں ارکان کی مختلف ترکیبوں کو جن پر شعر لوزان کرتے ہیں بحر کہتے ہیں۔

ان بحروں کی تعداد انیس[19] ہے جن میں سے بعض ایک رکن کی تکرار سے حاصل ہوتی ہیں بعض دو رکن کی تکرار سے۔ وہ بحریں جو ایک رکن کی تکرار سے حاصل ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) رمل فاعلاتن کی چار بار تکرار سے (۲) ھزج۔ مفاعیلن کی چار بار تکرار سے

(۳) رجز مستفعلن کی " " " (۴) کامل۔ متفاعلن کی " "

(۵) وافر مفاعلتن کی " " (۶) متقارب۔ فعولن کی " "

(۷) متدارک فاعلن کی "

وہ بحریں جو دو رکن کی تکرار سے حاصل ہوتی ہیں:۔

(۱) طویل۔ فعولن مفاعیلن ۴ بار پورے شعر میں۔ (۲) مدید۔ فاعلاتن فاعلن ۴ بار پورے شعر میں

(۳) بسیط۔ مستفعلن فاعلن ۴ 〃 〃 (۴) خفیف۔ فاعلاتن مستفعلن ۴ 〃 〃

(۵) مجتث۔ مستفعلن فاعلاتن ۴ 〃 〃 (۶) منسرح۔ مستفعلن مفعولات ۴ 〃 〃

(۷) مضارع۔ مفاعیلن فاعلاتن ۴ 〃 〃 (۸) مقتضب۔ مفعولات مستفعلن ۴ 〃 〃

(۹) سریع۔ مستفعلن مستفعلن مفعولات ۲ 〃 〃 (۱۰) قریب۔ مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن ۲ 〃 〃

(۱۱) جدید۔ فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن ۲ 〃 〃 (۱۲) مشاکل۔ فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن ۲ 〃 〃

تمام بحروں کو آسانی سے یاد کرنے کے لئے ایک قطعہ میں موزوں کر دیا ہے:۔

ہزج۔ رجز۔ متقارب۔ مشاکل و مجتث   مضارع و متدارک قریب اور مدید

طویل و مقتضب و وافر خفیف و رمل ہے   بسیط و منسرح و کامل و سریع و جدید

تقطیع

لغت میں تقطیع کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں اور اصطلاح عروض میں کسی شعر کے اجزاء کو اس کے بحر کے ارکان کے اجزاء کے برابر رکھنے اور تولنے کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہ متحرک متحرک کے مقابلے میں ساکن ساکن کے مقابلے میں رہے۔ زبر۔ زیر۔ پیش کا اختلاف شمار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً "اگر تم نے" بروزن مفاعیلن ہے۔ "اگر" "مفا" کے مقابلہ میں۔ "تم" "عی" کے مقابلہ میں اور "نے" "لن" کے مقابلہ میں آئے گا۔ تقطیع میں حروف ملفوظہ کا اعتبار کیا جاتا ہے مکتوبہ کا نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ تاریخ میں مکتوبہ کا لحاظ ہوتا ہے اور ملفوظہ کا نہیں ہوتا۔ الف ممدودہ دو حرف کے برابر شمار ہوگا۔ اور "آدم" بروزن "فاعل" ہوگا۔ کسرہ اگر اشباع کے ساتھ ہوگا ایک حرف شمار ہوگا۔ واو عاطفہ اگر کھینچ کر پڑھا جائے گا ایک حرف شمار ہوگا ورنہ نہیں۔ مشدد دو حروف کے برابر ہوگا۔

واو معدولہ جیسے خواب و خور کا واؤ ساقط ہو جائے گا اور "ہائے" مختفی مثل "گریہ" و "خندہ" کے اگر کھینچ جائے گی حرف شمار ہوگی ورنہ صرف حرکت رہے گی۔ نون ساکن اگر حرف مدہ کے بعد آئے گا ساقط ہو جائے گا۔ ہر وہ "ن" جس کے قبل ایک حرف ساکن ہوگا جب درمیان

بیت آ جائے گی متحرک شمار ہوگی۔ اگر بعد حرف مدہ کے دو حرف ساکن ہوں جیسے "دوست" اور "ساخت" میں اور درمیان شعر آئیں اگر وہ دونوں ساکن دو متحرک کے درمیان آئیں گے تو دونوں متحرک شمار ہوں گے۔

نوٹ:۔ حروف مدہ اس حرف علت (واؤ۔ الف۔ ی) کو کہتے ہیں جس سے ماقبل کی حرکت اس حرف کے موافق ہو یعنی واؤ کا ماقبل مضموم۔ الف کا ماقبل مفتوح اور "ی" کا ماقبل مکسور ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تقطیع کرنے والا بحروں کے اوزان اور ان کے ارکان اور زحافات کو بخوبی واقف ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ تقطیع حقیقی اور غیر حقیقی میں فرق نہ کرسکے گا۔

زحافات

"زحف" کے لغوی معنی تیر کا نشانے سے دُور پڑنا ہے۔ اصطلاح عروض میں ارکان کے تغیر و تبدل کو کہتے ہیں خواہ وہ تغیر کچھ بڑھانے گھٹانے یا متحرک کو ساکن کرنے سے پیدا ہوتا ہو۔ مثلاً فعولن سے فعُولان یا فعُولن سے فعَل یا مفعولاتُ سے مفعولات۔

زحافات کی ضرورت یوں ہوتی ہے کہ بعض سالم بحریں اپنی اصلی حالت میں خوبصورت نہیں معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں تھوڑا تغیر کر دینے کی وجہ سے دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں زحافات کے ذریعہ سے ایک وزن سے دوسرا وزن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے متعلق اسی قدر جان لینا کافی ہے۔

نظم

نظم کے لغوی معنی موتی پرونے کے ہیں اور متحد و آراستہ کرنے کے، چونکہ شاعر کلام میں الفاظ کو اس طرح سے یکجا کر کے آپس میں منسلک کرتا ہے کہ ان میں موزونیت پیدا ہو جائے اس لئے اصطلاح شاعری میں نظم کلام موزوں کو کہتے ہیں۔ زمین نظم بحر شعر سے کنایہ ہے زمینِ سخن زمین غزل بھی مستعمل ہے۔

شعر

شعر بکسر شین کے معنی جاننے یا کسی چیز کی واقفیت کے ہیں اصطلاح میں اس سخن موزوں کو کہتے ہیں جو بامعنی ہو اور بالقصد کیا گیا ہو شعر میں دو حصے ہوتے ہیں۔ ہر ایک مصرعہ کہلاتا ہے۔ شعر کی تحریک چونکہ جذباتِ انسانی کے متعلق تھی اور جذبات کی ابتدا وجود انسانی کے ساتھ ہی لہٰذا شعر گوئی کی ابتدا بھی اسی زمانہ کی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا مرثیہ حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے

بیل کے قتل پر بزبان سُریانی لکھا تھا۔ فارسی کا سب سے پہلا شعر بہرام گور شاہ عراق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی غزل حکیم ابوحفص سغدی نے کہی تھی اور سب سے پہلا قصیدہ رودکی نے کہا تھا۔

زبان اُردو میں شاعری کی ابتدا و نشوونما ملک دکن میں ہوئی اور سب سے پہلا شاعر جس نے شاہانِ دکن کے بعد باضابطہ شعرگوئی شروع کی تھی۔ ولی دکنی تھا۔ اُردو شعر کے حضرت امیر خسرو بھی موجد کہے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی پہیلیاں بھاشا میں بکثرت موجود ہیں، زبان بھاشا رفتہ رفتہ ترقی کرکے اُردو بن گئی۔

اقسامِ شعر

فرد۔ فرد کے معنی اکیلے کے ہیں۔ فرد اس اکیلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم وزن ہوں خواہ قافیہ ہو یا نہ ہو۔ مثال :- (ذوق)

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا ‏ ‏ ‏ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اب تو کعبہ بھی رہ گیا پیچھے ‏ ‏ ‏ گھر ترا کتنی دور ہے یا رب ‏ ‏ (اثر)

بیت۔ بیت وہ کلام موزوں ہے جس کے ہر دو مصرعے ہم وزن ہوں اور قافیہ رکھتے ہوں۔

مثال:۔ (میر حسن)

کروں پہلے توحید یزداں رقم ‏ ‏ ‏ جھکا جس کے سجدہ کو اول قلم

مصرع۔ بیت یا فرد کے نصف حصہ کو کہتے ہیں۔ لغوی معنی کواڑ کا ایک پٹ۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح کواڑ کے دو پٹوں سے دروازہ بند کیا جاتا ہے اسی طرح دو مصرعوں سے شعر مکمل ہوتا ہے۔ پہلے مصرعہ کو مصرعۂ اوّل دوسرے مصرعہ کو مصرعۂ ثانی کہتے ہیں۔

مصرع طرح۔ وہ ہے جس پر غزل کہی جائے۔

مصرع گرہ۔ وہ ہے جو طرح کے مصرع پر لگایا جائے۔ مثال مصرعہ

کہیں مسعود اچھا عشق کا بیمار ہوتا ہے ‏ ‏ (مؤلف)

رُباعی۔ اس نظم کو کہتے ہیں جس کے چاروں مصرعے ہم وزن ہوں۔ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ تیسرے مصرعہ میں خواہ قافیہ ہو یا نہ ہو رُباعی کا چوتھا مصرعہ سب سے اچھا ہونا چاہئے۔

رُباعی کی ایجاد عہد صفاریہ میں ہوئی۔ یعقوب بن لیث صفار کا ایک بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ اتفاقاً ایک اخروٹ جو گچی میں سب کے بعد جا کر گرا اس کو دیکھ کر بچہ کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو" یعقوب نے شعرا کو بُلا کر پوچھا کہ یہ کس بحر میں ہے انھوں نے کہا ہزج میں۔ چونکہ یعقوب کو بچے کی زبان کا نکلا ہوا مصرعہ پسند آیا۔ لہٰذا تین مصرعے اور لگا کر اُس کا نام رُباعی کر دیا۔ اور اوّل میں دوبیتی نام رکھا۔ عرصہ تک یہی نام رہا بعد کو رُباعی ہو گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ رُباعی کا موجد استاد رودکی تھا۔

رودکی کی روایت بھی اسی سے ملتی ہوئی ہے کہ لڑکے جہاں کھیل رہے تھے وہ اس طرف سے گزرا اور اُس بچہ کی زبان سے جو دوسری روایت میں مذکور ہے۔ یہی مصرع سُنا اور اس سے اس وزن کا استخراج کیا۔ رُباعی کے اوزان مقرر ہوتے ہیں۔ بحر ہزج سے ۲۴ وزن نکالے گئے ہیں۔ رُباعی کے مصرعے عموماً لاحول وَلا قوۃ الا باللہ کے وزن پر ہوتے ہیں، رُباعی کو ترانہ بھی کہتے ہیں۔ مثال

بھو نچے جو ترے در پہ وہ ممتاز ہوئے
رکھا جو قدم سر پہ سرفراز ہوئے
یہ کعبہ کہاں اور کہاں ہم مجرم
سامان یہ قسمت سے خدا ساز ہوئے

(امیر مینائی)

تو نے مجھے عمر جو عطا کر دی تھی
وہ نذرِ گناہ اے خدا کر دی تھی
اب تو بھی کرم کی انتہا کر دینا
میں نے بھی خطا کی انتہا کر دی تھی

(عبد آلباری آسی)

مثنوی

مثنوی کے لغوی معنی تثنیہ کیا گیا۔ مثنوی اصطلاح میں متفق الوزن ابیات کے مجموعے کو کہتے ہیں جس کے ہر بیت کا قافیہ جدا گانہ ہو۔ دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مضمون مسلسل ہو ابتدا میں حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مناجات۔ سلطانِ وقت کی مدح بھی اکثر ہوتی ہے۔ مثلاً مثنوی گلزار نسیم وغیرہ۔ مثنوی کے اوزان بھی مثل رُباعی کے مقرر ہیں۔ چنانچہ سات اوزان ہیں جن میں مثنوی ہوتی ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔

غزل

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا۔ اور بعضوں کا قول ہے کہ غزل ایک عربی شخص کا نام تھا جو عشق بازی میں مشہور تھا۔ لہٰذا اُسی کے نام کی وجہ سے غزل ایسے کلام کو کہنے لگے جس میں حسن و عشق کی باتیں ہوتی ہیں۔ اصطلاح میں وہ اشعار جن میں حسن و عشق، وصال و فراق۔ ذوق و اشتیاق جنون و یاس کی باتیں جو عشق سے متعلق کی جائیں غزل میں ہر شعر کا مضمون جداگانہ ہوتا ہے۔ علاوہ ان اشعار کے جو قطعہ بند ہوں۔ لیکن غزل میں قطعہ بند اشعار بہت کم ہوتے ہیں۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع آخر کو مقطع۔ اور سب سے عمدہ شعر کو **شاہ بیت یا بیت الغزل** کہتے ہیں۔

مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرع میں قافیہ ہوتا ہے۔

مقطع میں شاعر اپنا **تخلص** ظاہر کر کے غزل کو ختم کرتا ہے۔ اس میں کم از کم پانچ شعر اور زیادہ سے زیادہ اکیس یا پچیس شعر ہوتے ہیں۔ اشعار کی تعداد ہمیشہ طاق ہوتی ہے۔ مطلع کے بعد والے شعر کو "زیب مطلع" یا "حسن مطلع" کہتے ہیں۔ "تخلص" کے لغوی معنی رہائی پانے کے ہیں

تخلص۔ اس مختصر نام کو کہتے ہیں جس کو شاعر نظم میں اصلی نام کی جگہ لکھتے ہیں۔ مثلاً **مسعود** ایک جزو ہے مسعود حسن اصلی نام کا یا جیسے پنڈت جگ موہن ناتھ صاحب رینا نے دوسرا لفظ **شوق** اپنا تخلص مقرر کیا ہے۔

قطعہ

قطعہ کے لفظی معنی کاٹنا۔ اصطلاح میں اشعار کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جس کے آخری تمام مصرعوں میں قافیہ ہو پہلے مصرعہ میں قافیہ نہ ہو۔ قطعہ میں مطلع اکثر نہیں ہوتا ہے۔ اس میں کم از کم دو شعر ہوتے ہیں زیادہ کی تعداد مقرر نہیں۔ بعض قطعات میں دونوں ابتدائی مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ مثال

ہوئی ایسی خوشی ۱ اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے (ذوق)

ریختی

غزل کی ایک بگڑی ہوئی شکل۔ وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں کہی جاتی ہے۔ پہلے شعر اردو کو ریختہ کہتے تھے کیونکہ مختلف زبانوں سے اِسے مرکب کیا ہے، ریختہ کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ چونکہ اِن [illegible]

میں عربی فارسی ترکی وغیرہ کی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔اس لئے ریختہ نام رکھا۔مثال (جانصاحب)

روز پھر آتی ہے لونڈی مری جاکر خالی بھاڑ میں جائے کرایہ وہ کریں گھر خالی

رنگین۔

میں وہ تو اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی باجی مجھے منگا دو جھلا جھل کی اوڑھنی

قصیدہ

لغوی معنی دلدار گودا۔اور بعض کہتے ہیں کہ قصیدہ قصد سے مشتق ہے۔اصطلاح شعرا میں اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف یا مذمت یا وعظ و نصیحت ہو یا شکایت روزگار وغیرہ۔اس کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے۔ابتدائی اشعار کو تشبیب یا تمہید کہتے ہیں۔جہاں سے تعریف شروع ہو اس کو گریز یا مخلص کہتے ہیں۔

گریز

یہ وہ مقام ہے جہاں سے شاعر ایک مطلب سے دوسرا مطلب بیان کرتا ہے مگر اس خوبصورتی سے کہ پہلی باتوں کے سلسلہ کے ساتھ دوسری باتیں شروع ہو جائیں۔اور گریز ہی کی خوبی قصیدے میں بہت ضروری ہے۔قصیدہ میں کم از کم پندرہ اشعار ہوتے ہیں۔آخر میں یا آخر کے قریب شاعر کا تخلص ہوتا ہے اور آخری اشعار بیشتر دعائیہ ہوتے ہیں۔اگر قصیدہ میں لام ہے۔مثلاً کنول وغیرہ تو قصیدہ قصیدہ لامیہ کہلائے گا۔اور اسی طرح دیگر حروف کے ساتھ منسوب کیا جائے گا۔اگر ردیف آفتاب ہے تو شمسیہ۔بہار کا مضمون ہے تو بہاریہ کہلائے گا۔اس کے علاوہ عشقیہ۔حالیہ۔جہاں آشوب وغیرہ بھی قصیدہ کی قسمیں ہیں (قصیدہ و گریز کی مثال دیوان میں ملاحظہ ہو)۔

ترجیع بند

ترجیع کے معنی لغت میں رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔اصطلاح شعرا میں ان چند اشعار سے عبارت ہے جو بطور غزل ہوتے ہیں جن کے نیچے بیت ہوتی ہے اور یہی بیت ہر بند کے بعد آتی ہے اور بلحاظ مضمون مربوط ہوتی ہے اور اس بیت آخر کو اردو میں ٹیپ بھی کہتے ہیں۔مثال (جلال لکھنوی)

نازکرتی ہوئی چلتی ہے نسیم گلشن بلبلیں وجد میں ہیں مست ہیں طاؤس چمن

فرط شادی سے ہر اک کبک ہی کیا قہقہہ زن ترک کرتی ہی نہیں فاختہ دم بھر یہ سخن

ہتو جشن طرب اندوز مبارک باشد
بعد و نالہ جاں سوز بہار ک باشد

ترکیب بند

مثل ترجیع بند کے ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں ہر بند کے بعد نئی بیت آتی ہے۔ ترجیع بند میں
بار ایک بیت آتی ہے۔ مثال (امیر مینائی)

جب تک کہ چاند چہرہ کو روشن بیاں کہیں — جب تک دہن کو میم عدم نکتہ داں کہیں
ابرو کو اور مژہ کو خدنگ و کماں کہیں — جب تک نگاہِ یار کو شاعر سناں کہیں

مثل کماں نہ جو ترے آگے جھکا ہے
اس کا جگر نشانۂ تیر قضا ہے

مستزاد

لغوی معنی بڑھایا گیا، زیادہ کیا گیا۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرعہ کے بعد دو
ب لفظ بڑھا دیئے گئے ہوں یا ایسا ٹکڑا لگا ہو جو اسی مصرعہ کے رکن اول یا رکن آخر کے برابر ہو
مضمون سے مربوط ہو۔ مثال

جبریل ز آسماں فرود آمد و گفت — ای ختم رسل
فرزند بخانۂ خدا پیدا شد — ماشاء اللہ

مسمط

لغوی معنی موتیوں کا لڑیوں میں پرونا۔ سمط دھاگا جس میں پوت یا موتی پروتے ہیں مسمط اس بیت
و کہتے ہیں جس میں تین یا چار جگہ ایک قسم کا قافیہ ہو۔ اس میں تین مصرعے سے لے کر دس مصرعے تک
وتے ہیں اور تسمیط کے معنی جمع کرنا اور اصطلاح شعرا میں جمع ہونا چند مصرعوں کا جو ہم وزن و ہم قافیہ ہوں
ور اس بیت یا مصرعہ کا قافیہ جو آخر میں ہو مختلف ہو ان اشعار اول کے قوافی سے۔ اس کی آٹھ قسمیں
یں۔ مثلث۔ مربع۔ مخمس۔ مسدس۔ مسبع۔ مثمن۔ متسع۔ معشر۔

مثلث ۔ لغوی معنی سہ گوشہ، تکونہ۔ اصطلاحاً اس نظم کو کہتے ہیں جس میں تین مصرعے ہوں
ور پہلے دو ہم قافیہ ہوں۔ مثال۔ (ظفر)

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

مُربّع ۔ لغوی معنوی چوکور وہ نظم جس کے چاروں مصرعے ہم وزن و ہم قافیہ ہوں یا وہ نظم ہے جس کے پہلے تین مصرعے ہم قافیہ اور چوتھا الگ ہو۔ مثال (دبیر)

بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب
سو دل کے مرثیہ کا تو ممکن نہیں جواب
بفضلِ حق سے مرثیہ یہی ہے انتخاب
کافی ہے تجھ کو بخشش محشر کے واسطے

مخمّس ۔ لغوی معنی پنج گوشہ ۔ اس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں ۔ پہلے چار ہم قافیہ ۔ پانچواں علٰحدہ ۔ کسی شعر پر خواہ اپنا ہو یا کسی دوسرے کا تین مصرعے لگائے جاتے ہیں جو اس شعر کے مصرعہ اول کے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ مثال (مسعود)

اس سرزمیں کو دیکھئے حاصل ہے یہ کمال
جا کر یہاں سے پھر نہ کوئی آئے کیا مجال
پیشِ نظر ہے سب کے ہماری نئی مثال
مسعود ہم سے پوچھئے اس کی کشش کا حال
ہم لکھنؤ کو جا کے پھر آئے بندیلکھنڈ

مسدّس ۔ اصطلاح علم ہندسہ میں چھ ضلعوں کی شکل کو کہتے ہیں ۔ اصطلاح شعرا میں چھ مصرعوں کی نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوں ۔ آخری دو مصرعوں کے قافیے چار دوں مصرعوں کے قافیوں سے علٰحدہ ہوں ۔ مثال

قدا بسکہ روز قتل شہ آسماں جناب
نکلا تو خوں ملے ہوئے چہرہ پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب
روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

مُسبّع ۔ سات مصرعے والی نظم جس میں تین شعر ہم قافیہ ہوں اور ساتواں مصرعہ جداگانہ قافیہ رکھتا ہو ۔

مُثمّن ۔ وہ نظم جس میں چار مطلعے ہوں ۔ تین ہم قافیہ اور ایک جداگانہ ۔

مُتسّع ۔ نو مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں ۔

مُعشّر ۔ دس مصرعوں کی نظم جس میں چار مطلعے ہم قافیہ ہوں اور پانچواں مطلع جداگانہ ہو ۔

مرثیہ

مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت کا ماتم ہو ۔ اور پُر درد واقعات بیان کئے جائیں یعنی

مرنے والے کے صفات درد و حسرت کے ساتھ لکھے جائیں۔ مرثیہ اور قصیدہ میں صرف یہی فرق ہے کہ قصیدہ میں زندہ شخص کے فضائل درج کئے جاتے ہیں اور مرثیہ میں مُردہ کے۔ مثال۔ (دبیر)

اُس وقت تھی حسینؑ کی وہ آہ دلخراش | جس آہ سے جگر تھے فرشتوں کے پاش پاش
کاندھے پہ ایک لاش تو گودی میں ایک لاش | اک لاش ہاتھ آئی تو اک لاش کی تلاش

جس پر تباہی ایسی پڑے آہ کیا کرے
صابر حسینؑ سا ہو تو شکر خدا کرے

سلام

وہ صنفِ نظم ہے جو مرثیہ گویوں نے غزل کے انداز پر ایجاد کی۔ اس میں ہر طرح کا مضمون آسکتا ہے۔ زیادہ تر سلام واقعہ کربلا سے متعلق ہوتا ہے۔

نوحہ۔ یہ صرف بین ہوتے ہیں۔ یہ بطور غزل و مستزاد لکھا جاتا ہے۔

تضمین

لغوی معنی کسی کو ضامن کرنا۔ کسی کے شعر کو اپنے شعر میں لانا۔ اصطلاحِ شعرا میں کسی مشہور شعر کو اپنی نظم میں داخل کرنے کو کہتے ہیں۔ تضمین کا کمال یہ ہے کہ دوسرے کے شعر پر اس طرح مصرعے لگائے جائیں۔ جس سے معلوم ہو کہ یہ شعر اسی محل کے لئے نظم کیا گیا ہے۔ مثال (مؤلف)

مسعود کیوں پریشاں اس درجہ آج تو ہے | جلوہ نبی کا ہیہم آنکھوں کے رُو برو ہے
مخلوق کی زباں پر آوازِ ہاؤ ہو ہے | شورِ نشور برپا نواب چار سو ہے

کچھ غم نہیں ہے اپنا کہفِ اماں مدینہ

واسوخت

اصل میں عاشقانہ کلام کی ایک شاخ ہے۔ زیادہ تر مثمن یا مسدس ہوتا ہے اور اس میں معشوق سی بیزاری اور عاشق کی بے پروائی اور جلی کٹی کا ذکر ہوتا ہے۔ بقول مولانا حالی واسوخت عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے۔ واسوخت اور غزل میں یہ فرق ہے کہ واسوخت کا میدان وسیع ہے۔ اس میں غریب اور اجنبی الفاظ کی بھی کھپت ہو سکتی ہے۔ لیکن غزل میں کوئی لفظ غیر مانوس استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

ذوبحرین

وہ شعر یا کلام جو دو بحروں میں پڑھا جا سکے۔ اہلی شیرازی نے ایک مثنوی لکھی ہے۔ جس کا ہر شعر ذوقافیتین اور ذوبحرین ہے ؎

ساقی ازاں شیشۂ منصور دم　　　در رگ و در ریشۂ من صور دم

منقبت

(بفتح اول وسکون دوم وفتح سوم وچہارم) لغوی معنی تعریف وتوصیف اور اصطلاحِ شعراء میں اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں اہلِ بیت یا پیشوایانِ دین کی ثنا وصفت ہو اگر مدح رسول اللہ صلعم ہو تو نعت اور اگر تعریفِ خدا ہے تو حمد کہیں گے۔ (مثال منقبت مدحِ امام حسینؑ) ناصر زیدپوری

ہر مصیبت کو سمجھتا رہا تو اک نعمت　　　صبر اور شکر کا مفہوم بتانے والے
ہے عیاں ضبط کے پردے میں شجاعت تیری　　　جوہرِ صبر زمانہ کو دکھانے والے
تیرے سجدہ سے ہے خالق کی عبادت باقی　　　دینِ اللہ و پیمبر کے بچانے والے

مناجات

وہ نظم جس میں خدا کی تعریف اور اپنی فروتنی ظاہر کر کے التجا اور دعا کی جائے۔ (مثال مناجات امام حسینؑ)

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا　　　ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے البتہ جدا　　　اے خوشا بخت کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پر تیغ رہے سینہ پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے　　　(دبیر)

سہرا

(بالکسر) سہرا اصل میں داماد کو کہتے ہیں اُسی سے اس لفظ کا استخراج کیا اور وہ پھولوں کی لڑیاں ہیں جو دولھا دلہن کے سر پر سے منہ پر لٹکائی جاتی ہیں اور اصطلاح میں وہ نظم جو سہرا باندھنے کی تقریب میں لکھی جاتی ہے۔ مثال

(غالب)
خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

(ذوق)
اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

ہزل - وہ کلام ہے جس میں تمسخر پایا جائے۔

سجع

(بالفتح) لغوی معنی آواز قمری و کبوتر - اور اصطلاح فن بدیع میں وہ عبارت جس کے فقروں کی آخری کلمات قافیہ رکھتے ہوں - اور وہ فقرۂ نثر یا مصرع نظم جس میں کسی کا نام کچھ معانی و مناسبت کے ساتھ ہو بہترین سجع وہ سمجھا جاتا ہے جس میں روابط اور فعل نہ ہوں - مثال -

بروزِ قیامت محمد شفیع - محمد مکھن کے نام کا سجع - عالم ہمہ دوغ است و محمد مکھن -

فنِ تاریخ گوئی

تاریخ کے معنی لغت میں ظاہر ہونے اور ظاہر کرنے کے ہیں - لیکن اصطلاح شعرا میں تاریخ اُس صنعت کو کہتے ہیں جس کے ہر حرف کے عدد (بحساب ابجد) جوڑنے سے کسی واقعہ کے سال و سنہ کا اظہار ہو جائے - جس فقرے یا مصرع سے تاریخ نکلتی ہے اُسے "مادہ تاریخ" کہتے ہیں - پورے مصرع کا مادہ تاریخ جس میں تعمیہ تخرجہ نہ ہو بہتر سمجھا جاتا ہے - اگر مادۂ تاریخ میں کوئی عدد کم ہو اور اُسے کسی لفظ یا حرف سے پورا کریں تو تعمیہ یا تدخلہ کہیں گے - اور اگر کوئی عدد بڑھ جائے اُس کو خارج کرکے سنہ نکالیں تو تخرجہ کہیں گے - دس تک کا تخرجہ جائز ہے - اس سے زیادہ کا معیوب سمجھا جاتا ہے - تاریخ زیادہ تر بصورت قطعہ لکھی جاتی ہے - فنِ تاریخ گوئی کے موجد کا پتہ نہیں چلتا - اِس کی ابتدا عرب میں ہوئی، اُس کے بعد شعرائے فارس نے تاریخیں لکھیں - ہندوستان میں بعد اورنگ زیب محمد جعفر روحی نے تاریخ کہی تھی - وہ ہجری تاریخ ظہیر اور فصلی (ظہور) ہے - سنہ ہجری کی ابتدا ماہِ محرم سے ہوتی ہے - ہجری اُس سال سے مُراد ہے جب رسول اللہ صلعم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی تھی - اس سنہ کا رواج باقاعدہ زمانۂ حضرت عمر فاروقؓ سے شروع ہوا ہجرت رسولِ مقبول صلعم کے سترہ سال بعد یہ تاریخ مقرر ہوئی تھی -

سنہ فصلی کی ابتدا اکبر اعظم کے وقت میں ہوئی اُس وقت سنہ ہجری ۹۷۱ تھا - اِس کی ابتدا چیت کے ماہ سے ہوتی ہے اور جتنے سنہ ہجری اُس وقت تک گزر چکے تھے فصلی قرار دے دئے گئے تھے - ان سنوں میں فرق کی یہ وجہ ہے سال قمری، سال شمسی سے نو پل بچاس گھڑی دس دن چھوٹا ہوتا ہے - اس طرح ۳ سال بعد شمسی سال ایک مہینہ بڑھ جاتا ہے اور اس ماہ کی زیادتی کو لوند کہتے ہیں -

سال عیسوی کی ابتدا ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے یہ سال جنوری سے شروع ہوتا ہے۔
سنہ سمبت راجہ بکرماجیت کے وقت سے شروع ہوا اور سنہ عیسوی سے ۵۷ برس زیادہ ہے۔
اس کی ابتدا بھی چیت سے ہوتی ہے۔

تاریخ میں برخلاف تقطیع کے حروف مکتوبی معتبر ہوتے ہیں نہ کہ ملفوظی۔ یعنی جو حروف لکھے جاتے ہیں اُن کے اعداد لئے جاتے ہیں۔ اعدادِ حروفِ ابجد کو جُمّل (بضم جیم) کہتے ہیں جس کے آٹھ کلمے یہ ہیں:۔

ابجد	ہوز	حطی	کلمن	سعفص
ا، ب، ج، د	ہ، و، ز	ح، ط، ی	ک، ل، م، ن	س، ع، ف، ص
۱، ۲، ۳، ۴	۵، ۶، ۷	۸، ۹، ۱۰	۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰	۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰

قرشت	ثخذ	ضظغ
ق، ر، ش، ت	ث، خ، ذ	ض، ظ، غ
۱۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰، ۴۰۰	۵۰۰، ۶۰۰، ۷۰۰	۸۰۰، ۹۰۰، ۱۰۰۰

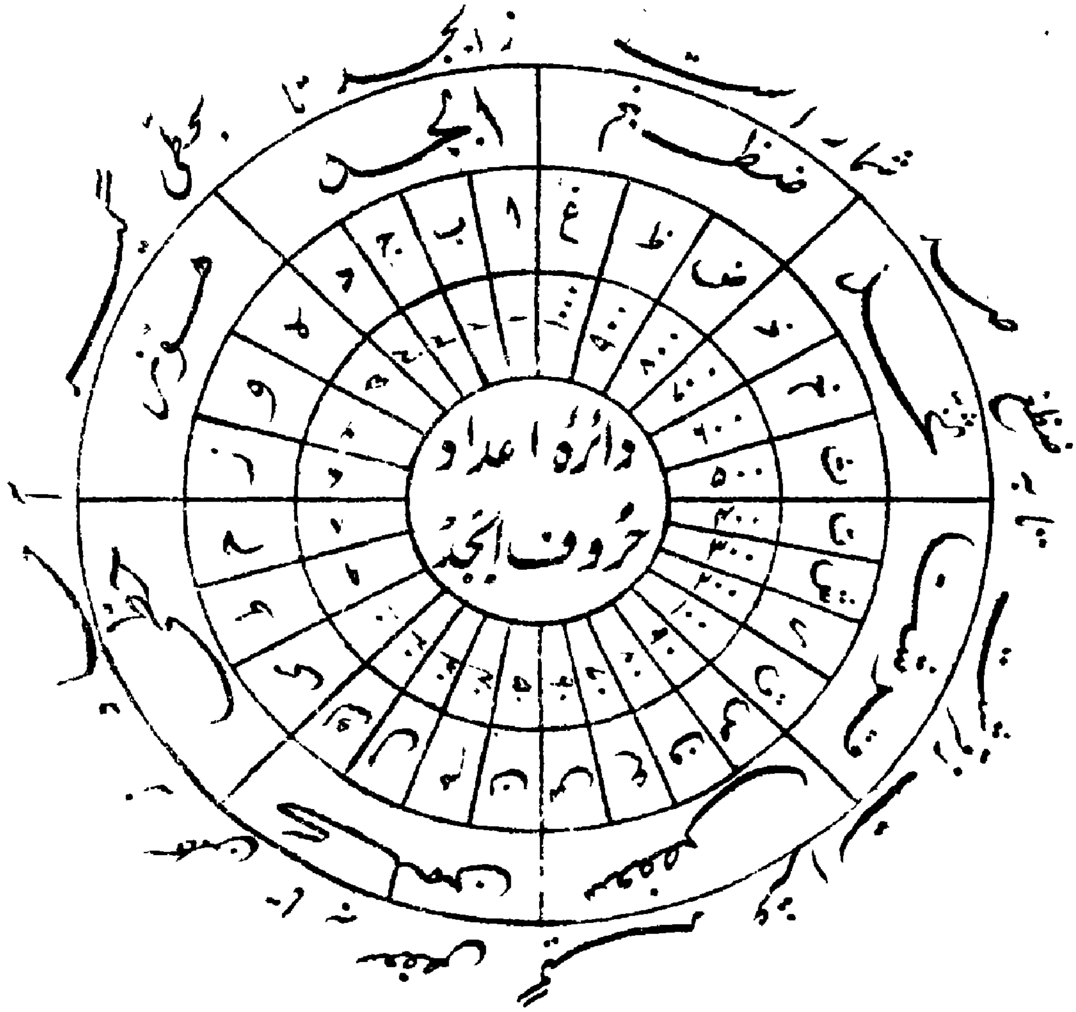
پ بجائے ب۔ ٹ بجائے ت۔ چ بجائے ج۔ ڈ بجائے د۔ ڑ بجائے ر۔ ژ بجائے ز۔
گ بجائے ک۔ محسوب ہوتا ہے یہ حروف مساوی الاعداد ہیں۔

کلماتِ ابجد کے معنی درج ذیل ہیں:۔

أَبْجَدْ	ہَوَّزْ	حُطّیْ
شروع کیا	ملا یا	واقف ہوا

کَلَمَنْ	سَعْفَصْ	قَرَشَتْ
سخن گو ہوا	جلد سیکھ لیا	ترتیب دیا

ثَخَذْ	ضَظَّغْ
دل میں لیا	تمام کیا



الف ممدودہ کے دو عدد بھی لئے جاتے ہیں اور ایک بھی۔ لیکن ایک لینا زیادہ بہتر ہے۔ کافِ یائیہ (کہ) میں بھی اختلاف ہے۔ بعض اہلِ فن کہتے ہیں ۲۰ لینا چاہئے۔ اور بعضوں کا خیال ہے بیس عدد لینا چاہئے۔ قولِ اوّل زیادہ قوی ہے۔ الف مقصورہ بجائے تی محسوب ہوتا ہے۔ ہمزہ چھوڑ دیا جاتا ہے اِس کے لئے کوئی عدد مقرر نہیں۔

تاریخ دو طرح کی ہوتی ہے صوری و معنوی۔ صوری میں الفاظ کے ذریعہ سے اور معنوی میں اعدادِ الفاظ سے سنہ و سال کا اظہار ہوتا ہے۔ (مثال تاریخ صوری۔ تاریخ بنائے مسجد)

پئے سال و ماہِ بنا صوری لکھو مسعود ہزار و سہ صد و پنجاہ و دو بماہِ صیام

مثال تاریخ معنوی ۱۳۵۲ھ (مسعود)

پئے تاریخ سالش گفت مسعود عبادت خانۂ معبود کعبہ
ایضاً ۱۳۵۲ھ (مسعود)

مسعود حسن خانۂ مسجود بنا کرد

تاریخ توشیح

اُس کو کہتے ہیں جس میں شاعر یہ التزام کرتا ہے کہ ایک قطعہ یا چند ابیات اس صورت سے ہوں کہ ہر مصرع کے حرفِ اوّل کے اعداد جوڑنے سے تاریخ نکل آئے۔ اس کی مثال ملاحظہ ہو دیوان میں مصنفہ ناصر زیدپوری۔

صنعتِ نادر

وہ صنعت ہے کہ اگر حروف کے اعداد معینہ کے حروف کے اعداد شمار کریں تو تاریخ نکل آئے جیسے ب کے دو عدد ہیں تو د + و (۴ + ۶ = ۱۰) کے جتنے عدد ہیں وہ لے لئے جائیں گے۔ اس طرح ب کے ۱۰ عدد ہو جائیں گے۔ مثال صنعتِ نادر (جوہر مُراد آبادی)

آرزو تھی بصنعتِ نادر — حال رحلت کا کیجئے ترقیم
ہاتفِ غیب نے کہا جوہرؔ — باغ جنت سے مل گیا تسلیم

زبر و بیّنہ

زبر تو یہ ہے جو عام طور سے رائج ہے یعنی ہر حرف کے اعداد لینا اور ہر حرف کے بعد جو رہ جائے وہ بیّنہ ہے۔ مثلاً آ میں تین حرف ہیں۔ ا۔ل۔ف۔ اگر الف میں ایک عدد لیا جائے تو زبر اور ہر حرف کے بعد کے حروف ل اور ف لئے جائیں تو بیّنہ ہے اور اگر دونوں کے اعداد لئے جائیں تو زبر و بیّنہ ہے

مثال—— ہائے افسوس اور اک بزمِ سخن کا شہ اُٹھا
۱۳۰۹ھ (جوہر مرادآبادی)

چند شعرا نے اس فن میں لزوم مالا یلزم سے بھی کام لیا اور پورے قطعہ کے ہر مصرع سے تاریخ نکالی لیکن ایسی تاریخیں بہت کم ہیں۔ ناصر زیدپوری نے اس صنعت میں ایک قصیدہ مولانا محمد سعید ابن شمس العلماء مولانا ناصر حسین صاحب کے مجتہد ہو کر نجف سے ہندوستان آنے پر قلمبند کیا تھا جس میں اُنھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ کہیں سے پتہ نہ چلے کہ کوئی لفظ عدد پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ چونکہ اہلِ ایران نے اس قصیدہ کی ادبیت کو تسلیم کر لیا ہے لہٰذا درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس قصیدہ کا ہر مصرع تاریخ ہے اور ۱۳۵۶ھ نکلتے ہیں۔

جامع التاریخ

قصیده در مدیح سلطان المحققین مولوی سیّد محمد سعید

نگاشتۂ ناصر زیدپوری

آمد بصحنِ گلشنِ تازه بهارِ علم — از بهر او خزاں نه بود لازوالِ علم
پیداست ایں بیان باحادیثِ مصطفیٰ — معلوم کن باہلِ درایت وقارِ علم
اہلِ ادب نیافته میراثِ انبیا — اکلیلِ فقه بود پئے ورثه دارِ علم
اوجِ سپہر بردِ بابِ العلوم یافت — آں شاهِ عدل شد بنجف همکنارِ علم
پُر نور شد ز جلوۂ او آفتاب و ماه — اکنوں بود بشمعِ ہدایت مدارِ علم
سوئے نصیر و ناصرِ ملت بلکھنؤ — آمد سعید خاصۂ حق از دیارِ علم
گردید قلبِ ناصرِ ملت ازاں قوی — فرزندا بحزبِ نجف شهریارِ علم
زیبِ سرِ فقیه شد تاجِ دینِ حق — واللّٰه شد بلطفِ علی تاجدارِ علم
زیبد ازاں چو شاهیِ تحقیق و علمِ فقه — باشد بکاملانِ کلام اعتبارِ علم
زیبا همیں خطاب باقبالِ اوجِ اوست — گویم مسلّم ست همایں در جوارِ علم
می نازد اجتهاد بریں عزّتِ کلام — قائم شده زاهلِ ادب اقتدارِ علم

مطلع

ناصر زبان ز مدیحِ تو اے سازگارِ علم — پیدا شد از کمالِ تو عزّ و وقارِ علم
گردد بنورِ ناصیه اتِ حُسنِ دیں عیاں — اے نجمِ هند قلبِ تو جائے قرارِ علم
نازاں شده بقوّتِ بازو نصیرِ دیں — اکنوں بود برادرِ تو نوبهارِ علم
ذاکر حسین عالمِ دیں زیدِ عزّ او — آگاه باش یافته عزّ و وقارِ علم
ساجد حسین صاحبِ عرفاں وفاشعار — حقّا بود برادرِ تو کامگارِ علم
معراج یافته ادب از همتِ بلند — تصنیفِ[عه] او فردِ جہاں یادگارِ علم

عه اشاره بسوئے معراج البلاغت و آں کتابیست از تصنیفاتش ۔

سر سبز باد نخل مراد ایزد جلیل — درگلشن وقار رساند بہار علم

تا صرپیہ وصف بحر معانی رقم کنم — پرُسند اعتبار ادیب از بحار علم

ہر مصرع سپت سال کہ این یمن او بود

تجویز شد قصیدۂ ما یادگار علم

ردیف و قافیہ

ردیف و قافیہ کو لازم و ملزوم کہا جاتا ہے

قافیہ ۔ کے لغوی معنی پے درپے آنیوالا۔ تقفو بمعنی پیچھے چلنا۔ اصطلاح میں یہ چند حروف و حرکات کا مجموعہ ہے جس کی تکرار بغیر استقلال الفاظ مختلف کے ساتھ آخر مصرع یا بیت میں پائی جائے بغیر استقلال اس لئے کہا گیا ہے کہ اگر کلمات مختلف نہ آئیں گے تو ردیف کہلائیں گے۔ خلیل بن احمد موجد علم عروض نے قافیہ کی یہ تعریف کی ہے۔

قافیہ اُن حرکات کا مجموعہ ہے جو حرف ساکن آخر بیت و حرکت ماقبل ساکن اول کے درمیان واقع ہو۔ مثلاً صاحبا و کاتبا میں پورا لفظ قافیہ ہے اور اگر آخر بیت میں دو ساکن ہوں تو مجموعہ اُن دونوں ساکنوں اور متحرک ماقبل ساکن اول کا قافیہ ہے۔ مثلاً "راست کاست" میں۔

حروف قافیہ نو ہیں جو اس قطعہ میں بیان کئے گئے ہیں ؎

قافیہ در اصل یک حرف ست وہشت آنرا تبع — چار پیش و چار پس این مرکز آنہا دائرہ

حرف تاسیس و دخیل و ردف و قید آنگہ روی — بعد ازاں وصل و خروج است و مزید و نائرہ

روی

قافیہ کا حرف اصلی ہوتا ہے جو آخر لفظ میں آتا ہے جیسے الفاظ "دل" اور "گل" کا لام "نور" اور "حور" کی رے۔ "دانا" و "توانا" کا الف بھی داخل روی ہے۔

تاسیس۔ وہ الف ہے جس کے اور روی کے درمیان ایک حرف متحرک کا واسطہ ہو مثلاً "کامل" اور "عامل" کا الف حرف تاسیس ہے۔

دخیل۔ وہ حرف ہے جو تاسیس اور روی کے درمیان کا واسطہ ہو۔ مثلاً "عامل" اور

"کامل" کا میم حرف دخیل ہے۔

ردف۔ روی کے پیشتر کا حرف ردف کہلاتا ہے۔ جیسے "شراب" و "شباب" میں الف "حبیب" و "نصیب" میں ی ردف ہیں۔

قید۔ علاوہ حرف ردف کے روی بلا فصل کو قید کہتے ہیں۔ جیسے "درد" و "سرد" میں ر "سخت" و "تخت" میں خ۔

روی۔ کی تعریف پہلے آچکی ہے۔

وصل۔ قافیہ میں اُس حرف زاید کو کہتے ہیں جو حرف روی کے بعد بلا فصل اُس سے ملا ہوا آئے جیسے "خدایا" کی ی۔

خروج۔ خروج وہ حرف ہے جو حرف وصل سے ملا ہوا بلا فصل آئے جیسے "مانے" اور "جانے" کے قافیے میں ن حرف روی۔ ا حرف وصل اور ی حرف خروج ہے۔

مزید۔ وہ حرف ہے جو بعد خروج اُس سے ملا ہوا بلا فصل آئے۔ جیسے "کہیں گے" میں ن خروج گ مزید ہے۔

نائرہ۔ لغوی معنی شعلہ۔ آگ کی لپک۔ بھاگنے والا۔ نکل جانے والا۔ اُس حرف کو کہتے ہیں جو بعد مزید اُس سے ملا ہوا بلا فصل آئے جیسے "بتائے گا" میں الف روی۔ ء وصل۔ ی خروج۔ گ مزید۔ الف ثانی نائرہ ہے۔

حدود قافیہ و حرکات قافیہ و القاب قافیہ کا بیان کوئی ضروری چیز نہیں ہے اور نہ اُن سے شاعر کو شعر گوئی میں مدد مل سکتی ہے۔

قافیہ معمولہ

وہ قافیہ ہے جس میں کسی تصرف کے بعد دوسرے لفظ کے ساتھ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔ مثلاً "تھانہ تھا"۔ "پیمانہ تھا" کے ساتھ "دریا نہ تھا" اِس کی دو قسمیں ہیں، ترکیبی و تحلیلی۔

ترکیبی۔ وہ ہے کہ ایک مصرعہ میں ایک قافیہ ہو اور دوسرے مصرعہ میں کسی لفظ کے ساتھ ترکیب دینے سے قافیہ حاصل ہو۔ مثلاً (مؤلف)

ہو نظر رحم کی ہم بھی ہیں مصیبت والے　　　تیرے دیوانے ہیں او تیرے ہی ہیں مت والے

بخت بیمار ہجر کا جاگا آ کے بیٹھی قضا سرہانے آج

تحلیلی ۔ وہ ہے کہ کسی لفظ کے دو ٹکڑے کر کے قافیہ بنایا جائے۔ ایک جز قافیہ میں رہے اور دوسرا ردیف میں۔ مثال (ناسخ)

پوچھا جو رو کے یار نے ناسخ کے حال کو ہنس کر کہا رقیب شقی نے گزر گئے

ایسے قوافی غزل میں ایک بار اور قصائد میں دو یا تین بار لانا جائز ہے۔

قافیہ شایگاں

وہ قافیہ ہے جس میں حرف زائد کو حرف اصل کے ساتھ قافیہ گردانیں جیسے "آہنیں" و "رنگیں" کا قافیہ "نسریں" و "چیں" کے ساتھ "گریاں" و "خنداں" کا قافیہ "زبان" و "فغاں" کے ساتھ۔ مثال

کروں اُس کے رتبہ کا کیا میں بیاں کھڑے ہوں جہاں باندھ صف مرسلاں

ذوالقافیتین

جس کے اشعار میں دو قافیے ہوں خواہ دونوں کے مابین ردیف ہو یا نہ ہو۔ مثلاً

الٰہی غنچہ امید بکشا گلے از روضۂ جاوید بنما

اس میں اُمید و جاوید پہلا قافیہ اور بکشا اور بنما دوسرا قافیہ ہے۔

عیوب قافیہ

ایطا

لغوی معنی پامال کرنا۔ مکرر کرنا قافیہ کا۔ کسی قافیہ کو لفظاً و معناً بتکرار لانا۔ ایطا کی دو قسمیں ہیں جلی و خفی

خفی۔ وہ ہے جس میں تکرار ظاہر نہ ہو جیسے "دانا" و "بینا"۔ "آب" و "گلاب"۔

جلی۔ وہ ہے جس میں تکرار ظاہر ہو۔ جیسے "زیباتر" و "خوشتر"۔ "یاران" و "عزیزاں" ایطا جلی عیب فاحش ہے۔ ہاں اگر اشعار بکثرت ہوں تو دو ایک جگہ ایسا قافیہ بضرورت و بفاصلہ لا چنداں معیوب نہیں ہے۔

ردیف

ردیف کے لغوی معنی وہ شخص جو ایک گھوڑے یا اونٹ پر کسی سوار کے پیچھے سوار ہو۔ اصطلاح میں جو لفظ جملہ قافیہ کے بعد مکرر مصرعوں کے آخر میں آئے۔ مثال

(۱) اعتبارِ زیست اے نادان کیا ہے کچھ نہیں
اک حبابِ آب ہے انسان کیا ہے کچھ نہیں } ردیف — مؤلف

نادان - انسان - قافیہ، کیا ہے کچھ نہیں - ردیف،

(۲) پیش کرتے ہیں اسی خوف سے ہم دل مقصود
آئینہ دیکھ کے ہو جائے نہ حیراں کوئی } مؤلف

حیران - قافیہ، کوئی - ردیف،

جو ردیف دو قافیوں کے درمیان ہو یا قافیہ سے پہلے ہو اُس کو ردیف حاجب کہتے ہیں اس کی مثالیں شاذونادر ہیں۔

تقابل ردیفین

جو غزل کی ردیف ہو وہی کسی پہلے مصرع کے آخر میں آجائے۔ اور یہ داخل عیب ہے۔ مثلاً

ہمارا وفاؤں میں ہمسر نہیں — تمہارا جفاؤں میں ثانی نہیں

عیوب سخن

مناقضہ

دو مصرعوں کے درمیان کی پستی و بلندی کو مناقضہ کہتے ہیں یعنی پہلا مصرع دوسرے کی نقیض ہو۔ ایک اُستاد کہتا ہے ؎

آں خواجۂ مبارک وآں شاہ نامدار — آں مہترِ مذہب و رکن مؤیدا

خواجہ ومہتر کو بادشاہ نہیں کہتے اور بادشاہ کو خواجۂ مہتر کہہ سکتے ہیں - دونوں مصرعوں میں تناقض ہے۔

تعقید

تعقید کی دو قسمیں ہیں لفظی ومعنوی - تعقید لفظی وہ ہے جس کے الفاظ کے استعمال میں خلل واقع ہو جائے۔ جیسے کسی کا مصرع ہے۔ "زور اُن کے اُدھر ہم جو بڑھیں گے تو گھٹیں گے" یعنی جو ہم اِدھر بڑھیں گے تو اُن کے زور گھٹیں گے۔ تعقید معنوی وہ ہے جس میں مضمون ومعانی کا اختلاف ہو۔ جیسے جامی

بیک جنبش دوبارہ سر نہ شودہ — چو مہ ہر روز از برجے نمودہ

ظاہر ہے ماہ ہر روز برج سے نہیں طلوع کرتا۔

تقدیم و تاخیر۔ مصرع اول کا مضمون مصرع ثانی میں اور مصرع ثانی کا مصرع اول میں ہو۔ جیسے ؎

چشمی ست کہ باید بر رخ ہر دو جہاں بست . گر رفتن ازیں خانہ دلے داشتہ باشد

پہلے مصرع کا مضمون دوسرے مصرع میں اور دوسرے مصرع کا پہلے مصرع میں ہونا چاہئے تھا۔

تخلیع۔ اُس کلام کو کہتے ہیں جو شاعر نے نامطبوع بحر میں نظم کیا ہو۔ مثال

بہار بود بچشم خزان ودے . گر شاد بود بردیم نگار من

تخالف۔ قواعدِ مقررہ کے خلاف نظم کرنا۔ جیسے سقوط عین بجائے الف۔ ع

پیرہن گل، تن گل عارض گل لب ولدار گل۔ عین تقطیع سے گر گیا۔

غرابت۔ کلام میں ایسے غیر مانوس کلمہ یا لفظ کا استعمال جو مناسب نہ ہو۔ جیسے خدا کو بجائے کریم سخی کہنا۔

ضعف تالیف۔ کلام کا روزمرۂ اہل زبان کے خلاف ہونا۔ جیسے بجائے کیجئے کے کریئے کہنا۔

سرقہ۔ کسی دوسرے کے مضمون کو بعینہٖ لے لینا۔ خواہ بہ تبدیلِ وزن۔ خواہ بہ تغیر الفاظ۔ اگر جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو سرقہ ہے اور یہ بہت معیوب ہے۔ اور اگر نادانستہ مضمون لڑ گیا ہے تو توارد ہے۔ بعضوں نے اسے بھی داخلِ عیب سمجھا ہے۔ مثال سرقہ یا توارد۔

غ۔ بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

ع۔ شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

تنافر۔ وہ حرف والفاظ جن کا تلفظ طبیعت و زبان پر گراں ہو یا ایسے دو متصل لفظ آجائیں جن میں پہلے لفظ کا آخر وہی ہو جو دوسرے لفظ کا حرف اوّل ہو۔ مثال

ع۔ جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی

اس مصرع میں کو کے کاف اور کھولے کے کاف کے ملنے سے عیب تنافر کی صورت پیدا ہوگئی۔

حشو۔ لفظِ زائد کو کہتے ہیں جس کے حذف کرنے سے کلام میں حسن پیدا ہو جائے۔ مثال ؎

انگڑائی لے کے اپنا مجھ پر نہ ہاتھ ڈالا . کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

اس شعر میں بس حشو ہے۔

شترگربہ۔ ایک چیز کو تحقیر و تعظیم اور جمع و مفرد دونوں کے ساتھ استعمال کرنا اس کو شترگربہ اس لئے
ہیں کہ اونٹ اور بلی میں جو مناسبت ہے وہی صیغۂ جمع و مفرد اور کلمات تحقیر و تعظیم میں۔ مثال

تیری باتوں کا کیا ٹھکانا ہے   آپ کا شاکی اک زمانہ ہے

اعلان نون۔ فارسی الفاظ میں عطف و اضافت کے بعد اعلان نون جائز نہیں۔ مثال
م العطف و الاضافت

ع۔ ہم آپ پہ قربان دل و جان کریں گے

ع۔ بادہ نوشی حاصلِ ایمان ہے

دونوں مصرعوں میں اعلان نون نہ چاہئے۔ بلا وقف و اضافت جائز ہے۔

توالیٔ اضافات۔ کلام میں پے در پے اضافتوں کا واقع ہونا۔ مثال

ع۔ میں ہوں سروِ ارسِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں

ن اس کا معیار یہی ہے کہ طبیعت پر اضافتیں گراں گزریں۔ ایسا نہو تو جائز ہیں۔

مبتذل۔ وہ مضامین جو مذاقِ سلیم سے دور ہوں۔ مثال

ع۔ ادا کون سی تجھ میں جانی نہیں

ذم کا پہلو۔ ایسا کلام جس سے ذم کا پہلو نکلے اور مضحک ہو جائے۔ مثال

ع۔ موسیٰ اسے پکڑیے ہوا حکم کبریا

متروکات

تلے	بجائے نیچے۔	سو	پس کی جگہ۔
واں۔ یاں	بجائے وہاں یہاں۔	اوپر	بجائے پر۔
صنم	بمعنی محبوب۔	دھرنا	بجائے رکھنا۔
حضور	خطاب بمعشوق۔	ولا۔ ناصحا۔ وغیرہ	
جناب		نے	بجائے نہ۔
سرکار		گر	بمعنی شاید۔
مری جان		جاگہ	بجائے جگہ۔
کیونکہ	بجائے کیونکر۔	تئیں	بمعنی تک۔
آئے ہی، جائے ہی	بجائے آتا ہے، جاتا ہے۔	وصلت	بجائے وصل۔
تلک	بجائے تک۔	عاقبت	بمعنی آخرکار۔

تھی	بجائے تھیں۔	کیجے، دیجے	بجائے کیجئے، دیجئے۔
میں	بجائے میں ہی۔	کہیو	بجائے کہنا۔
اسطرح پر	بجائے اس طرح۔	آوے	بمعنی آئے۔
مت	بمعنی نہ۔	ہوے، دیوے، لیوے،	بجائے ہو، دے، لے۔
پہ، پر	بمعنی مگر۔		
آن کر	بجائے آکر۔	مارے	بمعنی بسبب۔
تب	جب کی جگہ۔	آپ جیسا	بجائے آپ سا۔
آخرش	بجائے آخر۔	دل جگر	بغیر عطف۔
پنے	بجائے پن۔	لگ گئے	بجائے لگے۔
خوباں	بطور جمع بمعنی معشوق۔	لگنا	بمعنی معلوم ہونا۔
سالہا	بجائے سالہا سال۔	لگتا چلاہی	بجائے لگ چلاہی۔

صفات و تشبیہات

قد۔ نازک۔ بلند۔ ناز آفریں۔ چُست۔ چالاک۔ فتنہ زا۔ دلکش۔ دل آرا۔ دلفریب۔ رعنا۔ سرکش۔ شوخی پناہ۔ محشر پناہ۔ جامہ زیب۔ موزوں۔ کشیدہ۔ جلوہ ساز۔ سرو صنوبر۔ سرو شمشاد۔ سرو آزاد۔ سرو ناز۔ سرو سہی۔ عرعر۔ سدرہ۔ سناں۔ عصا۔ سرو۔ شاخِ گل۔ الف۔ تیر۔ قیامت۔ محشر۔ نخل۔ طوبےٰ۔

خرام۔ بہار۔ برق۔ نسیمِ صبح۔ نسیمِ سحر۔ نسیم۔ بادِ صبا۔ شمیمِ گل۔ رفتارِ آب۔

پیشانی۔ شگفتہ۔ کشادہ۔ گرفتہ۔ عرق آلودہ۔ آئینہ۔ صبحِ صادق۔ صبحِ عید، چاند۔ آفتاب۔ محرابِ کعبہ۔ لوحِ سیمیں۔ لوحِ محفوظ۔ بدر۔ زہرہ۔ مشتری۔

شکنِ پیشانی۔ تیغ۔ رگِ گل۔ موج۔

ابرو۔ دل آرا۔ دلکشا۔ دلکش۔ دلفریب۔ شوخ۔ پُرعتاب۔ عشوہ ساز۔ خمدار۔ حلقہ کمند۔ موج۔ قوسِ قزح خنجر۔ کلید۔ خطِ نسخ۔ شمشیر۔ نون۔ سورۂ نون۔ کمال۔ محراب۔ طغرا۔ طاق۔ ماہِ نو۔ ماہِ یکشنبہ۔ مدِ بسم اللہ۔ آئینہ۔ بیت۔ کماں۔ مصرعہ۔ ترازو۔ نیمچہ۔ مطلع۔ مہِ عید۔ شاخِ آہو۔ ہلال۔ بچھو۔ قضا۔ قوسِ قزح۔ خنجر۔ تیغ۔ نیشِ عقرب۔ مقراض۔ چوگاں۔ ناخن۔ کلید۔ قبلہ نما۔ بالِ ہما۔ بالِ شاہیں۔ قلم۔

مژگاں۔ کافر کیش۔ کج نہاد۔ کج۔ عشوہ ساز۔ زباں دراز۔ برگشتہ۔ تیز دست۔ سناں۔ دلدوز۔ دلجو۔ گرہ کشا۔ خونریز۔ خونخوار۔ نمناک۔ طوفاں طراز۔ نشتر۔ خدنگ۔ دشنہ۔ ترکش دوزن۔ خار زباں۔ بال سمندر۔ رشتۂ گوہر۔ جوئے موج۔ خنجر ناوک۔ شمشیر چوب۔ فلک۔ پیکاں۔ نیزہ۔ خار۔ خدنگ۔ نیش۔ مار الماس۔

ناک۔ شمع کافور۔ تیغ عریاں۔ بھالا۔ غنچۂ نرگس۔ غنچۂ خوشبو۔ غنچۂ گل۔ غنچہ یاسمیں۔ الف۔ عصائے سیم۔ موج۔ قلم۔

کان۔ جام بلور۔ صدف حسن۔ دہانِ مار۔ برگِ گل۔ ستارہ۔ نسترن پھول۔

دانت۔ دانۂ تسبیح۔ قطرۂ شبنم۔ موتی۔ الماس۔ دانۂ انار۔ سلک گہر۔ جگنو۔ اختر۔ ہیرے کی کنی۔ ژالہ۔ غنچہ یاسمیں۔ دُر۔ ستارہ۔ پروین۔ گوہر۔ غنچۂ نسترین۔ غنچۂ نسترن۔

خندہ و تبسم۔ برق۔ لمعہ۔ غنچۂ نیم شگفتہ۔ صبح۔

عارض۔ کعبہ۔ مصحف۔ شمع طور۔ گل سمن آفتاب۔ ماہ گل۔ آئینہ۔ شعلہ۔ مشعل۔ لالۂ ارغواں صبح گلستاں۔ گلشن۔ گلزار۔ چمن۔ باغ ارم۔

لب۔ شکر خا۔ شکر بار۔ شیریں۔ سحر آفریں۔ معجز بیان۔ گوہر بار۔ گوہر نثار۔ گوہر فروش۔ جاں پرور۔ جاں بخش۔ جاں فزا۔ روح پرور۔ روح فزا۔ تشنہ پرور۔ فریاد خیز۔ سیراب۔ دلنواز۔ موج تسنیم۔ موجِ آبِ حیات۔ موجِ شراب۔ رشتۂ جاں۔ شفق۔ انگر۔ آتش خاموش۔ دلکش۔ دشنام دہ۔ دلدار۔ عذر خواہ۔ دلستاں۔ نوشیں۔ مفرح یاقوت۔ شربت بنفشہ۔ گوہر شاداب۔ برگِ گل۔ رگِ گل۔ غنچہ جاں پرور۔ بدخشاں۔ شہد۔ نبات۔ قند۔ آبِ حیواں۔ خرما۔ پستہ۔ عقیق یاقوت۔ لعل عیسیٰ۔ انگبیں۔ نوشدارو۔ عناب۔ مرجاں۔ طوطی۔ تیغ۔

دہن۔ انگشتری۔ صدف۔ نقطۂ موہوم۔ صفر۔ عدم۔ کوزۂ نبات۔ شکر بار۔ شیریں۔ دلفریب۔ قطرۂ تنگ۔ حقۂ مرجاں۔ حقۂ یاقوت۔ حقۂ لعل۔ حقۂ مروارید۔ نمکداں۔ خنداں۔ تلخ۔ عنقا۔ پیمانہ۔ حقہ۔ ہیچ۔ مخزن اسرار۔ معما۔ میم۔ جوہر فرد۔ دل مور۔ چشم مور۔

خال۔ عنبریں۔ بلائے سیاہ۔ شب سیاہ۔ تخم امید۔ ہلال۔ کافر۔ ہندو۔ سنگِ اسود۔ نافہ۔ گوئے۔ سویدا۔ سپند۔ دارِ فلفل۔ کوکب۔ اختر۔ زاغ۔ کالا دانہ۔ افیون۔ بارود کا دانہ۔ زنگی بچہ۔ حبشی زادہ۔ نقطہ۔ مردمک۔

مانگ۔ خط استوا۔ خانۂ زنجیر۔ کہکشاں۔ نہر رواں۔ راہ ظلمات۔ سانپ کی لکیر۔ تجلی طور۔

زلف ۔ پُرپیچ ۔ سرکش ۔ آشفتہ ۔ اُفتادہ ۔ آتش پرست ۔ پُرخم ۔ پریشاں ۔ پیچاں ۔ مسلسل ۔ دودفریب ۔ جانفزا ۔ خمیدہ ۔ مارخفتہ ۔ دراز ۔ دل آرا ۔ دلبر ۔ دلربا ۔ بوستاں ۔ دلکش ۔ رسا ۔ رہزن ۔ سنبلستاں ۔ شکن درشکن ۔ شوخ ۔ شوریدہ ۔ عنبریں ۔ عنبرفام ۔ عیار ۔ فتنہ گیر ۔ کمند ۔ گرہ کشا ۔ گرہ گیر ۔ نیلگوں ۔ مشکیں ۔ بنفشہ ۔ تازیانہ ۔ ترازو ۔ اژدہا ۔ جادو ۔ چلیپا ۔ حبل المتین ۔ زاغ ۔ زنّار ۔ زنجیر ۔ دام غریباں ۔ شب ۔ شب قدر ۔ شبِ یلدا ۔ طاؤس ۔ طغرا ۔ طناب ۔ طوق ۔ ظلمت ۔ عقرب ۔ کافر ۔ مارِ سیاہ ۔ مارِ سیاہ ۔ طاقِ شام ۔ گھٹا ۔ کالی گھٹا ۔ لام ۔ اسلام ۔ سوادِ کعبہ ۔ سورۂ واللیل ۔ سلاسل ۔ عمر جاوداں ۔

سر ۔ بُرجِ ماہ ۔ گوئے خوبی ۔ گنبد ۔ کدو ۔ خطِ سحر راہ ظلمات ۔ خطِ استوا ۔ خطِ کہکشاں ۔ برقِ درخشاں ۔ تیغ ۔

موئے سر ۔ شب ۔ نیم شب ۔ شبِ دیجور ۔ شبِ یلدا ۔ ظلمات ۔ مشک ۔ عنبر ۔ دامِ مشکیں ۔ ابرِ سیاہ ۔

چشم ۔ آہوگیر ۔ تیرانداز ۔ کماندار ۔ ناوک فگن ۔ پُرخوں ۔ بلاجُو ۔ عربدہ جو ۔ عیار ۔ مردم آزار ۔ جفاکیش ۔ عاشق کش ۔ خونریز ۔ خونخوار ۔ قاتل ۔ ظالم ۔ غارت گر ۔ ستم گر ۔ شعبدہ باز ۔ جادوفریب ۔ مست ۔ مخمور ۔ میگوں ۔ مے پرست ۔ شرمگیں ۔ نیم خواب ۔ نیم باز ۔ بیمار ۔ ناتواں ۔ آہو ۔ جادو ۔ ہندو ۔ ترک ۔ بادام ۔ کافر ۔ فرعون ۔ نمرود ۔ اختر ۔ ہاروت ۔ چاہِ بابل ۔ ساغر ۔ شیشہ ۔ نرگس بیمار ۔ نرگس طناز ۔ نرگس شہلا ۔ صدف ۔ شاہیں ۔ آئینہ ۔ آہوئے فسوں ساز ۔ حرف صاد ۔ حرف عین ۔

پُتلی ۔ مسیحا درکنارِ مریم ۔

غمزہ ۔ عشوہ ۔ کرشمہ ۔

رخ ۔ دلفریب ۔ آتش بار ۔ خورشید پیکر ۔ گلرنگ ۔ گلگوں ۔ گلفام ۔ شگفتہ ۔ خنداں ۔ گلستاں ۔ یوسف ۔ آئینہ ۔ شعلہ ۔ عقیق ۔ مسجد ۔ قبلہ ۔

خط ۔ نودمیدہ ۔ سبز ۔ زنگاری ۔ عنبریں ۔ شبگوں ۔ مشکیں ۔ جاں پرور ۔ دلفریب ۔ بہار آفریں ۔ رازِ نہاں ۔ پروانۂ مراد ۔ آیۂ کرسی ۔ فصلِ بہار ۔ شب قدر ۔ بختِ سیاہ ۔ طغرا ۔ تقویم ۔ مصحف ۔ آبنوس ۔ لام ۔ طوطی ۔ زاغ ۔ پری ۔ ہلال ۔ ہالہ ۔ سُرمہ ۔ بنفشہ ۔ پردہ ۔ نقاب ۔ جدولِ مشکیں ۔ جدولِ عنبریں ۔ جدولِ زنگاری ۔ ریحاں ۔ خطِ غبار ۔ نامۂ خضر ۔ زمرد ۔ خطِ ریحاں ۔

زباں ۔ موجِ بحر ۔ شعلہ ۔ آتش ۔ برگِ گل ۔ ماہیٔ سُرخ ۔ کلید ۔ قفل ۔ برق ۔ لوح ۔ تیغ ۔

گردن - مینائے نور - صبحِ اُمید - صبح روشن - شمع کافور - صبحِ قیامت - صراحی - حُسنِ مطلع
شیشہ - بیاضِ سحر -
بر و دوش - صبح - برگ - سمن - نسترن - آئینہ -
بغل - برگِ سمن - برگِ گل - گلِ خنداں - گلِ شگفتہ -
بازو - توانا - کشورستاں - شہباز - سیم - شاخِ گل - سیم سادہ - گنجِ سیم -
کلائی - شاخِ صندل - شاخِ طوبیٰ - برگِ سمن - سیمیں - بلوریں - پُرنور - مرہمِ کافور - یدِ بیضا -
دست - گہربار - گہرپاش - گہرفشاں - دُرفشاں - دریابخش - سیمیں - بلوریں - نگاریں -
ی - حنابستہ - ورقِ نقرہ - برگِ گل -
سینہ - گنجینۂ راز - صفائے کعبہ - بیاضِ صبح - بلور - یاسمن - برگِ ترنج -
دل - آتش - آگاہ - آوارہ - آشفتہ - اشکبار - افتادہ - افسردہ - الفت خیز - اُمیدوار -
ں - بلاکش - بیتاب - بیقرار - بےصبر - بیرحم - بیدرد - بیدار - پُرجوش - پُرخوں - پُرشور - پُرغم -
اں - حیراں - خراب - خستہ - خودسر - خوں شدہ - خونبار - داغ دار - دردمند - دیوانہ -
ہ - ریش - زار - زخم خوردہ - زندہ - سوختہ - سوزاں - سرگشتہ - سوداز دہ - سودائی -
یدا - شادماں - صدچاک - صدپارہ - غم دیدہ - غم زدہ - فرزانہ - کامیاب - گرفتار - گرفتہ -
- لخت لخت - مجروح - محزوں - مبتلا - نازک - ناشاد - وارستہ - وحشت زدہ - ویراں -
ں - کشیدہ - ہرجائی - ہوشیار - قفل - ابجد - مچھلی - پارہ - آئینہ - شانہ - کنول - مرغِ قبلہ نما -
ں - پروانہ - کعبہ - برق - غنچہ - قطرۂ خوں - قندیلِ عرش -
اُنگلیاں - شاخِ مرجاں - شاخِ گل - رگِ گل - چنبیلی کی کلیاں -
ناخن - ہلال - شمشیر -
پاؤں - گلدستہ - لالۂ شگفتہ -
کمر - عنقا - رگِ جاں - معدوم - معمہ - خطِ استوا - رشتۂ جاں - مو - عدم -
شکم - مہتاب - مخمل - کافور - چشمۂ خورشید - آئینہ -
ناف - برگِ گل - چشمِ نرگس - گرداب - قفل - ساغر - غنچہ -
سُرین - کوہ - گوئے خوبی - لوح - خرمن - گلدستہ -
چہرہ - آفتاب - ماہتاب - آگ - صبح - گلشن -

مناسباتِ حُسن

بے مہری - بہانہ جوئی - فتنہ انگیزی - خوں ریزی - خود بینی - عشوہ - غمزہ - ناز کرشمہ - مسیحائی - کافری - خود نمائی - بیوفائی - چالاکی - سفاکی - سنگدلی - وعدہ خلافی - تلخ گوئی - دلبری - دلربائی - تندخوئی - رقیب نوازی - خونخواری - دل آزاری - خوش ادائی - ستمگاری - جفاکاری -

مناسباتِ عشق

حیرانی - پریشانی - سراسیمگی - سرگشتگی - بیچارگی - آہ - نالہ - فریاد - فغاں - بیتابی - زاری - ناتوانی - جانفشانی - جامہ دری - آرزو - شوقِ انتظار - درد - اندوہ - سُوزوگداز - تمنا - نیاز - صحراگردی - گریۂ نیم شبی - تنہانشینی - کوہ نوردی - عزلت نشینی - بےخودی - بے اختیاری - قلق - رنج - غم - صبر و ضبط - بےقراری - ہجر - بدگمانی - [ط۱]

"مسعود"

ط۱ جناب سید مسعود حسن صاحب کا مجموعۂ کلام "نغمۂ مسعود" شائع ہو گیا ہے - قابلِ مطالعہ ہے -

(مدیر)

قدیم اُردو

(دکھنی) میں "سیرۃُ النّبی" کا ذخیرہ

(از جناب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن)

مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃُ النّبی صلعم اُردو زبان کی ایک گراں بہا کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مولانا مرحوم ور اُن کے قابل جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے جو معلومات اس کتاب کے ذریعہ دنیائے اردو لے سامنے پیش کی ہیں وہ رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔ اور آنے والی نسلیں اُن پر فخر کریں گی۔ لمن اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "سیرۃُ النّبی" کے متعلق ہر زمانہ میں کتابیں ھی جاتی رہی ہیں۔

قدیم اُردو (دکھنی) میں اگر ایک طرف قصے کہانیوں کی مثنویاں لکھی جاتی رہیں، تو دوسری طرف قائد، فقہ، سیر وغیرہ کے متعلق بھی نظم میں معلومات پیش ہوتی رہیں۔ جیسے جیسے تحقیقات کا شوق بڑھ ہا ہے، معلومات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، جو علمی ذخیرہ بہ دست ہو رہا ہے وہ وہم و قیاس سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم نے بعض دوسرے مضامین میں قدیم فقہ کی کتابوں، رزمیہ مثنویوں اور اریخی ذخیرہ کو روشناس کر چکے ہیں۔ آج ہم "سیرت النّبی صلعم" کے متعلق جو کتابیں دکھنی زبان میں بدست ہوئی ہیں اُن کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

اس امر کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کسی رفارمر، کسی پیغمبر، اور کسی مصلح کے حالاتِ زندگی ور سوانح حیات اس قدر تحقیق اور کد و کاوش سے مرتب نہیں ہوئے ہیں جس قدر کہ عربی میں آنحضرت سول کریم" کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ مورخین، محدثین اور مفسرین نے آپ کے حالات جمع رنے اور اُن پر تنقیدی نظر ڈالنے، روایت اور درایت پر موشگافی کرنے رد و قدح کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غرضکہ آپ کی سیرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر متقدمین نے روشنی نہ ڈالی ہو ور اب عصرِ حاضر میں جو کام ہو رہا ہے وہ بھی اُردو زبان میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے، کیوں کہ

ڈاکٹر حمید اللہ ہاشمی ڈی فل نے "سیرت النبی" کے متعلق جو تحقیقات جاری رکھی ہے اور مستشرقین یورپ کے سامنے جو ذخیرۂ معلومات پیش کیا ہے وہ ایسا نہیں جس کو نظر انداز کیا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں اپنی بیش بہا معلومات سے اہل یورپ کی آنکھیں کھولدی ہیں وہاں اپنے ہم وطنوں کے لئے اردو میں بھی معلومات کو پیش کر کے اہل بصیرت کے لئے بہت کچھ سامان ضیافت فراہم کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اجداد نے جو کام "سیرت النبی" کا شروع کیا تھا اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اُن دکھنی کتابوں کا تعارف کراتے ہیں جو "سیرت مقدس" سے متعلق ہیں واضح ہو کہ قدیم زمانہ میں نثر سے زیادہ نظم سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس لئے علمی کتابیں بھی نظم میں زیادہ دستیاب ہوئی ہیں۔

(۱) روضۃ الانوار | یہ مثنوی ذکی دیلوی کی تصنیف ہے اور ۱۱۵۹ھ میں مرتب ہوئی ہے، ان کا نام میر ولی فیاض تھا، دیلور علاقہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ اولاً فوجی خدمت کے سلسلہ میں قلعہ دار ساتگڈھ کی ملازمت میں شامل رہا، اس کے بعد سدھوت آکر قلعہ دار سدھو کی ملازمت اختیار کی۔ نواب عبدالمجید خاں کے درباری شاعر کی حیثیت سے علمی کام میں مصروف رہا پھر چیت پٹہ (علاقہ مدراس) میں جو ان کی اپنی جاگیر تھی اقامت کر لی، اور وہیں انتقال ہوا۔ انکی کئی ایک تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں :-

روضۃ الشہدا، روضۃ الانوار، روضۃ العقبیٰ، دعائے فاطمہ وغیرہ۔

روضۃ الشہدا مشہور تصنیف ہے جس کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، اور اس کی طباعت بھی ہو چکی ہے۔ اس کی تصنیف ۱۱۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

روضۃ الانوار ان کی دوسری مثنوی ہے۔ یہ بہت نایاب ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں ایم اے، ایل ایل بی (علیگ) اسسٹینٹ لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) نے تفصیل کے ساتھ رسالہ معارف[1] میں روشنی ڈالی ہے، اور مولانا باقر آگاہ نے بھی اپنی تصنیف میں تذکرہ کیا ہے۔ جو معلومات رسالہ معارف سے حاصل کی گئی ہیں، ان کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

اس مثنوی کے اشعار کی تعداد (۲۲۴۰) ہے، مضامین کی فہرست طویل ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں :- ذکر نور نبی، ذکر واقعات در مدت حمل، ذکر ولادت، شیر خوردن، سفر شام،

---

[1] نمبرا - جلد ۴۹ -

ستگاری خدیجہ، ابتدائے وحی، اسلام حمزہؓ، اسلام عمرؓ، ہجرت، وفات بی بی خدیجہ،
راج، ذکر معجزات، جنگ بدر، جنگ احد، جنگ احزاب، جنگ بنی قریظہ، جنگ تبوک،
ت عائشہ، فتح خیبر، فتح مکہ، جنگ حنین، فتح طائف، حج الوداع وغیرہم۔

اس صراحت سے مثنوی کے اندرجات کا علم ہوسکتا ہے۔ معجزات کے بیان میں چالیس معجزے
ن کئے گئے ہیں۔ باقر آگاہ کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ ولی نے غیر معتبر روایات کو بھی اپنی
نیف میں جگہ دی تھی، چونکہ اُس زمانہ میں قصے کہانیوں کا زیادہ رواج تھا، اس لئے اس قسم کے
قعات سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ چونکہ موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہ مثنوی آنحضرت صلعم کی سیرت
پہلی مثنوی ہے۔ اس حیثیت سے اس کو ضرور اہمیت دی جانی چاہئے، نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

کئے یو نقل حضرت عمر خطاب
ہوا معراج کا جس دن خوشی باب

کیا حضرت رسول اللہ سوں میں سوال
نہانی راز ہا کا کچھ کرو قال

سو فرمائے کہ امت کا شکایت
کیا منجا ب بول دو دب عزت

کہ عصیاں در زہیں سب مل بہ خلوت
کریں دو انجمن میانی اطاعت

ولے میں پردہ پوشی میں ہوں ستار
ہوں دائم بخشش رحمت سوں غفار

علی مرتضیٰؓ سوں ہے یو منقول
سخن راز نہانی کا یو مدلول

گنہ کرتے تھے امتہائے پیشیں
عذاباں ترت ان پر تھے سو تعیین

کہ بعضے غرق ہو در آب طوفاں
ہو گیتے آب رود نیل غرقاں

کیتاں کوں صیحۂ جبرئیل سوں مار
ہوا بعضاں اُپر باران سنگسار

کیتے غرق زمیں ہیں مثل قاروں
چلے جاتے اچھوں تحت الثریٰ کوں

کیتاں کے تیں سو مسخ صورتاں کر
ہوئے تلپٹ سکتے از باد صرصر

کیتاں کوں بھیں سمیت اُٹھا کو مائے
جہنم کے لئے دو باٹ سارے

ولیکن تجھ امت کوں یا محمدؐ
بدی ان کی کوں کرنے کی ستی رد

تری امت ہیں مجھ کوں بہوت پیاری
غضب ہور قہر سوں یوہیں کنارے

روایت یوں سنے از خاتون جنت
کہ یوں تھے راز ہا و باعظمت

کہ میرے ہوں عنان رزق مقرر
ولے نیں اعتبار ان کا میرے پر

سدا ہیں رزق کے یو تنگ دوی میں
فکر سوں منتظر اس سنگ روی میں

بہشت ان کے رہیں کوں میں بنایا — سو یو سٹتے ہیں یاں دوزخ کا پایا
نڈر کر مجھ سوں لوگا نوں ڈریں یو — جو خلوت میں گناہاں نت کریں یو
نہ مانگوں میں صبا کا آج اعمال — یو مانگیں رزق ہفتہ ماہ ہور سال
میں ان کا رزق ان کو دیوتا ہوں — یو میری بندگی دیویں دوجی کوں
کہ یعنی ہے ریا سوں اس سوں نیکی — سو بے شک غیر کی ہے دو شریکی
ملائک ان کے بد اعمال ہر دم — کریں آ عرض مجھ سوں بیش ہور کم
کدھیں ہیں تیں کیا ان کی شکایت — فرشتیاں کے ان کے ان کی مذمت
پڑے ان پر مصیبت گر ذرا بی — ہوویں شکوہ منی کر اضطرابی
کریں سب خلق کوں احوال ظاہر — اپس کی قسمت اوپر نا ہو شاکر
تری امت کے کرداران شر میں — نہ دیکھیا غیر عفو و در گزر میں
مجھے لایا ہے کیا ہدیہ دنیا سوں — کہے لایا ہوں دو چیزاں بہت دول
یکے تقصیر امر بندگی ہے — دوجی عصیان کی شرمندگی ہے
کہا تقصیر میں رحمت ہے بھرپور — شفاعت سوں تری عصیاں کیا دور
کیے حضرت نبی پھر عرض یو واں — کہ سب امت کو بخش لے پاک سبحاں

کہیا بخشا یک حصہ آج کی رات
قیامت کوں دو حصہ از شفاعات[1]

اس تفصیل سے زبان کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق بھی معلومات ہو سکتی ہیں اور اسلوب بیان کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) اعجاز احمدؐ یہ مثنوی حیدر آباد کے شاعر شیدا کی تصنیف ہے۔ شیدا کا نام نوازش علی تھا۔ نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے میر ساماں تھے۔ "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔ جاگیر مرحمت ہوئی تھی، حیدر آباد کا بادشاہی عاشور خانہ جو قطب شاہی دور میں تعمیر ہوا تھا۔ آصفی دور میں آپ کی نگرانی میں تھا۔ منتظم عاشور خانہ کی حیثیت سے انھوں نے عزاداری اور

---

[1] از رسالہ "معارف" نمبر (۱) جلد ۵۴۔ مضمون غلام مصطفٰے خاں صاحب لکچرار امراؤتی (برار)

ثیہ خوانی کو بہت فروغ دیا۔ خود بھی مرثیے تصنیف کرتے تھے، ان کی بھی کئی کتابوں کا پتہ چلتا ہے
ن میں سے بعض یہ ہیں:۔

"روضۃ الاطہار"۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۱۴۳ھ میں ہوئی، یہ ضخیم مثنوی ہے اس کو صرف ۲۰۵ دن
میں تمام کیا تھا۔ اس میں شہادت امام حسین کے واقعات اور امام کے حالات لکھے گئے ہیں۔

"گلشن ایمان"۔ یہ بھی مثنوی ہے اس میں نعتیہ کلام اور معجزات جمع کئے گئے تھے، مگر یہ
کتاب نایاب ہے۔ اب تک کسی کتب خانہ میں ہمدست نہیں ہوئی۔

"اعجاز احمدی"۔ یہ مثنوی روضۃ الاطہار سے زیادہ ضخیم ہے اور اس کی تصنیف سنہ ۱۱۵۸ھ میں
ہوئی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں "آنحضرت صلعم" کی پیدائش سے چالیس سال کی
مر تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ نور محمدی، حمل، ولادت، رضاعت، شق صدر،
رحلت آمنہ، وفات عبد المطلب، آنحضرت کا تجارت کے لئے ملک شام کو جانا، خدیجہ کا نکاح،
حجر اسود کا نصب کرنا وغیرہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔

دوسری جلد بعثت سے ہجرت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں نبوت کی ابتدا، بی بی خدیجہ
اور حضرت علی کا اسلام لانا، ابو بکر صدیقؓ، عثمانؓ، وغیرہ کا اسلام لانا، آنحضرت کا قریش کو
دعوتِ اسلام دینا، قریش کا ظلم و ستم، ہجرت حبشہ، حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا، حضرت عمرؓ کا
ایمان لانا، سفر طائف، وغیرہ کا بیان ہے۔ بعثت کے سنین کے لحاظ سے ان کا تذکرہ ہوا ہے۔

تیسری جلد میں ہجرت سے وفات تک حالات درج ہیں، اس میں ہجرت کے سنین کے
لحاظ سے واقعات کا اندراج ہوا ہے، عبد اللہ بن سلام کا اسلام لانا، سلمان فارسی کا ایمان سے
مشرف ہونا، بی بی فاطمہ زہرہ کا عقد، جنگ بدر، جنگ احد، جنگ تبوک، حج الوداع، وفات وغیرہ
عنوانات قایم کئے گئے ہیں۔

جلد چہارم میں حالات بعد وفات، معجزات اور فضائل، زیارتِ تربت مقدس وغیرہ امور
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلی جلد اور دوسری جلد کا حجم (۱۰۵) اور تیسری جلد (۲۶۱) صفحے پر مشتمل ہے۔ عنوانات
فارسی نثر میں لکھے گئے ہیں۔ پوری مثنوی کے اشعار کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہوتی ہے۔ اس تفصیل کے
بعد اب ہم اس مثنوی کا نمونہ کلام پیش کرتے ہیں۔ ابو طالب کا آنحضرت کو اپنے ساتھ سفر میں لیجانا

رسولِ خدا کے سنوں کان دھر ہوئی جب تیرا برس کی عمر

ابو طالب اس وقت کیتے خیال / کہ جا شام کچھ مول لا بیچے مال
اتھی اون دونوں دھوپ سخت تے / کہے دل میں اپنے محبت ستے
محمد کوں یہاں چھوڑ جانا بھلا / کو گرمی سیں تا ہوئے وہ مبتلا
ولیکن جدائی کی طاقت نیں / پڑے اون پہ کوئی اس سیں آفت نیں
لگے سین لگا کر کینے کس سبب / تو گریاں ہے میرے سین...... اب
پیمبر نے کچھ نا کہے ہیں یہاں / پچھانے ابو طالب اون کا گماں
کہے دل میں تیرے یہ آئی ہے بات / سفر کوں نہ لیجاؤنگا اپنے سات
نبی نے کہے فکر تھی مجھ بھی / کہ جاوے گا کیونکر جدائی سہی
مجھے چھوڑ جاوگے کس کے اوپر / میں بے کس ہوں ناماں ہے ناہی پدر
ابو طالب اس وقت کھائے قسم / جدا تجکوں کرنا نیں ایک دم
سمجھتا ہوں مجھ تن کا ہے جان توں / نیں چھوڑ جاتا ہوں تن جان کوں
وہاں سیں سفر کا وہ سامان کیے / محمد کوں ہمراہ اپنے لئے
تھا بصرا سیں ایدھر کوئی کچھ کوس گاؤں / تھا وہ قافلے کے اترنے کا ٹھاؤں
تھا اس جائے پر ایک زاہد بڑا / نصارا کا تھا عالم اور مقتدا
بحرا تھا عالم میں مشہور نام / تھا توریت و انجیل از بر تمام
کتابوں ستے وہ پچھانتا اتھا / کہ آوے گا اس جا نبیرا لورا
وہ ہوویگا اس شکل داس......؟ / کرینگی نمود اس سیں پہ معجزات
توقع وہ رکھ کر ملاقات کا / بنایا تھا معبد بہوت سا بڑا

جنگ بدر کا حال

کھڑے آ کے میدان میں صف باندھ کر / لگے بجنے کرنائے جب ہر تدبر
یہ ہل بل کتیں کافروں کے بھا / صحابیوں کو بولے رسول خدا
پی نام خدا ہو تم اب سوار / کہ ہے فتح اعدا پہ وہ دیتے ہار
کہے بر رسول خدائے رہنیں / ہوئے مستعد سارے اصحاب دین
کھڑے آ کے کفار کے روبرو / پیاسی تھی سیدا نا نجوی عدد

حبیبِ خدا نے عصا اپنے ہات — صف آرائی کرتے تھے ترتیب سات
مناسب تھا جس شخص کا جو مکاں — دیتے بیچ اس کو وہ شاہنشہاں
سو ایک صحابی تھا آگے وہ بڑھ — کھڑا ہات شمشیر اپنی پکڑ
عصا اس کے سینہ پہ حضرت نے مار — کہے کیوں بڑا صف سے لے دیندار
یہ سنتے بھرا اور کہا التماس — مجھ اس ضرب سے دکھ ہوا قیاس
قصاص اس کا مجھ دیو یا مصطفےٰ — دیئے کھول سینہ رسولِ خدا
لیا دوڑ سینہ کا بوسہ سوار — لگا عرض کرنے کو ہو شاد شاد
تجھے آرزو تھی دمِ آخریں — کرے یہ دو کتیں پاؤں بادشاہ دیں

آنحضرت کی وفات کا تذکرہ

صحابہ کھڑے تھے باہر کر ہجوم — سنئے گھر کے اندر یہ ماتم کا دھوم
سبھی مل کے رونے لگے زار زار — لگے بولنے اس طرح سے پکار
کہ اے اہلِ بیت رسالہ مآب — ہوا وجہل کرو ہم کو تم باریاب
ہمارے نبی کا دیکھنا ہم جمال — ہے یہ وقت آخری کریں کچھ مقال
رسولِ خدا سن یہ فرمائے تب — ہوا وجہل بوا نہ صحابیوں کو سب
صحابی پہ حضرت کا احوال ایک — گئے [illegible] تم سے ایک ایک
نبی اُن کی دلداری کرنے لگے — دلاسہ دیتے تھے غمخواری کرنے لگے
کرے ایک ایک [illegible] — کئے رخصت ان کو عہد اسلام

کہ بعد از وفات رسولِ خدا — مسافر غریب ایک آیا چلا
تھا ڈالا ہوا منہ کے اوپر نقاب — کھڑا رہ کے مسجد میں ہو بے حجاب
صحابیوں طرف دیکھا بولا یوں میں — سلام علیکم اے اصحاب دیں
اگرچہ گئے چھوڑ تم کو رسول — کہ جن کے سبب تم ہو سارے ملول
ولیکن عوض چھوڑ کے حق کہتیں — ہے قیوم اور [illegible] تیں
کرو شکر اس کا دن اور رات — زباں پر بجز صبر مت لاؤ بات

وصی نبی تم میں ہے کون یاں | مجھے دیو اس شخص کا تم نشاں
ابو بکر پاس اپنے اس کوں بولائے | اشارہ علی کے طرف کر بتائے
علی کو کہا دیکھ وہ سب بھلے | سلام علیک یا فتا یا علے

اس کتاب کے مخطوطات حیدرآباد کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ "کتب خانہ آصفیہ" میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے (اردو سیر نمبر ۲۲۷) جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں اس کے چند حصے موجود ہیں، مکمل نسخہ نہیں ہے۔
شیدا کے حالات مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔

---

(۳) ہشت بہشت | یہ مثنوی مولانا باقر آگاہ کی تصنیف ہے، محمد باقر نام اور آگاہ تخلص تھا، ان کے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے، بیجاپور کی تباہی کے بعد آگاہ کے والد مولانا محمد مرتضیٰ ویلور (علاقہ مدراس) آگئے اور اسی کو وطن بنا لیا۔
آگاہ کی پیدائش اسی مقام پر ۱۱۵۷ھ میں ہوئی، علماء وقت سے آگاہ نے تعلیم حاصل کی اور شاہ ابوالحسن قربی کے مرید ہو کر روحانی تعلیمات کے فیض سے بھی متمتع ہوئے، عربی، فارسی اور اردو میں شعرگوئی کا ملکہ حاصل تھا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی پر صرف ونحو کے چار سو اعتراض کئے تھے، مگر اس کے باوجود ان دونوں میں خلوص اور اتحاد تھا، آگاہ نے اپنے کلام میں اس دوستی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے آگاہ نے شاعری شروع کی اور اپنے انتقال ۱۲۲۰ھ تک اردو زبان کی خدمت میں مصروف و منہمک رہے، آگاہ کی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) بیان کی جاتی ہے، ان میں (۱۶) کتابیں اردو (دکھنی) میں ہیں۔
آگاہ کے زمانہ میں ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کا دور دورہ تھا، مغل خاندان پر زوال آچکا تھا، اور اس کا چراغ گل ہو رہا تھا، اہل علم دنیا سے گزر رہے تھے، اور ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہ آتا تھا، سلطنت کی زبان فارسی نہ رہی تھی، اگرچہ عام طور سے اردو کا رواج ہو رہا تھا، مگر اقلیم اردو میں علم وفن کا ذخیرہ نایاب تھا۔ اہل فرنگ ہنوز اردو کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے، نہ تو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور نہ شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کی تفسیر قلمبند فرمائی تھی، عام طور سے تعلیم کی

ی تھی خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی میں جواب مادری
ان نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔
ر حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی۔

اس نقص کو معلوم کرنے والا، اس مرض کو دریافت کرنے والا، اس کے علاج پر کمر
ت باندھنے والا، اور اپنی تصنیفات سے اس کا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔
گاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو
می ضروری تصور کیا اور ان کے لئے خاص کتابیں لکھیں۔

آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیر، فقہ، عقائد پر
تعدد کتابیں تصنیف کیں اور پھر خاص طور سے ان کو عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا۔ آگاہ
کے زمانہ میں مبالغہ اور دروغ گوئی کلام کا خاص امتیاز تھا۔ اور جو کتابیں "واقعہ کربلا" اور
"سیرت" کی لکھی گئی تھیں وہ بھی صداقت سے دور تھیں، اس کے برخلاف آگاہ نے دروغ
گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے
مافی الضمیر کو ادا کیا۔ آگاہ کے قصائد، غزلیات اور مثنویاں اہم حیثیت رکھتی ہیں تفصیلی واقعا
کے لئے راقم کی کتاب "مدراس میں اردو" صفحہ ۳۳ تا ۵۷ ملاحظہ ہو۔

"ہشت بہشت" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ دراصل آٹھ رسالوں یا آٹھ جلدوں پر
مشتمل ہے اور ہر رسالہ ایک عمدہ نام سے لکھا گیا اور "سیرتِ مقدس" کے مختلف مباحث
پر مشتمل ہے۔ ان کی تصنیف ۱۱۸۴ھ سے ۱۲۰۶ھ تک ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) من دیپک = اس میں نور محمدی کا تذکرہ ہے۔
(۲) من ہرن = اس میں نبوت کی بشارتوں کا بیان ہے۔
(۳) من موہن = آنحضرت صلعم کی پیدائش کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
(۴) جگ سوہن = اس میں آٹھ سال کی عمر سے وفات تک حالات درج کئے ہیں۔
(۵) آرام دل = اس میں اخلاق و شمائل نبوی کا تذکرہ ہے۔
(۶) راحتِ جان = آنحضرت کے خصائص کا حال درج ہے۔
(۷) من درپن = اس میں معجزاتِ نبوی کا بیان ہے۔
(۸) من جیون = اس میں آنحضرت کے آداب اور آپ سے محبت رکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آگاہ نے ایک دیباچہ بھی نثر میں لکھا ہے، اس کا مختصر اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس دیباچہ سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں:۔

"بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں، لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں، اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے، اور ہر رسالہ کے وزن علحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے؛ چھ رسالے اوّل کے مدہ رسالہ تقریباً سنہ ایک ہزار ایک سو اور اسّی پر پانچ ہیں اور ایک ہزار و یک سو اور اسّی اور بیس میں بنے ہیں .... اور آخر ابتدا سنہ ایک ہزار اور دو سو اور چھ میں رسالہ "من درپن" اور رسالہ "من جیون" بنانے کا اتفاق ہوا، ان آٹھوں رسالوں میں تخمیناً آٹھ ہزار اور چھ سو پچاس بیت ہیں، اور مرثیوں کے ساتھ نو ہزار بیت ہوں گے۔ اور ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں، اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نیں ہیں۔

اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں کر کر سہل اور سرسری نہ جان کیا واسطے کہ تیرے معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں۔ اگر وہ تمام کتاباں تو دیکھے گا یا کسی سے سنے تو تجھے قدر ان رسالوں کی معلوم ہوگی۔"

جو امور اس سے واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(الف) ان رسالوں کی تصنیف سنہ ۱۱۸۷ھ سے سنہ ۱۲۰۶ھ تک ہوئی۔

(ب) ان رسالوں کے اوزان علحدہ علحدہ ہیں۔

(ج) کل اشعار کی تعداد نو ہزار ہے

(د) ان کو شمال کی اردو میں نہیں لکھا گیا بلکہ دکھنی میں لکھا گیا۔

(ہ) عربی کی معتبر کتابوں سے معلومات اخذ کر کے ان کی تصنیف ہوئی ہے۔

ایک دوسری مثنوی کے دیباچہ میں بھی آگاہ نے اپنی مثنویوں کو معتبر کتابوں سے اخذ کرنے کا اعتراف ان اشعار میں کیا ہے:۔

اے بھائی اکثر سب دکھنی کتابان بنانے والے بیان میں اپس بہت غلط کئے ہیں کر ان

زبان کو بے اعتبار کر دے۔ اس لئے علما، ان کتابوں کی طرف التفات نہیں کرتے، آج تک کوئی کوئی کتاب دکھنی صحیح و معتبر میری نظر میں آئی نہیں بعض ان سے سرتاپا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے، روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا اشد حرام ہے، شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل صحیح و معتبر و نہایت مضبوط و مدلل ہیں کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور نہیں کہ اس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے، . . . . .

. . . . . . ولی ویلوری و شیدائے حیدر آبادی دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھے ہیں ان کا نام " روضۃ الشہدا " اور " روضۃ الاطہار " ہے۔ مناقب عترت اطہار کے ان دونوں میں بہت کم ہیں، بلکہ نہیں ہیں۔ واقعات شہادت کے کچھ تفصیل کئے ہیں، اور اکثر بیان دونوں کا غلط اور بے اصل ہے۔ جیسا کہ انتقام چھنا عکاشہ کا آنحضرت سے . . . .

اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انکاری کے تئیں شیوہ اپنا کیا، تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائے سو لکھ گئے۔ اس جہت سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں، جیسا "حبیب السیر" "روضۃ الصفا" اور "روضۃ الشہدا" "

اس صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ آگاہ کو صحت کا کس قدر خیال تھا اور انھوں نے کس طرح دوسری کتابوں کے نقص کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہی کہ آگاہ نے غلط روایات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن آگاہ کے زمانہ کا ماحول آج کل کے ماحول سے مختلف ہے۔ اس لئے ممکن ہے جن امور کو آگاہ نے معتبر تصور کر کے لکھا ہے وہ آج درایت کی روشنی میں قبول نہ ہوں، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آگاہ نے معتبر احادیث کو اپنا ماخذ نہیں بنایا تھا۔ اس تفصیل کے بعد اب ہم نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں :-

بی بی آمنہ کا آنحضرت کو اپنے ساتھ مدینہ لے جانا . . . !

جب ہوا چار سال کا سرور
دس برس کے تھا طفل سے ہمسر

لے گئی حضرت آمنہ خاتون
سات اپنے اُسے مدینے کوں

ماموان سے ملائی اس کو لے جا
سب ہوئے باغ باغ اس کو نجھا

وہ مدینے منے رہے ایک ماہ
ام ایمن بھی تب تھی ہمراہ

جب او ہجرت کیا مدینے میں
بولتا تھا اپس کے یاراں سیں

اتری تھی ماں مری یہ گھر کے بیتھر — سارے احوال مجھ کو ہیں از بر

تیرنا بھی سیکھا میں وہاں اشتاب — آ کے مجھے دیکھتے تھے اہلِ کتاب

ہجرت کے دوسرے سال کا بیان حسب ذیل ہوا ہے:؎

سال دوم سے بے قیل و مقیل — ہوگیا قبلہ بلا شک تحویل

تھا اوّل بیت مقدس قبلہ — پس ہوا کعبۂ اقدس قبلہ

اور اسی سال سنو اے یاراں — ہوگئے فرض صیام رمضان

اور اسی سال زہرا کو شاہ — کر دیا حیدرِ کرار سے بیاہ

اور اسی سال سے بے تکرار — صدقۂ فطر ہوا فرض اے یار

صدقۂ فطر کے بعد از حسن بات — ہوگیا امت پر فرض زکوٰۃ

اور اسی سال ہوا غزوۂ بدر — ہے بڑی جس کی بہت عزت و قدر

آئے اس میں ملک بالکفار — بدریاں سب ہیں بہشتی اے یار

اور اسی جنگ کے بعد از اے جان — لایا عباس نبی پر ایمان

تھے قریشوں میں جو کفار کبیر — ہوئے اس جنگ میں مقتول و اسیر

اس غزا بیچ ابوجہل لعین — قعرِ دوزخ میں ہوا گوشہ نشین

جب پھرا بدر سے وہ سالار — گئی تھی جنت کو رقیہ اے یار

بے گماں اوّل بعثت میں شاہ — کر دیا تھا اسے عثمان سے بیاہ

اور ابو رافع و ابن الاشرف — گئے ہو مقتول جہنم کی طرف

ابن شیبہ و پسر سفیان کا — مارے جا کر لئے آتش میں جا

سراپائے رسول میں ابروئے مبارک کے متعلق اس طرح وضاحت کی ہے:؎

بھوان تند کے باریک تھے اور دراز — بیچ سے تھوڑے سے پیوستہ لئے سرفراز

کماندار سے تھے اور بہت تھے سیاہ — ان دیش اس بات پر ہیں گواہ

الٰہی ہمیشہ بشام و سحر

اس ابرو کو مجھ دل کا محراب کر

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا گیا ہے، جنگ و جدل وغیرہ کے حالات کے برخلاف
نگاہ نے آنحضرت کے اخلاق اور عادات کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے، آپ کی تواضع
کے متعلق آگاہ کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

تواضع میں اس کا کروں کیا بیاں — کہ ہے اس سو عاجز قلم ہور زباں
اول آپ کرتا تھا سب کو سلام — اچھے طفل یا زن اچھے یا غلام
اپے اپنے کپڑیاں کو دھوتا تھا شاہ — بھی سیتا اسے آپ وہ دیں پناہ
اپے اونٹ کا چارہ بھاتا اتھا — خادم کے سنگ ٹکو کماتا اتھا
بھی گنتا تھا آٹا آپس ہاتھ میں — متاع اپنی لاتا آپس ہاتھ میں
غرض اپنے خدمتاں اد تمام — تھا کرتا آپس ہاتھ سو و سلام
صحابیاں میں مل بیٹھتا سب کے ساتھ — ملی جان اسے جا کر اسے نیک ذات
صحابہ بحکم شہ بحر و بر — کیے ذبح بکرے کو دریک سفر
دیا سب کو بانٹ اس کے کاماں تمام — لیا اپنے ذمے میں لکڑیاں کا کام
خبر ہے کہ وہ سرور دلفروز — گیا وعظ کرنے کتین ایک روز
اتھے اس کی خدمت میں سب خاص و عام — بھرا ان کے کثرت ستے گھر تمام
سو اس وقت کے بیچ آیا جریر — جگا بیٹھنے کی نہ پایا جریر
ہو لاچار آخر وہ فرخندہ یار — زمیں پر گیا بیٹھ مجلس کے بہار
وہ سالار واقف ہوا اس حال پر — شتابی سے گولا کر اپنے چادر
دیا پھینک اس کے طرف ہور کہا — کہ بیٹھ اس کے اوپر تو اے باوفا
دے بوسہ اسے اور رکھ آنکھ پر — بیٹھا اوڑ اسے سر پہ وہ خوش سیر
کہا خادم خاص شہ کا انس — کہ میں اس کی خدمت کیا دس برس
تھا چہتا مجھے بہوت وہ نامور — کیا نیں کبھی غصہ میرے اوپر
میں جس کام کو اس کے کرتا اتھا — نہ حرف اپر اس کے دھرتا اتھا
بھی جو کام کرتا نہ تھا اس کا میں — نہ کہتا کہ کیوں نیں کیا اس کتیں

تصدق سو اس خو کے اے دادگر
مجھے کر تواضع سنے مشتہر

جس طرح آپ کے اخلاق اور عادات کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے، اسی طرح معجزات کا تذکرہ بھی مفصل ہے، یہاں ہم ایک معجزے کا نمونہ پیش کر کے اس بیان کو ختم کرتے ہیں: ۵

کہے ہیں یوں روایت اے برادر | کہ اس کی دختر فرخندہ اختر
پکا کر ایک دن کھانے کا یک دیگ | بلائی سرور عالم کتیں بیگ
کیا تب حکم اس روشن جبیں کوں | کہ بھیجے امہات المومنیں کوں
بجا لائی کیا جوں حکم سرور | وہ کھانا جوں کا تیوں تھا دیگ اندر
بھی دار دے خبریوں اے حق آگاہ | کہ زہرا کا کیا جب شاہ دیں بیاہ
بحکم شاہ دیں اصحاب آئے | سب دس کھانے کوں کھائے اور کھلائے

اس نمونے سے آگاہ کے کلام کا اندازہ بخوبی واضح ہوتا ہے، "ہشت بہشت" عرصہ دراز تک خاص وعام میں مقبول تھی، میلاد کی مجالس میں اس کو پڑھا جاتا تھا، بمبئی اور مدراس میں کئی مرتبہ طبع ہوئی ہے، اس کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ قلمی نسخے بھی دستیاب ہوتے ہیں، دکن کے کتب خانوں کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں میں بھی اس کے مخطوطات موجود ہیں، چنانچہ پیرس کے کتب خانہ میں خود مصنف کا تصحیح کردہ نسخہ موجود ہے[۱]

(۴) معجزاتِ رسالت یہ ایک مثنوی ہے جس کو مخدوم حسینی نے تصنیف کیا ہے، تصنیف کے سنہ کا پتہ نہیں چلا، جیسا کہ نام سے واضح ہے، اس میں چند معجزات کا تذکرہ ہے، زیادہ تر صرف ایسے معجزے ہیں جو اہل بیت رسالت سے تعلق رکھتے ہیں، ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا، انڈیا آفس میں اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے جس کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کر دیا ہے۔ صفحہ ۵۱۲،

(۵) وفات نامہ پیغمبر یہ بھی ایک دکھنی مثنوی ہے جس کو کسی شاعر "میر" نے جو غیر معروف ہے تصنیف کیا ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں آنحضرت صلعم کی وفات کا تذکرہ ہے، مگر بہت کچھ صدق و کذب کی آمیزش ہے۔ اس کا بھی ایک نسخہ یورپ میں انڈیا آفس کے کتب خانہ میں دیکھا گیا تھا۔

---

[۱] دیکھو راقم کی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۳۰۶

(۶) شمائلِ محمدی | ایک دکھنی مثنوی عثمان کی تصنیف ہے، شمائل کی اہمیت اور اس کے بعد شمائل کا تذکرہ ہے، جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔ (سروری ۳۰)

(۷) شمائل النبی | یہ مثنوی عبدالمجد کی تصنیف ہے، اور "پشتو" زبان سے "دکھنی" میں ترجمہ کی گئی ہے، اس میں آنحضرت کا سراپا، اخلاق اور عادات کا تذکرہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے، ادارہ "ادبیات اردو" کے کتب خانہ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ موجود ہے۔

(۸) وفات نامہ سرورِ کائنات | یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ کوئی غیر معروف شاعر "دریا" تخلص کی تصنیف ہے، ادارہ "ادبیات اردو" کے کتب خانہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

(۹) فوائد بدریہ | یہ دکھنی زبان کی سب سے آخری "سیرت النبی" ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے، اس کے مصنف آگاہ کے رشتہ دار قاضی بدرالدولہ مولوی محمد صبغۃ اللہ ہیں ۱۲۶۸ھ میں تصنیف ہوئی اور آج تک مدراس، بمبئی، حیدرآباد میں کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے، جس سے اس کی مانگ بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ ۱۲۱۱ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، آپ نے اپنے زمانہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی تھی جن میں مولانا عبدالعلی ملک العلماء فرنگی محلی جیسے امام وقت بھی شامل ہیں، مولوی صبغۃ اللہ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ کے ساتھ ساتھ ریاضی، ہیئت اور طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، نواب غلام محمد غوث خاں والی ارکاٹ نے آپ کو خدمات صدارت، قضائت وغیرہ سے سرفراز کرکے بدرالدولہ، قاضی الملک امام العلماء وغیرہ کے خطابات سے سربلند کیا تھا۔

آپ ایک بلند پایہ مصنف تھے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان میں سے اردو کتابوں کی تعداد تیرہ [13] ہے۔ جو فقہ، سیر، عقائد، مناسک، تفسیر وغیرہ پر مشتمل اور اردو نثر میں قلمبند ہوئی ہیں، چونکہ آپ کی زبان بلحاظ ارتقا تدریجی باقر آگاہ سے زیادہ صاف تھی، اس لئے اب آگاہ کی جگہ آپ کی تصانیف نے لے لی۔

فوائد بدریہ خاصی ضخیم کتاب ہے، اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں آنحضرت صلعم کی

پیدائش سے لیکر وفات تک کے حالات بعثت اور ہجرت کے سنین کے لحاظ سے بیان کئے گئے ہیں، دوسرے باب میں صورت باجمال اور سیرت باکمال کا تذکرہ ہے، اسی میں معجزات بھی لکھے گئے ہیں، شمائل کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر ناممکن ہے، عربی الفاظ کے لئے نہایت موزوں و مناسب الفاظ لکھنا اور پھر ایسا کہ پڑھنے والے کو مادری زبان کا سلف آئے اور نامانوس الفاظ نہ معلوم ہوں در حقیقت کامیاب کوشش ہے، اس امر کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند اور مکمل کتاب بمشکل دستیاب ہوں گی، ایک دو اقتباس بطور نمونہ اسلوب بیان پیش کئے جاتے ہیں :-

> "مسلمانوں کی فوج آراستہ کر کے ان کے مقابلہ میں گئے اس قدر جنگ ہوا کہ زید بن حارث تیروں کے مارنے سے شہید ہوئے، دونوں لشکر جب باہم خلط ہوئے جعفر گھوڑے پر سے اتر کر اس کے پانچے مار کر جنگ شروع کئے۔ سیدھا ہاتھ اڑ گیا۔ بائیں ہاتھ میں نشان لئے وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوئے۔"

> "آنکھیں حضرت کے بڑے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی اور حدقہ بہت سیاہ تھا، جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے، پیشانی مبارک کشادہ تھی، اور بھواں دونوں ملے ہوئے کمان کے ... اس کے ہوئے پورے تھے، بینی مبارک ہموار باریک اور بیچ اونچی تھی، اور دھن شریف کشادہ، دنداں مبارک سفید روشن براق آبدار اور رونق کے ساتھ تھے۔"

اس اقتباس سے فوائد بدریہ کا اسلوب واضح ہو سکتا ہے، قاضی بدر الدولہ[۵] نے اردو زبان کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے اس کی صراحت ہماری کتاب "مدراس میں اردو" سے ہو سکتی ہے ۹۶ تا ۱۰۲

دکھنی شعرا نے معراج کے متعلق بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں اور اس کے علاوہ وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں معراج کا بیان کرنا ضروری خیال کرتے تھے کیونکہ آئندہ اس پر صراحت سے روشنی ڈالی جائیگی۔

صفحات بالا سے اس امر کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے کہ دکھنی شعرا نے آنحضرت صلعم کی سیرت کے متعلق کیا کام انجام دیا تھا۔ اور کیسی طرح اردو زبان میں سیرت مقدس کو لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ ان کی یہ کوشش "تاریخ زبان اردو" سے محو نہیں کی جا سکتی۔

نصیر الدین ہاشمی حیدر آباد دکن

---

[۵] ڈاکٹر حمید اللہ جن کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہوا ہے، قاضی صاحب کے حقیقی پوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف بین القومی حیثیت رکھتے ہیں

ولی گجراتی

(تصحیح و استدراک)

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

"معارف" کے شمارہ نمبر ۱۲ میں عنوان بالا کے تحت جو مقالہ شائع ہوا ہے اس میں چند تسامحات کی طرف بعض دوستوں نے توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے اکثر تو اصل نقطۂ بحث سے غیر متعلق ہیں، اور بعض کا تعلق صرف جزئیات سے ہے، اس لئے ہم اس مضمون کے ذریعہ ان کی تصحیح ضروری سمجھتے ہیں اور بعض امور بطور استدراک پیش کرتے ہیں۔

ولی کو دکنی کہنے سے کیا مراد ہے؟

اس عنوان کے ماتحت دکن سے گجرات مراد لینے کے سلسلہ میں ہم نے بعض شواہد پیش کئے ہیں، ان میں سے ایک شہادت میں صدر جہاں گجراتی کو کتاب "طبقات محمود شاہی" کا مصنف بتایا ہے۔ کتاب مذکور کے ایک مخطوطہ کے آخری صفحہ پر جو پشاور کے ایک خانگی عربی مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، مندرجہ ذیل عبارت ہے جس کی نقل ایک فاضل دوست کی وساطت سے دستیاب ہوئی ہے۔

"مؤلف این کتاب فیض اللہ بن زین العابدین بن حسام بنبانی المخاطب بملک القضاۃ صدر جہاں کہ چوں در سنہ سبع و تسعمائۃ این مؤلف در دکن در شہر دار الملک محمد آباد چانپانیر از گجرات بحکم فرمان بادشاہ ہفت محمود شاہ بن محمد شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقات محمود شاہی کا مصنف صدر جہاں نہیں ہے، بلکہ ان کا پوتا فیض اللہ بنبانی ہے جو کتاب "مجمع النوادر" کا بھی مصنف ہے۔ محمود کے نام کے ساتھ "خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" سے قیاس ہوتا ہے کہ خود محمود کے عہد میں اس کی کتابت ہوئی ہوگی اور یہ عبارت بھی غالباً کاتب مخطوطہ کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عبارت گو کیسی ہی "بے ربط" ہو

تاہم اس میں "ور دکن در شہر محمد آباد" سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کا اطلاق گجرات پر ہوتا تھا۔

(۲) "حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے ایک پوتے کے شاگرد نے ملا جامی کی شرح لکھی ہے۔"

اس کی تشریح کر دینی بھی ضروری ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے۔ نحو میں ملا جامی کی شرح کافیہ بہت مشہور ہے۔ اس پر ایک کتاب جس کا نام "جامع الغموض" ہے ملا عبد النبی احمد نگری نے لکھی ہے۔ یہ شائع ہو چکی ہے اور اس کے آخر میں مصنف نے مندرجۂ ذیل اشعار میں اپنے وطن کا ذکر کیا ہے:

نامش احمد نگر بیان دکن

اور

وطن این غریب گجرات است

یہ عبد النبی احمد نگری وہی ہیں جو "دستور العلماء" کے مصنف ہیں۔ خود انھوں نے اپنی اس کتاب (جلد چہارم ضمیمہ ص۱۳) میں اپنا آبائی وطن کپڑبنج (گجرات) اور وہاں سے ان کے والد کا احمد نگر دکن میں جا کر قیام کرنا بیان کیا ہے۔ نیز اپنے والد کا حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے پوتے حضرت شاہ عبد الماجد سے عقیدت و ارادت اور اُن کے بیٹے حضرت شاہ نصیر الدین سے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہاں احمد نگر سے "ہمت نگر" (ایڈر کے پاس) جو مراد لی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہمارے مفید مطلب۔

(۳) شیخ کمال مالویؒ کی زبانی "سلاطین دکن" کی جو عبارت 'مرآۃ احمدی' کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، وہ 'مرآۃ سکندری' میں بھی موجود ہے اور غالباً وہیں سے منقول ہے، اور وہاں 'سلاطین دکن' کی بجائے 'سلاطین انکہ' لکھا ہوا ہے۔ اس روایت کی افسانوی حیثیت یا اس کی جزئیات پر درایتی حیثیت سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، ممکن ہے کہ 'مرآۃ سکندری' کے کسی قلمی نسخہ میں ایسا ہی ہو، ہم نے جو عبارت نقل کی ہے وہ اس مطبوعہ نسخہ کی ہے جس کو پروفیسر سید نواب علی صاحب نے خود مصنف کے تیار کرائے ہوئے نسخہ پر سے ایڈٹ کیا ہے[۱]۔ بمبئی کے اڈیشن میں بھی "سلاطین انک" چھپا ہے۔

ولی کے اساتذہ اور پیر طریقت

اس عنوان کے ماتحت حضرت شاہ علی رضاؒ کے ایما سے "نور المعرفت" کی تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے اور حاشیہ میں پیر "روشن ضمیر" کے ساتھ "یعنی حضرت شاہ علی رضاؒ" کا اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ ولی نے پیر

---

[۱] دیکھو مرآۃ احمدی مطبوعۂ گائیکواڑ سیریز جلد اول کا انگریزی دیباچہ۔

شنضمیر کے ساتھ یہ نام نہیں لکھا لیکن حضرت شاہ علی رضاؒ سے ولیؔ کی بیعت کی شہادت نیز
ن قرائن کی موجودگی میں ہم نے نام کی تصریح کر دی ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہاں پیر
شنضمیر سے مراد خود مولانا نور الدین ہیں اور کہ سبب تالیف رسالہ میں خود مولانا کی زبانی
ں رسالہ کو لکھنے کی تحریک کا خیال پیش کیا ہے، جو بقول ان کے ایک قصیدہ کی شاعرانہ تمہید
ملوم ہوتی ہے۔ رسالۂ مذکور کے سبب تالیف کی اصل عبارت یہ ہے :-

"ناگاہ پیر روشن‌ضمیر ..... از در درآمد ..... واز روئے التفات بزبان فصیح و بیان ملیح آغاز
نمود کہ .... قلم عطارد رقم را بر روشن بیانی آشناسازی ..... و بدانکہ سزاوار مدح ہمیں شہر
فیض کہ مسمّی باحمد آباد واست شخصے است ..... چوں از نام نامیش سوال کردم بایضاح ازیں معنی
پرداخت ..... وایں بیت برجستہ را بآواز بلند برخواند ؎

زنورشں حال دل چوں گل عیانست زنامش نور دیں برتو نشانست" (انتہی الخضا)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پیر روشن‌ضمیر سے مُراد مولانا نور الدین نہیں
ہیں بلکہ کوئی اور ہے، خواہ ان کو حضرت علی رضاؒ فرض کر لیا جائے یا "پیر روشن‌ضمیر عقل" جیسا کہ
اکثر شعرا قصائد میں اس قسم کی خیالی تمہید قائم کر کے مدح کی طرف گریز کیا کرتے ہیں۔ بالفرض
اگر یہاں "پیر روشن ضمیر" سے مولانا نور الدین ہی مُراد ہوں، پھر بھی یہ تو کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ
ولیؔ کو ان سے بیعت وارادت تھی۔" ایک شخص کسی پیر کا مرید ہوئے بغیر بھی اس کی تعریف کر سکتا ہے"
پھر ولیؔ کا سلسلۂ قادریۂ شطاریہ میں بیعت ہونا دکنی و گجراتی دونوں کے نزدیک مسلّم ہے۔[۵۱] حالانکہ
مولانا نور الدین سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ تھے۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مخزن شعرا کے مصنف کو بھی غالباً رسالۂ
"نور المعرفت" مولانا نور الدین کی مدح میں تصنیف کرنے سے یہ خیال ہو گیا تھا کہ ولیؔ کو ان سے
بیعت تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"واز رسالۂ 'نور المعرفت' کہ تصنیف اوست مستفاد می شود کہ از شاگردان شاہ گلشن و مُرید

---

[۵۱] "محبوب الزمن" جلد دوم صفحہ ۱۱۲۰ "علوی خاندان میں خانقاہ کے سجادہ نشین سے طریقۂ قادریۂ شطاریہ میں بیعت کی"
ولیؔ کی پیر شاہ علی رضاؒ کا سلسلۂ قادریہ شطاریہ میں حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی برہانپوری (المتوفی ۱۰۸۳ھ) سے بیعت
ہونا پایا جاتا ہے۔ (دیکھو "آئینۂ تصوف" از مولانا محمد حسن صابری چشتی)

جناب معارف آگاہ مخدوم العالم مولانا محمد نور الدین صدیقی السہروردی امت "[۵۱]

گجراتی الفاظ

ولی کے کلام سے ہم نے جن الفاظ کی فہرست پیش کی ہے اُن میں کے بعض الفاظ دکنی مصنفین کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ لفظ "بھار" کے متعلق ولی کا جو شعر نقل ہوا ہے وہ صرف وزن کے معنوں میں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ لفظ "بھار" باہر کے معنی میں بھی ولی نے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لفظ "ال آنون" کے علاوہ پنجابی معنوں "پاس" کے لئے بھی ولی نے ایک شعر میں باندھا ہے، اور اس لحاظ سے فرہنگ میں اس کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں۔ نیز لفظ "وسواس" کو ولی نے عربی معنوں (وسوسہ) میں لیا ہے۔ اس لئے اس کی توجیہ گجراتی لفظ "وسواس" سے غلط ہے۔ با ایں ہمہ ہماری فہرست الفاظ میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو ٹھیٹھ گجراتی اردو کے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دکنی زبان میں سینکڑوں الفاظ گوجری اردو کے اس قدر رل مل گئے ہیں کہ ایسے الفاظ دکنی مصنفین کے ہاں مستعمل ہونے سے ان میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ مسلم امر ہے کہ گجرات کے مسلمانوں کی زبان میں گجراتی عنصر نسبتاً زیادہ ہے جو ان کی زبان کو دوسرے صوبوں کی بولیوں سے ایک حد تک ممتاز کرتا ہے۔ مغربی ہندی کی طرح خود گجراتی زبان نے، جو ہندی کے علاوہ زیادہ تر "اپ بھرنش" الفاظ سے بنی ہے۔ گوجری اردو پر بڑا اثر ڈالا ہے جس نے گجرات میں اپنی مستقل حیثیت قائم کر لی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:-

> "ہندی عام ہے یعنی وہ زبان جو ہر جگہ مستعمل تھی، ہندی ہی کے نام سے موسوم تھی۔ گجری گجراتی خاص ہے یعنی وہ زبان جو گجرات اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بولی جاتی تھی اور جس میں کچھ مقامی الفاظ بھی داخل ہو گئے تھے۔"[۵۲]

سوائے اُن الفاظ کے، جو عام طور پر مرہٹی اور گجراتی میں مشترک ہیں، یا پھر ٹھیٹھ قدیم یا مغربی ہندی کے الفاظ کے۔ قدیم دکنی زبان کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود تھا۔ جس کو گجراتیوں نے اپنی کثرت آمد و رفت دکن سے مالا مال کیا ہے۔ دکنی زبان پر گجراتی زبان کے اثرات اتنے پڑے ہیں کہ خود دکنی مصنفین اپنی زبان کو گوجری کہتے ہیں[۵۳] گجری دو یا گوجری میں ایسے خاص الفاظ و محاورات پائے جاتے ہیں

---

[۵۱] مخزنِ شعراء صفحہ ۱۱ ۔ [illegible] ل متن میں نہیں، بلکہ حاشیہ پر لکھی ہوئی ہے۔

[۵۲] اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ [illegible]

[۵۳] بانجو آمین [illegible] (سنہ ۱۱۰۵ھ) میں نظم کی ہے، اور دکنی میں لکھنے کے باوجود اس کو

(بقیہ صفحہ ۸۳ پر)

جو اسس کو دکنی سے ممتاز کرتے ہیں، بایں ہمہ اگر دکنی مصنفین نے گجراتیوں سے لے کر ان کو استعمال کیا ہو تو اس سے ان کی گجراتی اصلیت مٹ نہیں سکتی۔ بہر حال ولی کے کلام میں گجراتی الفاظ کا وجود ثابت کرنے سے ہمارا مقصد ولی کے گجراتی ہونے کی ایک مزید اندرونی شہادت مہیا کرنا ہے۔ چنانچہ اس فہرست میں ہم مندرجۂ ذیل الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں :۔

ص۱۱ (ضمیمۂ اول) رُوسنا۔ بمعنی روٹھنا۔ ولی ع

ہمن سے رُوس رہے بے سبب سو کیا معنی؟

فرہنگ میں یہ لفظ نہیں دیا گیا۔ "اردو شہپارے" کی فرہنگ میں لفظ "رُوس" کے معنی غیرت لکھی ہیں۔

ص۱۲ (ضمیمہ) اُپراپیچ۔ پگڑی یا صافہ کے اوپر کی آخری بندش۔ ولی ؎

پیچ اپنے چیرۂ اُجلے کوں جو اُپرا دیا   عاشقاں کوں مارنے کھینچا ہے جیوں خنجر سپید

فرہنگ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ "گنبدی دستار" والے اس "خنجر نما اُپرے پیچ" کو کیا جانیں؟

ص۱۲ (ضمیمہ) جھرنا۔ گرنا۔ ٹپکنا۔ ولی ع

اشک جیوں چھوٹتے ہیں رات مجھ چشم سے جھر جھر سفید

فرہنگ میں یہ لفظ نہیں دیا گیا۔

(صفحہ گزشتہ سے)
گوجری کہتا ہے :؎

سنو مطلب اہے اب یو ایس کا   لکھی گوجری سنے یوسف زلیخا

ہر یک جاگے ہے قصہ فارسی میں   آیں اس کو اتاری گوجری میں

کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت   بڑی ہے گوجری مگ بیچ نعمت   (پنجاب میں اُردو)

اسی طرح شیخ برہان الدین جانم المتوفی ۹۹۰ھ جو اولیائے بیجاپور (دکن) سے تھے اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ مثلاً "حجۃ البقا" میں لکھتے ہیں :؎

جے ہوویں گیان بچاری   نہ دیکھیں بھاکا گجری!

کتاب ارشاد نامہ میں کہا ہے :؎

یہ سب گجری کیا زبان   کر یہ آئینہ دیا نساں

نثر کے رسالہ "کلمۃ الحقایق" میں لکھا ہے "سب یو زبان گجری، نام ایں کلمۃ الحقایق"

(دیکھو سب رس اردو ص۲۳، ص۳۴ ، اورنٹیل کالج میگزین ص۲۰ ، ص۹ جلد ۱، حصہ ۲)

صہ ۴۹ (ضمیمہ) گھر گھالے۔ کئی گھر لوٹنے یا ویران کئے، ولی ع
گوشۂ چشم ستی دیکھ بہت گھر گھالے

صہ ۲۲۹/۲۹۹ بقال پُرفن۔ عیار بنئے کا لونڈا۔ گجرات میں بنیوں کو بقال کہتے ہیں جو عام طور سے تجارت پیشہ ہیں۔ ولی ؎

غریبی سوں نہ سمجھو سادہ دل بقال پُرفن کو
کہ جو کھا اُن نے عاشق کوں بھواں کی ہاٹ لے تکڑمی

صہ ۲۵۵/۲۵ کُلاہِ بارانی۔ چھجے دار برساتی ٹوپی جو چٹائی سے بُنی ہوئی ہوتی ہے اور عموماً اس کو معمولی درجہ کے پُرتگیزی عیسائی پہنتے ہیں۔ پُرتگیزوں کا قیام گجرات میں بہت رہا ہے، ولی ؎

دیکھ اس کی کُلاہِ بارانی
چاند پر آج ابر آیا ہے

صہ ۲۹۶/۴۴ رام رامی۔ علیک سلیک۔ گجرات میں ہندو بجائے سلام کے "رام رام" کہتے ہیں، ولی ؎

تب کا مشتاق جی ہے لچھمن سوں
کشن سوں جب کہ رام رامی ہے

فرہنگ کلیات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

صہ ۲۹۹/۴۸ گولِ دستار۔ یہ وہی "چکری پگڑی" ہے جو گجرات میں عموماً سادات اور مشائخ باندھتے ہیں۔ ایک متاخر گجراتی شاعر کہتا ہے: ؎

بولا کمہار شیخ کی دستار دیکھ کر
سمجھا وہ سر پہ رکھ کے میرا چاک لے چلے!

ولی ؎
شیخ مت گھر سوں نکل آج کہ خوباں کے حضور
گولِ دستار تیری باعثِ رُسوائی ہے

صہ ۲۹۹/۴۸ مناہی۔ ممانعت۔ عربی لفظ گجرات میں ممانعت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ولی ؎

تو خطاں کی طرف نہ جا زاہد　　زہد وتقوی کی واں مناہی ہے

سنہ وفات ولی

انجمن ترقی اُردو کے مستعد اور سرگرم ناظم مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالۂ اردو بابت جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں ولی کی سنہ وفات پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے دیوان ولی کے ایک مخطوطہ مکتوبۂ سنہ ۱۱۵۲ھ موجودہ کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی (۱۱۳۵/) کے حوالہ سے ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سب سے پہلے ولی کی صحیح تاریخ وفات کو شائع کرانے والے مولوی صاحب موصوف ہی ہیں۔ لیکن یہ تاریخ قائل قطعۂ مذکور کے نام کے ساتھ ایک قلمی بیاض[1] سے جو محترم دوست سید حسینی پیر صاحب احمد آبادی کے پاس موجود ہے۔ اس قطعہ کے لکھنے والے "احسن مفتی" کے نام کا مولوی صاحب کو پہلی مرتبہ علم ہوا تھا، اس لئے کہ جامع مسجد والے مخطوطہ کے آخر میں صرف قطعہ درج ہے، قائل کا نام نہیں دیا گیا اور ایک مصرع بھی اس طرح غلط لکھا ہے:- ع

والی ملک شہنشاہ صاحبِ عرفاں ولی

اس کے باوجود مولانائے موصوف نے نہ تو حسینی پیر صاحب کا ذکر کیا نہ ان کی بیاض کا نام دیا۔ جو علمی تحقیق کے اصول کے مطابق نہایت ضروری تھا۔ صرف اتنا لکھ دیا کہ" احمد آباد کی ایک خاندانی بیاض سے اس کی تصدیق ہوتی ہے"۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مفتی احسن محمد شاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۳۶ھ میں مسندِ افتاء پر سرفراز ہوئے جیسا کہ ان کی مُہر میں لکھی ہوئی سنہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اور سنہ ۱۱۶۰ھ تک کے لکھے ہوئے دستاویزوں پر ان کی مُہر ثبت ہے اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے یہ قطعہ وفات ولی کے تقریباً سترہ سال کے بعد موزوں کیا ہوگا، جبکہ وہ بعہد محمد شاہ مفتی تھے، لیکن اس بات کا امکان قوی ہے کہ مفتی صاحب نے تو یہ قطعہ ولی کی وفات کے فوراً بعد ہی کہا ہوگا۔ مگر وہ محمد شاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۳۶ھ کے بعد نقل کیا گیا ہوگا، اُس وقت کاتب نے ان کے نام کے ساتھ مفتی کا لقب بڑھا دیا ہوگا۔

---

[1] یہ بیاض شاہ سراج کے پوتے حضرت سید بڑا صاحب (ابن شاہ حامد بن شاہ علاء الدین) المتوفی سنہ ۱۲۲۲ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ رسالۂ شہاب (جوناگڑھ) میں جو میری ادارت میں نکلتا تھا، اس کے اپریل سنہ ۱۹۳۴ء کے نمبر میں حسینی پیر صاحب کا جو مضمون ولی گجراتی پر شائع ہوا تھا اُس میں اُنھوں نے اسی بیاض سے یہ قطعہ مع نام مصنف درج کر دیا ہے۔

ولی کا نام ہم نے اپنے مضمون میں ولی کا نام شاہ ولی اللہ العلوی بتایا ہے۔ بعض اصحاب کے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مخطوطۂ دیوان ولی مکتوبہ (۱۱۳۸ھ) ثناء اللہ ثانی اور محمد تقی بن سید المعالی کے نسخۂ مکتوبہ ۱۱۵۶ھ میں ولی کا نام " ولی محمد" لکھا ہے۔ مخطوطات میں عموماً ناموں کا اختلاف ہوتا ہے، اور ہمارے خیال میں کسی مزید شہادت سے اس کی تصدیق و توثیق ہوئے بغیر اس سے کلی استناد صحیح نہیں ہے۔ قدیم ترین تذکروں میں بھی جن میں سے بعض ۱۱۶۵ھ تک کے قدیم ہیں، ولی کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حمید " ولی محمد" لکھتا ہے، اور گردیزی اور شفیق " محمد ولی" میر حسن " شاہ ولی" اور قائم، شورش، وکا ؛ ور ناسخ " شاہ ولی اللہ" اور آزاد اور صغیر بلگرامی " شمس ولی اللہ" لکھتے ہیں۔ تقریباً سب ہی مستشرقین نے ان کا نام " شاہ ولی اللہ" لکھا ہے۔ نام کا یہ اختلاف بعض مخطوطات دیوان میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً دی سی کے مخطوط (.M.E کٹلاگ نمبر ۲۸۳) میں جہاں ان کا نام " شاہ ولی اللہ" لکھا ہے۔[۵۱] اس لئے یہ کہہ دینا کہ ان کا نام صرف " ولی محمد" ہی صحیح ہے اور " ولی اللہ" غلط، کسی طرح مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ عموماً ہمارے ہاں ناموں کے اجزا کو مقدم مؤخر کر دینے کا رواج ہے، اور بسا اوقات کسی شخص کے قریبی اعزہ اور دوست احباب بھی اس کے مشہور نام کے سوا اس کے صحیح نام سے کم پہچانتے ہیں۔ پھر عموماً مسلمانوں میں مفرد ناموں کے آگے یا پیچھے برکت و سعادت کے لئے " محمد" (صلعم) کا نام اضافہ کیا جاتا ہے، اس بنا پر کسی نے ان کو " محمد ولی" کہا اور کسی نے " ولی محمد"، لیکن ان کا اصلی نام جیسا کہ بعض متقدمین تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، اور ان کے نسب نامہ میں موجود ہے، " شاہ ولی اللہ" ہی تھا۔

احمد آباد کی بعض خاندانی بیاضوں میں بھی نام کا یہ اختلاف موجود ہے۔ چنانچہ مولوی سید احمد بن سید عابد علوی کی بیاض میں " شاہ ولی اللہ" اور ملفوظات کبیری میں " میاں ولی اللہ" لکھا ہے۔ خود ولی کی مُہر میں " محمد ولی اللہ" ہے۔ حالانکہ یہ تینوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ ولی کے نام کے اختلاف اور اس سے مراد شاہ ولی اللہ العلوی ہونے پر ہم نے حیات ولی میں مفصل بحث کی ہے جو ابھی زیر ترتیب ہے اور انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد شائع ہوگی۔

ولی کے احباب اور تلامذہ (۱) شاہ سراج:

ولی نے اشعار ذیل میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے:-

---

۵۱ دیکھو یادگار ولی۔

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں ۔۔۔ فانوسِ دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ سے آ کے ملیا اس سبب ولی ۔۔۔ شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

ہم نے اپنے مضمون میں سراج کو، شاہ سراج احمد آبادی بتایا ہے جو ولی کے ہم نسب اعزہ میں سے تھے اور جنھوں نے سنہ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ سراج اورنگ آبادی سنہ ۱۱۲۷ھ میں وفات ولی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ دکنی اہل قلم نے سراج سے، شاہ سراج اورنگ آبادی مُراد لی ہے۔

چنانچہ کلیاتِ سراج کے مرتب پروفیسر عبد القادر سروری لکھتے ہیں :۔

"ولی کی ایک مسلسل غزل سے ان کے کسی دوست سراج کی شادی کا پتہ چلتا ہے، اور جیسا کہ بعض محققین اس طرف راغب معلوم ہوتے ہیں، شاید یہ سراج، شاہ سراج ہی ہوں گے۔ اس طرح کے قیاس کی گنجایش بھی ہے۔ کیونکہ اگر ولی کا انتقال سنہ ۱۱۱۹ھ میں ہوا ہو تو اُس وقت سراج کی عمر ۱۰ سال کی ہوگی۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :۔

"لیکن یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ولی کے دوست یہی سراج تھے۔"[۵]

بعض دقیقہ سنج اور نکتہ رس اصحاب کا خیال ہے کہ یہاں لفظ "سراج" چراغ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، نیز یہ کہ "شادی" کے معنی صرف خوشی کے ہیں۔ اگر یہی معنی صحیح ہوں تو پھر ان "سراجین" میں سے کسی ایک کی شادی کا قصہ "براتِ عاشقاں برشاخِ آہو" کا مصداق ٹھہرتا ہے! لیکن یہ دیکھ لینا چاہئے کہ کہیں اس سے ان اشعار کا مطلب تو خبط نہیں ہو جاتا؟ "سراج" کی رعایت لفظی سے انکار نہیں، لیکن "فانوسِ دل میں شوق کا سراج" بن جانا کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ سراج کو ماننے کی صورت میں مطلب صاف ہو جاتا ہے کہ سراج کا شوق شاعر کے فانوسِ دل میں اس قدر روشن ہو گیا کہ چاند بھی اس پر پروانہ وار گرنے لگا۔ لفظ "شادی" سے مسرت ہی لیجئے تو کوئی مضائقہ نہیں، زیادہ سے زیادہ شاہ صاحب کی شادی کی تقریب پر اس غزل کا لکھنا نہ ثابت ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ غزل مسلسل ہے جس میں ولی نے حسب عادت اپنے دوست شاہ سراج کو "سجن" اور "شوخ" سے مخاطب کیا ہے۔ پھر یہاں اس بات کا پورا قرینہ

---

[۵] "مقدمۂ کلیاتِ سراج" ص ۵۹ سنہ ۱۹۴۰ء

بوجوہ ہے کہ شاہ سراج کا ذکر ولی نے اپنے دوسرے اعزہ کے ناموں کی طرح کیا ہے۔ مثلاً شاہ کامل اور اکمل کی نسبت ولی کا یہ شعر ؎

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا وہ ہرگز نہیں بوجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

یہ دونوں بھائی ولی کے ہم نسب اور قریبی رشتہ دار تھے، یہاں "ماہ کامل" شاہ اکمل کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس میں شاہ کامل کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اسی طرح شعر مذکور میں بھی شاہ سراج کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور یہ کچھ بعید از قیاس بھی نہیں۔

(۲) اسی طرح محمد یار خاں کی نسبت اس شعر سے :؎

حسن کی دلی کا صوبہ ہے محمد یار خاں الخ

محمد یار خاں ناظم دہلی اور ولی کے ساتھ ان کے تعلقات کے قیاس کی تردید کرتے ہوئے یہ مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں محمد یار خاں مراد نہیں ہے۔ بلکہ ولی نے اپنے محبوب کو تشبیہاً دیارِ حسن کا صوبہ[۵] کہا ہے۔ لیکن ہم نے مآثر الامرا کے حوالہ سے محمد یار خاں کا صوبہ دار ناظم دہلی ہونا بیان کیا ہے، نیز ان کے سخن گو اور سخن شناس ہونے اور ان کی ادبی صحبتوں سے بعض دکنی شعرا کے مستفید ہونے کا تذکرہ قایم کے حوالے سے کیا ہے۔ اور اس غزل کے بعد تو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ولی کے ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ ولی نے اپنے جن احباب کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعریف اسی طرح کی ہے جس طرح عموماً شعرا اپنے معشوقوں کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس غزل میں بھی محمد یار خاں کی تعریف اسی انداز سے کی گئی ہے۔

(۳) محمد مراد کے قیام گجرات اور ولی سے ان کے تعلقات کے امکان پر ہم نے مآثر الامرا کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن بعض اصحاب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بحیثیت صوبہ دار ان کا تبادلہ اورنگ آباد ہو گیا تھا۔ صاحب مآثر کا یہ بیان بھی ضرور ان کی نظر سے گزرا ہے کہ یہ تبادلہ بعض وجوہ سے موقوف ہو گیا تھا اور آخر عمر میں، یعنی ۱۱۲۱ھ میں (ولی کی وفات کے دو سال بعد) وہ نائب صوبہ دار کی حیثیت سے وہاں گئے اور اسی سال انتقال کر گئے۔

(۴) ہم نے اشرف نامی شاعر کو شاگرد ولی بتاتے ہوئے اس کے بعض اشعار رسالۂ اردو (جولائی ۱۹۳۵ء) کے حوالے سے اپنے مضمون زیر بحث کے حواشی میں نقل کئے ہیں۔ اشرف کے دیوان

---

[۵] لفظ صوبہ بطور گجرات میں صوبہ دار کی بجائے آج بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ ریاست بڑودہ (گائیکواڑ) میں "صوبہ" اور "سرصوبہ" کے عہدے ۔۔۔ بھی قائم ہیں۔

تبصرہ کرتے ہوئے رسالۂ اردو کا ایک مضمون نگار لکھتا ہے:-

"شفیق نے اشرف کو معاصر ولی لکھا ہے، لیکن حمید اورنگ آبادی نے اس کو "بلا واسطہ شاگرد ولی" لکھا ہے۔ حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگرد ولی تو نہ تھا[۵۱] لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے۔ شاید ایسا ہو۔ لیکن ابتک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے ان کے استاد شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ بہرحال معاصرت مسلم ہے۔"[۵۲]

اشرف کے دیوان کا ایک قدیم مخطوطہ ہمارے سامنے ہے (جو ہمارے محترم دوست پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی ملکیت ہے)۔ اس میں اشعار ذیل دیکھ کر تو یہی قیاس ہوتا ہے کہ اشرف کو ولی سے نسبت تلمذ تھی ؎ (اشرف)

اشرف ترے سخن کی نت آرزو ہے دل میں — ہے جب سوں شعر تیرا شعر ولی سے ہم رنگ

ولی کے طور پر مجھ سا نہیں کوئی ریختہ بولیا — سخن ہے مبتذل جگمیں زبان اصفہانی کا

شعر کہنے میں ہے اشرف کوں ولی کا مرتبہ — اس سبب شاعراں ہیں صدق سوں اسکے مرید

اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح اقرار ولی کی شاگردی کا اشعار ذیل میں پایا جاتا ہے: ؎ (اشرف)

مجکوں ہے ارشاد اسے اشرف ولی سوں یو سخن
ترک کرنا عشق کا دشوار ہے دشوار ہے"

ولی نے یو غزل اشرف کرم سوں مجکوں بخشی ہے — سو اپنے نام سوں اسکوں کیا جاری نکو پوچھو

اس آخری شعر سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولی اپنی غزلیں اشرف کو لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر دیوان اشرف میں اسی کے تخلص سے ولی کی درجنوں بھر غزلیں درج ہوئی ہیں۔

رسالۂ اردو کے مضمون نگار کو اشرف کے گجراتی ہونے کی بھی کوئی سند یا شہادت نہیں ملی، سوائے اس کے کہ" اس نے اپنے کلام میں گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے

---

۵۱ "بلا واسطہ" کے معنی تو براہ راست کے ہیں یعنی بغیر کسی واسطہ کے۔ شاید "واسطہ" کو اردو معنوں میں لیا گیا ہے؟

۵۲ رسالۂ اردو بابت جولائی ۱۹۳۹ء ص ۵۸۵۔

عقیدت ظاہر کی ہے" پھر آگے چل کر لکھا ہے :-

"یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے، اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اپنے شعر کی داد شاعران دکن سے طلب کی ہے، حمید کے تذکرے میں اس کی غزل ہے جس کا مقطع ہے :-

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف ۔۔۔ تمام شاعر ملک دکن کی قسم۔"

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے اور ولی کا شاگرد بتایا ہے۔ اس کی تصدیق خود اس کے دیوان سے بھی ہوتی ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :-

(۱) اپنے کسی معتقد الیہ حبیب اللہ گجراتی کی نسبت لکھا ہے :-

ملک گجرات میں حبیب اللہ ۔۔۔ تیری فرقت نے ہم کوں مارا ہے

ممکن ہے یہ شاہ حبیب اللہ برادر ولی ہوں۔

(۲) "زین البلاد ہند" یعنی احمد آباد کی تعریف :-

رشک ایران رونق زین البلاد ہند ہے

یعنی احمد آباد کی رونق ایران کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ "زین البلاد" شہر احمد آباد کا لقب ہے، جو غالباً اورنگ زیب نے اس کو دیا تھا۔

(۳) گجراتی محاورے اور الفاظ اشرف کے کلام میں بہت ہیں۔ مثلاً :-

لے گیا تان دل کوں اشرف کے ۔۔۔ بولتا جب وہ تان نکلا ہے

گجرات میں کھینچنے کو "تانا" بولتے ہیں :-

اس مصرع رضی سوں ہے اشرف مجھے لگن ۔۔۔ جیوں عشق پیچ عشق میں دل ول گیا ہوں

ولن گجرات کا خاص لفظ ہے جو شاید ہی کہیں اور جگہ بولا جاتا ہو۔ اشرف نے یہ مصرعہ رضی کا نقل کیا ہے۔ اور اس سے خود رضی کا بھی گجرات سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی نسبت حمید نے صاف طور پر "متوطن احمد آباد" لکھا ہے :-

ہے اشرف کوں ہر فن میں اتنا کمال ۔۔۔ کہ جیوں کوئی اچھے کامل ایک فن

ہم نے "حیات ولی" میں اشرف کے گجراتی ہونے کی ایک دستاویزی شہادت پیش کی ہے جس سے اشرف کے شاعر گجرات ہونے کا مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔

اختر جوناگڑھی

اسیر فرنگ

منیر شکوہ آبادی

(از جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی گوپاموی)

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علما کا جس قدر شاندار کارنامہ اور جذبۂ وطنیت کا مظاہرہ ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ مولانا سید طفیل محمد مرحوم منگلوری پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تحریرات میں علمائے ماضی کے واقعات سیاسی کو جگہ دی۔ انہوں نے ہی یہ راستہ ہمارے لئے کھولا۔ مولوی سید الطاف علی بریلوی نے سرداران روہیلہ پر قلم اٹھایا۔ حافظ الملک حافظ رحمت کی حیات لکھی۔ نواب دوندے خاں۔ نواب غلام قادر خاں شہید۔ آج کل احمد خاں بنگش پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ آپ کی رفیقۂ حیات سیدہ انیس فاطمہ نے پہلو بہ پہلو جنرل بخت خاں روہیلہ۔ اور حضرت محل (اودھ) کے ولولہ انگیز حالات لکھے اور اب جنرل محمود خاں نجیب آبادی کے احوال قلم کر رہی ہیں۔

راقم السطور کو علما کے خاندان سے تعلق ہے۔ بزرگوں سے سنی سنائی باتیں لکھ دیں۔ مو فضل حق خیرآبادی۔ مولانا احمد اللہ شاہ شہید مدراسی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلوی۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ مولانا امام بخش صہبائی شہید دہلوی پر مقالے مرتب کئے جو "معارف علی گڑھ" میں شائع ہو چکے۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی اور علمائے ہند" نامی کتاب بھی لکھی ہے جو دلی سے شائع ہو رہی ہے۔

علمائے کرام کے علاوہ ہندوستان کے شعرا کا بھی سیاست ملکی میں بڑا حصہ ہے مگر تذکرہ نگار اپنی عدم واقفیت کی بنا پر نظر انداز کرتے رہے۔ سعادت یار خاں رنگین جس نے وزیر علی خاں نواب کا ساتھ دیا اور نواب مرشدآباد کو وزیر علی خاں کی ہمنوائی کے لئے آمادہ کرنا چاہا اس وقت سیاست حضرت رنگین کی کارنمائی قابل توقیر ہے۔ بندیلکھنڈ میں منشی محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ

کا ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں کافی دخل ہے۔

حضرت منیر کو ایک خوش گو شاعر سے زیادہ ملک میں کسی نے روشناس نہیں کرایا۔ چنانچہ اس جگہ اُن کے سیاسی کارنامے مختصراً پیش کرنا ہیں کہ علماء ہی نے نہیں بلکہ شعراء بھی ملک کی سیاست میں برابر کے شریک رہے۔ آپ کے حالات کے لئے مسلم یونیورسٹی لٹن لائبریری سے بڑی مدد ملی، ایک تاریخی قطعہ کے لئے مجکو مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی کی ہمراہی میں "حبیب گنج" کا سفر کرنا پڑا، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں "کلیاتِ منیر" سے مطلوبہ قطعہ حاصل کیا، صعوبتِ سفر ظاہر، نواب صاحب کا کتب خانہ تشنگانِ علم کے لئے سیرابی کا ملجا و ماوا ہے۔

وطن | منشی سید محمد اسمٰعیل حسین متخلص بہ منیر کا وطن شکوہ آباد تھا، ہندوستان کے نامور شاعر تھے، آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت سید بہاءالدین بزمانہ سلطان علاؤالدین غوری ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے پوتے کے پرپوتے سید شرف الدین علی خاں کو عہد محمد شاہ میں شکوہ آباد اور فیروز آباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ ۱۷۶۱ء جنگ پانی پت کے بعد نواب دوندے خاں اس علاقہ پر قابض تھے۔[۵] منشی منیر کے والد ماجد کا نام سید احمد حسین متخلص بہ شاد تھا۔ مرزا رفیع سودا دہلوی کے ان کو تلمذ تھا۔ مسٹر اسٹاکول حاکم آگرہ نے ان کو اپنے یہاں سررشتہ دار کر دیا تھا، عمر طبعی پا کر ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔

پیدائش و تعلیم | منیر ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی تعلیم باپ سے پائی، دینیات کی تحصیل اپنے بھائی مولوی سید اولاد حسین سے کی۔

شاعری | منشی منیر کو لڑکپن سے شعر و شاعری سے شوق تھا۔ آنکھ کھولی گھر میں شعر و سخن کے چرچے پائے۔ آگرہ میں ننھیال تھی اکثر آتے جاتے رہتے، اُن دنوں وہاں شعر و شاعری کی بڑی گرم بازاری تھی۔ خلیفہ گلزار علی اسیر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حضرت مہر اور ماائل کی شاعری عروج پر تھی۔ آئے دن مشاعرے ہوتے، لوگ غزل گوئی اور غزل سرائی کو نظر وقعت سے دیکھتے۔ منشی منیر نے بھی غزل گوئی سے لگاؤ پیدا کیا، حسن اتفاق نواب نظام الدولہ خلف الصدق وزیر شاہ اودھ بطور سیر و تفریح آگرہ آئے ہوئے تھے۔ اُن کی دلچسپی اور خوش وقتی کے لئے مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی نے محفلِ مشاعرہ منعقد کی۔ خود بھی شاعر راجہ تخلص کرتے تھے اسیر و مہر سے مشورۂ سخن کیا تھا۔

۵۔ "حیات حافظ رحمت خاں" از مولوی سید الطاف علی بریلوی۔

اس مشاعرہ کی دھوم تھی، نامی شعرا شرکت کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ منیر کو بھی خیال گزرا کہ غزل کہہ کر مشاعرہ میں پڑھی جائے۔ چنانچہ محفل میں پہونچے، راجہ کاشی کے چھتہ میں یہ مشاعرہ تھا، راجہ صاحب نے اہتمام خاص کیا تھا۔

استادوں سے پہلے نو آموزوں نے غزلیں پڑھیں، ان میں ہی منیر کو جگہ دی گئی کہتے ہیں ؎

دنیا سے ہے باہر دلِ دیوانہ کسی کا — بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا
ساقی نگہِ مست تری لڑتی ہے کس سے — کیوں چور نہو نشہ میں پیمانہ کسی کا
کعبہ سے چلے آتے ہیں میخانہ کو بادل — پہونچا ہے کہاں نعرۂ مستانہ کسی کا
نیند آئی ہے ہر ایک کو آغوشِ لحد میں — شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا

عاشق ہوں منیر اپنے ہی اندازِ سخن کا
وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

نکتہ سنجوں اور اہلِ کمال نے منیر کی امید سے زیادہ داد دی اور استادوں نے اپنے پہلو میں جگہ دی، نواب نظام الدولہ منشی منیر کی نازک خیالی، شستگی زبان اور حسنِ بیان پر فریفتہ ہوگئے اور کہنے لگے "میاں صاحبزادہ کس کے شاگرد ہو؟" منیر نے عرض کیا "ابھی کوئی استاد ملا نہیں ہے کامل کی تلاش ہے!" نواب نے کہا "اگر تم ہمارے پاس رہو تو ہم تم کو بہت عزت سے رکھیں گے اور شیخ ناسخ کا شاگرد بھی کرادیں گے۔" منشی منیر نے بطیب خاطر نواب صاحب کے ساتھ رہنا منظور کرلیا۔

اس تقریب سے آگرہ سے منیر لکھنؤ پہونچے۔ نواب نے حضرت ناسخ سے ان کی سفارش کی وہ ان پر توجہ کرنے لگے، غزل پر اصلاح دیتے۔ زمانہ کے انقلاب نے شیخ امام بخش ناسخ سے لکھنؤ چھڑایا تو منیر نے ناسخ کے اشارے سے میر علی اوسط رشک کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا، انھیں کے ساتھ کانپور، مرشد آباد، کلکتہ وغیرہ مشاعروں میں گئے ؎

کلکتہ کو میں ڈاک میں جاتا ہوں اے منیر
فکرِ غزل ہے راہ میں کیا خوب بات ہے

لکھنؤ میں مستقل قیام رہا اپنے دیوان کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:۔

"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردید بہ بیت سلطنت لکھنؤ شتافتم بتقول غزامہ تحریر مرزا غالب دہلوی:؎

اندر آں بقصہ معمور ز دل تنگی خویشتن
حسرت آگیں چو گنہگار بہ زندان مرقم

معاش کی طرف سے فکر مند تھے، نواب اصغر علی خاں نبیرۂ نواب معین الدولہ ولد سعید باقر علی خاں ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ بہادر نے اپنی مصاحبت میں رکھ لیا، بے فکری سے گزرنے لگی واجد علی شاہی دور تھا، عام رنگ رلیاں تھیں۔ چند دن فارغ البالی سے گزر رہے تھے، بدقسمتی نے پھر چکر ڈالا۔ احمد حسن خاں عرف [illegible] نے ذکی اس زمانہ میں سید محمد ذکی خاں بہادر عرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی نے منیر سے اپنے کلام کی اصلاح لی۔ دو سال اس طرح گزر گئے مگر منیر کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی نواب تجمل حسین خان بہادر ظفر جنگ والی فرخ آباد[1] نے زادِ راہ بھیج کر طلب کرلیا ؎

قطعہ

امیر عصر تجمل حسین خاں نواب | خطاب جن کا ظفر جنگ نام ہے اعلیٰ
زمانہ میں انھیں کہتے ہیں لوگ حشمت جنگ | سپہر کرم فیض عام میں یکتا
انھوں نے شوق سے خرچ راہ بھیجا ہے | طلب کیا ہے کمال اشتیاق سے بخدا
چلا ہوں لکھنؤ سے سوئے فرخ آباد آج | ہزاروں حسرتیں رنج و ملال میں ہے صدا

فراق لکھنؤ سے ہے منیر یہ تاریخ
بہشت ہند سے افسوس ہائے میں نکلا ۱۲۶

فرخ آباد میں نواب نے اور اہل فرخ آباد نے آپ کے کمال کی نہایت قدردانی کی، اس زمانہ میں ایک قصیدہ لکھ کر نواب کے حضور میں گزرانا جس کا مطلع یہ ہے ؎

قلزمِ فیض کے کس کے ہوئے پیدا گوہر | اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر
آبرو آپ کی خدمت میں بڑھی ہے ایسی | بن گیا اختر تقدیر ہمارا گوہر

نواب تجمل حسین خاں نے اس قصیدہ کے صلہ میں ایک خلعت زریں اور زنجیر طلائی عطا فرمائی اور منقول مشاہرہ مقرر کردیا۔ شہر میں شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا، موزوں طبع بخوشی خاطر آپ سے مشورہ سخن کرنے لگے۔

نواب واجد علی خاں رضوان ابن نواب نجابت علی خاں نبیرۂ نواب مظفر جنگ بہادر۔ نیز منشی مادھو رام متخلص بہ جوہر فرخ آبادی آپ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں ایک مشاعرہ ہوا طرح یہ تھی۔ ع "اس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں"

---

[1] ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا، جلاوطن ہوئے، مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔

رت منیر نے بھی طرح پر غزل کہی اور مشاعرہ میں پڑھی، مطلع اس کا یہ تھا ؎

اور مجھ سا جان دینے کا تمنائی نہیں
اس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں

ع میں کہتے ہیں ؎

لکھنؤ کی آرزو میں جان دیتا ہے منیر
سلطنت کا بھی زمانے میں تمنائی نہیں

ء بعد نواب تجمل حسین خاں کی رفاقت ترک کرکے لکھنؤ آ گئے، اپنے استاد رشک کی صحبت رہنے لگے۔ بعد ازاں اپنے استاد کے ساتھ کانپور جانا ہوا، وہاں مشاعرہ تھا اس میں شریک ہونے وقع ملا۔ نواب زادہ علی بہادر خاں باندہ بھی محفل مشاعرہ کی زینت تھے، انھوں نے طرح کی غزل

بعد یہ غزل پڑھی ؎

کیا جانے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج
اے بیخبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج

ڈرتا ہوں کہ جو خون تمنا کی نہ پوچھ لے
ہر سانس پہ آتا ہے مرے منھ کو جگر آج

غصہ میں نزاکت نے کیا ہی عجب احسان
وہ پھیرتے ہیں پھر نہیں سکتی ہے نظر آج

ہم سا کوئی نادان [illegible] نہ ہوگا
کل زاد کی تدبیر ہے دنیا سے سفر آج

م اہل مجلس نے بڑی داد دی، نواب زادہ باندہ نے آپ کے اشعار سے بڑا اثر لیا منشی منیر سے کہا رت میرے ساتھ باندہ چلئے اور میری فکر سخن میں امداد دیجئے۔ چنانچہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے ب کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ بہادر علی خاں نے نواب ہی تخلص رکھا۔ کہتے ہیں ؎

قصد کرتا ہوں ترے گھر سے جو میں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو چل میں نہیں آنے کا

نواب بہادر علی خاں کے والد ذوالفقار علی خاں کا ۱۲۴۹ھ میں انتقال ہوا۔ ع

شد آہ ذوالفقار علی در نیام آہ
۱۲۴۹ھ

یہ ۱۲۶۵ھ میں جانشین ہوئے منیر نے ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا ؎

قطعہ

علی بہادر عالم پناہ بندہ نواز
نہاد چوں بسر خویش افسر شوکت

منیر مصرع تاریخ ایں عمل گفتہ
جلوس باد مبارک بمسند نصرت
۱۲۶۵ھ

مسند نشینی علی بہادر

به نوابِ جان بخش گیتی ستاں — عطا کرد مسند چو ربِّ کریم
ازیں جشنِ پرنور شد باغِ دہر — رگِ برق گردید موجِ نسیم
بفیضِ خداوند گیتی پناہ — چناں گشت خرم چو باغِ نعیم
شدہ دستہا ما منِ آبِ زر — کفِ ہر گدا گشت چوں لوحِ سیم
به تاریخ گفتم بہ یک بیتِ من — کشیدم دریں رشتہ دُرِ یتیم

خوشا شوکتِ مسند بزمِ خود
چراغِ اُمید و مُرادِ عظیم

دیگر

خلعت آیا گورنری سے ملا — کھل گیا باغ ثروت اور جلال
میرے نواب ہو گئے مسرور — ہو مبارک یہ سال فرخ فال

کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ
آج آیا ہے خلعتِ اقبال
۱۲۹۶ھ

واقعہ نواب علی بہادر ایک دن اپنے باغ میں حسبِ معمول ٹہلنے جانے لگے۔ منشی تنیرؔ کو بھی ہمراہ لیتے گئے۔ دورانِ چہل قدمی میں پائیں روش سے ایک بیلی کا پھول توڑ کر ان کو دیا اس پر فی البدیہہ تاریخ کہہ ڈالی اور نواب کے سامنے پیش کی ؎

صبح آئے حضور میرے پاس — نورِ حق کا ہوا فلک سے نزول
لے گئے اپنے ساتھ بگھی پر — ہو گیا مطلب عظیم حصول
پھر ہوا کھانے میں ہوئے مصروف — جس طرح تھا ہمیشہ کا معمول
پھر دکھائی گلاب باغ کی سیر — گلِ جنت سے بھی سوا ہر پھول
گلِ تازہ دیا تنیرؔ سے مجھے — ہو گئی باغ باغ جانِ ملول

میں نے برجستہ یہ کہی تاریخ
گلِ خورشید ہے اجی یہ پھول
۱۲۹۷ھ

نواب صاحب اس قطعہ کو سُن کر بہت محظوظ ہوئے اور جناب تنیرؔ کی عزت و توقیر میں اور زیادہ اضافہ کیا، پھر تو باندہ میں اچھی طرح گزرنے لگی۔ کہتے ہیں ؎

نواب کے کرم سے زمانہ ہے کامیاب
باندے ہیں روز دیکھئے چرچا ہے عید کا

نواب صاحب سے ایک دن استاد کی خوبی کا ذکر کرنے لگے نواب نے بھی اُن کی تعریف کی۔ کہتے ہیں ؎

یکتائے عصر، عالم و فاضل جنابِ رشک   علامہ و محقق کامل جنابِ رشک
کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہوئے تنیر   سمجھا گئے تمام مسائل جنابِ رشک

سیاست تنیر کو بادشاہ لکھنؤ سے بڑی عقیدت تھی، نواب واجد علی شاہ کی معزولی کا اثر انھوں نے بھی لیا۔ کمپنی بہادر سے عدم موالات کرنے لگے اور نواب صاحب کے بھی کان بھرے۔
بندیلکھنڈ کے علاقہ میں جھانسی کو اہمیت تھی یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت تھا۔ یہاں کا فرمانروا راجہ گنگا دھر راؤ آف جھانسی تھا۔ اس کو مارو پنت تانبے کی لڑکی لکشمی بائی بیاہی تھی۔ مارو پنت آخری پیشوا باجی راؤ دویم کا برہمن پروہت تھا۔ لکشمی بائی کے آٹھ برس بعد ایک بچہ ہوا، جو چار ماہ کی عمر میں فوت ہوگیا۔ راجہ گنگا دھر کو اس کا بڑا صدمہ ہوا اور بچہ کے غم میں گھلتا رہا اپنی موت سے کچھ پہلے دامودر راؤ جو قریبی عزیز تھا اسکو متبنیٰ کر لیا تھا، لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، اس کی منشا تھی کہ تمام ریاستیں حکومت سے ملحق ہوجائیں۔ ستارا۔ ناگپور کے بعد جھانسی پر نگاہ تھی۔ گنگا دھر راؤ نے مرنے سے پہلے انگریز ریزیڈنٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی تاج برطانیہ سے عمر بھر کی وفاداری کے پیش نظر جھانسی کا الحاق نہ کریں۔ مگر درخواست نامنظور ہوئی۔ جھانسی کا الحاق ۱۸۵۳ء میں عمل میں آیا اور نوجوان بیوہ لکشمی بائی بے دخل کردی گئی۔ اُس نے کمپنی کے اِس خلاف عہد طرز پر آواز بلند کی مگر احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا۔ اس پر رانی کو اربابِ حکومت سے عناد سا پیدا ہوگیا۔ رانی نے اپنے طریقۂ عمل سے اپنی رعایا کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ ہر ایک اس کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اس اثنا میں طوفان کے بادل چھا رہے تھے، کمپنی کے عمال کی سخت گیری سے عوام میں بے چینی کی چنگاریاں اٹھی ہو کر غدر کے واقعات کی صورت اختیار کر گئیں جو کہ دراصل ہندوستان کی طرف سے اپنی سو سالہ غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے پہلی بغاوت تھی۔ بغاوت کا یہ شعلہ جوں ہی بھڑک اٹھا اُس نے تقریباً سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بلوائے عام دلی لکھنؤ اس تحریک کے مرکز بن گئے۔ دُور و نزدیک کے اور مقامات میں بھی ہنگامے ہوئے لکشمی بائی بھی ہنگامیوں کی ہم نوا ہوگئی۔ سرہیگ روز نے ایک مضبوط فوج کے ساتھ جھانسی پر چڑھائی کردی، اس کے پاس گیارہ ہزار جوانوں پر مشتمل فوج تھی۔ مقامی کارخانوں کی تیار کردہ توپیں

بندوقوں، گولوں اور بارُود وغیرہ سے آراستہ کر دیا گیا اور وہ مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئی۔

رانی نے تانتیا ٹوپی کو بھی امداد کے لئے لکھا۔ تانتیا فوج لے کر آیا مگر انگریزوں سے شکست کھا گیا نتیجہ میں رانی کو شہر کی حفاظت ترک کرنا پڑی اور پیدل کالپی روانہ ہو گئی، راؤ صاحب یہاں کے محاذ کا افسرِ اعلیٰ تھا اس نے ڈھائی سو سواروں کا دستہ رانی کے زیرِ کمان دیا، اس نے انگریزی فوج سے مقابلہ کیا اور دادِ شجاعت دی، مگر راؤ صاحب اپنے مقابل سے شکست کھا گیا، بنا بنایا کھیل بگڑ گیا رانی نے راؤ صاحب کی ہمت بندھائی اور مشورہ دیا کہ موقعہ ہے گوالیار کے قلعہ پر قبضہ کرکے پھر دشمن سے نبٹا جائے۔ راؤ صاحب کو یہ تجویز پسند ہوئی، تمام فوج کو سمیٹ کر راجہ سندھیا کو آ گھیرا وہ تاب مقابلہ نہ لا سکا اور مغلوب ہوا۔ اب گوالیار رانی کے قبضہ میں تھا۔ مگر راؤ صاحب بالکل ناکارہ، مغرور، اور عیاش مزاج آدمی تھا، گوالیار کی فتح کی خوشی میں اپنے آپ کو بھول گیا۔

اُسے چاہئے تھا کہ مزید جنگی تیاریوں پر توجہ دیتا اور فوجوں کے اندر ضبط و نظم مستحکم کیا جاتا مگر وہ غافل رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرہیگ روز نے بھاری فوج کے ساتھ گوالیار پر حملہ کر دیا۔ شیو رام تانتیا ٹوپی اور لکشمی بائی بمشکل تیار ہونے پائے تھے، آخر شس معرکہ پھر انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ لکشمی بائی دو دیویوں اور چند مردِ مصاحبوں کے ہمراہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مخالف فوج اس کے پیچھے لگ گئی۔ ایک ایک کرکے اُنھوں نے بھون کھایا۔ رانی نے مقابلہ کیا یہ بھی مجروح ہو کر گھوڑے سے گری، ایک خدمتگار قریبی جھونپڑی تک لے گیا، لیکن کشتیِ عمرِ رواں کنارے لگ رہی تھی۔ چند لمحوں کے اندر مرغِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ یہ دن ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کا تھا۔

باندہ باندہ سے قریب یہ واقعات رُونما ہو رہے تھے۔ نواب علی بہادر خاں ایک شجاع اور جری شخص تھا اُدھر رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی کے نامہ و پیام شرکت ہنگامہ کے جاری تھے، مرزا ولایت حسین خاں وزیرِ اعظم باندہ اور منشی سید اسمٰعیل حسین منیرؔ سے مشورہ کیا، ہر ایک چال بازی اور سرفروشی کے کے لئے سربکف تیار تھا مقامی فوج کو کیل کانٹے سے درست کرکے اوّلاً راج گڑھ کے قلعہ پر نواب نے حملہ بول دیا، قلعہ فتح کر لیا، اور دوا وہ بندیلہ کو گرفتار کر لیا۔ اس فتح کی خوشی میں جناب منیرؔ نے یہ تاریخ کہی [۱]

چو فوجِ بندیلہ بباندا رسید   ز حصنِ اجے گڑھ برائے فساد
بر ایشاں ظفر یافت نوابِ ما   دلِ اہلِ انصاف گردیدہ شاد

چنیں گفت تاریخِ نصرت منیرؔ
خدا فتحِ عالی بہ نواب داد
۱۲۷۴ھ

قطعہ در تہنیت فتح نواب علی بہادر جنگ آوڈا بندیلہ

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو — سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں
آیۂ انا فتحنا مژدۂ فتح قریب — تہنیت سے ہمزباں دردِ دلت تقریر ہیں

فتح زیبا و مبارک ہو شہا غازِ خلش
آپ منظورِ نگاہِ مالکِ تقدیر ہیں

یک قطعہ کا شعر یہ ہے ؎

ہوا محبوس دوّا باندہ میں آکر اب کے گرچہ ہے — پھنسا دامِ مصیبت میں سپاہی گرچہ کوا ہے

۱۵ر جون ۵۷ء کو مسٹر ایچ لے کاک ول قلعہ باندہ میں آیا اس کو مصاحبوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد ۹ر اکتوبر کو ادھر ادھر سے باغی آ جمع ہو گئے ان کے پاس دو ہزار گھوڑ سوار تھے جنرل وائٹ لاک نے حملہ کیا مگر اس کو شکست اٹھانا پڑی۔[1]

اس جنگ کا پچھا بھاری تھا ایک جنگی کونسل بنائی گئی، جس کے ارکان میں محمد سردار خاں ناظم، میر انشاء اللہ سپہ سالار افواج۔ اور وزیر اعظم مرزا ولایت حسین تھے، امداد حسین، اور فرحت علی افسرانِ فوج قرار دئیے گئے۔ جنرل وائٹ لاک نے اپریل ۵۸ء کو دوسرا حملہ باندہ پر کیا مگر مقابلہ پر اہل باندہ ٹھہر نہ سکے شکست یاب ہوئے۔ ۲۰ر اپریل ۵۸ء کو سرکاری قبضہ باندہ پر ہو گیا۔

نواب نے راہ فرار اختیار کی۔ مرزا ولایت حسین اور منشی تنیر نواب فرخ آباد سے امداد لینے روانہ ہوئے، فرخ آباد میں ہر دو گرفتار ہو گئے، مقدمہ ان پر چلتا رہا، مرزا ولایت حسین کو سزا حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہوئی۔ انڈمان بھیج دیے گئے۔[2] منشی تنیر پر ایک بلا اور نازل ہوئی مصطفےٰ بیگ ان دوستوں میں سے تھے انھوں نے نواب جان طوائف کو قتل کیا اور منشی تنیر کو پھنسوا کر خود بچ گئے۔ تنیر اس قصہ کو لکھتے ہیں:۔

مصطفےٰ بیگ ایک صاحب اُن میں ہیں — کج رَوَی میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کر کے خونِ ناحق نواب جان — مجھکو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال — تھا جو میں ذریتِ شبیرؑ سے

---

[1] گزیٹر جالون صفحہ ۱۴۱ [2] اردو مسلّی اپریل ۵۸ء میر شکوہ آبادی از بدر لکھنوی

آخرش اِن کو بھی سزا آئی دس سال کی ملی اور انڈمان بھیجدئے گئے۔ فرماتے ہیں :ـ

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا | زیرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس تمیز | کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

آخرش نواب علی بہادر پکڑے گئے مگر حکومت نے اُن کے ساتھ یہ رعایت برتی کہ اندور میں نظا رہے۔ ۳۶۰۰ روپیہ سال مقرر کر دئے گئے ۱۸۷۲ء میں بمبئی بُلائے گئے، گورنر کے دربار میں جگہ ملی کے فکرِ سخن سے ایک غزل پیش ہے :ـ

ترے خدنگِ ادا کا وہی نشانہ ہوا | کہ جس کے عشق سے تو آفتِ زمانہ ہوا
یہ کچھ نہ سوجھی کہ مجھ پر گزر گئی کیا کیا | تمہیں تو وجہِ مسرت میرا فسانہ ہوا

یہ کیا کیا جو کیا دعوئے وفا نواب
کہ اُس کو اور جفا کے لئے بہانہ ہوا

نواب نے ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا، جناب تمیز نے یہ قطعہ تاریخ لکھا :ـ

نواب علی بہادر اے بحرِ کرم | یوسف طلعت شجاعِ یکتا ہے ہے
اے قدرشناس و ناز بردارِ تمیز | اے اہلِ سخن کے عزت افزا ہے ہے
اے صدرنشینِ خلق و اقبال و شکوہ | اے بزمِ کرم معنی مسند آرا ہے ہے
اٹھ جائے جوان تو زمانہ سے ہائے | صد حیف افسوس و دریغا ہے ہے

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے تمیز
فیاضِ زماں امیرِ زیبا ہے ہے

حالاتِ قیدِ فرنگ

فرخ آباد اور یارانِ شفیق | چھوٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم | سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر | تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد میں لیجائے گئے | ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم | ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں | گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں | ناتواں تر قیس کی تصویر سے

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

کالاپانی | انڈمان میں زیادہ وقت مولانا فضل حقؒ کی صحبت میں گزرتا تھا، چنانچہ آپ کے متعلق ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

رشکِ زلیخا ہوئی بحرِ صفت بوش زن — غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن

.. ..

مخزنِ فضل و کمال عالمِ عالی مقام — تا قدِ تازی زباں فیض شناسِ سخن
مولویِ بے نظیر فضلِ حق اسمِ شریف — دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن
قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ — نین سمندر میں تھے غرقِ بحرِ محن

نصف قصیدہ کیا ہے میں نے لکھے رقم
ختم ہوا جب تھے وہ ہمدم کو رو کفن ؎[1]

تاریخ پھانسی نوابان فرخ آباد جو انڈمان میں کہی

اقبال مند خاں و غضنفر حسین خاں — دونوں مدیر محیط عطا آہ آہ ہائے
دونوں جوان نیک امیرانِ ذی حشم — مقتول تیغ تیرہ قضا آہ آہ ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہید راہ خدا آہ آہ ہائے
۱۲۷۴

تاریخ پھانسی نواب سخاوت حسین خاں برادر کوچک نواب تفضل حسین خاں مسند نشین فرخ آباد ؎

ریاض خلق سخاوت حسین خاں نواب — نہال باغ کرم زیب مسندِ شوکت
جوان قابل و فرزند خاص نصرت جنگ — غلام آل نبی سر و در قمر طلعت
وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول — عنایت اس کو کیا حق نے گلشن جنت
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیرِ دلیر با ہمت
۱۲۷۴

آپ بیتی | تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں — نیرنگِ گردشِ فلکِ نیلہ رنگ سے

---

[1] مولانا فضل حق نے ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔

منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں | محفوظ تھے مشقتِ بیل و کلنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس | شکرِ خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے
ہندوستاں میں آ گئے رہے ہم پراگ میں | اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے

فضلِ خدا سے سال رہائی کہو منیرؔ
اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے

واقعہ الہ آباد میں بعد فرو ہونے ہنگامہ کے جلسہ خیر خواہانِ برطانیہ کا منعقد ہوا اس میں نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور بھی شرکت کی غرض سے الہ آباد آئے یہاں ایک گویّہ جو واجد علی شاہ کے پاس رہ چکا تھا، لکھنؤ سے الہ آباد آ گیا اور رہ پڑا، نواب صاحب کے یہاں شام کو محفل سرود منعقد ہوئی اس میں یہ گویّہ بھی طلب ہوا، اس نے گانے میں منیرؔ کی مشہور غزل سنائی ؎

شرمندہ ہوں میں اپنے کمانوں کے سامنے

نواب نے سُنکر اثر لیا اور اس ردیف و قافیہ میں فرمایا ؎

ناظمؔ منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمانوں کے سامنے

نواب کو معلوم ہوا منیرؔ اندمان میں ہیں تو گورنمنٹ میں لکھا پڑھی کرنے لگے، اُدھر منیرؔ کو چھ سال گزر چکے تھے قصیدے نعتیہ کہے، مناجاتیں کہیں۔ ساتواں سال بھی نصف ختم ہونے کو ہوا۔

ایک قصیدہ جناب رسالتمآب کی شان میں کہنا شروع کیا، اس میں التجا کی ؎

اس ذی الحجہ تک مطلب مرے دل کو عنایت ہوں
کرے اب کا محرم ہند میں یہ بندۂ جانی

رباعی

بارے آئی نجات کی باری | کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا | قید کو جائداد بیکاری
کوچ ٹھہرا مقام غربت سے | اب وطن چلنے کی ہے تیاری
رخصت اے دوستانِ زندانی | الوداع اے غمِ گرفتاری
الرحیل اے دوستانِ زندانی | الفراق اے ہجومِ ناچاری
دال چاول سے کہدو رخصت ہوں | پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری

مچھلیوں سے کھو کر ہٹ کے سڑیں — گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی، برمی، ملائی، مدراسی — اہل آسام، جنگلی، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں — اپنی باتوں سے دیں سبک باری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت — اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری
بیٹھتے ہیں جہاز دُودی پر — اُٹھتے ہیں لنگر گراں باری
نکلے دریائے شور سے صد شکر — بحر شیریں کی آگئی باری
نظر آیا سوادِ کلکتہ — شکر ہے شکر حضرت باری

کیا منیر اور التماس کرے
فکر قاصر ہے نطق سے عاری

دیگر

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر — فضل حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں — اے خداوند وساں کا اب سفر مسعود ہو
آکے بیٹھا ہوں جہازِ تیز رو پر شکر ہے — لنگر اٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے — نیک ساعت ہو کواکب کی نظر مسعود ہو

آج کے دن کی ہو یہ تاریخ صوری معنوی
روز شنبہ نہم ماہ صفر مسعود ہو
۱۲۸۲ھ

چنانچہ ۱۲۸۲ھ ۲۰ محرم میں قید انڈمان سے رہا ہو کے کلکتہ آئے، وہاں سے الہ آباد پہونچے، بر غلام عباس رئیس کے یہاں ٹھہرے، مثنوی معراج المضامین لکھی تھی، عیال و اطفال کی مرگ کی خبر لگی، صد مہ جاں کاہ ہوا، وہاں سے لکھنؤ آئے، نواب یوسف علی خاں ناظم کے شعر پر تضمین کی ہے

مشہور خلق آپ کی ہیں قدر دانیاں — حب الطلب منیر بھی آتا ہے اب وہاں
بہر حکم خاص ہی دل و جان بر سمے رواں — "ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں"

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمانوں کے سامنے

چل اے منیر قبلۂ عالم ہیں قدرداں — بلواتے ہیں حضور معظم ہیں قدرداں
وہ کہتے ہیں جو آج مسلم ہیں قدرداں — "ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں"

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمانوں کے سامنے

لیکن جب منیر رہا ہو کر آئے تو نواب یوسف علی خاں بہادر انتقال فرما چکے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں ؎

آیا منیر چھوٹ کے جب قید سے یہاں　　تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں　　اب کس کے پاس جاؤں میں ہے کون قدرداں
نادم رہا میں اپنے کمانوں کے سامنے

لکھنؤ میں آغا علی حسن خاں نے دستگیری کی، کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جشن ولادت ولی عہد رام پور کی خبر ملی، ایک تہنیت نامہ معہ قطعات تاریخ عرضی کے ساتھ نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کیا۔ نواب صاحب نے ازراہ قدردانی ان کو طلب کر لیا۔ رام پور پہنچے ؎

نواب پاک کلب علی خاں نے اسے منیر　　بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر
صد شکر آئے راہ پر اب طالع فقیر　　ہے قدرداں سر پہ امیر فلک سریر
اب سرخرو ہوں اپنے کمانوں کے سامنے

نواب کلب علی خاں کا زمانہ رام پور میں عہد زریں کہنا سزاوار ہے۔ علوم و فنون کی اشاعت کی سرپرستی کے ساتھ صنائع اور بدائع کے رواج کی بھی ترقی تھی جس طرح ہر ایک علم و فن کے عالم جمع کئے گئے تھے اسی طرح دستکاری کے ماہر فن فراہم فرمائے۔ مدرسہ عالیہ اور وابستگان دربار میں علوم عربیہ میں ہر ایک علم کے کامل الفن اور مسلم الثبوت استاد موجود تھے۔ مفتی محمد سعد اللہ، مولانا محمد ارشاد حسین محدث شمس العلماء، مولانا عبد الحق خیرآبادی۔ مولوی عبد العلی ریاضی داں وغیرہ وہ لوگ تھے جنکی قابلیت کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے تھے۔ حکما میں حکیم ابراہیم لکھنوی۔ حکیم علی حسن خاں۔ حکیم حسن رضا خاں حکیم علی نقی خاں۔ حکیم ہادی حسن خاں لکھنوی یکتائے زمانہ تھے۔ شعرا میں منشی امیر احمد امیر مینائی۔ فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ۔ حکیم سید ضامن علی جلال۔ آفتاب الدولہ قلق۔ میر محمد ذکی بلگرامی منشی مظفر علی خاں اسیر۔ احمد علی خاں عروج۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ انھیں میں منشی منیر کو شامل کیا۔ سو روپئے ماہوار ملنے لگے۔ نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے مدح ممدوح میں ایک قصیدہ کہا اس کے چند دلچسپ مقامات پیش ہیں ؎

نواب سخن فہم کلب علی خاں بہادر　　دنیا میں جس کی در دولت کے برابر
نواب سخن دوست سخن سنج سخنداں　　افصح نہیں آج اس کی فصاحت کے برابر
رُت ہے برسات کی بہت پیاری　　موجزن جھیلیں، ندیاں جاری

بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — اُودے اُودے سُنہری زنگاری
دیکھ تو رام پور کی برسات — کیا نمایاں ہیں قدرتِ باری

وصفِ علماء

علماء ایسے نامور ہیں یہاں — جن کی مداح خلق ہے ساری
حکمائے فلاسفہ کو بھی — فخر ہے ان کی کفش برداری
وہ اطبا ہیں عیسوی اعجاز — نام سے جن کے بھاگے بیماری
فرد یکتا حکیم ابراہیم — کرے بقراط جن کی عطاری
حافظوں کا شمار حد سے فزوں — شرح کرنے میں حد کی دشواری
الغرض ہیں تمام اہلِ کمال — صاحبِ منصب نمک خواری
مجمع شاعرانِ نامی ہے — شاعری کی ہے گرم بازاری
بحر غشی اسیر اور امیر — ہمسر انوری و مختاری
طبع پاک عروج و داغ سے ہے — منفعل کی ابر کی گہر باری
ہے جلال و حیا و شاغل سے — محفلِ نظم جلوہ گر ساری
مثنوی میں حیا و خواجہ بشیر — رونقِ شاعری و نثاری
فنِ تاریخ میں رسا منصور — جان صاحب کی ریختی پیاری

سب سے بڑھ کر منیر کو حاصل
بے کمالی و بہرہ گفتاری

رام پور میں منشی منیر کی آخری زندگی اچھی گزری۔

وفات | عمرِ طبعی پاکر ہیضہ میں مبتلا ہوئے ۱۲۹۷ھ میں رام پور میں انتقال ہوا۔ سال رحلت اس مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔ ع (اردوئے معلّٰی اپریل ۱۹۱۰ء)

"انتقالِ منیر عالی قدر"

تصانیف | دو دواوین میں منتخب عالم ۱۲۶۴ - تنویر الاشعار ۱۲۶۹ - نظم منیر ۱۲۹۰ - مثنوی معراج المضامین - تیس ہزار اشعار کا مجموعہ یادگار چھوڑا۔

رسالہ اعلانِ حق - "سراج المنیر" - رسالہ "تنبیہ الشائقین بفضائل الثقلین" -

انتظام اللہ شہابی

آسامی مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ

(مترجمہ اختر النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ادیب ماہر جبل پور)

"یہ مضمون ترجمہ ہے اُس انگریزی مقالہ کا جو جناب مولوی شاہ سید محب الحق صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جورہاٹ' واقع آسام نے خاکسار کے خسر بزرگوار جناب بخش الرحمن احمد علی صاحب اور رفیق حیات کیپٹن عبد الرحمن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی کی فرمائش پر قلمبند کیا۔ ہندوستان کے جن دور افتادہ خطوں میں اُردو کا رواج کم ہے وہاں کے مسلمانوں کے حالات سے اُردو دنیا کما حقہ واقف نہیں۔ آسام بھی ایسا ہی حصہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی کچھ کم ۳۰ فی صدی ہے لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی آمد و ترقی کب اور کیوں کر ہوئی۔ فاضل مقالہ نگار نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے تاریخ کے علاوہ اپنی خاندانی معلومات اور آسامی روایات سے خاص طور پر کام لیا ہے۔ چونکہ آپ کو لکھنے کی مزاولت زیادہ تر انگریزی۔ عربی اور آسامی میں ہے اس لئے آپ نے یہ مقالہ انگریزی تحریر فرمایا۔ اور ترجمہ کے لئے خاکسار کو دیا اور اب وہ اردو لباس میں ہدیۂ قارئین ہے۔

فاضل مقالہ نگار آسام کے ممتاز اہل قلم اور مشہور ارباب فضل و کمال میں سے ہیں۔ اسلئے مناسب ہے کہ آپ کے کچھ حالات یہاں بیان کر دئے جائیں۔ آپ آسام کے ایک قدیم و معزز خاندان کے رکن ہیں۔ اور سابق وزیر اعظم آسام سر سید محمد سعد اللہ کے ماموں ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ سید نور الدین صالح پیر سے ملتا ہے۔ حضرت صالح پیرؒ اس خانوادۂ سیادت کے چشم و چراغ ہیں جس کی سلطنت دہلی میں رہ چکی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کو حضرت سے بڑی عقیدت تھی۔ اور انھیں کے ایما سے آپ تبلیغ الاسلام کے لئے آسام تشریف لائے تھے۔ آخر میں آپ نے وفات بھی یہیں پائی۔

فاضل مقالہ نگار کے والد مرحوم الحاج مولانا شاہ سید عبد الرحیم صاحب اپنے زمانہ کے جید عالم تھے اور آسام میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ عربی و فارسی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں جس میں بعض کتابیں نہایت اہم و قیمتی ہیں۔

جناب مولوی شاہ سید محب الحق صاحب اپنے بزرگوں کے اوصافِ حمیدہ کا آئینہ ہیں۔ وہی تواضع و فروتنی ہے، اور وہی صدق وصفا۔ ہر ایک سے خلوص ولگن اور کشادہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور دل میں خدمتِ خلق کی سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ ہرچند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں، مگر زندگی بالکل سادہ بسر کرتے ہیں، نام ونمود کی باتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

آپ کو ادب وتواریخ ولسانیات سے گہری دلچسپی ہے۔ فلسفہ کا مطالعہ مرغوب ہے اور اسلامیات پر خاص درک حاصل ہے۔ عربی سے آپ کو اور آپ کے خاندان کو عشق ہے اور وہ آپ کے یہاں مادری بات کے طور پر بولی جاتی ہے۔ آسامی، بنگالی، اور انگریزی پر بھی آپ کو اچھی دستگاہ حاصل ہے نیز آپ فارسی اور اردو بھی جانتے ہیں۔

آپ کا پایہ تصنیف وترجمہ میں بہت بلند ہے۔ یہ آپ ہی کی ذات تھی جسے سب سے پہلے یہ احساس ہوا کہ آسام کے مسلمانوں کے لئے قرآن شریف کا ترجمہ آسامی زبان میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے کمر ہمت باندھی اور کئی سال کی محنتِ شاقہ کے بعد تن تنہا ترجمہ مکمل کیا۔ اب تک اس ترجمے کے کئی اجزا شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ایک اور کتاب موسومہ "فلسفۂ زندگی" انگریزی میں تصنیف کی ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب بھی مدت کے مطالعہ اور غور وخوض کا نتیجہ ہے۔ اس میں مصنف نے بڑی دقیقہ رسی سے کام لیا ہے۔ اور تمام مباحث پر بالکل جدید زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ درحقیقت بڑی قابلِ قدر کتاب ہے، اور مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجہ کے دستور العمل کا حکم رکھتی ہے۔

آپ کہنہ مشق مضمون نگار بھی ہیں، چنانچہ آپ کے بہت سے عالمانہ مضامین انگریزی اور آسامی رسائل میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ چونکہ آپ کو مختلف علوم پر عبور حاصل ہے، اسلئے آپ کے مضامین میں خوشگوار تنوع ہوتا ہے۔ آپ کا وہ سلسلۂ مضامین علمی حلقوں میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا گیا تھا جو آپ نے عربی و آسامی زبانوں کے لسانیاتی رابطہ پر لکھا تھا اور عرصہ تک آسامی پریس کی زینت رہا تھا۔ اس دورِ قحط الرجال میں مسلمانوں کے لئے آپ کا دم بسا غنیمت ہے۔"

اختر النساء

ابتدائی تاریخ آسام سے میری مراد آسام کی وہ وادی ہے جو ڈھوبری سے لیکر ڈبروگڑھ تک ہے۔

کام روپ میں مسلمان بارھویں صدی عیسوی تک آسام میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ البتہ جب بختیار خلجی اسی صدی میں فرماں روا ہوا تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ بنگال۔

بہار اور اڑیسہ سے ہجرت کرکے آسام میں داخل ہوا اور دھوبری گوال پاڑہ اور کامروپ میں گوہاٹی کے نیچے تک یعنی دریائے برہم پتر کے جنوبی کنارے تک آباد ہوگیا۔ یہ نو وارد مسلمان کبھی دریائے برہم پتر کو پار کرکے دوسری طرف نہیں آئے کہ وہاں بھی رہتے بستے اب تک چناں چہ گوہاٹی سے ڈبروگڑھ تک کوئی مستقل آبادی نہ تھی۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً بعض قسمت آزما مسلمان ضلع سیب ساگر تک پہونچ جاتے تھے اور کہیں کہیں عارضی اقامت اختیار کرلیتے تھے۔ یہاں یہ لوگ اجنبی یا غیریا[1] تصور کئے جاتے تھے۔ ان کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُن شہری حقوق سے بھی محروم تھے جو کامروپ کے مسلمانوں کو حاصل تھے۔ غرض شمالی آسام میں سولھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی کوئی نوآبادی قائم نہیں ہوئی۔ اس عہد میں وہ برابر "غیریا" کے نام سے مشہور رہے لیکن اب یہ لفظ حقارت کا سمجھا جاتا ہے۔

آجن پیر اور نبی پیر

سترھویں صدی عیسوی میں آل فاطمہ کا ایک شاہی خاندان بغداد میں تھا۔ سب سے بڑے صاحب زادے نے (جو بعد میں آجن پیر کے نام سے مشہور ہوئے) اپنے باپ کی زندگی میں ہی دنیا کو چھوڑ دیا تھا اور درویشی مسلک اختیار کرلیا تھا لیکن قدیم ارث کے اصول پر باپ کی وفات کے بعد ریاست کے وارث وہی تھے۔ چنانچہ جب باپ نے وفات پائی تو لوگ حضرت آجن پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کرنے لگے کہ آپ ریاست کا انتظام سنبھالیں مگر انھوں نے صاف انکار کردیا اور روحانی مجاہدوں میں مصروف رہنے کو ترجیح دی۔ اب تمام لوگ اور خود اُن کے اقربا راضی کرنے کے لئے زور ڈالنے لگے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ آخر جب دیکھا کہ لوگوں کی ترغیب و تحریص اور منت و سماجت کو رد کرتے جانا ممکن نہیں رہا تو چپکے سے فرار ہو جانے کا فیصلہ کرلیا۔ لہذا اپنے رفیق نبی پیر اور چند مریدوں کو ساتھ لیا اور تری کی راہ ہندوستان کی طرف نکل گئے چٹگاؤں پہونچ کر جہاز سے اُترے اور یہاں سے دریائے برہم پتر کے راستے سیب ساگر آئے جہاں مع اپنی جماعت کے سکونت اختیار کرلی۔ ضلع سیب ساگر میں آئے، تھوڑے ہی عرصہ ہوا تھا کہ حضرت آجن پیر سے کسی بات پر گڑگاؤں اور ناظرہ کا اہوم راجہ ناراض ہوگیا اور اُس نے بہ طور سزا ان کی آنکھیں نکلوا دیں مگر اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو وہاں رہنے کی جو اجازت ملی تھی وہ قائم رہی۔

---

[1] غیریا عربی لفظ غیر سے ماخوذ، بہ معنی دیگر، دوسرا، اجنبی، پردیسی۔

شاہ شجاع آسام میں

اسی زمانے میں شاہ جہاں دہلی کا شہنشاہ تھا جس کے بیٹے داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب، مراد تھے۔ ناگہاں اورنگ زیب نے باپ کو تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا، اور اپنے شہنشاہِ دہلی ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے بھائیوں سے جنگ شروع کی اور انھیں قتل کرنے لگا۔ جب شاہ شجاع کو اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ آسام میں آکر پناہ گزیں ہوا۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی اور شاہی مغل خاندان کے باون (۵۲) افراد تھے۔ اس وقت گرگاؤں اور ناظرہ پر اہوم خاندان کے راجہ جے داس سنگھ کی حکومت تھی، وہ سمجھا کہ شجاع آسام پر حملہ کرنے آرہا ہے، اس لئے مقابلے کو باہر نکلا۔ لیکن شاہ شجاع اور اُس کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا اور قیدی بننا منظور کر لیا۔

میر جملہ کا حملہ آسام پر

شدہ شدہ یہ خبر اورنگ زیب کو ملی کہ شجاع اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خیریت سے آسام پہونچ گیا ہے اور اہوم راجہ سے رشتہ مودت قائم کر چکا ہے اور اب اُس کی مدد سے سلطنت حاصل کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس خبر سے اورنگزیب فکر پیدا ہوگئی۔ وہ اُس کے حملے کے دفعیہ بلکہ استیصال کی تدبیروں میں لگ گیا۔ چنانچہ بعجلت تمام ایک مہم میر جملہ کی سرکردگی میں آسام روانہ کی۔ چونکہ اس مہم میں بڑے خطرات اور سخت مشکلات پیش آنے کا احتمال تھا، اس لئے دعاء برکت کے لئے حضرت سید شاہ نور الدین صالح پیر کو ہمراہ کر دیا۔ یہ بزرگ اورنگ زیب کے دربار میں شاہی مُرشد تھے اور اُس خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ تھے جس کی سلطنت دہلی میں رہ چکی تھی۔

جب شجاع اور اُس کی جماعت نے سُنا کہ میر جملہ آسام پر فوج کشی کرنے والا ہے تو سخت اندیشہ پیدا ہوا اور یقین ہوگیا کہ میر جملہ کو آسام بھیجنے میں اورنگ زیب کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان سب کو گرفتار کیا جائے۔ اس لئے انھوں نے کوشش شروع کی کہ حتی الامکان میر جملہ کی پہونچ سے باہر رہیں۔ چنانچہ اپنی سلامتی اور خیریت کے خیال سے انھوں نے راجہ کو حسب ذیل مشورہ دیا۔

"اورنگ زیب بے حد طاقت ور ہے۔ اُس کے عساکر آپ کے لشکر سے ہزار گناہ بڑھ کر ہیں۔ آپ کسی طرح اُس کے مد مقابل نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ میر جملہ سے لڑے تو آپ کو بُری طرح شکست ہوگی اور آپ کا ایک ایک آدمی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ آپ گرگاؤں سے نکل جائیں اور محفوظ و مامون رہیں۔ میر جملہ یقیناً گرگاؤں پر اور آپ کے محل کے رنگ گھر پر قابض ہو جائے گا اور کچھ شک

نہیں ہیں۔ وہ یہاں قیام بھی کرے گا۔ لیکن یہ تھوڑے ہی عرصے کے لئے ہوگا۔ یہ لوگ آسام کی بارش اور یہاں کی دیگر متعلق مشکلات کے بالکل عادی نہیں ہیں، اسلئے مستقل قیام نہ کر سکیں گے بلکہ آگے چل کر مجبور ہو جائیں گے کہ آپ کا ملک آپ کو دے کر شمالی ہند کو واپس چلے جائیں۔"

جے راج سنگھ جے پور کو بھاگتا ہے

آہوم راجہ نے یہ مشورہ مان لیا اور تصفیہ کر لیا کہ گرگاؤں خالی کر کے جے پور میں پناہ لے۔ لہٰذا لشکرِ جرار اور کثیر سامانِ جنگ ہونے کے باوجود فوراً گرگاؤں خالی کر دیا اور جے پور چلا گیا۔ شجاع کی پوری جماعت بھی ساتھ گئی اور کسی پوشیدہ جگہ رہنے لگی۔ اب شجاع کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اگر میر جملہ نے ملک کے بچنے کے لئے میرے حوالے کئے جانے کی شرط لگا دی تو کہیں راجہ مجھے اُس کے سپرد نہ کر دے۔ اس لئے اُس نے اپنی جماعت کو تو جے پور میں چھوڑا اور بیوی کو ساتھ لے کر سادیہ ہوتا ہوا برما کی طرف نکل گیا۔ آخر اراکان پہونچ کر قیدِ زیست سے آزاد ہو گیا، جہاں اُس کے اور اُس کی بیوی کے مقبرے اب تک موجود ہیں۔

میر جملہ کا قبضہ آسام اور کارنگ گھر پر

میر جملہ نے بغیر کسی جنگ کے آسام کو فتح کر کے اورنگ زیب کی سلطنت میں شامل کر دیا اور خود گرگاؤں میں جے داس سنگھ کے کارنگ گھر نامی محل میں رہنے لگا۔ مگر جلد ہی آسام کی مرطوب آب و ہوا نے اس جماعت کی تندرستی و آرام میں خلل ڈالنا شروع کر دیا۔

چونکہ برسات کا زمانہ تھا، اس لئے مشکلات و تکالیف بے حد بڑھ گئیں اور اب یہ آرزو پیدا ہوئی کہ جتنی جلد ممکن ہو واپس چلیں۔ چنانچہ میر جملہ اور جے راج سنگھ کے درمیان نامہ و پیام شروع ہوا اور انجام کار صلح کی شرائط طے ہو گئیں۔

میر جملہ اور جے راج سنگھ کا صلحنامہ

صلح نامہ کی جو شرائط دونوں نے طے کیں اُن کی رُو سے قرار پایا کہ میر جملہ کارنگ گھر اور آسام خالی کر دے۔ جے داس سنگھ اورنگزیب کا باج گزار ہو کر پھر کارنگ گھر میں آ جائے اور آسام کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے۔ نذرانے کے طور پر راج کماری رمنی کو مع ستر ہاتھیوں اور زرِ کثیر کے اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کرے۔ تبلیغ اسلام کے لئے مسلمانوں کی آبادی قائم کرے۔ حضرت صالح پیر کو شاہی مرشد کی حیثیت سے، نیز ایک "نواب" اور ایک "فارسی پڑھیا" کو اورنگ زیب کے مستقل نمائندوں کے طور پر اپنے یہاں رکھے۔ متفرق جاگیریں حضرت صالح پیر، حضرت آجن پیر، حضرت نبی پیر کو نیز آسام کی مجوزہ

سلامی آبادی کے سرکردہ افراد کو بخشے، ساتھ ہی مسلم نوآبادکاروں کے آرام وضروریات کے
ش نظر مسلمان پارچہ باف، خیمہ گر، دھوبی، حجام وغیرہ کو باہر سے بلاکر بسائے۔

حضرت صالح پیر اس لئے تھے کہ وہ اورنگ زیب کی جانب سے راجہ کو دعاؤ برکت دیں۔
نواب صاحب" راجہ کے دربار میں اورنگ زیب کے نمائندے تھے۔ "فارسی پڑھیا" وزیر ترجمہ
رجہ کی حیثیت سے تھا اور فارسی کی اُس تمام خط وکتابت کا ذمہ دار تھا جو جے دراس سنگھ اور اورنگ زیب
لے درمیان ہوتی تھی، کیونکہ فارسی ہی مغل بادشاہوں کی درباری زبان تھی۔

مسلم نوآبادی

نامہ وپیام کے تکمیل کو پہونچ جانے کے بعد میر جملہ اپنی فوج کے ساتھ دہلی کو واپس
چلا گیا اور اپنے ہمراہ رمنی کماری کو بھی مع دیگر تحائف کے لیتا گیا۔ راجہ نے گرگاؤں
ے قرب وجوار میں ایک سڑک کماری کی یادگار میں تعمیر کرائی۔ حضرت صالح پیر کو روحانی مجاہدات
ے لئے آسام بڑا موزوں نظر آیا۔ اس لئے انھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی اور دہلی سے
پنے اہل وعیال نیز دیگر مسلم نوآبادکاروں کے آنے تک اعتکاف میں بیٹھے رہے۔ میر جملہ نے وہاں
و پہنچ کر حضرت صالح پیر کا خاندان آسام بھیج دیا۔ وہ ایک بیوی، چار لڑکوں اور شبال پیر
ی چھوٹے بھائی پر مشتمل تھا۔ اُن کے ہمراہ خیمہ گر اور بہت سے معزز و باکمال مسلمان اپنے اپنے
ل بچوں کے ساتھ آگئے۔ اِن لوگوں کے بسنے کے لئے گرگاؤں سے سات میل کے فاصلے پر ٹولے بگن
ے قریب جگہ دی گئی، بعد میں یہی بستی غیر یا پاتھر اور غیر یا پکھری کے نام سے مشہور ہو گئی۔

نوآبادکاروں نے حضرت صالح پیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور شجاع کے جو ساتھی آسام میں
رہ گئے تھے وہ حضرت اجن پیر اور حضرت نبی پیر کے مُرید ہوئے۔ جو چند مسلمان پہلے سے شمالی
سام میں آباد تھے اُن میں سے بعض نے حضرت صالح پیر کو اپنا مرشد قرار دیا اور بعض نے
وسرے دو بزرگوں کو۔

ایک مدت کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو اُن میں سے کچھ گرگاؤں اور ناظرہ
چلے گئے اور ایک صدی کے اندر اندر سادیہ سے گوہاٹی تک تمام آسام میں پھیل گئے۔

شبال[1] پیر سن شعور کو پہونچنے پر غیر یا پاتھر سے گرگاؤں منتقل ہو گئے۔ اور وہاں
لنے کے ایک سرکاری کھیت میں رہنے لگے۔ اِس پر سے اُن کا نام "کھیار باڑ یا دیوان"

---

[1] شبال یا شوال بمعنی لڑکا۔

پڑگیا۔ حضرت صالح پیر ہمیشہ جھینے راجہ کو دعا و برکت دینے کا رنگ گھر آیا کرتے تھے۔ بعد میں فیرو پربت پر معتکف ہو گئے اور لوگ انھیں "پربتیا دیوان" کہنے لگے۔

حضرت آجن پیر اور حضرت نبی پیر نے نو وارد مسلمانوں کے خاندانوں میں شادیاں کریں۔ لیکن بعد میں حضرت نبی پیر اپنے اہل و عیال کو سب ساگر میں چھوڑ کر کام روپ چلے گئے اور وہاں دوسری شادی کرلی۔ اِن بزرگوں کو اہوم راجہ نے "دیوان"[1] کا جو لقب دیا تھا وہ اُن کے روحانی اوصاف کی وجہ سے تھا۔

اختر النساء (جبلپور)

---

[1] دیوان ۔۔۔۔ آسامی زبان میں دیواگ (بہ یائے مجہول) اور دیوانگ وغیرہ کی شکلوں میں آتا ہے۔ سنسکرت کے لفظ دیو (بہ یائے مجہول) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خدا۔ لہٰذا دیوان کے معنی ہوئے "اوصافِ ایزدی سے متصف

لمعاتِ اختر

(از نفیسہ اختر صاحبہ لکھیم پو کھیری)

اِس قوم کو کمزور سمجھنا غلطی ہے — اس بات کے شاہد ہیں جہاں دیدہ ستارے
ایسا نہ ہو اے دوست تری کم نظری سے — اس "ارضِ مقدس" پہ بہیں خون کے دھارے
مسکرائے ہیں رات کو تارے — کتنے روشن ہیں، بے شمار ہیں ہم
لیکن اختر نمودِ صبح کہیں — ان کی محفل کو کر نہ دے برہم
دم بھر میں پلٹ دوں گا نظامِ ہستی — انسان کی قسمت کا ستارہ ہوں میں
کم مایہ سمجھ کے مری تحقیر نہ کر — "اے کثرتِ خاشاک" شرارہ ہوں میں
گھٹائیں چھا رہی ہیں سمتِ مغرب — فضائیں تھرتھرائی جا رہی ہیں
نہ گل ہو جائے شمعِ امنِ عالم — ہوائیں غیر ہوتی جا رہی ہیں
اے قوم تجھے عظمتِ رفتہ کی قسم ہے — اک بار پھر اندازِ اخوت کے دکھائے
تفریق مٹے شانہ بشانہ ہوں مسلماں — بگڑی ہوئی تقدیرِ زمانہ کی بنائے

بزمِ مُصنّف

حافظ محمد عبدالرحیم صاحب مکتبہ رضیہ آگرہ | کانفرنس اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ پر آپ کا مرسلہ رسالہ ملا۔ آپ صاحبان بڑا عظیم الشان مقصد لے کر اُٹھے ہیں۔ اس کے مقاصد سے ہندوستان کے ہر مسلمان کو ہمدردی ہے۔ خدا آپ کی مساعی کو بارآور کرے۔

اکیڈمی کے پروپگنڈا کے لئے میری حقیر خدمات کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ اس کے علاوہ جب تک اکیڈمی کا اپنا پریس قائم نہیں ہوتا اگر میرا پریس آپ کے کام آسکے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ جو کتابیں شائع ہوں وہ ظاہری حسن طباعت کے لحاظ سے نہایت شاندار ہونی چاہئیں۔ تاکہ اکیڈمی کے شایانِ شان ثابت ہوں۔

نواب صدر یار جنگ بہادر، خان بہادر پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی۔ خان بہادر سید آلِ نبی صاحب نقوی اور خان بہادر کرنیل مقبول حسین صاحب قریشی کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجئے۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ و معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن | اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ کا قیام ایک بہت ہی مفید کام ہے جو دُور رس نتائج کا ذمہ دار ہے۔ آپ کی بنا پر خاموش طبیعت اپنے اندر ایسے ایسے بلند عزائم رکھتی ہے کہ انشاء اللہ اُردو اور اسلامیانِ ہند اُس سے بہت فائدہ اٹھا سکیں گے۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے بہت متاثر ہوا۔

مجھے اکیڈمی کی مجلس انتظامی میں شامل کیا گیا ہے لیکن اتنی دُور کا سفر فی الحال تو آسان نہیں ہے بہرحال دُور ہی سے جناب نواب صدر یار جنگ بہادر اور محترم قریشی صاحب کا شکرگزار رہوں گا اور آپ حضرات کی مساعی کے کامیاب نتائج کے لئے دعاگو۔

مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی جنرلسٹ حیدرآباد دکن | میرے مضامین خشک اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں، نہیں معلوم مصنّف کے ناظرین کو کہاں تک پسند ہوتے ہوں گے۔ آج ایک جدید تصنیف موسومہ "عہد آصفی میں قدیم تعلیم" ذریعہ رجسٹری روانہ

خدمت ہوئی ہے۔ امید ہے کہ مصنف کی آئندہ اشاعت میں اس پر ریویو فرمایا جائے گا۔ مقالے کے دو حصے ہیں جو ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

اکثر و بیشتر ریویو کا حصہ بیگم صاحبہ (سیدہ انیس فاطمہ) کے خامۂ فضیلت نگار کا رہین منت ہو ہے۔ اس کے علاوہ بھی بیگم صاحبہ کے مضامین بصیرت افروز۔ معلومات آفریں ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ اور دلکش بھی۔ اگر بیگم صاحبہ ہی تکلیف فرما کر تنقید کریں تو موجب کرم ہوگا خصوصاً جب کہ کتاب میں تعلیم نسواں کا تفصیلی تذکرہ شامل ہو۔

چودھری محمد اقبال سلیم صاحب گاہندری نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن

جب "مصنف" نظر سے گزرتا ہے۔ آپ کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی کی داد دینی پڑتی ہے کہ بالکل زمانہ کے مذاق اور خیال کے خلاف آپ نے ایک ایسے رسالہ کا اجرا کر رکھا ہے جس کے پڑھنے والے ہندوستان میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ علمی اور ادبی جہاد ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو ثابت قدم رکھے۔ اس وقت میرے سامنے اپریل ۴۶ء کا مصنف ہے اس کی "بزم مصنف" میں مولانا شہاب مالیر کوٹلوی کا خط پڑھا، کہ ایک خیال پیدا ہوا کہ ۴۴ء میں اس پر میں نے آپ سے تبادلہ خیال کیا تھا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے علمی و ادبی مقالات کتابی شکل میں شائع ہونے چاہئیں۔ میں اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔

آج ذریعہ رجسٹرڈ پارسل چار کتابیں بھیج رہا ہوں اگر آپ تبصرے کا وعدہ کریں تو آپ کے ہر پرچہ کی اشاعت کے لئے چار کتابیں بھیجتا رہوں گا۔ جناب نواب صدر یار جنگ بہادر کی کتاب "علمائے سلف" مجھے بھجوا دیجئے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

نواب زادہ مرتضےٰ علی خاں صاحب ماہم بمبئی

یہ سال "سال نکوست" میں داخل ہے کہ بجمدہٗ "مصنف" کے دونوں پرچے یعنی جنوری اور اپریل کے ملگئے۔ ماشاء اللہ مضامین ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ جنوری کے پرچے میں "روسی ادب کی عالم گیر اہمیت" پُر از معلومات اور دلچسپ مقالہ ہے۔ ... احمد کیا لطیف احمد صاحب ہیں؟ ایک لطیف احمد "کالج" میں میرے زمانہ میں تھے اکبر آباد کے رہنے والے تھے اور ان کے والد غالباً وہاں کے نامور شہر تھے۔ انھیں لطفو کہا جانے لگا تھا۔ جو "لطف تو" کا مخفف تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ مدرسے کی گولیوں کا پارٹ تھا جس سے یارانِ طریقت نے "ماربل بازی" کی تھی جب انھوں نے بازپرس فرمائی تو صاحب موصوف "لطفِ تو" کا صیغہ گردان دیا گیا جو آگے چل کر "لطفو" رہ گیا تھا۔

"اُف رے کالج۔ ہائے زمانے"

"حضرت محل" پر بیگم الطاف علی صاحبہ کا مضمون ماشاء اللہ تاریخی حیثیت سے نہایت ہی وقیع، درد انگیز اور سبق آموز ہے۔ واقعہ ہے کہ عورت ہی عورت کے حالات کو دلکش بنا سکتی ہے۔ مرد کی تحریر میں یہ لوچ کہاں سے آئے۔ پرنس قدر مرحوم کے انتقال کا ہمارے خاندان پر ایک خاص اثر پڑا۔ پرانے مراسم اور قرابتوں کی وجہ سے پرنس مرزا جہاں قدر بہادر مرحوم نے جو واجد علی شاہ کے بھتیجے تھے۔ میرے دو بڑے بھائیوں کی نسبت پرنس قدر مرحوم کی دو صاحبزادیوں سے ٹھیرائی تھی۔ چنانچہ امام ضامن کی رسم بھی ادا ہو چکی تھی کہ اس گھر سے سات نعشیں ایک ساتھ نکلیں انگریزی ترکش کا یہ تیر بھی نشانہ پر بیٹھا اور اودھ کا یہ آخری چراغ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں نے اس مضمون کو کئی بار پڑھا کہ اپنوں کا تذکرہ تھا۔ بھابی صاحبہ مبارکباد قبول کریں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مضمون "نواب صدر یار جنگ" (از مولوی عبدالشاہد خاں شروانی) نہایت دلچسپ مقالہ ہے۔ ایسے مضامین کی مسلمان نوجوانوں کو سخت ضرورت ہے تاکہ وہ ان قابل قدر ہستیوں کی تقلید کو اپنا شعار بنائیں۔

اپریل کے پرچہ میں "مولانا طفیل احمد مرحوم" پر آپ کا اداریہ بہت ہی پُر اثر ہے علیگڑھ کو خصوصاً اور سمجھدار مسلمانوں کو عموماً اُن کے انتقال سے جو نقصان پہونچا ہے اُس کی تلافی بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

"بحیرۂ روم کی اسلامی تاریخ" (از پروفیسر ابرار حسین فاروقی ایم۔ اے) ایک اہم تاریخی اور سیر حاصل مقالہ ہے۔ دوسرے مضامین بھی اعلیٰ پیمانہ کے ہیں۔

میر تقی میر پر مضمون (از سید لطیف حسین ادیب بریلوی) "خاص نظر سے لکھا گیا ہے۔ صاحب مضمون کا مطالعہ گہرا ہے اور ماشاء اللہ مذاق سلیم ہے۔ اُن کے انتخابی اشعار میں جی چاہتا ہے کہ میر کے اس شعر کو بھی شامل کردوں: ؎

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جئے عمر نے ہم سے بے وفائی کی

"قصیدہ ہفت بند" (از راجہ رتن سنگھ بہادر) ملا حسن کاشی کے ہفت بند کا چربہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ راجہ نے ہر بند کے آخر میں ایک بیت زیادہ کر دی ہے۔ اکثر اشعار میں لفظی اور معنوی تصرفات بھی ہیں جو دونوں قصیدوں کے موازنے سے صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ ملا کاشی کے قصیدہ کا

پہلا شعر یہ ہے ؎

السّلام اے سایۂ ذات خورشید ربّ العالمیں ۔۔۔ آسمانِ عزّ و تمکیں آفتابِ داد و دیں

مصنف کا مطالعہ میں اس طرح کرتا ہوں کہ جب پرچہ ملا اُسے ایک دفعہ شروع سے آخر تک دیکھ گیا پھر رکھ دیا۔ فرصت ملنے پر پچھلے مجلّے نکالتا ہوں اور بالاستیعاب پڑھتا ہوں۔ چنانچہ آج آٹھواں مجلّہ پڑھ رہا تھا کہ ایک تاریخی سہو پر نظر پڑی " ظفر کی شاعری " (از مولوی حسن عبد اللہ صاحب ایم۔ اے) کے ضمن میں صاحب مقالہ تحریر فرماتے ہیں۔ " دہلی پر مرہٹوں اور جاٹوں کی یورش ہوئی۔ شاہ عالم ثانی دلّی سے بھاگے اور انگریزوں کی پناہ میں الٰہ آباد رہے "۔

یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ جب عالمگیر ثانی وزیر غازی الدین خاں کی سخت گیری اور دباؤ سے عاجز آگیا تو شاہزادہ علی گوہر (جو بعد کو شاہ عالم ہوئے) کو غازی الدین خاں کی معیت میں بہار کی سند جاگیر دے کر روانہ کیا۔ اصل مطلب یہ تھا کہ علی گوہر امرائے ہندوستان سے تعاون کرکے عالمگیر کو اس وزیر کی قید و بند سے نجات دلائے۔ قبل اس کے کہ شاہزادہ روانہ غازی الدین کو خبر مل گئی اور اس نے شاہزادے کو اُس مکان میں جس میں کہ وہ مقیم تھا محصور کردیا۔ لیکن شاہزادے نے بڑی جواں مردی دکھائی اور شمشیر بکف دشمنوں کے ہاتھ سے نکل کر اور دریائے جمنا کو پار کرکے نجیب الدولہ کے پاس چلا گیا۔ وہاں زیادہ کامیابی نہ ہوئی تو فیض آباد شجاع الدولہ کے پاس پہونچا۔ شجاع الدولہ اور محمد قلی خاں کی مدد سے بہار پر حملہ آور ہوا۔ لیکن بہار کے نائب صوبہ کو انگریزوں کی مدد پہونچی اور شاہزادہ کو پٹنہ میں شکست ہوئی۔ بعد کو دوسرا حملہ کیا پھر شکست ہوئی اس اثنا میں اُسے خبر ملی کہ غازی الدین خاں نے عالمگیر ثانی کو فیروز شاہ کے کوٹلے میں دھوکے سے قتل کرا دیا ہے۔ اُس وقت نواب منیر الدولہ (میرے مورثِ اعلیٰ) کے مشورے سے شہزادہ علی گوہر نے شاہ عالم کا خطاب اپنے لئے تجویز کیا اور تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ ساتھ ہی نواب منیر الدولہ کو بحیثیت سفیر احمد شاہ ابدالی کے پاس روانہ کیا۔ جس کا نتیجہ ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی لڑائی تھی۔ شاہ عالم ۱۷۵۹ء سے ۱۷۷۱ء تک الٰہ آباد میں مقیم رہے۔ جب مرہٹوں نے قلعۂ دہلی پر قبضہ کرلیا اور شاہ عالم کی والدہ وغیرہ کو حراست میں لے لیا تو شاہ عالم ۱۹ اپریل ۱۷۷۱ء کو دلّی سدھارے۔

میرے مورثِ اعلیٰ رضا قلی خاں (منیر الملک منیر الدولہ نادر جنگ) بحیثیت ایرانی سفیر محمد شاہ کے

زمانہ میں شاہ طہماسپ ثانی صفوی کے فرستادہ ہندوستان آئے تھے یہاں دو برس رہے بعد ازاں جب نادر شاہ قندھار آیا تو اُس نے انھیں بلالیا۔ اور وہ اُس کے ساتھ ہندوستان واپس آئے۔ نادر شاہ نے اپنا سفیر بنا کر دربار محمد شاہی میں چھوڑ دیا۔ نادر شاہ کے مرنے کے بعد یہ احمد شاہ دُرّانی کے وزیر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں اُن کا بڑا کارنمایاں یہ تھا کہ انھوں نے احمد شاہ درّانی کو کہ جس سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ جب وہ لاہور تک آگیا تھا تو اُسے دلّی پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے بعد یہ عالمگیر ثانی کے وزیر ہوئے جس نے شاہزادہ علی گوہر کو اُن کے سپرد کر کے بہار روانہ کیا۔ الہ آباد سے شاہ عالم کے دلّی آجانے کے بعد نواب منیر الدولہ ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء تک کوڑہ اور الہ آباد کے گورنر رہے۔ ۱۷۷۳ء میں وارن ہیسٹنگز نے کوڑہ اور الہ آباد کو بادشاہ سے چھین کر پچاس لاکھ روپے میں شجاع الدولہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اسی سال نواب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔

نواب منیر الدولہ جہاں شاہ شاہ ایران اور سلطان قرا یوسف بادشاہ تبریز و آذربائیجان کی اولاد میں تھے۔ ان کے اجداد کی سلطنت صفویوں کے ہاتھ پر تسلیم ہوئی۔ یہی بھائی ہمارا خاندان ہے۔ ہم ہندوستان کے اُن امرا کی اولاد میں نہیں ہیں جنھوں نے غداری کر کے سلطنت مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نیشاپور کے بساطیوں نے بساطِ شاہی تو بچھائی مگر انگریزوں کے غلام رہے۔ اودھ کی بادشاہی ایک تیر تھا جو سلطنت مغلیہ کے کلیجے کو چھیدتا ہوا پار ہو گیا۔ تیر وہ بھی نہ رہے، یہ بھی نہ رہیں گے۔ میری کتاب میں جو نواب منیر الدولہ بہادر پر ہے، اُس میں سب کچھ ہے۔ میں نے طباعت کے لئے لندن بھیج دیا ہے۔ دعا کیجئے کہ جلد چھپ جائے تاکہ ایک کاپی حاضر کروں۔

مولوی عبد الشکور صاحب ایم۔ اے پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور | عرصہ سے آپ کی خیریت دریافت نہ ہوئی۔۔۔ "مصنف" آیا تھا۔ اُس کو اطمینان کے ساتھ پڑھا اور لطف حاصل کیا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ ایک انگریزی جریدہ بھی نکال رہے ہیں۔ اللہ تعالے کامیاب فرمائے۔

مولوی ابو الفضل صاحب صدیقی بدایونی | محترمہ سیدہ انیس فاطمہ کے دو تاریخی اور سیاسی مقالے بعنوان "جنرل بخت خاں روہیلہ" اور "اودھ کی جاں باز ملکہ حضرت محل" مطبوعہ مصنف جون ۱۹۴۵ء و جنوری ۱۹۴۶ء نظر سے گزرے اور بے اختیار زبان سے نکلا ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اوّل تو موضوع ہی کیا کم ولولہ انگیز تھے۔ اُس پر طرزِ نگارش کی نشتریت اور بیان کا خلوص۔ میری رائے میں اگر یہ دونوں مقالے کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو علاوہ تاریخی خدمت کے ایک سیاسی خدمت بھی ہوگی جو موجودہ نسل کی ذہنی پرورش کا نہایت کامیاب ذریعہ ہوگی۔ اور شاید ایسی ہی چیزیں آیندہ نسلوں کو اپنی قابلِ فخر تاریخ دوہرانے کا سبق پڑھائیں کہتے ہیں کہ ماں کی گود بچہ کا پہلا اسکول ہے۔ کاش اب سے نصف صدی پیشتر ملک نے بہن انیس فاطمہ جیسی مائیں پیدا کی ہوتیں تو شاید ہماری قوم بہت پیشتر اپنی حالت سے آگاہ ہو جاتی۔

مولانا الیاس حسین صاحب سرآباد اودھ | مصنف مطبوعہ ماہ اپریل ۴۶ء کو اول سے آخر تک بغور تمام دیکھا۔ اُسے "نقاشِ نقش ثانی بہتر کشند ز اوّل" کا مصداق پایا۔ اس رسالہ کے مضمون نگار نہایت قابل اور بے نظیر ادیب و دبیر ہیں۔ بڑے سے بڑے مضمون کو نہایت آسان اور ایجاز و اختصار اور جامعیت و ہمہ گیری کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جیسے مضمون نگار ہیں۔ ویسے ہی مرتب بھی ہیں۔ جب کسی رسالہ کے مضمون نگار لائق اور قابل ہوں اور اُس کی ترتیب کا اسلوب صحیح نہ ہو تو اُس رسالہ کی آب و تاب اور خط و خال میں بڑا فرق نظر آنے لگتا ہے اور اُس کی خوبی اور خوشنمائی باقی نہیں رہتی۔ اگر کسی رسالہ میں کوئی خاص صفت نہ ہو لیکن مرتب صاحب نے اُسے نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا ہو تو اُسے امتیازی درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بالکل اُسی طرح اگر کوئی شعر اچھا ہو لیکن پڑھنے والا شعر خوانی کا سلیقہ نہ رکھتا ہو تو شعر کی شان باقی نہیں رہتی۔ مجھے قوی امید ہے کہ مصنف ترقی کر کے ملک کے مشہور علمی رسالوں میں خاص اور نمایاں درجہ حاصل کرے گا۔

امام بخش صہبائی شہید دہلوی کے حالات میں جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی کے مضمون میں وہ معمّا کسی نامعلوم سبب سے نہیں لکھا گیا جس کے ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں۔ کاش اُسے مع تشریح کے لکھ دیا جاتا۔

محترمہ نفیسہ اختر صاحبہ لکھیم پور کھیری | آپ کا رسالہ مصنف مجھے بہت پسند آیا۔ جو نیا رسالہ شائع ہو میرے نام وی۔ پی بھیج دیا جائے۔ ایک بات عرض کردوں کہ اگر آپ کے مصنف میں دو۔ تین معیاری نظمیں بھی شائع ہو جایا کریں تو اُس کی خوبیوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں اپنی خدمات پیش کر سکتی ہوں۔

سیّد حبیب الرحمٰن صاحب منیجر رسالہ "نئی زندگی" الہ آباد | نئی زندگی کا پاکستان نمبر ارسال ہے

ہم لوگ آپ کے خیالات اس نمبر سے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ "حضرت محل" "نئی زندگی" میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ پرچہ بھی ہمراہ ہے۔ بہت خوب مضمون ہے۔ محترمہ سیّدہ انیس فاطمہ سے درخواست ہے کہ وہ نئی زندگی کو اپنی قلمی مدد سے امداد پہونچائیں۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

مدتوں سے آپ نے "لطف ملاقات" سے محروم رکھا ہے۔ اس سے قبل دو نیاز نامے حاضر خدمت ہو چکے ہیں جن میں سے ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ پہلا خط "مصنف" میں نظر سے گزرا جس نے "دریا رتنک" "اپنی" "رسائی" کا ثبوت دیا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اب آپ اپنے علمی دائرہ کو وسیع کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا بین ثبوت "روہیلہ" کا جنم ہے۔ پیش از وقت مبارکباد قبول فرمائیے "مصنف" میں ابکی مرتبہ عزیزہ انیس فاطمہ آپ کی "اسسٹنٹ" کے طور پر نظر آ رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مہدی مرحوم کا یہ فقرہ یاد آ گیا:۔

"عذرا میری اسسٹنٹ ہو تو اردو لٹریچر میں جان پڑ جائے!!"

مہدی مرحوم کو تو "عذرا" ملی ہو یا نہ ملی ہو، لیکن آپ کی خوش قسمتی میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ خدا سے دعا ہے کہ یہ جوڑا اپنی ادبی اور علمی تخلیق میں بھی "تکاثر" کا ثبوت دے اور زبان و ادب کی خدمات سے تمام ملک کو فائدہ پہونچائے، آمین!۔

عزیزہ سیّدہ ابکی مرتبہ بجائے مضمون نگار کے "نقاد" بن گئی ہیں، لیکن یہ آگے چل کر کہیں خطرناک نہ ثابت ہو؟ ان کے تبصرے یوں تو بہت ہی پرلطف ہیں لیکن "راز ترقی" کے تبصرہ میں انھوں نے غضب کیا کہ اردو کے ایک افسانہ نگار کو "زندہ درگور" کر دیا! ان کے بعد والے "بزرگ" کے ساتھ اگر یہ سلوک ہوتا تو نامناسب نہ تھا، لیکن یہ بیچارے تو ابھی "ڈھلتی ہوئی چھاؤں" بھی نہیں ہیں۔ ان کے والد مرحوم مولوی سیّد ممتاز علی صاحب کی بجائے خود ان کا نام سہواً درج ہو گیا ہے۔ ہاں نگار کے انتقاد نمبر کی تنقید میں یہ فقرہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"وہ ایک ایسی کسوٹی ہیں جس پر سونا کندن بنتا ہے" کیا سونے اور کندن میں کوئی فرق ہے؟ آگے چل کر فرماتی ہیں:۔

"مستقبل میں انھیں کی بنائی ہوئی شاہراہوں پر چل کر ہماری نوخیز نسلیں اردو کو دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان بنا سکیں گی"

"انھیں" (انہی) کی ضمیر یہاں نیاز صاحب کی طرف راجع ہوتی ہے، حالانکہ تنقید نگار د

کی طرف راجع ہونی چاہیئے۔

آپ کے کاتب صاحب کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے میرے پچھلے خط میں "ادبی تخلیق" کو "ادنی تخلیق" لکھ دیا ہے اگر "قابِ قوسینِ اَوْ اَدنیٰ" کی رعایت سے ایسا کیا ہے تو خیر، ورنہ اس میں معاملہ "از اِدّعا حیثیت عرفی" تک پہنچ جاتا ہے۔ خیر۔ خدا ایش بیامرزد۔

'بزم مصنف' میں شیخ ممتاز حسین صاحب کے اس فقرہ سے بہت لطف اندوز ہوا کہ "میں اور مولوی طفیل احمد صاحب، میر ولایت حسین اور خان بہادر حبیب اللہ خانصاحب بالکل سر سید مرحوم کی طرح ہمدرد مسلمان ہیں"۔ اس پر مولوی بشیرالدین کی وہ تحریر یاد آگئی جس میں انھوں نے اپنے والد (ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم) مولانا حالی اور مولانا شبلی کو اردو شاعری کا "ثانی اثنین و ثالث ثلاثہ" کہا ہے۔

مقالۂ ولی کی تصحیح و استدراک پر ایک مضمون لکھ کر روانہ کیا ہے۔ رسید سے مطلع فرمائیں آجکل یہاں ولی کے دیوان کی اشاعتِ جدیدہ پر ایک مضمون قلمبند کر رہا ہوں۔

میں اس وقت جوناگڑھ سے ۴۲ میل کی مسافت پر دیہات میں مقیم ہوں۔ نسبتہً یہاں گرمی کم ہے۔ برسات سے پہلے گھر پہنچ جانے کا ارادہ ہے ؎

کوئی چھینٹا پڑے آخر تو جوناگڑھ چلے جائیں
کریں جھڑی گانوں میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

تبصرے

سیدہ
انیس فاطمہ
بریلوی

"غبارِ خاطر"

یہ مجموعہ ہے اُن خطوط کا جو مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ۱۹۴۲ء میں قلعہ احمد نگر کے تاریخی قلعہ کے ایام اسیری میں جناب نواب صدر یار جنگ بہادر کے نام لکھے تھے۔

اس وقت جبکہ سیاسی عقائد کے اختلاف کی وجہ سے آسمانِ صحافت و ادب کے درخشاں آفتاب ایڈیٹر "الہلال" و "البلاغ" کو ادبی دنیا قطعاً فراموش کرچکی تھی۔ "غبارِ خاطر" کی اشاعت نے ایک ہل چل ڈال دی۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ "حالی پبلشنگ ہاؤس" دہلی پر اس کتاب کی بکری کی وجہ سے راشن کی دکان کا گمان ہوتا تھا۔

پڑھنے اور نہ پڑھنے والے سب ہی نہ صرف اعتراف بلکہ اصرار کر رہے ہیں کہ ہم "غبارِ خاطر" پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے۔ انھیں "شیوۂ آبروئے نظر" رکھنے والوں میں ایک صاحب ہیں جن کی "فراغ خاطر" کا یہ عالم ہے کہ جب دیکھئے "غبارِ خاطر" ہے اور وہ ہیں لیکن اس قدر "احتیاط" سے مطالعہ کیا جا رہا ہے کہ ہنوز چند خطوط سے آگے قدم نہیں بڑھا ہے کہ "کہیں کتاب ختم نہ ہو جائے"۔ ؎

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا غمِ جدائی کا

قدرت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ابوالکلام آزاد کی تحریریں ان کے مخالف کیمپ میں بھی اُسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں جس طرح ان کے حلقۂ معتقدین میں بعض اصحاب کو اعتراض ہے کہ "غبارِ خاطر" کی عبارت میں تصنع اور آورد ہے، لیکن ہماری رائے میں مولانا کی آمد اور آورد والی تحریروں کا موازنہ کرنا ان کی تحریروں کو سمجھنے سے زیادہ مشکل ہے۔

جن لوگوں نے ان کی خود نوشت سوانح "تذکرہ" پڑھی ہے انھیں معلوم ہوگا کہ اپنے بزرگوں اور اس کے ساتھ اس دور کے صدہا واقعات پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد اپنے متعلق صرف چند صفحات لکھے ہیں اور متلاشی حالات آزاد کی اشک شوئی یہ شعر لکھ کر فرمادی کہ ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستاں کے ہیں

خود نمائی سے اس قدر احتیاط برا ن کے متعلق تصنع کا سوءِ ظن کہاں تک حق بجانب ہوسکتا ہے۔

خطوط کیا ہیں، جذباتِ لطیف اور افکارِ عالیہ کا بہترین مرقع ہیں۔ گرفتاری کے بعد پہلا خط اور آخر کے دو خطوط انتہا درجہ درد انگیز ہیں۔ خطوط کی فصاحت و بلاغت اور زبان کی حلاوت و اثر انگیزی ملاحظہ ہو۔

"صدیق مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا روشنی کی۔ اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا۔ قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے، اور نہیں معلوم اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی ؂

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہ جبیناں
مگو نہ حرف ز زخم دل کجا دماغ کجا"

ایک دوسرا خط جو بیگم صاحبہ مرحومہ کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے کس قدر درد انگیز ہے ضبط کیلئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے:۔

"مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے، میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں، احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک نئے طرح کا اُنس ہو گیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔"

"نثرِ ریاض خیر آبادی"

مرتبہ عقیل احمد جعفری۔ پروپرائٹر محمد اقبال سلیم گاہندری

نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن

خدا نظر بد سے بچائے مملکتِ آصفیہ کے حضرت سلطان العلوم کو جن کی توجہ سے اردو زبان اس قابل ہوئی کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکے۔ اور فی زمانا یہ فخر حیدر آباد ہی کو حاصل ہے کہ کاغذ کی گرانی کے باوجود وہاں کے ناشرین معنوی اور صوری لحاظ سے بہترین لٹریچر کی ملک میں اشاعت کر رہے ہیں۔ بالخصوص اقبال سلیم صاحب نے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق اشاعت کے ساتھ دیدہ زیب کتابیں چھپوانے کا حق بھی اپنے لئے محفوظ کرا لیا ہے۔

حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کا نام علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک طرف شاعری کے امام ہیں۔ تو دوسری طرف اپنے وقت کے بہترین نثار ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص ...م کا اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ ان کے پُرلطف اور معلومات آفریں مضامین پڑھکر جی چاہتا ہے ...ش ہم اُن کی زبان سے سنتے۔ اس سلسلہ میں ریاض مرحوم کے ساتھ اس زمانہ کی بہت سی ...ی ہستیاں دوبارہ روشناس ہوگئی ہیں۔ جن کو زمانہ بھول چکا تھا اور جو بقول مولانا عبدالماجد ...احب دریاآبادی "یاد ہی کس کو رکھتا ہے"

لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود چند خامیاں بھی ہیں۔ جو مذاقِ سلیم پر بارِ گراں گزریں ...وہ یہ کہ بعض ایسے عامیانہ اور عُریاں قسم کے ان کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ مثلاً "حسن وضع" "صبح عید" اور "ایک رقاصہ" کیا خوب ہوتا اگر مؤلف صاحب ان مضامین کو نظر انداز کردیتے

...یب اور شاعر بہرحال انسان ہیں اور ان سے غلطیاں اور لغزشیں بھی ہوسکتی ہیں۔ کیا ضرور ...ہے کہ ان کے قلم سے جو لفظ نکلے وہ الہامی حیثیت رکھتا ہو اور جب کبھی ان کے حالات مرتب ...وں تو ان کے ع

غلطہائے مضامین مت پوچھ

...ایسے مضامین کو جو کبھی کبھار سہواً ان کے قلم سے نکل گئے ہوں نمایاں جگہ دی جائے اور بزعم خود ...خیال کرلیا جائے کہ "ہم نے سوانح نگاری کا پورا پورا حق ادا کردیا"۔

بُرا ہو مغرب کی کورانہ تقلید کا کہ جن دلدلوں سے دامن بچاکر چلنا چاہیئے تھا وہی ہماری ...گذرہی ہوئی ہیں۔ یورپ نے فنِ سوانح نگاری کا یہ معیار مقرر کیا ہے کہ ہیرو کی زندگی کے ...ہر نجی اور خانگی واقعہ کو خواہ وہ اس قابل ہو یا نہ ہو منظرِ عام پر لاکر یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دی جائے۔ لیکن یہ سب کچھ تو انھیں زیب دیتا ہے اور انھیں کو مبارک رہے۔ جن کی تہذیب میں کیرکٹر اور اخلاق کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ لیکن اس گئے حالوں پر بھی کم از کم ہمارا شائستہ اور مہذب طبقہ تو شاید اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوسکے گا۔ کہ "لیڈی کرزن" کے بالمقابل "بیگم چمن" کو بھی مصروفِ رقص دیکھنا پسند ہے۔

"عہدِ آصفی کی قدیم تعلیم"

مصنفہ نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن

"ادب برائے زندگی" کے نظریہ کی مقبولیت نے ملک کے بیشتر سنجیدہ اور متین موضوعات پر لکھنے والوں کو ان کی پرانی ڈگر سے ہٹا کر نئی راہوں پر ڈال دیا ہے۔ اور خدمت کے نام نہاد جذبے نے نہ کہنے کی باتیں بھی ان سے کہلوا لی ہیں۔ لیکن ہاشمی صاحب کی ذات گرامی اپنی بکثرت تحقیقی اور تدقیقی تصانیف کی وجہ سے مستثنیات کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کا شمار اربابِ بصیرت کے اس طبقہ میں ہے جو بقول مولانا ابوالکلام آزاد اپنے لئے جگہ کا انتخاب وہاں کریں گے جو شاہراہِ عام سے علحدہ ہو اور پھر اس التزام کے ساتھ کہ جو جنس خریداروں کو پیش کی جائے گی وہ گراں ہی نہیں بلکہ کمیاب بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس شرالقرون میں "اربابِ نظر" کی چھوٹی سی جماعت کے سوا، کون خریدار ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی مشکل پسند طبائع "مقبولیت عام" کی خاطر دوسروں کے نقشِ پا، کی پیروی کسی طرح گوارا نہیں کر سکتیں۔

یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوئی کہ "تعلیم نسواں کی ابتدائی تاریخ" لکھی جائے اور کس کے قلم سے کسی خاتون کے نہیں بلکہ ایک مرد کے قلم سے۔ حالانکہ حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی کمی نہیں۔ لیکن جب ہماری مضمون نگار بہنوں کو اس آلام و مصائب سے بھری دنیا میں زمین سے لیکر تا حدِ نظر" موسیقی ہی موسیقی نظر آئے تو پھر تحقیقی یا تاریخی خشک موضوعات زیر بحث کیوں کر آئیں، ان پر لکھنا تو غریب مردوں کا کام ہے۔ ہماری آسان پسند طبائع تو "نئے ادب" ہی کے لئے موزوں ہیں۔ "بہر تسکین دل نے لے لی ہے غنیمت جان کر" کتاب کی یہ خصوصیت خاص اہمیت رکھتی ہے کہ قابل مصنف نے کوئی باب تشنہ نہیں چھوڑا ہے انداز تحریر دلنشیں ہے۔

"مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا"

مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی ـــ شائع کردہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ

کتاب ہاتھ میں لے کر سرسری ورق پر نظر پڑی اور دل میں ایک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ یہ اس قوم کے تنزل کی داستان ہے۔ جس کی اولوالعزمیوں کا کبھی یہ عالم تھا کہ ؎

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

آج جبکہ دنیا مختلف علوم و فنون کی تحقیقات اور سائنس کی نت نئی ایجادات میں مصروف ہے ہماری تمام دماغی اور ذہنی صلاحیتیں اپنی بربادیوں اور تباہیوں کی چھان بین کے لئے وقف ہیں۔ لاکھ ذہنیتوں کے

پست ہونے کا جواز پیش کیا جائے۔ بزرگوں کے کارنامے سنا کر اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کو چھپانے کی کوشش ناکام کی جائے۔ حقیقت حال کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ پر صاحب موصوف نے شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈال کر ایک دینی اور قومی فریضہ ادا کیا ہے۔ "نظریۂ" "وطنیت" اور "قومیت" نے عالم اسلامی کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا اس کی حقیقت کا انکشاف ہو کر دلی اذیت ہوئی۔

تیرہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو کس قدر عظیم الشان انقلابات اور حادثات سے گزرنا پڑا۔ اپنے عمل صالح اور نیک کردار کی بدولت دنیا میں خدا کا نائب وہ کہلانے کا مستحق قرار پایا۔ لیکن ایک دَور ایسا سخت آیا کہ وہی دُنیا جو اس کی میراث تھی اس پر تنگ ہو گئی۔ اور اس مومن جانباز نے ایسی ہار مانی کہ کافروں اور مشرکوں کی اطاعت صرف اتنی سی بات پر قبول کر لی کہ نماز، روزہ کے ساتھ دوسرے شعائر اسلامی کے ادا کرنے کی اس کو اجازت ہے۔

لیکن "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" اس کا جواب تشنہ رہا۔ یہ سب کو تسلیم ہے کہ دُنیا کی قیادت کی باگ مادّہ پرست یورپ کے ہاتھ آتے ہی روحانیت فنا ہو گئی لیکن ہم نے دیکھ لیا کہ جب تمام خصوصیات ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں تو خالی روحانیت پر اعتقاد کسی کام نہ آیا۔ اور اللہ میاں کو دنیا کا نظام چلانے کے لئے مادّہ پرست یورپ کو حکومت اور قیادت کی باگ سپرد کرنی پڑی — صالح اور نیک کردار بنا دینا بھی اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ کیا عجب ہے کہ برنارڈ شا کی یہ پیشین گوئی آگے چل کر صحیح ثابت ہو جائے کہ دُنیا کا آئندہ مذہب اسلام ہوگا۔

جمال الدین افغانی اور شیخ عبدہٗ نے "بین اسلامزم" کی جو تحریک شروع کی تھی وہ فنا نہیں ہوئی۔ ابوالحسن علی صاحب اور اُن کی واجب الاحترام رُفقاءِ کار کی جماعت اس سلسلہ میں برابر مصروف جدّوجہد ہے۔ لیکن چونکہ وقت کے اہم تقاضوں نے لوگوں کی توجہات دوسری جانب منعطف کر دی ہیں، اس لئے جو کام ہو رہا ہے اس کی رفتار سست ہے۔

"موت کے غار"

مؤلفہ ایس، اے۔ ڈانگے صاحب ایم۔ سی۔ اے۔ بلڈنگ مال روڈ۔ لاہور

حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کی متفقہ معاندانہ کوششوں کے باوجود ملک میں کمیونزم کی تحریک سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ اور اس کا سبب ہے سوسائٹی کی معاشی اصولوں پر غیر منصفانہ

تقسیم جس کی وجہ سے ملک کی دس فی صدی آبادی کو تو تمام لوازمات زندگی بخوبی میسر ہوتے ہیں اور بقیہ نوے فی صدی کو انتہائی حسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

قحط کمیٹی کے کام کے سلسلہ میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ طبقۂ نسواں بھی کمیونسٹ تحریک سے بہت زیادہ اثر پذیر ہے۔ ایک مسلمان خاتون نے مجھ سے کہا کہ عوام کے مصائب کا علاج اُس جمہوری نظام حکومت کا قیام ہے جو ملک کی حقیقی نمایندہ کمیونسٹ پارٹی پیش کر رہی ہے۔

پیش نظر پمفلٹ مشہور کمیونسٹ لیڈر ایس۔ اے ڈانگے صاحب کی اس رپورٹ کا اردو ترجمہ ہے جو انھوں نے مزدوروں کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۵ء میں پڑھی تھی جو کہ پیرس میں ہوئی تھی۔ کوئلہ کی کانوں کے اندر کثیر التعداد عورتوں اور دس گیارہ سال کی لڑکیوں کو صرف ۵ آنہ یومیہ پر ۹ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ کہاں ہیں محافظان تہذیب و کلچر وہ مذہب۔ نیچے طبقہ میں جا کر ان دل ہلا دینے والے حالات کا مشاہدہ کریں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے فروعی اختلافات چھوڑ کر اُس نظام حکومت کا خاتمہ کر دیں جس کے تحت ان کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی، تندرستی اور عزت صرف چند پیسوں کے عوض خریدی جاتی ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود صحیح اقتصادی اصولوں کی ترویج و اشاعت کرنا انسانیت اور ملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

"رُوحِ حیات"

اختر قریشی صاحب — ادارۂ نشریات اُردو

حسین ساگر حیدر آباد دکن

یہ اختر قریشی صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھے ہیں۔ وہ خطوط جن میں بیساختگی کے ساتھ طنزیات کی چاشنی بھی شامل ہو۔ بہترین ادبی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جو کچھ بھی لکھا گیا ہو اس سے لطف اندوز ہونے کا حق صرف مکتوب الیہ کے لئے مخصوص ہو۔ کسی شخصیت کو اس کے اصلی خدوخال میں اس کے خطوط کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضخیم سے ضخیم سوانح کو جو کسی دوسرے کے قلم کی مرہونِ منت ہو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو اس کے ہیرو کے صرف ایک خط کو جو ہو سکتا ہے کہ سرسری ہی طور پر لکھا گیا ہو۔ اختر قریشی صاحب کے خطوط میں یہ بات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جو لکھا گیا ہے وہ دماغ پر زور دے کر اور قلم کو روک روک کر لکھا گیا ہے

ی طور پر وہ کچھ لکھ جاتے ہیں جس میں عبرت بصیرت ادبیت اور طنز لطیف سب شامل ہو
نہ ایک خط ملاحظہ ہو :۔

"مشفقی

مشاعرہ کی اطلاع ملی مگر میں نے شرکت نہیں کی ہوتا وہاں کا اجتماع سنجیدہ مذاق پر شاق گزرتا ہو
پھر اگر ملول ہونے سے حاصل، سُنا ہے بعض حضرات کا کلام بہت کامیاب رہا۔ حق تو یہ ہے کہ ان چند ہی
حضرات سے ہماری ایسی محفلیں چمک جاتی ہیں۔ ورنہ ہمارے نوجوانوں کی شاعری میں دھرا کیا ہے۔
"رودِ موسےٰ کے کنارے" "نوبت پہاڑ کے اوپر" ہماری شاعری کے یہ عنوانات رہ گئے ہیں۔
ایک لطیفہ بھی سُننے میں آیا کوئی برخوردار اسٹیج پر آتے ہی بیہوش ہو گئے۔ ہائے ہائے ایسی بیہوشی
پر کتنے نہ بیہوش ہو گئے ہوں گے۔ اسٹیج کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے میاں کی کمر لچک گئی ہو گی۔ یا
ناف ٹل گئی ہو گی یا پھر ع

جب ہجومِ عاشقاں دیکھا تو گھبرانے لگے

کیا اس حادثہ کی تفصیل سُنی وہ کون صاحب تھے؟ ذرا مجھے معلوم کرائیے۔ جب کسی اور اجتماع کی خبر
ملی تو شرکت کروں گا۔ ملک کے نوجوانوں کو تیر و تلوار لے کر میدانِ جنگ میں دیکھنے کی آرزو تو اب
پوری ہو نہیں سکتی۔ کم از کم ان کی کمر کے پیچ و خم ہی دیکھ لوں گا اور پھر کوئی ویسے بیہوش ہو جائے گا۔
تو دونوں بازوؤں میں سنبھال کر گلاب و لخلخہ سنگھاؤں گا۔ کلیجہ سے لگاؤں گا کہ ملک کے قوتِ بازو
یہی تو ہیں۔ افسوس وائے ما اور وائے بر حالِ ما۔"

فانِ عزیز"

عربی اور فارسی کی تکمیل کے بغیر بے عیب اردو نثر و نظم لکھنا ممکن نہیں ہے۔ زمانۂ حال کے اکثر
ں اور شاعروں کے مقابلہ میں عہدِ قدیم کے نثار اور شعرا کو یہی چیز ممتاز کرتی ہے۔ علاوہ بریں
ر کے لوگ زیادہ تر پاک نفس اور صاف باطن بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے افکار
ت میں نفاست اور پاکیزگی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ آجکل کی سی پراگندہ خیالی اور محض
ں جذبات کی فراوانی نہ ہوتی تھی۔
بڑے بڑے دیدہ زیب لکھائی چھپائی اور کاغذ کے مجموعہ ہائے کلام اِس سرے سے اُس
تک دیکھ جائیے بے عیب اور معیاری کلام بمشکل نصیب ہوتا ہے اور اگر ختم کتاب کے بعد
یا جائے کہ کیا حاصل ہوا تو تضیع اوقات کے ایک گہرے احساس کے سوا کوئی اور بات

ذہن میں موجود نہیں رہتی ہے۔

حضرت منشی ولایت علی خاں عارف باللہ معروف بہ شاہ عزیز اللہ صاحب عزیز صفی پوری مرحوم مغفور کا زیرِ نظر انتخابِ کلام اردو الموسوم ”عرفانِ عزیز“ اُن تمام خوبیوں کا حامل ہے جو ایک اچھے کلام میں موجود ہونی چاہئیں ــــ کتاب کھولتے ہی دو شعر نظر سے گزرے ملاحظہ ہوں ؎

گیا جو نامہ بر آیا بہت سراسیمہ   کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا

———— × ————

ادب سے، سر جھکا کر، قاصد اُس کے روبرو جانا   نہایت شوق سے کہنا پیام آہستہ آہستہ

———— × ————

حضرت عزیز صفی پوری کے اُردو اور فارسی کے دواوین طبع ہو چکے ہیں مگر عام طور پر کمیاب ہیں۔ مولوی نصرت حسین صاحب صابری مرتب نے یہ انتخاب شائع کر کے مکمل کلام کے مطالعہ کا از سرِ نو مشتاق بنا دیا ہے۔ اس مفید و کامیاب کوشش پر ہم صابری صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں ــــ کتاب ملنے کا پتہ :ــــ نظامی پریس بدایوں

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا علمی و اصلاحی ا[illegible]

جو زیرِ نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

[illegible]ائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظامِ تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث
[illegible] کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ
[illegible]رح ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین، غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید و ضروری
[illegible]ر نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں
[illegible]س اہتمام سے ریویو کر کے اربابِ تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے
[illegible] پیشگی اخبار کے خریدار ہوں گے اُن کی خدمت میں دو کتابیں یعنی التربیۃ و التعلیم ضخامت ۱۵۰ صفحہ اور
[illegible]رت ضخامت ۸۰ صفحہ ہدیۂ پیش کش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید و علمی مضامین پر مشتمل
[illegible]مذہب اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے۔
[illegible]ت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

اڈیٹر:- محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

کانفرنس بک ڈپو

[illegible]نے کچھ عرصہ سے "کانفرنس بک ڈپو" کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں ان
[illegible] جو کانفرنس نے خود شائع کی ہیں ہندوستان کے دوسرے مشہور اور مستند مکتبوں اور مصنفوں
[illegible]ت ہوتی ہیں اور ان کتابوں میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی نہایت مفید ذخیرہ موجود
[illegible]۔ کانفرنس بک ڈپو کا نفع علمی اور تعلیمی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ
[illegible] کسی کتاب کی ضرورت ہو کانفرنس بک ڈپو سے طلب فرما کر کانفرنس کے اس شعبہ کو تقویت
[illegible] کے علمی اور تعلیمی کام روز افزوں جاری رہیں اور آپ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔

فہرست کتب مفت

مہتمم کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

تصنیفات [illegible]

حیات حافظ الملک حافظ رحمت خاں — اردو روہیلکھنڈ کے مشہور مدبر حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی [illegible] کا [illegible] اور دیگر حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب [illegible] نام [illegible] ہے [illegible] صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے (زیر طبع بار دوم)

مسلمانوں کی جدوجہد — (بزبان انگریزی) اس کتاب میں [illegible] سے [illegible] تک کی مسلمانوں [illegible] بالخصوص مسلمانان یوپی کی تعلیمی کوششوں [illegible] جدوجہد کی [illegible] کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی دس سالہ پبلک لائف کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و [illegible] اسباب و علل کو افسانوی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت دو آنے

رباعیات عرش [illegible] — بریلی اور روہیلکھنڈ کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی احتشام الدین احمد عرش [illegible] کے [illegible] حالات زندگی اور نمونہ کلام ان کی [illegible] اور رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت [illegible]

صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو [illegible] اور رکاوٹیں درپیش ہیں ان پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی ان کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۸ آنے

دلاور الملک نواب دوندے خاں — (بزبان انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار رفیق [illegible] دلاور الملک نواب دوندے خاں بہرام جنگ کے [illegible] حالات کا مجموعہ [illegible] قیمت [illegible]

غلام قادر روہیلہ (سلطنت مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبان انگریزی و اردو [illegible] قیمت ۸ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علیگڑھ

مصنّف ۲ نمبر ۱۶ و ۱۷

مجلس مصنّفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

اکتوبر ۴۶ء و جنوری ۴۷ء

مُدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

قیمت سالانہ۔ چار روپے

بیت المصنّف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

باہتمام حافظ صاحب برخاں

مُسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ طبع شد

مصنف

۱۶ و ۱۷

جلد ۴	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء و جنوری ۱۹۴۷ء	نمبر ۱۶ و ۱۷

فہرست مضامین

اعتذار

چونکہ مسلم یونیورسٹی پریس میں کچھ عرصے سے انتظامات طبع میں گڑبڑ رہی، اس لئے ہماری امکانی کوشش کے باوجود اکتوبر ۴۶ء کا "مصنف" شائع نہ ہو سکا۔ مجبوراً اکتوبر ۴۶ء اور جنوری ۴۷ء کا یہ یکجا نمبر پیش ناظرین کیا جا رہا ہے۔

مدیر

ایڈیٹوریل "مصنف"، علیگڑھ

پس چہ باید کرد؟

ہمارے ایک بزرگ منشی عظیم الشان خانصاحب بریلوی ماہر السنۂ مشرقیہ فرماتے تھے کہ یہ عجیب دَور ہے کہ ہفتے مہینے اور برسیں گزر جاتی ہیں کسی شخص اور گوشہ سے کوئی خوشی کی بات سُننے یا دیکھنے میں نہیں آتی۔ روزانہ صبح سے رات تک ملنے جلنے والے، اخبارات اور ریڈیو۔ غرض تمام تر ذرائع معلومات رنجیدہ اور پریشان کُن خبریں ہی دیتے ہیں۔ کبھی شاذ و نادر کوئی خوشں خبری ملتی بھی ہے تو اس کی عمر چند گھنٹے سے زائد نہیں ہوتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہی کسی ایسے پریشان کُن اور تشویشناک حادثہ کی اطلاع آجاتی ہے کہ وہ چھوٹی سی خوشی خواب و خیال ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب سے تیس چالیس سال پہلے صورتِ حال اس کے برعکس تھی — فارغ البال اور خوشں حال طبقہ کا تو کہنا کیا، غریب سے غریب آدمی کی زندگی میں بھی مسرت و شادمانی کا عنصر غالب تھا۔ چہچہے، قہقہے، خوشں گپیوں اور نت نئے کھلنڈرے پن کی فراوانی تھی۔ گاؤں گاؤں کوچہ کوچہ اور گھر گھر جدید سامانِ عیش اور اسبابِ راحت کے فقدان کے باوصف ایک قسم کا بے فکرا پن پایا جاتا تھا۔ پہلے نہ اتنے پڑھے لکھے لوگ تھے نہ اتنے مالدار۔ لیکن کھانے، پینے، رہنے سہنے اور میل ملاقات میں جو لطف اور جو مزہ تھا وہ آج دیکھنے میں نہیں آتا۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ مصائب و آلام کا یہ دَور دَورہ کب تک رہے گا؟ کیا پھر بھی کبھی حقیقی مسرت اور سچی بے فکری کے کچھ لمحے نصیب ہوں گے۔ یا یوں ہی مستقل کلفت میں بقیہ ایامِ حیات بسر ہوں گے؟

دراصل یہ نتیجہ ہے ہماری غلامی کی طویل مدت کا اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں خود غرضی۔ منافقت اور عدم خلوص کا عام حالات میں یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن معاملہ اب کچھ اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔

حالیہ عالمگیر جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں سے خاطرخواہ نجات نہ ملنے پائی تھی کہ ملک کے طول و عرض میں ہندو مسلم فسادات کا نہایت خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے اس بدنصیب ملک کے رہنے سہنے والوں کی زندگی انتہا درجہ تلخ اور اجیرن بنا دی ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علاقے اور ان کی کثیر آبادیاں شدید قسم کی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکی ہیں اور اگر یہی سیل و نہار رہے تو عنقریب پورا ملک اور اس کی کل آبادی تباہی کا شکار ہو جائے گی۔

ہم نے ایک گونہ اطمینان کی سانس لی تھی کہ کم از کم خاص ہندوستان کے اندر جرمنی اور جاپان کی حملہ آور فوجیں داخل نہ ہوئیں اور ہمارا ملک بیرونی حملہ سے بچ گیا۔

لیکن جیسا کہ "انڈین نیشنل آرمی" کے ایک افسر نے بیان کیا، جاپانی حملہ اور جاپانیوں کے قبضہ سے برہما کی وہ سقیم حالت نہ ہوئی تھی، جو فرقہ وارانہ فسادات سے بہار کی ہو گئی۔ وجہ ظاہر ہے —— ایک ظالم سے ظالم غیر ملکی حکومت اور سخت سے سخت بیرونی حملہ کے مقابلے میں سب اہلِ ملک متحد الخیال اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہو جاتے ہیں۔ مگر باہمی خانہ جنگی کی صورت میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک ہی شہر، ایک ہی محلہ اور ایک ہی گاؤں میں جب اپنے ہمہ وقت کے ساتھی اور پڑوسی خون کے پیاسے ہو جائیں تو کوئی بھی سامانِ مدافعت کارگر نہیں ہو سکتا۔

حکومت کی ساری پولس، کُل فوج اور جملہ سامانِ جنگ جان و مال اور ناموس کے بچانے میں لگا دیا جائے تو بھی پوری حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اسقدر تعداد میں پولس اور فوج کا مہیا ہونا کہ چالیس کرور انسانوں کے ہر گھر پر پہرا بٹھایا جائے ناممکن اور قطعاً ناممکن ہے۔

ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد ہیں اور ان کی آبادی اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ جن جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں وہ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں اور شہر میں غیر مسلم مساوی تعداد میں یا بھاری اقلیت میں آباد ہیں۔

اسی طرح جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے دیہات میں ان کی کثیر آبادی ہے اور شہروں میں مسلمان بہت نمایاں تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آبادی کی اس تقسیم کا نتیجہ ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تل جائیں تو مسلم اکثریت کے علاقے اپنے یہاں کی غیر مسلم دیہاتی آبادی کو ختم کر سکتے ہیں اور ہندو اکثریت کے صوبے مسلم دیہی آبادی کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ شہروں میں البتہ برابر کی ٹکر رہے گی۔ اب سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات زیادہ تر شہروں تک محدود تھے اور ملک کی دیہی آبادی اس لعنت و مصیبت سے محفوظ تھی۔ مگر اس وقت صورتِ حال بدل گئی ہے۔

کلکتہ اور بمبئی کے بعد خونریزی کا مرکز دیہات ہو گئے ہیں۔ جہاں قلیل التعداد مخالفِ مذہب قوم پر بے پناہ مظالم توڑے جاتے ہیں۔ اور پوری پوری آبادی کو قطعاً تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اسی ملک کے دوسرے حصّوں میں ہمارے ہم قوم و مذہب لوگوں کا بھی یہی انجام ہو سکتا ہے۔

جو حربہ ہم دوسروں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں وہی ہمارے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اور نتیجہ میں دونوں کی لازمی تباہی اور غیر ملکی حکمرانوں کی دائمی غلامی ہمیں نصیب ہو گی۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے برادرانِ وطن کا ایک طبقہ کچھ اس طرح سوچنے لگا ہے کہ چونکہ مسلمان پاکستان مانگتے ہیں جس کے دیئے جانے پر وہ راضی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ ایک کوشش مسلمانوں کو ختم ہی

کر دینے کی کر دیکھی جائے۔ اس کوشش کا سب سے شرمناک مظاہرہ بہار میں ہوا۔ جہاں کم از کم تیس ۳۰ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اور ڈیڑھ لاکھ مجروح و خانماں برباد کئے گئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس سب سے بڑے قومی حادثہ کے باوجود اور ہر قسم کی ناتیاری و غفلت شعاری کے باوصف مسلمان کیا باعتبار قوتِ مدافعت اور کیا اپنی باقی ماندہ تعداد کے بڑے سخت جان ثابت ہوئے۔

ہندوستان کی دس کروڑ مسلم آبادی خدا کے فضل سے علیٰ حالہٖ قائم و دائم ہے۔ حتیٰ کہ خاص بہار میں جہاں سب سے زیادہ کمزور سمجھ کر مسلمانوں کو اچانک دبوچا گیا۔ جہاں کہیں پانچ اور پچاس ہزار تک مسلح دشمنوں نے پانچ پانچ سو کی قلیل مسلم آبادی پر حملہ کیا تو وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اور بہار کی اڑتالیس ۴۸ لاکھ مسلم آبادی میں سے اگر زیادہ سے زیادہ دو لاکھ بھی ختم ہو گئے تو بفضلِ خدا چھیالیس ۴۶ لاکھ باقی ہیں۔ جنکو ایک "کربلا" ہو جانے کے بعد اب ہاتھ لگانا آسان نہ ہوگا۔

احمد آباد، کلکتہ، بمبئی، بہار اور گڑھ مکتیشر کے ہولناک حادثوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار اور حفاظتِ خود اختیاری کی مناسب تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا ہے اور انشاء اللہ آیندہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ان کی ناتیاری سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھا سکے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور انھیں اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے مسلمان ان کی کمک پر آئیں۔

دوسرے علاقوں سے قطع نظر صرف یو۔پی کے اسی لاکھ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں مسلم اقتدارِ اعلیٰ کے پشتیبان کا کام دیتے رہے ہیں۔ پورے ملک میں سلطنتِ اسلامی کا یہی صوبہ مرکز رہا اور یہیں سے اقوامِ ہند کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے۔

تاریخ گواہ ہے کہ شمال و مغرب سے ہندوستان پر جس قدر حملے

ہوئے ہر ایک حملہ آور کو دریائے اٹک پار کرتے ہی کوئی روکنے والا نہ ہوتا تھا اور دلی کے قریب پانی پت تک بے کھٹکے بڑھا چلا آتا تھا۔ البتہ پانی پت سے آگے بڑھنے کی اُسے ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اس جگہ سے دہلی اور یوپی کے غیور اور بہادر مسلمانوں سے مقابلہ اور زور آزمائی شروع ہو جاتی تھی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ یوپی کے مسلمانوں نے پیش قدمی نہ کی ہو اور کسی حملہ آور کو بغیر زبردست خونریزی کے پانی پت سے قدم آگے بڑھانے کا موقع دیا ہو۔

دلی کے لال قلعہ پر جس وقت تک پرچم اسلامی لہراتا رہا مسلمانان یوپی فداکارانہ اور پروانہ وار اس کی حفاظت کرتے رہے۔ جب دلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور پنجاب پر سکھوں کا ظالمانہ قبضہ ہو گیا۔ پنجابی مسلمانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ مسجدوں اور عبادت گاہوں کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ مسلمانوں کو نماز پڑھنے اور اذان تک کی ممانعت ہو گئی تو اس دورِ ابتلاء میں یوپی ہی کے ایک مردِ مجاہد سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی کی رگِ حمیتِ اسلامی جوش میں آئی اور وہ اپنے غازیانِ اسلام کی فوج اکٹھی کر کے براہِ راجپوتانہ، سندھ۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد۔ پنجاب پر حملہ آور ہوئے۔ خوب خوب لڑے۔ دشمنوں کو مارا۔ بچلا اور آخر میں خود بھی بمقام بالاکوٹ مع اپنے ساتھیوں کے شہید ہو گئے۔

انگریزی تسلط و اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں تمام تر جدّ وجہد کا مرکز بھی یوپی ہی رہا۔ آج بھی مسلمانانِ ہند کے "مطالبۂ پاکستان" کا آغاز عملاً یوپی سے ہوا۔ یہیں پروان چڑھا اور اسی جگہ کے مسلمانوں کو آخر دم تک اس کے لئے بالکل بے لوث خالصۃً لوجہ اللہ ہر قسم کی قربانی دینی ہے۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان عہد کر چکے ہیں کہ وہ نہ صرف "پاکستان لیکے رہیں گے"۔ بلکہ یوپی۔ بہار۔ اُڑیسہ۔ سی پی۔ صوبہ بمبئی

اور صوبہ مدراس کا جو بڑا بھاری اکھنڈ ہندوستان بنے گا اُس میں بھی ا
وجود ملّی کو روایتی عزّت و آبروکے ساتھ قائم و برقرار رکھیں گے۔

جو ۱۴ فی صدی ہونے کے باوجود ہم یُوپی کے مسلمان بالخصوص ض
مغربی کے مسلمان ہمیشہ صدیوں سے دوسری ہم عصر اقوام پر غالب رہے
اور ہمیں بھول کر بھی نہ کبھی احساس کمتری ہوا اور نہ ہم اپنے آپ کو کسی
سے کمزور سمجھتے ہیں۔ شہر تو شہر جن میں سے اکثر میں مسلمانوں کی اکثریت سے
قصبات و دیہات میں بھی پٹھانوں کے بڑے بڑے جرگے اور خاندان آ
ہیں اور اُن میں کا ایک ایک شخص پچاس پچاس پر بھاری ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات میں بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اندھیرے، اُجالے ا
اچانک دھوکے سے اکا دُکا مسلمانوں کو پیٹ لیا جاتا ہے، جب مسلمان
لینے کے لئے چڑھائی کرتے ہیں تو حکومت کی فوج اور پولیس بیچ میں آجا
ہے۔ اور اس طرح جو کچھ اُن کا جانی نقصان ہوتا ہے وہ بالعموم پولیس و
کے تصادم سے ہوتا ہے۔

آج کل ایک خاص بات یہ بھی دیکھنے اور سُننے میں آرہی ہے کہ جن
مقامات پر مسلمان مضبوط ہیں وہیں برادرانِ وطن "امن کمیٹیوں" یہ
اتحادِ عمل کر رہے ہیں۔ اور فوج و پولیس کے انتظامات کا بھی پورا ز
شور ہے۔ لیکن جہاں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہیں وہاں نہ "ا
کمیٹیاں" کام کر رہی ہیں، اور نہ ہی فوج اور پولیس نمایاں طور پر
آتی ہے۔ گویا حفاظتی تدابیر مسلمانوں ہی کے خلاف اختیار کرنے کی ضرور
محسوس کی جارہی ہے اور یہ مسلمانوں کی بہت بڑی اخلاقی فتح ہے۔

کانگریسی حکومتوں کے اس غیر ہمدردانہ رویّے کے پیشِ نظر مسئلہ صرف اُن مسلمانو
کا رہ جاتا ہے جو دُور دراز دیہات میں کم تعداد ہیں۔ سو اُن کو اپنے اللہ
بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت کے مطابق صوبے سے باہر نہیں بلکہ اپنے ہی صوبہ میں اُن مقامات پر جلد از جلد منتقل ہو جائیں جہاں اُن کے ہم قوم لوگوں کی تعداد معقول ہے اور مسلمانوں کی زمینداری ہے۔

اس صورت میں مسلمان زمینداروں پر بھی کچھ اہم اور خاص قومی ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ جن کی ادائیگی سے انھوں نے اب تک "مجرمانہ غفلت" برتی ہے۔

پچھلے تلخ و ناگوار حالات و واقعات سے مجبور ہو کر مطالبۂ پاکستان پہلی بار ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کی جانب سے کیا گیا۔ اور یہ برادرانِ وطن کی غلط سیاست اور انتہا درجہ تنگ نظری

"گنا نہ دیں بھیلی دیں"

کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ ۴۰ء سے پہلے سمجھوتہ کی صدہا کوششیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ ۳۱-۳۲ء میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی قیادت میں "آل پارٹیز مسلم کانفرنس" نے جو معتدل ترین تجاویز کانگریس کے سامنے پیش کیں اُن تک کو نہ مانا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں ایک نشست کی معمولی اکثریت تسلیم کرنے سے مولانا کو صاف انکار کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی وضعداری تو ان کو اب تک کانگریس سے لپٹائے ہوئے ہے۔ باقی سب مسلمان بددل ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے اور اب بجا طور پر مسلمان چاہتے ہیں کہ اُن کے حصّہ کے ایک چوتھائی ملک کا بٹوارہ کر دیا جائے۔ روز روز کی حق تلفی اور لاعلاج خود غرضی سے عاجز آ کر مشترک جائداد کے نمبر دار بڑے بھائی سے اپنی موروثی جائداد چھوٹا بھائی علیحدہ کرانا چاہتا ہے۔ اس میں بگڑنے اور خفا ہونے کی کیا بات ہے، یہ کام خوشی یا ناخوشی سے اب تو کرنا ہی پڑے گا۔

۱۷۰۷ء میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب سلطنتِ مُغلیہ کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو پورے پچاس سال تک مسلمانوں کی عیش کوشی اور غفلت سے فائدہ اُٹھا کر صوبۂ بمبئی کے مرہٹوں۔ پنجاب کے سکھوں اور مغربی یُوپی کے جاٹوں نے ملک میں "رام راج" قائم کرنے کی نیت سے جو عالمگیر خونریزی اور ہولناک بدامنی پھیلائی تھی اور جس کا ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ دُرانی والی جنگ پانی پت پر مسلمانوں کے حق میں کامیاب فیصلہ ہوا۔ بالکل ویسا ہی نقشہ آج کل انگریزی اقتدار کے خاتمہ پر جمتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ تاریخ اپنا سبق دُہراتی ہے ابتدا میں ہمیشہ مسلمانوں پر عبرت ناک بلائیں نازل ہوتی ہیں، لیکن آخر میں بیدار ہو جانے پر فتحمندی و کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ جب تک آل انڈیا مسلم لیگ کے "راست اقدام" کی تعریف وتشریح ہو اُس وقت تک وہ آنریبل ولبھ بھائی پٹیل کی نصیحت پر جو اُنھوں نے ہند اور مسلمانوں کے مشترک ہوم منسٹر (محافظ امن وقانون) کی حیثیت سے ۳۰ نومبر ۴۶ء کو ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بمقام ناگپور کی ہے۔ عمل کریں۔

ہوم منسٹر صاحب بہادر کی نصیحت یہ ہے:-

"تمھیں یہ سیکھنا چاہئے کہ تم پولس اور فوج کی امداد کے بغیر کس طرح غنڈوں کے خطرہ کا مقابلہ کرو۔ تمھیں خود حملہ آوروں کے مقابلہ میں اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی حفاظت کے لئے غیر متشددانہ یا متشددانہ طور پر پولس مین بن جانا چاہئے"

سید الطاف علی بریلوی

روہیلا ہاؤس
کانفرنس کمپاؤنڈ۔ علی گڑھ
یکم جنوری ۴۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

زبان اور کلچر

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی)

۱۹۳۹ء میں مجلہ "نگار" میں "زبانی نزاع" کے عنوان سے جناب آل۔ احمد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مضمون کی بحث آج بھی وہیں ہے جہاں ۱۹۳۹ء میں تھی، اس لئے ہماری خصوصی فرمائش پر جناب موصوف نے اپنے قیمتی خیالات بہت زیادہ مفصل و مدلل طریقہ پر قلمبند کرکے ہمیں عنایت کئے ہیں۔ یقین ہے کہ ہندی اُردو کے بارے میں ناظرینِ 'مصنف' کی بہت سی ذہنی الجھنیں اس مقالہ کے مطالعہ سے صاف ہوجائیں گی۔ بعض تلخ حقائق بھی سامنے آئیں گے جن پر صبر و سکون کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ آج زبان کا مسئلہ جس قدر علمی و ادبی ہے اُس سے زیادہ سیاسی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ سیاسی اختلافات اور ہنگامے عارضی چیزیں ہیں اور ہمیں ماضی کی شاندار روایات اتحادِ لسانی کی روشنی میں مستقبل کے ہندوستان کے لئے ایک مقبول و عام فہم زبان کے لئے میدان تیار کرنا ہے۔

اس مقالہ میں آل۔ احمد صاحب نے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو بخوبی واضح کیا ہے۔ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر صاحبان اگر اس بحث کو اپنے پڑھنے والوں تک پہونچانا چاہیں تو وہ بخوشی نقل کرسکتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

لسانیات یعنی زبانوں کا فلسفہ ایک علمی شغل ہے، جس کا کام لفظوں کی اصل اور معنی و مفہوم سے تعلق تحقیق و تلاش کرنا ہے۔ دیکھنے میں یہ ایک خشک سا مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں نہایت

دلچسپ مشغلہ ہے۔ تحقیق الفاظ کا ذوق پیدا ہو جانے کے بعد وہ طلسم کھلتے ہیں کہ آدمی اُن کے اندر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اس میں سے نکل آنا پسند نہیں کرتا۔

علمی نظر سے دیکھا جائے تو لفظوں کا بننا اور معنی اختیار کرنا، پھر ان کے مفہوم میں تبدیلیاں ہوتے کا سلسلہ قوموں کے اخلاقیات کا "چارٹ" اور ان کی زندگی کی تاریخ کا "گراف" ہوتا ہے۔

اُردو میں فلسفۂ زبان پر جتنا کام ہوا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سخندانِ پارس کے بعد مولوی حمید اللہ خاں صاحب اجمیری کی تالیف ضرور ایک جامع کتاب ہے، مگر آج اسے بھی حالیہ نہیں کہہ سکتے۔

اس مضمون میں میرا مقصد تحقیق الفاظ کے متعلق بحث کرنا نہیں ہے، اور حقیقتاً میں لسانیات کا طالب علم بھی نہیں ہوں، اگرچہ طبیعت کو اس موضوع سے لگاؤ بہت ہے۔ مجھے اس وقت اُردو ہندی کی موجودہ چپقلش پر لسانیات کے بعض بنیادی اصول کے تحت نظر ڈالنا اور دیکھنا ہے کہ اس جھگڑے کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں اس آویزش میں جو بحثیں کی جارہی ہیں، سراسر جذباتی ہیں، انھیں علمی اصول سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کو "بابائے اُردو" کا لقب حاصل ہے، اس کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہو کہ وہ انجمن ترقی اُردو کے "مستقل" سکریٹری بلکہ سب کچھ ہیں، اور اُردو عبارت ہی ان کی ذاتِ خاص سے ہے۔ چند سال ہوئے ان کا ایک طویل مضمون اُردو کی حمایت میں اخبار "مدینہ" میں شائع ہوا تھا۔ میں اس مضمون کی آخری چند سطریں نقل کرتا ہوں:۔

"۔۔۔۔۔۔ یہ خیال بار بار سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیئے گا، انسانی کوشش بڑی بدبلا ہے۔ یہ ہر مشکل پر غالب آجاتی ہے۔ وغیرہ"

یہ "بابائے اُردو" کی عبارت اور "ڈاکٹر آف لٹریچر" کے علمی دلائل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی حمایت یا ہندوؤں کی مخالفت میں جو کچھ کہا ہے، میں نفسِ مضمون سے محاکمہ تو نہ کروں گا لیکن اس عبارت میں جو مضمون کا آخری حصہ ہے اور جسے قدرتی طور پر زیادہ پُر زور ہونا چاہئے، میں علمی استدلال تلاش کرتا ہوں اور حیران رہ جاتا ہوں۔ "خیال کا سننا" نرالی اُردو ہے، اور "دھوکے میں نہ رہیئے گا" عبارت کی ثقاہت پر دال ہے۔ اہم ترین دلیل کہ "انسانی کوشش بڑی بدبلا ہے" علمی بحث پر حرفِ آخر ہے۔ اب اگر اس عبارت کو پڑھ کر کوئی کہے کہ ایک ڈاکٹر آف لٹریچر کی عبارت کا لہجہ یہ ہونا چاہیئے یا کوئی سوال کرے کہ کیا بازاری زبان اور علمی اظہارِ خیال کی عبارت کا فرق مٹ گیا ہے۔ تو کیا اس سوال کرنے والے کو الزام دیا جائے گا۔

رفع حجت کے لئے میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ "انسانی کوشش بڑی بدبلا ہے"۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سے بہ ادب سوال کروں گا کہ جناب نے بھی ایک کوشش فرمائی تھی اور انجمن ترقی اُردو نے ایک کتاب شائع کی تھی، جس میں آپ نے نئے مصدر اختراع کرائے تھے، جہاز سے "جہازنا" اور برق سے "برقانا" وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ اختراع انجمن کی تمام مطبوعات میں جاری کیوں نہ رہ سکی؟ اور کیا اُن کی یہ کوشش "انسانی کوشش" نہ تھی؟ اور اگر تھی تو اسے "بدبلا" کیوں نہ بنایا جا سکا؟

مجھ سے زیادہ ڈاکٹر صاحب واقف ہوں گے کہ ایک عرصے سے یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان بنا لینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ایک مرتبہ "ڈلاپک" نام دیا گیا۔ دوبارہ "اسپرنٹو" کہا گیا، لیکن ہر دفعہ ناکامی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ ہر شخص کو اتفاق ہوگا اور شاید ڈاکٹر صاحب بھی اختلاف نہ کریں کہ یورپ کے لوگ اپنی کوششوں کو "بدبلا" بنا لینے کے زیادہ اہل ہیں کیونکہ ان کو بہت زیادہ ذرائع حاصل ہیں۔ لیکن ایک نئی زبان بنا لینے کے معاملے میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح اپنی کوششوں کو بدبلا نہ بنا سکے۔

چنانچہ آج ہمارے ملک میں جو لوگ ایک نئی زبان بنا لینے یا کہئے موجودہ زبان کو بالکل بدل دینے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، اور جو لوگ ان کی اس کوشش کو دیکھ کر سہمے جا رہے ہیں یورپ والوں کی ان کوششوں کی ناکامی میں بہت کچھ سامانِ خود افروزی پائیں گے۔ یہ مثال پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ زبان کا مسئلہ ایک علمی بحث ہے مگر اسے ذاتی تشخص اور اغراض کی خاطر میدان سیاست کی فٹ بال بنا لیا گیا ہے۔

جس زمانے میں ہم آپ جی رہے ہیں وہ تلاش و تحقیق کا زمانہ ہے۔ علمی ترقیوں کا یہ عالم ہو کہ ہر بات کا ایک علم یا سائنس مرتب ہو گیا ہے اور ہر کام ایک آرٹ بنا لیا گیا ہے۔ تاش کا کھیل اور گھوڑ دوڑ سائنس بن گئے ہیں، عریانی اور فحاشی آرٹ بنا دی گئی ہے۔ ایسے زمانے میں اگر ملک کے رہنے والوں کے درمیان زبان کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے، باہمی میل جول کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے تو اسے علمی حدود کے اندر ہی سمجھا سمجھانا چاہئے تھا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ غلط تعبیریں کر کے مذہبی تعصب کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے اور صحیح سیاست کو بھلا کر زبان کے مسئلے کو "سیاسی" مطلب پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔

انسان اسی زندگی کی تلخیاں کم کرنے یا اس کی گتھیاں سلجھانے پر فطرتاً مجبور اور مامور ہے۔ کیونکہ اسی میں اس کی مسرت و راحت پوشیدہ ہے، اور مسرت و راحت کی تلاش انسانی زندگی کا اہم

مقصد اور راز ہے۔ چنانچہ ان تلخیوں کو دور کرنے اور ان گتھیوں کو سلجھانے کا اُسے اب تک ایک ہی نسخہ مل سکا ہے۔ وہ نسخہ ہے حکمت کی نظر اور فلسفیانہ فہم! فلسفے کی روشنی میں انسانی تلخیوں کا وجود باقی نہیں رہتا اور حکمت کی نظر سے اس کی گتھیاں از خود سلجھ جاتی ہیں۔

پھر کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ ارسطو و فلاطون کے فلسفوں میں اصلاح کرنیوالے اور فلسفۂ ویدانت کے موجد اُس مسئلے میں تعصب سے کام لیں جو تعصب کو قبول نہ کرتا ہو۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں تعصب سے کام لے کر اسے گندہ اور تکلیف دہ بنا سکتا ہے، مگر علم و حکمت کے اندر ارادے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ اور اہلِ نظر و خبر اعتراف کریں گے کہ تعصب تو وہ قاتل چیز ہے جو اشیاء سے ان کی دلکشی چھین لیتی ہے، جو انسان سے انسانیت نکال پھینکتی ہے۔ زبان کی بحث خالص علمی بحث ہے، اس لئے آج بھی زبان کے معاملے میں تعصب کی نہیں چل رہی ہے۔

میں آپ کے غور و فکر کے لئے دو لفظ پیش کروں گا۔ "ڈاڑھی" کا مسئلہ مسلمانوں میں مذہبی مسئلہ ہے اور اسے "اللہ کا نور" کہا جاتا ہے۔ ماتھے پر سجدہ سے جو نشان پڑ جاتا ہے اسے "گھٹا" کہتے ہیں اور مسلمان سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز وہ ہیرے کی طرح چمکے گا۔ ظاہر ہے کہ ڈاڑھی اور گھٹے کے ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی معتقدات وابستہ ہیں، لیکن ان کے لئے جو نام قبول کر لئے گئے وہ ٹھیٹ ہندی ہیں، اور ان کے اندر ثقالت کے اجزاء بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس ذکر میں یہ نکتہ زیادہ دلچسپ ہے کہ لفظ "ساڑھی" میں ہم نے اور خود ہندی والوں نے بھی ثقالت کا جزو نکال کر "ساری" کر لیا ہے مگر "ڈاڑھی" اور "گھٹا" جوں کے توں چلے آ رہے ہیں۔ اُن کی ثقالت دور کرنے کا ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اسی ایک شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ زبان تعصب کو قبول نہیں کرتی، اور اہلِ بصیرت کے لئے یہ ایک شہادت ہی کافی ہو گی، ورنہ اور بھی بہت ثبوت فراہم ہو سکتے ہیں۔

اس زبانی جھگڑے کا خلاصہ یہ ہے کہ "حضراتِ اُردو" کو خطرہ ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے لفظ چھانٹ کر ان کی جگہ سنسکرت کے اجنبی اور ثقیل لفظ ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اور اس کی اصل اور جڑ وہ اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور ان کی ہر یادگار سے نفرت ہو گئی، اور ان کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان نسلوں کی ذہنیت ہندوانہ ہو جائیگی اور ہمارا کلچر مٹ جائے گا۔

دوسری طرف کچھ "سنسکرتی سجن" کہہ رہے ہیں کہ دیش کو ایکا بجاتی بننے کے لئے ایک "راشٹر بھاشا"

ہونا چاہئے، اس لئے اپنی بھاشا میں جنتا کی سمجھ میں جو آ سکیں، ایسے ودیسی شبدوں (یعنی سنسکرت کی) کی بہتات ضروری ہے۔ اس سے یہ لابھ ہوگا کہ دوسری پرانت بھاشائیں اور راشٹر بھاشا اس آ جائے گی، اور راشٹر بھاشا سارے ہندوستانیوں کی سمجھ میں آنے لگے گی۔

میں اس سے تو بحث نہ کروں گا کہ دونوں طرف کی یہ دلیلیں درست و معقول ہیں یا نہیں ہیں، میری کوشش یہ دیکھنے کے لئے ہوگی کہ یہ خطرے اور یہ ضرورتیں جو بیان کی جا رہی ہیں لسانیات یعنی فلسفۂ زبان کی ترازو میں کتنی وزنی اترتی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبانیں بننے کے نظریے کو سمجھا جائے۔

علم زبان کے انگریز ماہر ٹرینچ کا بڑا رتبہ ہے اور لسانیات کی بحثوں میں اس کا حوالہ ناگزیر ہوتا ہے۔ ٹرینچ سے پہلے تک تخلیق زبان کی بنیاد کا یہ نظریہ تھا کہ دوسری بہت سی ایجادوں کی طرح جن سے انسان نے اپنی زندگی کو آہستہ آہستہ سنوارا اور اسے معقول و شائستہ بنایا، زبان بھی اس کی ایک صنعت اور ایجاد ہے۔ واضح لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان نے اس دنیا میں آ کر حسب ضرورت چیزیں ایجاد کیں اور پھر انہیں درجہ بدرجہ ترقی دی، اسی طرح اس نے زبان ایجاد کی اور اس کو سنوارتا رہا۔ شروع میں اس نے بے معنی آوازوں سے کام لیا ہوگا، پھر خاص چیزوں کے لئے خاص آوازیں مقرر کی ہوں گی، کچھ اشاروں سے کام لیا ہوگا (یہ وہ آج بھی کرتا ہے) اور اس طرح ترقی پاتے پاتے زبان انسانی خیال و احساس کے اظہار کا حیرتناک ذریعہ بن گئی۔

اس نظریے میں ٹرینچ کو یہ نقص نظر آیا کہ اس طرح زبان انسانی زندگی کا ایک حادثہ یا اتفاق قرار پاتی ہے۔ مگر دنیا میں انسانوں کی ایسی جماعتیں تو پائی جاتی ہیں جن کو ابھی اکثر ضروری صنعتیں معلوم نہیں ہیں اور ایسا کوئی انسانی گروہ نہیں دیکھا گیا جس کی ایک زبان نہ ہو اور اسے بولتا نہ ہو۔ چنانچہ ٹرینچ نے زبان کے بننے کا یہ نظریہ پیش کیا کہ جب انسان حیوانیت کے دور میں تھا اس وقت بھی اس کے اندر حیوانیت کی منزل سے نکل کر انسانیت اور عمرانیت کی منزل میں پہنچ جانے کی استعداد موجود تھی۔ قدرت نے اگر انسان کے اندر یہ استعداد نہ رکھی ہوتی تو یا تو وہ حیوانیت ہی کی منزل میں فنا ہو گیا ہوتا، یا اس سے آگے نہ بڑھ سکتا، یعنی انسان نہ بن پاتا۔ اس لئے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدرت نے انسان کو زبان بالکل اسی طرح بخشی جس طرح اسے عقل عطا کی۔ لفظ ہی عقل ہے۔ لفظ کے آئینے میں عقل انسانی اپنی صورت دیکھتی ہے۔ لفظ اور عقل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یونانی زبان میں ان دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ابتدا ہی میں انسانی لغت اور قواعد کی کتابیں بغل میں دبائے رونما نہیں ہوگیا تھا، لیکن یہ بھی اتنا ہی درست ہے کہ اس کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اور اس قابلیت کا موجود ہونا کبھی کارآمد نہ ہوتا اگر انسان کے اندر اس اہلیت اور استعداد کو بروئے عمل لانے کی فطرت بھی نہ ہوتی۔

ان دلیلوں کے بعد ٹرینچ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زبان نہ تو بالکل انسان کی ایجاد اور اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور نہ تمامتر فطرت کا عطیہ ہے' زبان کو وجود میں لانے کے لئے انسان اور قدرت، دونوں کی کارفرمائی کو دخل ہے یہ فیصلہ عام سمجھ کے مطابق بھی معلوم ہوتا ہے، معمولی عقل کا آدمی بھی جب زبان کے مسئلے پر سوچنے بیٹھے گا تو پہلے اس کا خیال بچوں ہی کی طرف جائے گا کہ وہ شروع میں کس طرح بے معنی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ پھر شاید وہ بہرے، گونگوں کا دھیان کرے گا کہ اشارے ہی ان کی زبان ہوتے ہیں۔ اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ زبان بنتی تو آپ سے آپ ہے، مگر انسان اس کے بننے میں سہارا برابر دیتا رہتا ہے

ڈاڑھی اور گھٹنے کی مثال سے غالباً یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہماری ضرورت کے سامنے نہ تو ان لفظوں کا ہندی ہونا رکاوٹ بنا اور نہ ان کی ثقالت مانع ہوئی، ساتھ ہی ہمارے مذہبی مناسک بھی ناقص نہیں رہے۔ ٹرینچ کا نظریہ اسی سے ثابت ہوجاتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کا یہ نظریہ زیادہ سہل اور قابلِ قبول ہوسکتا ہے، کیونکہ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے آدم کو علم الاسماء سکھایا" ٹرینچ نے بھی یہی کہا ہے کہ انسان کو چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت دی گئی۔

جب مسئلے کی علمی صورت یہ ہے تو ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں کسی کا یہ کہنا کہ ہماری زبان مٹائی جارہی ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ دوسرے صوبوں کی زبانوں سے نزدیکی پیدا کرنے کے لئے سنسکرت کے لفظ زیادہ لئے جائیں، (بالکل خلافِ عقل بحثیں قرار پاتی ہیں)۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ بعض حکماء نے دو ہی قوتوں کو مجرد کہا ہے، ایک محبت کی قوت جس سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں دوسری علم کی قوت جو اس وقت ہماری گفتگو کا محور و مرکز ہے۔

ظاہر ہے کہ علم کا کوئی مذہب نہیں ہوسکتا، ہر چند مذہب کا علم اپنی جگہ پر ہے' زبان کا بھی ایک علم ہے' اور زبان اُن کی ہے جو اِسے بولیں۔ شروع میں جن مسلمانوں نے چہرے پر "اللہ کے نور" اور پیشانی پر "کوہِ نور" کے لئے ڈاڑھی اور گھٹنے کے لفظ قبول کرلئے وہ بہرحال آج کل کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے' اس لئے کہ قرنِ اول سے کئی سو سال قریب تر تھے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

ان کے ذہن میں ہماری تمہاری زبان کا کوئی تخیل ہوسکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان کی یہ لنگوا فرینکا جود میں نہ آسکتی تھی، بلکہ پرانی کہاوت کے مطابق پانی پاس ہوتے ہوئے "آب، آب" کہتے مرجاتے۔

اب چونکہ علمی طور سے زبان کے بننے میں انسان کا ہات بھی ہے اس لئے اس کا پھولنا، پھلنا بولنے والوں کی ضرورتوں کے تحت ہوگا، اور چونکہ اسکے وجود میں آنے کے اندر قدرت کی کارفرمائی کو بھی دخل ہے۔ اس لئے جب حالات بدلیں گے، وقت کے تقاضوں کے تحت زبان میں تبدیلیاں ہوجانا لازمی بات ہے، اور اسلئے کہ یہ کارخانۂ عالم ہی تغیر پذیر ہے، زبان کے اندر تبدیلیاں ہونے کو روک سکنا انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے۔

علم زبان کے طالب علم جانتے ہیں کہ لسانیات کے ماہروں نے یہ کلیہ تسلیم کرلیا ہے کہ تیس سال کے عرصے میں زبان کے اندر تبدیلی آجاتی ہے، بعض لفظوں کا مفہوم بدل جاتا ہے، بعض کے مفہوم میں کمی بیشی ہوجاتی ہے، کچھ لفظ ترک ہوجاتے اور کچھ نئے داخل ہوجاتے ہیں۔

زبان کے بولنے والوں کی ضرورت اور وقت کے تقاضے کی دلیل پر ایک تاریخی واقعہ شاید کچھ روشنی ڈال سکے، چند سال ہوئے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو سرحد کے علاقے میں سلطان محمود غزنوی کے عہد کے کچھ سکے دستیاب ہوئے تھے جن پر کلمہ شریف کا سنسکرت ترجمہ ناگری رسم الخط میں ٹھپا کیا گیا تھا۔ محمود غزنوی سے یہ بات منسوب ہونا حیرت کا ہمالیہ ہے، مگر اس واقعے میں حیرت کے لئے اور بھی گنجائش ہے۔ "بسم اللہ" کا ترجمہ ہے "اَدیک تیا ںھے"۔ "رسول" کا ترجمہ "ادتار" اور "محمد" کا "جینا" کے لفظوں سے کیا گیا ہے۔ نام کا ترجمہ کیا جانا ایک طرفہ بات ہے مگر "جینا" جین مت کے معلم اول کا لقب ہے۔ سلطان محمود کو وہی لقب پیغمبرِ اسلام کے لئے اختیار کرنے میں تکلف نہ ہوا۔

سلطان محمود کے بعد بھی سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان بادشاہوں کے سکوں پر دیوناگری حروف چھپا ہوتے رہے۔ تغلق عہد میں "شری غیاث الدین" ضرب ہوا۔ اور محمد تغلق کے ایک روپے پر لکشمی دیوی کی تصویر ضرب ہوئی۔

میں واقعی متجسس ہوں کہ ۹ مئی ۱۹۳۸ء کو جب محکمۂ آثارِ قدیمہ نے شملے سے یہ بیان شائع کیا تو اسے پڑھ کر بعض مسلمانوں کی حالت کیا ہوئی ہوگی؟ کیا ان کا خیال اس طرف گیا ہوگا کہ وہ غزنوی جسے انگریز مورخوں نے ہندوؤں کی نظر میں اتنا قابلِ نفرت بنا رکھا تھا، وہ اس درجہ رعایا کی خاطر ملحوظ رکھنے والا تھا، یا انھوں نے یہ سرکاری بیان پڑھنے کے بعد محمود غزنوی کے نام کے ساتھ "علیہ الرحمۃ" کے بدلے کچھ اور کہا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین اور محمد تغلق کو مسلمانی سے خارج کیا ہوگا، یا ان کی اِس

اسلامی رواداری پر فخر ومباہات کیا ہوگا؟

اس دَور میں پہنچ کر مسلمانوں کو ذہنیت کے ہندوانہ ہو جانے اور کلچر کے مٹ جانے کا ڈر بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس طفلانہ دلیل پر زور بہت دیا جاتا ہے مگر غور بالکل نہیں کیا گیا ہے "مزید ہندی الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ محض ادخلہ ہماری نسلوں کی ذہنیت کو ہندوانہ بنا دے گا" یہ کہتے ہوئے ہمیں مطلق خیال نہیں آتا کہ ہم صدیوں سے اسّی نوّے فیصدی ہندی الفاظ بولتے چلے آرہے ہیں، اگر واقعی الفاظ کا استعمال ذہنیت کو بدل سکتا ہے تو ہماری ذہنیت تو ہندوانہ ہو چکی ہے، اس کی احتیاط آج کیسی؟ ہم نے بالکل نہیں سوچا کہ چند نئے لفظ زبان میں داخل ہو کر اگر ہماری ذہنیت کو متاثر کر سکتے ہیں تو کس ذہنیت کو متاثر کریں گے؟ اسی کو ناجو ایک مدت سے ہندوانہ بن چکی ہے؟ پھر ہماری زبان میں انگریزی کے لفظ بھی تو داخل ہوئے ہیں۔ ضرورت بے ضرورت، صبح سے شام تک ہم بیسیوں انگریزی لفظ بولتے رہتے ہیں، انگریزی زبان کو باضابطہ حاصل کرنے میں پندرہ سال اسی میں منہمک رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہماری ذہنیت انگریزی ہو جانا چاہئے؟ پھر کیا ذہنیت کے بدلنے میں ایک محاربہ برپا ہو جانا چاہئے، اُردو کا استعمال جس میں بکثرت ہندی الفاظ ہمیں ہماری ذہنیت کو "ہندویت" کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہوگی اور انگریزی کا استعمال "عیسویت" کی طرف کھینچے گا؟ فتح کس کی ہو؟ اس کی روک تھام کا ہم نے کیا انتظام کیا ہے؟

اس ذیل میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ الفاظ زبان میں داخل ہو جانے کے بعد ذہنیت کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ذہنوں کے اندر ان لفظوں کو قبول کرنے کے لئے پہلے سے گنجائش پیدا ہو چکی ہے۔ مولانا حالی مرحوم انگریزی ذہنیت کے انسان ہرگز نہ تھے، مگر انھوں نے بعض انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کئے (جو آج بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں) اُس وقت اُنکی ذہنیت ان لفظوں کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھی، اور اُس وقت انھیں اُن لفظوں کی ضرورت بھی تھی۔ حالی کے زمانے تک ہماری زبان میں لفظ تخیل استعمال ہوتا تھا لیکن "امیجی نیشن"، کے مفہوم میں "تخیل" کا لفظ جاری نہ ہوا تھا۔

غرض، یہ اسّی فیصدی ہندی کے لفظ ہمارے اسلاف نے ضرورت اور تقاضے کے تحت اختیار کئے تھے، اور اگر اتنی بڑی تعداد ہماری ذہنیت کو ہندوانہ نہ بنا سکی تو اب کچھ اور لفظ داخل ہو جاتے ہیں تو کوئی عقلی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اور جہاں تک ذہنیت بدل جانے کا سوال ہے تو یہ تو صدیاں ہوئیں کہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مغل عہد سے پہلے سے ہندوستان کے مسلمان ٹھیٹ

[redacted]

ہندوستانی بن گئے تھے۔ اس ذکر میں شاید ایک تاریخی حقیقت یاد دلا دینا بے محل نہ ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ امیر تیمور ایک نہایت متشرع مسلمان تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اُسے سکندر ثانی بننے کا سودا ہوگیا۔ اس وقت ہندوستان کے اندر کئی مسلمان بادشاہیاں قائم تھیں تیمور کے لئے یہ مشکل آپڑی کہ مسلمان پر مسلمان کا خون بہانا حرام ہے، اور اس وجہ سے اگر ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو چھوڑتا ہے تو سکندری کافی رہی جاتی ہے۔ اس تردّد کو دور کرنے کی صورت اس فتوے کی صورت میں نکلی کہ ہندوستان کے مسلمان صورت وسیرت، دونوں صورتوں میں غیر مسلموں سے مشابہ ہیں، اس لئے ان کا خون بہانا منع نہیں ہے۔ تیمور کی مشکل حل، اور سکندری حاصل ہوگئی۔

اس سے ہم یہ تو اخذ کر ہی سکتے ہیں کہ آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو اس طرح شیر و شکر ہو چکے تھے کہ تیموری دربار کے علما کو فتوے صادر کرنے کا یہ آسان موقعہ مل گیا۔

کلچر کی گفتگو میں زبان اور ادب پہلی نشانیاں ہیں اور موضوع کلام بنتے ہیں۔ کسی قوم کا کلچر اس کے ادب میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے ایک آدمی کا کلچر اس کی گفتگو اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اب اگر میں "آپ" کی جگہ "تم" یا "تو" کہوں اور "جی" کے بدلے "ہاں" یا "ہنو" بولوں تو یقیناً آپ مجھے ایک شائستہ انسان نہ کہیں گے۔ پھر کیا حیرت انگیز ماجرا نہیں کہ جن دو لفظوں میں ہر وقت بولتا اور اپنی تہذیب وشائستگی کا ثبوت دیتا ہوں، وہ ہندی الاصل ہیں؟ کلچر کے باب میں ہمیں اپنے تہوار اور تقریبوں پر بھی نظر ڈالنی ہے اور ان لفظوں اور اصطلاحوں پر غور کرنا ہے جو ان تقریبوں کے موقعے پر بولی جاتی ہیں۔

شب برات ایک خالص اسلامی تہوار ہے۔ لیکن عام طور پر مسلمان جس طرح اس تہوار کو مناتے ہیں اس میں اور ہندوؤں کے شرادھ یا کنا گتوں میں بڑا فرق نہیں ہے۔ دونوں کے یہاں پرکھوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ بیوی کی صحنک مسلمانوں میں اسی طرح چلائی جاتی ہے جیسے ہندو عورتیں چو مکھ بلاتی ہیں۔ تعزیہ داری اور رام لیلا میں نقل کے بہت سے پہلو ہیں۔ کالا دانہ اتارنا اور ٹوٹنے ٹوٹکے ہندو مسلمانوں میں بالکل یکساں ہیں۔ ہندوؤں میں جس طرح بھوت پریت جھاڑا جاتا ہے کلم صوفی بھی اسی طرح جھاڑتے ہیں اور منتروں کی طرح دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں۔

پیدائش سے پہلے پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد کی رسمیں دونوں میں مشترک ہیں۔ بچے کا نال ایک ہی طرح کاٹا اور گاڑا جاتا ہے۔ دوران حمل میں ستوانسا یا گود بھرائی کی رسم دونوں میں

ادا کی جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد چھوانی اور ستولا دونوں کے گھر بنتا ہے۔ دونوں کے بچے گھٹی پیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اپنے ناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ نام ہندی ہیں اور رسمیں ہندوستانی۔ غریب مسلمانوں میں سوتر کی رسم ابھی تک ہے۔ زچگی ہو چکنے کے بعد مکان کو نجاست سے پاک کیا جاتا ہے۔ چھٹی کی رسم بھی دونوں فریقوں میں عام ہے۔

شادی بیاہ کی رسموں میں نسبت یا منگنی، تاریخ مقرر ہونا یا لگن پڑنا، دونوں جگہ ہوتا ہے۔ شادی کے وقت کنگنا اور سہرا بھی باندھا جاتا ہے۔ دلہن کے دروازے پر دولہا کے چھڑیاں اور عروسی ابٹن کے گولے مارے جاتے ہیں۔ یہ سب رسمیں عرب و ایران کی رسمیں نہیں ہیں۔ ہندوانہ رسمیں ہیں جو مسلمانوں نے بطیب خاطر قبول کر لی تھیں۔ بیٹی کے گھر کھانا کھانے سے دیہاتی مسلمان آج تک پرہیز کرتا ہے۔ یہ ایک راجپوتی آن تھی مگر سارے ہندوستان کی بہت اہم رسم بن گئی۔ سماج میں ایسا آدمی نہایت ذلیل اور گرا ہوا سمجھا جاتا تھا جو بیٹی کا کھا لیتا تھا۔

موت کی رسموں میں تیسرے دن کی قرآن خوانی "پھول" یا "تیجہ" کہا جاتا ہے۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں اور چھماہی ہندی نام ہیں، اور ہندوانہ رسمیں مگر مسلمانوں میں برتی جاتی ہیں۔ مرے کا کھانا مسکینوں کو اسی طرح کھلایا جاتا ہے جیسے برہمن جمائے جاتے ہیں۔ مسلمان برادریوں میں مرے ہوئے کی "روٹی" دی جاتی ہے۔ ساری برادری کی دعوت ہوتی ہے مگر اسے دعوت نہیں "روٹی" کہا جاتا ہے۔ الغرض پیدائش، شادی اور موت سے متعلق تقریباً سب رسمیں دونوں فرقوں میں مشترک ہیں۔

مسجد کے گنبد پر بھی وہی کلس دکھائی دیتا ہے جیسا مندر پر لگا ہوتا ہے۔ وضو کے برتن کو "لوٹا" یا "بدھنا" ہی کہا جاتا ہے۔ یہ نام ہندی ہیں حالانکہ وضو کرنا ایک مذہبی رکن ہے۔ تعزیے کے اوپر کا حصہ "چھتری" کہلاتا ہے، حالانکہ ہندوؤں میں چھتری اس عمارت کو کہتے ہیں جو مردے کے "پھول" یعنی اس کی جلی ہوئی ہڈیوں پر بطور یادگار بنوائی جاتی ہے۔

یہ سب چیزیں جو گنائی گئی ہیں، مسلمانوں کے نیم مذہبی معاملات سے متعلق ہیں۔ تلاش کیا جائے تو بے شمار مثالیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ لیکن کلچر کی بحث میں ایک اور بھی اہم نکتہ یاد رہنا چاہیے۔ کلچر کوئی جامد شے نہیں بلکہ ایک نامیاتی چیز ہے۔ کلچر کا دائم متغیر ہونا اس بنا پر ہے کہ زندگی متغیر ہے۔ اور تبدیلی و تغیر میں ایک قوم کی کلچری باتیں دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ایک قوم کے کلچر میں قدیم قوموں اور جدید ملکوں کے کلچر کی موجودگی مسلمہ نظریہ ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی اس مذہبی رسم کی کہ مردے

کے ساتھ توشے کی روٹی جاتی اور قبرستان میں کسی محتاج کو دے دی جاتی ہے اور ہندوؤں کی پنڈدان کی رسم میں مناسبت ہے اور ہندو مسلمانوں کی یہ رسم اصلاً اپنے مصریوں کی رسم کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ فراعنہ مصر کی لاشوں کے ساتھ زندگی کی ضروریات قبروں میں دفن کی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ غذائیں بھی رکھی جاتی تھیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حشر کے دن مردے اٹھیں گے تو انھیں بھوک لگے گی۔ تین مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں ملتی جلتی رسم کا جاری ہونا اور تینوں مذہبوں میں اس رسم کا تعلق مذہبی معتقدات سے ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کلچر کی بحث میں موسیقی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں موسیقی بھی ایک شعبہ ہے۔ جو ہندوستان کے مختلف حصوں کو ایک وحدت ثابت کرتا ہے۔ یہ موسیقی مسلمانوں کے آنے سے پہلے مذہب کا ایک حصہ اور عبادت کا ذریعہ تھی۔ لوگ مندروں میں مورتی کے سامنے الاپ کر کے اپنے عقیدت جذبات پیش کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے اس موسیقی کو ہمسائے کی چیز سمجھا اور قوالی، ترانہ، ٹھمری وغیرہ کا اضافہ کر کے اسے عروج تک پہنچایا۔ مغل بادشاہوں نے اس فن کے بڑے بڑے باکمال پیدا کئے۔ حضرت امیر خسرو کا موسیقی سے جیسا لگاؤ تھا اس عہد کے شہرہ آفاق موسیقار ... بیشتر مسلمان تھے مسلمان اس موسیقی کو ہندوؤں سے سیکھتے رہے اور ہندو مسلمانوں سے سیکھتے رہے۔ آج مسلمانوں کو چھوڑ کر جو چار کی تعداد رکھتے ہیں وہ لوگ بھی جو ہندو کلچر کو جدا مانتے ہیں، اگر موسیقی سے لذت و انبساط حاصل کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہندوستانی موسیقی کے کلچری اثرات ان کے خون میں شامل کر دئے ہیں اور یہ اثر کسی کوشش سے زائل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس موسیقی کے ایک ہونے کی صورت میں ہندوستان کے مختلف طبقے اگر جدا جدا کلچر کے مدعی ہوں تو میرے خیال میں شاید کوئی ذی عقل انسان اس کی تائید نہ کرے گا۔

اس گفتگو میں ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ آج کل ریڈیو پر جو ٹھمریاں گانے سنائے جاتے ہیں اگر آپ ان پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ اردو کی غزل ہو یا ہندی کا گیت اس کے پسند کرنے والوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اور پھر یہ کہ ملک کے مختلف حصوں کے ہیں۔ ان لوگوں کا ذوق و مزاج ایک ہی ہے۔ یعنی ان کے ذوق و پسند کی یہ یگانگت جدا کلچر کے مدعیوں کے لئے ایک مستقل چیلنج ہے اور دوسرا مستقل چیلنج تو ہمارے نئے فیشن کے بزرگوں کی بغل میں رہتا ہے۔ یعنی ان کی بیگمیں یا دوسرے اور گھروں کی پارٹیوں میں نہ صرف شریک ہوتی ہیں بلکہ ٹھمری، دادرا، ساڑیاں اور ماتھے کی بندیاں ان کے ادعا کا سب سے بڑا بطلان ہیں۔

میرے لئے احساس برتری کا وہ نظارہ نہایت قابل رحم ہوتا ہے جب کوئی حضرت اردو کے مسئلے کا بعض نامانوس لفظ سن کر ناک بھوں چڑھاتا یا شکر خند کے پردے میں طنز کرتا ہے اس سے وہ شخص مجھے اپنی جہالت کا یقین دلا دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا اعتراض لفظ کی ثقالت پر ہوتا ہی اور ثقالت الفاظ کی اجنبیت کے ساتھ ہے۔ یہ صاحب خود دن بھر میں ہزاروں لفظ بولتے ہونگے جو نہایت درجہ ثقیل ہوتے ہیں، مگر کثرت استعمال نے ان کی ثقالت دور کر دی ہے۔ ڈاڑھی اور گھٹنے کے علاوہ بھی بہتیرے لفظ ہیں جن کا مترادف مشکل ہی سے ملیگا۔ جیسے بھونڈا، نٹ کھٹ، گھونگٹ، ایڈا بینڈا، گھاٹوپ، جھٹ پٹا، الٹ پلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ اشٹریتی سے زیادہ ثقیل ہیں، فرق صرف مانوس اور اجنبی ہونے کا ہے۔

لفظوں کی ثقالت کے باب میں یہ مسئلہ ایسے لوگوں کے سامنے ہے ہی نہیں کہ تحریری لفظ ایک علامت ہے صوتی لفظ یعنی آواز کی۔ اور سر رچرڈ پیجیٹ تو صوتی لفظ کو بھی اصل لفظ نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اصل تو وہ حرکات ہیں جو ہمارے اعضائے نطق سے صادر ہوتی ہیں، آواز کے یہ مخرج جب حرکت کرتے ہیں تو ہمارے سانس لینے کا نتیجہ آواز ہوتی ہے۔ مگر چونکہ ہمارے حلق کی یہ نظر نہ آنے والی حرکتیں اپنے ثانوی یا دوسرے وصف یعنی آواز کے ذریعے سے ایصال ہوتی ہیں اس لئے آواز کو ان حرکات کی علامت قرار دے لیا گیا ہے۔

اس اصول کے تحت دیکھئے تو ہماری زبان ہی ایک ایسی خصوصیت کی مالک نظر آتی ہے کہ اس کے اندر انسانی حلق سے نکلنے والی ہر آواز کے لئے حرف موجود ہے، اور ہمارے حلق کی ساخت بھی ایسی ہے کہ ہر تلفظ کو ادا کر سکتی ہے۔ بعض ملکوں کی زبانیں اور بعض قوموں کے گلے کی ساخت بعض تلفظ کو ادا نہیں کر سکتی، یا بعض قسم کی آواز نکالنے سے عاری ہے۔ اس صورت میں ثقالت پر ناک بھوں چڑھانا فطرت کا منہ چڑانا معلوم ہوتا ہے۔

میں مانوں گا کہ ثقالت پسندیدہ شے نہیں ہے، لیکن بادنٰی تامل دیکھا جا سکتا ہے کہ یا تو استعمال سے لفظوں کی ثقالت باقی نہیں رہتی یا اس لفظ میں سے ثقیل جزو گرا دیا جاتا ہے میں ایک لفظ "چھپر کھٹ" کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ اس کے اندر ثقالت کے تمام اجزا موجود ہیں لیکن اس کے مفہوم میں راحت و نفاست عشرت تموّل اور اس کے تعلقات کے دوسرے بہت سے تصورات بیک آن ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں اور ان تمام مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک واحد لفظ دوسرا پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا لفظ "گھونگٹ" پیش کروں گا۔ اس لفظ کے ساتھ امیال و عواطف کی جو دنیا ہے، اور وجدانیات کے لئے جتنا کچھ مسالا

راہم ہو جاتا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہندوستانی زبان کے ادب کا کتنا حصہ ہے جو اس لفظ
وراس کے متعلقات پر مبنی ہے؟ اور آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ادب جو اس لفظ سے پیدا ہوا ادب کی
ان نہیں ہے۔ "وکرمادیت" ہماری زبان میں "بکرماجیت" بولا جاتا ہے۔

کسی زبان میں ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہونا اور ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے متعدد لفظوں
ا موجودگی اس زبان کے تموّل کی دلیل ہے۔ اس حقیقت کا احساس شاعروں کو زیادہ ہوتا ہے
یسی لفظ کا ایک رکن کم یا زیادہ ہونا شاعر کے لئے کس ذہنی تکلیف اور روحی اذیت کا سبب بنجاتا ہے اور
لآخر یا تو بری طرح ادا کرتا ہے یا اس خیال کا خون ہی کرنا پڑتا ہے۔ جس کے ساتھ شاعر کا دل بھی خون ہو کر
ہجاتا ہے اس لئے یہ بات تو زبان کی ضرورت میں داخل ہے کہ اس کے اندر ہم معنیٰ اور قریب المعنیٰ الفاظ کی
ثبات ہو، ہمارے موجودہ ذخیرے میں ایسے مترادف لفظ ہیں اور اُن سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا جاتا
ِ شجر اور درخت کے ساتھ پیڑ کا لفظ بھی ہے! ورنالی اور موری کے ساتھ بدرو بھی ہے۔ یہ الفاظ کبھی ہمارے
لئے قباحت کا موجب نہیں بنتے۔ پھر اگر مضمون یا موضوع کے لئے "دیش" بھی ہو، وطن کے لئے "جنم بھومی"
ورملک کے لئے "راشٹر" بھی ہو تو عقلاً کسی زحمت کا امکان نظر نہیں آتا۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے
"راشٹریہ" کے لفظ پر غور کئے بغیر اس کی تضحیک کی گئی، مگر فی الواقع اس مفہوم کے لئے ہم کوئی دوسرا
فظ پیش نہیں کر سکتے۔ مگر ان نفرت کرنیوالوں کی بدولت یہ لفظ اب اُردو میں داخل ہو گیا۔

اس ذیل میں یہ علمی نکتہ نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ کوئی دو لفظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے۔
لبتہ قریب المعنیٰ ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ہماری زبان کئی زبانوں کے میل سے بنی ہے اس کے لئے یہ
بھی ممکن ہے کہ بالکل ایک ہی مفہوم کے لئے کئی لفظ مختلف وزن کے موجود ہوں۔

اُردو کے حامی جن کو ہندی سے تنفر کہنا بھی اتنا ہی درست ہوگا، ضروری اور غیر ضروری کی دلیل پر
ہت زور دیتے ہیں۔ مگر اپنی زبان کے یہ نادان دوست اس معاملے میں بھی غور و فکر سے کام لینا پسند
نہیں کرتے جو نئی غور و فکر کا کام، انگریزی زبان میں WOOD اور FOREST پہلے سے موجود
تھے مگر جنگل کا لفظ اس وقت لے لیا گیا جب ہندوستانی "کالا آدمی" اور اس کی زبان غلاموں
کی زبان تھی۔ اس پر کسی انگریزی بولنے والے نے اعتراض نہیں کیا کہ "بلا ضرورت" یہ نیا لفظ کیوں
لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بازار، ڈکیت اور لوٹ کے لفظ انگریزی زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ حالانکہ
نگریزی میں ان مفاہیم کے لئے لفظ موجود تھے۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے کسی کتاب میں یہ پڑھا کہ
یوکرین کے پایۂ تخت کیف میں ایک سڑک کا نام بازار پر ہے۔

چینی زبان میں ایک لفظ ہے "کن تن تاؤ" اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے یہاں "تو" کا عضو کا متعلق ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اسلوب موجود تھے مگر اس کا استعمال ہونے لگا اور کوئی معترض نہ ہوا کہ یہ چینی زبان کا لفظ ہم سے ادا نہ ہوگا۔

زبانوں کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں اور ہر شخص معمولی توجہ سے سمجھ سکتا ہے کہ زبان کے اندر رد و قبول کا فطری عمل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنے اس عمل کے لئے ہماری کسی کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جہانگیر کو لفظوں میں تصرف کرنے اور نئے لفظ گھڑنے کا شوق تھا اس نے بہت سے لفظ بنائے مگر آج کوئی باقی نہیں۔ نورجہاں نے نئی وضع کی چوڑیاں تیار کرا کے ان کا نام جہانگیریاں رکھا آج بھی وہ "جہانگیریاں" ہی کہلاتی ہیں۔

پچھلے دس بیس برس میں ہم نے انگریزی کے کچھ لفظوں کے ترجمے یا مترادف لفظ وضع کئے جن میں سے بعض نامقبول ہو گئے "سوسائٹی" کے لئے ہم نے "ہیئت اجتماعیہ" تراشا مگر قبول نہیں کیا گیا اور اس کی جگہ "سماج" کا لفظ رائج ہو گیا جو اس وقت گھس آیا جب ہندی اردو کا جھگڑا زوروں پر تھا "ورکنگ پارٹی" کا لفظ ہر چھوٹا بڑا سمجھتا ہے مگر اس کے بدلے "مجلس عاملہ" علی گڑھ یونیورسٹی کے حلقے سے باہر کوئی نہیں بولتا۔ "پبلک" کے مفہوم میں ہم نے "جمہور" کا لفظ چلانا چاہا مگر پبلک نے اسے "پبلک" ہی رکھا۔ اور "ڈیموکریسی" کے معنی میں "جمہوریت" کا لفظ ہر وہ شخص سمجھتا ہے جو اخبار پڑھتا ہے "لائحہ عمل" پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے بھی مشکل سے ادا ہوتا ہے مگر "پروگرام" بچہ بچہ بولتا ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے نے ایک گاڑی چلائی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کا نام "طوفان میل" کس نے رکھا مگر یہ نام ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ گیا یہاں تک کہ اس نام کا ایک فلم بن گیا۔

ضرورت ہو یا نہ ہو مگر عوام میں "صفے دار" کے معنی میں "ممبر" "پارٹی" کے معنی میں لفظ "پارٹی" بھی "جنبہ داری" اور ایسے ہی سیکڑوں لفظ بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ہندی کے بھی کچھ لفظ اسی زمانے میں عام فہم ہو گئے ہیں جیسے "شانتی"، "آکاش"، "شکتی"، "سنگھٹن"، "سبھا"، "سوراج" اور "جنتا" وغیرہ۔ غرض یہ کہ زبان مسلّم طور پر ایک عضوِ ذی حیات اور جاندار شے ہے وہ ہر اس غذا کو الٹ دیتی ہے جو اسے مرغوب نہ ہو اور ہر ثقیل چیز کو جسے اس کی طبیعت قبول کرے ہضم کر کے جزو بدن بنا لیتی ہے۔

دوسری طرف کچھ "سنسکرتی سجن" ہیں جو زبانوں کے بننے بگڑنے اور بدل جانے کے اصول سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھائی عام طور سے بولے اور سمجھے جانے والے سبک اور آسان لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے اجنبی لفظوں کو ٹھونستے رہتے ہیں ایک نئی بھاشا بنا لینے کی دھن میں ہیں

ں ہیں انھوں نے جو فائدہ سوچا ہے ہو سکتا ہے وہ حاصل بھی ہو جائے اگر ہندوستانیوں کو ایک
انی یا متحدہ قومیت بنا لینا جس کا یہ بھائی پرچار بھی کر رہے ہیں دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ بناوٹی طور
[illegible] نئے لفظوں اور بھاشاؤں میں پیدا تو ہو جا سکتے ہیں جن کا چند دن بعد مر جانا بھی ممکن ہے لیکن
[illegible] پیدا ہو جانے کی صورت میں بھی کوئی بڑا فائدہ تو نہ ہوگا۔ اس بات کی جو قیمت دی جا رہی ہے وہ
بہت زیادہ ہے اول تو خود ان پرچارکوں کا مطلب پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ ہندو عوام اور خاص کر
[illegible] بھاشی لوگ ان کی زبان کو بہت کم سمجھتے ہیں اور دوسرے اس سے قومی نفاق بڑھ رہا ہے۔ قومی
[illegible] کا نتیجہ [illegible] ذرا رائی مشن کی کارروائیوں میں اور اس کے بعد کلکتے کے ہولناک فساد
[illegible] صورت میں ان کے سامنے ہیں۔ [illegible] اگر چاہیں تو [illegible] اس سے آیندہ کے حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ ہندی کے اتنی فیصدی الفاظ صدیوں تک برتتے رہنے کے
[illegible] رہے ہیں سو ہیں اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے [illegible] طرز عمل یا [illegible] انگو [illegible] ہندو
[illegible] ہو گیا [illegible] راشٹر بھاشا [illegible] دوسرے صوبوں کے لئے آسان اور
[illegible] جائے تو [illegible] سچائی اور حقیقت سے آنکھ چرائی جا رہی ہے
[illegible] گجراتی اور بنگلہ زبانوں میں صدیوں سے عربی فارسی لفظوں کا میل جول ہو چکا ہے۔ اور اگر
مسلم [illegible] زبان میں داخل ہو جانے سے ہندوؤں کا کوئی نقصان ہونا ممکن ہے تو وہ آج سے بہت
پہلے ہو چکا ہے۔ اور اگر ہندی اور سنسکرت الفاظ کو زیادہ استعمال کرنے سے مسلمانوں کا کوئی نقصان
متصور ہو سکتا ہے تو وہ بھی پہنچ چکا۔ تلاش اس کی ہونا چاہیے کہ وہ نقصان آخر تھا کیا؟

ہندی کے پرچارک بھائیوں کے تعصب کی ایک شہادت تو یہ ہے کہ انھیں عربی کے ساتھ
فارسی شبدوں سے بھی نفرت ہو گئی ہے حالانکہ فارسی اور سنسکرت ماں جائی بہنیں ہیں۔ یہ اس لئے
ہے کہ فارسی مسلمانوں کے ساتھ آئی۔ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹانے کی مثال اس سے بہتر کیا ہوگی؟
فارسی کے ساتھ اردو بھی آریائی زبانوں کی برادری میں شامل ہے۔ اور علمی شہادتوں کو نہ ماننا عقلمندی
[illegible] نہیں کہا جائے گا۔ غور سے دیکھا جائے تو دوسرے صوبوں کی زبانوں کو راشٹر بھاشا سے نزدیک
کردینے کے نظریے کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ دراوڑی زبانوں کو ہندی یا سنسکرت بنا دیا جائے۔ یہ کوشش
ایک جاہلانہ خیال سے زیادہ درجہ نہیں پا سکتی۔ ایک برادری کی زبانوں سے بغض اور نفرت اور دوسری
برادری کی زبانوں سے ناتا جوڑنا یہ ایسی عقلمندی کا کام ہے جو شدید قسم کا تعصب ہی کرا سکتا
ہے۔

ہماری تمہاری زبان کے قضیے میں اگر یورپ کی ایک مثال کو سامنے رکھا جائے تو ممکن ہے کہ ہم کوئی مفید سبق حاصل کر سکیں۔ یورپ کے بین الاقوامی یا "انٹر ناشنل" معاملوں میں ایک مدت سے اور بالکل فطری طور پر فرانسیسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ تمام عہد نامے اسی میں لکھے جاتے تھے مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اس کی جگہ انگریزی لے رہی ہے۔ اس کی نہ تو انگریزوں نے کوشش کی تھی اور نہ فرانس والوں نے واویلا کی۔

یہ سنسکرتی بھائی شاید اس بات کو بھول گئے ہیں کہ سنسکرت صحیح معنی میں عوام کی بول چال کسی زمانے میں بھی نہ تھی۔ اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں کہ جنتا کی ضرورت نے جب پالی کو رواج دیکر سنسکرت کو بارہ پتھر باہر کر دیا تھا اس زمانے کو بیتے ہوئے ڈھائی ہزار برس گذر چکے ہیں۔ اور مڑ کر دیکھنا سمے کا سبھاؤ نہیں۔ انسانی ارتقا ایک منزل سے دو دفعہ نہیں گذرتا۔ ہمارے یہ بھائی اگر اس پروپیگنڈے کے زمانے میں اپنے آپ کو سچا ٹھہرانے میں کامیاب بھی ہو گئے تب بھی وہ خود اپنے ساتھ سچے نہ ہونگے۔ آج بھی وہ اپنے بیوی بچوں سے جس بھاشا میں بات چیت کرتے ہیں وہ وہ بھاشا نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے لیکھ لکھتے اور بھاشن دیتے ہیں۔

بھاشا ودیا یا علم زبان کے ماہروں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ لفظ یا شبد فوسلی شاعری، فوسلی اخلاقیات اور فوسلی تاریخ ہوتے ہیں۔ فوسل (FOSSIL) ایک علمی اور بین الاقوامی اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم اُن قدیم آثار زندگی کے برآمد کرنے سے ہے جو زمین کے اندر دفن ہو چکے ہیں اور جنکو برآمد کر کے بہت پرانے زمانوں کی تاریخ قیاس کی جاتی ہے۔ اس ذیل میں لفظ "ترک" پر غور فرمائیے گا۔ تو تاریخ معاشرت کا ایک فلم آپ کے سامنے سے گذر جائیگا۔ ترک مسلمان ہندوستان میں حملہ آور کی حیثیت میں داخل ہوئے۔ ملک کے باشندوں میں ان کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ لفظ ترک نے ایسے آدمی کے معنی اختیار کر لئے جو قابل نفرت ہو یعنی "ترک" اور "ملکش" ہم معنی لفظ بن گئے پھر مسلمان اس ملک میں بس گئے۔ باہم معاملت داری ہونے لگی نفرت کم ہوتی گئی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ایک امر واقعہ بن گیا۔ اجنبیت ختم ہو گئی۔ باہم میل جول نے دوستی کی بنا ڈالدی محبتیں بڑھنے لگیں۔ انسانی فطرت نے اپنا کام کیا۔ اور بتدریج تنا میل ملاپ بڑا کہ رام اور رحیم ایک ہی چیز ہو گئے۔ یہاں تک کہ لفظ ترک نے "ناپاک" کے معنی ترک کر دیئے اور وہ مفہوم اختیار کر لیا جو اس لفظ کو فارسی ادب میں ملا ہوا تھا۔ فارسی ادب کے اثر سے ہندی میں بھی لفظ ترک پیارے کے مفہوم میں بولا جانے لگا۔ آپ نے یہ ٹھمری ضرور سُنی ہوگی: ؎

"ترکو اپنے گھیر لئی رے ...."

یہ ہے مثال لفظوں کی فوسلی شاعری، فوسلی اخلاقیات اور فوسلی تاریخ ہونے کی۔ اس لفظ کے اندر یہ تینوں پہلو بیک وقت سامنے آجاتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر اور علمی نظر سے غور بھی کریں۔

اب اگر یہ سچ ہے کہ یہ "پراچینی بھائی" ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر یادگار کو مٹا کر چھوتے بننے پر تُل گئے ہیں تو کیا اُنھوں نے سوچ لیا ہے کہ ان کا یہ خیال کہاں تک اچھا، کس حد تک ممکن اور کس طرح قابلِ عمل ہوگا؟ زبان کے مسئلے میں چونکہ یہ کوشش غیر فطری ہے، ارتقاء کے خلاف ہے، اس لئے ناکام رہے گی۔ لیکن اگر بحث کی خاطر مان بھی لیا جائے کہ انھیں کامیابی ہو جائے گی تو کیا یہ حقیقت نہ ہوگی کہ اس طرح وہ اپنی کئی صدیوں کی تاریخ معاشرت کے خزانے کھو بیٹھیں گے؟ کیا اس طرح مسلمانوں کے ساتھ اپنی رواداری اور بھائی چارے کی زندہ اور بیش بہا شہادتوں کو فنا کر دیں گے؟

یہ مہاشے اس ناقابل انکار حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر وہ کسی طرح ایسا اچرج کر بھی سکے، یہ معجزہ دکھا بھی سکے تو اُسے نئی دنیا کے نقشے میں کیسے بٹھایا جائے گا یا پنڈت جواہر لال کے لفظوں میں "FIT IN" کیسے کریں گے؟ یہ سجن ایک اور بھی بات کو بھی جھٹلا رہے ہیں، سب نے مانا ہے کہ زبان اور کلچر کی رکھوالی عورت ہے۔ اور ہندوستان کی عورت نئی سڑک پر پڑلی ہے۔ یہ مہاشے چُٹیا باندھیں، کرتے شلوکے میں کپڑے کے بند لگائیں۔ ڈاڑھی بڑھا کر اس میں گانٹھ لگائیں، سر کے بال بھی بڑھالیں اور مہابھارت کے زمانے کی پوری تصویر بنجائیں، مگر ہندو عورت تو ساری میں "بورڈر" لگاتی جا رہی ہے، کہنیوں تک پہننے کے لئے سُرخ و سفید چوڑیاں مانگتی ہے، پورا فراک بنوا رہی ہے اور پاؤں میں سینڈل یا نہایت وضع دار چپل ڈالتی ہے پچاس برس کی تگ و دو کے بعد اگر آج ہندو عورت کی معاشرت اس طرح بدلتی دکھائی دے رہی ہے یہ بھائی ناکام تو ہو چکے۔ اس لئے کہ ہندو گھروں کی بدلتی ہوئی معاشرت نئی روشنی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

چنانچہ آج کے حالات دیکھ کر اگر آنے والے زمانے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو ہندوستانی اد اس کے ساتھ ہندو عورت کا بدلتا ہوا تصورِ حیات دیکھ کر ان "پراچینیوں" کو اپنی قوتِ عمل کو تفرقہ و نفر کے کام چھوڑ کر کسی قومی تعمیر کے کام میں صرف کرنا چاہیئے، اور اگر گزرے زمانے کے واقعات کو دیکھ آنیوالے زمانے کو قیاس کیا جاسکتا ہے تو ان بھائیوں کو پچھلے پچیس سال کی سیاسی تحریکوں کی روشنی

دیکھنا چاہیے کہ آگے چل کر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں سماج واد یعنی سوشلزم کے وچار اور خیال پھیل کر رہیں گے، اور سماج واد اس پراچینی پاگل پن کو ایک منٹ کے لیے نہیں سہار سکتا، اس لیے کہ سوشلزم ایک عالمگیر تحریک ہے جو پچانوے اور اٹھانوے فیصدی مزدور اور کسانوں کی تحریک ہے۔

یہ پراچینی بھائی ہندوستان کو تین ہزار برس پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، اس الٹے پانوں چلنے میں ان کے ساتھ بنگال جائے گا یا پنجاب، مدراس ساتھ ہوگا یا کشمیر، یا یو پی۔ کیا بھی سارے ہندو الٹے پانوں چلیں گے؟ کشمیری اور کایستھ اس پر راضی ہو جائیں گے؟ بالفرض انھوں نے شہر کے رہنے والے پڑھے لکھے اور خوشحال ہندوؤں کو لے بھی لیا تو نیچ ذاتیں اور مزدور طبقہ یا دیہات کا کسان ان کے ساتھ ہولے گا؟ کسان مزدور آج اپنا انسانی حق مانگ رہا ہے اور پراچین زمانے میں اسے جینے کا حق بھی اپنا حق معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس رجعت پسندی (REVIVALISM) کو پیٹ بھر الٹی بھی کہہ سکتے ہیں کہ الٹے پانوں چلنے ہی میں فائدہ ہے تو اس کی تکمیل تو ہمالیہ کی کھوؤں میں رہنے سے ہوگی، جہاں نہ تو کسی کے کام آنے والے ریل نہ موٹر، نہ ہوائی جہازوں کے جھگڑے اور نہ ریلوے انجنوں کے سگنل۔ جہاں نہ تار کی ضرورت ہوگی، نہ ٹیلیفون کی۔ اس سے زیادہ طرفہ اور نرالی بات کیا ہوگی کہ انڈسٹریل پلاننگ بھی سوچا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ڈھائی تین ہزار برس کے زمانے کو واپس لانے کی کوشش بھی جاری ہے جہاں سمجھ سکتے ہوں، ان پراچینی لوگوں کی یہ کوشش اگر گذشتہ آٹھ سو سال کی ہندوستانی تاریخ ہی میں بہا دی جائے تو دنیا میں اسے پاگل پن کے سوا دوسرا نام نہ دیا جائے گا۔

زبان کو بدل سکنے کا خیال پہاڑ سے سر ٹکرانے کا صورت ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مال کا قانون ایک ہے اور مسلم عہد کی یادگار ہے۔ اس قانون کی اصطلاحیں مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہیں اور جس طرح درخت جڑ پکڑ لیتا ہے، نہ صرف ہندوستان میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ پھر ضابطہ فوجداری اور قانون مال کی تمام اصطلاحیں ایک ایک دیہاتی کی زبان پر ہیں۔ گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ میں بہتیرے عربی فارسی کے لفظ شامل ہیں جن کی اصل پہچانی نہیں جاتی۔ مدراس میں شادی کے موقعے پر متعدد بار دولہن آتے ہیں اور جب وہ رسم ادا ہو چکتی ہے تو "چندن تنبول" کی رسم ادا کی جاتی ہے اور مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ مہاراشٹر میں لوگوں کے نام دجیندار، فرنویس، پیشوا اور سیراتش دار وغیرہ بہت ہیں۔ گجراتی کرتے کو پیرن (یعنی پیرہن) اور دلیس کو دھن کہتے ہیں۔ بنگلہ زبان میں نقل داز، آدم شماری (یعنی مردم شماری)، چھبی (یعنی شبیہ) اور بالش (یعنی تکیہ) بے شمار عربی فارسی کے لفظ شامل ہیں۔ قلم (یعنی مریم) ہندوستان کی ہر زبان میں بولا جاتا ہے۔ بنگالیوں کے نام بھی معظم دار، مجالانویس وغیرہ ہوتے ہیں۔

یوپی میں ابھی تک الفت سنگھ اور بخشی رام وغیرہ سُنے جاتے ہیں۔ یہ لفظ کیسے چھانٹے جائیں گے؟ اور ان کے بدلے میں کون سے لفظ بولے جائیں گے؟ میرا پختہ خیال ہے کہ اگر ہندوستانی زبانوں میں سے عربی فارسی اصل سے بنے ہوئے لفظ نکال دئے جائیں تو وہ بولیاں رہ جائیں گی جیسے کہ پہاڑیوں کے علاقے میں بھیلوں کی آبادی ہے۔ ان بھیلوں میں یہ رواج ہے کہ ہونے والا داماد اپنے سُسرے کی کھیتی باڑی پر محنت کرکے بیوی کی قیمت ادا کرتا ہے۔ ایسے داماد کو "خنزاد" کہا جاتا ہے۔ یہ خانہ داماد کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ایسے لفظ ہر زبان میں بے شمار نکلیں گے اور کوئی ذی ہوش انسان تسلیم نہیں کرسکتا کہ یہ لفظ نکالے جا سکتے ہیں۔

سنسکرت زمانۂ تاریخ میں جب کہ وہ ایک زندہ زبان تھی، بول چال کی زبان نہ تھی، مگر اب کہ وہ مُردہ زبانوں میں داخل ہو چکی ہے، اِسے زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور وہ قیمتی وقت جو زندہ زبانیں حاصل کرکے ہندوستانی قوم کے ذہن روشن کرنے میں صرف ہونا چاہئے "گڑے مردے اکھیڑنے" میں گنوایا جارہا ہے۔ یہ لوگ اگر ہندی ساہتیہ پر ہی ایک طالب علمانہ نظر ڈالیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے اندر عربی فارسی کے ایسے بہت لفظ ہیں جن کے ہندی مترادف اگر کبھی تھے بھی تو آج نہیں ہیں۔ برج کے علاقوں کے شہری اور دیہاتی ہندوؤں میں ایسے لفظ بولے جاتے ہیں جیسے براتی کی رخصت "بدا" (یعنی وداع) اور دلہن بیٹی جب میکے سے جاتی ہے تو اُسے "بدائی" دیجاتی ہے۔ "زچہ" "بچہ" اور جہیز یا دہیز گانوں گانوں میں بولے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ہندوؤں میں پلنگ اور "چرخہ" جہیز کی خاص چیزیں ہیں۔ "چرخہ" کانگریسی تحریک سے پہلے بھی کل ہندی لفظ تھا۔ منگنی کے وقت جہیز ٹھہرانے کو "کرارداد" (یعنی قرارداد) کہا جاتا ہے۔ دولہا کو "نوشہ" بھی کہتے ہیں اور ساتھ جو چھوٹا لڑکا گھوڑے پر بٹھا دیا جاتا ہے اُسے "شہ والا" ہی کہا جاتا اور دولہا "جامہ" ہی پہنتا ہے۔ برت کھولنے کے لئے دودھ کی مٹھائی "برفی" اور "قلاقند" وغیرہ ہی منگانا پڑتا ہے۔

عقل حیران ہے کہ کیا مٹھائیوں کے یہ بدیسی نام بھی بدلے جائیں گے، اور کیا سیب، سردہ، خربوزہ، خوبانی، کشمش، بادام وغیرہ کھانا چھوڑا جائے گا؟ "گلاب" اور اس کا "عطر" و "گلقند" یہ سب ترک کردیئے جائیں گے؟ "رضائی" اور "لحاف" کے نام بدلے جائیں گے۔ "پہلوانی" شاید نہ چھوڑی جائے گی، پھر "خم" ٹھوکنے کو کیا کہا جائے گا؟ آج کل کے حفظانِ صحت کے اصول کے مطابق پیتل کے برتنوں پر بھی "قلعی" ضروری چیز ہے۔ اب کیا قلعی نہ کرائی جائے گی؟ اگر کرائی جائے تو "قلعی" کو کیا کہا جائے گا۔ ہندوستان کی سنگیت کلا کو مسلمانوں نے جس بلندی پر پہنچایا کیا اس

حصے کو سنگیت دریا سے نکال پھینکا جائے گا؟ خیال، ٹپہ، ٹھمری وغیرہ گانا موقوف کر دیا جائے گا؟ اچھا، صدیوں کے میل جول سے مسلمانی تہذیب کے جو اجزا ہندوؤں کی سرشت میں داخل ہو گئے ہیں، خون کے ذرے بن گئے ہیں، ان کو نکال پھینکنا کیسے ممکن ہوگا؟

ہندی کے پرچارک جنتا کی آسان بھاشا کی بھی آڑ لیتے ہیں۔ مگر جنتا کو سمجھانے کے لئے سنسکرت لفظوں کی بھرمار کر دینا ایک نامعقول دلیل ہے۔ اصل ہندی میں سنسکرت کے لفظ لینے کی سہار نہیں ہے۔ برج بھاشا میں سنسکرت کے جتنے لفظ آئے ہیں عام طور سے تصرف ہو کر داخل ہوئے ہیں۔ ہندی کو سنسکرت کے لفظوں سے لاد دینا خود ہندی کی صورت بگاڑ دے گا۔ مغربی یو۔ پی کے دیہات وہی زبان بولتے ہیں جو شہروں میں بولی جاتی ہے۔ البتہ لہجے اور تلفظ کا فرق ہے، اور بعض مقامی لفظ محاورے بھی خاص ہوتے ہیں مگر ہر علاقے میں زبان کی یہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ مقامی الفاظ اور محاورے سنسکرت ہرگز نہیں ہوتے۔

گردن اور کمر کے لئے کون سے لفظ بولے جائیں گے؟ مغربی یو۔ پی کے تمام دیہات میں گردن کمر ہی بولے جاتے ہیں۔ کمر کے لفظ سے دیہاتیوں نے ایک کپڑا بنایا جس کی لمبائی صرف کمر تک ہو اور "کمری" کہلاتی ہے۔ ان دیہاتیوں کو جو چیز حسین نظر آئی اور جسے وہ پسند کرتے ہیں اسے "ملوک" کہتے ہیں۔ یہ خاص عربی لفظ اور ملک (یعنی بادشاہ) کی جمع ہے، مگر نہ معلوم یہ لفظ دیہات میں اس معنی میں کیونکر استعمال میں آیا۔ یہ صرف مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن اگر ایسے لفظ چھانٹے جائیں تو کتابیں بھر سکتی ہیں۔

جن لوگوں نے اردو دشمنی کا بیڑا اٹھایا ہے، وہ اردو کے دشمن نہیں بلکہ ہندی کی رہ لگانے والے ہیں، عربی فارسی کے لفظ جو رامائن لیلا، کبیر اور سورداس اور میرابائی کے "دوہوں" میں آئے ہیں ان کی کانٹ چھانٹ کرا دیں گے؟ پدماوت کو شاید جلا ہی ڈالیں گے، اور رحیم و رسکھان وغیرہ کی کوتائیں کیا گنگا کے سپرد کریں گے؟ لیکن میں ایسے لوگوں سے سوال کروں گا کہ آپ جس جذبے سے ہندی کو ترقی دینا چاہتے ہیں، وہ آپ سے یہ سب کام کرانا چاہے گا، اور جب آپ یہ کام کر گزریں گے تو ہندی ساہتیہ کی کیا شکل بنے گی؟ پھر شاید اس جنون میں دہلی کی مسجد اور آگرے کے تاج پر بھی پھاوڑا بجے گا! مگر یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی یہ بات باقی رہ جائے گی کہ یہ بھائی اپنے آپ کو ہندو کہنا بھی چھوڑ دیں۔ یہ لفظ بھی بدیسی ہے اور عربوں نے یہ نام ہندوستان کے باشندوں کے لئے تجویز کیا تھا۔

لیکن میں ایسے لوگوں کو ہندو جاتی کا نمائندہ نہیں مانتا۔ یہ لوگ بے جانے ہوئے سوامی دیانند کی

تحریک سے متاثر ہیں۔ اور یہ بھی ماننے والی بات نہیں کہ سارے ہندو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کی ہر چیز سے متنفر ہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آریا جماعت بھی انگریز سے متنفر نہیں ہے۔ حالانکہ مسلمان جیسے قصور ہیں ویسے ہی انگریز بھی ہیں۔ دونوں نے باہر کے ملکوں سے آکر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ لیکن اگر یہ جماعت مسلمانوں سے واقعی نفرت کرتی ہے تو کہنا پڑے گا کہ یہ لوگ اپنی نفرت میں بھی سچے نہیں۔ البتہ ایک دلیل جو سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کو نفرت اس لئے نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان پر حکومت کی، بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اس ملک میں بس گئے اور اسے اپنا وطن بنا کر بہشت کر دیا۔ انگریز چونکہ یہاں رہ نہیں پڑا اس لئے اس سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ نفرت ایک فطری جذبہ ہے اگرچہ انسانی وقار کے لئے پسندیدہ شے نہیں۔ بہرحال دنیا کی تاریخ کا ہر واقعہ انسانیت کی عدالت کے سامنے پیش ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔ اس نفرت کو وہ عدالت کمینہ پن کی نفرت کہے گی۔ لیکن چند سرپھرے پوری ہندو جاتی کو ملزم نہیں بنا سکتے اور نہ یہ کوئی دانائی کا فعل ہوگا۔

میرا عقیدہ ہے کہ نفرت کا یہ مظاہر غلامی کی لعنت کا نتیجہ ہے اور ملک کی آزادی کے ساتھ ہماری بہت سی کمینی خصلتیں بدل جائیں گی، ہم میں اعلیٰ خصائص پیدا ہوں گے اور ہم بلند اخلاق کو پھر حاصل کر سکیں گے جو غلامی نے مٹا دئے تھے۔ اس کے باوجود اگر ہندوستان کے اندر ایک آدمی بھی ایسے گھناؤنے اور گندے وچار رکھتا ہے جو انسان کی انسانیت کے منافی ہے تو وہ بھی وطن اور دیس کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے اور اس کا جلد سے جلد دھو دیا جانا ضروری ہے۔

اب "حضرات اردو" ہوں یا "سنسکرتی جانتے" اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارا ادب اور ساہتیہ زبان ہی کے اندر وجود میں آتا ہے اور وہ قومی زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ دونوں اس سے بھی انکار نہ کر سکیں گے کہ ہمارا پچھلا ادب اور ساہتیہ سامنتی یا جاگیردار سماج کا پیدا کردہ تھا جسے عوام سے اور عوام کی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی ناقابل رد ہے کہ دنیا ایک زبردست ہلچل میں مبتلا ہے اور انسانی سماجوں میں جا بجا انقلاب ہو رہا ہے اور ہوگا۔

ان واقعات کو دیکھنے کے لئے نہ دوربین کی ضرورت ہے اور نہ خوردبین کی۔ طبقاتی جنگ ہر جگہ ہر ملک و قوم میں شروع ہے۔ اور یہ وہ خواب نہیں جس کی تعبیریں مختلف ہوں۔ ہم اگر اپنے ذہن و خیال کے در بند بھی کرلیں تو بھی طوفان کی تیز و تند ہوائیں ان کی چولیں ہلا ڈالیں گی۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ پچانوے فیصدی محنت کش انسانیت کی بیداری ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ دنیا میں آئندہ جنتا کا راج ہوگا، جنتا کی زبان پھیلے گی اور جنتا اپنی تہذیب یا سبھیتا خود بنائیں گی۔ روس کا انقلاب اسکی

اہم شہادت ہے۔

اس لئے چاہے وہ اُردو کا ادب ہو یا ہندی کا ساہتیہ، اپنی بقا کے لئے اس کو چولا بدلنا ہی پڑے گا۔ اُردو میں ایسے بے شمار اسلوب در آئیں گے جن کو عوام سمجھتے ہوں گے۔ ہندی سے وہ تمام شبد نکال دئے جائیں گے جن کو جنتا نہ سمجھتی ہوگی۔ ہندی اُردو کی موجودہ چپقلش آپس میں زبان اور کلچر کی حجت نہیں بلکہ سیاسی چالاکیاں اور سستی لیڈری خریدنے کا ڈھنگ ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے قابو یافتہ درمیانی طبقے کے لوگ اپنا تفوق اور برتری قائم رکھنے کے لئے کھیل کھیل رہے ہیں۔ مگر جب جنتا انقلاب لائے گی تو اس وقت نہ شیخ صاحب کا پتا ہوگا اور نہ مہاشے جی کا۔ اس وقت یہ دونوں غائب ہوں گے۔

لسانیات کے ماہروں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں وہ ہمارا [illegible] اور وچار آتما [illegible] اور ہم لفظوں ہی کے ذریعے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دوسروں کے لفظوں میں چھپے ہوئے معنی کو سمجھ کر اُسے پہچان لیتے ہیں۔ ہمارے خیال و احساس، ہماری خواہشیں اور ارادے لفظوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُنھیں کے اندر چھپے بھی رہتے ہیں۔ یعنی لفظوں کی ترتیب پر قادر ہو کر ہم اپنی دلی باتوں کو موثر طریقے سے ادا کر سکتے ہیں اور اُنھیں چھپا بھی سکتے ہیں۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس چیز سے کام نہ لینا پاسکل کے بقول جس نے ہمیں اشرف بنایا ہے، یعنی اپنے تفکر اور وچار شکتی سے کام نہ لینا [illegible] کو ناقص قرار دینا ہے۔

اس دلیل کی بنا پر انسانوں کے دو فرقے جو ایک ہی وطن کی پاک مٹی سے بنے ہوں، صدیوں سے ایک ہی زبان بولتے چلے آرہے ہوں، جن کے سوچنے کا طریقہ بھی ایک ہو، وہ ان نئے باتوں کو قومیت اور کلچر کا فرق قرار دیں اور ایک دوسرے سے متنفر ہو جائیں عقل کی توہین کرنا ہے، انسانیت کو ذلیل کرنا ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ کوئی قوم یا فرد عقل و خرد کو طلاق دے کر زیادہ دن نہیں جی سکتا، ہمیں اپنے بقا ہی کی خاطر عقل سے کام لینا پڑے گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود تاریخ کا نتیجہ ہے۔ مسلمان پہلے دن سے ہندوستانی بن چکے ہیں۔ انھوں نے یہی نہیں کہ یہاں کے طور طریق سیکھے بلکہ رشتہ ناتہ بھی یہیں جوڑا۔ اس لئے دس کروڑ مسلمان ہندوستان کی ویسی ہی دولت ہیں جیسے تیس کروڑ غیر مسلم، وہ ایک قومی سرمایہ ہیں۔ اس تعداد کو نہ تو مٹا ہی جا سکتا ہے اور نہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جو جہاں ہے وہیں رہے گا اور آپس میں بیوہار بھی ہوگا۔ پھر ہندو ہندی بولتے ہوں گے اور مسلمان اُردو اور ایک دوسرے کی زبان جانتا نہ ہوگا، تو کیا اُن کو آپس میں بیوہار کرنے کے لئے ایک تیسری زبان سیکھنا پڑے گی، یا پھر کہ سے ایک کو دوسرے کی زبان

کرنا پڑے گی؟ کیسی طرفہ بات ہے کہ سیکھی ہوئی زبان بھلائی جا رہی ہے تاکہ نئے سرے سے سیکھی جائے!

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نام کے ساتھ بہت سی "یائے نسبتی" کا دُم لگا لیا ہے۔ ہندوستان میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ شروع میں ان کے ساتھ عورتیں بھی نہ آئی تھیں۔ اس لئے "بدیسی" یا "پردیسی" میں کھوٹ تو شروع ہی سے تھا۔ اصل یائے نسبتی "ہندی" کی ہے اور اسی کی اکثریت بھی ہے۔ حقیقت حال جب یہ ہو تو صرف مذہبی عقیدے کے بنا پر اپنے ہی گوشت اور خون کو غیر سمجھنا اپنے اعضا کو کاٹ پھینکنے کی حماقت کے سوا دوسرا نام نہیں پا سکتا۔ غیریت کے تمام اجزا، خون کی آمیزش اور صدیوں کی وطنیت نے مٹا دئے ہیں۔ اور جو فرق و اختلاف گنوایا جاتا ہے، ویسا تو صوبوں کو جانے دیجئے ایک ہی شہر کے ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان میں بلکہ ایک ہی گھر کے دو آدمیوں میں بھی ہوگا۔ چنانچہ اس فرق و امتیاز کو جدا گروہ اور جدا زبان کی وجہ قرار دینا عقل کے کانٹے پر پورا نہیں اترتا اور اہلِ وطن جتنی جلدی اس غلطی کا احساس کریں گے ہم دونوں کے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

علمائے زبان کا ایک فتویٰ یہ بھی ہے کہ الفاظ کے طبقے اور گروہ ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان اور شجرے، ان کے اندر اختلاف و ہم جنسی ہوتی ہے، ان میں شریف و رذیل بھی ہوتے ہیں اور صحبت کے اثر سے اچھے بُرے اور بُرے اچھے بنجاتے ہیں۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد الفاظ کی درآمد سے خوفزدہ ہونا بے معنی سی بات معلوم ہوتا ہے۔

لفظوں کی شرافت و رذالت کے ذکر میں ان دو لفظوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لفظ "جان" سے ایک لفظ "جانی" بنا۔ جس وقت یہ لفظ بنا ہوگا یقیناً نہایت اعلیٰ اور شریفانہ مفہوم میں استعمال ہوا ہوگا۔ مگر بُری صحبت نے اسے ذلیل بنا چھوڑا۔ اسی طرح ایک لفظ ہے "چوتڑ" اس کے مادے کو زبان سے ادا کرنا معیوب ہے لیکن اس کا مشتق لفظ بلا تکلف استعمال کیا جاتا ہے، وہ بدصحبت سے بچا رہا۔

الحاصل جو لوگ زبان کے فلسفے سے تو واقف نہیں مگر لفظوں کا استعمال جانتے ہیں، ایسے لوگ بھی بتا سکیں گے کہ ایک ہی مفہوم کے لئے کئی لفظ سامنے ہونے پر بھی مناسب لفظ کی تلاش کا کانٹا کس طرح کھٹکتا رہتا ہے؛ اور جب ایک مفہوم کے لئے مناسب لفظ ذہن میں بجلی کی تڑپ کی طرح آجاتا ہے تو کیسے ایک نیا تصور، نیا خیال، عبارت میں نیا زور پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا لفظ سوجھ جانا ہی وہ الہام ہوتا ہے جو سننے یا پڑھنے والے کے ذہن و فہم میں ایک ایسے تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ وہ بھی شاعر یا مصنف سے ہم سفیر ہو جاتا ہے۔

ایک غور طلب حقیقت یہ بھی ہے کہ آج تک کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام لفظ استعمال نہیں کرتا ہے۔ ایک قادر الکلام اہل قلم بھی صرف اتنے ہی لفظ استعمال کرتا ہے جن کی رُوح معانی سے وہ آشنا ہو چکا ہے۔ اور جن الفاظ کو ایک مصنف چھوڑ دیتا ہے اُنھیں کو دوسرا کمال خوبی و لطافت کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک کامل فن لکھنے والا ایک موضوع کے بیان میں لفظوں کا ایک سیٹ استعمال کرتا ہے اور دوسرے موضوع پر دوسرا سیٹ۔ اس لئے کہ ارسطو کے قول کے مطابق زبان کا رتبہ موضوع کے رُتبے کی مطابق ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ ایک ہی سیاق و عبارت میں ایک لفظ مختلف لوگوں کے ذہن میں مختلف تصورات پیش کر سکتا ہے۔ اور لغت کے اندر لفظ کی جو حیثیت ہوتی ہے، عبارت میں آکر بدل جاتی ہے۔ الفاظ نرم و نازک بھی ہوتے ہیں اور سخت و کرخت بھی، تلخ و بدمزہ بھی ہوتے ہیں اور شیریں و لذیذ بھی، اور اُن کی یہ مختلف حیثیتیں اِن لفظوں (اسماء) کے اُن تصورات کے مطابق ہوتی ہیں جو یہ لفظ ہمارے ذہن میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر یہ علمی حقائق سمجھ میں آجائیں تو عربی فارسی کے مُروّج لفظوں سے چڑھنا یا سنسکرت کے بعض نئے لفظوں کے داخلے پر برافروختہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے، اور لسانیات کے مذہب میں تو یکسر ناروا ہے۔

لغت کے اندر لفظ زیادہ سے زیادہ ہوں اور ہر قسم کے ہوں مگر ان کا استعمال تو میرے آپ کے ذوق انتخاب پر منحصر ہے، جو ایک فطری طریقہ ہے۔ بولتے وقت میں آپ کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں اور سنتے وقت آپ میرے مافی الضمیر کو سمجھنا چاہتے ہیں، اب اگر میں آپ کو نہ سمجھا سکا یا آپ نہ سمجھ سکے تو میرا کہنا ضائع ہوا اور آپ کا سننا بے کار گیا۔ زبان یا بھاشا کے اختلاف کا حل ان دو فقروں کے اندر ہے۔

ہماری زبان جسے آج خواہ اردو کہئے یا ہندی، آگے چل کر وہ ہندوستانی کے نام سے جانی جائے گی، اپنی بناوٹ کے اعتبار سے آریائی نسل کی زبان ہے۔ تفصیلات میں جائے بغیر میں اس بات پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ زبان ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور فطری تقاضوں کے تحت پروان چڑھی، باہر سے آنے والے لوگوں کی ضرورت قوی تھی، اس لئے ان کو ملک میں بسنے والوں کی زبان کے لفظ زیادہ سیکھنا پڑے۔ مسلمان ہندوستان میں آئے تو عربی، فارسی اور ترکی بولتے ہوئے آئے ہوں گے مگر کتنا حیرتناک ماجرا ہے کہ ہندوستان میں پہنچ کر انھوں نے صرف ہندوستانی چیزوں ہی کے نام نہیں سیکھے بلکہ اپنے بدن کے اجزا اور رشتوں کے نام بھی ہندوستانی ناموں سے بدل لئے، اعضائے جسم اور رشتوں کے نام دو ایک کے سوا سب ہندی ہیں۔

ترنیخ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس نے ایک اور بہت اہم نکتہ سمجھایا ہے، وہ کہتا ہے کہ "کسی انسانی
ت کے وحشی و نامہذب ہونے کا ثبوت اس کی زبان کا افلاس ہے، اور اس جماعت کو پستی میں
لے رکھنے والی چیز بھی اس کی زبان کی بے مائگی ہے۔ کیونکہ انسان کو اتنا ہی علم سکھایا جا سکتا ہے جتنا
فظوں کے اندر ہے جن کو وہ سمجھتا ہے۔" دوسرے لفظوں میں ترنیخ یہ قول بتاتا ہے کہ "زبان کا
یہ بڑھائے بغیر کوئی قوم ترقی کے زینے پر نہیں چڑھ سکتی"۔ یہی بات اس نظریئے کی بنیاد بنی کہ جس طرح
ن خیال کے لئے غذا بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ خیال کو محدود بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ اپنی جہالت کے
ں اگر ہم اپنی زبان کو محدود رکھنے کی ضد میں بامُراد ہو جائیں تو ترنیخ کا یہ فیصلہ ہمارے حق میں
ن ہے۔

ضرورت اور بلاضرورت کی دلیل پر اوپر کی سطروں میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے، لیکن اگر وسعت
ں کے مسئلے کی علمی و منطقی شکل یہ ہے جو ابھی بیان ہوئی تو الفاظ کے داخلے پر سنسر بٹھانا اخلاقی
ں کا مترادف ہے۔

علم زبان کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مُردہ الفاظ کا داخلہ کسی زبان کو زندگی عطا نہیں کر سکتا۔ اپنی
ن کو مالدار بنانا ہے، جو قوم کو علم سکھانے کے لئے ضروری ہے، تو نئے مفاہیم کے لئے مردہ زبان
سوڑ کر زندہ زبان کے الفاظ اختیار کیجئے۔

جو لوگ باضابطہ یعنی منطقی طریق پر سوچنے کے عادی ہیں وہ سبب اور علت پر غور کئے بغیر کسی نتیجے
با غلط سمجھتے ہیں، کہ یہ جہالت کا ثبوت ہے۔ زبان کے متعلق موجودہ اختلافِ رائے اور حجت و بحث
یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ صدیوں سے ایک زبان بولتے بولتے ایک
ت اس سے بیزار ہو جائے جو باہمی رواداری، قومی میل جول اور ہم رنگی کی جیتی جاگتی شہادت ہو،
ز دو بڑی جماعتوں کی متحدہ کوششوں نے پروان چڑھایا ہو اور جو ہندوستان کے دو بڑے فرقوں
حائی چارے کی زندہ یادگار رہی ہو؟

ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اسباب سیاسی تھے۔ غیر ملکی حکومت کے لئے ۱۸۵۷ء کی واقعے
دوبارہ امکان کو روک دینے کا (تاکہ اس کی لوٹ کھسوٹ جاری رہ سکے) آسان نسخہ یہی تھا کہ دو بڑے
ں میں پھوٹ ڈالی جائے۔ آج یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ برطانوی سامراج کی یہ پالیسی کامیاب
بھی زیادہ کامیاب ہے۔ سرکاری نوکریوں اور پھر کرسیوں کی آبادھاپی کے ساتھ الیکشن کے جداگانہ
ہ نے اس پھوٹ کو پکا کر دیا جس کی انتہا آج نظر آ رہی ہے۔ زبان کا مناقشہ بدیسی حکومت ہی کا

اشتعال تھا۔ اس کا سنگِ بنیاد یوپی کے لفٹنٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل نے رکھا، یہ بیج دوسرے اسباب سے نشوونما پاکر ایک بڑا تناور درخت بن گیا۔

اس ذیل میں یہ نفسیاتی حقیقت بہت اہم ہے کہ مسلمان اپنے زمانۂ حکمرانی میں احساسِ برتری بن کر رہ گیا تھا، اور اس احساسِ برتری میں بابر کا خیال کارفرما تھا جس کے تہذیبی گھمنڈ کو ہندو معاشرہ اور رہن سہن میں، ہندی علوم اور فلسفے میں کوئی چیز قابلِ قدر نظر نہ آئی اور ہر بات مضحکہ انگیز معلوم ہوئی۔ بابر کو خود اور بابر کے بعد مسلمان نسلوں کو یہ احساس کبھی نہ ہوا کہ پہلی مرتبہ ہر آدمی کو دوسری قوم کے عادات واطوار کچھ نرالے معلوم ہوتے ہی ہیں، فرنگیوں کی بہت سی باتیں ہندوستان کے لوگوں کو نرالی اور اعلیٰ تہذیب سے گری ہوئی معلوم ہوئیں۔ "ہندو" انگریزوں کے لئے ایک عام ضمیر بن گیا تھا۔ "ٹانگ اٹھا کر موتنا" ہماری تضحیک کا مورد تھا اسکی زبان یا بولی "گٹ پٹ" کے لفظ سے ظاہر کی جاتی تھی۔ غرض مغربی تہذیب کے اندر شروع میں ہمیں بھی بہت سی باتیں ذلیل و رسوا کن معلوم ہوئی تھیں۔ لیکن آخر ہمارے یہ خیالات و محسوسات بدل گئے۔ مگر ہندو تہذیب و معاشرت کے بارے میں ہم نے بابر کی رائے اور خیال میں کبھی ترمیم کرنا ضروری نہ سمجھا، اور یہ خیال ترک نہ کیا کہ تہذیباً ہم ہندوؤں سے برتر ہیں۔

اردو کی ابتدا عوام کے میل جول سے پڑی۔ مگر اس وجہ سے کہ اس وقت جاگیردارانہ سماج کا معیار شرافت مرتبہ اور دولت تھی، اس لئے عوام اجلاف اور کمین کے نام سے موسوم تھے۔ لہٰذا عوام کے میل جول سے جو زبان بن رہی تھی وہ اس عہد کے ہندو و مسلم شرفا و امرا کے لئے حقیر تھی اور اس کا استعمال توہین کا باعث تھا۔ اشراف کے طبقے میں ہندو و مسلم برابر کے شریک تھے اور اسی طرح اجلاف بھی دونوں قوموں کے پیشہ ور طبقوں پر مشتمل تھے۔ اشراف فارسی زبان بولتے لکھتے تھے اور اجلاف اس نئی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اردو کا بولنا اشراف کے طبقے میں ممنوع تھا اور غالب کے وقت تک رہا لیکن اس لئے کہ زبان انسان کے قبضے میں نہیں، بلکہ انسان اس کے بس میں ہوتا ہے، اشراف کا طبقہ اسی اجلاف کی زبان بولنے پر مجبور ہو گیا، اور اردو جس سے مراد ہی "بازاری پن" تھا، اردوئے معلیٰ کہلائی اور وہی غالب جس کے لئے اردو بولنا باعثِ ننگ تھا، اردو شعر میں ایک نشانِ راہ قائم کر گیا۔ اس خیال کا وجود کہ مسلمان ہندو سے تہذیباً برتر ہے۔ شرر لکھنوی کے زمانے تک موجود تھا شرر کو یہ گوارا نہ تھا کہ گلزارِ نسیم ایک ہندو کی تصنیف سمجھی جائے۔ اس لئے اسے انھوں نے نسیم کے استاد آتش کی تصنیف قرار دیا، کیونکہ ایک ہندو ایسی تصنیف کا اہل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ہندوؤں نے کھلے دل سے مسلم تہذیب اور کلچر کو اختیار کیا تھا، فارسی زبان سیکھی اور علمی داد

شاغل میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ادبی ضخامت میں ان کے کارنامے آج بھی وہی درجہ رکھتے ہیں تصنیف تالیف کا انداز اور طریقہ ہندوؤں نے بھی وہی اختیار کیا جو مسلمانوں میں رائج تھا۔ کتاب کا آغاز حمد سے ہوتا تھا، نعتِ رسول اور پھر منقبت لکھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہندوؤں کی تحریر و تقریر میں مسلمانوں نے ہمیشہ "بوئے کچوری" سونگھی۔

بظاہر یہ خاص اسباب تھے جس کی بنا پر ہندوؤں کو من حیث الجماعت اُردو سے محبت کم ہوتی گئی اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس خیال کو ہماری ایک حماقت سے بڑی تقویت ملی۔ لفٹنٹ گورنر یو پی نے جب بنارس کی تحریک "ہندی" کی سرپرستی فرمائی تو ہم اس عیاری کو نہ سمجھ سکے اور اُردو کے تنہا ٹھیکہ دار ہونے کے مدعی بن بیٹھے۔ زبان کے مشترک ورثے کے واحد حقدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے لکھنؤ جا کر اُردو کی حمایت میں ایک معرکہ آرا تقریر کی۔ ہندو تو ہندی کی تحریک پر ڈٹے ہوئے مگر نواب صاحب علی گوشہ نشین ہو گئے اور ہندی کی سرپرستی جاری رہی۔

اُس وقت اگر مسئلے کو فریقانہ نظر سے نہ دیکھا جاتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا کہ عدالتی سمنوں پر دونوں رسم الخط میں ایک ہی عبارت چھپ جایا کرتی، اور جس طرح تبلیغ و تنظیم کے غلغلے تک شدھی اور سنگٹھن کا زور رہا اور ایک کے ٹھنڈا پڑ جانے سے دوسری بھی سرد پڑ گئی، کم و بیش یہی حشر ہندی کی تحریک کا ہوتا۔

اس بنیادی غلطی کے ساتھ مسلمان اہل قلم نے اس بات کو یک قلم فراموش کر دیا کہ انکی تصنیف تالیف کو ہندو بھی پڑھیں گے۔ ہمارے سامنے سارے مسلمان بھی نہیں، صرف پڑھے لکھے مسلمان تھے جن کے لئے ہم لکھنے لگے، اور سرسید کی جماعت کے بعد مخزن کے ادارے تک کی روایات کو ترک کر کے مبالغے کے ساتھ عربی و فارسی لغات کی بھرمار شروع کر دی۔ اور زبان کو زیادہ مشکل اور زیادہ کٹھن بنانے لگے۔ اب چونکہ اُردو کا جاننا حصولِ معاش کے لئے ضروری نہ رہ گیا تھا، اور ہندی کے امتحان آسانی سے پاس کئے جا سکتے تھے، اس لئے ہندوؤں میں اُردو کی تعلیم گھٹتی گئی، یہاں تک کہ موقوف ہی ہو گئی۔

آج یہی غلطی ہندو بھی کر رہے ہیں کہ وہ زبان کو کٹھن سے کٹھن بناتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجہ وہی ہو گا جو بیسویں صدی کے پہلے ربع میں اُردو کو دیکھنا پڑا۔ یعنی معمولی پڑھے لکھے بھی تحریری اُردو کو سمجھنے کے قابل نہ رہے تھے۔

اِس وقت بھی ہم ایک بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں، اس وقت ہماری ساری توجہ اور کوشش اس بات پر صرف ہونا چاہئے کہ آسان اور سلیس زبان میں ادبی محاسن پیدا کریں، کم قیمت کے اخبار رسالے اور کتابیں شائع ہوں اور تعلیم بالغان پر انتہائی زور دیا جائے۔ مگر اس کے بدلے میں ہم شور و غوغا اور ہین ڈبگا پر اُترے ہوئے ہیں اور اسی میں ہم نے فلاح دیکھی ہے۔ لیکن فی الواقعہ اس طرزِ عمل سے ضد اور عناد میں اضافہ ہوتا ہے، جو یقیناً ہندوستانی زبان کے لئے جس کو ہر چھوٹا بڑا بولتا اور سمجھتا ہے خودکشی کے معنے ہوں گے۔ ایک طرف ہندی سنسکرت کی چھوٹی بہن بن جائے گی اور دوسری طرف اُردو عربی فارسی کا بچہ! دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ایک بہرا ہو جائیگا دوسرا گونگا۔

اہلِ فکر سے چھپا ہوا نہیں کہ دنیا دارِ مکافات یا کرم جگت ہے، یہاں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ ردِ عمل لازمی ہے، جو ایک فطری قانون ہے۔ زبان کی خود سرانہ نفرت ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ کارروائیوں کو چلنے تو نہ دیگی۔ لیکن اُردو کا دائرۂ اثر تنگ سے تنگ تر ضرور ہو جائے گا، اور بالآخر نشر و اشاعت کو محدود کر دے گا۔

آخر میں ایک نظر اس پر بھی ڈالنا بہت ضروری اور اہم ہے کہ اس زبانی آویزش اور الجھن میں کس حلقے اور ذہنیت کے لوگ مبتلا ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تو ممکن ہے کہ ہماری کوششوں کے دھارے کا رُخ بھی بدل جائے۔ بہرحال اس بات کا پتا چلا لینے کے لئے کسی گہرے سوچ اور تجسس کی ضرورت نہیں۔ آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ دو دیہاتی یا مزدور، کلچر یا زبان کی بحث پر لڑے ہوں، ان طبقوں میں اس بات کا دھیان نہ ہونا کیا معنی وہ تو اس بات چیت کو بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ اور یہ کہنا ایک واقعے کا اظہار ہوگا کہ ہندوستانی قوم کی بہت بڑی اکثریت کی سمجھ میں یہ بات نہ بیٹھے گی کہ زبان اور بولی بھی ایسی چیز ہے جس پر جھگڑا ہو سکتا ہے، اور کلچر کوئی چڑیا ہے جو فساد کی جڑ بن سکتی ہے۔ اور چاہے اسے ہندوستانی قوم کہئے یا ہندو مسلم، مگر قوم عبارت ہے انھیں پچانوے فیصدی عوام سے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ اوپر کے دس پانچ آدمی ایک رائے قائم کر کے "قوم" کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

ایک غیر جانب دار سوچنے والا اس زبان کے جھگڑے کو جنگ زرگری سے زیادہ درجہ نہیں دے سکتا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ مسلمانوں سے پہلے بھی اور مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں بھی، جاگیرداری سماج نے ہندوستانی عوام کو یہ موقعہ دیا ہی نہیں کہ وہ اپنی حالت پر خود دیکھ سوچ سکتے۔ بادشاہی اور راج کی آئینیں ایک ہی ڈھنگ پر چلائی گئیں، برہمن ہندو راجہ کا صلاح کار اور مُشیر ضرور ہوتا تھا مگر راجہ جوابدہ کسی کے سامنے نہ تھا، وہ خود بھگوان روپ ہوتا تھا۔ بادشاہ کے دربار

میں مولوی یہ بتانے کے لئے ہوتے تھے کہ بادشاہ تو ظلِ اللہ ہے، اس کی شکایت کیسی اور کی کس سے جا سکتی ہے؟ انتہا یہ ہے کہ راجہ اور بادشاہ کی عنایت و مہربانی "کہلام الٰہی" اور "ایشور کی کرپا" کے ہم معنی سمجھی جانے لگی تھی۔

اُجرت لے کر مذہبی پیشواؤں نے حکومت کو اس ڈھنگ سے مضبوط بنایا اور حکومت کے مظالم کو بھی مذہب کے ذریعے سے نتیجۂ اعمال یقین کرا دیا۔ اس اسکیم میں ذاتوں کی تقسیم سے بھی بہت بڑی مدد ملی۔ اور اس سے مسلمان بھی اتنے ہی متاثر ہوئے جتنے ہندو متاثر ہو چکے تھے۔ غرض مذہب اور دھرم نے تقدیر اور پرالبدھ کا سبق دے دے کر غریب عوام کو سنجیدگی سے محسوس کر لینے کے ساتھ گہری قسم کی قناعت سکھا دی گئی۔ پنڈت جی اور مولانا صاحب نے راج اور شاہی کی اسکیم کو اسی ڈھنگ سے اور اس طرح مضبوط کیا۔ انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے سارے عندئے بادشاہی کے ڈھنگ نے دفن کرا دئے تھے۔ سلطنت کے ساتھ خدا کا سایہ ہونے کا خیال بہت گہرا قائم ہو گیا تھا۔ اور اس نظریے کے راسخ ہو جانے کے نتیجے میں اشراف کا اجلاف پر اور آقا کا غلام پر سیاسی اقتدار اور اقتصادی غلبہ استمراری ہو گیا۔

لیکن اس وجہ سے کہ اس راج یا بادشاہی کی اسکیم میں حد بندیاں سخت تھیں اس لئے اونچی اور نیچی سماج، دونوں میں زوال آجانا لازمی تھا۔ اعلیٰ کو ادنیٰ پر جو برائی مل چکی تھی اس کی وجہ سے با اقتدار طبقوں میں بے کار اور نکھٹو لوگوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی، مذہبی رہنما خیرات پر بے فکری سے بسر کرنے لگے اور زمین کے مالک دوسروں کی محنت کے بل پر عیش اڑاتے رہے۔ اس طرح ملک کی آبادی میں بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی پیدا ہو گئی جو خود کوئی کام اور کسی قسم کی پیداوار نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسرے کی محنت کے پھل میں سے حصہ بٹاتے تھے اور حصہ بھی بہت بڑا لیتے تھے۔ مغل عہد میں یہ چیز مذہبی عقیدہ بن کر سارے ملک میں پھیل گئی تھی۔ اور ہندوستانی سماج کے نکھٹو دلیر اور موٹے ہوتے رہے۔

مغل حکومت کے زوال اور ہندو رجواڑوں کی آپس کی رقابت نے انگریز کو مداخلت کی دعوت دی۔ اُس وقت بھی ہندو مسلمان نکھٹو اور رعایت خور طبقے آگے بڑھے اور انگریز کے حامی و مددگار بن گئے۔ انگریز نے ایسے بے وقوفوں اور وطن فروشوں کی خاطر خواہ قدردانی کی۔ برطانوی سامراج نے نہ صرف پرانے رعایت خور طبقوں کو برقرار رکھا بلکہ ان میں اور اضافہ کیا۔ اس نے خطاب یافتہ اور پنشن خوار طبقے کے ساتھ وکالت کے پیشے کو بھی اپنا مددگار بنا لیا۔

چنانچہ یہ وہی پرانی سامنتی سماج کا پس ماندہ اور انگریزی سامراج کی ذریات ہے جو اپنی جماعتوں کے لئے پانوں پیٹ رہی ہے۔ اور عوام کو بے بنیاد قضیوں میں پھنسا کے رکھنا چاہتی ہے۔ ان کا مقصد آج بھی وہی ہے جو راج اور بادشاہی کے وقت میں تھا یعنی عوام الناس اپنی اصل مانگوں کو بھولے رہیں، ان کو اپنے حقوق کا دھیان نہ آئے اور وہ اپنی طاقت کو نہ پہچانیں تاکہ یہ حرامخوری کرکے راجی رعایت خور طبقے اپنا تفوق قائم رکھ سکیں اور ان کے موٹے ہونے کے نئے ذریعے یعنی کونسلوں کی کرسیاں اور وزارتیں ان کے ہاتھوں میں محفوظ رہیں۔ اور وہ قانون سازی کی مشین پر قبضہ رکھ کر غصب کی ہوئی جائدادوں اور پیداوار کے ذریعوں کے مالک بنے رہیں۔ اس طرح یہ وہی پرانی برہمنی ذہنیت کا سین سامنے آ رہا ہے کہ زبان بھی ایک مخصوص طبقے کی چیز بنی رہے اور علم و فن کی ٹھیکہ داری اوپر کے مٹھی بھر لوگوں کے ہات میں رہے۔

مگر اس لئے کہ محنت کش عوام کے اس شعور اور اس کی اس مانگ کے سامنے کہ وہ محنت کرنے کے بعد بھی بھوکا ننگا ہے۔ اب کوئی عیاری چلنے والی نہیں، ان بحثوں اور ایسے قضیوں کی بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں، اور اب یہ جھگڑے زیادہ مدت نہ چل سکیں گے، بغیر چکائے چک جائیں گے، البتہ یہ ضروری شرط ہے کہ ملک کی سیاسی انجمنیں صاف ہوں، اور قومی جماعتوں کی لیڈری کے سیاسی تصورات اسی صورت میں صحیح ہو سکتے ہیں جب عوامی تحریکیں، مزدور کسان کی تحریکیں زور پکڑ کر درمیانی طبقے کی لیڈری سے چھٹکارا پائیں گی اور عوام کے لیڈر عوام ہی میں نکلیں گے۔ امتیاز یافتہ اور رعایت خور طبقوں کی خاص رعایتیں ختم کرنے والے قانون مزدور کسان ہی بنا سکتے ہیں، درمیانی طبقے کی لیڈری تو اپنی حفاظت کا قانون بنائے گی۔ بہرحال اب وہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اس زمانے میں وقت کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پولس اور فوجوں میں ہڑتال کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا؟ ہندوستان کی سب سے بڑی ریلوے ہڑتال کا نوٹس آج سے بیس برس پہلے خیال میں نہ آ سکتا تھا؟ ہوائی بیڑے کی یا ڈاکیوں کی اتنی بڑی ہڑتال دس سال پہلے سمجھ میں آ سکتی تھی؟ سنہ ۴۶ء تک ایسی کوئی صورت خیال میں لاتے بدن میں کپکپی چڑھتی تھی۔ فوجی بیڑے کی بغاوت کا دھیان کرکے تو بعض لوگ آج بھی کانپ جاتے ہوں گے۔

بہرصورت زمانہ بالکل بدل گیا ہے اور بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں جو ادب آج پیدا ہو رہا ہے اس میں سماجی اور سیاسی انقلاب کی جھلک نظر آ رہی ہے جو مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔

اس لئے اگر "مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست" کا مشورہ صحیح ہے، اگر زمانے سے ساز کرنے کا اصول غلط نہیں، اگر انسانی مساوات فطرت کا منشا ہے، اگر مذہب کی تعلیم انسانیت پرستی سکھاتی ہے، تو ہندوستان کے ان "رعایت خور" طبقوں کی عافیت اس میں ہے کہ عوام کو غلط فہمیوں میں الجھا کر اپنی غرض پوری کرنے کے بدلے وہ عوامی تحریکوں سے وابستہ ہو جائیں اور اپنی جگہ عوام کے بیچ میں بنائیں، امتیاز و تفوق کو بھولا ہوا خواب سمجھیں، اور اپنی قوم و وطن کیلئے ایک معزز مقام حاصل کرنے میں عوام کو ساتھ لے کر غلامی کا داغ وطن کے حسین چہرے سے دھوئیں! دوسرے ملکوں کے "رعایت خور" طبقوں کے اکثر آدمیوں نے اس حقیقت کو پہچانا اور اس پر عمل کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے میں فی الواقع ان کے ہاتھ سے کچھ گیا نہیں، نقصان صرف حرامخوری کی عادت چھوٹ جانے اور لالچ کے نکل جانے کا ہوا۔

مسئلہ زبان کی اگر یہی صورت ہے تو دلوں میں گنجائش پیدا کر کے دیکھا جائے، نقصان صرف تعصب اور نفرت کا ہوگا، زبان اپنی جگہ رہے گی، سب لوگ اسے بولیں گے اور سب لوگ سمجھیں گے۔

آل احمد

قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں

(از جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن)

یہ ہم کو معلوم ہے کہ قدیم اردو یا دکھنی زبان کی شاعری کا آغاز تقریباً سنہ ہجری سے ہوا اور سنہ ۱۲۰۰ ہجری تک اس زبان میں شاعری ہوتی رہی اور اس کی ابتدا فارسی شاعری کے نمونہ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی۔ جس وقت دکھنی شاعری عالم وجود میں آئی اُس وقت تک فارسی شاعری کئی دور گزر چکے تھے۔ فردوسی، ابن حسام اور مولانا جامی نے شاہ نامہ، خاور نامہ اور سکندر نامہ جیسی رزمیہ مثنویاں مرتب کر دی تھیں۔

دہلی اسکول کی اُردو شاعری میں ہمیں رزمیہ مثنویاں دستیاب نہیں ہوتیں، لکھنؤ اسکول میں انیس نے رزمیہ کلام یادگار چھوڑا ہے۔ مگر انیس سے صدیوں پہلے دکھنی زبان میں رزمیہ مثنویوں کا کافی ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے۔ جس طرح انیس نے رزمیہ شاعری کی بنیاد واقعات کربلا پر رکھی ہے۔ اسی طرح دکھنی رزمیہ مثنویاں بھی پہلے پہل کربلا کے جاں سوز اور درد آمیز حالات سے شروع ہوتی ہیں۔ عام طور سے رزمیہ مثنویوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہوں، اس میں حالاتِ جنگ، مقابلہ کی روداد، ہتھیاروں کے اقسام، معرکہ کا طریقہ وغیرہ اس خوبی سے بیان کیا گیا ہو کہ لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس اصول کے مدِ نظر اگر دکھنی رزمیہ مثنویوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی شعرا نے کامیاب واقعہ نگاری کی ہے۔ ایک ماہر فن کی طرح اُنھوں نے واقعہ کے تمام حالات، تمام خصوصیات بلکہ جزیات تک تفصیل سے بیان کئے ہیں اور ایک قابل مصور کی طرح واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا ہے۔ ان کی رزمیہ مثنویوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تسلسل بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں جو کچھ واقعات نظمائے گئے ہیں وہ اپنے تسلسل کے لحاظ سے مربوط ہیں ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے داستان کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

دکنی رزمیہ مثنویوں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو فارسی مثنویوں سے ترجمہ کی گئی ہیں اور دوسری وہ جو دکنی شعرا کی ذہنی خیالات کا گنجینہ ہیں۔ اوّل الذکر مثنویوں میں خاور نامہ، جنگ نامہ، ظفر نامہ، جنگ نامہ حیدر، روضۃ الشہدا، روضۃ الاطہار، وغیرہ بیسیوں مثنویاں ہیں معلوم ہیں جو فارسی مثنویوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ دوسری مثنویوں میں فتح نامہ نظام شاہ، علی نامہ، تاریخ سکندری، جنگ نامہ عالم علی خاں، اور فتح نامہ طرب خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ لیکن اس امر کا خیال رہے کہ دکنی زبان کی یہی چند رزمیہ مثنویاں نہیں ہیں بلکہ کئی اور مثنویاں بھی رزمیہ مثنویوں کی ذیل میں داخل کی جا سکتی ہیں ان کے علاوہ دکنی شعرا کی دوسری مثنویاں جو عشق و محبت کی داستانوں سے متعلق ہیں۔ ان میں بھی اکثر و بیشتر جنگ اور معرکے کے حالات کئی کئی صفحوں میں نظم کئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دکنی مثنویوں میں عشق و محبت کی پُرلطف اور دلچسپ داستانوں میں جنگ پیکار کے خوں چکاں حالات بھی ضرور ہوتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں آئے دن جنگ و جدال کا بازار گرم رہا کرتا، لڑائی جھگڑوں کا ہنگامہ برپا رہتا، خون کے بادل فضا میں منڈلاتے رہا کرتے تھے۔ اس لئے ماحول سے متاثر ہو کر شعرا بھی اپنی تصانیف میں جدال و قتال کا تذکرہ میدان جنگ کا حال کسی نہ کسی موقع پر ضرور بیان کر دیتے تھے۔ اس موقع پر ہم اوّل الذکر مثنویوں میں سے صرف خاور نامہ کا مختصر تعارف کراتے ہیں اور آخر الذکر میں سے فتح نامہ نظام شاہ اور علی نامہ اور جنگ نامہ عالم علی خاں کا تذکرہ کریں گے۔

خاور نامہ رستمی: ابن حسام کے فارسی خاور نامہ کا دکنی ترجمہ ہے جس کو ۱۰۵۹ ہجری میں بیجاپور کے شاعر کمال خان رستمی نے مدون کیا ہے۔ یہ مثنوی چوبیس[۲۴] ہزار شعر پر مشتمل ہے اور خدیجہ سلطان شہربانو ملکہ محمد عادل شاہ کی فرمائش پر تیار کی گئی ہے۔ سلطانہ کا یہ کارنامہ تاریخ زبان اردو سے محو نہیں ہو سکتا۔ اس کی علمی سرپرستی کی یہ یادگار مدتوں زندہ رہیگی افسوس ہے اس بیش بہا تصنیف کا کوئی نسخہ یہاں نہیں ہے۔ انڈیا آفس میں میں نے اس کو دیکھا تھا۔

• • •

رستمی کا یہ کارنامہ صرف ترجمہ کی حد تک دکنی ہے، اس کے ساتھ مختلف خصوصیات کا حامل ہے۔ اوّل تو یہ کہ ڈھائی سال کی قلیل مدت میں چوبیس ہزار شعر کا مکمل کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر اس کا تسلسل بیان بھی

قابلِ تعریف ہے۔ زبان کے لحاظ سے بہت صاف ہے۔ اکثر اشعار اس قدر صاف ہیں کہ نثر کا لطف آتا ہے۔ پھر رزم کے واقعات بزم کے حالات، معرکہ کی روداد نہایت کامیابی سے پیش کی گئی ہے۔ بحری جنگ، شب خون، حملۂ قلعہ کا محاصرہ، بہادروں کے مقابلہ کا حال، اور دوسرے بہت سے جزیات تک یہاں بیان کئے ہیں۔

دکھنی شعرا کی اچھی رزمیہ مثنویوں میں شوقی کی مثنوی فتح نامہ نظام شاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس مثنوی میں جنگ تلی کوٹہ کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ دکن کی عظیم الشان لڑائیاں جن میں سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا ہے، ان میں سے ایک جنگ تلی کوٹہ بھی ہے۔ اس جنگ میں ایک فریق ویجا نگر کا مہاراجہ رام راج اور دوسری جانب بیجاپور، گولکنڈہ اور احمدنگر کی اسلامی سلطنتیں تھیں۔

اگرچہ یہ تینوں اسلامی سلطنتیں متحد اور متفق تھیں مگر ساز وسامان فوج اور ہاتھیوں کی کثرت کے لحاظ سے ویجانگر کو بہت زیادہ تفوق حاصل تھا۔ تلی کوٹہ کے میدان میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ معرکہ کارزار گرم ہوا، ہنگامۂ توپ و تفنگ سے میدانِ جنگ میدانِ محشر بن گیا۔ ویجانگر کے ہاتھی دکھنی سلاطین کے لشکر کو روندنے لگے۔ قریب تھا کہ ان کو شکست ہو جاتی۔ مگر مہاراجہ رام راج کے ہلاک ہو جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سلاطینِ دکن کی فوج یا تو فرار ہو رہی تھی یا اب ان کی ہمت بلند ہو گئی۔ وہ پلٹ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ویجانگر کی فوج اپنے مہاراجہ کے مارے جانے سے دل شکستہ ہو کر بھاگنے لگی۔ اس طرح ویجانگر کی سلطنت کا نام مٹ گیا اور اس کے حصے بخرے ہو گئے۔

شوقی نے ان ہی واقعات کو اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ چونکہ اس کو اس زمانہ میں احمدنگر کی نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اس لئے اس نے اپنی مثنوی میں نظام شاہی سلطنت کی تعریف زیادہ کی ہے اور اسی کی فوج کے سر فتح کا سہرا باندھا ہے۔

علی نامہ۔ بیجاپور کے ملک الشعراء ملانصرتی کا شاہکار علی نامہ بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ در تاریخی حیثیت سے بھی اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دراصل اس کو علی عادل شاہ ثانی کی سوانح زندگی کہنا چاہیئے۔

یہ ہمیں معلوم ہے کہ سلطان علی عادل شاہ ثانی کا پورا زمانہ جنگ و جدل میں بسر ہوا۔ شروع سے آخر تک میدانِ کارزار گرم اور ہنگامۂ پیکار بر پا رہا۔ اول تو سیواجی نے سر اٹھایا خود

اپنے آقائے ولی نعمت یعنی عادل شاہ کے قلمرو پر دست درازی کی۔ اس کے مقابلہ کے لئے سدی جوہر جس کو صلابت خاں کا خطاب ملا تھا بھیجا گیا۔ مگر یہ خود باغی ہو کر سیواجی سے مل گیا۔ اب سلطان خود بہ نفس نفیس صلابت خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ بادشاہ سے خوف زدہ ہو کر صلابت خاں قلعۂ پنالہ سے فرار ہو گیا۔ علی عادل شاہ نے قلعۂ پنالہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد صلابت خاں کے مقابلہ کے لئے عادل شاہی جنرل روانہ کئے گئے اور پھر خود سلطان بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ عادل شاہی سورما اور بڑے بڑے جوانمرد جیسے شریف خاں، اخلاص خاں، خواص خاں، سلطان کے ہمراہ رکاب تھے۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی، ہنگامۂ محشر برپا ہوا، قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا، ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بہادروں نے خون کی ہولی کھیلی۔ تیر و تفنگ کے جوہر دکھائے گئے۔ توپوں اور بندوقوں نے غضب کی آتش باری کی۔ بالآخر صلابت خاں زخمی ہو کر فرار ہو گیا۔ شاہی فوج کا ایک حصہ موسیٰ خاں کی سرکردگی میں اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ سدی مسعود۔ صلابت خاں کے داماد نے تاب مقاومت نہ لا کر شکست کھائی۔ ان پے در پے شکستوں سے دل شکستہ ہو کر صلابت خاں اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے مرنے پر اس کے لڑکے عبدالعزیز خاں اور داماد مسعود خاں نے سلطان سے اپنی خطا وغیرہ کی معافی چاہی اور مورد عنایات شاہی ہوئے۔ اس کے بعد سلطان نے ملیبار اور بدنور کی طرف پیش قدمی کی۔ متعدد قلعے فتح کئے۔ اس طرح علی عادل شاہ فتح و کامرانی کے نقارے بجاتا ہوا بیجاپور کو واپس ہوا۔

دوسری طرف دہلی کی مغلیہ سلطنت سے بھی معرکے رہے، عالمگیر خلد آشیاں کی فوج بیجاپور پر چھاپے مارتی رہی، لیکن مغلوں کو اپنی شہنشاہی کی زبردست پشت پناہی کے باوجود کامیابی نصیب نہیں ہوئی، بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

ان تمام واقعات کو نصرتی نے علی نامہ میں اپنی [illegible] رانہ چابک دستی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ سلطان کے معرکوں اور جنگوں کی روداد اس خوبی اور عمدگی سے بیان کی ہے کہ بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نے واقعہ نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ فوجوں کی روانگی، بہادروں اور سورماؤں کا مقابلہ، رسالوں اور ہاتھیوں کی مٹ بھیڑ، پھر ہنگامۂ کارزار کی گرم بازاری، جنگ و پیکار کی روداد، شمشیر و سناں کی معروفیت، ہتھیاروں کی جھنکار،

سے لکھی ہے۔

نصرتی کی رزمیہ شاعری کے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالحق کی صراحت ملاحظہ کے قابل ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے :۔

"رزمیہ واقعات کے بیان میں نصرتی کو خاص کمال حاصل ہے۔ وہ فوجوں کی آمد اور جنگ کے زور شور اور ہنگامہ خیزی کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کو اردو زبان میں میرانیس سے قبل کوئی نمونہ رزمیہ نظم کا نہیں ملا۔ میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتداء کی تھی لیکن وہ بالکل اولیں تھا۔ مولانا کو اگر نصرتی کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو اعتراف کرنا پڑتا کہ میرانیس سے قبل بھی ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس نے مسلسل رزمیہ نظمیں لکھی ہیں اور جو معرکہ آرائی نیز دیگر واقعات کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے۔"

غرض کہ نصرتی اپنے رزمیہ کلام کے باعث ہر طرح ستائش کے قابل ہے۔ اگر فردوسی کو اس کے شاہنامہ کی وجہ سے زندگی جاوید نصیب ہے تو نصرتی علی نامہ کے باعث اس کا مستحق ہے۔

جنگ نامہ عالم علی خاں کی تصنیف ۱۱۳۶ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ اس میں آصفجاہ اول اور عالم علی خاں کے جنگ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ جب حضرت آصفجاہ دہلی سے دکن کی جانب روانہ ہوئے تو یہاں عماد الملک صوبہ دار تھے۔ اس کے سپہ سالار عالم علی خاں نے آپ کا مقابلہ شکر کھیڑہ کے مقام پر کیا۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ عالم علی خاں نے پوری دلاوری اور بہادری کے جوہر دکھائے، دادِ مردانگی دی، طرفین کے سیکڑوں آدمی ہلاک ہوئے، بالآخر آصفجاہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آپ فتح و فیروزی کے ساتھ منصور و مظفر دکن میں داخل ہو گئے۔

ان ہی حالات کو غضنفر نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے اور نہایت کامیابی سے واقعات کا اظہار کیا ہے۔

ان مثنویوں کے علاوہ کئی اور مثنویاں رزم نگاری کے باعث قابل تذکرہ ہیں مگر یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک دکھنی مثنویوں کا جو ذخیرہ دستیاب ہوا ہے اس کے لحاظ سے چھوٹی بڑی پچیس تیس[۲] مثنویاں رزمیہ قرار دی جا سکتی ہیں جن میں سب سے طویل مثنوی رستمی کا خاور نامہ ہے جس کے چوبیس[۲۴] ہزار شعر ہیں۔ اور مختصر مثنویوں میں علی عادل شاہ کی مثنوی خیبر نامہ ہے جس میں جنگ خیبر کے حالات نظم کئے گئے

یہ (۷۲) شعر کی مثنوی ہے۔

دکنی شعراء نے اپنی رزمیہ مثنویوں میں جس طرح مثنوی کی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہے۔
رت انگیز ہے ان کے مطالعہ کے بعد یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اچھی مثنوی کے
ے لوازم استعمال نہیں کئے۔ ان کی مثنویوں میں واقعہ نگاری کا نقص نظر نہیں آتا ہے۔
ں نے کسی چیز کے بیان کو مبہم اور تشنہ نہیں رکھا ہے، دقیق اور نازک امور اور چھوٹے
ٹی باتیں بھی واضح طور پر بیان کی ہیں۔ جزئیات کو چھوڑا نہیں گیا ہے۔ حسن ترتیب کے لحاظ
و جانچا جائے تو بھی دکنی شعراء کی مثنویاں کامیاب اترتی ہیں، انھوں نے اپنے مسالے کو
عمدگی سے ترتیب دیا ہے اور جس قابلیت سے واقعات کو مربوط کیا ہے وہ ان کے نکتہ سنجی
ت بڑی دلیل ہے۔

بہرحال رزمیہ مثنوی کے جانچنے کے جو لوازم ہیں اور ایک عمدہ مثنوی کے لئے جو معیار
کیا جاسکتا ہے اگر اس معیار کے لحاظ سے دکنی مثنویوں کو پرکھا جائے تو میرے خیال میں
سوٹی پر کئی دکنی مثنویاں کھری اتریں گی۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی

مُصنّفینِ سیتاپور کی تصانیف

(از جناب مولانا سیّد الیاس حسین صاحب)

جناب قاضی سیّد الیاس حسین صاحب سیتاپوری، فارسی زبان کے ماہر اور طرزِ قدیم تدریس کے موافظ، پُرانی وضع کے دلدادہ اور قدیم تہذیب کے حامل ہیں، شعر کہتے نہیں مگر سخن سنجی اور نکتہ پروری کا بڑا ملکہ رکھتے ہیں۔ تقریباً ربع صدی سے مدرسہ عربیہ نیاز بہ خیرآباد ضلع سیتاپور میں مدرس فارسی ہیں۔ حاملانِ علوم قدیمہ کی طرح موصوف بھی زمانہ کی ناقدری کا شکار اور خاموشی سے علمی، تاریخی اور ادبی خدمت کرنے کے عادی ہیں۔ وطن سے باہر نکلنا کبھی گوارا نہیں کیا، نہ اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود نام ونمود اور شہرت ووجاہت کے خواہاں ہوئے۔ اسی وجہ سے طبقۂ اہل علم موصوف سے ناواقف رہا۔ اوقاتِ فرصت میں اعلیٰ مضامین کے اقتباسات اور ملکی و وطنی اہم معلومات اپنے روزنامچوں میں درج کرتے رہتے ہیں۔ عمدہ اشعار کا ذخیرہ بھی اسی طرح جمع کرتے رہتے ہیں۔ بیسیوں ضخیم مجلدات کا مجموعہ قاضی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

مجھے ان کے دیکھنے کا کئی بار اتفاق ہوا ہے۔ بڑا کارآمد ذخیرہ ہے۔

میرے لکھنے پر موصوف نے مقامی مصنفین کی اردو تصانیف کی فہرست مرتب کرکے ارسال فرمائی اور غالباً کیفیت میں مفید معلومات کا اضافہ بھی کیا۔

مدیرِ معارف کی فرمائش پر اشاعت کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

ہندوستان کے مصنفین بلاد وقصبات کی مصنفات کی فہارس اگر اسی نہج پر اہل ذوق حضرات مرتب کرکے شائع کراتے رہیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی اور ہزاروں مطبوعہ وغیر مطبوعہ گوہر نایاب منظرِ عام پر آجائیں گے۔ میں خود بھی مسلم یونیورسٹی لٹن لائبریری کی گمنام گرانقدر کتابوں کے بارے میں قارئین معارف کے لئے کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہوں گا +

محمد عبد الشاہد خاں شروانی

او رنٹیلسٹ لٹن لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون کتاب	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۱	طوفان نوح ؑ	تاریخ	مولوی منشی سید اکبر علی صاحب نقوی آملی حنفی۔ قادری ساکن سیتاپور محلہ قضیارہ	صرف ایک نقشہ	مطبوعہ	صرف ایک بار نقشہ کی صورت میں شائع ہوا تھا اب نایاب ہے۔
۲	تاریخ مسعودی	"	"	۲ جزو	"	حضرت سید سالار مسعود غازی بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مختصر کتاب ہے۔ ایک ہی بار شائع ہوئی۔ اب نایاب ہے۔
۳	مرآۃ النکاح	نصیحت	"	۳ جزو	"	یہ کتاب ایک ہی بار چھپی تھی۔ اب نایاب ہے۔ اس کتاب میں جوان بیوہ عورتوں کے نکاح نکرنیکی خرابیاں درج ہیں اور نصیحت آمیز حکایتیں بھی تحریر ہیں۔
۴	مجموعۂ فتاوے حنفیہ	فقہ	"	تقریباً ۱۰ جزو	قلمی	اس میں ضروری فتوے درج ہیں۔ کسی کی فارسی عبارت ہے اور کوئی اردو میں ہے۔ یہ فتووں کا مجموعہ چھپا نہیں ہے۔
۵	ترجمہ کتاب منقبت سلطانی رح	تصوف و تاریخ	"	۸ جزو	"	علامہ شیخ عبدالحمید صاحب جانمپوری کی کتاب منقبت سلطانی کے بعض مقام کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب حاجی قادری شاہ سید عبدالرحمن صاحب الملقب سید شاہ سلطان صاحب ولایت قصبہ آٹ رح کے حالات میں ہے جو مترجم صاحب کے جد امجد اور آٹ کے سید ونکے مورث اعلیٰ تھے۔ آٹ ضلع سیتاپور کی تحصیل مصرکھ میں مشہور مقام ہے۔
۶	تاریخ سیتاپور	"	"	۱۰ جزو	"	اس کتاب میں سیتاپور کے تاریخی واقعات اور ضروری اور مفید یادداشتیں درج ہیں۔ یہ کتاب شائع نہیں ہے غیر مرتب صورت میں ہے
۷	"	"	"	۱۶ جزو	"	"
۸	"	"	"	۱۰ جزو	"	"
۹	مجرب اعمال	اعمال	"	۱۲ جزو	"	مجرب عمل اور تعویذ درج ہیں۔ چھپی نہیں ہے۔
۱۰	"	"	"	"	"	"
۱۱	نصائح وہدایات	نصائح و تجارت	"	۴ جزو	"	"
۱۲	انساب و شجرات	انساب	"	۱۵ جزو	"	اپنے اور سیتاپور وغیرہ کے خاندانوں کے نسب نامے اور شجرے اور ضروری حالات۔ چھپے نہیں ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۱۳	تاریخی اور علمی یادداشتیں	مختلف	مولوی منشی سید اکبر علی صاحب نقوی	۲۰ جزو	قلمی	یہ مختلف کتابوں کے انتخابی مضامین غیر مرتب صورت میں ہیں جن سے ایک نہایت ضخیم اور مفید کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔
۱۴	تحفۂ حیدری	مناظرہ	"	"	"	یہ کتاب چھپی نہیں۔ شیعہ مذہب کے رد میں ہے۔
۱۵	ہدایۃ الاسلام	فقہ	"	"	"	شیعہ سنیوں کے نکاح کے جائز اور ناجائز ہونے کی بحث میں ہے علماء کے فتوے وغیرہ درج ہیں۔
۱۶	مرآۃ الربا	"	"	•	مطبوعہ	یہ کتاب سود کی حرمت میں ہے صرف ایک بار چھپی تھی اب نایاب ہے۔
۱۷	جدول قصہ حضرت یوسفؑ	تاریخ	"	[illegible]	"	ایک بڑے ورق پر چھپا تھا حضرت یوسفؑ کا مختصر بیان تاریخی اور تفسیری حوالوں سے لکھا گیا تھا۔ اب نایاب ہے۔
۱۸	ہدایۃ الغافلین	مناظرہ	"	۱۰ جزو	قلمی	یہ کتاب ناتمام ہے۔ شیعہ اور سنیوں کے اختلافات کا بیان ہے۔
۱۹	مثنوی تبصرۃ الایمان	"	"	۵ جزو	"	شیعہ مذہب کے رد میں یہ مثنوی تھی۔ چھپنے سے پہلے تلف ہو گئی۔
۲۰	انتخاب تواریخ	تاریخ	"	۱۲ جزو	"	مختلف تاریخوں کا مفید انتخاب ہے۔ چھپا نہیں۔
۲۱	ترجمہ مرآۃ مداری	"	مولوی منشی سید قمر علی برادر ممدوح الصدر	۵ جز	مطبوعہ	حضرت شاہ بدیع الدین صاحب مکنپوریؒ کے حالات میں ایک مشہور کتاب کا ترجمہ منشی صاحب نے اودھ کے بادشاہوں کی ملازمت کے دنوں اس کا ترجمہ کر کے لکھنؤ کے مطبع اثنا عشری میں چھپوایا مالک مطبع نے اسے نہایت بری صورت میں چھاپ کر اپنے تعصب کا اظہار کیا۔ کتاب میں ایسے مضمون شامل کر دئے جس سے یہ ثابت ہو کہ مترجم شیعہ مذہب ہے۔
۲۲	کتاب رد مذہب نصاریٰ	مناظرہ	"	•	•	عیسائیوں کے رد میں ایک ضخیم و بے مثل کتاب تھی اب نایاب ہے۔
۲۳	آداب المیلاد	میلاد شریف کے آداب میں	مولوی منشی قاضی سید الطاف حسین صاحب سیتاپوری	۳۲ صفحہ	مطبوعہ	مولف موصوف جناب مولوی سید اکبر علی صاحب ممدوح الصدر کے بڑے صاحبزادے اور سیتاپور کے قاضی تھے۔ اس کتاب کا تاریخی نام القول اللطیف فی آداب المولد الشریف ہے۔ ایکبار چھپی تھی۔ اب نایاب ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	فن	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۲۴	کتاب ردو ہابیہ	مناظرہ	قاضی سید الطاف حسین صاحب سیتاپوری	۲ جزو	قلمی	وہابیوں کے رد میں ہے اس کا صرف سودہ ہی ہوا تھا چھپی نہیں اس کے آخر میں بعض مضامین مولانا مولوی حاجی قاری حکیم منشی اعظم حسین صاحب صدیقی حنفی چشتی قادری خیرآبادی مہاجر مکی کے شامل ہیں۔
۲۵	بیاض اعمال مجربہ	اعمال	〃	۳ جزو	〃	اس بیاض میں مجرب عمل درج تھے۔ تلف ہو گئی۔
۲۶	بیاض اشعار منتخبہ	شاعری	〃	۵ جزو	〃	اس بیاض میں اردو اور فارسی کے مشہور شاعروں کے انتخابی اشعار ہیں۔ چھپی نہیں ہے۔
۲۷	سیتاپور کے نسب نامے وغیرہ	انساب	قاضی سید محمد رضا صاحب سیتاپوری	۱۲ جزو	〃	اس کتاب میں سیتاپور کے خاندانوں اور اپنے خاندان کے شجرے اور سلسلے اور سیتاپور کے تاریخی واقعات درج ہیں اور بعض تصنیفیں بھی۔ یہ بزرگوار قاضی سید الطاف حسین صاحب موصوف الصدر کے حقیقی بھائی اور سیتاپور کے مشاہیر سے تھے اپنے بھائی کے بعد یہی سیتاپور کے سینوں کے قاضی ہوئے تھے۔ یہ کتاب چھپی نہیں۔
۲۸	تتمہ تاریخ سیتاپور مولفہ سید اکبر علی صاحب	تاریخ	〃	۸ جزو	〃	اپنے والد صاحب کے بعد سیتاپور کے جو واقعات پیش آتے رہے آپ نے اُن کی تاریخ میں درج کر دئے۔
۲۹	مصنفین اسلام	〃	-	-	〃	مولوی حکیم شیخ اکرام علی فاروقی حنفی۔ زیدی بستی وجیہ شریف کی کتاب تھی ان کی اولاد کی غفلت سے یہ کتاب اُن کے خاندان سے جاتی رہی۔
۳۰	ترجمہ اخوان الصفا	ادب	-	۱۲۸ صفحہ	مطبوعہ	یہ کتاب مترجم کے زمانہ میں ہی چھپی انکے بعد انکے پوتے حسن رضا نے چھپوائی۔ انجمن ترقی اردو نے بھی چھپوائی ہے۔
۳۱	دیوان	〃	اُستاد منشی علی رضا صاحب رضا نبیرۂ مترجم اخوان الصفا امامی المذہب	-	قلمی	یہ دیوان چھپا نہیں ہے۔
۳۲	آئینۂ تماش بینی	نظم نصیحت	اُستاد منشی علی محمد رضا نبیرۂ مترجم اخوان الصفا امامی المذہب	ایک جزو	مطبوعہ	عیاشی کی خرابیوں کا بیان ہے۔ یہ کتاب صرف ایکبار چھپی۔ اب نایاب ہے۔
۳۳	تحفہ مہوشاں	فن مہوشی	حکیم مولوی سید امتیاز حسین صاحب	۳ جزو	قلمی	. . . . .

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون کتاب	نام مؤلف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	مطبوعہ یا قلمی	کیفیت
۳۴	ترجمہ قانونچہ	طب	حکیم سید مہدی حسن صاحب	.	قلمی	پوری کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔
۳۵	بیاض مجربات	"	"	.	"	اس میں مجرب نسخے ہیں۔
۳۶	مرثیے	ادب و شاعری	حکیم مولوی کرامت علی صاحب	.	"	یہ مرثیے انیسؔ و دبیرؔ کے طرز پر ہیں۔ چھپے نہیں ہیں۔
۳۷	کوکبۂ فارغ	مرثیے شاعری	سید محمد فضل صاحب فارغ	ص ۱۱۲	مطبوعہ	انیسؔ کے طرز پر یہ مرثیے ہیں فارغ سیتاپوری کے بیٹے سید محمد حمید صاحب نے چھپوا دیئے۔ یہ فارغ انیسؔ کے شاگرد بھی تھے۔ اس کتاب میں چھ مرثیے ہیں۔
۳۸	علمی۔ مذہبی ادبی مضامین	ادب	مولوی منشی سید ہادی حسن صاحب	.	قلمی	منتشر حالت میں یہ مضامین ہیں۔ اگر مرتب کئے جاویں تو کارآمد ہیں۔
۳۹	علامہ سیتاپوری	تاریخ	ڈاکٹر ناظم	ص ۱۶	مطبوعہ	اس میں مترجم اخوان الصفا کے حالات ہیں۔
۴۰	مولود شریف	مولود شریف	سید افضل حسین نقوی آتوی	۲ جزو	قلمی	یہ کتاب بھی چھپی نہیں ہے۔
۴۱	حال فارغ	تاریخ	حکیم سید ہلال حسین صاحب	ص ۶۵	مطبوعہ	اس کتاب میں فارغ سیتاپوری کے مختصر حالات ہیں۔
۴۲	ثمرۃ المکاشفہ	مناظرہ	"	ص ۹۴	"	اس کتاب میں کتاب شجرات طیبات پر اعتراض کئے گئے ہیں
۴۳	مرثیے	ادب و شاعری	سید ظہور الحسین فروغ	.	قلمی	فروغ انیس کے طرز پر ہیں۔ چھپے نہیں۔ فارغ کے بھائی اور انیس کے شاگرد تھے۔
۴۴	شجرات طیبات	انساب	"	ص ۹۵۶	مطبوعہ	یہ ضخیم کتاب سادات نیوتنی کے حالات میں ہے آخر میں بطور ضمیمہ کے سیتاپور کے سیدوں کا مختصر حال درج کر دیا گیا ہے۔
۴۵	کتاب فقہ	فقہ	مرزا عظمت اللہ بیگ صاحب	۳ جزو	قلمی	یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر لکھی گئی تھی۔ روزمرہ کے ضروری مسائل درج تھے۔ چھپی نہیں۔
۴۶	کلیات نامی	ادب	منشی سید نیاز احمد صاحب نامیؔ جعفری	۸ جزو	"	نامی صاحب کا کلیات ان کے صاحبزادے سید وکیل احمد گرامی نے جمع کیا تھا۔ چھپا نہیں۔ اس میں اردو، فارسی وغیرہ ہر قسم کے اشعار تھے۔
۴۷	تحقیق طاعون	طاعون کے متعلق ضروری مضامین	"	ص ۲۳	مطبوعہ	یہ کتاب چھپ گئی ہے مگر اس قدر غلط کہ اس کا کوئی صفحہ بلکہ کوئی سطر غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون یا فن	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۴۸	تذکرۂ شعراء بھوپال	ادب	منشی سید نیاز احمد صاحب نامی جعفری	۳ جزو	قلمی	اس میں بھوپال کے ان شاعروں کا حال اور ان کے اشعار درج تھے جنکے یہاں مشاعروں میں نامی صاحب خود جاکر شریک ہوتے تھے یا وہ اُن کے یہاں مشاعروں میں آتے تھے۔ چھپا نہیں۔
۴۹	مرثیہ	ادب و شاعری	؍؍	۰	؍؍	حضرت امام حسینؑ کی تلوار کی تعریف شاعرانہ انداز میں نظم کیا تھا۔ چھپا نہیں۔
۵۰	کتاب شیعہ اور سنی کے اتحاد کے بیان میں	نصیحت	؍؍	۰	؍؍	اس کا صرف مسودہ ہوا تھا۔ چھپی نہیں۔
۵۱	قبلہ نما	۰	؍؍	صہ ۱۲	مطبوعہ	جناب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیۂ ریاست بھوپال کے سفر حج سے واپسی پر بطور مبارکبادی کے یہ مسدس لکھا گیا تھا۔
۵۲	حاشیہ کتاب آداب المیلاد	میلاد شریف	مولوی قاضی منشی سید ابرار حسین صاحب جعفری حنفی قادری تحصیل محرکہ	۰	؍؍	کتاب آداب المیلاد پر آپ کا حاشیہ بھی چھپا ہے جس سے آپ کی وسعت معلومات اور تبحر علمی عیاں ہے۔
۵۳	مضامین گلدستۂ ریاست	زمینداروں کے مفید مطلب	؍؍	صہ ۲۶۸	؍؍	یہ کتاب اگرچہ سیٹھ سواجی لال صاحب تعلقدار معز الدین پور پرگنہ و تحصیل بسوال ضلع سیتاپور کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اول سے آخر تک آپنے اصلاح کی ہے مگر باعتبار بعض مضامین کے اس میں زیادہ حصہ آپ ہی کے مضمون کا ہے۔
۵۴	واقعات سیتاپور وغیرہ	تاریخ	؍؍	۵ جزو	قلمی	اس میں سیتاپور کے تاریخی واقعات اور بھی ضروری اور مفید یادداشتیں وغیرہ درج ہیں۔
۵۵	بیاض مجمع السرور	۰	؍؍	صہ ۳۰۰	؍؍	مفید اور کارآمد مضامین درج ہیں۔
۵۶	بیاض	۰	؍؍	۰	؍؍	اس بیاض کے علاوہ چند بیاضیں اور بھی ہیں جن میں عجیب نسخے، مجرب عمل، حکیموں، عالموں، صوفیوں وغیرہ کی تحقیق اور انتخابی اشعار، حکایات، لطائف وغیرہ درج ہیں۔
۵۷	کتاب الاخلاق	اخلاق	؍؍	۸ جزو	؍؍	علم اخلاق میں کتاب تھی جس کا صرف مسودہ ہوا تھا۔
۵۸	کتاب الاعمال	اعمال و وظائف	؍؍	صہ ۸۲	؍؍	اس کتاب میں مجرب عمل درج ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون	نام مؤلف یا مصنف یا مترجم	حجم	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۵۹	ارمغان ہاتف	شاعری	سید احمد حسن عرف امداد میاں ہاتف	صـ ۳	مطبوعہ	سیتاپور کے شاعروں کا انتخاب۔
۶۰	ناول	ادب	"	-	قلمی	بہت بڑے ناول کا مسودہ ہے۔ اگر ختم ہوکر چھپ جاتا تو پہلے ہی حصہ کا حجم فسانۂ آزاد کے پہلے حصہ سے کچھ ہی کم ہوتا
۶۱	ادیب فارسی	تعلیم فارسی بزبان اردو و فارسی	جناب منشی سید فرزند حسین صاحب عثمانی سیتاپوری جناب مولوی قاضی منشی سید العطاف حسین صاحب جناب مولوی قاضی منشی سید ابرار حسین صاحب سیتاپوری وزیر علیصاحب شاہ آبادی	صـ ۱۱۲	مطبوعہ	اس کتاب کے چار حصے ہیں اب نایاب ہے۔ اس کے سرورق پر بابو بلویو پرشاد وکیل کا نام ہے اور کسی شریک تصنیف کا نام نہیں درج ہے۔ اگر یہ کتاب باقاعدہ پڑھائی جائے تو فارسی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت پیدا ہو سکتی ہے۔
۶۲	مکتوب محمدی	خطوط نویسی	جناب اُستادی منشی سید فرزند حسین صاحب متوطن قصبہ پالی ضلع ہردوئی مہتمم و منیجر مطبع صبح صادق سیتاپور	۴ حصے حجم حصہ اول صـ ۵۲	"	مکتوب محمدی کے چاروں حصے اگر قاعدے اور اصول سے پڑھائے جاویں تو اردو اور فارسی میں کافی لیاقت پیدا ہو سکتی ہے اور خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروری تحریر اور عدالتی کارروائی سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے اور شکستہ اور شفیعہ خط بخوبی لکھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کی ترتیب لائق صد ہزار آفریں ہے۔ اس کا پہلا حصہ تو نایاب نہیں ہے لیکن اور حصے قریب قریب نایاب ہیں۔
۶۳	زلف عروساں	تاریخ خوشنویسی	"	-	"	یہ کتاب خوشنویسی اور خوشنویسوں کی تاریخ میں ہے وہ ایک ہی بار چھپی تھی اب نایاب ہے۔ اگر یہ دونوں کتابیں کہاں مل سکتی ہیں تو غالباً ضلع ایٹہ کے قصبہ مارہرہ کے سجادہ نشین سید محمد میاں صاحب کے کتب خانہ میں ہونگی۔ کیونکہ انھیں کے دادا سید شاہ محمد صادق صاحب وکیل ہائی کورٹ مقیم سیتاپور محلہ تامسین گنج کے مطبع صبح صادق میں چھپی تھیں۔

وَلی گجراتی

(استدراک)

(۲)

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

گذشتہ شمارہ میں ہم نے اپنے پچھلے مضمون کے چند مسامحات کی تصحیح کے ساتھ بعض استدراکات بھی پیش کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم چند مزید امور کا اضافہ کرتے ہیں۔ جن سے وَلی کے گجراتی ہونے پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

ایک دکھنی شہادت مولوی باقر آگاہ دکن کے ایک محقق عالم تھے جو نہ صرف مختلف علوم و فنون اور عربی، فارسی اور ہندی کے متبحر عالم تھے، بلکہ اردو زبان و ادب کے بڑے ماہر اور اپنے زمانہ کے بہترین مصنف اور شاعر تھے، چنانچہ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ وَلی کی وفات سے تقریباً ۳۵ برس کے بعد مولوی باقر آگاہ ویلور میں ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی اور مدراس میں مدفون ہوئے، تقریباً ستّرہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔ ان کے متعلق مؤلف "تذکرہ اردو مخطوطات" لکھتے ہیں:-

> "آگاہ اردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر قادر تھا۔ غزل، قصیدہ، مثنوی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ دکھنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہو گیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں ویسا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو سکا۔ وہ میر اور سودا کے ہمعصر تھے۔ لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے اس لئے شمالی ہند میں شہرت نہیں حاصل ہوئی۔" [1]

اپنے قصہ بعنوان شاہ روح افزا معروف بہ "مثنوی گلزارِ عشق" کی تمہید میں آگاہ نے اردو زبان کی تدریجی ترقی پر بحث کرتے ہوئے وَلی کو گجراتی لکھا ہے۔ یہاں ان کی تمہید متعلقہ حصہ نقل کیا

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۷۶

جاتا ہے:-

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بے معنی (بے معنی)[1] و ہرزہ درایان (درایان) لاطائل دکھنی پر اعتراض اور گلشن عشق و علی نامہ پڑھنے کے اعتراض (احتراز) کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک (تلک) ریاست سلاطین دکن کے (کی) قائم تھے (تھی)، زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج اور طعن شماتت (طعن و شماتت) سے سالم تھی۔ اکثر شعراء وہاں کے مثل نشاطی و فراقی و شوقی و خوشنود و غواصی و ذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی و جہتاب وغیرہم کہ بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و رباعیات و مثنویات و مقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دی (دئے)، لیکن نصرتی ملک الشعراء اور رتنگ نظری سے مبرا ہے۔ جب شاہان ہند اس کلیز (کشمیر) جنت نظیر کو تسخیر کرکے طرز روزمرہ دکھنی پنج محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی اور ہندوستان مدت تک زبان ہندی کہ اوست برج بھاکا بولتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول و مخرج فنون فروع و اصول ہے۔ پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو ل اوس کی (سکے) کھولنے لگے بسبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمیٰ ہوئی"

"جیسا کہ ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں بانی طرز جدید کی (کے) ہوئی (ہوئے) ہیں ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور استاد ہے بعد اوس کی (کے) جو سخن سنجان ہند ہوئے وہ سب بے شبہ اس پنج کو اوس سے لئے اور من بعد اوس کو باسلوب خاص مخصوص کرچکے اور نئے اردو کے بھاکا سے موسوم کئے۔ اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہندکی (کے) جیسا شاہجہان آباد و لکھنؤ و اکبرآباد وغیرہ رواج تمام پایا اور جوں جاہی (چاہئے) سبھوں کو من بھایا اور آخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن میں اکثر مشاہیر شعراء عرصہ (وجود میں؟) آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد، مظہر، فغاں، درد مند، یقین، سوز، ان، بیر (آبرو ؟)، آرزو، سودا، تاباں وغیرہ ہم (وغیرہم)"[2]

مندرجہ بالا تمہید کتاب "دکھنی مخطوطات یورپ میں" (صفحہ ۴۵۷ - ۵۰۴) سے نقل کیگئی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوچکی ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور
مقام[2] پر اس کا اقتباس بھی کیا ہے تو اس میں اس کا آخری حصہ جس میں ولی کا ذکر ہے نہیں آنے
بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اہل قلم نے بھی اس کی طرف کوئی نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ حا

---

[1] اصل متن کی غلطیوں کی تصحیح ہم نے بین قوسین کی ہے۔ [2] مقالات ہاشمی

لی کے گجراتی ہونے پر آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کی ایک دکنی عالم کی تحریر بڑی اہمیت رکھتی ہے، خصوصاً ں اعتبار سے کہ اس کا لکھنے والا اُردو زبان کی تاریخ سے واقفیت رکھتا تھا اور وَلی کی ایجاد زل ریختہ کے سبب ان کو سبھوں کا مبتدا اور استاد مانتا تھا۔ لہٰذا ایسے محقق کا بیان وَلی کے گجراتی ہونے پر "قولِ فیصل" کا حکم رکھتا ہے۔

سیر گجرات کا نظریہ

سب سے پہلے آصفی ملکاپوری[1] نے اور اُن کے تتبع میں حسن مرحوم[2] اور دیگر دکنی اہلِ قلم[3] نے وَلی کے "قطعۂ در فراقِ گجرات" کے ایک شعر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وَلی گجرات میں صرف سیر و تفریح کی غرض سے گئے تھے ورنہ اُن کا اصل وطن رنگ آباد تھا[4]۔ وہ شعر یہ ہے :-

اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا
آخر کو اس فراق میں کھینچا خمارِ دل

ہم اپنے پچھلے مضمون میں اس پر کافی بحث کر چکے ہیں، یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کلیاتِ لی کا دوسرا اڈیشن جو حال ہی میں "انجمن ترقی اُردو" نے شائع کیا ہے اور جو طبعِ اول کی بہ نسبت دیوانِ لی کے زائد نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کے بعد مرتب ہوا ہے، اس میں سرے سے لفظ "سیر" موجود ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ "شہر" چھپا ہے۔ اگر معتبر نسخوں کے مطابق یہ صحیح ہو تو اس بحث کا یہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور اس قطعہ کے موضوع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ لفظ "شہر" ہو۔ چنانچہ اب اس کے معنی بھی یادہ واضح اور درست ہو گئے ہیں۔ کیونکہ "اس شہر" (اس کے شہر۔ مطلع میں گجرات کی طرف اشارہ ہے) اور مصرعۂ ثانی میں "اس فراق" (اس کے فراق) کا مشار الیہ بھی گجرات ہے اور اس کے لئے "سیر"

---

[1] محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۱۱۳۶
[2] کلیاتِ وَلی صفحہ ۲۸۵ کا نوٹ۔
[3] یادگارِ وَلی صفحہ ۷۰
[4] ایک دکنی اہلِ قلم لکھتے ہیں: "شفیق اور فتوت اور محمد تقی لی کے اورنگ آبادی ہونے پر متفق ہیں اور دکن میں سوا اورنگ آباد کے کسی شہر کو وَلی کا وطن ہونے کا دعویٰ بھی نہیں۔ اس سے یہی ابت ہوتا ہے کہ وَلی اورنگ آباد دکن کے اصل باشندے تھے" (مقالاتِ ہاشمی صفحہ ۱۵۶) میر اور اُن کے تتبع میں شفیق کے سوا ی نے وَلی کو اورنگ آباد کا باشندہ نہیں لکھا جن کی حقیقت ہم اپنے پچھلے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ فتوت اور محمد تقی کی نسبت یہ بھی غلط بیانی ہے اس لئے کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی وَلی کو اورنگ آبادی نہیں لکھا۔ فتوت نے صرف "دکنی" اور "بود و باش دکن" (مقالاتِ ہاشمی صفحہ ۲۲۵) اور محمد تقی نے "متوطن دکن" (مقالات صفحہ ۱۳۱) لکھا ہے۔

کی بہ نسبت "شہر" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں وؔلی نے اپنے وطنِ مالوف احمد آباد کو "شہر" کہا ہے، تواریخ میں احمد آباد کو عام طور سے دار الملک گجرات لکھا گیا ہے۔

ملکِ دکن اور دکنی زبان

ہم اپنے مضمون میں اس بات کے متعدد شواہد پیش کر چکے ہیں کہ وؔلی نے اپنے شعر اور دوسروں نے اُن کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے تو اس سے اُن کی مراد گجرات ہے جس پر عام طور سے دکن کا اطلاق ہوتا تھا۔ اسی طرح وؔلی کے دکنی زبان میں شعر کہنے کے متعلق بھی ہم نے مفصل بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض گجراتی شعرا کے اپنے ملک گجرات کو "ملک دکن" اور اپنی زبان کو "دکھنی" کہنے کی چند مثالیں ہم پہنچی ہیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:-

۱۔ سید محمد اشرف متخلص بہ اشرؔف خاص احمد آباد گجرات کا باشندہ اور وؔلی کا شاگرد تھا۔[1] اس نے اپنے اشعار ذیل میں اپنے وطن گجرات کو "ملک دکن" لکھا ہے:؎

یہ شعر سُن کے کہے ہیں صدآفریں اشرؔف
تمام شاعر ملکِ دکن سخن کی قسم[2]

ہوا سر مشق ہر یک صاحبِ طبع
سخن اشرؔف ترا ملکِ دکن میں

وصف میں تیرے شعر بولے ہیں
شاعرانِ دکن امیر الدین

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اموں کا
ہوا مشتاق ہر یک شاعرِ ملکِ دکن میرا

اسی طرح اپنی مثنوی "جنگ نامۂ حیدری" میں جو اس نے ۱۱۲۵ھ میں لکھی تھی کہتا ہے:؎

ہوس دل میں آیا کروں ترجماں
کروں فارسی کا یو دکھنی بیاں

برا اں فارسی کوں دکھنی مال میں
بھر آیا ہوں اس کو ہر یک حال میں[3]

---

[1] گلشن گفتار صفحہ ۱۲۔ ملاحظہ ہو مصنف شمارہ ۱۵ میں ہمارا مضمون سابق۔ "اشرف گجراتی" پر ہمارا ایک مفصل مقالہ عنقریب رسالہ اردو میں شائع ہوگا جس میں ہم نے اشرؔف کو گجراتی اور وؔلی کا شاگرد ثابت کیا ہے۔

[2] حمید نے اپنے تذکرہ میں اشرؔف کی ۵ شعروں کی غزل نقل کی ہے اس کا یہ شعر ہے۔ حمیؔد خود دکنی ہے اور اشرؔف کو گجراتی لکھا ہے اس کے باوجود اس شعر کے متعلق اُس نے کسی قسم کا ریمارک نہیں کیا۔

[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۴۹۔

۲۔ گودھرا (ضلع گجرات) کا ایک شاعر فتح شریف بھی اپنے "پندنامۂ لقمان" میں لکھتا ہے :ـــ

وسے نثر میں فارسی تھا اوّل ــــــ کیا نظم دکھنی سوں یو بے بدل

تعجب ہے کہ اس شاعر کو مؤلف "تذکرۂ اردو مخطوطات" نے دکنی لکھ دیا ہے۔ اِن کے الفاظ ہیں :ـ

"فتح شریف گوڈر کا رہنے والا ایک دکنی شاعر تھا۔[1]"

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ "گوڈر" دکن کا کوئی شہر ہوگا۔ اس کی ایک تصنیف "زلیخائے ثانی" کی نسبت مؤلف مذکور نے لکھا ہے :ـ

"مصنف کے ایک نامور دوست محمد امین نے قسم دے کر کہا کہ تم بھی زلیخائے ثانی کا ایک ایسا قصہ لکھو جس کی وجہ سے شہر گوڈرا کی شہرت ہو جائے۔"

یہاں شاعر کا وطن گوڈر سے گوڈرا ہو گیا۔ لیکن یہ "گودھرا" کی خرابی ہے جو دکن میں نہیں بلکہ گجرات کے ضلع پنچ محال میں بی بی سی آئی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ اور یہ محمد امین وہی ہے جس نے مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۴۰ھ میں اپنے وطن گودھرے ہی میں لکھی تھی۔ چنانچہ کہتا ہے :ـــ

بتاں یک چالیس سو پھر چودہ اور سو ــــــ میں لکھا گودھرے کے بیچ سُن لیو

اس پر مؤلف "دکھنی مخطوطات" کا بیان ملاحظہ ہو :ـ

"اور یہ گودھری (گجراتی) زبان میں لکھی گئی ہے، مگر چونکہ امین کو دکن سے بھی تعلق رہا ہے اس لئے اس مخطوطے کی صراحت نامناسب نہیں ہو سکتی۔"[2]

"مخطوطے کی صراحت" کا اشارہ غالباً اسپرنگر کی طرف ہے جس نے اس کو "دکھنی نظم" بتایا ہے لیکن مصنف تو یہ کہہ رہا ہے کہ اس نے یہ مثنوی شہر گودھرا میں لکھی ہے۔ گودھرے کو گودھری پڑھ کر اس کو گوجری اور گجراتی (حالانکہ یہ دونوں علیحدہ زبانیں ہیں) سمجھ لینے میں غلطی ہوئی ہے۔ آگے چل کر مؤلف نے تسلیم کیا ہے کہ امین گجراتی تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :ـ

"جہاں تک میری تحقیقات ہے ان کا تعلق گجرات سے تھا۔ عالمگیر کے عہد میں دکن کا رُخ کیا۔"[3]

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ "دکن کا رُخ کرنے" کے متعلق مؤلف کا ماخذ کونسا ہے؟

۳۔ عبدالصمد جو گجرات کے مہدویوں میں سے تھے اور جنھوں نے اس فرقے کے بزرگوں اور پیشواؤں کے

---

[1] تذکرۂ اردو مخطوطات جلد ۱، صفحہ ۳۱۔

[2] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۳۳۲۔

حالات میں ایک مثنوی "فیض عام" ۱۱۴۱ھ میں لکھی ہے۔ اس میں وہ اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں:-

سہل کر دکنی میں لکھی کتاب ۔۔۔ سو آوے سمجھ میں ہر یک کوں شتاب

کیا ہے کو دکنی زباں میں کلام ۔۔۔ رکھا نانو اس کا یقیں فیض عام

اس کے متعلق پروفیسر شیرانی مرحوم رقمطراز ہیں:-

"پلوانہ (مہدوی) اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے جہاں اردو کی وہ شاخ جسے گوجری کہا جاتا تھا رائج تھی اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ ہیں کہ انسان کو ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ابن داؤد بلحاظ دکنی لٹریچر سے کافی گہری آشنائی رکھتے ہوں گے کہ ان کی ادبی مساعی کا پہلا نتیجہ ایک ایسی زبان میں ہے جسے دکنی کے [illegible] اور نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے میری مراد مثنوی فیض عام ہے اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے عبدالصمد اس کا مصنف ہے۔"[له]

ایک گجراتی مصنف کے اپنی زبان کو "دکنی" لکھنے پر شیرانی مرحوم کو اس کی توجیہ کرنی پڑی، اور آخر انھوں نے اپنا یہ قیاس پیش کیا ہے کہ یہ گجراتی مصنف دکنی لٹریچر سے گہری آشنائی رکھتے ہوں گے حالانکہ مرحوم نے خود تسلیم کیا ہے کہ گوجری اور دکنی اس قدر مشابہ ہیں کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ بجائے خود ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک گجراتی مصنف کی تصنیف ہے اور گجرات ہی میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی پر بحث کرتے ہوئے مرحوم نے اس کی جو لسانی خصوصیات دکھائی ہیں وہ اکثر گجراتی ہیں۔[۵۲]

۴۔ عبداللہ بن اسحاق واعظ ریاست گونڈل (کاٹھیاواڑ) کے شہر "دھوراجی" کے رہنے والے تھے ۱۱۹۶ھ میں انھوں نے "لیلیٰ و مجنوں" لکھا ہے۔ وہ کاٹھیاواڑ گجرات کے باشندہ ہونے کے باوجود اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں:-[۵]

زباں دکنی میں ایک قصہ سناؤں ۔۔۔ سنہ ہجری میں سو لکھ کر سناؤں

میں عبداللہ واعظ ابن اسحاق ۔۔۔ خدایا بھیج میرے غم کا تریاق

شروع قصہ کیا دسویں صفر کو ۔۔۔ وہ دن کا پہر تھا وقت ظہر کو

ختم دسویں ربیع اول کیا ہے ۔۔۔ گیارہ سو چھنوں اندر لکھا ہے

له اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۸۲

۵ه " " " صفحات ۸۸، ۸۹۔

مینہ ایک میں قصہ لکھا ہے — سنو سورت میں یہ قصہ بنا ہے
شروع قصہ کیا گونڈل کے اندر — اوسے پورا کیا دھوراجی بھیتر [۱]

ولی کے نام کی تحقیق

گزشتہ مضمون میں ہم نے ولی کے نام سے مختصر بحث کی ہے۔ یہاں ہم اس پر تفصیلی نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ جو احمدآباد کے مشہور بزرگ حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علوی قدس سرہٗ کے خاندان سے تھے۔

اردو شعرا کے حالات میں تین قسم کی کتابیں ملتی ہیں:۔

(۱) قدیم تذکرے جو بارھویں صدی کے نصف سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک لکھے گئے ہیں کچھ تو ذاتی تحقیقات اور کچھ سنی سنائی روایات پر مبنی ہیں۔

(۲) جدید تذکرے جو چودھویں صدی میں لکھے گئے ہیں جن میں سے اکثر قدیم تذکروں سے ماخوذ ہیں یا تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہیں۔

(۳) مستشرقین یورپ کی تصانیف اور یورپی کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی فہرستیں جن میں ان مخطوطات کے مطالعہ سے یا قدیم و جدید تذکروں سے تحقیق کر کے شعرائے اردو کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذیل میں ہم ان تینوں قسم کے تذکروں کے بیانات ولی کے نام کے متعلق نقل کرتے ہیں

ق

حصہ اول

(۱) "مخزن نکات" از قائم چاندپوری (۱۱۶۸ھ) ولی کی وفات کے ۵۰ برس بعد کی تصنیف

"شاہ ولی اللہ موطنش گجرات، گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیا مشاہیر ست افتخار یادداشت" (صفحہ ۱)

(۲) "تذکرہ شعرائے اردو" مولفہ میر حسن (۱۱۸۸ھ - ۱۱۹۲ھ)

"درویش خفی و جلی شاہ ولی المتخلص بہ ولی مشہور و معروف مردے بود از خاک گجرات" (صفحہ ۲۰۲)

احمد گجراتی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"چوں معاصر شاہ ولی اللہ بودہ و دستہ ریختہ نیز گفتہ" (صفحہ ۴۱)

(۳) "تذکرہ گلزار ابراہیم" از علی ابراہیم خاں خلیل (۱۱۹۸ھ)

"ولی دکنی شاہ ولی اللہ اصلش از گجرات" (صفحہ ۲۴۶)

---

[۱] قصۂ لیلیٰ مجنوں (مجموعۂ بارہ قصے) مطبوعۂ کریمی پریس بمبئی ۱۳۲۶ھ، صفحات ۷۹ و ۸۰۔

(۴) "تذکرۂ گلشنِ ہند" از مرزا علی لطف (سنہ ۱۸۰۱ء)

"ولیؔ تخلص شاہ ولی اللہ نام" (ص۱۵۱)

(۵) "تذکرۂ طبقاتِ سخن" مؤلفہ شیخ غلام محی الدین قریشی تخلص عشق و مبتلا میرٹھی (سنہ ۱۲۲۲ھ) تذکرہ آبرو:

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بعہدِ محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آں شد" [۱]

(۶) سخن شعرا از عبدالغفور خاں نساخ (سنہ ۱۲۹۱ھ) ۔

"ولیؔ تخلص شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے" (ص۵۰۶)

قسم دوم:—

(۷) "آبِ حیات" آزاد:— "شمس ولی اللہ" (ص۸۰)

(۸) "جلوۂ خضر" از صفیر بلگرامی: "ولی اللہ ولیؔ" (ج ۱ ص... و ص...)

(۹) "گلِ رعنا" از مولوی عبدالحی: "شمس الدین لقب ولی اللہ نام (ص...)

(۱۰) "اربابِ سخن" از حسرت موہانی: "شاہ ولی اللہ" (ص...)

قسم سوم —

(۱۱) "دیوان ولیؔ" مرتبہ گارساں دی تاسی (سنہ ۱۸۳۳ء)

"ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا" (مقدمہ ...)

(۱۲) "مخطوطہ دیوان ولیؔ" (مملوکہ گارساں دی تاسی) "شاہ محمد ولی اللہ" [۲]

(۱۳) "یادگار شعرا" مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر (سنہ ۱۸۵۴ء)

"ولی شاہ ولی اللہ ساکن گجرات" (ص۲۱۰)

(۱۴) "اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری" از ٹامس ولیم بیل (سنہ ۱۸۹۴ء)

"شاہ ولی اللہ ولی تخلص ساکن گجرات" (ص۴۴۴)

(۱۵) "اڈنبرا کیٹلاگ": "شاہ ولی اللہ گجرات کے باشندے تھے" [۴]

(۱۶) "آکسفورڈ کیٹلاگ" "ہندوستان کے ممتاز شاعر شاہ محمد ولی گجراتی" [۵]

(۱۷) "انڈیا آفس کیٹلاگ" از بلوم ہارٹ "ولی دکھنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا بعض محمد ولی اور بعض ولی اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ولی الدین بھی کہا گیا ہے۔ یہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے" [۶]

---

[۱] ہندوستانی بابت جولائی سنہ ۱۹۳۱ء "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" ص۳۲۵ [۲] دیکھو یادگار ولی۔ ص۹۴

[۳] گارساں دتاسی مرتبہ زور قادری ص۳۶ [۴] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص۴۰۴

[۵] " " "

[۶] " " " ص۴۰۳

(۱۸) "ہندوستان کی پیمائش لسانی" از جارج گریرسن (سنہ ۱۹ء) "دلی کا نام شاہ ولی تھا" (ص ۱۴۹)
(۱۹) "تاریخ ادب اردو" از گریم بیلی (سنہ ۱۹۳۲ء) "شمس الدین ولی اللہ" (ص ۳۳)

بعض تذکرہ نویسوں نے "محمد ولی" لکھا ہے جو پورے نام "محمد ولی اللہ" کا مخفف ہی چنانچہ
ردیزی، شفیق، فائق، شورش، ذکا، قاسم، نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ آصفی ملکاپوری اور حکیم سید
ں اللہ قادری نے بھی "محمد ولی" کو ترجیح دی ہے، خود خاندان شاہ ولی اللہ کی قلمی بیاضوں اور ان کی
ول اور دستخطوں میں لکھے ہوئے ناموں میں بھی تھوڑا تھوڑا فرق ہے چنانچہ

(۱) شجرۂ نسب میں : "شاہ محمد ولی اللہ" (۲) مہر میں : "محمد ولی اللہ"
(۳) مولوی سید احمد ابن سید عابد علوی کی بیاض میں : "شاہ ولی اللہ"
(۴) ان کے بھانجے شاہ یحییٰ بن غنی علوی متوفی سنہ ۱۱۰۱ھ کی لکھی ہوئی تاریخ وفات میں "ولی اللہ"
(۵) ملفوظات کبیری میں "میاں ولی اللہ"

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا پورا نام "شاہ محمد ولی اللہ" ہے جس کو بعض نے "شاہ
لی اللہ" بعض نے "محمد ولی اللہ" اور بعض نے صرف "ولی اللہ" یا "میاں ولی اللہ" لکھدیا ہے،
جوان کے پورے نام کے اجزا، یا مختلف شکلیں ہیں، اور غالباً اسی آخری نام کی بنا پر دیوان ولی کے بعض
ندہ مخطوطوں میں کاتبوں نے ان کا نام "میاں ولی محمد" لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں۔ چنانچہ ثناء اللہ فانی کے
لکھے ہوئے مخطوطہ سنہ ۱۱۳۰ھ میں "سید ولی محمد" اور انڈیا آفس کے مخطوطہ دیوان ولی مکتوبہ سنہ ۱۱۵۵ھ
کے کاتب محمد تقی نے "میاں ولی محمد" لکھا ہے۔ تذکروں میں یہ نام صرف "گلشن گفتار" میں ملتا ہے۔ اس
کے سوا کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ تقریباً تمام تذکروں میں شاہ محمد ولی اللہ،
محمد ولی اللہ، ولی اللہ، اور محمد ولی لکھا ہوا ہے۔ جو ایک ہی نام کو ظاہر کرتا ہے، اور اسی پر تمام قدیم
وجدید تذکرے متفق ہیں۔

عزیز مکرم سید ظہیر الدین مدنی (پروفیسر گجرات کالج) نے سنہ ۱۱۰۱ھ کے ایک "تمسک نامہ" میں
شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے دستخطوں میں ولی اللہ کے والد کا نام دو طرح سے لکھا ہوا پایا ہے چنانچہ
یک نے "محمد شریف" لکھا ہے، تو دوسرے نے "شریف محمد"۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ جب
شاہ ولی اللہ کے بیٹے اپنے دادا کا نام دو طرح سے لکھتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں اگر کاتبوں نے ان کی
وفات کے بعد شاہ ولی اللہ کا نام "محمد ولی" کی بجائے "ولی محمد" لکھدیا۔

اختر جوناگڑھی

ایک دلچسپ سفرنامہ

سنہ ۱۹ء کا جاپان

(از جناب ڈاکٹر حاجی محمد حسین صاحب مرحوم)

ذیل کا مضمون ایک نہایت دلچسپ اور معلوماتی "سفرنامہ" بصورت مکتوب ہے، جو ہماری درخواست پر اواخر سنہ ۴۳ء میں جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے از راہ مصنف نوازی عنایت فرمایا تھا، لیکن چونکہ اُس وقت "ہندوستان اور جاپان کی جنگ" جاری تھی، اس لئے باوجودیکہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر بھی صحافتی ذمہ داری کی نزاکتیں مانع اشاعت رہیں۔

اب کہ ہمارا "دشمن دین وایمان" اپنے کیفر کردار کو پہونچ کر تہس نہس ہو چکا اور کسی قسم کی "دشنام" یا "ثنا و صفت" نہ تو "مصالح جنگ" پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ مخالف کو نقصان یا فائدہ پہونچا سکتی ہے، اس لئے یہ "تاریخی" خط (سفرنامہ) نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم ومغفور نے اس خط کے کاتب و مکتوب الیہ کا حسب ذیل تعارف بھی ہمیں لکھ دیا تھا:۔

"خان بہادر ڈاکٹر حاجی محمد حسین صاحب میڈیکل کالج لاہور کے پاس شدہ تھے۔ ہندوستان میں ڈاکٹری کی ملازمت کے بعد جدہ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے "نائب قونصل" کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ اور اس حیثیت سے وہاں عرصۂ دراز تک رہے۔ پنشن پانے کے بعد وہ مع اپنے بیوی بچوں کے انگلستان چلے گئے اور کئی سال تک وہاں رہے۔ وہ بہت دولتمند سمجھے جاتے تھے۔ انگلستان کے قیام سے جب جی بھر گیا تو ہندوستان آ کر ڈیرہ دون رہے اور وہاں "دارالسلام" کے نام سے ایک شاندار اور ڈیرہ دون میں سب سے بڑی کوٹھی بنا کر اس میں قیام کیا۔

پھر مدینہ منورہ جا کر علاج کے ذریعہ مخلوق خدا کی خدمت کی۔ دوبارہ ڈیرہ دون آئے تو وہاں انگریزی طریقۂ تعلیم کا ایک اسکول قائم کر کے اُسے چلایا۔

آخر عمر میں دونوں کی تمام جائداد فروخت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں قیام کیا۔
طالب علمی کے زمانہ سے اُن کی بڑی دوستی مولوی عبداللہ جان صاحب سے تھی (جن کے نام یہ خط ہے) مولوی صاحب موصوف لدھیانہ کے رہنے والے تھے اور سہارنپور میں نامور وکیل رہے۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے شخص تھے۔ عربی اور فارسی مثل مادری زبان کے بولتے اور لکھتے تھے۔ اسی طرح انگریزی بھی روانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے جو انھوں نے بعد میں پڑھ لی تھی۔ وہ عرصہ تک حاجی محمد حسین صاحب کے ساتھ انگلستان میں مقیم رہے۔ راستہ ہی اسی قیام میں حاجی محمد حسین صاحب نے ان کو کئی لاکھ روپئے کے نوٹ نذر کرنے چاہے مگر انھوں نے قبول نہ کئے
مولوی عبداللہ جان صاحب کو سرسید علیہ الرحمۃ اور علی گڑھ تحریک سے عشق تھا۔ وکالت کے زمانہ میں ہر سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر صدہا کی تعداد میں بناتے رہتے اور اس کے ہر اجلاس میں نیز علی گڑھ کالج کے تمام جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ عرصۂ دراز تک کالج کے ٹرسٹی رہے۔ اُن کا انتقال سہارنپور میں ہوا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ دونوں اصحاب حکومت برطانیہ کے بڑے دلدادہ اور سچے بہی خواہ تھے۔

راقم السطور "مدیر" مصنف نے دونوں اصحاب کو دیکھا۔ سنہ یاد نہیں غالباً سنہ ۲۵ء اور سنہ ۳۰ء کے دوران میں کسی سال حاجی محمد حسین صاحب یونیورسٹی کانووکیشن میں تشریف لائے تھے۔ پستہ قد گٹھا ہوا بدن اور گندمی رنگ تھا، داڑھی رکھتے تھے اور ٹخنوں تک کی نیچی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔
اسٹریچی ہال کے سامنے احباب کے جھرمٹ میں بہت جوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔
مولوی عبداللہ جان صاحب انتہا درجہ مہمان نوازی، احباب پرستی، اور مُسرفانہ خصائل کے باعث بہت کلفت زدہ ہوگئے تھے۔ اور مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم ہی کے یہاں کاظمی منزل سہارنپور میں ایک عزیز خاص کی طرح رہتے تھے۔ ذاتی اثاثہ اور متعلقین ختم ہو چکے تھے۔ سپید بہت نیچی داڑھی، بلند قامت، گورا رنگ، نورانی چہرہ، اور ضعیف العمری کے باوجود نہایت وجیہہ، پُر وقار شخصیت کے مالک تھے، ہر قسم کی معلومات اور قابلیت کا مجسمہ تھے، مولانا صاحب ہی کے یہاں سنہ ۴۲ء یا سنہ ۴۳ء میں ہمیں اُنکی زیارت نصیب ہوئی۔ مرحوم کے اور مرحوم کے نام خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب بلگرامی (علیگڑھ) کے پاس محفوظ ہے
جناب حاجی مولوی ابوالحسن صاحب غازی پوری سابق ڈائرکٹر تعلیمات ریاست کشمیر کے پاس بھی بوجہ تعلقات خصوصی مولوی عبداللہ جان صاحب کے بہت سے خطوط تھے جو موصوف نے قاضی صاحب کے ذریعہ حبیب ایرا دکردئے ہیں۔ غالباً یہ مجموعۂ خطوط کتابی شکل میں مرتب ہو کر شائع ہوگا اور اس سے

انیسویں صدی کی رُبع آخر اور بیسویں صدی عیسوی کی رُبع اوّل کے سیاسی اور معاشرتی پر بہت کچھ روشنی پڑے گی۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ط

سیّد الطاف علی بریلوی

انٹرنیشنل ٹرین ڈی لوپ
۱۱ر ستمبر ۱۹۰۷ء

مائی ڈیر مولوی صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج عالی۔

جب سے میں آپ سے رخصت ہوکر یورپ کی طرف روانہ ہوا۔ آپ کو بہت ہی کم خط لکھنے ملا۔ اور سارا وقت ایک ہی سلسل مشغولیت میں گزرا۔ کل ۸ بجے شام کو وناڈی واسٹک سے اس ٹرین میں سوار ہوا ہوں اور گیارہ دن کا ماسکو تک متواتر سفر ریل ہے۔ اس لئے ذرا دم لینے کی فرصت ملی اور جی چاہا کر آپ کو مختصراً اپنے چھوٹے سے سفر کا کچھ حال سُناکر بہت سا نہیں تو تھوڑا ہی سا اپنے سفر کے لطف میں شریک کروں۔ کلکتہ تک کی حالت سے تو آپ واقف ہیں اور ممکن ہے بہت کچھ آپ بھی دیکھ چکے ہوں۔ مگر میں اپنے سفر کو کلکتہ سے شروع کرتا ہوں۔

۲ر جولائی کو میں، ڈاکٹر دل جنگ مع مسز دل جنگ اور مس دل جنگ کے B.I. کے جہاز "لنڈولا" میں رنگون کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلی دن تو ہگلی کے کناروں کی خوشنما سیر میں بسر ہوا دوسرے دن خوب بارش رہی۔ اور کسی قدر طلاطم۔ تیسرا دن بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ چوتھے دن رنگون پہنچ گئے۔ جہاز کنارے لگایا گیا اور ہم لوگ اُترے۔ یہاں کے سب سے اچھے ہوٹل میں جو دریا کنارے ہے۔ فروکش ہوئے۔ یہاں ہمارے دوست علی حارث صاحب (جو کئی برس ہوئے میرے ساتھ آپ کے مہمان ہوئے تھے) ملے اور انھوں نے رنگون کی خوب سیر کرائی۔ اور اچھی طرح رنگون کے اندرونی اور ظاہری حالات سے واقفیت پیدا کی۔ یہاں سے ۸ر جولائی کو روانگی کا قصد تھا مگر اس ہفتہ کا B.I. کا جہاز جو "پینانگ" اور "سنگاپور" اُس کا جانا منسوخ ہوگیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو جہاز اس ہفتہ روانہ ہونے والا تھا وہ طوفان کھاکر کسی قدر بےکار ہوگیا تھا۔

الغرض ایک ہفتہ اور "برہما" میں ٹھیرنا پڑا۔ ہم نے بھی چاہا کہ اس کو ضائع نہ کریں۔ رنگون تو دیکھ ہی چکے تھے۔ "مانڈلے" کی سیر کا قصد کیا وہاں پہونچے۔ وہاں کی بھی خوب سیر کی۔ بہت بڑا شہر ہے۔ سڑکیں

ہیں کہ گھنٹوں گاڑی میں چلے جائیے کہیں ختم ہی نہیں ہوتیں مگر بالکل ویران۔ اس پر بھی لکھنؤ اور دلّی کی سی مردگی برستی ہے۔ بادشاہ تھیبا کا پیلس رور وکرانی جان کھو رہا ہے۔ اور کچھ سالوں میں اپنے تئیں مٹا لیگا بالکل عیسائیوں کے احاطے میں ہے۔ یہاں ایک "مارکٹ" نہایت عمدہ ہے۔ اور اس میں دوکان دار اکثر برہمی جمال ہیں۔ برہما میں سارے کام عورتیں کرتی ہیں۔ اور مرد صرف کھانا اور آرام کرنا جانتے ہیں۔ ہاں رنگون کے شہر کی کیفیت میں چھوڑ گیا۔ رنگون بالکل نئی وضع کا شہر ہے۔ سڑکیں نہایت صاف کلکتہ اور بمبئی کی سڑکوں سے اچھی۔ گاڑیاں نہایت نفیس۔ گھوڑے نہایت خوب صورت۔ مکان اور بازار نہایت شان دار۔ یہاں اور مانڈلے میں دونوں جگہ دکان دار اکثر ہندوستانی ہیں۔ صرف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہر چیز کی ہیں اور ان پر مرد کم نظر آتے ہیں۔ مانڈلے میں بھی اتنا وقت نہیں بسر ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہاں "مانڈلے" سے اور آگے ایک بے مثل پل بنایا گیا ہے جس پر سے ریل گزرتی ہے۔ اس کے دیکھنے کو چلے گئے۔

یہ پل بہت لمبا ہے اور دو سَو فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ اور سب سے زیادہ وصف یہ ہے کہ اس کے کھمبے وغیرہ سب لوہے کے ہیں اور یہ پہاڑ کے ایک درّہ میں واقع ہے جس درّے میں ایک دریا آکر ٹھیک اس پل کے نیچے پہاڑ میں غائب ہو جاتا ہے اور پل کی دوسری طرف کئی گز پر پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے چل کر وہ پہاڑ دیکھا جہاں یہاں کا گورنر گرمی میں رہتا ہے اس کا نام "میمیو" ہے۔ یہ ایک معمولی پہاڑی اسٹیشن ہے۔ "مانڈلے" اور "رنگون" کے اور عجائبات میں یہاں بدھوں کے پگوڈا قابل بیان ہیں۔ سب سے بڑا پگوڈا رنگون میں ہے اور عجیب نقاشی اور صناعی برمیوں نے اس پر صرف کی ہے۔ برہما کی عورتیں عام طور پر زیادہ خوب صورت نہیں۔ مگر بعض بعض بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بات ان میں عجیب یہ ہے کہ سب کی سب خوش وضع۔ اور خوش خلق، خوش باش۔ اور ہمیشہ خوش۔ کسی سے یہاں ہنسی مذاق کی باتیں کیجئے۔ سوا ہنس ہنس کے جواب دینے کے کوئی آپ سے رنجیدہ نہیں ہوگا۔ "مانڈلے" میں ایک بہت بڑی ریشمی کپڑوں کی دکان پر ہم لوگ پہونچے۔ دکان دار دو نہایت حسین عورتیں تھیں۔ ان سے کپڑا بھی خریدتے جاتے تھے۔ اور مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ اور وہ بھی نہایت خوش تھیں۔ ہمارے دوست علی عارف صاحب نے ایک سے کہا کہ یہ (میری طرف اشارہ کرکے) تم کو پسند ہیں وہ ہنس پڑی۔ اور کہا میں بڑی ممنون ہوں۔ اس کے بعد میں نے چاہا اس کا فوٹو لوں۔ فوراً اڑ گئی ہوئی۔ حیدرآباد پہنچ کر کبھی یاد آیا تو آپ کو بھی ان کی زیارت کرا دوں گا۔ غرض کہ سترہ جولائی تک نہایت لطف کے ساتھ "برہما" میں گزار کر اٹھارہ کو رنگون سے صبح چھ بجے جہاز "تارا" میں روانہ ہوئے۔ دو دن

میں "پنیانگ" پہنچے۔ یہ "اسٹریٹ سٹلمنٹ" کا پہلا شہر ہے۔ نہایت اچھا پُر فضا بندر ہے۔ شہر کے پشت پر پہاڑ ہیں اور بندر اور شہر کی سینری کو زیادہ خوشنما کر دیتے ہیں۔ یہاں سے رکشا کی سواری ہو جاتی ہے۔ گاڑیاں بہت کم ہیں اور وہ بھی اچھی نہیں۔

ہم لوگ جہاز سے اُترے اور شہر کی سیر کی۔ یہاں ایک قسم کا پھل ہوتا ہے جو کٹھل سے بہت ملتا مگر بہت چھوٹا۔ اس کو "ڈریان" کہتے ہیں اور یہاں والے اس کی اس قدر تعریف کرتے ہیں کہ اس سے بڑھکر دُنیا میں کوئی اور پھل ہی نہیں۔ مگر ہے یہ کہ اس کے کھانے کے لئے آدمی کو پہلے چینیوں اور برہمیوں کی قوتِ شامہ پیدا کرنی چاہیئے تب وہ کھا سکتا ہے۔ اِس کی بو اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہوا کے رُخ پر میلوں کی خبر لیتی ہے اور پیرانی سنڈاسوں کا عطر نکالا جائے تو بھی شاید اِس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ سارا "ڈریان" کی بُو سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں والے "ڈریان" کے مغز کو کھاتے ہیں اور اس کے چھلکے کا اچار بناتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کے قابل ایک "بوٹانیکل گارڈن" اور "آبشار" ہے۔ چند ہوٹل اور بنگلے بھی یہاں ہیں۔ شہر دیکھ بھال کر پھر جہاز پر واپس گئے اور اگلے دن سنگاپور کے لئے روانہ ہوگئے۔

سنگاپور کا "بندر" نہایت عمدہ "بندر" ہے اور یہاں دس لاکھ پونڈ کے صرف سے ایک نیا "ڈاک" بن رہا ہے۔ اس کے تیار ہو جانے کے بعد سارے شرق میں یہ "بندر" لاثانی ہو جائے گا۔ سنگاپور بمبئی کی طرح ایک جزیرہ ہے۔ بہت سرسبز۔ اور باوجودیکہ خطِ استوا سے بہت قریب ہے۔ یہاں گرمی اس قدر نہ تھی۔ شب کو کمرہ میں سوئے اور صبح کے قریب بالکل دولائی کی سردی تھی۔ بارش یہاں بہت ہوتی ہے اور یہی اس کو ٹھنڈا رکھتی ہے۔ یہاں سید عمر صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ یہ صاحب عرب ہیں اور میرے خود کے دوست ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے اس جزیرے میں اس قدر مملکت پیدا کر لی ہے کہ یہاں کے پرنس سمجھے جاتے ہیں۔ دو دن یہاں رہنا ہوا۔ شہر یہ بھی بالکل یورپین وضع کا ہے اور چونکہ "فری پورٹ" ہے تجارت کا "سنٹر" ہے یہاں "الفریڈ تھیٹریکل کمپنی" بمبئی والی موجود تھی۔ رات کو اس کا تماشہ دیکھا اور نہایت اچھے دو دن گزار کر ۲ جولائی کو ایک جرمن "میل اسٹیمر" میں سوار ہو کر راہی "ہانگ کانگ" ہوئے۔ چار دن میں ہانگ کانگ پہونچے۔

جرمن جہاز میں یہ میرا پہلا سفر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جرمن آج کل سب سے بڑھ گئے۔ کسی ملک کے جہاز میں یہ آسائشیں نہیں جو اِس میں موجود۔ اور تو اور آپ کے میلے کپڑے بھی روز کے روز دُھلتے جائیں۔ صبح سے شام تک سات مرتبہ آپ کو کھانا دیں۔ اور ہضم کرنے کے لئے بڑی بڑی ڈک موجود ہیں۔ جس قدر چاہئے ورزش کیجئے۔ ٹہلئے۔ دوڑئے۔ کرکٹ کھیلئے۔ یہاں کھانوں کے وقت گھنٹہ نہیں بجایا جا

بلکہ گل بجتا ہے اور چائے اور ڈنر کے وقت بینڈ بجتا ہے اور جب نکلتا ہے تو بینڈ بجاتا ہوا۔ ہر کیبن میں بجلی کی روشنی اور پنکھا اور نل۔ نوکر نہایت با ادب باسلیقہ اور حاضر باش۔ غرض کہ ہانگ کانگ میں اترے۔ یہ ایک عجیب قسم کا "بندر" ہے۔ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ بالکل ایک جھیل کی سی شکل۔ اصل میں ہانگ کانگ ایک جزیرہ ہے۔ "بندر" کے ایک طرف یہ واقع ہے اور دوسری طرف اس کنارہ جو چین کی زمین سے متصل ہے۔ "ہانگ کانگ" کی آبادی بالکل یورپین اور عمارتیں نہایت ہی بڑی۔ "الیکٹرک ٹریموے" پہاڑ کی چوٹی تک موجود۔ پہاڑ پر چڑھتی ہوئی آبادی نہایت خوش نما۔ دوسری طرف چینی شہر پرانی وضع کا۔ میلے چھوٹے مکانات اور بد وضع۔ دونوں شہروں کے درمیان ۱۰۔۱۵ منٹ پر "اسٹیم لانچ" آتی جاتی رہتی ہیں۔ اور اس طرح دونوں کو ایک کر رکھا ہے۔ ٹامس کک نے جس نے دنیا بھر میں سیاحوں کی آرام رسانی کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ یہاں بھی آفس کھول رکھا ہے۔ اس کے آفس میں پہونچے اور یہاں کی سیر میں اس سے بہت مدد ملی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ٹریموے سے جا کر ایک ہوٹل ملتا ہے یہاں آرام کیجئے اور اس جزیرہ کے اطراف کی سیر کیجئے اور لطف اٹھائیے۔

اگلے دن یہاں سے روانہ ہو کر اگست کی تیسری کو "شنگھائی" پہونچے۔ یہاں جہاز تقریباً ایک دن دریا میں چل آتا ہے۔ اور شہر سے ۱۸ میل پر (بڑا جہاز) ٹھیر جاتا ہے۔ یہاں سے شہر تک "اسٹیم لانچ" مسافروں کو لاتی لے جاتی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ مسافت طے ہوتی ہے۔ یہاں میں تنہا اترا اور "شنگھائی" پہونچا۔ چونکہ یہاں ترجمان کی ضرورت ہے لہذا سیدھا "ایسٹر ہاؤس ہوٹل" میں پہونچا۔ یہاں ایک کمرہ لیا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ ٹفن کھایا۔ گاڑی منگائی اور ایک گائڈ لیا اور چل دئے پھرنے کو۔ پہلے پرانا چینی شہر دیکھا۔ بہت بڑا شہر ہے۔ مگر بنارس کی سی گلیاں، دکانیں مختلف تجارتی اموال سے پر۔ تاجر سب چینی۔ اکثر میلے۔ نالیاں سڑی ہوئی۔ پہلے تو تین گھنٹہ پیدل پھر کر شہر دیکھا۔ پھر یہاں کے "مندر" دیکھے۔ بعض بدھ کے اور بعض اور دیوتاؤں کے جو ان لوگوں نے خود پیدا کر لئے ہیں۔ جن کو نہ "بدھزم" نہ "کنفیوشزم" سے کچھ واسطہ ہے۔ ان دیوتاؤں میں سے کوئی پانی کا مالک ہے کوئی سمندر کا کوئی موت کا۔ کوئی زندگی کا۔ غرض ایسے ہی مہملات سب ہیں۔

چینیوں کا قبرستان دیکھا یہ ایک نہایت عمدہ چیز ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جیسے پرانے زمانہ میں مصر وغیرہ میں ہوا کرتے تھے جن کو "کیٹاکومبز" کہتے ہیں وہ زمین کے اندر ہوا کرتی تھیں۔ یہ سطح زمین پر ہیں۔ لاش ایک صندوق میں رکھی جاتی ہے اور اسباغ کرنے کے بعد ایک کوٹھری میں رکھ دی جاتی ہے۔ لاش کے وارث نسلاً بعد نسلاً ۲۰۔۲۰ ڈالر ہوار

اس کا کرایہ بھرا کرتے ہیں۔ چینیوں میں بھی بہت سی ذاتیں ہیں اور اس لحاظ سے بہت سے قبرستان بھی ہیں جو لوگ غریب ہیں وہ زمین میں دفن کئے جاتے ہیں۔

یہاں کا جیل دیکھا جہاں کچھ پرانی وضع کے قیدی جو لکڑیوں میں بندھے ہوئے، کسی کی گردن شکنجہ میں کسی ہوئی مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا۔ اور دوسری قسم کا جیل بھی ہے جو نئے سسٹم کے موافق بنا ہوا ہے۔ یہاں کے گورنر کا دربار روم دیکھا۔ دربار روم کیا چنڈو خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک گڑھیا اس کے سامنے ہے جس کے پانی پر سبز کائی جمی ہوئی ہے۔ گائڈ نے کہا کہ نہایت عمدہ باغ ہے مجھے سخت تعجب ہوا کیونکہ گڑھیا کے کنارے صرف تین چار ہی درخت تھے۔ کمرہ کو دکھلانے کے بعد ایک تنگ سے راستہ سے گائڈ دوسری طرف لے چلا۔ راستہ بالکل پہاڑی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ چڑھنے اترنے کے بعد کچھ درخت نظر آئے۔ اور ایک کمرہ۔ غرض اسی طرح کے بہت سے سین اس باغ میں ہیں اور ایک لحاظ سے واقعی یہ باغ نہایت عجیب ہے کہ چینیوں نے جو قدرتی طور پر نیچر کے فریفتہ ہیں شہر کے اندر۔ ایک پہاڑی باغ اس طرح کا بنا دیا ہے کہ اس کے اندر کے رہنے والے کو کبھی نہ معلوم ہو کہ وہ میدان میں ہے اور شہر میں۔ یہاں سے نکل کر "چینی چائے گھر" جس کو عام لوگ استعمال کرتے ہیں دیکھا اس مکان میں جو نہایت کثیف ہے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی ہیں اور بیٹھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی تپائیاں۔ لوگ یہاں آکر چائے پیتے ہیں گپ لگاتے ہیں۔ اخبار خوانی کرتے ہیں۔ اور بعض بعض کچھ ناشتہ بھی۔ دو منزلہ مکان ہے۔ اوپر جانے کی سیڑھی اس قدر تنگ کہ ہندوستان کا ایک بونا بھی اوپر نہ پہونچ سکے۔ نتیجہ یہ کہ چینی موٹے نہیں ہوتے۔ یہاں سے واپس ہو کر اپنی گاڑی پر سوار ہو کر ایک اور چائے خانہ میں جو ایک محفوظ بڑے باغ میں واقع ہے اور یہ باغ بھی ایک پہاڑی وضع کا بنایا ہوا ہے۔ پہونچے۔ یہ چائے خانہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہے۔ یہاں ایک پیالی چاء کے لئے آدھا ڈالر یعنی ۱۲ ار دینے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد نئی شنگھائی کی سیر کی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ "شنگھائی" میں انگلش، فرنچ، جرمن، امریکن، نوآبادیاں ہیں اور ہر ایک کو اپنی نوآبادی میں اپنے قوانین کے موافق اختیارات حاصل ہیں اس لئے ہر ایک گویا ایک مستقل شہر ہے یہ حصہ نہایت پرفضا، سڑکیں بالکل یورپ کی سی۔ مکانات بڑے عالی شان، بڑے ڈبل ڈبل ہوٹل دکانیں یورپ کی دکانوں سے مقابلہ کرنے والی۔ دکان دار اکثر غیر ملکی۔ مگر ان نوآبادیوں کو دیکھ کر چینیوں نے بھی اس کے متصل ایک نیا شہر آباد کیا ہے وہ اس سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ یہاں جاپانی دکاندار بہت موجود ہیں جو ہر طرح یورپین تاجروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ بازاروں کی سیر کے بعد گائڈ صاحب نے

فرمایا کہ یہاں گرس ہاؤسس بھی اچھے اچھے ہیں۔ ہم نے بھی سمجھا۔ ع

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اور کہا بہتر دکھائیے۔ یہ ہم کو ہدایت کرکے وہاں تک لے گئے یہاں چینی حوریں دیکھیں جو واقعی بہت خوبصورت اور قابل قدر خوبصورت کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے ان کے چھ چھ انچ کے پیر بھی برے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خیر چند ایسے مکانوں کی سیر کرکے پیر مغاں صاحب ہم کو ایک ایسے "چائے خانہ" میں لے پہنچے جس کی یہاں کے بڑے لوگ سرپرستی کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سہ منزلہ مکان ہے۔ صاف، ستھرا۔ میزیں عمدہ، نوکر پاکیزہ۔ ہر قسم کے نقل اور پینے کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ علاوہ اس کے شام کے قریب یہاں سینکڑوں پری جمالوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ باوجودیکہ ایک پیالی چار اور نقل کا یہاں ایک ڈالر دینا پڑتا ہے مگر وہ کتنے ہی ایسے ڈالر نکال لیتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بغرض تفریح یہاں آتے ہیں اور چلتے ہوئے اگر جی چاہا تو کسی کو گاڑی میں بٹھا ساتھ لے گئے۔ بندہ نے بھی یہ سمجھا کہ من عاشر القوم فھو منھم۔ چلتے ہوئے ایک حور کو گاڑی میں لے آیا۔ ایک ہوٹل میں پہونچے۔ جو خاص ہوٹلوں میں سے ہے۔ اور یہاں چند گھنٹے دنیا کا غم غلط کیا۔ اب ڈنر کا وقت تھا ان کو لئے ہوئے ایک فرسٹ کلاس رسٹورینٹ میں پہونچے۔ کھانا کھا کر ایک چینی تھیٹر دیکھنے گئے۔ چینی تھیٹر سے خدا کی پناہ۔ بیسیوں ڈھول۔ گھنٹے پر اکتفا نہ کرکے ڈنڈے بھی بجاتے ہیں۔ اور گانا تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت دردناک دھاڑیں مار مار کر منھ بنا بنا کر روتے ہیں اور کم بخت نازک نفیس نفیس صورتوں کو بھتنوں کا سوانگ بھرا کر سارے سین کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ خدا جانے ان کو اس میں کیا لطف آتا ہے۔ آدھے گھنٹہ سے زیادہ نہیں بیٹھا گیا۔ اور بھاگے ہماری ساتھی اسٹیم لانچ تک پہونچانے آئیں اور وہاں سے انھیں خدا حافظ کہہ کے ہم اپنے اسٹیمر پر پہونچے۔

شنگھائی میں دو دن ٹھیر کر ہمارا اسٹیمر ناگاساکا کے لئے روانہ ہوا۔ اگلے دن ناگاساکا پہونچے یہ جاپان کا پہلا بندر ہے۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ یہاں کی خدائی ہی نرالی ہے۔ بندر میں داخل ہونے سے پہلے ہزاروں کشتیاں ملیں۔ بیرونی بندر میں جہاز نے لنگر کیا۔ تین جاپانی ڈاکٹر صاحب آئے۔ عملہ جہاز اور مسافروں کا معائنہ ہوا۔ اس کے بعد جہاز کو اندرونی بندر میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ جاپانی پائلٹ نے جہاز کی کمان لی اور جہاز کو اندرونی ہاربر میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یہاں کتنی ہی اسٹیم لانچیز جو ہوٹلوں کی ہیں آپہونچیں۔ اور ہوٹلوں کے ایجنٹ اپنے اپنے کارڈ تقسیم کرکرکے لوگوں کو اپنی اپنی طرف مائل کرنے لگے۔ انگریزی۔ جرمنی۔ فرنچ فرّاٹے کے ساتھ بولتے ہیں۔ چونکہ ہم نے ٹکٹ یکوہامہ تک کے لے رکھے تھے۔ ہوٹل میں ٹھیرنے کی تو ہم کو ضرورت نہ تھی۔ مگر شہر کی سیر کے

لئے ایک گائڈ لیا اور سب اُترے اور سارے شہر کی سیر کی۔ عجیب لطف آیا۔ سارا شہر یورپین اسٹائل کا صاف ستھرا۔ دُکانیں نہایت آراستہ۔ چیزیں نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی۔ لوگ بہت صاف اور پاکیزہ مگر یوروپین نہیں۔ بلکہ ایشیائی۔

خدا کی خدائی یاد آتی تھی اور کہتے تھے کہ خدایا کبھی ہم لوگوں کی بھی یہ حالت ہوگی۔ مگر جواب ملا کہ "ہنوز دلی دور است"۔ پہلا تاثر جاپانیوں کا بہت اچھا ہوا۔ اور آخر تک وہ قوی ہوتا گیا۔ یہاں شب کو تھیٹر دیکھا۔ اسٹیج کے سین بدلنے کے لئے پردے گرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سین ختم ہوا اور اسٹیج گھوم گیا۔ دوسرا سین جو پہلے سے تیار رکھا سامنے آگیا۔ "ناگاساکے" کی اچھی طرح سیر کر کے اسٹیمر پر واپس گئے۔ اگلے دن اسٹیمر یہاں سے چل کر "کوبے" پہنچا۔ یہ "ناگاساکے" سے بہت بڑا پورٹ ہے۔ یہاں بھی ایک گائڈ لیا اور "میکاڈو ہوسٹل" پہنچے۔ یہ ایک جاپانی ہوٹل ہے۔ مگر عمدہ سے عمدہ انگریزی ہوٹل کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہاں دو روز تک سیر کی۔ یہاں سے چل کر "یکوہامہ" پہونچے۔

یہ سب سے زیادہ اہم جاپانی "بندر" ہے اور پایۂ تخت "ٹوکیو" سے صرف ۴۵ منٹ کا راستہ ہے اور سچ پوچھئے تو یوں کہئے کہ "ٹوکیو" کا سُبرب ہے۔ "یکوہامہ" اور "ٹوکیو" کے درمیان ۱۸ میل کی مسافت ہے۔ مگر مسلسل آبادی چلی گئی ہے۔ آدھے آدھے گھنٹہ میں ٹرین اور الکٹرک ٹریم روانہ ہوتے ہیں۔ اور ہزاروں آدمی برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ "یکوہامہ" کی آبادی تین لاکھ سے کچھ اوپر ہے اور "ٹوکیو" کی ۱۸ لاکھ سے کچھ اوپر۔ مگر "ٹوکیو" وسعت میں کلکتہ سے چھ گنا ہوگا۔ ایک ایک بازار گھنٹوں کی مسافت۔ یہاں سے جاپانیوں کی بہشت یا کشمیر کہئے جس کا نام "نکو" ہے گئے۔ اس کے بعد کئی اور شہر دیکھے۔ غرض کہ پورا ایک مہینہ جاپان میں بسر کیا اور خوب دیکھا۔ یہاں کے حالات تفصیلاً بیان کرنے کے لئے تو ایک کتاب چاہئے مگر مختصراً لکھنے کے لئے میں اس کے حالات کو مختلف ہیڈنگس میں تقسیم کرتا ہوں۔ اور جو کچھ میں نے سمجھا اور دیکھا وہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ زمین سارے کا سارا "جاپان" پہاڑوں اور وادیوں سے بنا ہوا ہے۔ پہاڑ بہت بلند نہیں مگر دو تین ہزار فٹ بلندی کے اکثر۔ سب سے اونچا پہاڑ فیوجی ہے اس کی بلندی بارہ ہزار فیٹ ہے۔ پانی کی یہ کیفیت ہے بحر ہی تحتہا الانہٰر گویا "جاپان" کی شان میں ہے۔ سارے ملک میں کوئی جگہ غیر شاداب نہیں دیکھی اور شاداب سے منشا۔ ایسی شادابی ہے جیسے برسات کے زمانہ میں "دہرہ دون" وغیرہ میں آپ نے دیکھی ہوگی۔ سارے ملک میں ایک چپہ زمین غیر مزروع نہیں اور زراعت بھی نہایت سائنٹفک اصول پر۔ غلّوں میں چاول سب سے زیادہ۔ مکئی بھی دیکھی اور بھٹے کھائے۔

جوار بھی دیکھی۔ گیہوں۔ جو۔ جیمی۔ ساںواں۔ کودوں۔ مٹر۔ سیم۔ لوبیا مختلف قسم کا اور چند قسم کی پھلیاں جو ہندوستان میں نہیں دیکھیں یہاں ہوتی ہیں۔ ترکاری ہر قسم کی اور پھلوں میں انگور (مگر اچھا نہیں) سیب عمدہ، ناشپاتی نہایت عمدہ، شفتالو نہایت عمدہ۔ زردآلو۔ آلو بخارا۔ انار سب موجود ہیں۔ کیلا یہاں نہیں ہوتا۔ مگر "فارموس" سے آتا ہے۔ لیچی اور اور جیسے فروٹس "چین" سے آتے ہیں۔ روئی بہت کم ہاں شہتوت بہت۔ اور ریشم کی بہت کثرت۔ چیڑ۔ دیار وغیرہ کے درخت بہت کثرت سے اور لکڑی کی افراط۔ بانس بہت۔ پہاڑوں کی سبزی ہندوستان کے پہاڑوں کی سی، صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں پہاڑوں میں پھول کم ہیں اور پھل دار درخت خودرو تقریباً نادارد۔ چیری یہاں کے نیشنل درختوں میں سمجھا جاتا ہے۔ اور جب چیری پھول لاتا ہے تو گویا یہاں عام "عید" ہوتی ہے۔ دریا بہت مگر بہت بڑے نہیں۔ گومتی جیسے اور اس سے کچھ بڑے۔ اور کچھ چھوٹے۔ شمالی حصہ میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔

۲۔ آب و ہوا معتدل۔ آج کل سوا بلند پہاڑیوں اور شمالی حصہ کے اکثر جگہ گرمی ہے اور بعض جگہ تو اچھی خاصی ہندوستان کی سی گرمی۔ ان مقامات میں ٹمپریچر تقریباً ۹۰ درجہ فارن ہائٹ ہوتا ہے مگر شب کو مکانوں کے اندر کھڑکیاں کھول کر بے تکلف سو سکتے ہیں۔ دھوپ خوب گرم ہوتی ہے۔ اور بے چھاتے کے کام نہیں چلتا۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ سردی کے زمانہ میں شمالی حصہ میں بہت زیادہ مگر جنوبی حصہ میں بھی برف پڑتا ہے۔ اور کئی مہینے یہ کیفیت رہتی ہے۔ اکثر طوفان بھی آتے ہیں۔

۳۔ آدمی پست اور میانہ قد منگولین ٹائپ مگر بدصورت نہیں۔ اور عورتوں میں ہم لوگوں کی خوبصورتی کے معیار کے موافق تقریباً سو میں دس خوبصورت۔ اور پندرہ سے بیس فیصدی متوسط باقی گرے ہوئے۔ رنگ گورا۔

۴۔ وضع عورت، مرد سب ایک قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ ڈھیلے چوغے خاص وضع کے اور کمر بندھی ہوئی اور پیروں میں کھڑاؤں۔ اور بہت اونچے کھڑاؤں بعض بعض چار انچ اونچے اور کھڑاؤں پہن کر اس بے تکلفی سے دوڑتے پھرتے ہیں جیسے ہم لوگ ننگے پاؤں یا بوٹ یا جوتے پہن کر۔ کپڑے نہایت سادے رنگوں کے پہنتے ہیں، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتیں زیور بالکل نہیں پہنتیں، ساری آرائش ان کے بالوں میں ہے۔ بال نہایت صاف رکھے جاتے ہیں۔ اور باندھے جاتے ہیں اور خاص طرح کے سر پر گویا ایک تاج معلوم ہوتا ہے اور اکثر بالوں میں خوشبودار تیل لگاتی ہیں اور پھول بھی رکھتی ہیں، مگر یہ جو پٹکا باندھا جاتا ہے وہ پشت کی طرف خاص طور پر ٹائی کی طرح ایک بڑے

ٹاٹ میں باندھا جاتا ہے مگر بعض لڑکیاں بیس بائیس برس کی عمر تک کی ایک گون کی صورت کی جبہ کے اوپر پہن لیتی ہیں اور بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مرد اکثر یوروپین کپڑے پہننے لگے ہیں اور سب پہنتے ہیں۔ اعلیٰ سے ادنیٰ تک۔ بقول ڈاکٹر دل جنگ سنگھ اس ملک میں تہذیب تمرکی طرف سے شروع ہوئی ہے اور ہمارے ہندوستان میں بیر کی طرف سے۔ مگر مرد جو کوٹ پتلون۔ ہیں گھروں میں وہ بھی اپنے دیسی لباس کو پسند کرتے ہیں۔ موزے ایک خاص قسم کے کے بنائے جاتے ہیں جن میں انگوٹھا الگ رہتا ہے۔ سب پہنتے ہیں ادنیٰ اور اعلیٰ۔ مزدور قلی بھی بے موزے نہیں دیکھئے گا۔

پنکھے کا بہت استعمال ہے تقریباً ہر ایک کے ہاتھ میں گرمیوں میں پنکھا رہتا ہے۔ چھاتے کے لئے اکثر یوروپین وضع کے اور بارش کے لئے اپنی وضع کے جیسے برہما والے بھی استعمال کرتے مگر یہاں اکثر واٹر پروف کاغذ کے بناتے ہیں۔ مردوں میں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں بوٹ کا بھی زیادہ ہے مگر گھروں میں وہی اپنے موزے اور کھڑاؤں اور عورتیں بھی جو کالجوں اور اسکولوں میں جاتی ہیں بوٹ پہننے لگی ہیں۔ ہاں مرد جو اپنی دیسی وضع میں رہتے ہیں وہ بجائے پائجامہ کے نہایت چھوٹا سا جانگیہ یا لنگوٹ پہنتے ہیں اس کے اوپر ایک سفید چغہ اس کے اوپر ایک سیاہ کمربند۔ اور عورتیں اکثر ایک سرخ تہبند باندھتی ہیں اس کے اوپر دو چغے۔ اور کمربند۔ یا ایک اور ایک گون (جاپانی) لوگ نہایت خلیق اور با ادب۔ خلق اور ادب گویا ان کی فطرت ثانیہ ہیں۔ تواضع تکریم لکھنؤ والوں کی ان کے سامنے ہیچ ہے یہاں نماز کے سارے ارکان معمولی تو میں ختم ہو جاتے ہیں۔ نہایت معمولی سلام رکوع کی حالت میں ہو کر کیا جاتا ہے۔ (سوا فوجی سلام اور ہاتھ باندھ کر۔ اگر اس سے بڑھ کر تعظیم کی تو قعود کی حالت میں ہو کر آدھے سجدہ کی حالت پیدا کر لی اور بڑھے تو بالکل سجدہ کر لیا۔ اور ہاتھ پیشانی کے نیچے رکھ لئے۔ اور یہ عام طور پر تواضع کی رسم ہے۔ کوئی عورت یا مرد ایک دوسرے کو بے تعظیم دیئے ہوئے ملاقات نہیں کرتا۔

۵۔ عادات سوا ایک علت کے کہ پاخانہ پھر کر آب دست نہیں لیتے اور کاغذ کی صفائی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مگر باہر نکل کر ہاتھ ضرور دھو لیتے ہیں۔ پیشاب کرنے کے بعد بھی یہی حالت اور ہر طرح سے نہایت صاف۔ روز غسل کرتے ہیں۔ اور بہت مل دل کر ہر ایک برش سے درست ہوتا ہے اور دن میں کئی مرتبہ رومال بھگو کر منہ اور گردن صاف کرتا ہے۔ کھانا چینیوں کی طرح دو لکڑیوں سے کھاتے ہیں۔ کھانا ان کا اکثر بسیندا ہوتا ہے۔ اور کچا۔ کچی مچھلی نہایت ذائقے سے کھائی جاتی

دن بسر کریں بھاگ کر۔ مکانات دو منزلہ سے زیادہ بلند بہت کم ہوتے ہیں اور فرنیچر بہت کم اور صاف انتہا سے زیادہ۔ مکانوں میں باریک گھاس کے چٹائی کے بنے ہوئے گدیلے بچھے ہوتے ہیں اور بہت ہلکے کاغذ منڈھے ہوئے فریموں کے پارٹیشن ہوتے ہیں جو اوپر نیچے کے خانوں میں ادھر ادھر کھسک سکتے ہیں۔ جب چاہا اس طرح دو کمروں کو ایک کر لیا۔ اور جب چاہا دو۔ بلکہ یوں کہئے کہ اکثر مکانوں میں سارا گھر ایک کمرہ بھی بن سکتا ہے اور متعدد کمرے بھی۔ سبزہ اور پھول کے عاشق ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جس میں چند گملے جن میں چھوٹے چھوٹے خوشنما پودے نہ رکھے ہوں اور ہر دوسرے تیسرے دن گلدستے نہ بدلے جاتے ہوں۔ سبز چائے خاص قسم کی جو جاپان میں بوئی جاتی ہے نہایت ہلکے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں بے دودھ اور شکر کی بہت استعمال ہوتی ہے۔ کسی کے گھر جائیے تو تواضع یہ ہوگی۔ سب سے پہلے آپ کے داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا خاص قسم کا ٹرے لاکر رکھا جائے گا اس میں ایک چھوٹے سے چینی کے برتن میں انگارے راکھ میں دبے ہوئے نہایت نفاست سے رکھتے ہیں اور ایک چھوٹی سی موٹی بانس کی پور جو ایک طرف سے بند اور ایک طرف سے کھلی ہوتی ہے رکھی ہوگی۔ آگ آپ کے سگرٹ یا پائپ سلگانے کے لئے اور دوسری چیز اس کی راکھ جھاڑنے کے لئے یا تھوکنے کو۔ سگریٹ آپ اپنے بجئے گھر سے نہیں ملیں گے۔ اس کے بعد فوراً چا ر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک رکابی میں کسی قسم کا چاول کا بنا ہوا یہاں کا کیک کم سے کم ایک کیک جو بسکٹ کے برابر ہوگا آپ کو کھانا ہوگا اور چائے کی بھی پیالیاں پینا ہوں گی۔ بعض جگہ جہاں آپ کی زیادہ خاطر منظور ہے وہاں آپ کو کسی قسم کا موسمی فروٹ بھی ملے گا اور صاحب خانہ خود چھیل کر اور کاٹ کر آپ کو دے گا۔ یہاں چونکہ پردے کو کوئی نہیں جانتا اس لئے عورتیں برابر ملاقاتوں میں حاضر رہتی ہیں اور اکثر خاطر تواضع میں وہی زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ بعض بعض عادات یورپ والوں سے ملتی ہوئی ہیں۔

مثلاً بندہ ایک مس صاحبہ سے ملنے کو گیا جو ٹوکیو یونیورسٹی کی گریجوئٹ ہیں اور ایک اخبار کی اڈیٹر بھی۔ بے تکلف یورپین لیڈیز کی طرح وہ ملیں اور خاطر تواضع میں سرگرم رہیں اور ان کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دوسرے کمرہ میں بیٹھے رہے۔ جب تک مس صاحبہ نے خود اپنی والدہ کو بلا کر تعارف نہیں کیا وہ کمرے میں نہیں آئیں۔ شرم و حیا بہت کم ہے۔ اب تک دیہاتوں میں اور قصبوں میں مرد عورت سب ایک جگہ بالکل برہنہ ہوکر نہاتے ہیں اور کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اب یورپین اور اور جانب سے خلط ملط ہونے سے اس بات کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ اور شہروں میں یہ چیز بالکل نہیں نظر آتی۔ عورتوں سے اس قسم کی باتیں جو یورپ والے بھی روا نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک کنواری لڑکی سے (یہ نہیں کہ

وہ بدچلن ہو بلکہ اچھے سے اچھے گھرانے کی) اس قسم کی بات کرنا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے یا نہیں اور نہیں کیوں اب تک شادی نہیں کی۔ اور اب شادی کرو گی اور کیسے شخص سے کرو گی اور علیٰ ہٰذا القیاس کوئی عیب نہیں۔ اور لڑکی بھی آپ کو جواب دینے میں نہیں جھجھکے گی۔ شادی کی یہ حالت ہے کہ ۱۵ برس تک کی لڑکی اپنے والدین کی اجازت سے شادی کرتی ہے۔ مگر اپنی پسند سے۔ اور اس کے بعد اُس کو اختیار ہے۔ قانوناً اُس کو کوئی روک سکتا۔ جس سے چاہے وہ شادی کر سکتی ہے۔ اور شادی کے کوئی مذہبی رسم و قواعد نہیں رجسٹریشن آفس میں جا کر میاں بیوی رجسٹر کرا آئے۔ فرصت شد۔ چونکہ ذات پات چھوت چھات کا یہاں کوئی جھگڑا نہیں اس لئے ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی یا اور کسی قوم اور مذہب والے سے یہاں والیوں کو شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ عارضی شادیاں بھی اکثر ہوتی ہیں۔ کیونکہ طلاق بھی بہت آسان جب دونوں راضی ہوئے جا کر رجسٹریشن کورٹ میں لکھوا دیا کہ آج سے ہم نے اپنے تعلقات قطع کئے۔ فرصت شد۔

ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ

معلوم ہوتا ہے کہ سارے باشندے ایک خاندان کے ممبر ہیں اور میکاڈو اس خاندان کا ہیڈ ہے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ۔ بات چیت نہایت مؤدبانہ اور ہنس ہنس کر۔ ایک مہینہ جاپان میں رہا۔ مگر لڑکوں تک کو آپس میں جھگڑتے یا زور سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ پھر کہئے تو سہی روس یا اور کوئی اُن کو کس طرح نیچا دکھا سکتا ہے۔ مجھے تو بالکل شہد کی مکھیوں کی سی حالت ان کی معلوم ہوتی ہے۔ گورنمنٹ اس قدر وطن دوست کہ ظاہر ہے پچاس برس میں یہاں والوں نے کیا کر دکھایا۔ کوبے میں ایک "ڈوک" دیکھنے گیا۔ میلوں میں یہ کارخانہ ہے جہاز جو اس وقت اُس میں بن رہے تھے۔ ایک جاپانی کروزر، چھ ہزار ٹن کا، دو چینی اگن بوٹ اور ایک سات ہزار ٹن کا پسنجر اسٹیمر۔ منیجر مجھ سے اس طرح ملا کہ گویا وہ میرے سامنے ایک نہایت حقیر شخص تھا مگر سمجھئے تو سہی میری اُس کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ دس ہزار آدمی روزانہ کرتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کس قدر لوہے اور فولاد کا خرچ ہوگا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ سب "میٹیریل" جاپانی ہے اس لئے کمپنی کا ایک دوسری جگہ "اسٹیل ورک" ہے۔ وہاں سے ہر قسم کی چیزیں ڈھل اور پریس ہو کر یہاں آتی ہیں اور یہاں تعمیر جہازوں میں کام آتی ہیں۔ آدمی تو ہم لوگ بھی ویسے ہی ہیں جیسے جاپانی مگر اتفاق کہاں سے لائیں۔ اور اپنی گورنمنٹ کیسے پیدا کریں۔ واقعی ؎

دو دل یک شود بشکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

جہاں ۵ہ ملیں ایک دل ہوں تو نتیجہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا— پان آتے ہوئے جرمن جہاز پر کئی ایک انگریز بھی تھے۔ ایک دن کچھ نہایت پُر فضا سینری کا ڈاکٹر ل جنگ فاکہ کھینچ رہے تھے مگر ایک انگریز نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو کہیں کسی جاپانی نے دیکھ لیا تو ڑے جاؤ گے۔ یہاں نقشہ کھینچنے اور فوٹو لینے کی سخت ممانعت ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں ایک فد سخت مخمصہ میں پڑ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے اپنی "ڈرائنگ بک" بند کر کے رکھ دی۔ اُس کے بعد یہ بھی کہا کہ اپانی "کسٹم ہوس" والے مسافروں کی چیزوں کو نہایت سختی سے دیکھتے ہیں اور ساری چیزیں تہ و بالا ردیتے ہیں اور باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گیا کہ ابھی جاپانی تہذیب قریب ہے یہ لوگ یورپ کی نقل کرتے ں مگر بے سمجھے بوجھے۔ اوّل تجربہ تو "یکوہامہ" میں ہوا۔ "کسٹم ہاؤس" والے اس قدر شائستہ ہیں کہ ں نے کسی یورپ کے ملک میں نہیں دیکھے۔ ہمارے پاس چار بکس سگریٹ کے تھے اور سگریٹ چونکہ گورنمنٹ "مونوپلی" ہے اس لئے کوئی اس کو یہاں سوا گورنمنٹ کے نہیں لا سکتا۔ مگر یہ اجازت ہے کہ ایک آدمی ایک کھلا ہوا بکس اپنے استعمال کے لئے داخل کر سکتا ہے۔ "کسٹم" والے نے خود کہا کہ آپ لوگ چار آدمی ہیں اس لئے آپ لے جا سکتے ہیں۔ باوجودیکہ دو عورتیں تھیں۔ ہمارے ساتھ کسی یورپین ملک میں ہرگز اس کا خیال نہ ہوتا۔ اٹلی میں۔ فرانس میں۔ ٹرکی میں ایک سگار تو داخل کر نہیں سکتے۔ اس جدید تہذیب یافتہ قوم کی کیفیت ایسے ایسے کارخانوں کی موجودگی سے آپ سمجھ سکتے ہیں جیسا اوپر میں لکھ چکا ہوں۔ "ٹوکیو" کے ایام قیام میں میں کاؤنٹ اکوما سے ملا جو موجودہ جاپان کے بنانے والوں میں ے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے۔ وزارت تعلیم۔ وزارت خارجہ اور اس قسم کے بہت سے اعلےٰ عہدوں پر رہ چکا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے باتیں ہوئیں۔ میں کیا کہوں آپ سے اس قدر خلیق آدمی کم ہوتے ہیں۔ اور اُس کی معلومات کی حالت سے میں دنگ تھا۔ ہندوستان کی بابت بہت سی باتیں رہیں۔ کہنے لگا یہ ہندوستان میں آج کل کیا اُودھم مچی ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے، آپ نے ایشیا والوں کی آنکھیں کھول دیں۔! کہنے لگا مگر شور و غل سے کام نہیں چلا کرتا۔ کہنے لگا دو چیزیں ہندوستانی پیدا کر لیں پھر نہ لاٹھی کی ان کو ضرورت ہے نہ ڈنڈے کی۔ انگریز خود بخود چلتے پھرتے نظر آئیں گے اور وہ دونوں **تعلیم** اور **اتفاق** ہیں۔ کہنے لگا نہایت افسوس کا مقام ہے کہ وہ ملک جو آبادی اور زرخیزی کے لحاظ سے ساری دُنیا میں درجۂ اوّل کی طاقت ہونے کا مستحق ہے ایسی حالت میں ہو۔ ہاں ایک بات جاپانیوں میں اور عجیب ہے وہ یہ کہ یہ لوگ اس قدر آپس میں رازدار ہیں کہ جس کی دُنیا پر مثال نہیں۔ آپ اِس مُلک میں عمر بھر رہئے اور سینکڑوں جانی دوست پیدا کر لیجئے مگر کیا مجال آپ ا

ان باتوں کی خبر بھی ہو جو "قومی راز" ہیں۔ سارے جاپان میں آپ پھریے آپ کو ایک فوجی وسپاہی نہیں نظر آئے گا۔ نہ ایک جنگی جہاز۔ ایسی ایسی جگہ فوجیں رکھتے ہیں جہاں غیر ملکیوں کا گزر ہی نہیں اور جہاز بھی ایسے بندروں میں۔ مجھے خیال ہوا کہ جس قدر بنگالی پنکھے چلانے والے ہیں، اتنے ہی یہ خاموش اور کارکن۔۔ ایڈمرل الکزف جو منچوریا کا گورنر جنرل تھا اور جو باعث جنگ ہوا۔ ۲۱ برس "ٹوکیو" میں روس کا سفیر رہ چکا تھا مگر کم بخت کو ذرہ بھر خبر نہ تھی کہ جاپان کیا کر رہا ہے اور اس کی فوجی اور بحری تیاری کیا ہے۔ اگر اس کو پہلے سے یہ کیفیت معلوم ہوتی تو کیا کتے نے اسے کاٹا تھا کہ بھڑ کے چھتہ کو ہاتھ لگاتا۔

یہاں کی جیل میں گیا یورپ کی جیلوں سے اچھے۔ قیدیوں کے لئے ستھریاں بیس کے جیل میں دیکھیں اور چونکہ جوتے پہن کر کوئی کسی مکان میں داخل نہیں ہوتا، اس لئے صفائی میں تو کوئی جاپانی مرد کو مات کر ہی نہیں سکتا۔ سینکڑوں عمدہ عمدہ قیدیوں کی بنائی ہوئی بائیسکلیں دیکھیں اور بالکل ہاتھ سے بناتے ہیں مشین کا نام نہیں۔ چھاتے نہایت عمدہ ان کی تیلیاں پیچ کے لوہے کے سینخ اور ہینڈل سب ہاتھ سے اور معمولی ہاتھ کے پریس سے اس قدر جلدی بناتے ہیں کہ دیکھنا ایک تماشہ ہے۔ لکڑی کے چھلکے جو رندے میں نکلتے ہیں ان کے پتلے فیتے بنتے ہیں جیسے یورپ والے گھاس کے بناتے ہیں۔ یہیں دیکھا کہ جو جیل دیکھنے جائے اس کو جب تک وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے پینے کو چائے اور سگرٹ بھی ملے۔ لوگ یہاں کے کسی حالت میں ہوں خوش۔ کسی کو اس طرح تباہ اور غمزدہ حالت میں نہیں دیکھا جیسا اور ملکوں میں عام طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ بھیک مانگنے والے شاذ و نادر کہیں دیہات میں نظر آجاتے ہیں۔ شہر میں کہیں نہیں۔

ہاسپٹل یہاں کے دیکھے یورپ کے ہاسپٹل سے اچھے۔ لاوارث بچوں کے پرورش کے مکانات ایسے ایسے جیسے آپ کے علی گڑھ کالج کا کمپونڈ اور مکانات، ملک چھوٹا، لوگ چھوٹے مگر کام بہت بڑے۔ بڑے بڑے شہروں میں رنڈیاں ایک جگہ بلکہ ایک کپاؤنڈ میں رکھی جاتی ہیں مگر یہ کمپاؤنڈ ایسا نہ سمجھئے جیسا ہندوستان میں گوروں کی چھاؤنیوں میں ہوا کرتا ہے۔ ہر ایک ایسے کمپونڈ میں سینکڑوں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں ہوتی ہیں۔ بڑی چوڑی چوڑی سڑکیں۔ عمدہ عمدہ دکانیں۔ ہر قسم کی خورد و نوش کی چیزیں مہیا اور وہاں ہزاروں پریاں۔ "ٹوکیو" میں ایسے پانچ کمپونڈ ہیں اور ہر کمپونڈ میں تقریباً پانچ ہزار پری زاد رہتے ہیں۔ یہ کمپونڈ ہمیشہ شہر کے کناروں پر ہوتے ہیں۔ ان جگھوں کی حالت شب کو دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ پریاں گھر سے نہیں نکلتیں۔ خریدار گھر گھر پھرتے ہیں۔ رنڈی کی خرچی اور اس کے گھر میں خلط

وافع کے بل ہوٹلوں میں آتے ہوئے ہم نے جاپان ہی میں دیکھا۔ جہاں جی چاہے جائیے۔ جو جی چاہے
کھائیے پیجئے۔ رات بسر کیجئے۔ اپنا کارڈ اور ہوٹل کا پتہ دے کر چلے آئیے۔ بل دوسرے دن آپ کے
پاس آجائے گا۔ اور آپ نہ ملے تو ہوٹل والا ادا کر کے آپ کے اکاؤنٹ میں رکھ دے گا۔ واللہ ترقی ہو
تو یہاں تک ورنہ ہیچ۔ پیرس کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی اور خوش معاملگی اور اعتبار کا درجہ
خیال کرنے کے قابل ہے۔

یہاں کے کارخانوں میں گیا۔ دست کاری میں دنیا میں کوئی فیشن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
آپ کو سخت تعجب ہوگا میں نے لکڑی کی ایک طشتری خریدی ہے جو چار انچ لمبی چوڑی ہے اور وزن
میں ایک تولہ سے یقینی کم ہے مگر قیمت ۳۰ روپیہ۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح اس پر محنت کی گئی
ہوگی۔ سنہری نقاشی اور وارنش کے کام کی یہ طشتری ہے جس کو انگریزی میں "لیکوس ورک" کہتے ہیں۔
صفت اس کی یہ ہے سینکڑوں برس کے استعمال سے اس کا رنگ نہیں بدلتا۔ اور کھولتے ہوئے پانی
میں ڈال دیجئے تب بھی کوئی اثر نہیں۔ یورپ والوں نے سر ٹکرا مارا مگر یہ بات نہیں حاصل ہوئی۔ ڈرائنگ روم
کا ایک کیبنٹ دیکھا اسی کام کا جس کی قیمت پینتالیس ہزار روپیہ ہے۔ چینی کے ویس دیکھے معمولی تو
ہزاروں آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ست سوا پورسلین مشہور ہے اس کا ویس تیس[۳۰] انچ اونچا اور
بارہ[۱۲] سو روپیہ قیمت۔ سگرٹ کیس لوہے پر کوفت کے کام کا ایک سو سے پانچسو[۵۰۰] روپے تک کا۔

میناکاری ایک ہندوستان میں ہوتی ہے۔ خدا کی مار۔ یہاں کی میناکاری دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔
میرا ایجنٹ مجھے "براس فیکٹری" دکھانے کو لے گیا۔ میں سمجھا ایسی ہوگی جیسے مراد آباد میں برتن بنتے ہیں۔ یا
جے پور میں برتن وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ فیکٹری میں جا کر معلوم ہوا کہ جاپان کی دنیا ہی نرالی ہے چھوٹی
سی چھوٹی چیز مثلاً سگرٹ کیس یا کارڈ کیس کے تیس[۳۰] - چالیس[۴۰] روپیہ دام۔ اور خوشی سے دینے کو جی چاہے
نقاشی تو جاپان پر ختم ہے۔ ریشم پر سوئی سے ایسا کام بنانا انھیں کا کام ہے۔ آپ اگر دیکھئے تو یہ معلوم
ہو کہ زندہ جانور یا پرند بیٹھا ہے یا اڑ رہا ہے۔ مخملی تصویریں جن کا کوئی نمونہ رفتہ رفتہ شاید آپ تک بھی
پہونچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے قلم سے کھینچی ہے۔

الحاصل جاپان نے مجھے تو بالکل شیفتہ کر لیا اور ایک جاپانی لیڈی سے خط و کتابت بھی شروع
ہے کیا عجب ہے کہ کسی دن ایک مکان جاپان میں ہو اور وہاں یہ بندہ اپنی جاپانی سواری کو لئے ہوئے
بڑھاپے کے دن گزار رہا ہو۔ جاپان کے راگ کہاں تک گاؤں۔ بہت ہوا۔ ڈاکٹر دل جنگ سے ۲۸ اگست
کو میں رخصت ہوا۔ ان کو "کوبے" میں چھوڑ کر میں "ٹوکیو" "یکوہامہ" "اوساکہ" وغیرہ پھرتا رہا۔ وہ مع

اپنے فیملی کے یکم ستمبر کو جرمن میل میں سوار ہو کر "سیلون" گئے اور وہاں سے ۲ بجے پور بخیریت پہنچ گئے اور شاید کبھی زبانی جاپان کی کیفیت آپ کو سنائیں۔ اور بندہ تنہائی سے گھبرا کر "سردگا" پہنچا۔ جہاں سے روسی جہاز "ولاڈی واسٹک" جاتا ہے اور ۷ ستمبر کی شام کو سوار جہاز ہو کر روانہ ہوا۔ اس وقت طوفان کا سگنل اڑ رہا تھا اور جہاز والے کہہ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ مگر میل کا جہاز رک نہیں سکتا جہاز نے اپنے وقت پر لنگر اٹھایا۔ اور چل دیا۔ رات تو خیر اچھی گزری۔ مگر صبح سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز سمندر میں ایک تنکا ہے کہ جس کو ہوا اور پانی بچوں کے کھیل کی طرح نچا رہے ہیں اور تماشا دیکھتے ہیں۔ سارے کیبنوں میں دو دو فٹ پانی۔ بستر ے، کپڑے شرابور، پکڑنے کے لئے بنکس میں رسیاں باندھ دی گئی تھیں۔ جن کو پکڑ کر ہم لوگ اپنی اپنی جگہ چمٹے ہوئے پڑے تھے۔ اور موجوں کی بوچھار کھڑکیوں اور دروازوں کی درازوں میں سے منوں پانی ہر لحظہ اندر لاتی تھیں اور ہمارے سروں پر وار جاتی تھیں۔ اور ہم لوگ تھے کہ دم بخود بھیگی بلی کی طرح سمٹے پڑے تھے۔ کبھی یہ معلوم ہوا کہ جہاز بالکل پانی کے اندر غائب ہوا جاتا ہے یا اپنی جگہ سے باوجود رسیاں پکڑنے کے کھسکنے لگے۔ تو خدا یاد آ گیا۔ اور کہہ اٹھے "خدا خیر کرے۔"

"سردگا" سے "ولاڈی واسٹک" ۳۶ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ مگر الحمد للہ ہم لوگ دو دن خوب طرح طوفان کھا کر اور کئی کشتیاں اور سیڑھیاں وغیرہ کھو کر اور سارے سامان کو ستیا ناس کر کے چوتھے دن بخیر و سلامت "ولاڈی واسٹک" پہونچے۔

اسی دن اس ٹرین میں سوار ہو کر (۱۰ ستمبر ۷ بجے شام کو) روانہ ہو گئے۔ آج پیر کا دن اور ۱۶ تاریخ ہے اور ہم ہیں کہ رات دن چلے جا رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو سنیچر کے روز "موسکو" پہونچیں گے (۲۱ ستمبر) "ولاڈی واسٹک" سے اُدھر جس قدر بڑھے ہیں سردی بڑھتی گئی۔" ولاڈی واسٹک میں ۵۶ ڈگری تھی صبح کو تین دن سے برابر ۳۰ ڈگری ہوتی ہے۔ خدا کا ملک ہزاروں کوس بے آدم زاد پڑا ہے۔ ریل کی سڑک کے کنارے ذرا ذرا سی آبادی کہیں کہیں نظر آتی ہے اور وہ بھی اس قدر جیسے سمندر میں قطرہ کیا زمین ہے۔ کیا درخت ہیں۔ کیا سبزہ ہے۔ مگر سوا اس کے کہ روس زبردستی کہے کہ میرا ہے اور کچھ نہیں۔ کسی کا بھی نہیں۔ پرسوں شب کو ڈاکوؤں نے لگیج وان کی کھڑکی توڑ کر چاہا تھا کہ کچھ نکال لیجائیں مگر اسٹیشن آ گیا اور حضرات تشریف لے گئے۔ صرف دو ہی تین بکسوں میں سے کچھ گیا۔ راستہ میں ٹرین ایک ریچھ اور ایک گائے کو شہید کر چکی ہے اور ابھی ایک کتے صاحب بھی تشریف لے گئے۔ یہاں کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ اور سگرٹ پر زور ہے۔

ہم سمجھتے تھے ریل کا سفر گو لمبا ہی ہو جہاز کے سفر سے اچھا۔ مگر اب تو طبیعت تنگ آگئی۔ ہر ایک اپنے کمرہ میں ایک قیدی کی طرح جو حبس تنہائی میں ہو، بند بیٹھا ہے۔ صرف کھانے کے وقت تو ڈائننگ کار میں سب جمع ہوتے ہیں۔ یا کہیں بڑا اسٹیشن آگیا تو اتر کر ذرا ٹہلے پھرے۔ ورنہ وہی گوشۂ تنہائی۔ گیارہ تو میں نے یہ خط شروع کیا تھا آج سولہ تو ہوگئی۔ دیکھئے کب ختم ہوتا ہے۔

کل شام کو ۵ بجے "ماسکو" پہونچ کر ہوٹل "برلن" میں مقیم ہوا۔ سردی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ "فریزنگ پوائنٹ" کے قریب ہے۔ اور بارش بھی کم کم ہوتی رہتی ہے۔ شہر بہت بڑا ہے۔ گرجے بکثرت یہاں کا اوپرا کل رات کو دیکھا دنیا میں اس کے مقابلہ کا اور نہیں ہے۔ اس وقت تو یہیں تک بس کرتا ہوں۔ والسلام۔

ہاں بندہ پندرہ اکتوبر تک غالباً جدہ پہونچ جائے۔ جواب کا وہاں منتظر رہوں گا۔

آپ کا

محمد حسین

۲۲ ستمبر ۱۹۰۷ء

تاریخی نوادر

ضیاءُ الملک جنرل محمود خاں

(از سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی)

شاہ عالم نے تختِ آبائی کو مرہٹوں اور انگریزوں کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرکے ملّیہ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ایک صدی کے اندر اندر وہ عظیم الشان سلطنت جس کی آبیاری شیر دل ہمایوں، اکبر، جہانگیر، اور عالمگیر نے اپنے خون سے سینچ کر کی تھی۔ مرہٹہ قسمت آزماؤں اور انگریز کے رحم و کرم پر جینے لگی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ نازک ترین دور مسلمانانِ ہند کے لئے سخت اور آزمائش کا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ اُس وقت جنوبی ہند میں حیدر علی، ٹیپو سلطان شمالی ہند میں نواب علی محمد خاں، نواب نجیب الدولہ، حافظ الملک حافظ رحمت خاں۔ نواب احمد نواب دوندے خاں اور نواب وزیر خاں وغیرہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق سینہ سپر ہو کر میدانِ عمل میں نہ آتے تو مسلمانوں کے لئے ہندوستان دُوسرا اسپین بن "جنگ پانی پت" میں روہیلہ سرداروں میں سے اکثر نے مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ہمیشہ کے زور توڑ دیا۔ شیواجی کے جانشینوں کا یہ عبرت ناک انجام دُنیا نے دیکھ لیا۔ لیکن اس کے بعد ایک جماعت "ایسٹ انڈیا کمپنی" حکومت و امارت کے خواب دیکھنے لگی جس نے ایسی الٹی چال سے اُبھرنا شروع

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

ملک کا سنجیدہ طبقہ ان کی جانب ابتداءً متوجہ نہ ہوا، ورنہ سوداگروں کی ایک غیر معروف چھوٹی سی کی یہ جرأت کب ہو سکتی تھی کہ وہ سات سمندر پار کر کے حصول سلطنت کا نقشہ جماتی۔ باوجودیکہ عوام کے ہاتھ میں تلوار اور تختِ حکومت پر مغل شہنشاہ متمکن تھا ہم ہندوستانیوں کی خانہ جنگی اور غفلہ سے کمپنی بہادر کی بیباکی اس درجہ بڑھی کہ ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ کی برائے نام بادشاہت بھی خا طرح کھٹکنے لگی۔ اور آ ر نے اب بلاشرکتِ غیرے زمامِ حکومت سنبھال لینے کا تہیہ کر لیا۔

جاں باز روہیلے جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سے مسلسل مصروف جہ

تھے کب خاموش رہ سکتے تھے۔ بڑی بے جگری اور پامردی کے ساتھ آگے بڑھے۔ سانڈرس رقمطراز ہے:-

"تمام روہیلکھنڈ میں بدعملی اور بدنظمی کہاں کو پہنچ گئی تھی۔"

جنرل بخت خاں کا دہلی پہونچ کر تحریک کی باگ ہاتھ میں لینا تھا کہ پوری روہیلہ قوم میں سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ ملک کی آزادی اور اس کی عظمت رفتہ کے واپس آنے کے خواب دیکھنے لگے۔

جنرل محمود خاں

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی تمام دوسری شخصیتوں کی طرح جنرل محمود خاں کے حالات پر بھی گہری تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جنرل صاحب سے روشناس ہونے کے لئے لے دے کر صرف سرسید کی نادر الوجود کتاب "سرکشی ضلع بجنور" ہے اس کے علاوہ جس مورخ نے قلم اٹھایا وقتی مصالح کی بنا پر اسی کتاب سے استفادہ کیا کیونکہ خوف تھا کہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے ؎

اے وضع احتیاط یہ فصل بہار ہے
گلبانگ شوق زمزمہ سنج فغاں نہ ہو

مدیر کہ مصنف "نجیب التواریخ" جنہوں نے جنرل محمود خاں کا عروج و زوال کا پورا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنی تاریخ میں ان کے کارہائے نمایاں کے لئے صرف نصف صفحہ دے سکے اور وہ بھی سرسید کی کتاب سے خوشہ چینی کرنے کے بعد لیکن ؎

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بے کار گریباں تو مرا دور نہیں

انہیں مخالفانہ اور معاندانہ تحریروں کو پڑھ کر ان کی کوہ وقار شخصیت اپنے اصلی خد و خال میں آسانی سے بے نقاب ہو جاتی ہے اور ایک گہرا اور دیرپا نقش وفا چھوڑتی چلی جاتی ہے۔

جنرل محمود خاں کے تفصیلی حالات دانستہ منظر عام پر نہ لانے کی کوشش کا ثبوت نواب عبدالسلام خاں مصنف 'نسب افاغنہ' کی ایک تحریر سے بھی ملتا ہے۔ جو مرحوم کی مرتبہ فہرست کتب موجودہ للٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ' میں نظر سے گزری "نجیب التواریخ" کے خانہ کیفیت میں لکھی ہیں۔

"حالات تباہی خاندان (محمود خاں) زمانہ غدر اور بعض واقعی اعتراضات کتاب سرکشی ضلع بجنور مؤلفہ سرسید احمد خاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ناگوار واقعات کتاب مذکور میں درج تھے۔ یہ انتخاب کیا گیا۔ مگر مرزا صاحب (نصیر محمد خاں برلاس) کو ہمت نہ ہوئی کہ سرسید صاحب کی وجاہت کی وجہ سے اپنی کتاب لکھ کر چھپواتے۔

میری استدعا پر مجھے عنایت کی یہ انتخاب اس حالت میں نہیں ہے کہ کوئی تصنیف بغیر دوسری کتا
کی مدد کے مکمل ہو سکے۔ اس کتاب کے ساتھ ساتھ ایک روزنامچہ ضلع بجنور زمانۂ غدر" مرزا صاحب نے
عنایت کیا اس کا پتہ مجھے کچھ نہیں معلوم ہوا کہ اس کا مصنف کون ہے"۔

بہرحال اب جنرل محمود خاں کا حال سنئے :-

حسب و نسب محمود خاں نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب معین خاں عرف بھنو خاں
ابن نواب ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے لڑکے تھے۔ نجیب آباد ضلع بجنور کی
کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے اس محل اور نواب کی دوسری عمارتوں کے بارے میں مصنف
"نجیب التواریخ" رقمطراز ہیں :-

"راقم نے قبل از غدر جبکہ میری عمر ۱۶ برس کی تھی - سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی کی تھی اور جس احاطہ
میں تحصیل نجیب آباد اور تھانہ پولیس واقع ہے وہ محلسرائے نواب کی تھی۔ دروازہ نہایت عجیب اور باشوکت
تھا۔ باغ میں ایک مکان مجھی بھون تھا ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بوندیاں مینھ کی سی برسائی
جاتی تھیں" ؎

؎ تاریخ صفحہ ۱۹۱

تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات نواب بھنو خاں نے محمود خاں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جب سن شعو
کو پہنچے تو علاقے کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ ایک دوسری بیگم سے نو
بھنو خاں کے ایک اور صاحبزادہ جلال الدین خاں مخاطب بخطاب محافظ الملک جلال الدین خاں
تھے والد کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں تقسیم ترکے وقت باہمی نزاع ہو گیا، جو آخر وقت
تک قائم رہا۔

چنانچہ روشن الدولہ نواب محمد سعد اللہ خاں منصف اور مہ جونوب عبد القادر خاں شہید کے متبنٰی
اور نواب بھنو خاں کے داماد تھے، تقسیم ترکہ کے لئے منحصر علیہ قرار پائے۔ انھوں نے کُل جائداد کے
پانچ حصے قرار دے کر تین حصوں کا مالک نواب محمود خاں کو (اس سبب سے کہ وہ بڑے اور مہتمم
خاندان تھے) قرار دیا اور دو حصے جلال الدین خاں کو دئے بڑے بھائی کے حصے کی بیشی رنج و ملال کا
ہوئی پھر بھی دونوں بھائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

نواب محمود خاں فیاض اور فضول خرچ تھے۔ داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے۔ یہاں تک
کہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں اپنی کثیر جائداد نواب محمد سعید خاں بہادر والئی رام پور کے پاس
مرہون کردی۔

نواب محمود خاں نہایت خوش طبع یار باش اور مہمان نواز تھے، سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے۔
کار کا بہت شوق تھا۔ اکثر وقت اسی شغل میں بسر ہوتا۔ گولی کا نشانہ خوب لگاتے، انگریز حکام، مرزا فنا فرخ
اہزادہ دہلی اور کبھی کبھی مہاراجہ ہندو راؤ ساتھ ہوتے [1]

۱۸۵۷ء اور جنرل محمود خاں کی حکومت

مئی سے لیکر جون ۱۸۵۸ء تک تمام ملک میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جوش و خروش کا
اسیلاب تھا جو امنڈ امنڈ کر اس کے اقتدار کو خس و خاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ عوام بغیر
ی امیر با اقتیار کے ہر جگہ "محمدی جھنڈا" بلند کر کے جہاد کا اعلان کرتے تھے۔ مغل بادشاہ کی کمپنی نے جو
ہین د تحقیر کی تھی اور اس کے اختیارات کم کرنے کے لئے جو پُر فریب جال بچھایا تھا اس کا جواب اُنکے
ال میں صرف یہ تھا کہ ایسے ناموافق حالات اُس کے خلاف کر دئے جائیں کہ بالآخر وہ رخت سفر
مدھنے پر مجبور ہو جائے اسی صورتِ حال کا اعادہ نجیب آباد میں بھی ہوا۔ مولوی منیر خاں کا چار سو
ادیوں کے ساتھ نجیب آباد آنا تھا کہ عوام میں انگریزوں کے خلاف سخت اشتعال پھیل گیا۔ مُلا
ون یوسف کو مسلمانوں نے اپنا مرشد بنا کر جہاد کے لئے تیاری کی اور جلال آباد جا کر "محمدی جھنڈا"
فراکیا۔ احمد اللہ خاں اور محمد شفیع خاں بھی آ گئے [2] سر سید رقمطراز ہیں:۔

"مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر سنتے ہی بجنور میں کسی کے دل میں عہدہ داروں کی دہشت باقی نہیں
رہی، بڑا اندیشہ ہم کو حکام انگریزی کا تھا۔ کیونکہ بے شک حرام کمبخت نلنگے بند وستانیوں سے چنداں
سروکار نہیں رکھتے تھے۔" [3]

انگریزوں کا فرار

نجیب آباد میں حالات سرعت کے ساتھ بگڑ رہے تھے بسیاد حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہو چکی تھیں اس لئے انگریزوں نے خاموشی کے ساتھ بجنور کو خالی کر دیا۔
اب شجاع اللہ خاں لکھتے ہیں:۔

"کلکٹر نے سو آدمی نواب محمود خاں سے طلب کئے اور نواب سے کہا کہ ہم بسبب ہنگامہ پردازدل
کے یہاں سے بیرٹھ جاتے ہیں اور ضلع کا بندوبست بوجہ قدیم رئیس ہونے کے تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔
انتظام ضلع کا کرو۔" [4]
انگریزوں کے چلے جانے کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] عجب التواریخ صفحہ ۲۶۹، روزنامچہ بہادر شاہ
[2] نواب شجاع اللہ خاں
[3] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۱۳
[4] مرتبہ ۲ اگست ۱۸۶۹ء روزنامچہ غدر عبدالسلام خاں

"اس وقت تمام ضلع کی نظر محمود خاں پر تھی۔[51] جو گرد و پیش کی فضاء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے خود سید بھی ہوا کا رخ پلٹتے ہی جنرل صاحب کے موافقین میں شامل ہو کر بظاہر ان کی خیر خواہی کا دم بھرنے لگے۔"

چنانچہ نواب شجاع اللہ خاں رقمطراز ہیں:۔

"سید احمد خاں آئے اور محمود خاں سے کہا آپ کو خوب معلوم ہے کہ ڈپٹی رحمت خاں چودھریان ہندوؤں کو ضلع سپرد کرائے دیتے تھے لیکن میں نے کوشش کر کے آپ کے سپرد کرا دیا اور بلا شرکت آپ کو رئیس کرا دیا۔"[52]

اعلان امارت ۵ر جون ۱۸۵۷ء کو نجیب آباد میں جنرل صاحب نے اپنی امارت کا اعلان کیا احمد اللہ نے نجیب آباد کے باہر "محمدی جھنڈا" اٹھایا اور جلال آباد کے قریب مورچہ لگایا کے ساتھ شفیع اللہ خاں بھی درستی سامان جنگ میں مصروف تھے۔ اُس وقت اُن کے پاس چار ہزار آدمی ملازم تھے۔[54]

تمام ضلع میں نواب محمود خاں کی بے کھٹکے حکومت قائم ہو گئی اور اُن کے جملہ منیر انتظام ضلع طرف متوجہ ہو گئے۔ احمد اللہ خاں مختار کل قرار پائے۔ اُن کے دھام پور پہونچنے پر سب ہندو اور مسلمان اس سے متفق ہوئے اور ہر طرح اس کی اطاعت اختیار کی۔ بقول مصنف گزیٹیر ضلع بجنور:

"یکایک لوگوں کی قسمت ایک ایسی تند د پارٹی کے ہاتھ میں آگئی جو اسلام کی ماننے والی اور تخت دہلی سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتی تھی۔

ایک بہادر پٹھان سردار ماڑے خاں کی سرکردگی میں بھی ایک فوج بنائی گئی تھی۔"[55]

شاہ دہلی کی اطاعت محمود خاں نے ۱۲ر جولائی کو محمد خاں کے ہاتھ ایک عرضداشت دہلی روانہ کی۔ اس کے جواب میں بہادر شاہ نے امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ خطاب مرحمت فرمایا۔ نیز یہ بھی تحریر کیا کہ تم نے جو حال ضلع اور پرگنوں کی بدنظمی کا لکھا ہے اس کا انتظام کرو۔ تمہارے باپ دادا کے حال پر بادشاہان دہلی کی مہربانی رہی ہے۔ خزانہ کا حال بھی لکھ کر روانہ کرو تم ہمارے دولت خواہ ہو۔[56] تین مغل شہزادے بھی دہلی سے نجیب آباد آئے۔[57]

---

[51] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۱۳۔
[52] روزنامچہ غدر نواب شجاع اللہ خاں ۶۶۹
[53] محمود خاں کے بھانجے تھے
[54] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۵
[55] گزیٹیر ضلع بجنور
[56] عروج عہد انگلشیہ
[57] ؍؍ ؍؍ صفحہ ۶۶۹

اس دوران میں جنرل صاحب اندرونی، ملکی و مالی انتظام میں اس درجہ منہمک رہے کہ سیداور ان کے دست راست رحمت خاں کی موجودگی کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ ڈپٹی رحمت خاں کی بہی خواہی کے پردے میں ہندو چودھریوں کو ان کے خلاف بغاوت کرنے پر ابھار رہے تھے۔ یہی فتنہ تھا جو آگے چل کر محمود خاں کی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور انگریزی حکومت کے دوبارہ قیام کا سبب بنا۔

دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی برائی کا گلہ جاتا رہا

سر سید کو خود تسلیم ہے کہ :۔

"درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جان کرافٹ ولسن بہادر سے تھی" [۵۱]

محمود خاں انگریزوں کی اس چال کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے اس لئے وہ بدستور ڈپٹی رحمت خاں اور سید سے سرد مہری سے پیش آتے رہے۔ چنانچہ سر سید رقمطراز ہیں :۔

"۵ جون کو تیسری مرتبہ محمود خاں نے ہنگامہ برپا کر نا شروع کیا۔ میں اسی وقت محمود خاں کے پاس گیا جو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا مجھ کو کچھ علیحدہ عرض کرنا ہے۔ اس نے عجب دغدغے کہا یہاں کون غیر بیٹھا ہے سب اپنے بھائی ہیں۔ مگر میرے اصرار پر اٹھ آیا۔" [۵۲]

محمود خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لئے چودھریوں کی حمایت پر بدستور سابق پدرانہ شفقت جاری رکھی۔ اور احمد اللہ خاں نے مندروں پر پہرے لگوادیئے تاکہ کوئی مسلمان ان کو گزند نہ پہونچائے جس سے آپس میں جھگڑے کی صورت پیدا ہو آخر کیوں نہ ہو یہ لوگ نجیب الدولہ جیسی پر عظمت شخصیت کے نام لیوا تھے جن کے بارے میں مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی لکھتے ہیں :۔

"نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد کے بازار خاص میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کی کہ مبادا ہندوؤں کا دل آزاری کو تکلیف ہو۔ نیز جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو قبر کے لئے جو جگہ تجویز ہوئی وہ ایک ہندو جاٹ کی ملکیت تھی اس نے انکار کر دیا تو دوسری جگہ تجویز ہوئی وہ بھی کسی ہندو کی تھی۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ تمام حوالی ہندوؤں کو عطا کئے ہوئے ہیں۔ مجبور ہو کر نواب نے کہا چلو جنازہ مانسری لے چلیں۔ [۵۳] آخر ایک ہندو کو رحم آیا اور

[۵۱-۲] "سرکشی ضلع بجنور"
[۵۲] صوبہ سرحد کا ایک موضع جہاں سے نجیب الدولہ آئے تھے۔

اس نے اجازت دی کہ مقبرہ اس کی زمین پر بنایا جائے۔" ۵۱

یہی وہ چودھری تھے جن کو بلاوجہ مشتعل کر کے انگریزوں کے حامیوں نے "ہلدور" میں قتل عام کرایا۔ سر سید لکھتے ہیں :-

" قبل طلوع آفتاب سے شام تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد تمام مکانات جلا دئے گئے کوئی گھر باقی نہیں بچا۔" ۵۲

لیکن ہیبت ،حشمی اور وسیع القلبی میں محمود خاں اپنے پردادا نجیب الدولہ کے قدم بقدم تھے چودھریوں کے خلاف، کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لانے کی انھوں نے اجازت نہیں دی۔ حالانکہ مسلم عوام بہت زیادہ مشتعل تھے اور سر سید کے خلاف ان کو برانگیختہ کر رہے تھے۔ سر سید لکھتے ہیں :-

" چاندپور میں اس سے زیادہ مصیبت دیکھی تھی جب ہم وہاں پہونچے اور مسلمانوں کو معلوم ہوا تو صدہا آدمی گنڈاسہ، تلوار، بندوقیں لے کر ہم پر چڑھ آئے اور سب بلوائی پکار پکار کہہ رہے تھے کہ چودھریوں سے سازشیں کر کے مسلمانوں کو مروایا۔ مسلمانوں کو ذبح کرایا اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔" ۵۳

لیکن آفریں ہے جنرل صاحب کو جن کی ہمت بلند نے چودھریوں اور سر سید سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ اور اصلی دشمن کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے پر ہی اپنی تمام تر توجہ مبذول رکھی۔

نجیب آباد اور اس کے نواح کا بخوبی انتظام کرنے کے بعد جنرل صاحب نے اپنی کثیر التعداد فوج کو امروہہ، مراد آباد، بریلی، اور اودھ روانہ کیا جہاں علما، اور مجاہدین اپنے خون سے ہولی کھیل کر ایک فیصلہ کُن جنگ لڑ رہے تھے، ان کی فوج کو بالعموم نجیب آبادی تلنگے کہا جاتا تھا۔

چنانچہ جب امروہہ میں سیدوں نے بغاوت کا علم بلند کیا تو سید گلزار علی صاحب ۵۴ ہلدور گئے اور مجاہدین کی کافی تعداد لے کر امروہہ آئے اور اعلان کیا کہ :-

"مارُسے خاں بھی آئیں گے۔" ۵۵

فیروز شاہ نے جب مراد آباد کا محاصرہ کیا تو ان کے ہمراہ نجیب آباد کی فوج تھی۔ مولوی منّی

---

۵۱ "رسالہ ہجرت" فروری ۱۹۱۹ء ۵۲ و ۵۳ "سرکشی ضلع بجنور" صفحہ ۱۰۶

۵۴ غدر سے پہلے مراد آباد میں مختار کل تھے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو امروہہ آئے جہاں سیدوں کی آبادی تین ہزار تھی ان کی رہنمائی کی اور امروہہ میں تحریک شروع کی، ناکامیابی کے بعد بریلی میں روپوش رہے، ایام جلاوطنی سخت عسرت اور مفلوک الحالی میں بیتے لوگ کہتے تھے بہت حسین، مکین، فیاض، جری اور بہادر تھے۔

۵۵ "تاریخ امروہہ" صفحہ ۸۳ ۔ مصنفہ محمود احمد عباسی۔

علی ساکن دھام پور اپنے معتقدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ لکھنؤ گئے اور احمد اللہ شاہ صاحب کے مصروفِ کارزار رہے۔ مصنف "قیصر التواریخ" رقمطراز ہے :۔

"لکھنؤ کی فتح کے بعد جرم ثابت ہوا۔ تین برس کی سزا ہوئی۔ الہ آباد کے جیل خانہ میں ہیں۔ سنتے ہیں کہ اب غذا میں تخفیف ہوگئی ہے۔ کپڑے بدلتے ہیں۔ پلنگ پر سوتے ہیں۔ نگینہ کی تمام جائداد گھر کی نقد و جنس بحق سرکار ضبط ہوگئی۔" ۵۱

اسی طرح بریلی میں جب خان بہادر خاں نے اپنی امارت کا اعلان کیا اور "نکٹیا" کے پل پر ان کے انگریزوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ فیروز شاہ ۵۲ کے ساتھ کافی تعداد نجیب آبادی مجاہدین کی تھی۔ مارچ ۵۸ء میں اودھ کا سب سے بڑا محاذ آزادی سر کرنے کے بعد انگریزوں نے اطمینان کے ساتھ نجیب آباد کے خلاف اقدام کیا۔ مصنف "بجنور گزیٹیر" لکھتا ہے :۔

یزوں کا حملہ اور شکست

"لکھنؤ کی فتح کے بعد جنرل کیمبل رڑکی اور روہیلکھنڈ کی طرف بڑھا۔ یہ فوج مسٹر جانسن کے ماتحت تھی ۱۵ اپریل کو اس فوج نے "ہردوار" پر قبضہ کیا۔ پھر گنگا کو عبور کرکے ناگل کی طرف بڑھی تاکہ دشمن کا جو کہ جنگل میں مضبوط طاقت میں تھا مقابلہ کرے چار میل چلنے کے بعد باغیوں کی ایک بڑی تعداد سے مقابلہ ہوا۔"

سید لکھتے ہیں :۔

"شیو پرشاد نے خبر دی کہ نواب کی فوج اندر ہی ہے۔ ڈائمنڈ صاحب نے نہر پر کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھا اور حکم دیا کہ نہر کا پانی چھوڑ دیا جائے۔ اس حکمت سے دشمن کو موت نے جنگل میں پکڑ لیا۔ بیسیوں پانی میں ڈوب گئے اور باقی جو پانی کے بیچ میں کھڑے تھے یا کنارے پر تھے سب کو مار دیا گیا۔ نہر ایجنٹ شیو پرشاد کو سو روپیہ انعام کے ملے۔" ۵۳

---

۵۱ "قیصر التواریخ" صفحہ ۳۴۴

۵۲ میرے خاندان کی ایک بزرگ خاتون نے کل دردخاں کی زبانی ...ول نے بچشم خود فیروز شاہ کو نبرد آزمائی کرتے دیکھا تھا اُن سے بیان کیا کہ فیروز شاہ مع اپنی فوج کے جس طرف نکل جاتے تھے ...ن کی فوج میں ہل چل پڑ جاتی اور وہ خود مع گھوڑے کے خاک و خون میں اس قدر لوٹ جاتے تھے کہ سوائے ان کی تلوار کی ...لک کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جب خان بہادر خاں نے اپنے ہاتھی کی باگ موڑی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کو خیرباد ...ہا۔ فیروز شاہ اس کے بعد بھی لڑتے رہے یہاں تک کہ تمام رفقا ایک ایک کرکے ان پر نثار ہوگئے وہ یکہ و تنہا رہ گئے تو ...ہیں غائب ہوگئے۔

۵۳ "سرکشی ضلع بجنور"۔

نجیب آبادی فوج کو غیر متوقع طور پر ہزیمت ہوئی۔ نیز تمام اقطاع ملک "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی گرفت میں آجانے سے محمود خاں سخت بدحواس ہو گئے اور انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ اب آزادی ملک و ملت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا جنرل محمود خاں، سعد اللہ خاں، اور احمد اللہ خاں بھی آخری بار مشورہ کے لئے جمع ہوئے ۵

آج جاں بازوں کا مجمع ہے درِ قاتل پر
کون کرتا ہے فدا تیغ بہ سر دیکھیں تو

ان سب کے مشورے سے ماڑے خاں، شفیع اللہ خاں، نتھو خاں، قادر خاں اور مولوی عنایت علی نے نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے لیکن جائے پناہ کی تلاش عبث سمجھ کر جنرل محمود خاں نے اپنے کو انگریزی فوج کے سپرد کر دیا اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ پورا ملک "برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی" کے خونخوار پنجوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔

دردانگیز انجام

حب الوطنی کے جرم میں کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی لیکن اس پر عملدرآمد کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ انھوں نے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ جیل خانہ ہی میں انتقال فرمایا۔ جنرل صاحب کے اوصافِ حمیدہ کا اعتراف آج تک روہیلکھنڈ میں کیا جاتا ہے۔

سُنا ہے حد درجہ دلیر اور بہادر ہونے کے باوجود لاغر اندام اور متوسط القامت تھے۔ غلامی کی پہلی بیڑی "بنگال" اور آخری بیڑی "نجیب آباد" نے پہنی۔ بہادر شاہ پر "مغلیہ خاندان" کا خاتمہ ہوا۔ اور محمود خاں پر آزادیٔ "روہیلکھنڈ" کا۔

برٹش کمپنی کے مظالم

سر سید لکھتے ہیں:-

"لوگوں کو عبرت ناک سبق دینے کے لئے نجیب آباد میں بھی انھیں مظالم کا اعادہ کیا گیا جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جا رہے تھے۔"

"۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو محمود خاں کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو نور پور میں پھانسی کی سزا دی گئی اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑا دیا گیا۔" ۵۱

"نگینہ کے باغوں میں چھپے ہوئے لوگوں کو انگریزی فوج نے قتل کیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے۔ دھام پور کی سڑک پر جس قدر لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے سب کو قتل کیا گیا۔ خاص باغی دیہات بنا دئے گئے تھے کہ وہ بالکل غارت کر دئے جائیں اور ان میں تمام باغیوں کے سر لٹکائے جائیں۔" ۵۲

---

۵۰ "سرکشی ضلع بجنور" ۵۱ "عروج عہد انگلشیہ"

جانسن کی رائے تھی کہ:-

"موت کی سزا طرح طرح کی تکلیف دے کر دی جائے۔ مثلاً مجرم کی کھال اُتاری جائے، زندہ جلایا جائے، پھانسی آسان موت ہے۔" [1]

"جو مسلمان متمول و جیہہ تھے انھیں پکڑ پکڑ کو توالی پہونچایا گیا۔ بہت کم ایسے مسلمان تھے جو سپاہیانہ شان نہ رکھتے ہوں اور پھانسی سے بچے ہوں۔"

پشاور سے لے کر مشرقی و شمالی ہند تک شاید ہی کوئی مالدار مولوی۔ غازی مسلمان ہوگا جو نہ پکڑا گیا ہو۔ دس برس تک برابر ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ برپا رہی۔

"ایک محکمہ گواہوں کی دارو گیر کے لئے بھی تیار رہا جس کو چاہا حبس دوام کر دیا۔" [2]

"مجرم کراچی میں اکڑوں بٹھا دیا جاتا اور مشکیں کسی ہوتیں۔ تختہ پر مجرم کو چڑھا کر گلے میں پھندا ڈال کر نیچے گرا دیتے تھے۔" [3]

"زد و کوب اور سزا یابی کے وقفہ میں گورے باغیوں کو بڑی اذیت دیتے۔ مثلاً بال کھینچتے، سنگین بدن میں چبھوتے۔ ان حرکتوں کو دیکھ کر افسر مسکراتے تھے۔ گورے صاحب ظالموں کو ہلاک کرنے میں پتھر سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ ... تھے۔" [4]

اس قومی بد نصیبی اور ہولناک زمانہ میں عوام پر یہ مظالم کچھ تعجب خیز نہ تھے اُن کے سرتاج شاہنشاہ ہند بہادر شاہ تنگ رنگون کی قیدِ فرنگ اور جلاوطنی کی حالت میں جبکہ اُن کے پرستار و نمک خوار پر سایہ کا گمان ہوتا تھا۔ دل ہلا دینے والے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔

ایک انگریز ممبر پارلیمنٹ رقمطراز ہے:-

"میں نے بہادر شاہ کو ایک کھری چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ انھوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ اوپر کے ٹاٹ کو ہٹا کر اپنے بازو دکھائے جو بے فرش کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔" [5]

اس زمانہ میں فارسی اور عربی کا رنگ اردو زبان پر غالب تھا۔ اس لئے بالعموم انگریزوں کے لئے مسلمان قرآن شریف کا لفظ "نصاریٰ" بولتے تھے۔ لیکن اس لفظ کے لکھنے پر بھی مسلمانوں

---

[1] "تاریخ عہد انگلشیہ" [2] "جلاپانی" از مولانا جعفر تھانیسری

[3][4] " " [5] رسالہ گجراتی کا دورائی نمبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۲

پر کون سا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا۔

"حیاتِ جاوید" میں مرقوم ہے:۔

"بعض اضلاع میں مسلمانوں کی ایامِ غدر کی ایسی تحریریں پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور اُن کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو اُن کی قسمت میں لکھی تھیں۔" [1]

لیکن کیا آزادی کے ان پروانوں اور شہیدانِ وطن کا خون رائگاں گیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ لوگ ہماری موجودہ "تحریکِ آزادی" کے بنیادی ستون ہیں ان کی زندگی اور موت دونوں مبارک اور قومی حیاتِ نو کا پیغام جانفزا ہیں ؎

تمھیں سے اے مجاہدو! جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُرضیا جبینِ کائنات ہے

کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

انیس فاطمہ

---

[1] "حیاتِ جاوید" صفحہ ۸۰۔ لائف سرسید مصنفہ مولانا حالی۔

نوٹ۔ اس مضمون میں موجودہ زمانہ کے حالات کی روشنی میں ہمارے محبوب رہنما سرسید علیہ الرحمۃ کی شخصیت کسی قدر قابلِ اعتراض آتی ہے لیکن انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے اُس وقت کے خیالات و عقائد و زیرِ فرائضِ منصبی کے تحت تھا۔ انھیں یقین تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان سے نہیں جائے گی اور اس کے خلاف بغاوت کرنے سے مسلمان بے وجہ ہلاک ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن جو کچھ خدمات اُن سے ظہور میں آئیں انھوں نے کوئی خاص انعام گورنمنٹ سے نہیں لیا۔ چنانچہ میر صادق علی و میر رستم علی پٹھان چاند پور ضلع بجنور کا وہ تعلقہ جو بحق سرکار ضبط ہو گیا تھا انھیں دیا جانے لگا تو اس کے لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانا ان کی شریف فطرت کے خلاف تھا۔ غدر کے بعد مسلمانوں کو مزید تباہیوں سے بچانے کی شاندار خدمات اور تعلیمی میدان میں اُن کی زبردست جدوجہد بھی جس سے کہ ملتِ اسلامیہ کو از سرِ نو زندگی حاصل ہوئی مسلّم ہے۔ (ایڈیٹر)

مسز سروجنی نائیڈو

اب سے تیس سال پہلے

(از علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی)

دسمبر کا آخری ہفتہ حسب معمول ہماری قومی مجلسوں کے لگن کے دن تھے، امسال کلکتہ کی سرزمین میں ان کے تمام مراسم ادا ہوئے، شور و غل، ہجوم و اژدہام، جوش و خروش کے بڑے بڑے منظر یہاں دیکھے، زبانوں کی سحرکاری، الفاظ کی روانی، دلائل کا زور، مطالب کی اہمیت اور مقاصد بیان کی عظمت، ان میں سے ہر شے فراوانی کے ساتھ ہر جگہ موجود تھی۔

لیکن کیا شے نہ تھی؟ سحر تھا لیکن اثر نہیں، روانی تھی لیکن صفائی نہیں، زور تھا لیکن ہاتھ میں نہیں، اہمیت تھی لیکن بیان میں، عظمت تھی لیکن الفاظ میں، شور و غل تھا لیکن غیر مفہوم ہجوم و اژدہام تھا لیکن مور و مگس کا، جوش و خروش تھا لیکن اُس دریا کا جس کی تہ میں گوہر نہیں۔

ہم سے کہا جاتا تھا کہ اب وہ وقت آیا ہے کہ اس وقت "تڑپتی ہوئی لاشوں، کٹی ہوئی رگوں اور بہتے ہوئے خون کی ضرورت ہے" ہم سراپا اثر ہو کر جھک کر دیکھنے لگتے تھے کہ خوش بیان مقرر کے سینہ میں تڑپتی لاش ہے؟ گردن میں کٹی ہوئی رگ ہے؟ بدن میں کہیں بہتا ہوا خون ہے؟ لیکن تامل کے بعد نظر آتا تھا کہ یہ صرف رونقِ بازار اور گرمیٔ ہنگامہ کا سامان تھا، نہ کہیں لاشیں تڑپی ہیں، نہ کہیں رگیں کٹی ہیں، نہ کہیں خون بہا ہے۔

اُم الاحرار کے جلوس میں اللہ اکبر کے زلزلہ انداز نعرے دمبدم سنائی دیتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا کنگرہ اب زمین پر آتا، یا زمین کا طبقہ اب نیچے کو دھنس جانا چاہتا ہے

لیکن جب بھیڑ چھٹ جاتی تو آسمان اپنے مدار پر اور زمین اپنے نقطہ پر نظر آتی تھی۔

ہم نے کہا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ مسلمان دم میں جل جانے والے اور جلا دینے والے کوہِ آتش فشاں ہیں، لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتشکدہ نہیں، وہ ایک لمحہ کے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آپ ہیں، لیکن ہمیشہ بہنے والے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے چشمے نہیں۔

ہم جوشِ بیان، آزادیٔ قول، اور نعرۂ حق کے ساتھ ایک اور چیز بھی ڈھونڈھتے ہیں۔ متانتِ رائے، استقلالِ عزم اور دوامِ عمل! دنیا کی تاریخ قول سے نہیں عمل سے بنی ہے، اس لئے ہمارے نزدیک کمزور عمل، پُرزور بیان سے بہتر، اور تھوڑا کرنا بہت بولنے سے اچھا ہے۔

سرسید نے ابنِ خلدون کے نظریہ کے مطابق ایک مضمون لکھا ہے کہ "ہر قوم کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے" ہم اس کلیہ میں قومی مجلسوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں، کانفرنس کی عمرِ طبعی ۳۰ برس تھی اور وہ ۳۲ برس ہوئے کہ پوری ہو چکی[1]، اب وہاں عام مجلسوں کا شور و غل اور جوش و خروش بھی نظر نہیں آتا، کانفرنس ہماری تمام مجلسوں میں سب سے زیادہ کبیر السن ہے؛ اب اس کو دوسرے کاروبار چھوڑ کر گھر کا کام انجام دینا چاہئے، اشاعتِ تعلیم کا پیغام تو ہر جگہ پہنچ چکا، اب اشاعتِ تعلیم کا کام ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں کلکتہ میں ایک اسلامیہ کالج کی بنیاد کی تجویز اگر عمل میں آجائے تو اس کو امسال کی کانفرنس کا ماحصل سمجھنا چاہئے[2]

کانفرنس کے تمام شعبوں میں سب سے مفید اور کارکن صیغہ "انجمن ترقی اردو" ہے، اور سب سے شکستہ رو شعبہ "تعلیم نسواں" ہے، اس کا کام مسلمان عورتوں کی اصلاح ہے، مگر وہ

---

[1] "ہر کلیہ میں مستثنیٰ" ہوتا ہے۔ خدا کے فضل سے کانفرنس اب ساٹھ سال کی ہو جانے پر بھی "جوان" ہے۔ (دسمبر ۱۹۲۷ء کے صدرِ اجلاس سر اکبر حیدری مرحوم اور اس زمانہ میں کانفرنس کے سکریٹری جناب نواب محمد اسحٰق خان صاحب مرحوم مغفور تھے۔) (مصنف)

[2] یہ کالج قایم ہو گیا نیز دوسرے ادارے کانفرنس کی کوشش سے قایم ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ (مصنف)

نواب "مسلمان عورت" ہو گیا ہے، کم از کم تین برس سے ہم اس کی سالانہ رُوداد سُن رہے ہیں، اس کے سُنے میں اُسی قدر لطف آتا ہے جس قدر ایک بوڑھی عورت کو آدھے پان کی کُٹی ہوئی گلوری میں۔

چند سال سے ہماری دسمبر کی قومی مجلسوں کی بہترین ساعت وہ ہوتی ہے جب دکن کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو اپنی ادھیڑ عمر لیکن نوجوانی کے لباس میں پنڈال کے اندر داخل ہوتی ہیں، سُرخ ٹوپیاں اپنی جگہ سے اُچھل پڑتی ہیں، صدارت کا مرکز اپنی جگہ سے جنبش کر جاتا ہے، اور سکریٹری اپنے نوجوان لیڈروں کی ہمراہی میں اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، ہمارا سب سے خوش قسمت لیڈر وہ ہے جس کو اُن کے قیمتی فرغل کو کندھے پر رکھنے کی عزت ملتی ہے، اور اس کے بعد خوش قسمت وہ ہے جس کے پہلو کی کرسی میں ان کو جگہ دی جائے، ہندوستان کا ہر شہر اس خوش قسمتی کے لئے اپنے اپنے فرزندوں کو پیش کر سکتا ہے، لیکن عموماً یہ فخر لکھنؤ اور بانکی پور کی قسمت میں آتا ہے۔

چند لمحہ کے بعد صدر اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اور مسز موصوفہ سے تقریر کی تحریک کا خوشگوار فرض ادا کرتا ہے، وہ بلا انکار قبول کرتی ہیں اور جادوگری کے تمام بانے لیکر سامنے آتی ہیں، الفاظ رانی کے دامنے بن بن کر داہنے بائیں اور آگے پیچھے گرنے لگتے ہیں، اسی مسحوری کے عالم میں ہاتھوں کی جنبش، دلوں کا اضطراب، آنکھوں کی گردش ہر چیز سننے والے کی بے قراری کا پتہ دیتی ہے، مسلمانوں کے طبائع کا اندازہ کرکے اسلامی مجلسوں کے لئے ایک موضوع انھوں نے مقرر کر لیا ہے، اور وہ حسب موقع اسلام، تاریخ اسلام، اور اسلاف اسلام کی مدح سرائی اور آخری تان ایک اردو یا فارسی شعر پر توڑ دینا۔

مسز موصوفہ اُس وقت نہ صرف شاعرہ بلکہ سر تا پا شاعرہ ہوتی ہیں، ان کا لباس، طرز خرام، طرز گفتار، ان کے ایک ایک عضو کی حرکت، سر کی جنبش، آنکھوں کی گردش، اس میں سے ہر چیز شاعرانہ ہوتی ہے، جب تک وہ بولتی رہتی ہیں سارا مجمع مبہوت اور متحیر رہتا ہے، ٹاؤں کی بلندی سے ہر چند فقروں کے بعد چیئرز کے نعرے بلند ہوتے ہیں، اور آخر نشست تک اس کی صدائے بازگشت بڑھتی چلی جاتی ہے، آخر اسی چیئرز کے آوازوں میں ایک اردو یا فارسی شعر پڑھ کر جب پلٹتی ہیں تو ہر کرسی خود بخود خالی ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھنے کی آرزو کرتی ہے۔ لیکن کمتر ایسا ہوا کہ اس تسابق میں لکھنؤ یا بانکی پور کی کرسی سے کہیں اور کی کرسی سبقت لیجائے، ان کے کانوں میں باتیں کرنے کا شوق اس درجہ ترقی کر جاتا ہے

اور بوڑھوں بوڑھوں سے اس باب میں وہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ہمارے ادب شناس نوجوان غصہ سے لال پیلے ہو جاتے ہیں ۔

بعد ازیں صدر اور سکریٹری فوراً اٹھ کر لیکن تبسم آمیز شرم اور حجیب کے ساتھ خطبہ کا شکریہ ادا کرتا اور کوشش کرتا ہے کہ طوطی، بلبل، قمری اور دیگر خوش رنگ و خوش آواز پرندوں میں سے کسی کی تشبیہ چھوٹنے نہ پائے، اور ہر شکریہ گزار اپنے حسن تشبیہ کے لئے دوسروں پر سبقت کے لئے بیقرار رہتا ہے، شکریہ کا آخری فقرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا "جب ہماری پردہ نشین خواتین اپنی لیاقت و قابلیت سے ہماری قومی مجلسوں پر حکمرانی کریں گی، مسز سروجنی نائیڈو نہ صرف قوم کے لئے نمونہ ہیں بلکہ وہ خود مجسم ہماری خواتین کے لئے عملی سبق ہیں"۔

آخری سین کس درجہ رقت انگیز ہوتا ہے جب وہ شکر گزاروں کے تحفے لے کر چلنے کو اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، تو اُس کی نصف کرسیاں آخری جلسہ تک خالی ہو جاتی ہیں اور صف کے اندر جہاں جہاں سے گزرتی ہیں حاضرین کا زیر لب تبسم کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھتی جاتی ہیں، اور آخر جب وہ زمین آتی ہے جہاں گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں تو کہہ نہیں سکتا کہ کس قیامت کی کشمکش برپا ہوتی ہے، اور آخر ایک سناٹا چھا جاتا ہے ۔

ہم مسز موصوفہ کے فضل و کمال کے منکر نہیں، ان کے حسن تقریر کے دل سے معترف ہیں، ان کے خیالات کی قدر کرتے ہیں، لیکن ہم اپنے مسلمان اکابر کی خفیف الحرکتیوں کو جو بھرے جلسوں میں ان سے سرزد ہوتی ہیں، اپنے قومی جلسوں کے لئے لعنت کبریٰ سمجھتے ہیں، حافظ کو آٹھویں صدی میں شکایت تھی کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

لیکن اگر چودھویں صدی میں ہوتے "جلوت" و "خلوت" کا بھی فرق وہ نہ پاتے۔

(منقول از شذرات رسالہ معارف بابت جنوری ۱۹۱۸ء)

بزمِ مصنف

پرنسپل عبدالرحمن صاحب صدر حیدرآباد اکیڈمی حیدرآباد دکن | کانفرنس کے ادارۂ تحقیقاتِ علومِ اسلامیہ کے مطبوعہ کتابچہ کا شکریہ۔

شاید آپ کو علم نہ ہوگا کہ میں نے جدید سائنس و ریاضی کے علاوہ علومِ اسلامیہ پر بھی بعض شعبہ جات میں تحقیقات کی ہے۔ اور مسلمانانِ عہدِ ماضی کے سائنس و حکمت وغیرہ پر انگریزی اور اردو میں متعدد مقالے شائع کئے ہیں۔ "حیدرآباد اکیڈمی" کی مطبوعات میں میرے مندرجۂ ذیل اردو مقالے اگر آپ ملاحظہ فرمانا چاہیں تو بھیج دئے جائیں گے۔

(١) قرونِ وسطیٰ میں عرب اور عجم کے حکماء کی علمی تحقیقات۔	صفحے ٩٨
(٢) سیاروں پر زندگی کے امکانات	٢٨ ؍
(٣) حقائقِ حیاتِ انسانی	٣٠ ؍

اوّل الذکر مقالہ کا انگریزی خلاصہ "اسلامک کلچر" میں شائع ہو چکا ہے۔ ہیئت کے ایک اہم شعبہ سے متعلق مسلمانوں کی بیش بہا خدمات پر ایک مقالہ بعنوان "فضائی علم الہیئت میں مسلمانوں کا حصہ" اسی رسالہ میں طبع ہو رہا ہے۔ اس سے اہلِ یورپ و امریکہ کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان حکماء نے صدیوں پہلے کیسی صحیح معلومات فراہم کی تھیں۔

۵ مئی کے رسالۂ استار کی اشاعت میں (جو بمبئی سے مسلم لیگ کی مدد سے جاری ہے) بعنوان "سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کے کارنامے" میرا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کو کس قدر ترقی دی۔ میری نشری تقریروں میں بھی (جو کتاب کی شکل میں شائع ہو گئی ہیں) میں نے اسلامی معاشیات اور مسلمانوں کی سائنٹفک تحقیقات پر مفید بیانات شائع کئے ہیں۔

قبل ازیں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے الخازنی کی میزان الحکمت جو طبع اور شائع کی گئی اُس میں میرا ایک نوٹ "البیرونی ابوزکریا الرازی ابن سینا" وغیرہ کے طبیعیات کے تجربوں کی اہمیت سے متعلق درج ہے۔ ممالکِ غیر کے سائنس داں جب اس کو پڑھتے ہیں تو اُن کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔

اسلامی ثقافت و تمدن سے متعلق میرے فارسی اشعار معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، ندائے حرم وغیرہ

میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔ حال میں ان کا مجموعہ مرقعِ خیال کے نام سے طبع ہوا ہے۔ ابن بطوطہ کے تحفۃ النظار کا اردو ایڈیشن سائنٹفک جغرافی اور تاریخی اشارات کے ساتھ (جس کا بیشتر حصہ ندائے حرم میں باقساط شائع ہوا ہے) مکمل کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔

براہِ کرم مطلع فرمایا جائے آیا ادارۂ تحقیقاتِ علوم اسلامیہ اس کو طبع اور شائع کرنے کے لئے آمادہ ہے۔

اسٹینلی لین پول کی کتاب "مسلم شاہی خاندان" کا اردو ترجمہ بھی میں نے کر ڈالا ہے اور وہ باجازت انگریزی پبلشر ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد کی طرف سے طبع ہو رہا ہے۔ اس ترجمہ کے ساتھ تمہید میں تاریخی مواد کو زمانۂ جنگِ عظیم تک پہونچا دیا ہے۔ اصل کتاب میں یہ مواد صرف ۱۸۹۳ء تک کا درج تھا۔

عرصۂ دراز سے میں مسلمان حکماء کی تصنیفات و تالیفات متعلق ریاضی، ہیئت، طبعیات، کیمیا، ارضیات، نباتیات، معاشیات، عمرانیات، طب، میکانیات، فلسفہ، تاریخ، و جغرافیہ وغیرہ پر یورپ و امریکہ کے مستشرقین نے جو بھی مواد فراہم کیا ہے اُس کی تفصیل اور تنقید لکھ رہا ہوں۔ بشرطِ زندگی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کتاب دو سال میں مکمل ہو جائے گی۔ اگر ادارۂ علوم اسلامیہ اس کو شائع کرنا چاہے تو ہر مضمون کا علٰحدہ علٰحدہ حصہ وقتاً فوقتاً بغرض طباعت و اشاعت بھیجا جا سکے گا۔ حیدر آباد اکیڈیمی والا اوّل الذکر مقالہ اس کتاب کا پیش لفظ سمجھا جا سکتا ہے۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

"معارف" کا ہر نمبر آپ کے علمی و تاریخی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ... کی مرتبہ بھی نواب سراج الدولہ (از مولوی رئیس الاسلام صاحب گوپاموی) نہایت محققانہ اور پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون کو پڑھتے وقت صفحہ ۹۱ کے فٹ نوٹ میں "منتخب اللغات" کا حوالہ دیکھ کر خیال ہوا کہ اس قسم کے لطائف اگر یکجا جمع کر دئے جائیں تو کاتب صاحبان کو اپنی ستم ظریفیوں کا علم ہوتا رہے اور شاید اُن کی اصلاح کا موجب ہو۔

تاریخی مضامین کے سلسلے میں "آسامی مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ" (مترجمہ اختر النساء بیگم بی۔ اے۔ جبلپور) جتنی دلچسپ ہے۔ اتنی ہی مختصر ہے۔ چند ماہ ہوئے ایک بنگالی محقق ہلاہرن لا کا ایک مفصل مضمون "سلاطینِ گور" پر نظر سے گزرا تھا۔ ابتدائی عہد میں اسلام کے ایک مایۂ ناز فرزند قاضی محمد رکن الدین سمرقندی (۵۴۴ھ – ۶۱۵ھ) معروف بابن العمید سرزمین کامروپ میں پہونچ گئے تھے چنانچہ ان کی ایک عربی کتاب "المرآۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی" (جو یوگ پر سنسکرت کی ایک کتاب "امرت کنڈ" کا ترجمہ ہے) کے دیباچے میں کامروپ کی جامع مسجد میں ایک

ہندو لوگی نعبو جر برہمن کے جانے اور قاضی صاحب کے ہاتھ پر اسلام لانے کا واقعہ ملتا ہے۔ اس ابتدائی عہد میں آسام میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر مزید تحقیقات کی جائیں گی تو امید ہے کہ زیادہ حالات مل سکیں گے۔

اب کی مرتبہ جدید مطبوعات پر تبصرے خوب ہیں۔ اُردو کے چوٹی کے رسائل میں بھی (رسالۂ اُردو کے سوا) اس سے زیادہ مفصل اور بہتر تبصرے نہیں نظر آتے۔ تبصرہ نگار (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) قابلِ مبارکباد ہیں۔ ع نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

دلی کے سلسلے میں کئی چیزیں پیش نظر ہیں، جن کی تکمیل زحمت چاہتی ہے۔ بعض فاضل دوستوں کی رائے ہے کہ اس کو کتابی صورت میں چھپوا دیا جائے۔ اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ایک مضمون کی صورت میں ہے جس کے کئی گوشے تشنۂ تکمیل ہیں۔ اور مکمل ہونے کے بعد وہ مضمون کی حدود سے تجاوز ہو جائے گا۔ اس لئے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔ آپ کو جو مضمون بھیجا گیا ہے وہ پچھلے مقالے کی آخری کڑی ہے ؎

رفتیم یاراں تخفیف تصدیع — گر درد سر بود از ما شما را

کرنیل غلام سید محمد معین الدین صاحب حیدرآباد دکن

ایک زمانہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ اخبار "یاد" (ہفت روزہ) انشاء اللہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ظفر جاوید صاحب میرے ساتھ کام کر رہے ہیں ابتدائی منازل طے ہو چکے ہیں۔ سب سے کٹھن کام یعنی پائے کے مضامین کا دستیاب ہونا باقی ہے۔ مجھکو قوی امید ہے کہ آپ میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ کے ذریعہ ایک ضروری کام یہ ہے کہ خاص یونیورسٹی کے لئے ایک نہایت ہی ایماندار، صاف گو اور غیر جانبدار نامہ نگار کا تقرر فرما دیجئے جس کے ذریعہ ہم کو یونیورسٹی کے جملہ شعبوں کی صحیح صحیح اور بے کم و کاست خبریں بروقت مل جایا کریں۔ ہم اس اخبار کو فرقہ واریت اور پارٹی بندی سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں اور صرف علی گڑھ کی تعمیری خدمت ہمارا پہلا نصب العین ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی

آپ سے روانگی کے وقت ملاقات نہ کر سکا، جس کا بے حد افسوس ہے۔ آپ کے تمام ارشادات کی تعمیل کر دی گئی۔ تفصیل یہ ہے کہ کالج میں ڈبل شفٹ جاری ہو گیا۔ سب بچے داخل ہو گئے۔ اب بحمد اللہ بارہ سو طلبا کالج میں داخل ہوں گے۔ آپ کو چونکہ ہمیشہ کالج کی ترقی سے دلچسپی رہی ہے اس لئے درخواست اور انسپکٹر کی منظوری کی نقل بھی بھیج رہا ہوں۔ اس وقت آپ کا کالج صوبہ کے اوّل درجہ کے

اداروں میں ہو گیا ہے۔ جناب مولوی مختار احمد خاں صاحب منیجر ایثار مجسم ہیں۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن

دکنیات کے متعلق آپ کا خیال درست ہے مگر میرا خیال ہے کہ دکنیات سے قطع نظر دکن کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اُس سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر صوبہ کی "اردو" اس قدر وسیع مضمون ہے کہ اُس پر کام کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے اور پھر میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ایک صوبہ والوں کو دوسرے صوبہ کے متعلق معلومات اس قدر نہیں ہوتیں جس قدر خود اس صوبہ والے کو ہو سکتی ہیں اور جو اصحاب وسیع پیمانے پر اردو کی تاریخ وغیرہ لکھا کرتے ہیں اُن میں سے اکثر کتابیں نامکمل اور تشنہ ہوتی ہیں، کیونکہ انکی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ اوروں کی تو خبر نہیں خود اپنے متعلق کہوں گا کہ اگر میں اردو کے کسی وسیع عنوان پر مضمون لکھوں تو ہرگز کامیابی نہیں ہوگی بلکہ معلومات نہ ہونے کے باعث مضمون قابل اعتراض ہوگا۔

جولائی کا مصنف وصول ہوا۔ میری کتاب "عہدِ آصفی کی قدیم تعلیم" پر سیّدہ امیر فاطمہ صاحبہ نے جو تنقید فرمائی ہے۔ اُس کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری خدمات کی بیگم صاحبہ نے جن بلند پایہ الفاظ میں ستائش کی ہے۔ اُن کے لئے بھی سپاس گزار ہوں۔ ایسے ہی حوصلہ افزائی کے باعث باوجود دفتری مصروفیت وغیرہ کے کچھ نہ کچھ لکھنے کی جرأت ہوا کرتی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ کے دونوں تاریخی مقالے "جنرل بخت خاں" اور "حضرت محل" کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو نہایت مفید ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی چیرمین شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی

یہ بہت خوب ہوا کہ کلیات نظیر کے مقابلے کا کام آپ نے مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شروانی کو سپرد کر دیا۔ نول کشوری نسخہ جو میں نے بھیجا ہے اُس کے صفحہ ۱۵ (آغاز دیوانِ نظیر) سے صفحہ ۳۳ کے آخر (لطف کن لطف کہ این بار بہ قسم رفتم) تک کا مقابلہ نہ کیا جائے اس لئے کہ نثر اور فارسی کلام کا شامل کرنا مقصود نہیں اور بھی بعض جگہ فارسی کلام آ گیا ہے وہ بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح مطبع الٰہی والے مطبوعہ نسخے کے تیسرے اور چوتھے دیوان سے غرض ہے۔

"موتی کی لڑی" (جو ایک عربی رسالے کا ترجمہ ہے، ۱۲۲۴ھ میں کسی آگرہ کے مطبع میں چھپی تھی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کو لکھ کر دریافت کیجئے کہ آیا اس کتاب کا کوئی نسخہ قیمت پر یا مستعار مل سکتا ہے یا نہیں۔ مترجم کا نام منشی محمد سجاد حسین انجم کسمنڈوی ہے۔

نواب بہادر میجر مرزا ابوجعفر صاحب کلکتہ | چندے کے پیسے کی کیا بات ہے وہ تو میں کل بھیج دوں۔ لیکن پھر اس کے بعد آپ کی توجہ خاص کی توقع رکھنا ایک فعل عبث ہوگا۔ اس لئے تأمل کرجانا ہی مصلحت ہے۔ دیکھیں آپ جیتیں گے یا یہ مخلص۔ کیا عجب ہے کہ اکتوبر۔ نومبر کے لگ بھگ میں علی گڑھ جاؤں۔ کیا آپ کے درشن بھی ہونگے؟ (بھینٹ پر موقوف ہے۔ مدیر) نواب صاحب کی خدمت میں آداب تسلیمات۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی پونہ | آپ نے ”کانفرنس اسلامک ریسرچ اکیڈمی“ کے بارے میں کچھ باتیں لکھی تھیں میری بہت بڑی خواہش ہے کہ علی گڑھ کے اسلامی ماحول میں آکر کچھ کام کروں۔ آپ کے معنّف میں قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کا مضمون دکنی پر شائع ہوا تھا۔ اگر موصوف کا کوئی اور مضمون شائع ہو تو مجھے ضرور ارسال کیجئے جناب قبلہ نواب صدر یار جنگ بہادر اور پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی کی خدمت میں سلام علیک۔

مولوی حمید علی صاحب دارالاشاعت پنجاب لاہور | پبلشرز یونائیٹڈ یہ فرم ہم آٹھ پبلشرز نے مل کر بنائی ہے اور یہاں آٹھ اداروں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں، باری باری سے ہر سال ایک پبلشر کے ہاتھ میں انتظام ہوتا ہے۔ اس سال شیخ محمد اشرف کے ہاتھ میں ہے۔ لاہور میں کتابوں کی مقامی بکری کا کام زیادہ تر اب اسی فرم کے ہاتھ میں ہے اور کامیاب تجربہ ہے

نواب صدر یار جنگ بہادر علی گڑھ | جولائی کا معنّف ابھی پڑھ کر رکھا ہے۔ اس مرتبہ طبع میں غلطیوں کی شدید کثرت ہے اس طرف توجہ کیجئے۔

صاحبزادہ ممتاز علی خاں بی۔ اے (علیگ) بہادر ور | جولائی کا معنّف انتظار بسیار کے بعد ۲۴ اگست کو موصول ہوا۔ آپ کی مجبوریوں کے علم نے انتظار کی تلخی کو دور کردیا۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوشیں لائق صد ستائش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معنّف کو نکال کر آپ قوم اور زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ معنّف ۱۵ کے مضامین عمدہ اور پُرازمعلومات ہیں لیکن ان میں سے بعض میں ذاتیات کا ذکر ہے اور یہ بات فی زمانہ پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ وقت کا اقتضا یہ ہے کہ سیاست، ناضرہ معلومات جدیدہ اور قومی زندگی سے متعلق موضوعات پر اظہار خیال کیا جائے۔

منشی حبیب الرحمن عبدالجلیل لیس گوٹہ والے آگرہ | ہماری نظروں سے جناب کا رسالہ معنّف گزرا۔ بہت کامیاب پرچہ معلوم ہوا۔ اور آپ کی علمی۔ ادبی اور اخلاقی

خدمات لائقِ تحسین ہائیں۔ یہ کسی قسم کی مصنوعی تعریف یا بناوٹ پر مبنی نہیں۔ ہمیں اشتیاق پیدا ہو
ہے کہ ہم بھی رسالے کے خریدار بن جائیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف جادوگر ہے تو لہ
اس کا علاج بھی کیجئے اور ماہ جولائی کا رسالہ فوراً بذریعہ وی پی بھیج دیجئے۔ یا آپ تحریر کریں تو می
روانہ کر دیا جائے۔ پاکستان زندہ باد! مسلم لیگ زندہ باد!! شمشیرِ اسلام قائدِ اعظم محمد علی جناح زندہ باد

محمود بریلوی صاحب سابق سب ایڈیٹر بمبئی کرانیکل"

مصنف کے اپریل نمبر میں مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھی تھی۔
معلوم ہوتا ہے کہ تصوریؒ عمر میں آپ کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کیونکہ اُس شمارے میں بھی مرحوم کے
جو کچھ آپ نے لکھا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں ان بزرگ مرحوم سے پہلی مرتبہ ان کی وفات سے چند
قبل ملا تھا۔ وہی مرحوم سے میری آخری ملاقات بھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ غالباً دسمبر ۱۹۴۵ء میں ملی
گے اسٹیشن پر بریلی آنے والی گاڑی کے سکنڈ کلاس میں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اسی کمپارٹمنٹ
میں مولانا مرحوم تشریف رکھتے تھے۔ جن سے ملنے کے لئے آپ اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ آپ نے
میرا تعارف ممدوح مرحوم سے کرایا تھا۔ یہ سعادت مجھے آپ کی بدولت ہی نصیب ہوئی۔ بریلی تک
موصوف مرحوم کا اور میرا ساتھ رہا۔ مرحوم نے میری تصانیف کے بارے میں مجھے بڑے مفید
مشورے دئے تھے۔

"مصنف" کے موجودہ جولائی ۱۹۴۶ء نمبر میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد کا مقا
"قدیم اردو (دکھنی) میں سیرت النبی کا ذخیرہ" بہت مفید و پُر از معلومات مضمون ہے۔ موصوف ہندو
کے اُن چند گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جن کا ہر مضمون اور مضمون کا ہر لفظ غور سے پڑھنے اور فا
اٹھانے کے لائق ہوتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "مصنف" کو مولوی صاحب موصوف ایسا
لائق بزرگ کی قلمی اعانت حاصل ہے۔

اسی شمارے میں قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی رئیس جوناگڑھ کا قابل قدر مضمون
"ولی گجراتی" نظر سے گزرا۔ جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) جیسے دُور افتادہ مقام میں رہ کر عربی و فارسی کا یہ
اور اردو کا زبردست ادیب و شاعر جو عظیم الشان ٹھوس خدمت زبان و ادب کی کر رہا ہے وہ پنجاب
اور یو۔ پی کے نام نہاد ادیبوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ مجھے قاضی صاحب موصوف کی خدمت
میں ذاتی نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ ۱۹۳۹ء میں جب کہ میں سید واڑہ جوناگڑھ میں مقیم تھا قا
صاحب ممدوح کی خدمت میں کئی بار حاضری دینے کی عزت نصیب ہوئی اور موصوف نے اپنی کئی تصا

مجھے عطا فرما کر — افتخار بخشا۔ غالباً قاضی صاحب اس ہیچ میرز کو بالکل بھول نہ گئے ہوں گے "معنف" کے جنوری۔ اپریل اور جولائی کی " بزم مصنف " میں آپ کے دلچسپ خطوط پڑھے۔

" معنف " کے اپریل ۱۹۴۶ء نمبر میں مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب کا مضمون " بحیرۂ روم میں اسلامی حکومت " میرے بڑے کام آیا۔ اپنی ضخیم زیر ترتیب تالیف " تاریخ اسلامیاتِ عالم " میں اس سے استفادہ کروں گا۔ انشاء اللہ۔ اسی شمارے میں مفتی انتظام اللہ الشہابی صاحب اکبرآبادی کا " صہبائی " پر مقالہ خاصے کی چیز ہے۔ " میر شکوہ آبادی " پر بھی آپ کا جولائی نمبر میں مضمون نہایت بلند پایہ ہے۔ تاریخ زبان و ادب اردو میں مفتی صاحب ممدوح کی حیثیت سند کا مرتبہ رکھتی ہے۔ میں سالہا سال سے آپ کے مضامین سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ سید لطیف حسین ادیب بریلوی کا مقالہ " میر کی شاعری پر ایک عام نظر " اور ڈاکٹر سید شریف احمد چشتی کا مضمون " اسلامیانِ ہند کی تعلیمی ضروریات " دونوں بڑی دقتِ نظر سے لکھے گئے ہیں۔

اسی نمبر میں مولوی مہر محمد خاں شہاب صاحب مالیرکوٹلوی مقیم بمبئی کا مراسلہ " بزم معنف " کے ماتحت نظر سے گزرا۔ شہاب صاحب میرے دیرینہ کرمفرما ہیں اور آٹھ برس پہلے ہم دونوں ہمسایہ رہ چکے ہیں۔ اُس وقت موصوف اور میں دونوں " بزم ادب " بمبئی کے رکن تھے۔ جس میں میں نے اپنا مشہور مقالہ جس پر شیعہ پرچوں نے میری بڑی لے۔ دے کی تھی " شاہ نامۂ فردوسی پر ایک محققانہ نظر " پڑھا تھا اور اُس زمانہ میں متعدد ماہ ناموں نے اسے نقل کیا تھا۔ " اودھ پنچ " لکھنؤ نے اس پر بڑی سخت نکتہ چینی کی تھی کیونکہ اس میں محمود بریلوی اور محمود غزنوی کی سازباز نمایاں تھی۔

اب کہ میں سات ماہ سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ آٹھ برس کی مسلسل غیر حاضری کے بعد بمبئی آیا ہوں۔ مصروفیت اوقات کا یہ عالم ہے کہ اس اثنا میں صرف ایک مرتبہ ٹیلیفون پر محبی پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی خیر و عافیت معلوم کر سکا اور ایک مرتبہ جب میں ٹیکسی میں جا رہا تھا تو شہاب صاحب پیدل کسی طرف جاتے ہوئے میرے برابر سے گزر گئے۔ ملاقات و تجدیدِ تعارفات کی ہنوز حسرت ہی۔ شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری مقیم لکھنؤ جوائنٹ سکریٹری " آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس " جن کا خط اپریل کی " بزم مصنف " میں شائع ہوا ہے۔ میرے دیرینہ عنایت فرما ہیں۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں جب میں صوبۂ یو۔ پی کے لئے لکھنؤ میں " اورینٹ پریس " کا ایڈیٹر انچارج تھا تو موصوف ہی نے ابتداً میرے دفتر وغیرہ کے قیام کا انتظام کیا تھا اور ہمیشہ مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے رہے۔ قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی کی طرح میں نے بھی ممدوح کے اس فقرہ سے کہ " میں اور مولوی طفیل احمد صاحب۔ مولوی ولایت حسین صاحب اور خان بہادر

حبیب اللہ خاں صاحب بالکل سرسید مرحوم کی طرح ہمدرد مسلمان ہیں۔" بہت لطف اٹھایا۔ اس "میں" کے باوجود شیخ صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ اور فنِ کتابت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

"مصنف" کے جنوری نمبر میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔ سیّدہ انیس فاطمہ صاحبہ اور آل۔ احمد صاحب اکبر آبادی کے مقالات بہت خوب ہیں۔ سیّدہ انیس فاطمہ صاحبہ کے مضمون "حضرت محل" کی داد تو انھیں کافی مل چکی ہے۔ قاضی اختر صاحب جوناگڑھی نے اس کی مبارک باد اشارتاً آپ کو دی ہے۔ یہ خطرناک قسم کی چھیڑ ہے۔ سیّدہ انیس فاطمہ صاحبہ کی جانب سے میں احتجاج کرتا ہوں۔ آل احمد صاحب اپنے افسانوں اور مقالوں کی "نیازی" طرزِ تحریر سے زیادہ اردو داں طبقے میں اپنے نام کی طوالت کے باعث مشہور ہیں۔

میری کتابوں کی طباعت و اشاعت کے بارے میں آپ نے اب تک میری کوئی اعانت نہیں فرمائی۔ جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ میری ایک تالیف "فلسطین و مسئلہ یہود" انوار احمدی پریس الہ آباد میں زیرِ طباعت ہے۔ انشاء اللہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں اس کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں پہونچ جائے گی۔ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی میرے پاس تیار ہے۔ اس کے علاوہ "ہندی شاعری" اور "سوویٹ روس اور اشتراکی انقلاب" بھی تیار ہیں۔ یہ سَو۔ سَو صفحات کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ میرے مختصر افسانوں کا مجموعہ "سرابِ زندگی" پریس میں جانے کے لئے تیار ہے۔ دو مزید ضخیم کتابیں یعنی "تاریخ اسلامیانِ عالم" اور "سیاسیاتِ ہند جدید اور دیسی ریاستیں" زیرِ ترتیب و تدوین ہیں۔ اوّل الذکر کے تین حصے (۵۰۰ صفحات) صاف کرکے لکھ چکا۔ چار حصص (غالباً سات سو صفحات) لکھنا باقی ہیں۔ ثانی الذکر کے دو سو صفحات لکھ چکا۔ غالباً تین سو باقی ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی کو وائی اسٹیٹ

میں نے رسالہ "مصنف" کو بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے مضامین مندرجہ بذاتِ خود اس قدر دلچسپ ہیں کہ پڑھنے والا دلچسپی لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ براہِ کرم مجھے وہ نمبر بھی بھیج دو جس میں "جنرل بخت خاں مرحوم" (از سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی) کے حالات درج ہیں۔ میں ایک عرصہ سے ۱۸۵۷ء کے اس گمنام ہیرو کے سوانحیات پڑھنے کا آرزومند تھا۔ الحمد للہ کہ "مصنف" کے طفیل یہ آرزو پوری ہو جائے گی۔

جنوری ۱۹۴۶ء کے "مصنف" میں مجھے عزیزہ سیّدہ موصوفہ کا مضمون بعنوان "حضرت محل" بہت پسند آیا۔ چونکہ بقول حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ :-

"اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُن کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے۔ اسے از سرِ نو گرم کیا جائے اور تیزی کے ساتھ دوڑایا جائے۔"

اور یہ مقصدِ عظمیٰ اس مضمون کے مطالعہ سے بدرجۂ اولیٰ حاصل ہو سکتا ہے۔ عزیزہ سیدہ لائق تحسین و آفرین ہیں کہ اپنے اوقات عزیز کو ملّی اور ادبی خدمت میں بسر کرتی ہیں۔ کثّر اللہ تعالےٰ امثالہا فی قومنا۔

میں نے تم سے سرسری طور پر ذکر کیا تھا کہ میں انگریزی زبان میں مسلمانانِ ہند کی کلچرل تاریخ لکھنی چاہتا ہوں اُس میں سیاسی تاریخ کے علاوہ ہندوستان کے صوفیا، اور علما، اور مقامی تحریکوں کے حالات بھی بہت شرح و بسط سے لکھنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے اُن کتابوں کے ناموں سے مطلع کرو جو اس سلسلہ میں کارآمد ثابت ہو سکیں گی۔

شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب عباسی گورکھپور | آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے مدت گزری۔ ارادہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی جوبلی میں آؤں اور آپ سے بااطمینان ملاقات ہو۔ اب کی بار "مصنف" باعتبار مضامین کچھ خوب نہیں ہے۔ "موازنہ جوگ و تصوف" بھیج رہا ہوں۔ آپ کی فرمائش سے مرتب کیا ہے اور اسی مضمون میں آپ کا ذکر خیر بھی ہے۔

مولوی آفتاب احمد خاں صاحب آگرہ کالج آگرہ | جولائی سنہ ۳۶ء کا "مصنف" پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ اگر آپ اسکی ایک کاپی ہر ماہ میرے لئے روانہ کر دیا کریں تو عنایت ہوگی۔ جواب ملنے پر ایک سال کا چندہ بذریعۂ منی آرڈر بھیج دوں گا۔

منشی عبدالعزیز خاں صاحب بریلی | بریلی کی کوئی تاریخ موجود نہ تھی۔ میں نے لکھی ہے اور تیار ہے۔ اور میں اب مشورے کے لئے آمادہ ہوں۔ ہمارے آپ کے باہم عرصہ سے خلوص اور یکجہتی قائم ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ اُسے دیکھ لیتے۔

مولوی محمد بہلول خان صاحب ناظم جمعیت افاغنہ چوسلچ پور | آپ کو معلوم ہے عرصے سے گوشہ نشین ہوں۔ لیکن ہند کے موجودہ خلفشار میں گوشہ نشین رہنا ممکن نہیں۔ ایک ہزار سال کی جانفشانی برباد ہو رہی ہے۔ اسلام خطرہ میں ہے مجھے میدانِ عمل میں اُترنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے قدیمی رفقائے کار کو اپنے ارادہ سے مطلع کر دیا ہے۔ آپ کی طرف سے مجھے یقین کامل ہے کہ آپ ہر ممکن طور پر مجھے سہارا دیں گے اور میری جد و جہد کو کامیاب بنائیں گے۔ مہربانی فرما کر اپنے یہاں سے "کانفرنس گزٹ" کو بدستور قدیم میرے نام پر جاری کر دیں اور اپنا رسالہ "مصنف" بھی مجھے بھیجتے رہیں ان شاء اللہ میں اُن میں مضامین دیتا رہوں گا۔

مولوی حسن احمد صاحب زبیری محبوب نگر دکن

مولانا طفیل احمد صاحب کی حالت آپ سے بالمشافہ معلوم ہو گئی تھی۔ بعد کو اخبارات کے ذریعہ ان کے انتقال کی کیفیت معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے (آمین) یہاں کے ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول حیدرآباد کے رہنے والے ہیں ولایت کے تعلیم یافتہ اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے۔ میرے پڑوسی اور ملاقاتی ہیں۔ پرسوں میں نے اُن سے اتفاقیہ طور پر یہ خواہش کی تھی کہ کوئی عمدہ کتاب مطالعہ کے لئے اپنے اسکول کے کتب خانہ سے میرے پاس بھیج دیں عجیب اتفاق دیکھئے کہ کل انھوں نے آپ کی مؤلفہ کتاب "حیاتِ حافظ رحمت خاں" بھیجی۔ گو میں عرصہ ہوا اس کتاب کو دیکھ چکا ہوں۔ مگر وہ ایسی دلچسپ ہے کہ رات ہی سے میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ جب سے یہ کتاب میرے پاس آئی ہے اس نے آپ کی یاد کو اور تازہ کر دیا۔ کانفرنس کا اخبار اور کانفرنس سے متعلق لٹریچر نیز اپنی مصنفہ کتابیں بھیج دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔ یہاں اور دوست مطالعہ کر سکیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی کانفرنس کے ممبر بھی بن جائیں۔

مولانا لطف الرحمن صاحب ناظم ادارہ ترجمان القرآن مالدہ بنگال

عرصہ سے خط و کتابت کا موقع نہیں ملا۔ جس کی وجہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ باوجود عادت سکون مجبوراً ہنگاموں میں کودنا پڑتا ہے۔ اب میں مالدہ میں سکون کے ساتھ کام کرنے کے لئے آگیا ہوں۔ سارجنٹ اسکیم پر "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا مطبوعہ تبصرہ ہمارے سکریٹری مولوی عبدالحمید صاحب لے گئے اور ہنوز واپس نہیں آیا اس لئے بھیج دیجئے۔ اصل اسکیم باوجود طلب نہیں آئی اگر ممکن ہو قیمتاً منگوا کر وی۔پی کرا دیجئے۔

اب یہ نئی حکومتیں بحال ہو گئی ہیں، بہار نے بنیادی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم منظور کر لی، کانفرنس کو تو اپنی لائن پر کام کرنا چاہئے، میں بھی ممکن خدمات دے سکتا ہوں۔

مولانا مرحوم سید طفیل احمد صاحب کی یاد بار بار ستاتی ہے۔ میں نے آپ کو تعزیتی خط لکھا تھا اور یہاں ایصال ثواب کا نظم بھی مدرسہ میں اور کلاس میں کیا تھا۔

تبصرے

(از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

افکارِ امام غزالی کے چند بنیادی پہلو | بزبانِ انگریزی۔ مصنف پروفیسر عمرالدین صاحب ایم اے لیکچرر شعبۂ فلاسفی۔ شائع کردہ ارشاد بک ڈپو کانفرنس مارکٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ .... قیمت ۳ روپے

امام غزالی کی مسلّمہ اہمیت اور احوالِ امت پر اُن کی اصلاحی تدابیر کا اثر ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ یونان کے نظام فلسفہ کی اصلاح و تکمیل میں مسلمان مفکرین کی کامیاب سعی کی تاریخ بغیر غزالی کے تذکرے کے ممکن نہیں۔ زندگی کے وہ اہم مسائل جو غزالی کے وقت تک فلسفہ کے حدود سے باہر تھے اُن کی دانشمندانہ اور سلجھی ہوئی کوششوں نے اُن کا حل فلسفیانہ اصطلاحات میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غزالی کا طریقہ آسان اور فطری ہے۔ وہ ایک سوال قائم کرتے ہیں اور پھر اُس کا اسلامی نقطۂ نظر سے فلسفیانہ اصطلاحات اور اصول کے لحاظ سے جواب دیتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف نے بھی غزالی کے بعد اُلجھ جانے والے مسائل پر ایسے ہی سوالات قائم کرکے موجودہ فلسفہ کی روشنی میں خود غزالی کے نظریات اور حوالے سے اُن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اُن کی کامیابی کا اعتراف علامہ اقبال۔ پروفیسر کرنکاؤ۔ ڈاکٹر اولیری۔ ڈاکٹر اسٹوری ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ اور دوسرے اکابر نے بجا طور پر کیا ہے۔ کتاب کی خصوصیت عام فہم اور آسان طرز بیان ہے۔ اہم اور پیچیدہ مسائل کو کامیاب طریقہ سے بیان کرنا اپنی جگہ پر خود ایک بڑی کامیابی ہے۔ اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں جن میں غزالی کے اُن نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مجبوری، حریت، حقیقتِ حقہ، رُویتِ باری تعالےٰ۔ آزادیٔ رائے، اصولِ اخلاق وغیرہ جیسے مسائل سے متعلق ہیں۔

عرب کا خود ایک بلند مرتبہ اور عظیم الشان تمدن تھا۔ لیکن قومیں جب گرتی ہیں تو نہ صرف اپنی عظمتِ دیرینہ سے بیگانہ ہو جاتی ہیں بلکہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ اُن کو معمولی انسانیت سے بھی کوئی نسبت نہیں رہتی۔ مسلّمات عقائد کی صورت میں اور اصول رسموں کے طور پر بگڑی ہوئی شکل میں رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے تمدن کا کوئی نشان حضور سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونیکے

وقت باقی نہ رہا تھا۔ اسلام جب ایران میں پہونچ کر نور افروز ہوا تو تمام عالم کے تمدنوں سے ایک ایسا تصادم پیش آیا کہ جس کا احساس بہت عرصہ تک نہ ہو سکا۔ لیکن اُس کے اثرات خطرناک صورتیں اختیار کرتے گئے۔ چین کے طاؤسی عقائد۔ ہندوستان کے ویدانتی نظریات۔ مصریوں کے وجودی خیالات اور یونانیوں کے اُلجھے ہوئے فلسفے کا اسلام پر زرغہ ہوا۔ اور اسلامی زندگی میں ایرانی تمدن اور مزدکی اور زرتشتی عقائد سرایت کرنا شروع ہو گئے۔ ابتداءً اسلامی متکلمین نے یرانی تعلیمات کو اصطلاحات غیر میں بیان کرنے کی کوشش مخاطبین کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسلامی عقائد اور اصولوں کی جانچ کا معیار وہ چیز ٹھیری جسے غلطی سے فلسفۂ یونان کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک نیا فلسفہ تھا جو تمام عالم کے انسانی افکار سے مُرتّب کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اور مطالب کی بنا نظریات پر ہوتی ہے اور خود نظریات اقدار کے تابع۔ دین برحق اقدار کے حقیقی تعین سے شروع ہوتا ہے اور اصول قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا بہ تقید۔ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ اس پر حاوی ہے۔ ابنائے ملت اسلامیہ نے انسان کے مقرر کئے ہوئے معیاروں کے چکر میں اپنے بنیادی اصولوں سے دوری کو محسوس نہیں کیا اور بتدریج صورت ایسی پیدا ہو گئی کہ قرآن کو معیار قرار دے کر جو کہ صداقتِ کبریٰ ہے زندگی کے تمام اصولوں کو جانچنے کی عادت نہ رہی۔ یہ کام کرنے کا سہرا حضرت امام غزالی کے سر ہے۔ اور زمانہ حال میں اس اقدار بازی کے طومار اور مصطلحات بے محابا کے طوفانِ تخلیق کے علاوہ بھی خود زندگی کا جو نہج ہے اُس کے پیشِ نظر ایک صحیح اور بے لوث محاکمہ کی ضرورت ہر طرف محسوس کی جا رہی ہے تاکہ بنی نوعِ انسان کے لئے ایک مشترک اور اتفاقی نظامِ عالم ممکن ہو سکے۔

اس حیثیت سے بھی پروفیسر عمر الدین صاحب کی یہ کتاب ایک برمحل اور مفید خدمت ہے جو واضح طور پر ایک نئی راہ کی طرف رہبری کرتی ہے۔ ارشاد بک ڈپو کے مالک سید ارشاد علی صاحب اپنی اس اولوالعزمی پر لائق مبارکباد ہیں کہ اسلامیات پر انگریزی زبان میں عمدہ اور معیاری کتابیں شائع کرنے کا انھوں نے اس کتاب کی اشاعت سے مبارک اقدام کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دارالعلوم علی گڑھ اور بیرونجات کے معارف پرور بزرگ اُن کی ہر ممکن طریقہ سے ہمت افزائی کریں گے تاکہ وہ جلد از جلد علی گڑھ کے "شیخ محمد اشرف" ہو جائیں اور اساتذۂ مسلم یونیورسٹی کی بکثرت علمی و تحقیقی کاوشیں جو عرصہ سے تشنۂ طباعت ہیں ان کے ذریعہ بآسانی اور پُر منافع طریقہ پر منظرِ عام پر آ سکیں۔

تقویۃ الایمان | مصنفہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید صاحب رح شائع کردہ اقبال اکیڈمی۔ علم منزل۔ تاجپورہ لاہور

حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی اور اُن کے دست راست حضرت اسمٰعیل شہید کی سیاسی تصانیف کی طرح مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی کتابیں بھی عرصہ دراز تک مسلمانوں کی عدم توجہی کا شکار رہیں اور یہ نتیجہ تھا اُس غلط انگریزی پروپگنڈے کا جو بعض علماءِ سوء کے ذریعہ عرصۂ دراز تک ہندوستان میں سید صاحب اور اُن کی انقلابی تحریک کے خلاف ہوتا رہا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ تشدد اور دار و گیر کے مذموم طریقے بھی اختیار کئے گئے۔ اگر کسی جماعت یا فرد پر تحریک "وہابیہ" سے وابستہ ہونیکا ادنیٰ سا شبہ ہوتا تو اُس کو گورنمنٹ کے لرزہ براندام مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری ثلث ربع میں سید صاحب کے عقائد سے ہمدردی اور اُن سے محبت کرنے کی پاداش میں سینکڑوں مسلمان پھانسیوں پر لٹکائے گئے۔ ہزاروں کو سزائے قید ہوئی۔ بکثرت جائدادیں ضبط ہوئیں۔ اور کالے پانی بھیجے گئے۔ جو خاص اُنہی کے لئے کھولا گیا تھا کیونکہ بعض حکامانِ انگریزی کا خیال تھا کہ بعض پھانسی کی سزا مجرموں کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ وہ اُس کو خوشی خوشی قبول کرتے ہیں۔

ان حالات میں سید احمد صاحب شہید۔ حضرت اسمٰعیل شہید اور اُن کے دوسرے رفقاء کار کا تذکرہ منظر عام پر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔

خدا بہشت نصیب کرے مولانا جعفر تھانیسری مرحوم کو کہ انھوں نے ایام اسیری انڈمان ہی میں تذکرۂ بالا مجاہدین اسلام کے حالات اور اُن کی تصانیف کا تذکرہ اپنی کتاب "تاریخ عجیب" (الموسوم "کالا پانی") میں قلم بند کئے جو حوادثِ روزگار کے سینکڑوں تھپیڑوں کے باوجود ہم تک پہونچ بھی گئے۔ لیکن عرصہ تک اُن پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ سب سے پہلے مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم مغفور نے نقلِ خموشی کو توڑا اور تذکرہ کی کتاب سے استفادہ کرنے کے بعد تحریک "وہابیہ" کے بانی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید صاحب کے حالات سے موجودہ عہد کے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔ مولانا مرحوم کی کتاب "روشن مستقبل" نے بانگِ جرس کا کام دیا اور اب اکثر مشہور اہلِ قلم حضرات کی اس موضوع پر توجہ ہے۔ سید صاحب اور شاہ صاحب کے سوانحات اور اُن کی بیش قیمت تصانیف کے اردو تراجم شائع ہو رہے ہیں۔

پیش نظر کتاب بھی شاہ اسمٰعیل شہید صاحب کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ ہے جس میں مولانا غلام رسول صاحب مہر ایڈیٹر انقلاب لاہور کا مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ کتاب مذکور کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں:۔

"شاہ شہید کی تصنیفات میں سب سے زیادہ "تقویت الایمان" مقبول ہوئی۔ اور سنو سال کی مدت میں

اس کتاب نے اصلاحِ عقائد کا نہایت اہم کام انجام دیا۔"

کتاب کے پہلے باب میں توحید کی تعریف اور شرک کی مذمت کی گئی ہے۔ دو باب اتباعِ سنت اور بدعت کی برائی میں ہیں۔ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں کیا گیا ہے۔

سلکِ گوہر — از مہکش بدایونی۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:—
نرینڈرس بک ہاؤس۔ رسل گنج علی گڑھ

یہ مختصر کتاب جناب مہکش کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہنہ مشق بزرگوں کی سی متانت اور سنجیدگی دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ ان کو شباب ثانی کا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔ جوانی دیوانی مشہور ہے اور پھر شاعری کی دنیا میں تو گویا سب کچھ معاف ہے۔ اکثر شاعر پیرِ فرتوت ہو کر بھی جب کہ کھانے اور دکھانے تک کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔ لہک لہک کر اپنی بھیانک آواز میں ایسے ایسے حیا سوز جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ نوجوانوں کا شرم سے منہ چھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔ مہکش صاحب لائقِ مبارکباد ہیں کہ اس روشِ عام سے ہٹ کر فکرِ سخن کرتے ہیں۔ خدا ہمارے دوسرے نوجوان شعرا کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

نہ پوچھ وحشتِ شب ہائے بیکسی ہمدم — کہ ہر نفس مجھے جینا وبال ہوتا ہے
کبھی نشاطِ گزشتہ کو یاد کرتا ہوں — کبھی فراق سے دل کو ملال ہوتا ہے

چند شعر یہ ہیں:—

سوزِ غمِ پنہاں کو دبا لیتا ہوں — خلوت میں کبھی اشک بہا لیتا ہوں
جب آہ لبوں پر مرے آجاتی ہے — اشعار کے پردے سے چھپا لیتا ہوں

جہانِ آرزو — از حضرت آرزو لکھنوی۔
شائع کردہ "نفیس اکیڈمی"۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

حضرت آرزو لکھنوی عرف منجو صاحب حضرت جلال کے شاگرد اور جانشین ہیں۔ جلال اور ان کے شاگردوں بالخصوص آرزو کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی کے الفاظ اور ایسے الفاظ جن میں اضافتیں ہوں کم سے کم لاتے ہیں۔ عوام کے لئے ٹھیٹ اردو اور چلن سار الفاظ کو سہل تر بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ متروکات سے اجتناب کا سلسلہ ناسخ سے شروع ہوا۔ جلال نے تکمیل کی بلکہ انھوں نے بعض متروکات خود تجویز کئے۔ مثلاً "پہ" چھوڑا اور "پر" استعمال کیا اور

ب وہ عام طور پر مستعمل ہے۔

صحتِ الفاظ کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس میں افراط و تفریط ہو گئی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ خاص اُن زبانوں کے تلفظ میں لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً "لال ٹین" کو "لین ٹرن" لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ صورت پسندیدہ نہیں ہے اور کانوں کو اسی طرح گراں گزرتی ہے جس طرح حیدرآباد میں دسمبر کو "ڈسمبر" اور مدراس میں "جج" کو "جڈج" بولتے ہیں۔ پیش نظر مجموعۂ کلام آزرد صاحب کی کہنہ مشقی کا آئینہ دار ہے۔ پختگی زیادہ اور آمد و روانی بھی ہے اور جہاں تک سوز و گداز کا تعلق ہے اُن کی غزلوں میں ذوق کا سا رنگ نظر آتا ہے۔ مجموعۂ کلام دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے اور اس کی اشاعت سے ہمارے سرمایۂ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

رسالہ نئی زندگی الہ آباد ایڈیٹر سید انیس الرحمن صاحب زیرِ اہتمام سید حبیب الرحمن صاحب ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ دیدہ زیب لکھائی چھپائی اور کاغذ پر شائع ہوتا ہے کچھ عرصہ سے خوب صورت تصاویر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس رسالے کا شمار چوٹی کے ماہانہ جرائد میں ہے اور ملک کے اونچے سے اونچے طبقہ میں اسے سندِ قبول حاصل ہے۔ مضامین اکثر مستند اہلِ الرائے لکھتے ہیں۔

"انڈین ریویو" اور "ماڈرن ریویو" کے معیار کے ایک رسالہ کی عرصۂ دراز سے اردو زبان میں ضرورت ہے تاکہ اس میں اہم سیاسی۔ معاشی۔ تمدنی اور تاریخی مسائل پر سنجیدگی، متانت اور بے لوث طریقے پر خالص علمی نقطۂ نظر سے مضامین لکھے اور شائع کئے جائیں۔ رسالہ نئی زندگی الہ آباد غالباً مالی وسائل کی کمی کے باعث ابھی اس معیار تک تو نہیں پہونچا ہے لیکن اس کی یوماً فیوماً ترقی امید دلاتی ہے کہ اب نہیں تو مستقبل قریب میں وہ ہماری مندرجۂ بالا توقع کو شاید پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔ سید انیس الرحمن صاحب اور اُن کے بھائی حبیب الرحمن صاحب ان تھک کوشش کر رہے ہیں اور اُن کی کوششیں انشاء اللہ ضرور بارآور ہوں گی بشرطیکہ جنبہ داری کی عینک اُتار کر وہ اپنے نقطۂ نظر کو خالص علمی بنا لیں۔

مطلق العنان حکومت اور سامراج شاہی تیزی کے ساتھ ہمارے ملک سے اٹھ رہی ہے۔ اختیاراتِ حکومت عوام اور اُن کے نمایندوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہے ہیں اور ملک و قوم کی نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عوام حاصل شدہ اختیارات کا جائز استعمال جانیں اور پہچانیں اس کے لئے عام لازمی تعلیم اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور دستوری مصطلحات اور مسائل پر اُن کو پورا پورا وقوف حاصل ہو۔ ورنہ خود غرض لوگ اُن کی عدم واقفیت اور عدم احساس سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ملک میں پہلے سے بھی بدتر صورت

حال پیدا کر دیں گے۔ حکومت کی مشین چلانے کے لئے دردمند، ایثار پیشہ اور مخلص کارکنوں کو اُبھرنے کا موقع نہ ملے گا اور وہی لوگ جو بڑے بڑے خطابات اور اعزازات کے طرّے وکلغیاں لگا کر غیر ملکی حکومت کے معاون و مددگار تھے، کھدر پوش ہو کر پاجامہ و عمامہ زیب تن کر کے بمصداق

"آستین میں دشنہ پنہاں"

ثابت ہوں گے۔ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسا لٹریچر جس سے یہ معلوم ہو کہ ووٹ کیا چیز ہے اس کے استعمال کرنے والوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ مجالس قانون ساز اور کیبنٹ کس کس قسم کی ہوتی ہیں اور ان کی مختلف اقسام کی کیا مضرتیں یا فوائد ہیں۔ دستوری طرزِ حکمرانی میں دنیا کی دوسری اقوام و ملل کے مقابلے میں ہندوستان کا کیا درجہ ہے۔ کتنی منزلیں طے ہو گئیں اور کتنی طے ہونی باقی ہیں۔ عوام اور رائے دہندوں کے اس خصوص میں کیا فرائض و اختیارات اور ذمہ داریاں ہیں۔ اخبارات و رسائل اور سستی کتابوں کے ذریعہ ایسے لٹریچر کی بکثرت اشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تا کہ اُن کے مطالعہ سے عوام میں خاطر خواہ سیاسی احساس و بیداری پیدا ہو۔

رسالہ "نئی زندگی" اس قسم کی پہلی کوشش ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اشاعت پذیر ہو کر عوام اور خواص کے ہاتھ میں پہونچنا چاہئے۔

مقالاتِ اقبالیہ و شرقیہ اسٹڈیز اسلامک اینڈ اورینٹل (بزبان انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف صاحب لاہور۔ مصنفہ جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی۔

یہ وہی کتاب ہے جس کے اشاعت پذیر ہونے کی خوشخبری مصنّف بابتہ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں دی گئی تھی۔ اور جس کی رائلٹی میں فاضل مصنّف کو کتاب کے صرف پانچ نسخے دئیے جانے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ جناب قاضی صاحب کی مہربانی سے کتاب ہاتھ میں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ وہ ۳۴۴ صفحے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور خان بہادر پروفیسر محمد شفیع ایم اے (کیمبرج) لاہور کا اس پر عالمانہ مقدمہ ہے۔ بہترین ٹائپ، کاغذ، جلد۔ اور گرد پوش سے اسے مزین کیا گیا ہے۔ آخر میں نہایت محنت و کاوش کے ساتھ اشاریئے شامل کئے گئے ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر ملک کے بلند پایہ عالم و محقق اور ادیب و شاعر ہیں۔ آپ ریاست جوناگڑھ کے ایک قدیم قاضی خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے بزرگ تقریباً تین سو سال پہلے سندھ سے جوناگڑھ منتقل ہوئے تھے اور عہدِ مغلیہ میں ان کو ایک شاہی جاگیر عطا ہوئی تھی جو اب تک قاضی صاحب اور ان کے اہلِ خاندان کے ہاتھوں میں محفوظ و موجود ہے۔ مالی فراغت حاصل ہونے کا موصوف نے بہترین مصرف

دیا کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مخدومی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں
شروانی کی طرح اپنے اوقاتِ عزیز کو تمام تر علمی اور قومی کاموں کے لئے وقف کر دیا۔ آپ کی دس بارہ
قیمتی تصانیف اور مجموعۂ کلام اس سے پہلے چھپ چکے ہیں اور سندِ قبول حاصل کر چکے ہیں۔ بکثرت علمی
تحقیقی مقالات ان کے علاوہ ہیں جو ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب قاضی صاحب کے دس مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب رسوائے عام ریسرچ
کے معیار سے بہت بلند اور ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ علمی
ہے۔ پوری کتاب میں شروع سے آخر تک زبان کی صرف ایک غلطی صفحہ پانچ سطر اکیس پر نظر آئی جہاں
"بزہ گردم کرنے" کے لئے Chented کا غیر اسلامی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور جو منتر
پڑھنے کے لئے عام طور پر مستعمل ہے۔ کتاب کا ہر مقام اپنی جگہ پر مکمل اور محقق ہے۔ اہلِ یورپ نے مشرقی
اور بالخصوص اسلامی شعبہ جات میں ریسرچ کو اس درجہ مضحکہ خیز اور رنج دہ بنا دیا ہے کہ اس نقطہ پر کسی مزاح
نگار کا توجہ نہ کرنا تعجب خیز ہے۔ لیکن جن مسائل پر اختر صاحب نے قلم اٹھایا ہے ان کی اہمیت مسلّم
اور ان کے اب تک نظر انداز کئے جانے پر تعجب ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اچھوتا تاریخی پس منظر
پیش کرتا ہے اور ہمارے تمدن اور شکوہِ ملی کا آئینہ دار ہے۔ مسلمان دنیا میں علم و ادب تہذیب و ترقی
کے گہوارۂ جنباں اور امن و عافیت کے علمبردار رہے ہیں۔ ان کے پرچمِ عروج کے سائے میں قوموں
نے سکون و عافیت کے ساتھ جو ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ہے۔ ایک "وراقت"
ہی کو لیجئے (مقالات نمبر ۱ و نمبر ۲ مشمولہ کتاب ہذا) کہ عہدِ عباسیہ میں اس فن کو کیسی کچھ وسعت حاصل
تھی۔ کاغذ سازی۔ کتابت۔ جلد بندی اور دوسرے لوازمات اشاعت وغیرہ سے اس عہد کے
تمدن اور ذوقِ علمی کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

مقالہ نمبر ۷۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے یقیناً اہم ترین پہلو
ان کی چالیس سالہ سیاحی ہے ؎

چہل سال خواندم چہل سال سیر
چہل سال تعلیم کردیم غیر

اور اس سیاحت میں "سومناتھ" کے سفر کو خاص اہمیت اس وجہ سے حاصل ہے۔ کہ ہندوستان میں
نہ صرف مذہبی آزادی کا اس سے ثبوت ملتا ہے بلکہ مصر۔ یونان۔ بابل اور کلدان کی تہذیبوں کا
ہندوستان پر اثر بھی ثابت ہوتا ہے۔ نیز خود شیخ سعدی کا ذوقِ تحقیق و شوقِ سفر اور دلیری کا اس

واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ ہاتھی دانت کے بت ہندوستان میں بودھ مت اور جین دھرم کے اثر سے یقیناً برباد کئے جا چکے ہوں گے اور یہ بت جو شیخ نے سومناتھ میں دیکھا تھا کوئی تازہ شاہکار ہوگا۔ جو مصر و یونان کے اُن ماہرینِ فن کے اثرات کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ جن سے ہندوستانی فیثاغورث اور دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے متاثر ہوا۔ قاضی صاحب نے اس باب میں جو کچھ تحقیق فرمائی ہے وہ اہلِ یورپ اور ان کے متبعین کی لغزشوں کی مناسب اصلاح ہے۔ اور اُس سے شیخ کا ہندوستان تشریف لانا پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔

مقالہ ۱۳۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا ہندوستان میں زیادہ تر طبیب کی حیثیت سے معروف اور روشناس ہیں۔ اور اسی طرح عمر خیام انگریزی خوانوں میں اپنی رباعیات کے غلط سلط ترجموں اور ہوسناک مضامین اور ہلکی سی دہریت کے لئے مشہور ہیں۔ قاضی احمد میاں صاحب اختر نے شیخ الرئیس کے عربی رسالہ کا عمر خیام کا کیا ہوا ترجمہ اور اُس پر اپنی محققانہ رائے قلمبند فرما کر ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ اس مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر خیام ایک عقیدتمند مسلمان تھے اور انھیں مسائل الٰہیات پر پورا عبور تھا۔ جن کو وہ اتنی وفصاحت و سلاست کے ساتھ اپنے ترجمہ میں پیش کرسکے۔ اصل عربی مضمون اور اس کا فارسی ترجمہ اس مقالہ کے ساتھ شامل ہے۔

مقالہ ۱۴۔ حضرت شمس تبریزی جو مولانا رومؒ کے مرشد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لاپرواہ ناقدوں اور ہرزہ گو معترضین کے نرغہ سے اس مقالے میں نہایت دیانت کے ساتھ نکالے گئے ہیں۔ اور اُن کا اسمٰعیلی نہ ہونا پوری تحقیق کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ کسی دن ہمارے قاضی صاحب کو حضرت شمس تبریز کے فلسفے پر بھی قلم اٹھانا پڑے گا اور

آدم نہ بود و من بودم حوا نہ بود و من بودم
او خود نہ بود و من بودم من عاشق دیرینہ ام

جیسی دلچسپ پہیلیوں کو حل کر کے ان کے متعلق از خود رفتگی یا ویدانتیت کا الزام دور کرنا ہوگا۔

مقالہ ۱۵۔ حافظ کی عربی شاعری اپنی ندرت اور دقتِ نظر کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر یہ عام عقیدہ صحیح ہے کہ حافظ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہ تھے تو عربی پر ان کی یہ قدرت عام تعلیمی فضا کی ترقی اور اس کی گہرائی کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ بے تکلف عربی زبان میں نہایت مکمل شعر اور مصرعے موزوں کرسکتے تھے۔ جس سے اس تمدن کی عظمت کا پتہ چلتا ہے جس نے عالم کو حیاتِ تازہ بخشی

مقالہ ۱۶۔ شہر آشوب ہند۔ کسی نے ایک باغی کا بت دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایک زندہ قوم ہے

جس نے اپنے لوٹیرے کو ہیرو بنا دیا ہے اور ایک ہماری قوم ہے کہ اُس نے محمود غزنوی جیسے مجاہد کو لٹیرا ثابت کر دکھایا۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا سلوک ان کے ناقدین اور معترضین دونوں نے کیا ہے ؎

گرو ہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالبؔ
رسم اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

ایک آدھ چھوٹا سا ٹریکٹ کوئی ڈرا دنا سا مضمون جو کسی حد تک ان کی تائید میں نکلا وہ ایک حلقہ تک محدود رہا اور فی الجملہ حضرت عالمگیر کے کارنامے ان کی ذاتی شخصیت اور کیرکٹر کی عظمت نیز ملک اور بنی نوع پر احسانِ عظیم کی سچی تعریف باوجود زمانہ حاضرہ میں مکمل اور کافی ثبوت کے اب تک پردۂ اخفاء میں ہے "بہشتی کا شہر آشوب" بھی ستم ہائے عزیزاں میں سے ایک ہے۔ بہشتی سلطان مراد کا نمک خوار اور حلیف تھا۔ اور جو کچھ بھی اُس نے لکھا ہے اِس سے قطع نظر اس کی تاریخی حیثیت قاضی صاحب کی محققانہ نظر میں بجا طور پر اہم ہے اور اسی لحاظ سے اُنھوں نے اس پر مقالہ لکھا ہے۔ اس مثنوی سے نہ صرف اُس وقت کی انتظامی بدحالی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ دیانت اور سیاست کے اس نقدان کا بھی ثبوت ملتا ہے جو سپاہ کی بیدلی اور مُراد کی شکست کا باعث ہوئی۔

اس نظم میں حضرت عالمگیر کے بلند اخلاق کا اعتراف جو یقیناً اُن کے یا ان کے طرفداروں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا گیا اُن کی عظمت کا ایک قطعی اور حتمی ثبوت ہے۔

عربوں کے یورپین نام "سیرسیں" کی تحقیق مقالہ ۸۔ الماوردی کی زندگی پر ایک نظر ۹۔ اور "تاریخ گجرات کے عربی ماخذ" یہ مضمون اُردو زبان میں مُصنّف میں شائع ہو چکے ہیں ابھی بہت بلند پایہ مضامین ہیں جن میں کافی چھان بین سے کام لیا گیا ہے

کتاب فی الجملہ اس عہد کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کا حق رکھتی ہے اور اس کا ایک اُردو ایڈیشن جلد سے جلد شائع ہونا ضروری ہے۔ تاکہ جو لوگ انگریزی سے واقف نہیں ہیں یا اتنی قیمتی کتابیں نہیں خرید سکتے وہ بھی اِس سے بہرہ ور ہو سکیں۔

غدر پارٹی کے انقلابی یہ ایک چھوٹی سی پچاس صفحات کی کتاب ہے۔ قومی دارالاشاعت مال روڈ لاہور نے شائع کی اور ۸ قیمت ہے۔ بقول ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر بہار فی زمانا ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں سب سے کم لٹریچر مسلم لیگ، اور سب سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی شائع کر رہی ہے۔ پارٹی مذکور کی لاتعداد چھاپی ہوئی کتابوں میں سے ایک یہ کتاب بھی ہے۔

قومی تحریکات کے زاویے وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری تمام تر سیاسی جدوجہد "ہوم رول" کے محور کے گرد گھومتی تھی اور چکبست آنجہانی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا۔ ع

لیں گے بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ قومی نصب العین اور مطالبہ مضحکہ خیز سمجھا جانے لگا۔ اور مکمل آزادی خواہ ایک ہندوستان کی ہو یا دو ہندوستانوں کی ہمارا مطمح نظر بن گیا۔ قومی کارکنوں کی ذہنیت بھی بدل گئی اور جیسا کہ آٹھ دس سال ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا آج کے انتہا پسند کل کے اعتدال پسند اور کل کے اعتدال پسند اس سے آگے والے کل کے انتہا پسند ہو جائیں گے۔ چنانچہ کسے خبر تھی کہ خود پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے انتہا پسند آج حلف وفاداری شہنشاہ برطانیہ اٹھا کر حکومت کی کرسی پر براجمان ہو جائیں گے اور سر فیروز خاں نون جیسے خالص سرکاری آدمی خطابات ترک کر کے دعوت جہاد دیں گے۔

تقسیم بنگال کے وقت سے ہمارے ملک میں ایک تشدد پسند انقلابی جماعت چلی آ رہی ہے۔ اس جماعت کے گروہ در گروہ گولیوں کا نشانہ بن چکے۔ پھانسی کے تختوں پر لٹک چکے۔ کالے پانی کی ہولناک سزا بھگت چکے اور بکثرت ہندوستانی جیلوں کی کال کوٹھریوں میں عمریں گزار چکے یا گزار رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کے حالات اور لرزہ بر اندام مصائب کی داستانیں پردۂ خفا میں ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب نے ان میں سے کچھ لوگوں کے حالات پر سے جو "غدر پارٹی" کے نام سے موسوم تھے، تاریکی کا پردہ اٹھایا ہے اور غالباً پہلی مرتبہ مسٹر رندھیر سنگھ کی زبانی اہل ملک کو شہیدان وطن کی قربانیوں کا علم ہوگا۔ کتاب کا خلاصہ بیان کر کے ہم اصل کتاب کے اشتیاق کو کم کرنا نہیں چاہتے صرف اس قدر عرض کریں گے کہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس کو ضرور پڑھا جائے۔

بھگت سنگھ اور اُنکے ساتھی ایک قومی دارالاشاعت YMCA بلڈنگ لاہور کی شائع کردہ ہے۔ قیمت ۸ر حجم ۱۶ صفحات یہ کتاب بھی کمیونسٹ لٹریچر کی ایک کڑی ہے۔ بھگت سنگھ اور اُن کے حالات سے ہمارے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ کتاب کے مصنف اجے گھوش اُن کے ساتھیوں میں سے ایک ہیں جو عمر قید کی سزا بھگت چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیڈر بھگت سنگھ اور دوسرے ساتھی چندر شیکھر آزاد، کشوری لال، شیو ورما، جے دیو اور ڈاکٹر گیا پرشاد کی گرفتاری اور سزا سے پہلے کے حالات، مقدمہ کی مفصل کیفیت اور پھر بعد سزا یابی مصائب و تکالیف کی داستانیں نہایت پُر اثر طریقہ سے بیان کی ہیں۔ اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد بغیر ختم کئے چھوڑنا ناممکن ہے۔ زبان صاف اور سلیس اور بیان میں تعجب انگیز روانی و تسلسل ہے۔

(انیس فاطمہ)

یادگارِ شاہد!

سید شاہد علی کے اچانک حادثۂ ارتحال پر نینی تال میں جہاں اُس کا ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو انتقال ہوا، میرے وطن بریلی میں جہاں اسے سُپردِ خاک کیا گیا۔ اور علی گڑھ میں جہاں ہم لوگ رہتے ہیں، بکثرت عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں نے بالمشافہ اظہارِ ہمدردی کر کے میری اور میری رفیقۂ حیات کی جس درجہ دل نہادی کی اس کے لئے ہم لوگ بدل شکرگزار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مصیبت کے وقت مخلصوں کی سچی ہمدردی ہی سب سے زیادہ وجہ تسکین ہوا کرتی ہے اور اس خصوص میں میں خاص خوش نصیب ہوں۔ بالمشافہ ہمدردیوں کے علاوہ بہت سے پیغامات ہمدردی بذریعہ ڈاک بھی موصول ہوئے جن کے حتی الامکان جوابات لکھنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہونے لگا تو جوابات کا یہ سلسلہ جاری رکھنا اپنے موجودہ حالات میں میری قوت سے باہر ہو گیا۔ اب میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مصنف کے ذریعہ شکر ادا کروں۔

خطوطِ تعزیت اور پیغامات ہمدردی کے مطالعہ سے مجھے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کیونکہ اس سے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا) کہ ان کے لکھنے کا بھی ایک خاص سلیقہ اور ڈھنگ ہوا کرتا ہے اور جس شخص میں جس قدر زیادہ اثر تحریری کی قابلیت، دردمندی، خلوص اور فلسفۂ حیات و ممات سے واقفیت ہوتی ہے۔ اتنی ہی اس کی تحریر زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔ اصنافِ ادب میں مرثیہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کیوں نہ خطوطِ تعزیت کو بھی جو بالعموم نظم کے بجائے نثر میں ہوتے ہیں ہمارے ادب میں ایک نمایاں جگہ دی جائے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر جس قدر خطوط اس موقع پر مجھے موصول ہوئے ہیں اور جن میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی خاص بات یا عبرت و موعظت کا پہلو ہے۔ انھیں چھاپ کر محفوظ کر دینا میرے لئے ناگزیر ہو گیا ویسے بھی صاحبِ استطاعت حضرات اُن لوگوں کی جو انھیں دل سے عزیز ہوتے ہیں بڑی بڑی مادّی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ تاج محل، بڑے بڑے دوسرے عالیشان مقبرے، پُل، سرائیں، اسکول اور کالج وغیرہ اسی جذبات کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ ایک غیر مستطیع شاعر، ادیب، مُصنّف یا اخبار نویس اگر کسی اپنی محبوب ہستی کو کھو بیٹھتا ہے تو وہ مندرجہ بالا قسم کی تو کوئی یادگار بنا نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہے کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے صفحۂ قرطاس پر کچھ نقوش چھوڑ جائے

میں بھی شاہد جیسے ہونہار اور صلاحیت رکھنے والے اپنے عزیز ترین بیٹے کی ایک قلمی یادگار بنا رہا ہوں جو ناظرین مُصنّف آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے ع نوشتہ بماند سیہ بر سپید

سید الطاف علی بریلوی

وفاتِ شاہد

(ایک نامعلوم دوست کا ہدیۂ اخلاص!)

(۱)

بہ ریحانِ شباب افسوس شاہد را اجل آمد
بہ الطافِ علی درد و ملالِ جاں گسل آمد
بہ سلکِ سال، فکرم قطرہ ہائے اشکِ خوں سُفتہ
وفاتِ سیّدِ شاہد علی جاں کاہ شد گفتہ
۱۳۶۵ھ

(۲)

الطاف سے کیا پوچھئے کیا حالت ہے
کیوں کر گئی اک آن میں جانِ شاہد
شاہد ہے کہاں ڈھونڈھئے اُس کو کس جا
بس قلب کا ہے داغ نشانِ شاہد

(۳)

اک دوست کا تھا بیٹا جو سولھویں برس میں
وابستہ اُس کے دم سے گھر بھر کی تھی مسرّت
علم و ادب کا شائق، طبّاع، ذہین، قابل
اطوار تھے حمیدہ، صالح تھی اُس کی فطرت
اس پر اجل نے ناگہ حملہ کیا غضب کا
ماں باپ رہ گئے ہیں تکتے ہوئے ہی صورت
ہر شخص کو ہے مرنا، اِس سے مفر کہاں ہے
پھر موت نوجواں کی، حسرت ہزار حسرت
تاریخ و مرثیہ کیا، لوحِ مزار پر تم
لکھ دو یہ ایک فقرہ "شاہد کی پاک تربت"
۱۳۶۵ھ



سید شاہد علی بریلوی

وداعِ دوست!

(از حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی)

وداعِ دوست آساں مرگ مشکل
مگر ہر سانس کی سولی پہ ہے دل

ہوئی ہے موجِ دریا کی روانہ
ٹپکتا رہ گیا سر اپنا ساحل

غبارِ خاکِ مجنوں بھی تو آلے
ٹھیراؤ ساربان ہاں روک محمل

چمن سے ٹوٹ کر زیبِ گلو ہے
سُنے گل کس طرح شورِ عنادل

ارے او دوریٔ راہِ نظارہ
نگاہوں کو بھی ہو جانے دے شامل

جدائی اور پھر شامِ جدائی
دہائی ہے تری اے ماہِ کامل

مدد ہاں المدد اے تابِ دیدار
چلا آیا تڑپ کر آنکھ میں دل

مبارک باد مرگ منتظر کو
نہیں ہے زندگی جینے کے قابل

اندھیری شب ہے پروانے کدھر جائیں
اٹھالی کس نے آکر شمع محفل

سمجھ میں اپنی کیفی آرہا ہے
یہی ہے مرگِ مہجوری کا حاصل

تن از ہمراہیٔ او ماند محروم
مگر جاں میرود منزل بہ منزل

تعزیت نامے!

شاہد مرحوم کے ساتھ دو دن
از سید مصطفٰے علی بریلوی

ہم ۲۰ جون کو "گھٹیا پہاڑ" آئے۔ صبح ہی صبح دیکھا ایک خوبصورت، نازک اندام، دبلا پتلا لیکن پھرتیلا لڑکا چلا آرہا ہے۔ آتے ہی ایک دم سب کی خیریت نام بنام دریافت کر ڈالی۔ میں نے کہا بیٹھو۔ اطمینان سے بات کرو۔ لیکن اُس کو قرار کہاں۔ 'نینی تال' کی سیر کے واقعات شروع کیے۔ 'تال' کی کشتی بانی سے لے کر چینا پیک کی چوٹیوں تک کے بالتفصیل واقعات بیان کر ڈالے۔ اس پر بھی صبر نہ آیا تو ہاتھ پکڑ کر حدِ نظر تک کے مقامات کی تفصیل، محلِ وقوع، تاریخی اہمیت اس طرح از بر سنائی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکا تاریخ کا طالب علم ہے اور یہیں کا رہنے والا ہے۔ یہ لڑکا شاہد تھا۔ ابتدائی عمر سے بہت کمزور تھا اس لئے سارے خاندان کی توجہ اُس کی صحت کی طرف رہتی تھی۔ فطرتاً بے حد طباع، دلیر، خوش مذاق اور محبت کرنے والا تھا۔

۱۴ مئی ۱۹۴۶ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان ختم کیا۔ اتفاقاً گھر پر ایک بہن شدید بیمار تھی۔ اس لئے متفقہ رائے سے شاہد کو نینی تال تبدیل آب و ہوا کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ شاہد نینی تال، سید اعجاز علی صاحب کے پاس ٹھیرے جو اُن کے چچا ہوتے ہیں۔

۲۰ جون ۱۹۴۶ء کو شاہد 'گھٹیا' ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ یہ مقام 'نینی تال' سے ۱۴ میل نیچے ہے۔ اُس وقت شاہد پہلے سے کہیں زیادہ تندرست اور موٹے تھے۔ لیکن شاید خدا کو انھیں جلد بُلانا مقصود تھا۔ اس لئے ظاہر حالات ایسے ہو گئے کہ سب لوگ قطعی غافل رہیں۔ اس کے بعد ۲۶ جون تک شاہد 'گھٹیا' برابر آتے رہے۔ ۲۷ جون ۱۹۴۶ء کو میں 'نینی تال' خانصاحب ارشاد حسین پرسنل اسسٹنٹ آنریبل ہوم منسٹر سے ملنے نینی تال گیا۔ شاہد مرحوم کہیں سے ٹہل کر آئے تھے۔ میں نے دیکھ کر کہا 'میاں کیا حال چال ہیں؟' کہنے لگے کچھ نہیں خیریت ہے اب نینی تال میں دل نہیں لگتا۔ کیونکہ کوئی دوست نہیں ہے۔ شام کے کھانے اور چاء میں میرے شریک رہے۔ میں نے کہا 'گھٹیا چلتے ہو؟' کہنے لگے 'صغیر کے ساتھ جاؤں گا' (یہ ملازم تھا) میں نے کہا کہ 'میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ صغیر کے ساتھ کیا خاص بات ہے؟' اور ذرا ڈانٹ کر میں نے کہا کہ نوکروں سے زیادہ نہ ملنا چاہئے۔ میری یہ بات اُس کو ناگوار گزری اور کہنے لگے 'اچھا تو کل میں بریلی جاؤں گا' اور ایک خط اپنے بھائی لطیف کو لکھا۔

لوٹتے میں میں نے بازار میں سمجھایا کہ میں نے تم کو کسی خاص وجہ سے کچھ نہیں کہا ہے تم خیال مت کرنا اور ۱۰ روپیہ دیا۔ نینی تال کی آخری حد یعنی تلی تال وہ مجھے چھوڑنے آیا۔ راستے میں گوروں کے ساتھ کچھ ہندوستانی عورتیں جارہی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر کہنے لگے کہ "بھائی دیکھئے ان بے غیرتوں کو موت نہیں آتی اور اچھے آدمی مرجاتے ہیں" یہ نہیں معلوم تھا کہ ۲۴ گھنٹہ بعد اُن کا بھی وقت آگیا ہے!!!

۲۸ جون ۱۹۴۶ء بروز جمعہ ۲ بجے تک بالکل ٹھیک تھے۔ ۳ بجے کے بعد بخار آیا۔ دوا دی گئی۔ رات کے ۹ بجے سرسامی کیفیت ہوگئی۔ ۲ دست اور ایک قے ہوئی۔ ڈاکٹر آیا لیکن ابھی صحیح تشخیص اور دوا دینے بھی نہ پایا تھا کہ حالت خراب ہوگئی۔ دوا ڈالی حلق کے پار نہ ہوئی۔ انگلی سے ڈالنے کی کوشش کی تو دانت بند ہوگئے۔ یہ آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ اماں بی (اپنی نانی) بھائی (راقم السطور) کو پکارا۔ اللہ کا نام لیا اور ایک آخری حسرت بھری نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے۔ پردیس میں بعد حسرت و یاس اس ننھے مجاہد نے جان دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ ....

مرحوم بہترین مقرر، مضمون نگار، سیاست داں لڑکا تھا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا اتنی سی عمر میں شدید احساس تھا۔ اکثر مضامین مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی و سیاسی ترقیات کے متعلق لکھتا تھا۔ اپنے اسکول کے لڑکوں میں مسلمہ لیڈر تھا۔ سنجیدگی، ذوقِ مطالعہ اور تاریخ دانی میں اپنا آپ جواب تھا۔ مستقبل میں اس جوہرِ قابل سے بڑی اُمیدیں تھیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب شاہد دنیا میں نہیں اور کوئی دنیاوی طاقت اُس کو اس جہان میں نہ لاسکے گی۔ لیکن تمام عمر ایک داغ دل پر رہے گا۔ اور مشیتِ ایزدی میں کسی کو چارہ نہیں۔ خدا ہر حال میں بندہ کی تربیت کرتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ شاہد دنیا میں آیا تھا، اور اب شاہد مرحوم ہوگیا۔ ایک وہ تصور بندھتا ہے، جب سولہ سال کے پہلے شاہد عالم ہست میں آیا تھا، ہر طرف خوشی کی لہر تھی اور آج یہ وقت ہے کہ اپنے اور غیر ماتم کناں ہیں اور جلد از جلد دفن کرنے کی فکر میں ہیں۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ مسلمانوں کو دنیا سے محبت نہیں اُن کو عقبیٰ بنانی ہو۔ لیکن دنیا کی کامیاب و با ایمان زندگی ہی عقبیٰ کی بہتری کی ضامن ہے۔

نئی نسل کے مسلمان بچوں کے واسطے شاہد کی مختصر زندگی ایک نمونہ ہے۔ کتابیں پڑھنے و جمع کرنے کا شوق۔ ذوقِ سیاحت۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کرلینا۔ چھوٹوں بڑوں سے حسب مراتب ملنا۔ مستقبل میں آگے بڑھنے کی کوشش۔ یہ مختلف سرخیاں ہیں جو شاہد کی

قلیل زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ کاش تمام مسلمان بچے اسی اسپرٹ کے ہوں تاکہ ایک شاہد کے بدلے قوم میں ہزاروں شاہد پیدا ہو جائیں اور ہماری اُمیدیں بر آئیں۔

نواب صدر یار جنگ بہادر
حبیب گنج۔ علی گڑھ

کل آپ کا خط معمولی ذہنی حالت میں کھول کر پڑھا۔ اس کے اندر کے حادثے کی خبر نے دل کو صدمہ دیا۔ کیسا حادثہ آپ کو پیش آیا ــــ اور دفعۃً ــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ــــ یہ مقام صبر و رضا کا ہے۔ رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰہ ــــ صبر و رضا اُمت نے ساداتِ کرام سے سیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو باغ جنت کی فضائیں بخشے۔ آپ کو اور جملہ اعزّا کو صبر و اجر۔

خان بہادر حاجی مولوی
حبیب اللہ خانصاحب علی گڑھ

مجھ کو آپ کے صدمۂ جانکاہ کا حال معلوم ہو کر دلی افسوس ہوا۔ مشیت ایزدی میں مجالِ دم زدن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں التجا ہے کہ وہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ اور آپ کو و اہل خاندان کو توفیق صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین یا ان اللّٰہ مع الصابرین ۔

خانصاحب میر ولایت حسین صاحب
بی۔ اے علی گڑھ

صاحب زادہ شاہد علی کے انتقال پُر ملال کا حال معلوم ہو کر بہت رنج ہوا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

میں اظہار افسوس کے واسطے خود آپ کے پاس آتا لیکن بدقسمتی سے چلنے پھرنے سے معذور رہوں۔ اس لئے خط کے ذریعہ اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق صاحب
علی گڑھ

میں نے حادثۂ جانکاہ کی خبر آج ہی سنی۔ ہم لوگوں کو اس خبر کو سُن کر جو صدمہ ہوا ہے اس سے کچھ اندازہ آپ کے اور بیگم صاحبہ کے رنج و الم کا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت مسلمان کو صبر کرنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نعم البدل کی اُمید وابستہ رکھنی چاہیئے۔ بہر حال زخم کی تکلیف اپنی جگہ رہتی ہے۔

مولوی عبدالشکور صاحب
پرنسپل حلیم مسلم کالج۔ کانپور

کل نانا صاحب قبلہ کے خط سے اور آج حسیب میاں کے خط سے اس دلدوز سانحہ کا علم ہوا جس میں آپ، آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کا خاندان مبتلا ہے۔ کیسا اندوہناک اور دل ہلا دینے والا سانحہ ہے جس کا تصور ہی ہوش رُبا ہے اور جب سُننے والوں کا یہ حال ہے تو خود آپ پر اور بچے کی ماں کے لال پر کیا کچھ نہ گزرا ہوگا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ دونوں کو صبر جمیل اور استقامت عطا فرمائے اور مرحوم کی رُوح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ میں اور میری بیوی آپ دونوں کے اس غم میں شریک ہیں اور ہماری دلی دعا ہے آپ کو صبر و شکر عطا ہو۔

ایک تعزیت نامہ آپ کو روانہ کرچکا ہوں۔ جی نہیں مانتا۔ پھر آپ سے ہمکلام ہونے اور غم میں شرکت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جوان کی موت اور پھر ایسے ہونہار اور ترقی کرنے والے کی موت اور وہ بھی اچانک۔ دیار غیر میں۔ یہ سب سخت ترین سانحات ہیں۔ اس غم واندوہ میں آپ کا اور آپ کی بیگم صاحبہ کا کیا حال ہوگا۔ خداوند کریم آپ دونوں کو صبر عطا فرمائے اور آپ کو ہمت واستقامت دے کہ آپ اس سانحۂ عظیم کو خوش اسلوبی سے برداشت کرلیں۔ ہم دونوں غم میں شریک ہیں اور دست بدعا ہیں۔

مولانا سید عبدالرؤف صاحب
ناظم نذیریہ پبلک لائبریری۔ دہلی

آج صبح جناب انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی سے آپ کے صاحبزادہ کے انتقال کی خبر وحشت اثر سن کر جس قدر صدمۂ عظیم ہوا وہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ افسوس صد افسوس۔

سید شوکت علی صاحب
انجینیر دہلی

تمہارے نور چشم لخت جگر شاہد کو خدا نے اپنے پاس بلالیا۔ اس خبر سے بے انتہا صدمہ ہوا اور انسان کی مجبوری کا ایک درمشاہدہ ہوا۔ تمہیں سکین دینا دنیاداری کا فعل ہے۔ صبر وشکر کی طاقت بھی خداوند کریم ہی دیتا ہے ورنہ اس قسم کے صدموں سے جانبر ہونا دشوار ہوجائے۔ مجھے کسی تفصیل کا علم نہیں اور نہ مرحوم کی علالت کی کبھی اطلاع ملی۔ ممکن ہو تو جواب دینا۔

شیخ نعی[illegible] صاحب
بوملی

مجھ کو کل معلوم ہوا تھا کہ آپ کے یہاں حادثۂ جانکاہ ہوا۔ فی الواقع بڑا سانحہ ہوا۔ مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ سوائے صبر وشکر کے کیا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر کلی عطا فرمائے۔ میں بغرض فاتحہ خوانی آپ کے پاس آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ قبرستان گئے ہیں۔

شیخ کریم الدین صاحب
میرٹھ

شاہد ایک ذہین اور کس قدر ہوشیار تھا۔ مگر قضا وقدر سے کیا چارہ۔ مشیت الٰہی یوں ہی تھی۔ میاں کی ذات بے نیاز ہے ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام   کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

میں بھی ایسے ہی حالات میں مبتلا ہوں ورنہ خود حاضر ہوتا۔ معلوم ہوا کہ مرحوم نے اسی سال انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا۔ اپنی طبیعت کی جو کیفیت ہے کیا عرض کروں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے۔

مولوی احمد الدین صاحب نظامی
ایڈیٹر "ذوالقرنین" بدایوں

والد صاحب قبلہ سے آپ کے بچہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوکر بے حد رنج ہوا۔ دیکھئے اللہ کی کیا شان ہے۔ ایسا ہونہار بچہ چند گھنٹوں میں ختم ہوگیا۔ آپ کو اور اُس کی والدہ کو تو جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا تو ذکر کیا۔ میری آنکھوں میں مرحوم کی صورت گھوم رہی ہے۔ بھائی سوائے صبر کے اور کیا چارہ ہے۔ اللہ کا مال تھا اُس نے لے لیا۔ وہ معصوم تھا۔ خدا اُس کی مغفرت کرے۔ آمین

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، آگرہ — آپ کا حال سُنکر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہاں کے کام کو سلام کرکے جلد آتا ہوں۔ اب تو آپ کی فکر ہے۔ اللہ رحم کرے۔

محمد سعید اللہ خاں۔ شیرانی، دیول گھاٹ۔ برار۔ سی۔ پی — حفیظ صاحب کے خط سے معلوم ہوکر بڑے صدمہ کا باعث ہوا کہ شاہد نے اس جہان سے کوچ کیا۔ مرحوم مجھے 'نینی تال' سے خط لکھتے رہے تھے
آپ کو زیادہ لکھنا تازہ زخم پر نمک چھڑکنا ہے ؎

بلبلا پانی کا ہے دُنیا میں انساں کی حیات
یہ جہاں فانی ہے اِس میں سب کو لازم ہے ممات

سید اعجاز علی، نینی تال — میں جس دن سے 'نینی تال' واپس آیا ہوں میری طبیعت ایک منٹ کو نہیں لگ رہی ہے۔ کئی دن بیکار پڑا رہا اور اب وحشیوں کی طرح پھر رہا ہوں۔ بہت کوشش کی طبیعت بہل جائے لیکن ہر وقت شاہد کا خیال ستاتا رہتا ہے۔ کئی مرتبہ سینما گیا لیکن آدھا پونا دیکھ کر چلا آیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے برابر بیٹھے ہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ برابر کی کرسی خالی پڑی ہے تو عجیب وحشت سی ہوتی ہے۔ کیونکہ میں ہمیشہ اپنے ساتھ سینما وغیرہ لے جایا کرتا تھا۔ وہ میرے بغیر کبھی اکیلے سینما نہ دیکھتے تھے۔ میں نے وہ کمرہ بھی چھوڑ دیا ہے جس میں وہ میرے ساتھ رہتے تھے اور جہاں انتقال ہوا۔ کیمپ میں رہ رہا ہوں۔ اگر میں زیادہ دن یہاں رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں بخار نہ رہنے لگے۔ لوگ تو یہاں آکر اچھے ہوتے ہیں اور میں اب بیمار ہوا جا رہا ہوں۔ بارش مسلسل اب چار دن سے ہو رہی ہے۔

اخبار "عرش"، بریلی — حلقۂ احباب میں کس قدر افسوس کے ساتھ یہ خبر پڑھی جائے گی کہ ۲۸ر جون ۴۶ء کو رات کے ۱۱ بجے سید الطاف علی صاحب سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے فرزند ارجمند مسٹر شاہد علی بعمر ۱۶ سال صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے اور اپنے شفیق والدین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئے۔ ۲۹ر کی شام کو ۴ بجے آپ کی نعش پہاڑ سے موٹر میں بریلی آئی اور ۳۰ر کی صبح کو سید الطاف علی صاحب اور مرحوم کی والدہ اور گھر کے دوسرے لوگ علی گڑھ سے تشریف لائے تو اعزا و احباب نے اس ہونہار نونہال کو تقریباً ۱۱ بجے سپردِ خاک کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؏ مرحوم نے اسی سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا، بہترین مقرر تھا۔ سید الطاف علی صاحب کے فرزندوں میں یہ بچہ نہایت تیز اور ہوشیار تھا اور والدین کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا سید صاحب اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

حافظ محمد اشرف صاحب نینی تال | شاہد کی موت — آہ کیسا سانحہ ہے۔ اس کے خیال اور تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اعجاز میاں نے بریلی سے واپس آکر جو جانگداز اور دل کو پاش پاش کرنیوالے حالات بیان کئے حوالۂ قلم نہیں ہو سکتے جو صدمۂ عظیم آپ کو اور والدۂ شاہد کو ہوا ہوگا اس کو آپ ہی لوگوں کا دل جانتا ہوگا۔ آپ کا ہر ایک کو تلقینِ صبر کرنا کس قدر صبر آزما تھا، لیکن پھر رات کی تنہائی میں جو تکلیف اور حالت آپ کی سننے میں آئی خدا ہر صاحب اولاد کو اُس سے محفوظ رکھے۔ شاہد مرحوم کس قدر ہونہار ذہین اور نہ معلوم کیا کیا اوصاف کا مالک تھا۔ افسوس برق گرتی ہے تو ایسے ہی ہونہاروں کو تلاش کرتی ہے۔ شاہد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن اس کی یاد باقی ہے اور رہے گی۔

مولوی محمد یامین صاحب یعقوبی دیوبند | عزیزم شاہد علی کے انتقال کا حال معلوم ہو کر سخت صدمہ ہوا، اللہ تعالےٰ آپ کو و جملہ عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم معصوم تھا اس کی مغفرت ضرور ہوئی ہوگی۔ میری اہلیہ کی حالت بھی سخت نازک ہے اور میں شدید پریشانی میں ہوں اللہ تعالےٰ ہم لوگوں پر رحم فرمائے۔ بیگم صاحبہ کو تسلی دیتے رہئے گا۔

علامہ کیفی صاحب چریاکوٹی اعظم گڑھ | آپ کے سانحۂ دلگداز و روح فرسا کی خبر سنکر صبر و ضبط کے ہوش اُڑ گئے۔ بڑا ہونہار بچہ تھا۔ موت اور ہونہار بچے کی موت، کس دل سے آپ کو تلقین صبر کرو۔ دعا کرتا ہوں اللہ تعالےٰ آپ لوگوں کو صبر عطا فرمائے۔ ایسے حادثۂ عظیم میں جس قدر بھی رنج و غم کیا جائے بجا اور درست ہے۔ مگر میرے دوست کہاں تک۔ بس یوں سمجھئے کہ اللہ کی چیز تھی اُس کو پسند آئی لے لی۔ تاکہ اس خوشنما پھول سے جنت کا باغ آراستہ کرے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ آپ کے پاس صرف داغِ جدائی اور خارِ غم رہ جائے۔ اُس کے سامنے اس عطا پر بھی سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں پھول اور کانٹے اور داغ سب اس کی مرضی کے اشارے ہیں۔ بندہ مجبور۔ اسی مجبوری کا نام بندگی ہے۔ خدا جس طرح اپنی خدائی نہیں چھوڑ سکتا اسی طرح بندہ اپنی بندگی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف یہ جانتا اور کہتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرا دل بھی زخمی اور بہت زخمی ہو چکا ہے۔ پرسوں میری مریضہ لڑکی جو بڑی سے چھوٹی تھی دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو بلکتا اور ہم لوگوں کو روتا ہوا چھوڑ کر جنت کو سدھاری۔ افسوس اڑ گیا نقش قدم رہ گئے۔ کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ اپنے گھر میں مری دعا کہئے اور کہئے کہ صبر کر کے اپنی خاندانی خصوصیت کا اظہار کریں۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی | آپ کے فرزند دلبند کی جوانا مرگی سے دل کو سخت صدمہ پہونچا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اور ہم کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت

میں جگہ دے۔ اس ماتم سخت میں مجھ کو اپنا شریک حال سمجھئے۔ مصیبت میں صبر و استقلال سے کام لینا مسلم کا فرض ہے۔ اس کو آزمائش سمجھئے اور صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیجئے۔ اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے۔؟ ع

کیا کریں اے میر صاحب بندگی بیچارگی

میرے گھر کے لوگ بھی اس وقت خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ حادثۂ فاجعہ کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) میرے برادر نسبتی یعنی میری چھوٹی بیگم کے برادر عزیز عمر ۲۴ سال دیہات میں سیر و شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ندی کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک چٹان کے نیچے بارش سے پناہ لینے کے لئے بیٹھے تھے کہ یکایک وہ چٹان ان سب پر گری، اُن میں سے تین بچ گئے اور دو دب کر فوت ہو گئے۔ انھیں میں ایک برادر عزیز نعیم الدین عرف حسین میاں بھی تھے۔ میت کو بذریعۂ ریل کار لایا گیا اور ساٹھ سالہ بوڑھے باپ نے پردیس میں اپنے لاڈلے کو سپرد خاک کیا۔ یہ حادثہ ۲۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو رونما ہوا۔ مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ اور دو بچے (لڑکی اور لڑکا) چھوڑے ہیں۔

(۲) عین اسی وقت کہ مرحوم کو پیوند خاک کیا جا رہا تھا اطلاع ملی کہ میری بڑی بیگم صاحبہ کے بڑے بھائی قاضی عبدالحی صاحب جو اپنے گاؤں سے اسٹیشن پیدل آرہے تھے راستہ ہی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔ چنانچہ اُسی وقت دوسری ریل کار کا انتظام کیا گیا اور میت کو اسی جگہ لاکر دفنایا گیا۔ مرحوم میرے چچا زاد بھائی اور میری جاگیر کے سہیم و شریک تھے۔ اور اس زمانے میں میرے دست و بازو بلکہ پشت پناہ تھے۔ اِن دو عزیزوں کا یکایک اُٹھ جانا اور اس طرح دردناک طور پر ان کی موت کا واقع ہونا میرے لئے اور میرے خاندان اور گھر والوں کے لئے قیامت کبریٰ سے کم نہیں ہے۔ آج ۷ روز ہوئے طبیعت ان پے درپے صدموں سے بہت نڈھال ہو رہی ہے اور انتشار دماغ و اختلاج قلب نے مجھے بھی آپ ہی کی حالت پر لاکر رکھدیا ہے۔ ع

تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل

لیجئے ایک "ناکارہ" سے محبت کرکے دوسرے نے بھی اپنے "ناکارہ" ہونے کا ثبوت دیدیا۔ ایک جہربیتہ مزاج سے مطلع فرماتے رہئے۔ میری حالت تو یہ ہے ؎

خارِ فراق دل میں ہے سوزش جگر میں ہے
اب جائیے کدھر کہ خلش دونوں گھر میں ہے

دعا فرمائیے کہ خدا ہم لوگوں پر رحم فرمائے۔

خانصاحب شیخ ارشاد حسین صاحب سول سکریٹریٹ نینی تال | آج صبح آپ کے لختِ جگر کو روانہ بریلی کر چکا ہوں۔ مجھے اُن کی نینی تال میں موجودگی کی اطلاع اس وقت ہوئی جب وہ اس جہان کو الوداع کہہ چکے تھے۔ حالانکہ پرسوں ہی اعجاز علی اور مصطفےٰ علی مجھ سے ملے مگر آپ کے بچہ کا کوئی تذکرہ درمیان میں نہیں آیا۔ اس سانحۂ جگر شگاف میں آپ کو صبر کی تلقین کرنا لاحاصل ہے۔

پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی علی گڑھ | تم کو کیسا صدمہ ہوا اس کا اندازہ کر سکتا ہوں!! تم سید ہو صبر کے خوگر ہو اس لئے خیال ہوتا ہے کہ غالباً تم اس صدمہ کو بھی سہار لوگے۔ مجھے تم اپنے غم میں شریک سمجھو۔ خدا کرے کہ تم بخیر و خوبی اس ابتلائے عظیم سے عہدہ براٰ ہو جاؤ۔ گھر میں بھی صبر کی تاکید کرو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ غم ایسا نہیں جو تم لوگ آسانی سے بھلا سکو گے۔

مولوی اکرام اللہ خانصاحب ندوی ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ | آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ واقعی اس حالت میں لکھنا مشکل تھا لیکن اندوہناک واقعہ کی اطلاع مل گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحوم کی والدہ کو صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ قلب و دماغ پر اس خبر بد کا جو اثر پڑا اور جو رنج و قلق ہوا اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ کی نوعیت بجائے خود اس قدر اندوہناک ہے کہ ایک بے تعلق سے بے تعلق شخص بھی بیتاب ہو جاتا ہے۔ ع

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

مرحوم نے باوجود جسمانی کمزوری اور ناتوانی کے تعلیم کی ایک منزل اپنے شوق اور محنت سے طے کر لی تھی۔ والدین اور خاندان کی بہت سی امیدیں اس ننھی سی جان سے وابستہ تھیں لیکن افسوس کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ قدرت کے یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ع

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

موت خواہ وہ کسی عمر میں ہو خاندان والوں کے لئے رنج و صدمہ کا باعث ہوتی ہے لیکن ایک غیر متوقع دفعتاً شخص کو بیتاب کر دیتی ہے۔ [illegible] بہتر جانتا ہے کہ اس کا ... میں کتنے غنچے کھلنے سے پہلے مرجھا گئے اور کتنی کلیاں تبسم آشنا نہ ہو سکیں۔ قدرت کا یہ سلسلہ ہی جاری ہے جو یہاں آتا ہے وہ کبھی جلد اور کبھی بدیر رخصت ہو جاتا ہے۔

آپ کو اور مرحوم کی والدہ کو جو رنج و قلق ہوگا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ فطرت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے معصوم بچے کی وفات پر حزن و ملال ہوا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ کہ انسان جب تک زندہ ہے اس پر کچھ ذمہ داریاں ہیں جن سے عہدہ برا ہونا ضروری ہے [illegible]

زندگی عطا ہوئی تو خواہ مخواہ اس کی حفاظت ضروری ہے اور ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ خوش ہوں یا ناخوش۔ ع

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب اس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ اس لئے صبر سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اور یہ ہمت کی کی آزمائش کا موقع ہے۔ آپ پر دوسرے بچوں کی (خدا انھیں زندہ اور سلامت رکھے) ذمہ داریاں ہیں۔ پرورش کی ذمہ داری اور تعلیم کی ذمہ داری۔ اس لئے ہمت سے کام لیجئے اور مردانہ وار اس صدمہ کو برداشت کیجئے۔ میرا خیال ہے کہ بریلی میں آپ کا قیام مزید رنج و غم کا باعث ہوگا۔ اس لئے حتی الامکان اس ماحول سے باہر آ جانا چاہئے۔

مصطفےٰ صدیقی صاحب بی۔ اے ریاست ٹونک

آخر اس غمناک خبر کی تصدیق ہو کر ہی رہی جسے اب بھی دل نہیں مانتا۔ کسی طرح دل و دماغ یہ سوچنے کو تیار نہیں ہوتا کہ شاہد میاں جیسا پیارا اور سنجیدہ بچہ ہم سے اس طرح چھینا جا سکتا ہے۔

آپ کے اس نقصانِ عظیم کا اندازہ تو کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ مگر اس وقت یہ خیال کسی طرح دماغ سے نہیں نکلتا کہ کیا واقعی مشیت اتنی بے رحم ہے۔ فطرت اس قدر بے حس ہے اور انسان اتنا مجبور ہے۔

صبر کی تلقین کرنے کی ہمت نہیں۔ اُس "ماں" اور اس "باپ" سے صبر کرنے کو کس طرح کہا جا سکتا ہے جس ماں باپ نے شاہد جیسا بچہ کھو دیا ہو۔

سید اظہر حسن صاحب رضوی بی۔ اے اورنگ آباد۔ دکن

کس قلم سے آپ کو خط لکھوں اور کس ذخیرہ سے الفاظ چن لاؤں جن سے میرے اندرونی جذبات کا بھی اظہار ہو سکے اور آپ کا زخم بھی اچھا ہو جائے —— قدرت نے بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ ہم مجبور انسان سوائے صبر کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ بچاری ماں کے دل کا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی کلیجہ پھٹتا ہے۔

آپ نے اب تک موت کے ہر جھٹکے کا ایک بلکے سے تبسم سے مقابلہ کیا ہے۔ اس صدمہ کو بھی جھیل جائیے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ شاہد ہم سے چھٹ چکا ہے —— دل ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ —— یہ غریب ایک دن ختم ہوگا اور دل کو موت کے ہاتھوں صبر کا خون پینا ہی پڑے گا۔

حاجی عنایت احمد خاں صاحب علی گڑھ

یہی مقام ہے جہاں انسان مجبور ہے۔ سوائے صبر و شکر کے چارہ نہیں جو چیز یہاں پسند ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں۔ اُسکی امانت تھی صبر کیجئے

حکیم شریف الزماں صاحب علی گڑھ

حالِ وفات شاہد میاں مرحوم معلوم ہوکر حد درجہ رنج و افسوس ہوا۔ بڑا متین اور نیک بچہ تھا۔ افسوس صد افسوس۔ عمر نے وفا نہ کی۔ آپ کے بچوں میں یہ بچہ قابل ہوتا۔ مگر مشیتِ ایزدی میں کسی کا چارہ نہیں۔ نیک بندوں کی آزمائش ہوا کرتی ہے۔

سید ریحان الزماں صاحب علی گڑھ

شاہد میاں کے انتقال پُرملال کی دہشت اثر خبر سُننے میں آئی۔ سخت افسوس ہوا۔ دنیا فانی ہے۔ یہاں کی کسی شے کو ثبات نہیں۔ کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ کوئی پہلے اور کوئی بعد مگر وقت آنے پر جس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا چھلک گیا۔ ہمیں خود ایک روز اس راہ سے گزرنا ہے۔

میر عزیز الرحمان صاحب دھلی

آج یہ خبر سُنکر کہ آپ کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا دل کو بیحد صدمہ پہونچا۔ اولاد کی موت تو یونہی ماں باپ کے لئے صدمۂ عظیم ہوتی ہے لیکن جوان بیٹے کی موت سے بڑھ کر اور کیا غم ہو سکتا ہے۔ یہ نقصان پورا ہونے والا نہیں۔ جب اس کی بہار کے دن آئے تو خدا نے بیاہا کر لیا۔ بھائی میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اور آپ کی اہلیہ محترمہ کو صبر کی توفیق دے اور اس نقصان کی تلافی فرمائے۔ خدا پر بھروسہ رکھئے اور اُسی پر معاملہ کو چھوڑ دیجئے۔

پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب ایم اے "ندوۃ المصنفین" دہلی

کل شام مصنف پہونچا۔ کھولتے ہی شاہد کی جوانمرگی کے سانحۂ الم انگیز کا علم ہو کر کیا کہوں کہ قلب و جگر پر کیا کیفیت گزری۔ عام دستور یہ ہے کہ پسماندگان مرنے والے کے اوصاف و محامد کو بیان کر کے گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مرحوم کے لئے اُن کا ماتم اور نوحۂ غم جائز اور درست ہے۔ میرے نزدیک اس طرح کی بات ایک حد تک اخلاقی کمزوری کی دلیل ہیں۔ ایک باپ کو اپنے بیٹے کا ماتم اس لئے اور صرف اس لئے کہ مرنیوالا اُس کا بیٹا تھا۔ جگر گوشہ اور پیوند جاں تھا۔ ایک باپ کے لئے ماتم کے جواز میں اس سے زائد اور کیا چاہئے۔ شاہد کی جو خوبیاں آپ نے لکھی ہیں وہ بے شبہ ایسی ہیں کہ اُن کو پڑھ کر اور سُنکر ہر شخص متاثر ہوگا۔ اور مرحوم کی بے وقت موت سے وہ اپنے دل میں ایک چبھن اور خلش سی محسوس کرے گا۔ شاہد جیسے ہونہار اور پر ارمان بچوں کا فقدان کسی ایک گھر کا نقصان نہیں بلکہ پوری قوم کا نقصان ہے۔ اُس کی جمعیت کا ایک ہونیوالا کامیاب سپاہی گم ہو گیا۔ بہرحال یہ تمام اسباب وجوہ غمگینی کے لئے ہیں۔ آپ کے اور محترمہ سیدہ انیس فاطمہ کے زیادہ سے زیادہ رنج و غم کے لئے کیا یہی کم ہے کہ اُٹھتی جوانی اور اُبھرتے شباب کے عالم میں مرنیوالا شاہد آپ دونوں کا جگر پارہ اور دل

طرہ امتیاز آپ دونوں کے لئے تو ایک عربی شاعر کے بقول وہی بات ہوگئی کہ ؎

وَمَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ
فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

جیسے مواقع پر رسم یہ کہنے کی ہے کہ "صبر کیجئے" مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ الفاظ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ واقعہ جب انتہائی صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہو تو پھر ایسے موقع پر صبر کی تلقین کرنا ایک امر غیر مقدور کی تکلیف دینا نہیں تو اور کیا ہے! اس لئے میں آپ دونوں سے ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ صبر کیجئے بلکہ باخلاص تمام خدا کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ دونوں حضرات کو اور دوسرے بہن بھائیوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ خدا قادر مطلق ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے اور آنجہانی مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب بھی تعزیت کرتے ہیں اور سلام مسنون پہونچاتے ہیں

والسلام مع الاکرام

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پرنسپل دارالعلوم کالج حیدرآباد دکن نے "معنف" میں یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا کہ آپ کے نوجوان فرزند نے وفات پائی۔ آپ نے جس انداز میں نوٹ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے نفس پر بڑا جبر کیا ہے۔ اور سچے مسلمان کی طرح صبر و شکر سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے اور اس کے سوا انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ شکر ہے کہ آپ کو اس صدمہ عظیم کے جھیلنے کی ہمت نصیب ہوئی۔ اور آپ کی تحریر ایک مرد مومن کے راضی بہ رضائے الٰہی قلب کی غمازی کر رہی ہے۔

امید کہ آپ اس صدمے کا زیادہ اثر نہ لیں گے۔ آپ اردو اور علم کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کی خاطر زیادہ بار نہ لیجئے (باقی دارد)

قطعہ

شب کو مرا جنازہ جب جائے گا نکل کر
رہ جائیں گے سحر کو دشمن بھی ہاتھ مل کر
روئیں گے دیکھ کر سب بستر کی ہر شکن کو
وہ حال لکھ چلا ہوں کروٹ بدل بدل کر

(قمر جلالوی)

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

پندرہ روزہ شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی مقاصد کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ مت [illegible] اور [illegible] سے چھپے کا غذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید [illegible] خاص اہتمام سے ریویو کرکے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے جو [illegible] قیمت پیشگی اخبار کے خریدار ہوں گے اُن کی خدمت میں دو کتابیں یعنی التربیۃ و التعلیم ضخامت ۵۵ صفحات اور تمدن و معاشرت ضخامت [illegible] صفحہ ہدیۃً پیش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید دلچسپ مضامین پر مشتمل [illegible] اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے۔ [illegible] سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

اڈیٹر:- محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

کانفرنس بک ڈپو

کانفرنس نے کچھ عرصے سے "کانفرنس بک ڈپو" کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں اُن کتابوں کے علاوہ جو کانفرنس نے خود شائع کی ہیں ہندوستان کے دوسرے مشہور اور مستند مکتبوں اور مصنفوں کی کتابیں بھی فروخت ہوتی ہیں اور ان کتابوں میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی نہایت مفید اور کارآمد کتابیں موجود ہیں۔ کانفرنس بک ڈپو کا نفع علمی اور تعلیمی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ آپ جب کبھی کسی کتاب کی ضرورت ہو کانفرنس بک ڈپو سے طلب فرماکر کانفرنس کے اس شعبہ کو تقویت پہنچائیں تاکہ اس کے علمی اور تعلیمی کام روز افزوں جاری رہیں اور آپ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں

فہرست کتب مفت

مہتمم کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

مجلس مصنفین علیگڑھ کا ماہانہ علمی [illegible] رسالہ

اپریل ۱۹۴۷ء

مدیر و ناشر

الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ - چار روپے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

[illegible]

مُصنّف

جلد ۵ | بابت ماہ اپریل سنہ ۴۷ء | نمبر ۱۸

فہرست مضامین

سفینہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

ایڈیٹوریل مصنف
بابتہ اپریل ۴۷ء

مسلمان اور سیاستِ حاضرہ

"مصنف" ایک علمی و ادبی رسالہ ہے اور سیاسیات سے ہمیشہ بے تعلق رہا ہے۔ لیکن گزشتہ شش ماہی کے ملکی و ملّی تکلیف دہ واقعات و خوں چکاں حادثات نے مجبور کیا کہ اپنے ادادبوں میں ہم علم و ادب کی نرم و نازک موشگافیوں کو کم از کم اُس وقت تک کے لئے بالائے طاق رکھ دیں جب تک کہ ہماری ملّتِ عزیز خطراتِ عظیم سے دوچار ہے۔ ع

چہ کند بے نوا ہمیں دارد!

چنانچہ بہار اور گڑھ مکتیشر کے سانحات کے بعد جنوری ۴۷ء میں

"پس چہ باید کرد"

کے عنوان سے ہم نے جو مقالۂ افتتاحیہ مسلمانوں کی موجودہ تشویش ناک حالت پر ایک بصیرت افروز تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کیا وہ ملک کے طول و عرض میں "وقت کی آواز" قرار دیا گیا اور مختلف صوبائی مرکزوں کے موقر و کثیر الاشاعت اخبارات نے ہمارے ناچیز "پیغام" کو لاکھوں شکستہ دل مسلمانوں تک پہونچا کر اُن کی ڈھارس بندھانے کا سامان بہم پہونچایا +

گزشتہ سہ ماہی کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ مسلمانانِ "مغربی پاکستان" نے سوتے سے کروٹ بدلی اور "اُفقِ پنجاب پر" آفتابِ حسِ قومی کچھ ایسے آب و تاب سے "ابھرا" کہ نہ صرف عرصۂ دراز کا "دورِ گراں خوابی" یک لخت مفقود ہو گیا۔ بلکہ ہمارے پنجابی بھائی اور بہنوں نے اپنی "زندہ دلی" کا ایسا بے نظیر اور بانکا مظاہرہ کیا کہ دنیا محوِ حیرت ہو کر رہ گئی ہے

دلا اندر رہِ ہستی با جبر زی   ز سودائے سکوں بیگانہ تر زی

جس کمال چابک دستی سے پنجابی مسلمانوں نے اپنی حالیہ تحریک سول نافرمانی کو چلایا ——— ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں ——— اس کی حیرت انگیز کامیابی کا بہترین ثبوت ——— حریفوں کے طریقہ کار کا وہ بھونڈا پن ہے جو بعد کو اُن کی چلائی ہوئی تحریک میں دنیا نے مشاہدہ کیا +

مسلمانوں کی تحریک سابقہ ناتجربہ کاری کے باوصف کامل طور پر پُرامن اور نتیجہ خیز رہی ——— اغیار کا اُٹھایا ہوا "ہنگامہ" بلند بانگ دعاوی عدم تشدد کے باوجود ہولناک قتل و غارت گری کی شکل اختیار کئے بغیر نہ رہ سکا +

———※———

اب اس وقت معاملہ یہ ہے کہ ایک سال تک کانگریس پارٹی کے آلۂ کار بنے رہنے کے بعد ملک سر خضر حیات خاں صاحب ٹوانہ اور اُن کے ہم نوا حضرات غلط روی سے تائب ہو کر سوادِ اعظم سے پھر آملے ہیں۔ لیکن پنجاب اسمبلی میں ۱۹۳۵ء کے ناقص آئین کی رُو سے ستاون فی صدی مسلمانوں کی قانونی اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی وزارت ہنوز نہ بن سکی اور کانگریس ہائی کمانڈ اس غلط فہمی کے تحت کہ عہدوں کے لالچ میں پنجاب کے مسلم لیگی رہنما بلووں اور فسادوں سے خوف کھا کر یا تقسیم پنجاب کی دھمکی میں آ کر بالآخر سر تسلیم خم کر دیں گے۔ قیام وزارت میں بڑی بڑی رکیک اور طفلانہ رُکاوٹیں ڈال رہی ہے +

ایک مسلمانوں کا ظرف ہے کہ ہندوستان کے سات بڑے صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کو انگیز کئے ہوئے ہیں اور دوسری طرف برادرانِ وطن کی یہ تنگ نظری ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کے حق آزادئ کامل کو تسلیم کرنا تو درکنار ۱۹۳۵ء کے پُرانے قانون کے مطابق مسلم اکثریت کے ایک صوبہ میں اُن کی عارضی وزارت تک کو ناممکن بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

———※———

ہندوستان کے اصلی مالک اچھوتوں کو ہزارہا سال سے اپنی سرمایہ دارانہ قومیت و استعماریت میں ضم کر لینے کے جو ساحرانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ وہی اب سے نوّے سال پہلے کے حکمرانوں — شاہی بچوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کی شاطرانہ چالیں چلی جا رہی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ :-

'چونکہ سنہ ۱۷۹۹ء سے سنہ ۱۸۴۹ء تک سلطنتِ مغلیہ کے عہدِ زوال اور انگریزوں کے زمانۂ عروج میں پچاس سال تک سکھوں کی حکومت رہی۔ لہذا پنجاب سکھوں کا حق ہے —'

اُس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ :-

'ایک ہزار سال تک بلا شرکتِ غیرے پچیس فی صدی مسلمانوں کی پورے ملک ہندوستان پر حکومت رہی — نیز جب سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک سال کے لئے اس حکومت کا ملک کے طول و عرض میں دوبارہ احیاء ہوا۔

بہادر شاہ شہنشاہِ ہند کے سکّے اور خُطبے کی تجدید ہوئی — مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہر جماعت کے لوگوں نے جُوق در جُوق 'مُغلِ اعظم' کے پرچمِ اسلامی کو سلامی دی۔ تو کیوں نہ انگریزوں کے جانے کے بعد پورا ہندوستان از سرِ نو

حق بحقدار رسید'

'صرف مسلمانوں کے زیرِ نگیں کیا جائے'

مستقبل کے نئے ہندوستان میں یوروپین طرز کی اکثریت و اقلیت والی ناقص جمہوری حکومت کا تجربہ کرنے کی ایسی کیا خاص ضرورت ہے، جبکہ مسلمانوں کا دَورِ حکومت مسلّمہ طور پر بلا تفریقِ مذہب و ملت ہر فرقہ کے واسطے باعثِ رحمت و برکت رہا — اور برعکس اس کے اوّل الذکر یوروپین طرزِ حکومت خاص یورپ میں قطعاً ناکام ثابت ہو چکا ہے

جمہور کے نام پر صرف اُونچے طبقہ کے لوگوں نے حکومت کی اور "اخوت و مساوات" کے جھوٹے نعرے لگا کر خونِ انسانی کے ایسے سمندر بہائے کہ چنگیز و ہلاکو کی خون آشامیاں داستانِ پارینہ بن گئیں +

خود ہندوستان کی میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں وغیرہ میں جیسی جیسی انسانیت سوز خود غرضیوں اور سازشوں کی گرم بازاری ہے اُس نے بھی ہمیں کسی مزید تجربہ سے بے نیاز کر دیا ہے +

شہنشاہیت، آمریت اور جمہوریت وغیرہ طرز حکمرانی کی صرف مختلف قسمیں ہیں، جن کا ہزاروں سال کے عرصہ میں بہت کچھ سر سے پانی گزر جانے پر آج ۱۹۴۷ء میں بھی محض تجربہ ہو رہا ہے اور تاریخ کی کسوٹی پر سب سے زیادہ یہ نام نہاد جمہوری نظامِ حکومت ہی ناکام ثابت ہوا ہے، ہمارا ایقان ہے کہ حقیقی جمہوریت نہ کبھی قائم ہوئی نہ ہو سکتی ہے +

مغلیہ سلطنت کے بعد پانچ ہزار میل سے آئے ہوئے مٹھی بھر انگریزوں نے بظاہر جمہوریت کی آڑ لے کر ورنہ اصلاً اپنی بندوقوں اور توپوں کے زور سے چالیس کروڑ انسانوں کے ملک کو اب تک اپنا غلام بنائے رکھا ——— ——— آج بھی انگریزی توپوں کا بول بالا ہے

کیونکہ برطانوی فوج اور پولیس کے سہارے ہی صوبوں کی کانگریسی وغیر کانگریسی حکومتیں اور مرکز کی "اینٹرم گورنمنٹ" برسرِ اقتدار ہے۔ رائے عامّہ یا جمہور کی نمایندگی کا محض ڈھونگ ہے، آج بین الاقوامی سیاست کی گتھی برطانیہ کے حسب منشا سلجھ جائے یا تیسری "جنگِ عظیم" چھڑ جائے تو ہماری مفروضہ قومی حکومت و آزادی کے تمام خوش نما نشانات حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دئے جائیں گے، اُس وقت نہ لالہ جے پرکاش نرائن کی لاف زنی مؤثر ہوگی۔ نہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت جواہر لعل نہرو کا غرور و تکبر کام دے گا اور نہ ماسٹر تارا سنگھ کی کرپان نمائی کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا +

ہو سکتا ہے کہ بعض جماعتوں کی طرف سے عَلَمِ بغاوت بلند کیا جائے لیکن جس طرح جرمنی اور جاپان جیسی منظم قوموں کی نہتے ہو جانے کے بعد کوئی

نادت کارگر نہیں ہو سکتی۔ کانگریس کے برپا کئے ہوئے ہنگامے کی بھی
مطلق اہمیت نہ ہوگی سنہ ۱۹۴۲ء کی طرح پوری تحریک کو آناً فاناً کچل کر
رکھ دیا جائے گا اور جنگی ضرورت کے تحت انگریز یا ان کے جانشین
امریکنوں کا ملک پر پہلے سے بھی زیادہ مضبوط قبضہ ہو جائے گا +

※

اندریں حالات ہماری دردمندانہ اور مخلصانہ گزارش ہے کہ
محض نہتی اور ابلہ فریب اکثریت کے زعمِ باطل میں مسلمانوں کے ساتھ
سمجھوتے میں تاخیر کرنا اور ملک کو باہمی خونریزی کا جہنم زار بنانا غیر ملکی
اقتدار کی عمر طویل کرنے کی مترادف اور عدیم المثال کوتاہ اندیشی کی
بات ہے۔ البتہ پاکستان کی بنیاد پر کانگریس، لیگ سمجھوتہ ہوتے ہی
انگریز بجائے جون سنہ ۱۹۴۸ء، جون سنہ ۱۹۴۷ء میں! نہیں نہیں!! بلکہ بقول مولانا
آزاد ایک طلوع و غروب کے وقفہ میں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور
کئے جا سکتے ہیں +

※

اس وقت کانگریسی زعماء و رہنما ہندو اکثریت کے نمایندے ہونے
کی وجہ سے بہت بڑے امتحان سے گزر رہے ہیں اور ہندوستان کے
غریب و مفلوک الحال لوگوں کی ان پر نظریں لگی ہوئی کہ —— اس
نازک دور میں وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں —— جہاں تک مسلمانوں اور
مسلم لیگ کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ پر مطمئن ہیں —— سمجھوتہ ہو جانے کی
صورت میں اور نہ ہونے کی صورت میں —— غرض دونوں حالتوں
میں وہ آزادی کامل حاصل کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اس کے واسطے
بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں +
مسلمانوں کی نیت میں ابھی تک کوئی فتور نہیں ہے اور وہ تبدیل شدہ
حالات میں اغیار ہی کے بنائے ہوئے اقلیت و اکثریت والے
پیمانوں کے مطابق صرف اپنا جائز حق مانگتے ہیں اور اس کے

ن کے طور پر بنگال اور سندھ کی مانند پنجاب و صوبۂ سرحد
میں لیگی وزارتوں کا قیام چاہتے ہیں +

'پاکستان' یا 'اکھنڈ ہندوستان' کا مسئلہ طے ہونے سے
پہلے ملک کے چھ بڑے صوبوں یعنی ۳/۴ ملک پر کانگریس حکومت
ہے اور چار دوسرے چھوٹے صوبوں یعنی ایک چوتھائی حصہ ملک پر مسلم لیگ کا
اقتدار ہو۔ کانگریس مسلم اکثریت کے علاقوں میں اقلیتوں کو ابھارنے
اور اُن سے مل کر سازشیں کرنا ترک کردے اور مسلم لیگ ہندو
اکثریت کے صوبوں میں حسب معمول مسلم اقلیتوں کو امن و امان سے
رہنے اور اتحادِ عمل کرنے کی ہدایت کرتی رہے گی +

لیکن اگر پنجاب میں سکھوں اور صوبۂ سرحد میں سُرخ پوشوں کو
اس طرح آلۂ کار بنائے رکھا گیا، نیز مسلمانوں کے قومی مطالبہ
'پاکستان' کا بدستور سابق مذاق اُڑایا جاتا رہا تو ہمیں خوف
ہے کہ مستقبل قریب میں صورتِ حال نازک سے نازک تر ہو جائیگی
اور ممکن ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کی طرح پورا ملک زبردست
خانہ جنگی کا مرکز بن جائے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری انڈین نیشنل کانگریس
کے سر ہو گی، جس کو بحالتِ موجودہ آزادئ وطن سے زیادہ
صرف ہندو قوم کے غلبہ و اقتدار کی فکر دامن گیر ہے +

خدانخواستہ کانگریس اور مسلم لیگ میں جلد از جلد سمجھوتہ نہ ہوا تو
مسلمان پہلے کے بہ نسبت زیادہ تیز قدم اُٹھانے پر مجبور ہوں گے +

ہندوستان کے سات کروڑ مظلوم اچھوت اِن سے ہاتھ ملانے
کو تیار بیٹھے ہیں اور اُن کے اتحادِ عمل سے ملک کے ہر حصہ میں کانگریس
کے لئے ویسی ہی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، جیسی کہ سکھوں کے ذریعہ
پنجاب میں مسلم لیگ کے واسطے پیدا کی جا رہی ہیں +

مخصوص پنجاب کے لئے ایک خالص قانونی لائحہ عمل بھی ضرورت پڑنے پر مسلم لیگ اختیار کر سکتی ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح اپنی سہولت کی خاطر مستقل آئین بننے سے پہلے کانگریس کی جانب سے پنجاب و بنگال کے دو - دو ٹکڑے کرکے ۱۹۳۵ء کے آئین میں ترمیم کئے جانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور یا خود برٹش گورنمنٹ کی جانب سے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کے اعلان کی رُو سے "انتقالِ اختیارات" کو سہل بنانے کی غرض سے مرکزی آئین میں ضروری تبدیلیاں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ مسلمان بھی یہ پیش کش اور مطالبہ کریں گے کہ ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت اقلیت کے صوبوں میں وہ اپنے تناسب آبادی سے زائد حق نمایندگی سے دست بردار ہوتے ہیں، تا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں تناسب آبادی کے مطابق اُن کی صحیح صحیح نمایندگی قائم ہو جائے +

فی زمانہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو **قائد اعظم محمد علی جناح** اور **آل انڈیا مسلم لیگ** پر جو غیر مشروط اعتماد ہے، اُس کی وجہ سے اقلیت کے ہر صوبہ کے مسلمان حکم ملتے ہی نہ صرف اس ایثار کے لئے بخوشی راضی ہو جائیں گے بلکہ اگر مذکورہ ترمیم دستور ۱۹۳۵ء میں کوئی رکاوٹ پیدا کی گئی تو اُس کو دور کرنے کے لئے مزید قربانیاں بھی دینے کو بلا پس و پیش تیار ہو جائیں گے +

*

الغرض ایک ایسی قوم جس کی پوری تاریخ سروری و سرفروشی کی شان دار روایات سے بھری پڑی ہو اُس کے جائز حقوق اور ترقی میں عارضی رکاوٹیں تو ڈالی جا سکتی ہیں، لیکن زیادہ عرصہ تک اُس کی قدرتی اور فطری تیز گامی کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت نہیں روک سکتی، جو لوگ یہ رکاوٹیں ڈالیں گے آخر میں وہ خود ہی خسارہ میں رہیں گے

مسلمانوں میں سچی بیداری اور حقیقی سیاسی بصیرت پیدا ہو چکی ہے اور وہ آیندہ ہرگز کسی مغالطہ یا دھوکہ میں نہ آئیں گے۔ ان سے صاف بات اور صاف صاف سمجھوتہ جلد اور بہت جلد ہو جانا ملک کی اور اس ملک میں رہنے بسنے والوں کی اہم ترین ضرورت ہے +

خدا کا شکر ہے کہ بہار کے بعد پنجاب کی خونریزی و تباہی نے کانگریسی زعماء کو اس ضرورت کا اب احساس بھی دلا دیا ہے اور اس خصوص میں ہم گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کی اپیلوں کا خیر مقدم کرتے ہیں +

اللہ سے دعا ہے کہ یہ اپیلیں دلوں کی حقیقی صفائی کی آئینہ دار ثابت ہوں اور نیک ارادے قول کی منزل سے گزر کر فعل کی صورت اختیار کریں +

روہیلا ہاؤس

کانفرنس کمپاؤنڈ۔ علیگڑھ

۲۴ ؍ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء

سید الطاف علی بریلوی

(مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیدرآباد اسکول کی غزل گوئی!

(از جناب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی)

دہلی اسکول۔ لکھنؤ اسکول اور رام پور اسکول کی اردو شاعری یا غزل گوئی پر بہت کچھ ن جا چکا ہے۔ مگر حیدرآباد اسکول کے متعلق ہنوز جیسی چاہئے کوئی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ اختصار کے ساتھ اس عنوان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ اردو شاعری کی بنیاد فارسی شاعری پر رکھی گئی۔ اس لئے فارسی اعری کے جملہ اصناف سخن یعنی مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی اور قطعہ وغیرہ ابتدا ہی سے ردو شاعری میں رائج ہو گئے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ دکن میں ابتدائی دو صدی تک مثنوی کا زیادہ واج رہا۔ اس لئے اسی صنف کا ذخیرہ بہت زیادہ ہمدست ہوتا ہے۔ مثنویوں کے کئی سو سخے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے مقابل غزلوں کا ذخیرہ ابتدائی دو صدی کا بہت کم یتیاب ہوا ہے۔

دکھنی شاعری کے آغاز کے وقت فارسی شعراء کے تین طبقے اپنا اپنا دور ختم رچکے تھے۔ رودکی، اسد طوسی، فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی اور انظ کا دور مختتم ہو چکا تھا۔ ان کی زمزمہ سنجی اور غزل سرائی ایران سے نکل کر دکن تک ہنچ گئی تھی۔ اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، کلیم اور ظہوری کی سخن سنجی اور نغمہ سرائی فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ اگر فارسی غزلوں کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ

اس میں یا تو عشقیہ مضامین ہیں یا پھر ان کو تصوف کی جانب منسوب کر کے عشق حقیقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ اس کو ماڈل قرار دے کر دکن کے شعراء نے غزل کی بنیاد رکھی۔ دکن یا حیدرآباد اسکول کی غزل کے مختلف دَور قرار دئے جا سکتے ہیں۔

پہلا دَور وہ ہے جو سلطان قلی کے پہلے سے شروع ہو کر ولی پر ختم ہوتا ہے۔ غزل کو بہ الفاظِ دیگر معشوق سے گفتگو، محبوب سے راز و نیاز سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور غزل کے ایک ایک شعر میں ایک دُنیا پنہاں ہوتی ہے۔ جس کی تفسیر کے لئے کئی صفحے درکار ہوتے ہیں۔ دکن کے پہلے دَور کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شعراء نے غزلوں میں حقیقت نگاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ دکنی شاعری کے عُروج کا زمانہ سلطان قلی سلطان محمد اور عبداللہ قطب شاہ کا دَورِ حکومت ہے اور اسی زمانہ میں بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ کی حکمرانی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس زمانہ میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی فضائیں عیش و طرب نغمہ اور سرود سے معمور تھیں۔ دولت کی فراوانی کے لحاظ سے عیش و عشرت کی گرم بازاری تھی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بازار حسینانِ جہاں سے معمور تھے، حُسن کے بازار میں ہر ملک کی حسین اور جمیل پری پیکر کی کمی نہیں۔ دکن کی سانولی سلون۔ گجرات کی گندمی گول۔ ایران کی سرخ و سفید۔ قاف کی پری چہرہ مہ وشوں کی افراط تھی۔ ان کے معطر لباسوں۔ نیم برہنہ جسموں۔ قیمتی جواہرات کی ضیاء پاشی سے محفل کا سماں دُوبالا ہو جاتا تھا۔

اُس دَور کی غزلیں اپنے مضامین کے لحاظ سے تو فارسی کا پورا پورا عکس ہیں۔ اس میں عشقیہ مضامین ملتے ہیں یا پھر تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ لیکن تخیل خالص ہندی ہے۔ اور الفاظ میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ اُس وقت کی زبان پر چونکہ فارسی کے ساتھ ہندی کا اثر تھا، اس لئے ان کی شاعری میں مقامی رنگ جلوہ نما ہے۔ سلطان محمد قلی نے جگہ جگہ اس امر کا اقرار کیا ہے کہ وہ عشق حقیقی کو چھپا نہیں سکتا۔ اس نے حافظ شیرازی کے رنگ میں غزلیں موزوں کی ہیں بلکہ حافظ کی کئی غزلوں کا کامیاب ترجمہ کر دیا ہے۔ غواصی کا دیوان بھی اب ہمدست ہو گیا ہے۔ اس کا رنگ بھی وہی ہے جو سلطان قلی کا ہے۔ ان کے کلام میں ہندی کی طرح عورت عاشق ہے اور مرد

اس کا معشوق۔ وہی معشوق کی زلفِ سیاہ اور رُخسارِ گلگوں۔ چشمِ فتاں کی تعریف ہے اس کی ترچھی نظر سے عاشق کا دل گھائل ہو جاتا ہے اور تیرِ نگاہ سے دل و جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ معشوق کا حسن اپنا آپ نظیر ہے۔ آفتاب کی ضیاء پاشی چاند کی پر نور روشنی اس کے مقابل ماند ہیں۔ معشوق کی جُدائی کا صدمہ عاشق سے سہا نہیں جاتا ہے۔ دن کو چین ملتا ہے اور نہ رات کو آرام۔ کوئی اُس کا پرساں حال نہیں۔ عاشق کے آنسو جاری ہیں۔ جُدائی میں ایک ایک پل ایک ایک سال معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر وہی رقیب کا گلہ۔ معشوق سے اس کی بے وفائی کا شکوہ۔ معشوق کا دم عیسیٰ سے بڑھ کر ہے کہ سیکڑوں مُردے جلا دیتا ہے۔ معشوق کا آنچل موسیٰ کے عصا سے سبقت لے جاتا ہے۔ معشوق کی چوکھٹ ہی کعبہ اور بت خانہ ہے۔ اس کی دربانی نصیب ہونا دو جہاں کی دولت کا مل جانا ہے۔ وہیں زاہد پر طعن و تشنیع اور ساقی کی مدح و ستائش ہے۔ ابر ہے۔ بہار ہے۔ چاندنی ہے۔ گل و گلشن ہے اور ایسے سماں میں معشوق کے دستِ حنائی سے بادہ ناب وہ مزہ دیتا ہے کہ پھر دُنیا و مافیہا کی خبر ہی نہیں رہتی۔

معشوق کے مقابل جنت کی حور و قصور کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ دین اور دُنیا بھی عشق اور معشوق کے مقابل ہیچ ہیں۔

یہ ہیں وہ مضامین جو اس ابتدائی دَور کی غزلوں میں عموماً پائے جاتے ہیں۔

قطب شاہ :-

پیا باج پیالا پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا

شمع مہاں جیوں کرے پروانہ کوں اب   مرغ بسمل بھونکر پروانہ کیتا

تیری انچل باد (ہوا سے) تھے ہے عیسوی دم جلوہ گر   وہ انچل بیچ ہات میں ہے جیوں کہ موسیٰ کا عصا

وجہی :-

طاقت نہیں دُوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا

تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے

شاہی :-

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو　　یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمُدر ہے

حیدرآباد اسکول کی غزل کا دوسرا دَور ولی اور سراج اور اُن کے ہمعصروں کا زمانہ ہے ۔ جبکہ مثنوی کا رواج کم سے کمتر ہو چلا تھا اور اس کے بجائے غزل گوئی کا زیادہ سے زیادہ رواج ہونے لگا۔ اگرچہ اس وقت بھی غزل کے داخلی مضامین وہی تھے جو اس کے پہلے دَور میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اب عشق حقیقی کی طرف زیادہ راہ نمائی ہونے لگی۔ تصوّف اور عرفان کے رمز غزلوں میں بیان ہونے لگے۔ مبالغہ آمیزی نہیں ہوتی۔ تشبیہیں اور استعارات کی کثرت ہے۔ صنعت الہام نہیں ہے۔ اس دَور کے ایک بڑے شاعر یعنی ولی کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ولی کا تخیل ہندی تخیل ہے اور فارسی شاعری کا بھی رنگ ملتا ہے۔ اگر ایک طرف ان کے کلام میں تصوریت ہے تو ساتھ کے ساتھ واقفیت بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اس دَور کی غزلوں میں تعشق اور تغزل کا وہی رنگ ہے جو غزل کا صدیوں سے موضوع ہے۔ وہی عشق و حُسن کے تاثرات۔ وہی امید و بیم۔ حزن و ملال ہے وہی سوز و گداز ہے۔ تو وہی معشوق کی بے نیازی ہے۔ لفظی خوشگافیاں۔ استعارات اور تشبیہوں کی ندرت اور دل آویزی۔ محاکات شاعری۔ زبان کی سلاست تخیل کی بلند پردازی۔ بندش کی چستی اور کلام کی رنگینی یہ سب باتیں اُس دَور کے کلام کے جوہر ہیں۔ اُس دَور کے دوسرے بڑے شاعر سراج کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صداقت اور حقیقت کے جوہر موجود ہیں۔ ان کو اس جہانِ فانی کی ہر چیز میں حُسنِ ازل ہی کا پرتو نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں ترنم اور تلمیحوں کی ندرت۔ سادگی۔ بے تکلفی۔ مضمون آفرینی۔ حقائق اور معارف کے بیش بہا نکتے۔ نصیحت اور موعظت کے گراں بار جواہر موجود ہیں اور سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے۔

اُس دَور کے دوسرے مشہور شعرا ولی اور سراج کے ساتھ آزاد۔ داؤد۔ فضلی۔ اشرف۔ ذوقی۔ عزلت۔ فراقی۔ دردمند۔ ایما۔ قہر۔ محرم۔ حقیر۔ ضیا۔ فخر۔ صارم۔ مبتلا۔ مہتاب وغیرہ بیسیوں شعرا ہیں۔ کسی قدر کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

(ولی)

تجھ حُسن آبدار کی تعریف کیا لکھوں　　موتی ہوا ہے غرق تجھے دیکھ آب میں

لب تمہارے ہیں شفا بخش ولی ہے بیمار　　　حیف صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

ہے دل مرا دریائے غم اور نقش اس لب سُرخ کا
رہتا ہے مرے دل میں یوں دریا میں جیوں مرجان ہے

اے یار گر منظور ہے تجھ آشنائی عشق کی　　　ہر آشنائی عقل سوں بے گانہ ہو بے گانہ ہو

ولی اس گوہر کان حیا کا واہ کیا کہنا　　　مرے گھر اس طرح آوے ہی جیوں سینے میں راز آئے

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

تری یہ زلف ہے شام غریباں　　　جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے

دل چھوڑ کے یار کیوں کر جاوے　　　زخمی ہے شکار کیوں کر جاوے

آج تیری نگہ نے مسجد میں　　　ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

نگاہ تیز و پلک تیز غمزہ تیر تیز　　　ہوئے ہیں دل کے لئے یہ تمام نشتر تیز

سراج :-

ہمارا دلبر گلفام آیا　　　قرار جان بے آرام آیا

خندہ گل ہے گویہ شبنم　　　ہے ہنسی یار کی مرا رونا

اے بت پرست دیدۂ بینا سے دیکھ تو　　　اک ذات میں ظہور ہوا کئی صفات کا

کیا اُس سرو قد نے کل کا وعدہ قیامت پر رہا دیدار موقوف

مستیِ عشق اگر تجھے ہے سر آج شیشۂ چشم سے شراب نکال

خبر تحیّر عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی نہ تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

غیر کو بار نہ دو اپنی گلی میں ہرگز گلشنِ خلد میں کچھ کام نہیں خاروں کو

داور:۔

بے قراری کیوں نہ ہے دل کو مجھے سیماب وار
تجھ جُدائی کا مجھے اے شوخ تاب آتا نہیں

مسند ہے اہلِ دل کو بساطِ زمیں کا فرش ہے بے ریا کو بوئے ریا نقش بوریا

تیمم اس کا ان کے وضو کرنے سے افضل ہے کیا ہے جس نے حاصل خاکساری کی عبادت کو

آتشِ عشق سوں تری جل جل دل ہوا دل ہوا کباب کباب

ہوا ہے ابر گریاں دیکھ میری چشم گریاں کو پڑا ہے شور دریا میں مرے اس اشک جاری کا

ایجاد:۔

تماشا تھا اگر اب باغ میں ہوتا وہ یار اپنا خجل کرتا ہر اک گل کو دکھا کے نو بہار اپنا

میکدہ میں کون رکھتا عزتِ پیرِ مغاں گر نہ دیتی دخترِ رز اپنی حرمت کی قسم

پہلو اُسی کے بیٹھئے جو دلبری کرے باتیں اُسی سے کیجئے جو ہمدرد راز ہو

عشق :-

سینہ بریاں۔ چشم گریاں۔ آہ سوزاں۔ دل تپاں
کس قدر جلنے کا پروانے کے غم کھاتی ہے شمع

سوتے بختوں کا مرے یار سنو افسانہ　　سرگزشت اپنی کہوں تو اُسے نیند آتی ہے

اِدھر بلبل گزر جا گل سے۔ اُدھر گل گلستاں سے
جو تو گلزار سے گزرے تو کیا ہنگامہ برپا ہو!

قہر :-

پڑھ نماز یا تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ　　تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ[1]

ظاہری عشق و حسن میں اتنا ہی فرق ہے　　تم نے جفا و جور کئے میں دُعا دیا

عاجز :-

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اجڑا سمجھوں　　مشتِ خاک اپنی اڑا کر اُسے صحرا سمجھوں

الٰہی کب دلِ غمگیں ہمارا شاد ہووے گا　　یہ اجڑا شہر یارب کس گھڑی آباد ہووے گا

عزلت :-

آج دل بے قرار ہے میرا　　کس کے پہلو میں یار ہے میرا

قتل عزلت سے نہ منکر ہو کہ گل کے مانند　　لب پہ ہنستا ہی ترے خون نمایاں میں میرا

---

[1] تقریباً ایک صدی کے بعد ذوق نے اِس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

فضلی :-

دیکھ کر تیرے پاؤں کی مہندی　　مجھ کو تلووں سے آگ لگی

دکن کے اس دوسرے دور کے بعد دھلی اسکول کی شاعری کا آغاز ہوا۔ آرزو۔ آبرو۔ حاتم۔ مظہر وغیرہ کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور صرف قلعۂ معلّی کے اندر ہی مغلیہ تاجدار اپنی حکمرانی کی نوبت بجانے میں مصروف تھے۔ مگر پھر بھی مغلیہ تہذیب اور تمدّن مٹ نہیں گیا تھا۔ پُرانے رسم و رواج کے قدرداں ہر طرف موجود تھے۔ پُرانی محفلوں کے نشان باقی تھے۔ اس لئے جو زبان دکن میں بولی جاتی تھی وہ دھلی کی زبان کے سامنے ٹکسالی نہیں ہوئی تھی۔ دہلی کی زبان خصوصًا قلعۂ معلّی کی زبان اپنی صفائی اور شائستگی کے لحاظ سے خصوصیت رکھتی تھی۔ اسلئے جو شاعری دھلی میں آغاز ہوئی وہ صفائی اور شائستگی کی حیثیت سے بہت بلند معیار کی سمجھی جانے لگی۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگے۔ صنعت ایہام کا رواج ہو گیا اس کو کمالِ فن تصوّر کرنے لگے۔ ایسے محاورے جو غیر فصیح سمجھے جاتے تھے خارج کر دئے گئے۔

دکن کے تیسرے دَور کی غزل گوئی پر دھلی اسکول کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ کیونکہ دھلی کے شعراء دکن آنے لگے۔ ان کے اثر سے قدیم دکنی محاورے اور روزمرہ الفاظ متروک ہو گئے۔ اور پھر دکنی شعراء کے مقابل باہر سے آنے والوں کی قدردانی زیادہ ہوتی تھی۔ اور ان کی بڑی عزّت و وقعت کیجاتی تھی۔ چنانچہ صرف مہاراجہ چندو لال کے متوسلین شعراء میں کئی نام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً احسن اللہ کا بیان۔ تاج الدین مشتاق۔ حفیظ۔ نصیر وغیرہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے دکن اسکول کی اس دَور کی غزل گوئی پر دھلی اسکول کا رنگ جھلکتا ہے۔ یعنی اب دھلی والوں کی اتباع ہونے لگی۔ اس زمانہ میں بیسیوں شعراء نام آور ہوئے ہیں —— شیر محمد خاں ایماؔ۔ چندو لال تاباںؔ۔ قیسؔ۔ آشفتہؔ۔ شفیقؔ۔ سالکؔ۔ احسانؔ۔ عروجؔ۔ امتیازؔ۔ نثارؔ۔ چنداؔ وغیرہ اس دَور کے چند مشہور شعراء ہیں۔

اس دَور کے شعراء کے کلام سے یہ امر صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ انھوں نے دکھنی محاورات کو متروک کر دیا ہے اور دھلی اسکول کے امتیازات کی پیروی کرتے ہیں۔ فارسی

ترکیبیں اور فارسی جملے اُن کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں نازک نازک تشبیہیں ایسی پائی جاتی ہیں جو کسی فارسی اُستادِ سخن کے یہاں ہی مل سکتی ہیں۔ مضمون آفرینی کے لحاظ سے ان کا کلام بہت بلند مرتبہ تک پہونچتا ہے۔ اس دَور کے کلام میں تصوّف کے راز و نیاز کے ساتھ ساتھ فلسفی نکات بھی ملتے ہیں۔ محاکات یا مصوّری کے بیش بہا نمونے بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ چند شعراء کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ۔

شیر محمد خاں ایماءؔ: ۔

کس کی شمیم زلف یہ لاتی ہے اب نسیم | ٹک سونگھتے ہی عاشقِ بے دل نے غش کیا

زمرّد اُس کے آویزہ کا یوں عارض پہ جھکتا ہے | پری کے ہاتھ ہے شیشہ شبِ مہتاب میں گویا

گردش کو تیری چشم کے دیکھا تھا ایک دن | تب سے پڑا ہی چرخ میں خورشید اب تلک

کشتی شکستہ حال ہے اور بحر موج زن | اے شرط آ پہنچ کہ ہے ساحل کی آرزو

کچھ سُرخ جو ہے رنگ مرے اشک رواں کا | شاید کوئی ٹوٹا دلِ مجروح کا ٹانکا!

مجھ سے تو راز عشق کا افشاء نہیں ہوا | لیکن چلی ہی جاتی ہے تاکید اب تلک

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر | آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں

مہ لقا بائی چنداؔ: ۔

رخصتِ بوسہ دیا پان چبا کر ظالم | اپنی قسمت میں گ

گو اختراعِ عیش کا معدن ہے تو مگر | رغبت

خدا حافظ

وفا کے ہاتھ سے اپنے کمال عاجز ہیں ۔۔۔ جفا تو اس کی تھی معلوم پیشتر ہم کو

عشق میں ننگ سے مطلب ہے نہ ہے کام سے کام
کچھ کہے کوئی سدا اپنے ہمیں کام سے کام

ناصح عبث کرے ہے مجھے منع دید سے ۔۔۔ آجاوے وہ نظر تو پھر انکار دیکھنا

اس مضمون کو مومن نے یوں ادا کیا ہے۔
اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو ۔۔۔ ہم کو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

محمد صدیق قیس :۔

جاتا ہے سمندِ عمر کدھر ۔۔۔ جس پہ پا بہ رکاب سوار ہیں ہم

دیکھا جو رات شمع نے داغِ جگر کو قیس ۔۔۔ بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

کون آکر سما گیا دل میں ۔۔۔ جان تن میں نہیں سماتی ہے

روتے روتے ہوئی صبح مجھے ۔۔۔ پوچھ لو حال میرا شبنم سے

چندو لال شاداں :۔

شکل ہستی سراب کی سی ہے ۔۔۔ بے ثباتی حباب کی سی ہے

کیا کہے رات کیسی کٹی اُس کے پیار میں ۔۔۔ کس کس مزے کے لطف تھے بوس و کنار میں

محاورات کو متروک سمجھ :۔

بہ ترک نسب کن جامی ۔۔۔ کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ہے کام یہاں عاشقِ صادق کا وگرنہ — اٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بارِ محبت

مست کرتا ہے اک نگاہ میں تو — کب تجھے دیکھ ہم سنبھلتے ہیں

آتا ہے کس ادا سے بتِ نازنیں مرا — کرتا ہے مہر و مہ کو خجل مہ جبیں مرا

اسد علی تمنّا :-

کہیں شیوۂ سوز و گداز کیا، کہیں جلوۂ ناز و نیاز کیا
شبِ زلف کو جس نے دراز کیا مرا روز اس نے سیاہ کیا

جبکہ خنداں ایاغ ہوتا ہے — دل مرا باغ باغ ہوتا ہے

ساقی نہ دیا تو نے اگر مے تو کیا ہوا — بے بادہ گزر ہی گئے مستوں کے رات دن

رحم کر سے لے سینۂ سوزاں کہیں — آہ کے بھرنے سے نہ جل جاؤں میں

سوال وصل تمنّا نہ کیجو چونک نہ جائے — بچک رہا ہے وہ حاضر جواب پہلو میں

بچھمی نارائن شفیق :-

مہر اور لطف و تسلّی ہے رقیبوں کے نصیب — ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

آخری دم ہے ٹک ایک آنکھ بھلا اے قاتل — بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

قاضی کرم بخش سالم :۔

کس طرح عشق ترا کوئی نہ سمجھے سالم　　چشم گریاں دلِ غم گیں کا نشاں ہے تمغہ

خوب رُویوں کو نہیں پردے میں ہرگز اعتبار　　دُر صدف کی قید سے نکلے پہ پاتا ہے وقار

حجاب دخترِ رز کو تجھ سے نہیں زاھد　　جہاں گئی ہے تو بے پردہ سبو نہ گئی

کبھی نظریں چُرا کر مُسکرانا کچھ نگہ کرنا　　غرض کیا لطف ہی جب آشنا سے آشنا رُوٹھے

اک جان ہی سوا تک تجھ بن ترس رہی ہے　　پھر پوچھتا ہی پیارے کیا کیا ہوس رہی ہے

خواجہ ابو طالب خاں آشفتہ :۔

گریباں چاک پھرتا ہوں مجھے کیا کام گلشن سے　　دکھاتا ہے کسے اب باغباں تو انتظام اپنا

میں کب سے ترا طالبِ دیدار کھڑا ہوں　　رُسوا شدہ کوچہ و بازار کھڑا ہوں

خون ہے کس کا گنہگار سچ کہیو　　تیرے دامن پہ یار سچ کہیو

میر عباس علی خاں کافی :۔

الٰہی یاد میں کس بُت کی ہوں میں مضطرب خاطر

کہ ہے ناقوس کا نغمہ صدائے دل طپیدن میں

لگا دی سوزشِ داغِ جگر نے آگ سب تن میں

ہوا آخر یہ شعلہ برقِ سوزاں اپنے خرمن میں

اب ہم دکن اسکول کے چوتھے دَور میں پہونچ جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ

لکھنو اسکول بھی قائم ہو چکا تھا۔ اور دکن میں ایک طرف دھلی اسکول کے شعراء آئے
تھے۔ تو دوسری طرف لکھنؤ اسکول کے ارباب کمال کو بھی دکن کی کشش اپنی طرف
کھینچتی تھی۔ یہاں نہ مجھے لکھنؤ اسکول کے امتیازات بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اسکی*
خصوصیت کی وضاحت کرنی ہے۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ لکھنوئی شاعری پر وہاں کے
تمدن اور معاشرت کا اثر ناگزیر تھا۔ ماحول کے اثر سے کلام میں جو نزاکت پیدا ہوئی وہ
شعر کی جان۔ بلکہ روح تسلیم کیجاتی ہے۔ فارسی ترکیبیں جو دھلی اسکول میں رائج تھیں
کم ہو گئیں۔ معشوق کے خارجی اوصاف کا بیان ہونے لگا۔ زلف و کاکل۔ خط و خال۔
آنکھیں و رخسار۔ پھر ان کا لباس انگیا اور کرتی وغیرہ کے متعلق طرح طرح سے اظہار خیال
ہونے لگا۔ کلام میں معاملہ بندی کیجانی لگی۔ دھلی اور لکھنؤ میں اس زمانہ کے بڑے بڑے
استاد فن موجود تھے۔ انشاء۔ مصحفی۔ رنگین۔ ناسخ۔ نسیم۔ آتش۔ مومن۔ غالب۔
ذوق۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ انیس۔ دبیر۔ آسیر وغیرہ آسمانِ شاعری کے تابان و درخشاں
ستارے تھے۔ اور شاعری میں غالب کی وجہ سے جو تغیر ہو رہا تھا وہ اگرچہ اُس زمانہ میں
ذوق کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی ناقدانِ سخن غالب کے کلام کی خصوصیت
کے قائل تھے۔

اُس زمانہ میں حیدرآباد میں فیض۔ خاموش۔ تمیز۔ ذکا۔ عصر۔ فیاض۔ تاجی۔ باقی۔
وطن۔ مزاج۔ تمکین۔ زمزم وغیرہ اساتذہ فن موجود تھے۔ فیض اور ان کے تلامذہ نے
شاعری کی جو شمع روشن کی تھی اس کی ضیاء پاشی حیدرآباد کو منور کئے ہوئے تھی۔ جیسا کہ
قبل ازیں لکھا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں حیدرآباد میں دھلی اسکول اور لکھنؤ اسکول
دونوں جگہ کے شعراء آئے تھے۔ گویا دونوں اسکول سے تعلق تھا۔ اس لئے کوئی دھلی اسکول
سے شغف رکھتا تھا اور کوئی لکھنؤ اسکول کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا کرتا۔ شاہ نصیر کی
طرح سنگلاخ زمینوں اور مشکل سے مشکل قافیوں اور ردیفوں کا استعمال شروع ہوا اور بعض
مطالب اور معانی اور زبان سے زیادہ ضلع جگت۔ صنعت ایہام پر زور دینے لگے حیدرآباد
کے اُس زمانہ کے شعراء اپنے کلام کو بلند مرتبہ پر پہونچانے کے لئے شمالی ہند کے شعراء کی پیروی
ضروری تصور کرتے تھے۔ زبان اور محاورہ کا خاص لحاظ کیا جاتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ
حیدرآباد اسکول کا کوئی خاص رنگ نہیں بنا تھا۔ بلکہ دھلی اور لکھنؤ اسکول کے رنگ میں علیٰ

علیحدہ سخن سنجی ہوتی تھی۔ اور دونوں اپنی اپنی علیحدہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی آمیزش شروع نہیں ہوئی تھی۔ اُس دَور کے بعض شعرا کا کلام قابل ملاحظہ ہے :۔

فیض :۔

خلعتِ بادشہی خلعتِ عریانی ہے ۔۔۔ سروسامان میرا بےسروسامانی ہے

میں خوشامد کروں خدا نہ کرے ۔۔۔ اے بتو آن بان والا ہوں!

رہا کرتے ہیں پہروں محوِ نظارے میں ہم ایز ۔۔۔ سراپا ہو رہے ہیں اب تو اپنا آپ دَرپن ہم

حرم میں دیر میں جب کوئی رو برو آیا ۔۔۔ مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

چھان ڈالی جہان کی مٹی ۔۔۔ نہ ملا آج تک سراغ اپنا

قہر کی چشم سے دیکھو دیکھو ۔۔۔ مجھ پہ ہوگا نہ اثر جادُو کا

کبھی ذکر کوثر کبھی ذکرِ جنت ۔۔۔ کیا کرتے ہیں پینے کھانے کی باتیں

کہدو یہ زاھدانِ شریعت پناہ سے ۔۔۔ اک دن خمارخانۂ الفت میں آئے

جب سے وہ یار اپنے پاس نہیں ۔۔۔ دل ٹھکانے نہیں حواس نہیں

تمیز :۔

ہوا نہ ایک بھی اس کے اثر کیا دل پر ۔۔۔ اگرچہ ہجر میں نالے ہزار سال کئے

گزار جبکہ چمن میں وہ نونہال کیا ۔۔۔ خرام ناز سے ہر گل کو پائمال کیا

کمر کا اس کی سرِ مو نشاں نہ ہاتھ آیا　　بہت سا چشمِ تصور نے گو سراغ لیا

آنکھوں میں تیری سُرمہ کی تحریر ہے بہتر　　قتلِ دلِ عاشق کو یہ شمشیر ہے بہتر

سمجھے تھے ہم تو بہت دل کو دانا　　تمیز آہ بے کس یہ نادان نکلا

اُڑا لے گئی دیکھتے دیکھتے دل　　عجب وہ نگاہیں عجب اُن کی آنکھیں

قاتل نے ابروں سے لیا کام تیغ کا　　بدنام مفت ہی میں ہوا نام تیغ کا

باقی :-

بام پر یار کا چہرا دیکھا　　طور پر نور کا شعلا دیکھا

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پوچھے ہوتے　　دیکھتے پھر یہ مرا دیدۂ تر کیسا کرتا

پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر　　دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

حباب آسا ہے اپنا دم لبوں پر　　کوئی دم میں ادھر ہے یا اُدھر ہے

آج کل مشق ہے شمشیر زنی کی ان کو　　کاش ہم پر ہی کریں صاف وہ تلوار کے ہاتھ

عصر :-

شبِ غم انتظاری میں تمہاری اس طرح گزری　　کبھی تھے گھر کے اندر ہم کبھی تھے گھر کے باہر ہم

مٹی میں مٹی مل گئی نام و نشاں مٹا — پامال کرکے خاک ہماری اُڑا چکے

خدا ایسا کرے وہ پھوٹ جائے — نہ دیکھے تجھ کو جو اے دلربا آنکھ

کہانی کیا شبِ غم کی سُناؤں — اُنھیں نیند آئی میری داستاں پر

فیّاض :-

ہر رنگ میں وہ شاہد رنگیں قبا ملا — پنہاں کہیں ملا تو کہیں برملا ملا

حُسنِ بتاں سے شانِ حقیقت ہے آشکار — اُٹھ جائے چشمِ دل سے جو پردہ مجاز کا

جس کی ہمیں تلاش ہے دل میں ہے وہ مکیں — پھرتے ہیں خاک اُڑاتے ہوئے چار سو عبث

ہے کفر اگر کہوں خدا ہوں — ہاں آئینۂ خدا نما ہوں

نکل آتا ہے جب مذکور ان کی سرد مہری کا — تو بیمارِ محبت ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے

خاموش (شاہ معین الدین) :-

جاناں کی طرف جائیں تو جانا نہیں ہوتا — گھر اپنے بلائیں تو بلانا نہیں ہوتا

مقتل میں جو آؤ تو نہ لو ہاتھ میں شمشیر — بس کرتے ہیں دو ابروئے خمدار تمہارے

محفلِ عشق میں خاموش وہی روشن ہے — شمع سا کرے جو منظور جلانا اپنا

نہ مہر و وفا نہ جفا چاہتا ہوں — بہر حال تیری رضا چاہتا ہوں

ساقیا ایسا پلادے مجھے ایک جام بھلا   جس کے پیتے ہی رہوں بے خود و گمنام بھلا

صاؔف (میر حیات الدین مرحوم)

اے صاف سمجھ صحبتِ احباب غنیمت   سنتے ہیں جدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی

خدا کے واسطے صیاد اب رہا کر دے   چمن میں ہنستے ہیں گل موسم بہار آیا

عشق کے بندے ہوئے مذہب سے کچھ مطلب نہیں
بندگی کہدو ہماری کافر و دیندار کو

رمزؔ (سدانند جوگ بہاری لال) :-

تری بے وفائی کی یہ نصیحت   کسی سے نہ زنہار دل کو لگانا

آباد ہے ان قدموں سے ویرانہ ہمارا   گھر ہوگیا اب رشکِ پری خانہ ہمارا

جو دیکھا دیدۂ دل سے تو ہم نے یہ دیکھا   اِدھر بھی یار اُدھر بھی ہے یار کی صورت

حیدرآباد اسکول کی غزل گوئی کا پانچواں دور سنہ ۱۳۰۰ھ سے قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ لکھنؤ اور دہلی کے عظیم المرتبت شعراء نہ صرف حیدرآباد آئے بلکہ یہاں متوطن ہو گئے۔ حضرت امیرؔ اور اُن کا خاندان اور شاگرد فصیح الملک داغؔ اور اُن کے تلامذہ ظہیرؔ۔ سرشارؔ۔ نظمؔ۔ طباطبائی وغیرہ حیدرآباد آگئے۔ اُس زمانہ میں فیض کے تلامذہ اپنے اُستاد کی میراث تقسیم کر رہے تھے۔ ماحول کے اثرات دکن کے شعراء پر ہوتے رہے۔ اِس زمانہ میں دکن کے مشہور شعراء میں مائلؔ۔ توفیقؔ۔ کیفیؔ۔ شادؔ۔ رساؔ۔ وزیرؔ۔ دلؔ۔ ولاؔ۔ نامیؔ وغیرہ ہیں۔ اگر مائلؔ کے کلام کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ شاہ نصیرؔ کی طرح سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذوقؔ اور نصیرؔ کے بعد مائلؔ ہی نے اس قسم کی کوشش

کی ہے اور کوئی ان کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ مائل نے جہاں سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں قافیہ پیمائی کی ہے وہاں اُنھوں نے اُردو کے مشہور اساتذہ مثلاً میر۔ سودا۔ انشاء۔ ناسخ۔ اور آتش۔ مومن اور غالب کی کامیاب پیروی ہے۔ ان کے کلیات میں ان اساتذۂ سخن کی غزلوں پر بہتر سے بہتر غزلیں ہمدست ہوئی ہیں۔ مائل نے دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکول کی پیروی کی ہے۔

توفیق کا کلام امیر اور داغ کی طرح رنگین ہے اس میں فصاحتِ لفظی و بلاغتِ معنوی پائی جاتی ہے۔ وہ غالب اور مومن کی طرز کے مقلد کہے جاسکتے ہیں۔

کیفی داغ کے شاگرد تھے۔ مگر اُن کے کلام میں داغ کی خوبیوں کے ساتھ اور دُوسرے محاسن بھی جمع ہو گئے۔ شوخی۔ بذلہ سنجی اور لطفِ زبان۔ روانی اور صفائی کے ساتھ رندی۔ کیف و مستی بھی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے اور پھر تصوف اور عرفان کی آمیزش بھی موجود ہے۔ چونکہ یہی امور کیفی کی زندگی کی تفسیر ہیں اس لئے اُن کی غزلیں حقیقت نگاری کا مرقعہ کہی جاسکتی ہیں۔

عزیز بھی داغ کے شاگرد تھے۔ عزیز کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ دہلی کی زبان کی پیروی کرتے ہیں۔ حیدر آباد کے شعراء میں ایسے بہت کم شعراء ملیں گے جنھوں نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی ہو۔ دہلی کے محاورے۔ دہلی کے روزمرہ کا عزیز نے نہایت صحیح استعمال کیا ہے۔ عزیز کے کلام میں حسن و عشق کی تازگی سے جان پائی جاتی ہے اور اسی کیفیت کے باعث وہ نئی طرز کے مالک نظر آتے ہیں۔

شاد بھی اُسی دَور کے ایک جلیل القدر شاعر تھے۔ ان کا کلام مختلف خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں تصوف اور سلوک کے اسرار ہیں۔ سوز و گداز اور حلاوتِ زبان موجود ہے۔ اگر یہاں یہ صراحت کیجائے تو صحیح ہوگا کہ حقیقی حیدر آباد اسکول کی شاعری کا آغاز اُسی دَور سے ہوتا ہے جبکہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے امتیازات اور خصوصیات ایک جگہ جمع ہو گئے اور لکھنؤ اسکول کے بعض نقائص مثلاً معشوق کی خارجی وصف نگاری معاملہ بندی وغیرہ ترک کر دی گئی۔ گزشتہ ادوار کی قدیم معیاری اُردو کو بالکل ترک کر دیا گیا اور جدید شمالی ہند کی معیاری زبان پر قابو حاصل کرنے کی کوشش اپنے عروج کو پہونچ گئی۔ نظم نگاری کی ابتدا بھی اُسی دَور سے ہوئی اور اسطرح جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ بہر حال حیدر آباد اسکول کی شاعری کا خاص رنگ اِسی دَور سے شروع

ہوتا ہے۔ اب بعض شعراء کا کلام ملاحظہ ہو :۔

(۱) مائل ۔ ڈاکٹر احمد حسین :۔

لے بوسے جو میں نے تین چار آہستہ آہستہ
دیا کافر نے سینہ کو ابھار آہستہ آہستہ

یارب نہ پوچھ حشر کے دن دردِ دل کا حال
تو میرا ہم مذاق نہیں تجھ سے کیا کہوں

تم کو بھی ہے کمال تو ہم کو بھی ہے کمال
تم بخششوں میں طاق ہوئے ہم گناہ میں

موسیٰ نہیں ہوں نہ کرو لن ترانیاں
پردہ اٹھا دو بیچ سے گفت و شنید کو

خیالوں میں نگاہوں میں تمھیں ہو!
پھر اس پر یہ غضب پردہ نشیں ہو

کیوں نہ تڑپے راستہ میں خاک پتھر زہر پا
دل کی بیتابی سے نقشِ پا ہے مضطر زہر پا

دستِ ساقی میں رہے دستِ قدح کش میں رہے
گردنِ شیشہ صہبا کمر جام شراب

آپ کی بات کا بھروسہ کیا
آج کہتے ہیں کل مُکرتے ہیں

نہ تجلیاں ہیں نہ گرمیاں نہ شرارتیں ہیں نہ پھرتیاں
ہمہ تن تھے دن کو تو شوخیاں ہمہ تن وہ شب کو حیا ہوئے

---

(۲) توفیق (سید جلال الدین) :۔

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں قسمت آئندہ مری
خوابِ نادیدہ کی کہنی پڑی تعبیر مجھے

کبھی گم وہ رہوں میں نازکا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں
کہ حقیقت اک مری مشترک ہی حقیقت اور مجاز میں

ہوش اڑ جاتے ہیں پابند قفس کر کے مجھے — ہے مرے ساتھ رہائی بھی گرفتاری ہیں

بات مطلب کی کھٹک کر رہ گئی ہنگام عرض — مدعائے دل زباں پر آ کے کانٹا ہو گیا

آنے لگی کعبہ میں بھی یاد بت کافر — پڑنے لگی بنیاد کلیسائے دل میں

ہو گئے خود اسیر ہم ورنہ فریب ناز سے — اسکی بلا کو کیا غرض زلف میں وہ پھنسائے کیوں

چارہ گر روتا ہے میرے سامنے میرے لئے — رو رہا ہوں بیٹھ کر میں چارہ گر کے سامنے

(۳) کیفی (سید رئیس الدین حسن)

کیوں خفا ہوتے ہو مجھ مست پر اے حضرت شیخ
میں گنہگار خدا کا ہوں تمہارا تو نہیں

کیفی تم اور اتنی خوشامد پھر اس کی ہائے — اللہ اس قدر بھی نہ مجبور ہو کوئی

پارسا بن بیٹھنے سے کیا ملا کیفی تجھے — ہائے وہ رسوائیاں وہ ذلت و خواری تری

خیال میں مثال اور خواب میں ہے خیال — عجب رنگ بدلتی ہے تیری صورت بھی

یہ دل اول تمہارا ہے یہ دل آخر تمہارا ہے — ہم اپنا دل سمجھتے تھے نہ اپنا دل سمجھتے ہیں

(۴) عزیز (عزیز یار جنگ) :-

بے ثباتی کا اگر رنگ یہی ہے تو عزیز
رونق عالم ایجاد کہاں تک آخر

دیکھنا راہ پہ آ جائے گی آتے آتے گردشِ چشم ترس گردشِ ایام نہیں

اے حسنِ ازل تو نے بدل دی میری حالت میں لطف کا خوگر تھا مجھے غم نہ ہوا تھا

چارہ گر ہیں دنگ میری خوبی تقدیر سے زخم دل کچھ اور بگڑے ناخنِ تدبیر سے

بات کرنے کی اجازت ہی کسے دیکھ لینا بھی گنہگاری ہے

---

(۵) شادؔ (مہاراجہ کشن پرشاد) :-

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے مبرا ہے شادؔ یہ گرفتار تراسب سے ہے لیے یار جدا

وہ طالبِ دنیا ہے میں ہوں طالبِ مولیٰ منعم سے میری شادؔ طبیعت نہیں ملتی

کچھ آسان نہیں دعوئے عشق و الفت جو مشکل نہ حل ہو وہ مشکل یہی ہے

سوز و گداز عشق بھی میرے نصیب ہیں روزِ ازل سے اس کے لئے آفریدہ ہوں

مے پیو فکر میں اندوہ میں اچھا ہے یہی پیرِ مغاں کا رند و فتوئے ہے یہی

اے دل خیال خام ہے وہ رشکِ نازنیں معشوق ہو کر تجھ سے کہیں بدگماں نہ ہو

شیخ ہم سے نہ الجھ دیکھ جتا دیتے ہیں رند بھی ایسے کہ ہم حق سے ملا دیتے ہیں

---

(۶) غلام مصطفےٰ رساؔ :-

کس منہ سے کروں میں ستم و جور کا شکوہ وہ دیکھتے ہیں میری وفاؤں کو جفا میں

جب حریمِ ناز میں پہنچا میں خود بے گانہ تھا مہمان تھا آپ وہ اور آپ صاحب خانہ

کر دیا مست شرابِ عشق ملتے ہی نظر چشمِ ساقی میں الٰہی کیا کوئی میخانہ تھا

میں وصل کا خواہاں وہ مرے مرگ کے طالب اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دُعا کا

پروانہ صفت لے دل جل سوزِ محبت میں جو خاک ہوا اس سے اکسیر نکلتی ہے

---

(۷) وزیر (میر وزیر علی خاں) :-

آنکھ تھی عشق کی تھا حُسن و جوانی کو غرور مری نظروں میں ہے وہ آنکھ لڑانا تیرا

جانتے ہیں جسے دل ہے وہی دلبر اپنا عشق ہی حُسن ہوا روپ بدل کر اپنا

جو شخص کرے عالمِ پستی کو اختیار رتبہ نہ کیوں بلند ہو اس خاکسار کا

---

(۸) دل محمد حیدر خاں (لقمان الدّولہ) :-

دل کا آنا جی کا جانا ہو گیا آنکھ کا لڑنا بہانا ہو گیا

نکلتا ہے مرا سینہ سے دل آہستہ آہستہ مسافر ہے رواں سوئے عدم آہستہ آہستہ

کیوں کر شکستِ توبہ سے توبہ کرے کوئی عذرِ گناہ ہوتا ہے بدتر گناہ سے

---

(۹) نامی (عبد الغفور خاں صاحب) :-

آخر جلا جلا کر نامی کو مار ڈالا ارمان جی کا نکلا منت بر آئی تیری

کٹی عمر جس کی وفاداریوں میں ۔۔۔ وہی بے وفا بے وفا جاتا ہے

آئینہ دیکھئے زلفیں تو بنا، اپنی ۔۔۔ آج دیکھو تو میں لیتا ہوں بلائیں کیونکر

حیدرآباد اسکول کی غزل گوئی کا چھٹا دور اعلیحضرت سلطان العلوم کے سربر آوری سلطنت ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے شروع ہوتا ہے۔ اِس دَور کے غزل گو شعراء کو ہم تین طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا گروہ تو ان شعراء پر مشتمل ہے جو باہر سے آکر یہاں متوطن ہوگئے۔ اور اپنی خاص طرز کی شاعری کے لحاظ سے مشہور ہوئے۔ جن کو اُستادِ سخن کہا جاسکتا ہے۔ اور اُنھوں نے اپنے شاگردوں میں اپنی طرز کو رواج دیا۔ ایسے شعراء میں حضرت جلیل (فصاحت جنگ) حضرت نظم طباطبائی (حیدر یار جنگ) اور فانی مرحوم۔ نثار یار جنگ مزاج۔ اصغر یار جنگ اصغر۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرا گروہ ان شعراء پر مشتمل ہے جو خاص حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سے بعض سابقہ دور کی یادگار رکھے جاسکتے ہیں۔ مگر اس دَور میں ان کی شاعری زیادہ تابناک یا پختہ اور کہنہ مشق ہوگئی۔ ایسے اصحاب میں حضرت امجد ذہین۔ صفی۔ شہید۔ رعد۔ اختر۔ وغیرہ شامل ہیں۔

تیسرا گروہ نوجوان شعراء کا ہے جن میں سے بعض جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہیں۔ بعض جامعہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر ان پر بالواسطہ جامعہ کا اثر ہوا ہے۔ ایسے نوجوان شعراء میں وجد۔ میکش۔ نظر۔ سلیمان۔ اریب۔ شاہد۔ برق۔ سعید۔ ساز۔ باقی۔ شمیم وغیرہ شامل ہیں۔

جلیل مرحوم امیر کے شاگرد تھے اور امیر کو اگرچہ لکھنؤ اسکول سے تعلق تھا۔ مگر داغ کے تتبع میں دہلی اسکول کا رنگ بھی اختیار کیا تھا۔ مگر پوری طرح اس کو نباہ نہ سکے۔ کیونکہ ان کی شاعری کا اصل موضوع تصوّف اور نعت تھا۔ اور اس کے لئے داغ کا رنگ موزوں نہ تھا۔ مگر جلیل نے اپنے اُستاد کی پیروی میں جہاں لکھنؤ اسکول کے امتیازات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ وہاں دہلی اسکول کے خصوصیات خصوصًا داغ کے رنگ کی نہایت خوبی سے پیروی کی۔ اس لئے جلیل کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے دونوں رنگ جمع ہو کر

یک خاص رنگ پیدا ہوگیا۔ اور آپ کی شاعری قدیم طرز پر ہونے کے باوجود دورِ حاضرہ میں پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی رہی۔ ان کے غزل کے داخلی موضوع قدیم رہے۔ پامال موضوع پر خیال آفرینی کی مگر اس کو ایسا دلکش اور دل آویز بنایا کہ اس کی پامالی محسوس نہیں ہوتی۔

حیدر یار جنگ نظم کو بھی لکھنو اسکول سے تعلق تھا اور آپ کا خاص موضوع بھی نعت اور رسالت مآب کی سیرت کے بعض پہلو رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے غزل گوئی کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اس کا کافی سرمایہ چھوڑ گئے۔ ان کی غزلیں جہاں ایک طرف قدیم طرز پرشان وشوکت اور چُست بندش کی وجہ سے قابل قدر ہیں تو وہی جدید دلچسپیوں یعنی مضامین کی تازگی اسلوب بیان کی ندرت کی آمیزش کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ نظم کی غزلوں میں تغزل کا رنگ بہت کم ہے بلکہ فلسفہ۔ اخلاق اور لغت ہی ان کی غزلوں کے داخلی موضوع ہیں۔

فانی اور یگانہ میں اول الذکر دھلی اسکول سے اور ثانی الذکر لکھنو اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ فانی مرحوم کا کلام غالب کی طرح حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات سے مملو ہے۔ ان کا کلام یاسیات کا خزانہ۔ قنوطیت اور یاس و حرماں کی تصویر ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر کے بعد فانی نے ہی یاس اور حرماں کی حسرت ناک مصوری کی ہے۔ تخیل کی بلند پردازی۔ جذبات کی مصوری۔ واردات کی نزاکت ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ یگانہ کا کلام بھی فانی کی طرح فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات کا حامل اور حقایقِ زندگی کے مضامین سے مملو ہے۔ وہ دقیق اور نازک مسائل کو غزل میں آسانی سے بیان کر دیتے ہیں۔ یگانہ کا تخیل اپنی رفعت اور اسلوب بیان اپنی جدت اور ندرت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فانی اور یگانہ کی شاعری میں تغزل کی پابندی کی وجہ سے قدیم اساتذہ کا رنگ جلوہ گر ہے تو وہاں محسوسات طبیعت کی جدت۔ محاکات کی وجہ سے جدید رنگ بھی نظر آتا ہے۔

دوسرے طبقہ کے ممتاز شعراء میں امجد کا تذکرہ سب سے مقدم ہے۔ اگرچہ آپ اقلیم رُباعی کے بادشاہ ہیں مگر آپ کی نظموں اور تضمینوں کے ساتھ غزل بھی قابلِ قدر ہوتی ہے۔ امجد کی غزل تمام تر تصوف اور سلوک کے مضامین سے پُر ہوتی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے گراں بہا مضامین ملتے ہیں۔ آپ کی غزل حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ عام طور سے غزلوں کے پورے

قابلِ تعریف نہیں ہوتے بلکہ پوری غزل میں ایک دُو شعر قابلِ ستائش ہوتے ہیں۔ مگر امجد کی غزلوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کے زیادہ اشعار قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ اشعار میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہیں۔ امجد کی غزلیں تصوّف اور فلسفہ کے مشکل اور دقیق مسائل کی حامل ہونے کے باوجود سادہ اور صاف ہوتی ہیں۔ وہ تخیل کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود اصلیت سے دُور نہیں ہوتیں۔ رنگینی اور لطف زبان سے خالی نہیں۔ امجد نے اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ معمولی بول چال کی زبان کس طرح غزل کا بارِ امانت اُٹھا سکتی ہے۔

اختر خاندانی شاعر ہیں۔ آپ کی کئی پشتوں سے شاعری میراث بنی ہوئی ہے۔ امجد کی طرح اختر نے بھی نظم نگاری کے ساتھ غزل سرائی میں نام آوری حاصل کی ہے۔ آپ کی غزلیں سنجیدگیٔ فکر۔ متر نم وضع اور دلکشی رکھتی ہیں۔ بیان کی ندرت۔ اسلوب کی جدّت۔ تخیل کی بلندی۔ زبان کی شیرینی۔ آپ کی غزلوں کے جوہر ہیں۔ جدید شاعری کا رنگ نمایاں ہے۔ مگر عریانی نہیں ہوتی۔ آپ جوشؔ کے رنگ میں کلام موزوں کرتے ہیں۔

صفیؔ۔ کیفیؔ مرحوم کے شاگرد ہیں اور کیفیؔ داغؔ کے شاگرد تھے۔ مگر اپنا انفرادی رنگ رکھتے تھے کیفیؔ جہاں داغؔ کی طرح دہلی کی زبان۔ محاورہ اور روزمرّہ کا برمحل استعمال کرتے اور شوخی اور رنگینی میں استاد کے رنگ کی کامل پیروی کرتے تھے۔ وہاں وہ سخت سے سخت زمین اختیار کرتے اور زیادہ سے زیادہ شعر موزوں کرتے تھے۔ اس رنگ میں وہ اپنے استاد سے جداگانہ تھے۔ پھر سوز و گداز کے لحاظ سے بھی ان کا رنگ داغؔ سے علیحدہ تھا۔

صفیؔ کیفیؔ کے شاگرد ہونے کے باعث اپنے اُستاد کا رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ داغؔ کا رنگ چھن کر پہونچا ہے۔ لطافت اور نزاکت کے لحاظ سے صفیؔ کا کلام خصوصیت رکھتا ہے۔ مگر بلند پروازی سے وہ احتراز کرتے ہیں۔ روزمرہ کی بول چال میں وہ نفیس سے نفیس تر شعر موزوں کرتے ہیں۔ ان کے کلام کو سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔

تیسرا طبقہ نوجوان شعرا کا ہے جن میں سے بڑی تعداد جامعۂ عثمانیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے جدید شعرا مختلف نہج پر غزل گوئی کرتے ہیں۔ بعض علّامہ اقبال کے کلام سے متاثر ہیں اور اقبال کے رنگ میں غزلیں موزوں کرتے ہیں۔ بعض جوشؔ کے ہم نوا ہیں تو بعض اختر کے کلام کو پسند کرتے اور انھیں کے رنگ میں اپنی غزلیں لکھا کرتے ہیں۔ بعض جگرؔ

محبوب رکھتے ہیں تو کسی نے حفیظ جالندھری کے رنگ کو اختیار کیا ہے کوئی جلیل حسرت اور فانی کو اپنا رہبر بتاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے جدید شعراء نے جہاں اُردو کے صدر اول کے شعرا کا رنگ اختیار کیا ہے وہاں اُنھوں نے دوسری طرف یورپ خصوصاً انگلستان۔ جرمنی اور اطالیہ کے شعراء کے کلام سے بھی اثر لیا ہے۔ اور ان کے کلام نے اس طرح مغربی اور مشرقی طرز کی آمیزش کے باعث جدید رنگ اختیار کر لیا ہے جس کو حیدرآباد اسکول کا خاص طرز کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے شعراء کی غزلیں تخیل کی بلند پروازی اور اسلوب بیان کی جدت اور ندرت زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ ساتھ اصلیت اور واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ حقیقت نگاری کو پسند کرتے ہیں۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ خواتین بھی اب میدانِ شاعری میں خاصا حصہ لے رہی ہیں اور ان کے کارنامے تابناک ہیں۔ عصر حاضر کی چند مشہور شاعرات آمیر۔ ادا۔ بشیر۔ باقرہ۔ سعیدہ۔ شمیم۔ قمر۔ لطیف۔ نسیم۔ مخفی وغیرہ ہیں۔

اب صفحات ماقبل کی طرح بعض شعراء کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:۔

جلیل:۔

جب تک خلشِ درد تھی یک گونہ مزہ تھا ۔۔۔ جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

غرور اُن کا جو ٹوٹا تو عاجزی سے مری ۔۔۔ بجز نیاز کوئی ناز کا جواب نہیں

ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے ۔۔۔ گود میں تم کو لئے بیٹھے ہیں

نظم طباطبائی:۔

یہ آکے دیکھ کراماتِ میکدہ اے شیخ ۔۔۔ کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

کچھ نہ اندیشۂ عقبیٰ ہے نہ فکرِ دُنیا ۔۔۔ رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر

اتنا دعویٰ نیاز کا اے نظم ۔۔۔ نازیبا کہیں نہ ہو جائے

یگانہ :-

کیا چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں　　　جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اس دیار میں

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے　　　شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

پالا اُمید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا　　　دل کا بنا بنایا گھروندہ بگڑ گیا

فرحت :-

اس کے وعدے کو ہوگئے برسوں　　　اور مجھے انتظار ہے اب تک

ابر ہے ساقی ہے مے ہے اور زمانہ سازگار　　　چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہارِ نغمہ ہے

سجدے کر کے بتِ کافر کو یہ عادت بگڑی　　　ہے غضب کعبہ کو بھی میں نے کلیسا جانا

اصغر :-

گناہوں کا مری گردن پہ اصغر بوجھ کیا کم ہے　　　ستم اس پر فرشتوں کا ہے بارِ دوش ہوجانا

مجھے کیفِ جامِ الفت ہے جسے چھوڑ کر نہ اتر گیا　　　یہ نشہ نہیں ہے شراب کا کہ سرور آیا اُتر گیا

کبھی سُرخ تھا میرا پیرہن کبھی لال تھی میری آستیں　　　میری آنکھ سے جو لہو بہا تو وقارِ دیدۂ تر گیا

امجد :-

دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ　　　دیکھ لیا رُخِ حسیں اس درِ نیم باز سے

ہم تو اک بار اس کے ہو جائیں　　　وہ ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا !!

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے جو ہے اپنا نظر نہیں آتا !!

صفی :-

قیامت آئی یا اُس فتنہ قامت کو شباب آیا جفا آئی - غرور آیا - ادا آئی - حجاب آیا

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اُس نے کانوں کان سے مجھے خبر نہ ہوئی

جب اس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا زبان پر نہیں صورت پر اعتبار کیا

اختر (سید علی اختر) :-

قدرِ وفا ہوئی اُنھیں عرضِ وفا کے بعد رکھ لی خدا نے شرم مری التجا کے بعد

دم زندگی سے رہا ہوا غم زندگی سے گزر گیا یہ حیات قابلِ رشک ہے وہی جی رہا جو مر گیا

زندگی خواب سہی خواب کی تعبیر تو ہو بہر آسائشِ منزل کوئی تدبیر تو ہو

اب ہم چند نوجوان شعرا کا نمونہ پیش کرتے ہیں :-

وجد :-

نگاہوں میں دل میں سمائے چلا جا یونہی میری ہستی پہ چھائے چلا جا

ہر حال میں اک آفتِ جاں ہے وہ ستمگر آئے تو غضب اور نہ آئے تو ستم ہے

سراسر خطا تھی نگاہِ تمنا گنہگار تیری جوانی نہیں ہے

میکش :۔

کچھ امتیاز رہے میکدہ میں میکش کا　　　لبوں سے اپنے ہراک جام کو لگا کے پلا

دستِ نازک میرے شانے پر رکھا　　　بجلیاں رگ رگ میں دوڑا کر ہنسے

گم گشتگی میں منزلِ مقصود مل گئی　　　اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے کارواں سے ہم

سعید :۔

تا حشر نہ پاؤ گے کبھی آبِ بقا میں　　　اے خضر جو لذت ہے میرے جامِ فنا میں

انسان تو غافل ہے سحر خیز پرندے　　　کس شوق سے سرگرم ہیں خالق کی ثنا میں

فضل الرحمن :۔

طرب کی بزم میں جا کر کرے گا کیا کوئی　　　نہ وہ پیالہ نہ وہ مے نہ وہ شباب رہا

ہر ایک چیز کی دُنیا میں حد مقرر ہے　　　مگر یہ رنج زمانہ کا بے حساب رہا

ہوتی نہ دل کی تسلی کسی نظارے سے　　　زمیں کو دیکھ لیا، آسماں کو دیکھ لیا

ہمارا مضمون نامکمل ہوگا اگر ہم حضرت عثمانؔ اور حضرت شجیعؔ کے کلام کو پیش نہ کریں۔ صفحات ماقبل میں اس لئے تذکرہ نہیں کیا گیا تھا کہ کلام الکلام ملوک الکلام ہونے کے لحاظ سے تنقید اور تبصرہ سے بالاتر ہے ۔لیکن جب تک اس کا تذکرہ نہ ہو حیدرآباد اسکول کی شاعری کا پورا رنگ نمایاں نہیں ہوسکتا ہے اس لئے نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے :۔

حضرت عثمان :۔

نجست میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی　　　ابھی حصے میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی

کیا کہوں حال میں نیرنگ قفس کا عثمان — ایک پابند ہوا دوسرا آزاد ہوا

دیکھ اسے قیس اسے جامہ دری کہتے ہیں — تار باقی نہ رہا جیب و گریباں کی قسم

حُسن کے رعب سے لے یار شبِ خلوت میں — شمع کی لو ہے وہ لرزاں کہ بجھائے نہ بنے

درمیان دو عدم میں تھی جو ہستی اپنی — خاک میں مل گئے ہم خاک سے پیدا ہو کر

ہزار بار تمہیں آزما کے دیکھ لیا — تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے

ایسے گلشن میں کیا چین میسر عثمان — جس میں گل چیں بھی ہے صیاد بھی ہے جلاد بھی ہے

حضرت شجیع :-

کر چکے حالِ دل زباں سے بہت — اب سنائیں گے بے زبانی سے

جب تک نہ ہو فراق مزا کیا وصل کا — مہر و وفا کا لطف ہے جور و جفا کے بعد

ہیں یہ الفت کے کرشمے کہ مرے حصہ میں — زیست ایسی ہے کہ مرتا ہوں قضا سے پہلے

اُمید ہے کہ اس تفصیل سے حیدرآباد اسکول کی غزل گوئی کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے۔ فقط

نصیرُالدین ہاشمی

اقبالؒ

میری نظر میں

(نوشتۂ سید لطیف حسین ادیبؔ بریلوی)

مشرق کی ارضِ مقدس نے صرف پونے چار شاعر پیدا کئے ہیں۔ اوّلاً میرؔ۔ ثانیاً غالبؔ اور بعدہٗ اقبالؔ ـــــ یہ تین پورے شاعر ہیں۔ آدھے شاعر نظیرؔ اکبر آبادی اور چوتھائی شاعر برج نراین چکبستؔ ہیں۔ میرؔ نے عشق کی بنیادیں رکھیں اور اس کو "کمالِ جنوں" بخشا۔ غالبؔ نے اس پر "عقل و حکمت" کی جلا دی۔ اقبالؔ نے ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ اِس نے عقل کی روشنی میں سوز کا سہارا پکڑا اور عشق کی ارتقائی منازل کو طے کیا ؎

چہ می پرسی میانِ سینۂ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شُد

اِس نے فلسفۂ خودی کی داغ بیل ڈالی جس کی تبلیغ شعروں کے ذریعہ کی۔ اس نے فردِ واحد کو مکمل انسان اور قوم کو مکمل قوم بنانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ مشرق کی خوش قسمتی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا اور رہتی دنیا تک اُمتِ مصطفوی کے مرضِ دیرینہ کا نسخۂ شفا تجویز کر گیا۔

علاّمہ مرحوم پر یہ ایک عام اعتراض ہے کہ ان کا فلسفہ مغربی مفکروں سے ماخوذ ہے۔ ان کا فلسفہ اسی سبزہ زار کا ایک ننھا سا تر و تازہ پودہ ہے جس کی آبیاری ہیگلؔ۔ ٹالسٹائیؔ۔ نٹشےؔ۔ برگساںؔ اور شوپہارؔ وغیرہم نے کی۔ لیکن یہ علاّمہ کی شخصیت پر سرتاپا بہتان ہے۔ ان کا فلسفہ تو اتنا بلند ہے کہ یہ مادیت کے پرستار اس کی ہوا بھی نہیں پا سکتے۔ اور درحقیقت یہ بہتان نہ صرف تعجب میں ڈال دیتا ہے بلکہ انتہائی مضحکہ خیز بھی ہے کیونکہ خود ان مفکرین کو نہیں معلوم کہ ان کا فلسفہ کس شمع سے منور ہے۔ مغرب بزعم باطل اس کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن بے سود اسلام کی پرانی زرین ترقی کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قرطبہ کے کھنڈر۔ افریقہ کا تپتا ہوا صحرا۔ دمشق کی مساجد۔ کعبہ کا ماتمی لباس۔ فارس کے دشت و جبل اور ہندوستان میں سومنات کا مندر

اس بات کے شواہد ہیں کہ کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ نہ صرف مغرب کے جاہل رقیب کو ہم نے درس د
بلکہ ایک عالم کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔

دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

صد حیف! کہ مردِ مومن کی اب وہ شان نہ رہی۔ علم و حکمت کے خزانے سرقہ گئے۔ چور دَ
چوری کی اور رہی سہی عظمت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ مسلمان ہاتھ جھاڑ کر رہ گئے۔ ان کے تہذیب
تمدن نے مغرب کو ترقی کی راہیں دکھائیں۔ مغرب کو تہذیب سکھائی۔ ادب کا مفہوم بتایا۔ کلچر کی وحشت
کی اور جہالت کو شائستگی میں مبتدل کیا۔ اِن کے فلسفۂ جہالت کا خاکہ اڑایا اور فلسفۂ حیات سے
آشنا کیا۔ اور آج یہی تہذیبِ نو کے بانی اپنی موروثی فطرت کا اطلاق علامہ اقبال پر کر رہے[1] ہیں
علامہ مرحوم نے اپنے چھٹے لکچروں میں سے ایک لکچر میں خود اس کا جواب دیا ہے[2] "مجھے اجازت
دیجئے کہ میں برفالٹ Briffault کی کتاب 'تشکیلِ انسانیت' میں سے ایک یا دو
ٹکڑے نقل کر دوں۔

"آکسفورڈ اسکول میں راجر بیکن نے ان کے جانشینوں سے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کئے۔ نہ تو راجر بیکن اور نہ اس کے بعد اس کا اہم نام اس تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تجربی طریق ایجاد کیا۔ راجر بیکن نے صرف یہ کیا کہ مسلمانوں کے علوم اور اُن کے طریق کو مسیحی یورپ میں پہنچایا اور اس نے اس بات کا اعلان کرنے میں بھی کبھی دریغ نہیں کیا کہ عربی زبان اور عربی علوم کا سیکھنا اس کے ہمعصروں کے لئے صحیح علم حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ یہ بحثیں کہ تجربی طریق کا کون موجد ہے اس عظیم الشان غلط بیانی کا ایک جزو ہیں جو یورپی تہذیب کی اصلیت کے متعلق کی جاتی ہیں۔ بیکن کے وقت میں عربوں کا تجرباتی طریق تمام یورپ میں عام تھا اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔"

"عربوں کی تہذیب سے موجودہ عہد کو جو سب سے بڑا حصہ ملا ہے وہ سائنس ہے لیکن یورپ میں اس سے بہت بعد کو فائدہ اٹھایا گیا۔ جب اندلس میں عربوں کا تمدن تاریکی میں چھپ گیا اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد یورپ کا وہ عظیم الشان تمدن جو اسی عربی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے ظہور میں آیا۔ یہ صرف سائنس ہی نہ تھی

---

1. Making of Humanity
2. Reconstruction of Religious Thoughts

جس نے یورپ کو نئی زندگی بخشی۔ بلکہ حقیقت سے قرونِ اسلام کے ایسے اثرات ہیں جنھوں نے یورپ کی زندگی کو پہلے پہل تہذیب کی روشنی سے منور کیا۔"

اسلام کے ظہور سے پہلے یونان کا فلسفہ کارفرما تھا۔ ہر ادیب اور ہر خطیب اس کو ہی سراہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ یہ نظریات پر مبنی تھا۔ محسوسات سے اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور یہ نظریات بھی خیالی تھے جو واقعات کو سراسر نظر انداز کر دیتے تھے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے بعد عربی مفکروں میں ایک ذہنی کشمکش پیدا ہو گئی۔ کیونکہ انھوں نے فلسفۂ یونان کا خاص ذوق و شوق اور بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا جبکہ قرآن نے ایک ایسے فلسفہ کی تشکیل کی جو واقعات اور محسوسات سے بحث کرتا ہے۔ اس کشمکش اور وقتی غور و خوض نے ایک نئے فلسفہ کی بنیاد ڈالی جس پر عربوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ فلسفہ بھی الجھتا گیا۔ تنازع خیالات اور لایعنی باتیں سوزِ دل سے فنا ہوتی گئیں۔ عروجِ اسلام تک یہ مسلمانوں کا شغل رہا اور ان کے زوال کے بعد انگلینڈ کے ذراتی قمار خانوں اور بینکوں میں خوش گپیاں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ سارا یورپ اس میں مبتلا ہو گیا۔ کسی نے اس پر قنوطیت کی آڑ لے کر بحث کی اور کسی نے رجائیت کی۔ لیکن خدا کے وجود سے ہر ایک نے انکار کیا۔ اور جب منزل کا ہی علم نہ ہو تو سوزِ منزل کیسا۔ درد لادوا ہی لے کر وہ زوال میں مل گئے۔ اقبال نے بھی ان مجذوب فلسفیوں کا مطالعہ کیا۔ اُن کی تصنیفات کو پڑھا اور سمجھا لیکن بجز گمراہی کے کچھ بھی نہ ملا ؎

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا گہر صدف سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

جس منزل کی تلاش تھی اُس کی راہیں بند تھیں، خیالات کا ہجوم بے پناہ تھا لیکن بجز طلسم کے اصلیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ تو پھر تتبع کیسا؟ اِس نے اپنی منزل کو قرآن کی روشنی میں دیکھا، شریعت کو خضرِ راہ بنایا، تجسس اور سوزِ پیہم کا سہارا لیا، ذوقِ یقین پر بھروسہ کیا، عمل کی پرخطر راہوں کی پرواہ نہ کی۔ موت اور سکوت کو الوداع کہہ کر مردِ مجاہد چل کھڑا ہوا، اِس نے منزل کو پا لیا، گہر بے صدف کے مل گیا اس کی منزل خود اس میں ہی پنہاں تھی، اس نے اس کا راز پا لیا، خود تک پہنچنے کی راہیں مل گئیں بس یہی ہے اس کا فلسفہ خودی جو نہ برگساں کا سایہ ہے اور نہ ہیگل کا خیال بد۔

علامہ مرحوم پر ایک دوسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں قنوطیت کے اثرات [illegible]

قنوطیت کا کوئی دوسرا علمبردار نہیں[1] - وہ خود ہی اس کی ابتدا ہیں اور خود ہی انتہا۔ اقبال پر اس کا اطلاق خوش فہمی اور حسنِ عقیدت سے زیادہ نہیں - کلامِ اقبال کا مطالعہ بین دلیل ہے کہ ذوقِ عمل اور جستجوئے پیہم کی تعلیم قدم قدم پر ملحوظ رکھی گئی ہے - ان جذبات کو منظوم کیا ہے جو ماندہ قوم کیلئے رجز سے کم نہیں - ان میں جوش ہے ، غیرت ہے ، اور روشن مستقبل کا پیام انبساط ہے لیکن حزن کا شائبہ بھی نہیں ——— شاعر "گورستانِ شاہی میں کھڑا ہے ، شاہوں کی قبریں پیش نظر ہیں ، اک ہو کا عالم ہے" ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے — کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اِس نظارۂ خاموش میں — صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی — بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آسمان تاریک ہے ، چہرہ پر بادلوں کا نقاب ڈالے ہے ، ماہ تاب کی جبیں بھی مکدر سی ہے ، چاندنی پھیکی ہے ، صبح کاذب کا خموش نظارہ ہے ، ہر طرف حیرت کا سکوت طاری ہے ، گویا مطربِ قدرت دھیمی نوا سے بربط کے تار چھیڑ رہا ہے ، ذرہ ذرہ درد کا نمونہ بنا ہوا ہے ————

ایسا ماحول ! علامہ کی رُوح ! لیکن نہیں - دنیا اب بھی نشاط آباد ہے ، اس میں عیش بے اندازہ ہے ، صرف ایک درد ہے اور وہ بھی غمِ ملت ! ؎

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

کیا یہ غم قنوطیت ہے ؟ اقبال نے اپنے دَورِ اول میں شعر کے ذریعہ قوم کو اس کی خستہ حالی اور کم مائگی کا احساس دلایا ، اسکی حالتِ بد پر نوحہ کیا - اس کی غلط کاریوں کا مآل پیش کیا - لیکن یہ سب قنوطیت نہیں - یہ سب ذریعہ تھا اس کے تکمیلِ فلسفہ کا جو اس نے بعد میں پیش کیا - اس کا ابتدائی دور قومِ حالی جیسا ہے ، دونوں نے جی بھر کر نوحہ کیا ہے ——— حالی قوم کی زبوں حالت کا کوئی نسخہ نہ پیش کر سکے لیکن اقبال نے اس کمی کو مشرق کی اہلیت سے زیادہ پورا کر دیا -

---

[1] دیکھئے میرا مضمون "میر کی شاعری پر ایک عام نظر" مصنف نمبر ۱۳ - بابتہ اپریل [illegible] -

اس نے دیکھا کہ مسلمان کی حالت زبوں سے زبوں تر ہے۔ اس میں سابقہ جوش و خروش نہیں، حرارتِ ایمانی ٹھنڈی پڑ چکی ہے، تلواروں میں زنگ لگ گیا ہے، مردِ مجاہد کلیسا کا مداح ہے۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا میں نعرۂ تکبیر بلند کیا تھا، اندلس کی سرزمین پہ پرچمِ توحید لہرایا تھا، قیصر و کسریٰ کی بنیادوں کو ہلایا تھا۔ ہند کے کفر و باطل کو نیست و نابود کیا تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہے[1]

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند — آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
چشمِ تو بر لالۂ رویانِ فرنگ — آدم از افسونِ شاں بے آب و رنگ
مردِ حق آں بندۂ روشن نفس — نائبِ تو در جہاں او بود و بس
او بہ بندِ نقرہ و فر زند و زن — گر توانی سومناتِ او شکن
ایں مسلماں از پرستارانِ کیست — در گریبانش یکے ہنگامہ نیست
سینہ از بے سوز و جانش بے خروش — او سرافیل است و صورِ او خموش
قلب او نامحکم و جانش نژند — در جہاں کالائے او ناارجمند
در مصافِ زندگانی بے ثبات — دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک — آتش او کم بہا مانندِ خاک
شعلۂ از خاک او باز آفریں — آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذبِ اندروں او را بدہ — آں جنونِ ذوفنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار — صبحِ فردا از گریبانش برآر
بحرِ احمر زاہجوبِ او شگاف
از شکوہش لرزۂ افگن بہ قاف

۱- جاوید نامہ

صدق و اخلاص ختم ہو گیا، سینہ سے سوز اور جان سے خروش جدا ہو گیا، قلب نامحکم ہو گئے۔ وہ فنا کو فنائے کامل سمجھنے لگا، طلب اور جستجو ختم ہو گئی، غرض یہ کہ مردِ مومن کی صفاتِ اعلیٰ اس سے رخصت ہو گئیں۔ اقبال نے اس پر نوحہ کیا، اس کی زبوں حالت کا نقشہ کھینچا، کیا یہ قنوطیت ہے؟

اس نوحہ میں درد ہے، تڑپ ہے، شوق ہے، جستجو ہے جو شاعر کو بہائے لئے جا رہی ہے —— شاید اس طرف جہاں وہ اس پژمردہ قوم کو شبنم کے چند قطرے دے گا تاکہ سابقہ روح عود کر آئے!

مردِ مومن عجیب مصیبت میں گرفتار ہے، فرنگیت اس کی روح کو کچل رہی ہے، مادیت اس کو پیراہن نو سے آراستہ کر رہی ہے، اس کے دینی دولت کو لوٹا جا رہا ہے، کوئی بد ترین اس قابل

نہیں کہ اس کی شکایت بارگاہِ ایزدی میں کر دے، رحم ہی آتا ہے تو لینن کو سے

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بُنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہ ہے مادّیت کا مرقع، یہ ہے مادّیت کی رُوح، یہ ہے فرنگی کی شانِ کبریائی، یہ ہے مغرب کا پژمردہ چہرہ، یہ ہیں تدبّر کے وہ شاطر جنھوں نے تہذیب کی بساط پر مشرق کو جبراً مات دیا، یہ ہیں علمبردارانِ علم و ہنر، معمارانِ تہذیبِ نو جن کی تجارت، جن کا پیشہ، جن کا غرور و نخوت، بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کا حامل ہے۔ جو فیضانِ سماوی سے محروم ہیں، جو آسمانی باپ کو بھول چکے ہیں اور 'برق و بخارات' ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ یہ ہے وہ گندہ ماحول جو مشرق کو عریاں کر رہا ہے، اس کا نقاب پھاڑ رہا ہے، اس کی 'شانِ جمالی' کو فنا کر رہا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں، دل روتا ہے۔ دل میں تڑپ اُٹھتی ہے لیکن سر پٹک کر رہ جاتی ہے۔ انسانیت کچل رہی ہے، کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ مردِ مومن کشمکشِ نزع میں سسک رہا ہے لیکن دو گھونٹ پانی دینے والا نہیں۔ مجبوری کے دیوتا نے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے ہیں، زبان ہلانے کا چارہ نہیں کہ فی الفور یزداں کو جنبش ہوتی ہے اور وہ حکم دیتا ہے

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سُلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ اوزان شاعر کے مطمحِ نظر کا پتہ دیتا ہے، صاف ظاہر ہے کہ وہ دُنیا میں انقلاب چاہتا ہے۔ سرمایہ داری، بنکوں کی عمارات اور مرمر کی سلوں کے بجائے مٹی کا حرم بنوانا ہے تاکہ اس کے 'انا' کو، اس کے ذوقِ عمل کو، یا بالفاظِ دیگر اس کی رجائیت کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ روحانیت کا طالب ہے جو کبھی عُرُوسِ مشرق کا تابندہ گہنا تھی۔ لیکن اب یہ گہن کے ماتے مادیت کے شوریدہ بھنور میں پھنس گئی ہے۔

یہ تھا اقبالؔ کا 'مردِ مومن' اور یہ تھی اُس کی سابقہ شان جو مغرب کی نظرِ بد کے نظر ہوگئی لیکن ابھی اس کی رُوح فنا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اب بھی کامل انسان بن سکتا ہے۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے نفس کا عارف بنے، اپنی 'خودی' کو پہچانے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

'خودی' اور اُس کا مفہوم

'خودی' کے چار حرفوں کی وضاحت عرصہ دراز سے ہوتی رہی ہے۔ علامہؒ کی حیات میں ہی اس پر طرح طرح کی جِلا دی گئی۔ اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر ادیب و خطیب نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ میں نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، کہہ نہیں سکتا کس حد تک کامیاب ہوں۔

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تمام چرند و پرند حیوانات و نباتات پر اس کو افضلیت کا شرف حاصل ہے۔ کیوں؟ یہی وہ جذبۂ خودی ہے جو انسان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو

انسان کا سرمایۂ ہستی حیوانیت کی ایک منجھی ہوئی صورت ہوتی۔ چنانچہ نظریۂ ارتقا یہی دلیل ہے۔ ماضی کے اوراقِ پارینہ بتاتے ہیں کہ فطرت کا ماحول انسان و حیوان پر برابر کا اثر ڈالتا تھا۔ دونوں کی حیات قریب قریب ایک ہی جیسی تھی۔ لیکن انسان کی عقل و دانش اور ذوقِ عمل نے تشکیل انسانیت کے اس معرکہ میں حیوان کو پیچھے ڈال دیا۔ عقل کی کمی اور عمل کے محدود دائرہ نے حیوانات کے جذبۂ خودی کو پرورش پانے کا موقع نہ دیا۔

خودی کی وضاحت ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ 'میں' شک کر سکتا ہوں کہ اب سے چند صدی قبل رفتارِ زمانہ اس عہد سے زیادہ شائستہ اور مہذب تھی۔ 'ہم' یہ کہ سکتے ہیں کہ رات جو کچھ خواب میں اکبرِ اعظم کے متعلق دیکھا ہے وہ سچ ہے۔ میں ان خیالات پر شک کر سکتا ہوں جو کبھی مشہور ناول نگار کے کسی کردار میں ادا کئے ہیں۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ " رفتارِ زمانہ شائستہ" ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ اکبرِ اعظم پر گمان ہو سکتا ہے کہ اس کا عہد حکومت بے جا رواداری کا آئینہ تھا۔ ناول نگار نے جو خیالات کسی کردار کے روپ میں پیش کئے ہیں اس سے متفق یا غیر متفق ہونے کا احتمال ہے۔ یعنی یہ کہ اس چیز کا وجود جو غائبانہ ہے شک و شبہ کی دُور تک گنجائش ہے۔ لیکن شک کرنے والی ہستی کا وجود مسلّم ہے۔ " میں" اور " ہم" یقینی اور ضروری ہیں ورنہ شک کا مفہوم مع اس چیز کے جس پر شک کیا گیا ہے قطعی اور ضروری نہیں۔ پس اس شک کرنے والی ہستی کا ہی نام 'انا' یا 'خودی' ہے۔

خودی کا اطلاق فردِ واحد پر

غرض یہ کہ 'خودی' وہ روحانی طاقت ہوئی جس کی پرورش انسان کو یزداں سے ملا دیتی ہے۔ ہر انسان یا فرد میں خدا بن جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ ان صفات کا امین ہے جو اس کو بحرِ ناپیدا کنار میں ملا سکتی ہیں۔ اس کے سینہ میں وہ جلوے رقصاں ہیں جن کا سوز اور جستجوئے پیہم تکمیلِ انسانیت میں کوشاں ہیں؎

کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اور جب یہ جوہر اور یہ جلوہ وا ہو جاتے ہیں تو انسان " کمالِ انسان " کا علمبردار بن جاتا ہے۔

دُنیا کے دیگر مذاہب نے انسان کو پست تر پیش کیا ہے۔ اس کی شخصیت کو اتنا ذلیل اور حقیر کر دیا ہے کہ وہ لائقِ توجہ ہی نہ رہا۔ کیا وہ بندہ ہی ہے اور اس بندگی یا عبودیت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا؟

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ

(بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنی ہی ترقی کرے ـــــــ رب رب ہے خواہ وہ کتنی ہی تنزلی کرے)

نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر وہ خود کا عارف بن جائیگا، اپنے سینہ کے جوہر اور تڑپتے ہوئے جلووں کا علمبردار ہوگا تو یقین جانئے کہ ؎

مکاں فانی مکیں فانی ازل تیرا ابد تیرا

خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

لیکن اگر اس نے اپنی خودی کو فنا کر دیا اور اپنے نفس کا عارف نہیں بنا تو یہ خود اس کی شخصی موت ہے۔ دُور نہ جائیے اگر وہ خودی کا معترف نہیں بلکہ منکر ہے تو وہ کافر ہے ـــــــ سب سے بڑا کافر!

منکر حق نزد ملا کافر است منکر خود نزد من کافر تر است

خودی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کی مداح ہے۔ خودی کا کمال یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خدا کے صفات پیدا کرے۔ دنیا کی ہر چیز میں یہ جذبۂ خودنمائی موجود ہے اور خود انسان بھی اس کا امین ہے ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

یہی وہ چیز ہے جو اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے۔

خودی اور قوم | قوم کا مفہوم سیاسی و مذہبی :-

خودی کے جب یہ عارف ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو وہ ایک قوم بنے گی جس کو علامہؒ نے "ملت" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ملت وطن کی تابع نہیں بلکہ وطن ان کا تابع ہے۔ اس لئے مسلمانوں (خودی کے عارفوں) کے مختلف اوطان مثلاً عراق، عجم، عرب، مصر، ترک وغیرہ ہا سب ملتِ اسلامیہ کے اوراقِ پارینہ ہیں۔ یہ تصور کہ عراق کے مسلمان عراقی، مصر کے مسلمان مصری اور عرب کے مسلمان عربی ہیں غلط ہے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

اور رنگ و خون کا امتیاز بے جا ہے۔

قوم [illegible]

جس سے وہ اسلام کی مرکزیت کو ذبح کرنا چاہتا ہے۔ ہماری زدہ حالت میں اس کے ستم کی یہ انوکھی چال ہے ؎

ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

جے ایس مل (J. S. Mill) جو "ایک وطن میں ایک قوم"[1] کا مداح ہے قومیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :۔

"بنی آدم کا ایک حصہ اس وقت قومیت تعبیر کرے گا اگر وہ باہمی ہمدردیوں کی بنا پر جو اس سے قبل اس میں اور دوسرے لوگوں میں نہیں تھی یکجا ہو جاتے ہیں ——— جو اور لوگوں کے مقابلہ میں آسانی سے متحد ہو جاتے ہیں ، ایک ہی حکومت کی ماتحتی کی خواہش رکھتے ہیں ، اور چاہتے ہیں کہ حکومت ان کی ہو یا اس کا ایک جزو ان کا جداگانہ ہو۔ قومیت کی یہ آرزو کتنی ہی وجوہات سے ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ بسا اوقات نسل و خاندان کے امتیاز سے ہوتی ہے ، عوام الناس کی زبان اور عوام الناس کا مذہب اس کے زبردست معاون ہیں جغرافیائی حدود بھی اس کا ایک سبب ہیں ، لیکن ان سب سے زیادہ مطبوع ترین سیاسی امتیاز ہے ——— ایک قومی تاریخ کا ہونا اور ایسی قوم کا ہونا جو ماضی کا نتیجہ ہے ، تکبر اور انکساری کا مجموعہ ہے ، خوشی اور غم کا مرکز ہے ، اور ماضی کی ایسی ہی نقوش سے منسلک ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی ماحول ضروری یا کافی نہیں ہے۔"[2]

صاف ظاہر ہے کہ نسل و خاندان ، جغرافیائی حدود ، سیاسی تصور اور رنگ و خون کا امتیاز برقرار رکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں اگر 'باہمی ہمدردی' سے کام لیں ، اپنی زبان اور اپنے مذہب کی معاونت حاصل کریں اور رنگ و خون کے امتیاز کو برقرار رکھیں تو ہندوستان میں 'ہندی' کی تعمیر ہو گی۔ یا یہ کہ عراق اور عرب دو جدا قومیں اس لئے ہیں کہ جغرافیائی حدود مخل ہیں ، خاندان جدا ہیں۔ تہذیب کے آذر کے اس نئے تراشیدہ صنم کا یہ مقصد تھا کہ قومیت کی صدا جو کافی سرور آور ہے ملتِ اسلامیہ کی مرکزیت کو جدا کر دے گی ، اس کے شیرازہ کو بکھیر دے گی اور اس کے نظام کو درہم برہم کر دے گی۔ کانگرس جو ہندوستان میں اکثریت کی جماعت ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تاکہ قومیت کے پیٹ کو مسلمانوں کی اقلیت سے بھر دیا جائے۔ باہمی ہمدردی

---

1. One nation one state
2. ترجمہ۔ کتاب ۱۶۶ تا ۱۶۹ صفحہ An Introduction to Civics and Politics by P. D Gupta

شتراکِ عمل سے اس کے نسل و خون، اس کی زبان اور اس کے سیاسی تصور کو جو مذہب کا رہین منت ہے اپنے اندر جذب کرلیا جائے تاکہ قومیت کی اس تشکیل سے کانگرس ہندوستان میں پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے اور آنیوالی چند نزدیک صدیوں میں مسلمان اور ہندوستان دونوں اپنا نام بھی کھو بیٹھیں۔ ۱۸۸۵ء میں جب کانگرس کا پہلا اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد یہ تھا:۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق کر کے ایک قوم بنانا۔"

مندرجہ بالا اقتباس کانگرس کے مطمحِ نظر کی کھلی وضاحت ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہندوستان کی آبادی کے مختلف اور متصادم عناصر کو "ہندی مرکب" بنانے والے باریک نقاب منہ پر ڈال کر چلے کیونکہ اغلب تھا کہ مسلمان جن کا زخم تازہ ہے اور ۱۸۵۷ء کی نمک پاشی ہنوز تکلیف دہ ہے کہیں پھر نہ پھر پڑیں۔ اہلِ ہنود نے ہندوستان کی مسلمان نامور شخصیتوں سے تعاون کیا اور ان کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ ان ہستیوں نے مسلمانوں کی ٹوٹی کشتی کو ساحل تک لانے کے بجائے گرداب میں پھنسا دیا۔ "بی کانگرس" نقاب میں ہی بولتی رہیں۔ لیکن کب تک، راز فاش ہو گیا۔ خلافت کی تحریک نے ہندی مسلمانوں کو خواب سے جگا دیا۔ انگریز جو ہمیشہ مردِ مسلمان کی مشتعل نظروں سے خائف رہا ہے "توازنِ طاقت" کے اصول کو بھول گیا۔ ہندو کی سرمایہ داری کا سہارا لے کر مسلمان کو مقتل کی طرف لے چلا اور اس شان سے کہ "قومیت" کی تیغ براں بغل میں دبی ہوئی تھی لیکن اس کی جلد بازی اور گاندھی جی کے "عدمِ تشدد" نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور ستم بالائے ستم سہارا دینے والے مفت میں بدنام ہو گئے۔ انھوں نے بھی واویلا شروع کر دی۔ انگریز کو بہرکیف حکومت تو کرنا ہی تھی "لڑاؤ اور حکومت کرو" والا مسئلہ جاری کر دیا۔ جو کچھ بھی ہوا تاریخ حال شاہد ہے۔ علامہؒ مرحوم نے اس عہدِ جلیل کا مشاہدہ کیا۔ مسلمان کی سادہ لوح طبیعت کو دیکھا، کانگرس کی سرمایہ داری پر نظر ڈالی اور انگریز کی شاطرانہ چالوں سے واقفیت حاصل کی۔ لندن سے واپس آتے ہی "ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کو بدل کر "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" رکھ دیا۔ مرکزیت کی تعلیم دی اور مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر راہِ حق کی تلاش کی۔ اقبال کی شاعری کے اس پہلو سے میں آئندہ اوراق میں بحث کروں گا۔ جی چاہتا ہے کہ "قومیت" کے ماتحت دو یا پاکستان سے بھی بحث کر لوں۔

علامہؒ نے مرکزیت کی تعلیم دی۔ ہندی مسلمان کو اونچ نیچ بتائی اور خاموشی سے اپنی مہم سر کرتے رہے [illegible] ایک بھی قابل توجہ کی گئی تھی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی سرکردگی

میں ایک نئی تعمیر کا اضافہ ہوا۔ اقبالؒ واضح رہے کہ پسِ پشت تھے۔ میں تو بغیر کسی پس و پیش کے قائد ملت کی حیات میں یہی کہوں گا کہ اقبالؒ کی وہ واحد ہستی ہے جس نے ان کے ذہن کی تعمیر کی، ورنہ یقین جانئے سیاست کا رخ کسی اور طرف ہوتا اور مسلمان کی حالت پست تر ہوتی۔ سنہ ۴۰ء میں پاکستان کا قومی ریزولیوشن پاس ہوا۔ مسلمانوں کو ایک ملت اپنی نظر میں اور 'قوم' دوسروں کی نظر میں تسلیم کرایا گیا۔ ہندوستان بحیثیت 'وطن' دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وطن میں دو اوطان بنے۔ یعنی دو جدا قوموں نے دو اوطان بنائے ایک نے اکھنڈ ہندوستان کہا' دوسرے پلنے پاکستان کہا۔ لیکن 'وطن' نے قوم کی تعمیر نہیں کی جیسا کانگرس اور انگریز کا نظریہ "قومیت" تھا۔ اس لئے ہم ڈنکے کی چوٹ پہ کہتے ہیں کہ بحیثیت نسل، بحیثیت مذہب اور بحیثیت رسم و رواج کے ہمارا اہلِ ہنود سے 'باہمی ہمدردی' کا کوئی تقاضہ نہیں ہم ایک جدا قوم ہیں اور وہ ایک جدا قوم "الگ" اور مٹی کا ساتھ نہیں۔ یہ 'عناصر' 'مرکب' اور 'متفق' نہیں ہو سکتے۔ ہمارا مطالبہ پاکستان ہمارا جائز حق ہے۔ یہی ایک حل ہے جس سے ہمارے حقوق کی حفاظت بخوبی ہو سکتی ہے۔

ساڑھے پانچ سال کی مستقل جدوجہد بے کار نہ گئی۔ مرکزی مجلسِ عاملہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کو مساوی ممبری کا حق دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کی پہلی شاندار کامیابی تھی۔ اللہ اللہ ایک وہ وقت تھا کہ مسلمان کانگرس کے رحم و کرم پر تھے اور آج .... زیادہ حد ادب! لیکن گاندھی جی اب بھی قومیت کے راگ کو بھولے نہیں ہیں حالانکہ مرکز میں مشترکہ ذمہ داری کے اصول کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ بہاریوں کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں:-

"بہاریوں پر سختی روا رکھنا اصولِ قومیت کے خلاف ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں ایک قوم ہیں۔" ۱

کانگرس نے قومیت کو کامیاب بنانے کے لئے ایک اور بہروپ بھی لیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہندوستان کی چند ممتاز شخصیتوں کو آلۂ کار بنایا ہے جو سوئے اتفاق کہ مسلمان ہیں اور مسلمان بھی کیسے جود و سجود کو دیندار بناتے ہیں تاکہ دنیا جان جائے کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے یعنی اس کو وطن ہندوستان میں ایک قوم ہونے کا حق حاصل ہے۔ یہاں تک کہ مجبوراً صدارت کی کرسی تک مسلمان کے لئے خالی کرنا پڑی۔ لیکن ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

مسلمان ایک قوم ہے مستقبل قریب میں ہر مسلمان یہ آسانی سے سمجھنے لگے گا!

اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک پیغام شعر کی صورت میں دیا ہے۔ اگر مسلمانوں نے

بحیثیت ایک قوم کے ہے۔ اس کے تین ابواب ہیں۔

باب اوّل :۔

مذہب میں پختگی

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں ؎
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اقبال کا پیغام ایک ایسے زمانے میں آتا ہے جبکہ مادیت کی ہولناکیاں مشرق میں بھی کارفرما ہیں۔ ہندی مسلمان فریب میں مبتلا ہے۔ مغرب کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس کی مے کا اثر بے حد کیف آور ہے۔ ساری انجمن مدہوش ہے ؎

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن مدہوش ہے

دریا کی شوریدہ روانی ہے جس میں مشرق بہتا چلا جا رہا ہے۔ فرنگ کی بادۂ ناب کا نشہ ہنوز سرشار کئے ہوئے ہے۔ اس کے بازو شل ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی قوت نہیں کہ وہ موجوں کو کاٹ کر اپنی راہ تلاش کر سکے۔ وہ قطعی بے دست و پا ہے۔ منزل کا نشان بھی نظروں سے اوجھل ہے۔ لیکن وہ بحر جس کی روانی کو وہ حاصلِ زندگی سمجھے ہوئے ہے ساکت ہے۔ اس میں جوش و خروش نہیں۔ گو خارجی ٹھنڈک ہے لیکن روحانی ایذا۔ اقبالؒ نے اس بحرِ بیکراں کی گہرائیاں ناپیں۔ اونچ نیچ کو دیکھا۔ عکسِ آب میں حیاتِ ہستی کا پرتو دیکھا لیکن بجز جمود اور سکوت کے کچھ بھی نہ ملا۔ مشرق کے غنودہ انسانوں کو اس میں سے نکالا اور جد و جہد کی روحانی دُنیا میں لا پھینکا۔ ان پر فرنگی کی مکاری کا پردہ فاش کیا اور بتایا کہ مادیت کی یہ نسیمِ سحری بادِ سموم سے کم نہیں جو اندرونی قوتوں کو رفتہ رفتہ جھلسا رہی ہے اس سے پرہیز لازمی ہے۔ اُنھوں نے بتایا ؎

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اُٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

غرب کی شراب تیز ہے۔ اس کا اثر فوری ہے۔ لیکن جب مسلم نے اس کے دو گھونٹ حلق سے اتارے تو
... بھڑک اٹھا۔ کیونکہ وہ ناقابل برداشت تھی۔ رفتہ رفتہ عادت پڑ گئی، اسی بادۂ ناب میں
... کو سرور ملنے لگا۔ لیکن روح جامد ہو گئی گو چہرہ پر کافی سرخی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ مغرب
شرق سے اسی سرخی کا متمنی تھا۔ کیونکہ یہی اس کی کامیابی کا راز اور اس کے سحر کا نتیجہ ہے ؎

کیا ذرہ کو جگنو دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

رہ جو ناچیز ہے اس کو مغرب نے ایک چیز تصور کیا لیکن خارجًا۔ اس پہ مادیت کی جلا دی، وہ جگنو
بن گیا۔ اس میں شوخی پیدا ہو گئی، آفتاب جیسا کمال پیدا ہو گیا۔ لیکن تابِ مستعار تھی۔ اس لئے
زوال ہوا اور پھر مشرقیت ہی میں سکون ملا ؎

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے	یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی
تغیر آ گیا ایسا تدبر میں تخیل میں	ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کیا گم تازہ پروانوں نے اپنے آشیاں لیکن	مناظرِ دلکشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

جوانوں کی طبیعتیں جن سے مستقبل کی امیدیں وابستہ تھیں بدل گئیں، شرم و حجاب، عجز و انکسار
تخیلی قوت میں تغیر آ گیا۔ وہی جو کبھی اپنی جگر چاکی کو راہِ نجات اور تصورِ حیات جانتے تھے خندہ زن
گئے۔ سابقہ روایات کو مضحکہ سمجھا گیا۔ چنانچہ آشیاں گم ہو گیا۔ لیکن دورانِ پرواز میں ہزاروں
اظر دلکشا سامنے آئے، حیاتِ تازہ اور لذتوں کی فراوانی دیکھی۔ لیکن یہ لذتیں "تابِ مستعار"
ہیں اپنے ساتھ رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی اور ہوسناکی کا "الحاد" بھی ساتھ لگا لائیں۔
ں یہ کہ مادیت، فرنگیت اور درسِ مغرب نے خوشی بخشی لیکن زوال پذیر ———————
رق میں جس کا گذر نہیں! اس لئے اقبال نے درس دیا ؎

تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

رکے یہ اربابِ سیاست" مشرق کے انسان کی خودی سے گزر کر اب اس کے مذہب پہ
حملہ آور ہوئے۔ اسلام کے ان اصولوں کو جن پر روحِ بنی نوعِ انسان کا دار و مدار ...

حکمت سے چاک کرنا چاہا اور اپنے نو ساختہ اصولوں کو جن میں "بلا کی حرارت تھی" پیش کیا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ ایک نظامِ تعلیم بھی ہے جس سے ذہنیتوں اور خیالات میں تغیر ہو گیا۔ ان سے دیرینہ روایات چھین لیں، ماضی کے زریں اوراق کو نظرِ عجائب گھر کر دیا۔ علومِ مشرقیہ کی جگہ علومِ مغربیہ نے لیلی جو کسی طرح بھی موزوں نہ تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسجدیں ویران ہو گئیں، اذان دینے والے باقی نہ رہے، تبلیغ کا مشن ختم ہو گیا، روح ساکت ہو گئی، مجاہدانہ طبیعت ٹھنڈی ہو گئی، دن دونی رات چوگنی تنزلی ہونے لگی، نشانہ ٹھیک بیٹھا، ٹوٹی ہوئی زرہ بکتر کے سوراخ قابلِ فراموش سے تیر گزر کر جسم میں پیوست ہو گیا۔ نظامِ تعلیم تنہا نہ آیا، "الحاد" کو بھی اپنے ساتھ لگا لایا۔ طالب علم کی یہ حالت ہوئی ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

تو پھر مذہب و قوم کا اللہ ہی والی ہے۔ اقبالؒ نے بالکل ٹھیک کہا ؎

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز ۔۔۔ ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ۔۔۔ ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

اس سازش کے خلاف انھوں نے آواز بلند کی۔ ایک طرف فرنگیت کے تار و پود بکھیرے تو دوسری طرف فردِ مشرق کو یوں درس دیا ؎

غارت گرِ دین ہے زمانہ ۔۔۔ ہے اس کی نہاد کافرانہ
خالی ان سے ہوا دبستان ۔۔۔ تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جو ہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف ۔۔۔ تعلیم ہو گو فرنگیانہ

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا
ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ (جاوید سے، ضربِ کلیم)

باب دوم

فرنگیت اور اس کے تباہ کن نتائج | اقبالؒ سے قبل قوم کے دو ناخدا اور بھی گزرے ہیں جنھوں نے شعر کے ذریعہ قوم کی اصلاح چاہی۔ اوّل حالی اور بعدہٗ اکبر۔ حالی نے مسلمانوں کو تاریک پہلو دکھایا

ادیبوں کھول کر نوحہ خوانی کی، ماضی کے اوراق الٹے، اسلاف کے کارنامے پیش کئے لیکن فرنگی تخیلات کو بجنسہ قائم رکھا۔ مغرب کی تقلید میں فطری شاعری کی بنیاد ڈالی جس کی بگڑی ہوئی صورت دَورِ جدید کی تکبندی ہے۔ اکبر حالی سے زیادہ وسیع النظر تھے۔ خود مغرب زدہ تھے اس لئے اس کی اونچ نیچ سے خوب واقف تھے۔ مشرق کے مسلمانوں کا بھی خوب جائزہ لیا تھا اس لئے اُنھوں نے اپنی شاعری کا سنگِ بُنیاد ظرافت پر ڈالا۔ مغربیت پر خوب ہنسے اور ہنسایا اس ہنسی میں طنز کا سم قاتل موجود تھا۔ اس لئے قوم کی اصلاح ہوئی اور خوب ہوئی۔ اب سے چار صدی قبل یہی کام سروینٹس نے ڈان کوئکزوٹ لکھ کر کیا تھا۔ ڈان کوئکزوٹ کے روپ میں اس نے اسپین کے ان غیر شائستہ اور غیر مہذب لوگوں کا خاکہ اُڑایا جو ہر نئی مہم کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ اکبر بھی اِس سے بہرہ یاب ہیں ؎

اِن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

یا

دو لھا بھائی کی یہ رائے ہے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید
خود تو کٹ پٹ کے لئے جان دئے دیتے ہیں — ہم سے کہتے ہیں کہ پڑھو بیٹھ کے قرآن مجید

اکبر کے کلام میں اس قسم کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک لفظ نشتر سے کم نہیں۔ جس کو ہنس ہنس کے کلیجوں کے پار کیا ہے۔ ''اسکول'' ''تعلیم و تفریح'' اور ''قرآن مجید'' کے مطالعہ سے بیزارگی کا اظہار کتنے اچھے اسلوب اور عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ فرنگیت کے خلاف کس شان سے بغاوت کی ہے، سانپ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اقبال کا دَورِ اول بھی اسی قسم کی شاعری کا تتبع ہے۔ جگہ جگہ ظرافت کی چاشنی موجود ہے ؎

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں — پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط — آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال، بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں — ان کا یہ حکم دیکھ! مرے فرش پر نہ رینگ

''مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے ''بدری'' — مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے ''مسیتا''

بات پھر سنے کہو یا مجھ سے ۔۔۔۔۔ ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو ۔۔۔۔۔ صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زحمت
پی گیا سب لہو اسامی کا

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں ۔۔۔۔۔ ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

مُصر ہے حلقہ کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی ۔۔۔۔۔ مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں

ان اشعار سے اقبال کی ظرافتِ اکبر صاف ظاہر ہے۔ اس سے تفصیلی بحث انشاءاللہ پھر کبھی کی جائے گی۔ زمانہ کا مقتضا، وقت کی نزاکت اور خود ان کے ذاتی مشاہدہ نے ایک نئی راہ تلاش کی۔ ابھی تک وہ ایشیا کی ارضِ مقدس سے مغرب کے ستان کو دیکھتے تھے۔ لیکن دورانِ سیاحت میں اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُنھوں نے قانون نہیں پڑھا بلکہ فرد کی ان گتھیوں کو سلجھایا جن کو وہ راہِ نجات سمجھتے تھے۔ انگلینڈ سے واپس آکر اُنھوں نے فرنگیت کے شیرازہ کو بکھیر دیا۔ انگریزی حکومت حکومت نہیں بلکہ تجارت ہے، دنیا اس کو خداوند اور اس کی حکومت کو خدائی کہتی ہے۔ اس کے یہاں مذہب کی کوئی قدر و وقعت نہیں۔ مذہب ایک پرائیوٹ چیز ہے بالکل ایسے ہی جیسے بیوی۔ کلیسا عبادت خانہ ضرور ہے لیکن اس میں روحانی تعلیم مفقود ہے۔ راہبوں کی تواضع کباب اور مئے گلگوں سے کی جاتی ہے۔ اس کے یہاں کا ہر قریہ فردوس کی مانند ہے۔ وہ تیری فردوس پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ اُس کو انھوں نے نہیں دیکھا ہے البتہ مسجد کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اس میں زاہدِ خشک کی تلخ کلامی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ؎

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ ۔۔۔۔۔ دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں ۔۔۔۔۔ مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

افرنگ کی اس مادیت نے غریب مشرق پر پورا پورا اثر ڈالا جس کی حالت یہ ہے ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک ۔۔۔۔۔ بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نہیں ہے!

دہقان ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ — بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے!
جاں بھی گروِ غیر! بدن بھی گروِ غیر!
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے!

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

یہ سب کچھ ایک خاص تدبیر اور حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔ انگریزی کی خفیہ شاطرانہ چالیں ہیں جس میں ملتِ مصطفوی کا سادہ لوح مسلمان پھنس کر رہ گیا ہے۔ اقبال نے اس خیال کی تائید اپنی نظم "ابلیس کا پیغام سیاسی فرزندوں کے نام" میں کی ہے ؎

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں — زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — مُلا کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے اُن کی روایات چھین لو — آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

فرنگی سیاست ایک پیچ ہے۔ اس کے اصول سلجھے ہوئے نہیں۔ ہند کی قوم کو اس میں پھانسا گیا ہے۔ آزادی اس کی بیدار مغزی کا نتیجہ نہیں بلکہ خود آزادی کے علمبرداروں نے ایک حلقۂ غلامی بشکلِ قانون ڈالا ہے۔ قانون اس کی دید کی رُو سے نہیں بلکہ فرنگی کے مرتب شدہ ہیں۔ اس کا دیر کہیں اب نہیں۔ قانون کے لیڈروں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ قانون ان کا "نافذ کرنے والے وہ محکوم ہم اور عمل کرنے والے ہم۔ کیا شان ہے اس حاکم کی۔ بالکل اسی طرح وہ مسلمان جس کا کام [illegible]

اب قانوناً اسلحۂ محافظت بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اس کی وہ روح جس نے عیسائیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، جس نے روما کی عظمت کو خاک میں ملا دیا، جس نے بیت المقدس پر خون کی قربانی دی، جس نے اندلس کی بربریت کو ختم کیا اور جس نے وحشیوں کو تہذیب و تمدن سکھایا، اس سے چھین لی گئی۔ قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر اس کو مُردہ سے بدتر کر دیا۔ رُوح محمدؐ جس نے سلطانی کی لیکن گلہ بانی نہ چھوڑی، جس نے گدا کو شاہی بخشی لیکن پیوند لگے کپڑے پہننا نہ چھوڑے جس نے فتح و نصرت حاصل کی لیکن محکوم کو ایذا نہ دی، جس نے رحمت اللعالمین کا خطاب پایا لیکن شب بیداری نہ چھوڑی، جس نے مسجد نبوی میں امامت کی لیکن جہاد میں کمانڈر کا کام نہ چھوڑا۔ جس نے دنیا کو درس دیا، جاہلوں کو عالم بنایا، اندھوں کو نور بصیرت عطا کیا اور ناسمجھوں کو سمجھ عطا کی لیکن فرنگی نے سیاست کے نام سے مسلمان کی اس رُوح کو جو اس کو ورثہ میں ملی تھی چھین لیا۔ اس کے لہو کو ٹھنڈا کر دیا۔ اب تلواروں میں زنگ لگ گیا ہے۔ یہی انگریز کا سب سے بڑا مدعا تھا۔

عرب کا مسلمان جو ہنوز اسلامیت کا علمبردار ہے، جس کے بدن میں رُوح محمدؐ رقصاں ہے، جس کے تخیلات حق کی تائید میں ہیں لیکن انگریزوں نے ان کی روایات چھین لینے کے لئے ان کے جذبۂ ملت کو فنا کر دینے کے لئے اپنی روایات کا نفاذ کیا، نئی رنگین جنت کے مادی خواب دکھائے اور لازمی طور پر ان کی شاطرانہ چال ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ عرب اب وہ عرب نہیں۔ افغانستان ملتِ اسلامیہ کا ایک دوسرا غیور اور بہادر ملک ہے۔ یہ لوگ آزاد ہیں اور بہادر ہیں۔ لیکن انگریز کی نظر میں یہ آزاد قبائل خار کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔

چنانچہ وہ مُلا یا پیر جن کی وقعت ان قبیلوں میں بہت زیادہ ہے نکال دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ لوگ کیونکہ بے حد پیر پرست ہیں اس لئے اس ٹیپ کے بند کو ختم کرنے کی جدوجہد کی گئی جو اب تک جاری ہے۔ اس کے علاوہ قوم کے وہ رہنما جو اسلام کے مطابق سچا راستہ قوم کو دکھاتے ہیں انگریز کی ان چالوں میں روڑہ ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ کھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اقبال اور جمال الدین افغانی کی مثالیں موجود ہیں۔

اس طرح ہم نے خوب دیکھا کہ انگریز کس طرح دُکھتی رگ پکڑ کر مسلمان کو دُنیا سے فنا کرنا چاہتا ہے۔ بس جان لیجئے کہ یہی ہے فرنگیت جس کے خلاف اقبال نے جہاد کیا ہے اور مشرق کے ڈوبتے ہوئے سفینہ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ اب میں پھر نفس مضمون پر آؤں گا کہ اس نے قوم کو خودی کی تعلیم دی جیسا میں نے شروع ہی میں بتایا ہے۔

باب سوئم :-

علاج : رد (۱) مرکز سے جُدا نہ ہو۔ تمام مسلمان ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔ ان کو ایک ہار کی شکل میں جمع ہو جانا چاہئے۔ ایران کا رہنے والا ایرانی نہیں، عرب کا رہنے والا عربی نہیں، ہند کا رہنے والا مسلمان ہندی نہیں بلکہ سب ملّتِ اسلامیہ کے فرد ہیں ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا　　تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑوں گا

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے　　پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

مرکزیت کی تعلیم ان الفاظ میں دیتے ہیں ؎

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جُدائی!　　یہ صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!
اس دَور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسّر　　یہ معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی!

آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی　　جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی　　چھوڑ کر گُل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

---

(۲) مذہب کے اصول پختہ ہونا چاہئیں۔ سابقہ روایات کو تازہ رکھنا چاہئے۔ اصلاح کے کام نے پیشِ نظر ہونا چاہئیں۔ سلطانی اور فقر میں کوئی تمیز نہ ہونی چاہئے ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگاہ تیغ بازی

لقہ اسلاف کی روایات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز | قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز | نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے | مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے

اوکبھی نہ بھولنا چاہئے خواہ مسلمان دنیا کے کسی امتحان میں ہو۔ اس پختگی سے ہی قومیت ہے ؎

چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو | یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دُنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو | ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

لمان کا وجود لازوال ہے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں!
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

ہر جگہ موجود ہیں ؎

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے | بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے | اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

رحقیقت تو یہ ہے کہ ؎

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری | یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

(باقی آیندہ)

ادیب بریلوی

تاریخی نوادر

انقلاب ۱۸۵۷ء کا ولولہ انگیز رومان

ایک انگریز خاتون کا "نانا صاحب" سے عشق!!

(مترجمۂ جناب ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل)

"کثرتِ مطالعہ کی جہاں خوبیاں ہیں وہاں کچھ نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات کسی عمدہ کتاب کو پڑھے ہوئے زمانۂ دراز گزر جاتا ہے تو اُس کا اگر نام یاد رہ جاتا ہے تو مصنف کا نام دماغ سے محو ہو جاتا ہے۔ نام اور مصنف یاد رہتے ہیں تو مضمون کتاب ذہن سے اُتر جاتا ہے۔ اسی قسم کی ایک کتاب ۲۱-۱۹۲۲ء کی تحریک ترک موالات و خلافت کے بعد نظر سے گزری تھی جس کی خوبی کا دلپر گہرا اثر قائم رہا۔ مگر عنوانِ کتاب اور مصنف کا نام یاد نہ رہ سکا۔ اکثر اُس کو دوبارہ پڑھنے کی آرزو ہوئی۔ وقتاً فوقتاً صاحبِ ذوق احباب سے اُس کا ذکر بھی رہا لیکن حصولِ کتاب کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل متوطن پیلی بھیت شریف میرے اُن مخصوص علم دوست احباب میں سے ہیں جن کی ہمدردیٔ قلم، دوست نوازی اور خوش ذوقی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا۔ جون ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ میڈیکل کالج کے چندہ کے لئے میں نے اضلاع روہیلکھنڈ و کمایوں کا دورہ کیا اور اس سلسلہ میں پیلی بھیت بھی جانا ہوا۔ برسبیل تذکرۂ علمی میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس "نامعلوم" کتاب کا بھی ذکر کیا۔ جس پر موصوف نے ارشاد فرمایا کہ:-

"آپ کی مطلوبہ کتاب کا نام 'مکتوباتِ فرنگ' ہے۔ آپ کے اسی نیاز مند نے مئی ۱۹۲۲ء میں اُسے شائع کیا تھا۔ اور مولانا سید عبدالودود صاحب ذرہ بریلوی کے نام معنون کیا تھا۔"

میں نے عرض کیا پھر اب وہ ملے کیسے؟ ارشاد ہوا! "ابھی لیجئے۔" چنانچہ ایک چھوڑ تین نسخے مرحمت ہوئے۔ میری عادت ہے کہ ہر اچھی چیز جو مجھے ہاتھ لگتی ہے اُس کا تنہا لطف نہیں اُٹھاتا بلکہ اُس میں دوستوں کو بھی شریک کرنے کی ایک قسم کی بے تابی سی رہتی ہے۔ لہٰذا بہ تبدیل عنوان جناب ڈاکٹر عبدالغفور صاحب کے دلی شکریہ کے ساتھ مکتوباتِ فرنگ نذرِ ناظرینِ 'مصنف' کئے جاتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

تمہیدِ مترجم

انگریزی میں یہ خطوط "مکتوباتِ محبت" کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔
مسنر شان ٹون نے جو کہ متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں یہ مکتوبات جیشل لندن میں شائع کرائے ہیں۔ دیباچہ میں لکھتی ہیں:۔

"ایامِ بغاوت میں ایک معتمد اور معزز اینگلو انڈین افسر کو مفرور نانا کا تھوڑا سا سامان ہاتھ آگیا تھا۔ اس میں علاوہ اور چیزوں کے یہ خطوط بھی تھے۔ چونکہ وہ افسر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکا ہے۔ وہ نازک اور حسین ہاتھ جس نے یہ خطوط لکھے تھے ظالم موت نے شل اور غیر متحرک کر دئے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کی اشاعت میں کسی قسم کی معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ مکتوباتِ محبت تعداد میں تیئس ہیں۔ جن میں سے دو خطوط تیسرا اور تیئسواں نانا صاحب نے لکھے ہیں اور باقی خطوط خاتون ایم۔ بی۔ کے۔ طلسم ادب کا نمونہ ہیں۔

ان مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نانا صاحب قبل بغاوت ۱۸۵۵ء انگلستان گئے تھے اور وہاں اس خاتون کے نوید محبت کو قبول کیا تھا۔

یہ خاتون ایک بیوہ انگلش نواب زادی ہے۔ جس نے نانا صاحب کے شباب پر فریفتہ ہو کر اپنے لئے سامانِ خلش حاصل کیا تھا۔ جب یہ جذبۂ محبت اندر ہی اندر اس کی روح کو تحلیل کرنے لگا تو وہ سیاحت کے بہانے سے مصر۔ سیلون۔ رنگون ہوتی ہوئی کلکتہ پہونچی اور غالباً لارڈ کیننگ کی مہمان رہی۔ وہ نانا کے ساتھ شادی کی خواستگار تھی۔ چنانچہ اس نے کئی خطوں میں جلد شادی کرنے پر اصرار کیا ہے۔

خاتون کے سیاسی عقائد

اکثر خطوں کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سیاسی خاتون تھی جو کہ نانا صاحب کو صرف اس غرض سے اپنے فریبِ محبت میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی کہ کبھی یہ انگریزوں کی مخالفت میں کھڑے ہونے کی جراءت نہ کرے۔ ع

کرتی ہے محبت تو گزرتا ہے گماں اور

اول خط میں لکھتی ہے:۔ "کس طرح انگریز امید یا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ اس قدر وسیع اور اجنبی ملک پر بغیر کسی تصادم یا بغاوت کے حکومت کر سکتے ہیں۔ تمام باتیں ایسی حالت میں ممکن ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ تم اپنے ہم وطنوں کی درخواست پر بھی ہمیں چھوڑنے پر راضی ہو گے۔"

دوسرے خط میں لکھتی ہے:۔ "سیاسیات سے مجھے اسی قدر محبت ہے جس قدر دوسری خواتین کو لباس سے۔"
لیکن اس نے یہ لکھ کر کہ:۔ "میں ایک عورت ہوں اور مبتلائے محبت عورت۔ خود غرضی میری فطرت

میں داخل ہے۔" اپنے آپ کو تمام شکوک اور نکتہ چینیوں سے محفوظ بنالیا ہے۔

ادبیت یہ مکتوبات ادب کی فسوں کاریوں اور طلعت ریزیوں سے لبریز ہیں۔ حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ میں جذبات و تاثرات مفقود نہ ہونے پائیں۔ لیکن پھر بھی اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے۔ ہر خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کے بیان پر قدرتِ کامل رکھتی ہے! اور خاص طور پر مناظرِ فطرت کے اذکار میں اُسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ شاندار الفاظ ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہیں اور تخیلات کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔

ہر جملہ سے خیال کی رعنائیاں اور فطری رنگینیاں جلوہ گر ہیں اور بعض بعض جگہ اس قدر رنگین وکیف پرور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ کہ اُس کی سحر طرازی پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ یوں تو ہر سطر سے لطیف تاثرات نمایاں ہیں۔ لیکن یہ جملے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔

"آہ! وہ چاندنی رات جس کی بابت یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ فرشتے آسمان سے اُتر کر سیر کیا کرتے ہیں۔" "بلیغ الفاظ وہی ہیں جو لب تک نہ پہنچنے پائیں۔" "چھوٹے چھوٹے بت خانے جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا ہوا میں تیر رہے ہیں۔" "بہر کیف جب شوق کی دلفریبیاں زائل ہو جاتی ہیں تو پھر بجز اُس تاریک خیال کے جس کا نام بے غرضی ہے اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔"

"نسیم گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم ہے"

جذباتِ محبت عورت کا جذبۂ محبت۔ مرد کے جذبۂ محبت سے زیادہ عمیق اور دردانگیز ہوتا ہے۔ تنہائی میں ایک عورت کی نرم و پُرگداز آواز ایک صوتِ سرمدی ہے۔ جو کہ تمام کائنات پر خواب طاری کر سکتی ہے۔ اور ایک مبتلائے محبت عورت کے ہیجان سینہ سے نکلی ہوئی فریاد ایک سسکی ہے۔ ایک ہوک ہے جو کہ ہر ذرہ کو درسِ تپش دیے بغیر نہ رہے گی۔ یہ تمام مکتوباتِ جمیل اسی قسم کے پاکیزہ اور دل آویز خیالات سے لبریز ہیں۔ پڑھئے اور وجد کیجئے۔

(۴) "شروع ہی سے تم مجھے ہر شخص سے زیادہ عزیز ہو۔ یہاں تک کہ اُس مرحوم سے زیادہ عزیز ہو جس کے لئے میری دوشیزگی وقف کر دی گئی تھی۔"

"حقیقتاً میں اس امر کے اعتراف سے کسی قدر پشیمان ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ مجھے تم سے نسبت ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ جان و دل سے کسی کے ہو رہنے ہی میں راحت و آرام مضمر ہے۔ کسی کو اقلیمِ دل پر حکمرانی کی اجازت دیدینا گویا دونوں کو تباہ کر دینا ہے۔ تاہم یہ بھی کوئی بات نہیں۔"

(۲) "محبت تمام مخالفین کو متحد کر دیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُس کا نام محبت نہیں۔"

(۳) "آؤ ہم تم مل بیٹھیں۔ آؤ ہم اُن خوابوں کا خواب دیکھیں جو کہ محبت و مسرت کا ماحصل ہیں۔ پیارے خدا کے لئے جلد آؤ۔"

(۴) "اے دل کے مالک للہ جلد واپس آؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہاں مجھے تم سے محبت ہے تمہاری موجودگی میری حیات کو انوارِ مسرت سے چمکا دیتی ہے۔ کیا یہ میری منت زائیاں مقبول نہیں ہیں۔ میں انتہائے محبت سے اس بات کا دعویٰ کرتی ہوں کہ تمہاری زندگی میری زندگی ہے۔"

(۵) "میں مدت مدید تک۔ یہاں تک کہ حشر تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔ اگر پیارے تم مجھے وہاں ملنے کی اُمید دلاؤ۔"

(۶) "مجھ غمگین اور حقیر ہستی کے پاس فردوسِ بریں سے قریب قریب ملتی ہوئی محبت جیسی عالی اور معصوم چیز ہے۔ میری جان واپس آجاؤ۔ ہاں واپس آجاؤ۔ میں صرف تمہارے لئے زندہ ہوں اور ہمیشہ تک تمہاری یاد میں زندہ رہوں گی۔"

(۷) "میں ملتجی ہوں کہ تم اُس عورت کو فراموش نہ کرنا جس کی محبت غیر مختتم ہے اور خدا سے اور بشر سے وہ صرف اس بات کی خواستگار ہے کہ تم بھی اُس سے اُسی کی طرح محبت کرو۔"

(۸) "میری عفیف نسائیت کے تمہی اور صرف تم ہی ایک جذبۂ خاص ہو۔ میری زندگی ابدالآباد تک تمہاری زندگی کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے۔ خواہ مستقبل سے ہمیں فائدہ پہونچے یا نقصان۔ خواہ تحسین ہو یا تضحیک لیکن ہم تم شریک رہیں گے۔ تا اختتامِ حیات تمہارے اہلِ وطن میرے اہلِ وطن ہونگے اور تمہارا خدا میرا خدا۔"

نانا صاحب نانا۔ خاندان پیشوا (مرہٹہ) کے آخری فرماں بردار باجے راؤ کا پسر متبنیٰ تھا۔ جب موت کے زبردست ہاتھ باجی راؤ کی زندگی کا خاتمہ کر چکے تو انگریزوں نے نانا صاحب کو حقوق ولیعہدی سے محروم کر دیا۔ لیکن نانا نے اپنی مستحکم اور غیر متزلزل وفاداری سے انگریزوں پر اپنا اعتماد قائم رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب کانپور پر شورش انگیز جماعت نے حملہ کیا تو بٹھور سے انگریزوں نے مدد کی غرض سے نانا صاحب کو بلایا۔ نانا صاحب نے بجائے انگریزوں کی معاونت کے اُنھیں شکست دینے کی کوشش کی۔ لیکن جب اپنے مقاصد میں ناکام رہا تو وہ مع اپنے ہم خیال ساتھیوں کے نیپال کی ترائی کی جانب مفقود الخبر ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنے آخری خط میں لکھتا ہے:۔

"لیکن اب میں خود بخود بیش بہا چیز کو چھوڑ کر صرف اپنے مادرِ وطن کی بیہودی کی خاطر ایک غیر معلوم جگہ کو جلا وطن ہو رہا ہوں۔"

جذبۂ حبِّ وطن | نانا صاحب کے دونوں خطوط جذبۂ حبّ وطن سے لبریز ہیں۔ لکھتا ہے:۔
"مجھے اُس قوم کے حسیات اور روایات مرتعش بنادیتے ہیں جو کہ مختلف عقائد کے لحاظ سے خواہ صراطِ مستقیم پر چلتی ہو یا صراطِ غیر مستقیم پر اور صدیوں تک اپنی وضع کی پابندی کو ترک کرنا نہیں چاہتی۔

مجھے اُمید ہے کہ تمہارا دل عام جذبۂ ہمدردی سے لبریز ہوگا۔ علاوہ ازیں تعصب کی خطرناک معصیت سے بھی بے لوث۔ تعصب کسے کہتے ہیں۔ اسی کا نام جہالت ہے۔ جس میں تمہارے بہت سے مشہور ہم وطن مبتلا ہیں۔

۲۔ میں صرف یہ اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ میرے ملک کو میری ضرورت ہے۔ انگریز مجھے غدار اور ایک دیوانہ کا خطاب دیں گے۔ اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

مجھے صرف اپنی قسمت کے فیصلہ پر شاکر رہنا چاہئے۔ مجھے وہ نادر جذبہ جسے دنیا جذبۂ حُبّ وطن کے نام سے پکارتی ہے مرتعش کئے ہوئے ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ زبردست کمزوروں کو ستا رہے ہیں اس لئے مجھے کمزوروں کی حمایت میں لڑنا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تاریکی تمام ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی طلوعِ سحر کے آثار پائے جاتے ہیں۔

میں اُمید پر قانع ہوں کہ شاید میرے مرنے کے ایک عرصۂ دراز کے بعد میری قربانی کا معمولی تخم زمانہ کے ہاتھوں سے پرورش پاکر ایک امید افزا پھول پیدا کرے۔"

خاتون۔ایم۔بی۔ کی التجائے محبت کی پذیرائی کے متعلق نانا صاحب کے خیالات میں سے یہ جملے پیش کر دینا کافی ہیں۔

"میں تمہیں سے محبت کرتا تھا اور اب بھی میری محبت غیر محدود ہے۔ دُنیا کی ہر شئے سے زیادہ بلکہ اس سے بھی بالاتر اور اس لئے تم سے ترکِ تعلقات کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا رہا ہوں

مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ میں تمہاری پرستش کرتا ہوں اور ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔"

سببِ اشاعت | طبّی تعلیم کے ایام میں زندہ دل اور مذاقِ سلیم رکھنے والے احباب ایک جگہ جمع ہو جاتے اور شام کو وقتِ فرصت میں علمی اور ادبی موضوعات پر بحث ہوا کرتی تھی۔ میں اور میرے محترم ہم سبق ڈاکٹر خورشید حسن صاحب زیدی دہلوی انگریزی کتابوں کے ترجمہ میں اپنا وقت عزیز صرف کیا کرتے تھے۔ ع
تکلف برطرف۔ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

وہ دَور ختم ہوگیا اور وہ محفل درہم برہم ہوگئی۔ ع

نالۂ دل نے دئے اوراقِ لختِ دل بہ باد

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُس عہدِ رفتہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے مکتوباتِ فرنگ کو ترتیب دے کر شائع کرا دوں ؎

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ۔۔۔ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

شکریہ اصل کتاب جو انگریزی زبان میں تھی وہ بغرضِ ترجمہ مجھے میرے ہم سبق اور شفیق دوست ڈاکٹر سید جواد حسین صاحب تجار دی نے مرحمت فرمائی تھی۔ اُن کے اظہارِ شکر و امتنان میں میرا خاموش رہنا ہی بلیغ اعتراف ہے ؎

لب بند ہو گئے جو ہُوا اُن کا سامنا ۔۔۔ نکلی نہ کوئی بات ہماری زبان سے

تعویقِ اشاعت ایک برس سے زیادہ عرصہ ہوا کہ میں نے ان مکتوبات کی طباعت کا انتظام مخزن پریس لاہور سے کیا تھا۔ لیکن مالکان رسالہ مخزن نے ایسا دلخراش سکوت اختیار کیا۔ کہ اُس کی طباعت تو کجا جواب بھی نہ دیا۔ مخفی ذرائع سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ کہیں گم ہو گئے

پردہ پردہ میں جو ظاہر ہو وہ حال اچھا ہے

آخر کار میں نے دوبارہ بصد دقت یہ اجزائے پریشاں جمع کئے ہیں ۔

فقیر ڈاکٹر بسمل بریلوی
۲۱ اپریل ۱۹۲۲ء

۱

پیارے شہریار!

آپ کے اُس جاذب عطیہ کا جو کہ ابھی موصول ہوا ہے، نہایت ممنونیت ریزشکریہ پیش کرتی ہ[...] یہ اُس خلوت گاہ یعنی مختصر سے بالاخانہ کا جسے آپ اپنی نشست کے لئے زیادہ پسند کیا کرتے تھے باعث آرائش ہے۔ بہ نسبت پہلے کے وہ منظر بہت زیادہ تغیر پذیر ہے۔ اشجار خزاں رسیدہ ہیں اور تمام منظ[ر] گلشن ریز کو ردائے زوال محیط کئے ہوئے ہے اور مسرت حیاتِ انسانی کی طرح غیر یقینی اور مشتبہ[...] ایک زمانہ تھا کہ گلاب کے پھول باغات کی زینت تھے اور خورشید ہمیشہ ضیا بار تھا۔ اور کوئی شئے بھی تاریکی کے زیر اثر نہ تھی۔ بس اُس مرنے والے کی یاد جو کہ تھوڑا عرصہ قبل اِس دُنیا میں کسی کے پہلو میں لطف ا[...]

تھا ستانی تھی۔ ہائے وہ ساعتیں کس قدر سرور انگیز اور خواب آلود تھیں۔ میں متعجب ہوں اگر آپ کبھی اُس کا تصور بھی کریں۔ میں یقین کرتی ہوں کہ آپ اُس محبوبۂ صادق کو جو کہ اس طرح شریکِ غم رہی ہو کبھی فراموش نہ کریں گے۔

ڈیوک صاحب جنھیں پیرانہ سالی نے فاتر العقل بنا دیا ہے کل تشریف لائے تھے اور آپ کی بابت کچھ سوالات کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کے بارہ میں ہماری اور گورنمنٹ کی حکمت عملی کے متعلق زیادہ متفکر معلوم ہوتے تھے۔

ہم نے آپ کی عدم حاضری کو بہت محسوس کیا کہ کاش آپ یہاں ہوتے اور اپنی قابلِ ستائش ذہانت اور قابلیت سے . . . ہمارے مکالمے کو اپنی خردمندی کی میزان میں تولتے۔ کیونکہ اِن ناکامیوں نے ہم میں واجب الرحم تزلزل پیدا کر دیا ہے۔ کیا اِن خوفناک افواہوں میں جو کہ ایک ایسے دور و دراز مقام پر گرم ہیں کچھ شائبہ حقیقت بھی ہے یا صرف خیالی دنیا کی خیالی اختراعات ہیں۔ تاہم اپنی غیر مستقل مزاجی اور ناشکیبائی سے جو کہ انگریزوں کے مطمحِ نظر سے خارج ہیں۔ کس طرح امید یا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ اس قدر وسیع اور غیر ملک پر بغیر کسی تصادم یا بغاوت کے ہم حکومت کر سکیں۔ تمام باتیں ایسی حالت میں ممکن ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنے ہم وطنوں کی درخواست پر بھی ہمیں چھوڑنے پر راضی ہوں گے۔

لارڈ صاحب جنھیں آپ بھولے نہ ہوں گے گزشتہ ہفتے میں شکار کے لئے گئے تھے۔ اب وہ اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اتنے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے صوبجات کے پیچیدہ واقعات سے تنگ آ گئے ہیں اور اپنے قدیمی مسکن کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ آپ نے یہاں شکار کے لئے قیام نہیں کیا ورنہ آپ شکار کے بہت زیادہ شائق ہو جاتے۔ شاید یہ تمثیل غیر موزوں ہو۔ لیکن جب آپ میری اس قسم کی فروگزاشت پر غور کریں گے تو ضرور الزام سے بری پائیں گے۔

کیا آپ انگلستان پھر تشریف نہ لائیں گے؟ کیا یہ یاد ہے کہ ہم نے کس جوشِ مسرت سے آپ کا استقبال کیا تھا۔ اور بادلِ ناخواستہ رخصت بھی۔ کیا کوئی ایسی طاقت ہے جو آپ کو یہاں دوبارہ کھینچ لائے؟

کیا مخلصانہ آوازوں کی گونج پہاڑوں اور سمندروں کو عبور کرتی ہوئی آپ تک پہنچ سکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا کسی دن آپ جواب بھی دیں گے؟

اچھا۔ میرے پیارے خدا حافظ۔ میں ان موسم بہار کے دنوں کو جو کہ تمہارے ساتھ گزارے ہیں۔ اکثر زیادہ دیر تک بغیر تمہارے تصور کے کبھی یاد نہ کروں گی۔

تمہاری صادق محبوبہ

ایم۔ بی

۲

میرے پیارے۔

آپ کے اس مسرت ریز محبت نامہ کا غیر محدود شکریہ۔ جس کا جواب مجھے اس سے قبل دینا چاہئے تھا۔ لیکن میرا ہر لمحہ مصروفیت سے لبریز ہے۔ خوشگوار اور نقش ہو جانے والے تصورات مجھے ہر وقت منہمک رکھتے ہیں۔

میرا برادر زادہ جو چند ہفتہ ہوئے انگلستان پہونچا ہے۔ آپ کے متعلق بہت کچھ حالات بیان کرتا ہے کہ تم سے ہمیشہ ملتا رہا۔ اور وہ کہا کرتا ہے کہ ہندوستان میں تم سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور قابلِ قدر ہستی ہو۔ یہ تم خود جانتے ہو کہ ہر دل عزیزی بھی خود ایک جادو ہے۔ شاذ و نادر افراد ہی اس قدر مختصر وقت میں اتنے بہی خواہ پیدا کر سکے ہوں گے جتنے کہ تم۔ ہم ایوانِ وزارت کے افتتاح تک یہاں شہر میں مقیم ہیں۔ سیاسیات سے مجھے اسی قدر محبت ہے جس قدر دوسری خواتین کو لباس سے۔ شاید تم کو یاد ہو کہ ہم باہم شطرنج کھیلا کرتے تھے اور میری دلچسپیاں کس قدر شکن اور انہماک ہوا کرتا تھا۔ اُف! یہ کیسا دلکش مشغلہ ہے۔ یہ فرض کر لینا کہ پیادے بنی نوع انسان ہیں اور بساط قوم ہے۔ مقصد عامہ کی غیر فانی چار دیواری میں کس قدر رخنہ اندازی ہے۔ یہ اختلاف یگانگت جس کا اظہار مختلف اقسام کی ضیافتوں اجتماع۔ اور تفریحات سے کیا جاتا ہے۔ جن سے میں واقف تو بخوبی ہوں۔ لیکن پسند نہیں کرتی۔ اس سال اور بھی زیادہ متنفر ہوں۔ سال گزشتہ حالت کچھ مختلف تھی۔ کیوں کہ تم یہاں تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس بہترین نعمت کو جان گئی ہوں۔ جو حیات اور عیش عطا کر سکتی ہے۔ لیکن میں اس عیش کی کوئی زیادہ قدر نہیں کرتی۔ باہمی ارتباط البتہ گلاب کے خوشنما پھولوں کے باغ کی مانند ہے۔ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اُسے کیا جس کے دل میں ایک نامعلوم اور ناآسودہ خلش ہو۔ یہ کیسا صدمۂ جانکاہ ہے کہ شوق اُس مکار دنیا کے تجسس میں سرگرداں ہو جس پر چند جھوٹے عقائد اور اسی قسم کے فرضی خدا ہوں۔ اور آہ وہ دنیا جس میں ہر متنفس کسی حقیقی یا فرضی برتری کے لئے برسر پیکار ہو۔ اور اس سے غافل ہو جائے کہ لمحاتِ زندگی کس طرح پھر جاوداں کی جا

رواں دواں ہیں اور اسے فراموش کر دے کہ انسان کی اُمیدیں۔ خواہشات اور جذبات شاذ و نادر ہی پورے ہوا کرتے ہیں۔

لیکن مجھے ناصح بننے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں بہت ہی برداشتہ خاطر ہو رہی ہوں۔ جیسا کہ تم میری تحریر سے معلوم کر دگے۔

مجھے ایک سیاسی دعوت میں۔ ڈی۔ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ باوجودیکہ وہ لباس کی بے ترتیبیوں اور بے قاعدگیوں میں مرحوم کوئنٹ کی اتباع کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی حیرت انگیز خردمندی کے باور کرانے کی کوشش کی۔ وہ خوبی اور حُسن سے اس قدر معرا ہے کہ اُس کی چند امتیازی خصوصیات اس کی تلافی نہیں کر سکتیں۔ وہ بہت ہی کم گو ہے۔ لیکن جب وہ کچھ کہتا ہے تو وہ وہی کہتا ہے جو دوسروں کے دل میں ہو۔ اور وہ بھی دل خوش کن پیرایہ میں۔ حالانکہ یہ راز کی بات ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذاتی منفعت کی خاطر اپنے ضمیر کو ہر طرف رجوع کر سکتا ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ انجمن ہائے ملی کے استعمال کے سوائے اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے پورے طور پر ہندوستان میں بغاوت کو روکنے کے لئے میری ہمدردی حاصل کر سکے۔ ڈی۔ کو مشرق کی سیاحت کا بہت زیادہ شوق ہے۔ لیکن اب تک اُس کا سفر ترکی ہی تک محدود رہا۔ اُسے بہت افسوس ہے کہ انگلستان میں تم سے شناسائی حاصل نہ کر سکا۔ وہ کہا کرتا ہے کہ مشرق سے اُسے ایک خاص اُنس ہے۔

اُس نے دوارکا ناتھ کی دلرُبا صورت کا بھی تذکرہ کیا جس سے وہ چند موقعوں پر جانج ہاؤس جیسے زاہد فریب مقام پر مل چکا تھا (جہاں کہ خاتون بی صاحبہ دل کھو بیٹھی تھیں۔)

اُس نے مجھے مختلف افراد کے دلچسپ سوانح حیات اس قدر۔ خمار اور وارفتگی کے عالم میں سُنائے کہ جو کہ اُس کا حصّہ تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مضمحل اور افسردہ خاطر تھا۔ لیکن تاہم پورے طور پر توجّہ کو منعطف کئے ہوئے دورانِ گفتگو میں اُس کی خفیف سی لکنت موسیقی سے کم لطف دینے والی نہ تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہی ایک ہستی ہے جو کہ دوسرے کے دل میں شعلۂ محبت بھڑکا سکتی ہے۔

ہم لندن میں تا اختتامِ جولائی قیام کریں گے۔ اور پھر شمال کے سفر کا قصد ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم جنگل کے شکار میں اپنا وقت خوب گزار رہے ہوگے۔ حالانکہ مرغابیوں کی پرواز تمہارے لئے کوئی دلچسپی کا باعث نہ ہوتی ہو۔ موسم سرما میں میری ہمشیرہ۔ ڈی۔ جیسے غالباً بھولے نہ ہوں گے مصر تک جانے کا ارادہ رکھتی ہیں نا ورسکے معلوم۔ لیکن اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا تو شاید ہم بھی کلکتہ تک پہونچ سکیں وہاں میرے بہت سے کرمفرما ہیں۔ لیکن تم سے زیادہ مہربان شاید ہی کوئی ہو۔

مجھے پیارے ہندوستان کے اُن از یاد رفتہ اور دلفریب شہروں کا ایک خفیف سا خیال ہے۔ لیکن روانگی کا ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ تجسس مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں اکثر خواب دیکھتی رہتی ہوں اور جب کبھی خواب دیکھتی ہوں تو اے پیارے محبوب تمہاری صورت پیش نظر ہوتی ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم دوبارہ جملہ فسوں ریز افسانوں کو جو کہ صنعت۔ فطرت۔ قدامت۔ اور اعجاز سے اس قدر حیرت انگیز اور پیچیدہ طریقہ میں مخلوط ہیں۔ بیان کر رہے ہو۔ یکایک میں کیا دیکھتی ہوں کہ شاندار اور زرق برق جلوس شعاع ریز شوکت کے ساتھ میرے سامنے سے گزرے ہیں۔ تصور میں تمام چمک۔ دمک۔ شان وشکوہ۔ فضائے ارغوانی سبزہ زار۔ جن کی بابت اکثر تم کہا کرتے تھے دیکھتی ہوں۔ اور آخر کار اُس ساعتِ سعید کی بابت خیال کرنے لگتی ہوں جس کی کشش مجھی تمہاری طرف لئے جارہی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ میں نوعمر ہوں اور آزاد بھی۔ اور یہ پہلا موقع ہے کہ میں آزادی کی قدر کرتی ہوں۔ اس نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ میں واقعات سے مغلوب ہوں۔ واقعات پر خود غالب آگئی ہوں۔ یہی چیز تسلی بخش ہے۔

اور ہاں کیا تم مجھ سے مل کر خوش بھی ہوگے۔ ؟

تمہاری طالب دیدار

ایم۔ بی

۳
جواب خط

چھاؤنی۔ پی۔ ۱۸۔

میری پیاری حسینہ!!

میں نے انتہائے مسرت کے ساتھ تمہارا وہ آخری نامۂ محبت پڑھا جس میں تم نے ہندوستان آنے کا وعدۂ موہوم کیا ہے۔ تم نہیں جان سکتیں اور یہ خوب ہو کہ تم نہ جانو کہ بار دگر تمہارے حصولِ دیدار سے مجھے کس قدر مسرت ہو سکتی ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ تمہیں یہاں اپنے آنے کا افسوس نہ ہوگا۔ کیونکہ اِس ملک میں قابلِ دید نظارے ہیں۔ بہت سی ہستیاں اور بہت سے مقامات۔ جا...نہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک سپاہی زادہ ہوں اور مجھے اپنے اس مشغلہ کے علاوہ بہت کم وقت ملتا ہے کہ میں شاعرانہ جذبات و تخیلات میں اپنے آپ کو وقف کر دوں۔ تاہم مجھے اُس قوم کے حسیات اور روایات مرتعش بنا دیتے

ہیں جو کہ مختلف عقائد کے لحاظ سے صراطِ مستقیم پر چلتی ہو یا صراطِ غیر مستقیم پر۔ اور جو کہ صدیوں تک اپنی وضع کی پابندی کو ترک کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں مجھے اُمید ہے کہ تم یہاں آکر اسی اخلاقِ حسنہ اور الطافِ بے پایاں کا اظہار کروگی جو کہ مجھے اب تک یاد ہیں اور تمہارا دل ایک عام جذبۂ ہمدردی اور استقلال سے لبریز ہوگا۔ علاوہ ازیں تعصب کی خطرناک معصیت سے بھی بے لوث۔ تعصب کسی کہتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام جہالت ہے۔ جس میں تمہارے بہت سے مشہور ہم وطن مبتلا ہیں۔ مجھے یہاں بہت سے انگریزوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے جو کہ میرے مخلص اور مہربان ہیں اور اُن سے ربط ضبط مجھے پسند ہے۔

اے میری محبوب ترین آرزو۔ میرے لئے یہ امر محال ہے کہ میں اُن مسرت سے معمور لمحات کا ذکر کروں جو کہ تمہاری جلوہ گاہِ ناز میں میرے لئے مخصوص کئے گئے تھے۔ تمہارا تصور یا جلوہ میرے دماغ میں اُسی طرح جاگزیں ہے جس طرح کہ میں نے بارِ اول انگلستان کے روشن مطلع میں تمہارے ساتھ رہ کر حاصل کیا تھا۔ نسیم تازہ اور مشک بیز تھی اور موسم علمدارِ بہار۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ تمہاری مہماں نواز اور مہربان چچی زاد بہن ہی کا طفیل تھا کہ مجھے اُس ملک کے تمام رسم و رواج سے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی۔

میرا دل تمہارے لئے بیقرار ہے اور تمہارے تصور میں بازوئے تخیل مصروفِ پرواز۔ خدا کے لئے تم یہاں آؤ تاکہ میں تمہیں عجائباتِ مشرقی کے حُسن اور اُس کے رازِ سربستہ سے واقف کرکے اپنے لئے غیر محدود مسرت اور افتخار حاصل کرلوں۔

اے مایۂ ناز خاتون۔ میں ہوں تمہارا دیرینہ عقیدت کیش
نانا صاحب

۴

جہاز۔ ایس پاٹ جانٹا
از بحیرۂ رُوم

میرے پیارے

دو ہفتہ ہوئے کہ ہم انگلستان سے روانہ ہوکر یہاں تک بخیریت تمام پہونچ گئے ہیں۔ اب تک تمام وقت لطف سے گزرا ہے۔ فلکِ نیلگوں اور شفاف سمندر نے اوقات کو عجیب ہی دلفریب بنا دیا ہے اور صرف یہاں آکر ہی جہازات کے حُسن وحقیقت اور سمندر کے طلسم کو کوئی جان سکتا ہے۔

ہمارا جہاز جزیرہ کریٹ کے قریب سے گزر رہا ہے۔ جہاں سے میں تمہیں یہ چند سطور لکھ رہی ہوں۔ پانچ بجے کا وقت ہے۔ غروب آفتاب کا منظر۔ آسمان کو لاجوردی اور شفق گوں بنائے ہوئے ہے۔

شام کا بہترین اور پاکیزہ دھندلکا یونان کے پہاڑ کو ردائے سیمیں میں لپیٹے ہوئے ہے۔ ہوا لوریوں کا کام دیتی ہے۔ امواج ہمارے جہاز کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنی خمار آگیں ترنم ریزیوں سے میرے قلب و دماغ کو باعثِ فرحت بنائے ہوئے ہیں کہ خود بخود میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور میں عالمِ خواب میں اس سرزمین کو دیکھتی ہوں اور میرے پیارے تمہیں بھی۔

کس قدر تیزی اور مسرت سے ہمارے لمحات گزر رہے ہیں۔ گاہے گاہے طائرِ بحری کی خلائے امواج میں غوطہ زنی اور اُس کے نقرئی بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوا اور کوئی شے ہمارے اور آسمان کے درمیان حائل نہیں ہے۔ کاش میں شاعرہ ہوتی اور ان باتوں کو جامۂ الفاظ سے زینت دے کر قدر کرتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میری دعا ہے کہ میں لندن کبھی واپس نہ جاؤں یا یہ صرف ایک مبالغہ سمندر کی عطر باری اور اس وسیع قطعۂ ارض کی کامل آزادی اور افق کی تنویر سے جو کہ گلابی اور زرّیں حرارت میں ڈوبے ہوئے ہیں پیدا ہوا ہے۔

اس وقت سنگھاپور کا عزم ہے بعد ازاں برما ہوتے ہوئے ہندوستان پہونچیں گے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم کتنے عرصہ کے بعد آپ سے مل سکیں گے۔

میں مناظرِ قدرت کے دیکھنے کے لئے بےچین ہوں جو کہ نئی دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہمارے لئے منتظر ہیں۔

یہ خط مصر سے بذریعۂ ڈاک روانہ کروں گی۔ ڈیوک کا ارادہ ہے کہ وہ قاہرہ جا کر اپنے گزشتہ سفر کی یاد کو تازہ کرے۔ مسٹر مُریل جن سے تم واقف ہو وہاں کے معصوم مناظر کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم وہاں کچھ روز قیام کریں۔ لیکن مجھے اُمید نہیں یہ تمام تاخیرات مجھے مضطرب اور سیماب آسا بنائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مصر کے شہر کتنے ہی دلفریب کیوں نہ ہوں۔

جہاز پر جتنے بھی تمہارے شناسا ہیں۔ تمہاری خیریت کے طالب ہیں۔ اچھا رخصت!

تمہاری صادق محبوبہ

ایم۔ بی

۵۰

از کنڈی

سیلون

دورانِ سفر میں۔ میں نے آپ کو کئی خطوط لکھے۔ اور خاص طور پر مصر کے مخروطی میناروں کو دیکھ کر

لیکن یکے بعد دیگرے چاک کر دئے۔ محض اس غرض سے کہ وہ سمندر کو عبور کرتے ہوئے اپنا پیغ دنیائے جاودانی تک پہونچا دیں۔

ہم چند دن سے اِس شاندار وسیع خلوت بار اور دلفریب مقام پر پہونچ گئے۔ جہاں ہمارے ہی ایک جھیل ہے جو کہ ردائے سیمیں کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور چاروں طرف ہمارے فلک نما پہاڑ ہیں جو کہ برف کے نقرئی تاج سے مزین ہیں۔

کل ہم ایک جگہ گئے تھے وہاں ہم نے اس قدر بلند درخت دیکھے کہ گویا معلوم ہوتا تھا کہ کو جدت طراز شخص عالم خواب میں فردوس بریں تک پہونچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شام کو ہمارے اعزاز میں یہاں کے باشندوں نے ایک جلوس نکالا تھا۔ خوفناک اور مہیب صورتیں چاندنی رات میں مشعلیں لے کر ہمارے قریب سے گزریں۔ آہ وہ چاندنی رات جس کی بابت یہاں کے لوگوں خیال ہے کہ فرشتے آسمان سے اُتر کر سیر کیا کرتے ہیں۔

میں نے اب تک کوئی ایسی جگہ نہیں دیکھی جو دنیا کے زہریلے اثر سے پاک ہو اور جہاں ایک شخص کچھ پاکیزہ خیالات، اور نیک عقائد پیدا کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اسی طرح اگر زمانہ بہ نظر امعا مطالعہ کرے تو یہ سب باتیں شعاعِ آفتاب کے سامنے شبنم کی طرح بے حقیقت معلوم ہوں۔

لیڈی سی۔ کہا کرتی ہیں کہ مجھے سیلون سے نفرت ہے۔ لیکن خدا جانے قسمت میں کیا لکھا اللہ اللہ غریب الوطن کن کن اوہام کے شکار ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میں اپنے مقصود خیا کی تصویر اقلیم دل میں جواہراتِ حُسن سے اِس طرح آراستہ کروں گی۔ کہ کوئی طاقت اُس کی خوبصو کو مٹا نہ سکے۔

مجھے تمہارے خطوط کی تاخیر کا سخت افسوس ہے اور بسا اوقات بدگمان سی ہو جاتی ہو ر لیکن خیر بعض باتیں معرضِ تحریر میں نہ آئیں تو بہتر ہے۔ جس طرح سے کہ بلیغ الفاظ وہ ہی ہیں جو کہ لب تک نہ پہونچے ہوں۔

ہم کولمبو میں چند گھنٹوں کے سوا زیادہ نہ ٹھیریں گے اور آیندہ جو خطوط تحریر کروں گی وہ غالبا سنگاپور پہونچ کر۔

میں اس خیال سے بہت شاد ہوتی ہوں کہ دن بدن لمحات مجھے ہندوستان اور میرے زند دیرینہ کے قریب تر لئے جا رہے ہیں۔ میرا اور صرف میرا اسلام شوق۔

میں ہوں تمہاری
صادق۔ ایم۔ بی۔

۶

گورنمنٹ ہاؤس رنگون

برما

ہم چند ہفتے سے زمانہ کی بوقلموں زائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اچھا میں اب آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ دماغ کے تصویر خانہ میں تمام نئی اور پرانی تصویروں کو ترتیب دے سکوں۔

آبنائے کے انتظامات نے ہمیں متحیر کر دیا ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں۔ میرے خیال میں برما کی واقعات سے اس کا مشکل سے مقابلہ ہو سکتا ہے۔ میں نے آج تک ایسا کہیں نہیں دیکھا کہ کسی نے رنگہائے گوناگوں، وسیع ظلمات اور روشنی کی طویل شعاعوں کو یکساں سمجھا ہو۔

کل ہم برما والوں کے ایک میلے میں شریک ہوئے تھے۔ جو کہ ان کے قدیمی بت خانہ میں منعقد ہوا کرتا ہے۔ وہاں ایک انبوہ کثیر تھا۔ وہ لوگ ادھر ادھر سورج مکھی کے پھولوں کی طرح بلا کسی اتشا کے مصروفِ تماشا تھے۔ ہم نے بے شمار سیاہ خانقاہیں دیکھیں۔ جن میں نور کے قمقمے روشن تھے اور صندل کی خوشبو سے معطر۔ بہت سے طلائی اصنام دیکھے جو کہ چھتوں میں تراشے گئے تھے۔ پیپل کے پاک اور ساکن درختوں میں علم لہرا رہے تھے۔ اور اس سے بھی کہیں زیادہ وہ چیزیں ہیں جو کہ حیطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ کیونکہ وہ سب کرۂ سحر میں واقع ہیں۔

ہم نے یہاں ہزاروں مناظر دیکھے ہیں جو کہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے آج تک غروبِ آفتاب۔ صبح و مسا اور متلاطم سمندر کی طرح آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے ایسے مناظر نہیں دیکھے۔ جیسے کہ یہاں ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ ہندوستان کا خیال دل سے نہ محو ہو جائے۔!

برما والے انگریزوں سے بہت ہی مانوس ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ بہت زیادہ بشاش رہتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں مخمور اور دلِ عقیدت سے لبریز ہیں۔

یہ ملک تاریخ اقوام میں شیرخوار بچے کی مانند ہے۔ زمانہ کی دستبرد سے اب تک محفوظ ہے۔ کیا تم اسے تمسخر خیال کرتے ہو۔ تو برما جا کر اُن کے عیش و عشرت دیکھو۔ اور ملاحظہ کرو کہ وہاں دن کس طرح گزرتے ہیں۔ آفتاب کس طرح طلوع ہوتا ہے۔ اور بُت خانے اپنے سُنہرے لباس میں کس طرح درخشاں ہیں۔ یہاں بے شمار مندر ہیں اور بہت خوبصورت اور اُس مذہب کی یادگار ہیں جس کی

اشاعت یہاں تک پہونچی ہے۔ اور وہ مذہب اس قدر فطری اور پاک ہے کہ اس میں شک نہیں کہ کوئی غیر اثر اُس کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہاں آکر تاڑ کے درختوں کے زیر سایہ دھوپ میں زندگی کی حقیقی مقصد کا پتہ چلتا ہے۔
جب کوئی شخص رنگون کی گلیوں میں سے گزرتا ہے تو یہاں کے خط و خال اور حُسن کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

نامعلوم چیزوں کی کشش۔ دَورِ حاضرہ کی شعریت اور باقی تمام چیزیں ایک قسم کی شعاع ہیں جو کہ آسمان سے قرض لی گئی ہیں۔ اور قلب اطمینان سے مثل اُن جذبات کے لبریز ہے کہ جب وہ اپنی تمام تمناؤں کا احساس کرلے اور پھر اُسے کسی چیز کی خواہش نہ رہے۔

غالباً تم میرے تمام جوشش کو حماقت سے تعبیر کروگے۔ لیکن یاد رہے کہ مجھ جیسی ہستی جس نے ایسے نادر راستوں اور حسین چیزوں کو نہ دیکھا ہو قابل معافی ہے۔

کل ہم دریا کے راستہ سے مانڈلے روانہ ہو جائیں گے جس کے بعد ہم صرف صحرا پر ایک سرسری نظر ڈال سکیں گے۔ سلامِ شوق۔

تمہاری وابستۂ محبت

ایم۔ بی۔

۷

گورنمنٹ بنگلہ۔

مانڈلے

ہمیں یہاں آئے ہوئے تین روز ہوئے اور ہماری خوب خاطر و تواضع کی گئی۔ ہمارے ہر چیز کے نظارہ کو نقاب مسرت نے ملفوف کر لیا ہے۔ انگریزوں کے یہاں مہمان نوازی کا مفہوم صرف دعوتِ طعام ہے۔ یہاں کے لوگ اس سے بے بہرہ ہیں اور نہ اسے جاننا چاہتے ہیں۔ غالباً یہ ناپاکی ہے۔ لیکن یہاں کے باشندوں کا طرزِ معاشرت ہمارے لئے زیادہ دلچسپ ہے اور ہم میں سے ہر ایک کی ناواقفیت قابلِ افسوس ہے۔ اور لطف یہ کہ اگر کوئی اس موضوع کے متعلق واقفیت میں اضافہ حاصل کرنا چاہے تو مخالفت کی جاتی ہے۔

ہم راجہ صاحب کی خاص اجازت سے اُن کے رنگ محل کی سیر کر کے ابھی واپس آئے ہیں۔ بہت سے کمرے دیکھے جو کہ بلند۔ شاندار اور وسیع و بے ترتیب تھے۔ دیواروں پر زرکار اطلس کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ جن میں خوش نما لیکن غیر موزوں اور مختلف اقسام کے جواہرات ٹکے

ہوئے تھے اور اُن پر زردوزی کی مُہیب تصاویر بنی ہوئی تھیں۔

خوفناک ناگ کے عنبریں نیلوفر کے پھولوں میں سے سر نکالے ہوئے ہمیں گھُور رہے تھے اور باد سُست رفتار میں اُس وقت تک ساکت رہے جب تک اُن کی نظروں سے ہم غائب نہ ہوئے۔

ہم نے ابھی تک راجہ صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں کیا ہے۔ لیکن اُن کی بابت کچھ عجیب اور غیر خوشگوار افسانے مشہور ہیں۔ یہ سب لوگوں کی افترا پردازیاں اور اس قسم کی یاوہ گوئیاں قابلِ نفرت ہیں جو کچھ سُنا جائے وہی بغیر کسی تصرّف کے بیان کر دیا جائے۔ یہ ہی فلسفۂ صداقت ہے گو یہ خود غرضی کا دوسرا پیرایہ ہے۔

ہم نے کل بہت سی عمارتوں کو دیکھا۔ ڈیوک صاحب۔ بہت سے خدام سے مصروفِ تکلّم رہے۔ لیکن ہم اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے بُت خانوں کے دیکھنے میں مشغول رہے جو کہ جھیل کے کنارے پر کھڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا ہوا میں تیر رہے ہیں۔

مطلع کی خیرہ کرنے والی روشنی صنعتِ فطرت کو آشکارا کر رہی ہے۔ یہاں کے باشندوں کی زندہ دلی کو دیکھ کر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ یہ قابلِ شکر ہے کہ مغربی سرد مہری ابھی تک اس قطعۂ ارض پر اپنا تاریک اثر پھیلانے میں بیکار ثابت ہوئی ہے اور نہ یہاں کے مردوں اور عورتوں کے اطوار میں کوئی خاص تغیر پیدا کر سکی ہے۔

کل ہم وزیرِ اعظم کی لڑکی کی دعوتِ شادی میں مدعُو کئے گئے ہیں۔ بعدازاں ہم مانڈلے کو خیرباد کہیں گے خاص بات جس سے ہم اس قدر متاثر ہوئے ہیں۔ وہ برطانوی اخلاق کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے جس سے ہمیں یہاں سابقہ پڑا۔ حقیقتاً میں ..... اندازہ نہیں کر سکتی کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ میں بغض وعناد کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔

یہاں ایک مختصر سا کلب ہے۔ جہاں تمام انگریز شام کو تفریحاً جمع ہوتے ہیں اور جن کی گفتگو کا ماحصل صرف دَورِ ساغر و مے ہے۔ کھانے سے قبل اس قسم کی مختلف آوازیں مختلف سروں اور لہجوں میں سُننے میں آتی ہیں۔

سیلون کے باشندوں کا اپنے بالوں کی ترتیب کا عجیب ہی طریقہ ہے۔
میں نے توپ خانہ کے ایک میجر سے دریافت کیا کہ وہ بالوں کو کیوں نہیں تراشتے۔ تو اُس نے اپنی بڑی لیکن بے مُدعا آنکھوں پر عینک کو درست کر کے متانت کے ساتھ یہ جواب دیا کہ بالوں کے ترشوانے سے اُن کا حسن زائل ہو جائے گا۔

ہم جہالت کی اُس وسیع خلیج کا اندازہ نہیں کر سکتے جو کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تفریق پیدا کر رہی ہے۔ اور نہ اُس پر اخلاق و محبت سے پُل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بات قابلِ رحم ہے کہ جہاں ہمدردی و صلح کے پھول شاداب ہوتے وہاں اقتدار و حکمرانی کی گھاس اُگی ہوئی ہے۔ ہم موردِ الزام بنے ہوئے ہیں۔ اور ہم میں صبر و استقلال کی بھی کمی ہے۔

ایک سول افسر کو جو کہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند مخلوق سمجھتا ہے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "یہاں کے باشندے کم عقل ہیں۔ اگر وہ دماغ رکھتے ہوتے تو وہ یا تو ہماری ملازمت کم کرتے یا قطعی ترک کر دیتے۔" کیا یہ خود غرضی اور تنگ خیالی کی بہترین مثال نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہم صداقت اور سخاوت سے جس کے ہم اس قدر مداح ہیں۔ قریب تر ہو جائیں۔ اگر ہم اِس مسلہ امر کو تسلیم کر لیں کہ فطرتِ انسانی بلا کسی امتیاز ملت و قوم تمام دنیا میں یکساں ہے۔

میرا اور صرف میرا پیام محبت

"بی"

۸

بنگلہ

ن

مانڈلے کو چھوڑے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو چکا۔ ہم خشکی کے راستہ سے سفر کر رہے ہیں۔

ایک جگہ ایک شخص مسمیٰ جارج لارنس کے مہمان ہیں جو کہ میرے متوفی شوہر کا دُور کا رشتہ دار ہے۔

ہمیں اپنی جائے قیام بہت پسند ہے۔ یہ ایک وسیع اور فرحت بار بنگلہ ہے۔ یہاں سے ایک چھوٹا سا سرسبز و شاداب بری گاؤں نظر آتا ہے۔ یہ بنگلہ کچھ فاصلہ پر ہے۔ یہ ایسی سنسان اور سکوت بار جگہ میں ہے کہ ایسا اس عالمِ ہستی میں مُیسر آنا ناممکن ہے۔ درختوں۔ پرندوں اور گُل آسا خاموشی نے ہمیں اور بھی مسرور کر رکھا ہے۔ یہاں ہر ایک شئے نادر ہے۔ نئی اور خوبصورت چیزیں ذروں اور ستاروں کی طرح بے شمار ہیں۔

اس وقت موسم خوشگوار ہے اور اس لئے یہاں کی ضیا بار اور شوکت ریز صبحیں کسی قدر باعثِ راحت ہوتی ہیں اور خاص طور پر دوپہر کے وقت سکوت کامل۔ جبکہ کوّے بھی خاموش رہتے ہیں۔ ہم شام کو کھانا کھانے کے بعد صحن میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تاریک اور گھنے جنگل پر سایہ کو آتے اور جاتے دیکھتے رہتے ہیں۔ تاڑ کے درخت آسمان کے قدرتی منظر کی جانب سر اُٹھائے ہوئے کھڑے ہیں۔ اُس وقت

آہ۔ اِ۔ اے متاعِ نازِ محبوب! فوراً تمہارا خیال آجاتا ہے۔ کاش تم یہاں ہوتے اور "لالہ رُخ" کو پڑھ پڑھ کر سُناتے جاتے۔ کیا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے؟

جارج لارنس ہمارے اِس جوش سے بہت متحیر ہوتے ہیں وہ یہاں غروب آفتاب اور بُت خانوں کے مناظر دیکھنے میں کافی عمر گزار چکے ہیں۔ اب اُنھیں حسین مناظر دیکھنے کی بہ نسبت اپنے کھانے پینے کی زیادہ فکر ہے۔ چونکہ وہ اس ملک کا ہر پہلو سے مدت مدید سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ اِس لئے یہ بات کوئی زیادہ قابلِ حیرت نہیں ہے کہ کسی چیز کے حقیقی اور غیر حقیقی محاسن کے نقوش اُن کے دل سے مٹ چکے ہوں۔

بہرکیف جب شوق کی دلفریبیاں زائل ہو جاتی ہیں تو بجز اُس تاریک خیال کے جس کا نام بے غرضی ہے اور کیا رہ جاتا ہے۔

میں کل کچہری گئی تھی۔ وہاں تمام گاؤں والے جمع تھے۔ یہاں تک کہ بچے بھی۔ جو کہ زرد مخمل کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب عدالت کے مناظر کی جانب متوجہ تھے۔

برما والوں کو جنگ و جدل سے آئرلینڈ والوں کی طرح محبت ہے اور اگر کسی روز کسی شخص کو نبرد آزمائی کا اتفاق نہ ہو تو وہ اپنے ہمسایہ کے حالات کو سُن کر یا دیکھ کر اطمینانِ قلب ہی حاصل کر لیتا ہے۔

مجسٹریٹ کی جائے نشست لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور مجھے عدالت کی شان و شوکت کے خیال نے بہت ہی متاثر کر دیا تھا۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب دقیانوسی پائجامہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھے اور گاہے گاہے نصیحت بھی کرتے جاتے تھے۔ زبانِ عدالت ایوانِ وزارت کی زبان سے کہیں مختلف تھی۔ پنکھے والا دروازہ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ وہ برمی محرر جس کے سفید موزے اُتر کر جوتوں میں آپڑے تھے۔ نہایت ہی سنجیدہ اور مصروف معلوم ہوتا تھا۔ عدالت میں شہادت دینے والے کے قریب اگر کوئی شخص خفیف سی بھی آواز نکالتا تھا تو محرر صاحب کی پیشانی پر تحکمانہ شکن پڑ جاتی تھی۔ ہم زبان نہ جاننے کے باعث مقدمہ کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن ہم اُن کے زرد چہروں سے اُن کے مختلف اور تعجب خیز جذبات کا اندازہ کر لیتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر لفظ کو غور سے سُن رہے تھے۔ اور پورے طور پر سُننے کے لئے پنجوں کے بل کھڑے تھے۔ صحن سے باہر زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ اور اُس سے باہر آفتاب کی طویل اور خاموش شعاعیں درختوں کے پتوں میں سے چھن رہی تھیں اور شاہراہ کے ریت کو سُرخ بنا رکھا تھا۔

ایک شخص کو متعجب ہونا چاہیئے کہ کیوں ایسی غیر مشہور جگہ میں اسقدر جھگڑے۔ تنازعے اور جنگیاں ہیں۔

اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ غالباً اُن کی زندگی کا خمیر۔ فساد۔ غیر اطمینانی اور توہم سے مرکب ہے جیساکہ اکثر ہماری مغربی تہذیب میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہم مسٹر لارنیس کے ایک نتیجہ خیز لکچر سے جو کہ دہ صحن کے پچھلے حصہ میں ایک شخص کو سُنا رہے تھے نہایت محظوظ ہوئے۔ وہ شخص بہت ہی منطقی اور غمگین تھا۔ اور آخر میں گریہ وزاری کے ساتھ تائب ہو گیا۔ صاحب نے آخرکار اُس سے دروغ گو کی تشریح پوچھی۔ اُس نے آہستہ سے یہ جواب دیا کہ "اے حضور! دروغ گو وہ ہے جو عدالت میں شہادت دے۔"

کل ہم ایک اور سیر کی خاطر یہاں سے کچھ فاصلہ پر ایک ڈاک بنگلہ میں جائیں گے۔ اس کے بعد ہمارا ارادہ ہندوستان جانے کا ہے۔ اور ....

مجھے اُمید ہے کہ تم کلکتہ کے پتہ سے مجھے خط لکھوگے۔ براہِ کرم اپنے انہماک اور اپنے متعلق بھی مجھے تحریر کروگے۔ ہمیں اُن باتوں سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے جو کہ ہمارے کسی دوست سے تعلق رکھتی ہوں۔

بس! خدا حافظ

۹

بنگلہ ....

کل شب ژالہ باری ہو رہی تھی۔ یہ طوفان نمونۂ قہر تھا۔ لیکن آج ہماری روانگی کے وقت مطلع یکایک صاف ہو گیا۔ حقیقت میں یہ منظر دلکش تھا۔ ہم سیدھے اَنناس کے باغوں میں سے گزرتے ہوئے اُس جگہ پہونچے جہاں بدھ کے شکستہ و ریختہ نیم مجسمے عہدِ قدیم سے اب تک ایستادہ ہیں۔ بید کی بُنی ہوئی نشست پالکی کے ڈنڈوں سے علیحدہ ہو گئی۔ اِس وجہ سے اور بھی حصۂ ملک کے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ بعدازاں ہم زیادہ تر اُس ایک خوبصورت سڑک پر چلتے رہے جو کہ تراکم اشجار کے وسیع شامیانہ میں کچھ فاصلہ کے بعد گم ہو جاتی ہے۔ خاموش تاریکی اور نکہتِ گُل ہمارے حواس پر اثر کر رہی تھی اور وہاں بیل گاڑی کی چوں چوں یا کتوں کے بھونکنے کے سوا اور کوئی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔

صبح کاذب کے بعد آفتاب نمودار ہوا۔ اور ناقابلِ برداشت گرمی پڑنے لگی۔ اور برما کی وہ خنکی آمیز تمازت یاد آنے لگی جس کے ہم عادی ہو گئے تھے۔ اِس لئے اُس ڈاک بنگلہ کا نظارہ جو کہ سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے احاطہ میں واقع تھا۔ ہمارے لئے لبیک سے زیادہ تھا۔ صحن میں غلیظ

چوکیدار بیہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ اور ایک لنڈوری مرغی مٹی کے ڈھیر میں کرید رہی تھی۔ جس کے پانچ۔ چھ۔ بے ترتیب چھوٹے پر نکل رہے تھے۔ اور چند غریب گاؤں والے دھوپ میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہماری آمد کو بہت سے لوگ اُن جھونپڑوں میں سے دیکھ رہے تھے جو کہ چند بلند درختوں کے سایہ میں بنے ہوئے تھے۔ اُن لوگوں نے ہمیں بہت ہی غور اور تعجب سے دیکھا۔ ایسے مقامات میں انگریزوں کے خاکی ٹوپ زیادہ حیرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دو سن رسیدہ عورتیں بندروں کی طرح ڈرتی ڈرتی ہمارے قریب آئیں۔ وہ ڈیوک کو آرام کرسی پر لیٹے ہوئے دیکھ کر ایک خاص انداز سے مسکرا رہی تھیں۔ اور ڈیوک کی پیشانی کی شکنوں سے بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ موریل نے اسے زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اُس نے اپنے زنگ کے صندوق کو کھولا۔ اور اپنے چاروں طرف کسی منظر کو تصویر کھینچنے کے لئے تلاش کرتی رہی۔ ہم نے اُس فرصت کے وقت کو اُن مہمانوں سے ملنے میں صرف کیا جو کہ چست لباس پہنے ہوئے اور چرٹ پیتے ہوئے آتے تھے۔ کاہلی بہت ہی قابل شے ہے۔ میرا نہ تو کام کرنے اور نہ سیر کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کیا میڈم ڈی اسٹیل کا یہ کہنا سچ نہیں ہے کہ ”اخلاق پر مختلف مقامات کے معاشرت کا ضرور اثر پڑتا ہے“ میری رائے میں وہ قوم قابلِ معافی ہے اور اُس سے کسی قسم کی اُمید فضول ہے جو کہ اپنا وقت بے کار مشغلوں میں صرف کرتی ہو۔

میرے پاس ایک چھوٹا کتا تھا۔ اگر اُس سے کوئی یہ پوچھتا کہ تو کام کرنا پسند کرتا ہے۔ یا مرجانا۔ تو وہ فوراً ہی فرضی طور پر مُردہ ہو کر زمین پر لیٹ جاتا تھا۔ یہ ہی ہم سب کی حالت ہے کہ بہ نسبت محنت کرنے کے مرجانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم اپنے یہاں ایک خوشگوار موسم میں زندگی بسر کر رہے ہو گے۔ ورنہ سڈنی اسمتھ کا یہ مقولہ بہت صحیح ہے کہ ”اگر کوئی شخص ہوا کے جھونکوں کا پورا لطف اُٹھانا چاہتا ہے تو اپنی کھال کھچوالے اور ہڈیوں کے ڈھانچے میں بیٹھ جائے۔“

قوم شان کی ایک بہت خوبصورت لڑکی ہمارے واسطے کچھ کیلے لائی تھی۔ اور صحن میں کھڑی ہوئی مسکراتی رہی اور ذرا بھی نہ شرمائی۔ تاڑ کی پیچیدہ شاخوں میں سے چمکا چوند پیدا کرنے والی آفتاب کی شعاعوں نے اُس کے چہرہ کو خوبصورت اور اُس کے رنگین لباس نے اُسے تصویر بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایسی حسین صورت معلوم ہوتی تھی جس میں برما والوں کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ افسوس ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ ہمارے تمام اشارے و کنایے قطعی مغربی تھے۔ اِس لئے ہمارے

عدم تکلم نے ہماری دلچسپی کو خاک میں ملا دیا۔

حالانکہ مُریل یہاں کی وضع۔ قطع اور نور و تاریکی کے جلد تبدیل ہونے والی مناظر کی رنگین تصویر بنانے میں ناکامیاب ہو کر بھی پست حوصلہ نہ ہوئی تھی۔ وہ اُس لڑکی کو ایک مرکز اور اُس کے چاروں طرف دھوپ کو ایک دائرہ فرض کر کے ایک تصویر کھینچنے والی تھی۔ لیکن ہماری مترحم نگاہوں کی وجہ سے جو کہ اُس کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں وہ بھی اپنے ارادہ سے باز رہی۔

ڈاک بنگلہ کے علاوہ جہاں مکھیوں اور ناپسندیدہ مہمانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں اور بہت سی آرام دہ جگہوں میں رہ چکی ہوں۔ ہمیں اِس مقام کے چھوڑنے کا قطعی افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ غروب آفتاب کے بعد ہم ایک شاندار اور وسیع آسمان کے نیچے خاموش اور اجنبی سڑکوں پر سے گزرنے والے ہیں۔ جہاں نسیم گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم ہے۔ اچھا پیارے تھوڑی دیر کے لئے رخصت ہوتی ہوں۔

ایم۔ بی

۱۰

گورنمنٹ ہاؤس
کلکتہ

میرے پیارے!

قبل اِس کے کہ میں بستر پر سونے کے ارادہ سے لیٹوں۔ یہ زیادہ ضروری سمجھتی ہوں کہ آپ کے محبت آمیز استقبال اور پھولوں کے حسین عطیہ کا شکریہ تحریر کروں۔

آج شام بہت مسرت سے گزری۔ حضور گورنر جنرل اور اُن کی بیگم صاحبہ ہم پر بہت مہربان تھیں اور ظاہرا طور پر ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن یہ ہماری جائے قیام ایک بارک کی طرح ہے۔ اور میرے نزدیک ہم جارج لارنیس کے بنگلہ میں جو کہ جنگل میں واقع ہے زیادہ مسرور تھے۔ خیر یہ غالباً ناشکر گزاری ہے۔

میرا بہت سے لوگوں سے یہاں تک کہ کونسل کے اعلیٰ ممبر سے لے کر نوجوان اور باہمت چھوٹے عہدہ داروں تک سے تعارف کرایا گیا۔

کلکتہ کی چند خواتین کے آرائشِ لباس نے مجھے کسی قدر متحیر بنا دیا اور میں یہ محسوس کرنے لگی۔ کہ ہم لندن سے کس قدر دُور ہیں اِس قسم کی صنعت اور وضع۔ قطع۔ آج تک میری نظر سے

نہیں گزری۔

روئی صورت ڈیوک نے آج بہت زیادہ اظہارِ اخلاق کیا۔ اور ہمارے ہمراہ چہل قدمی کرتے ہوئے چھاؤنی تک چلے آئے۔ اور مریل نے ایک نوجوان مصاحب سپہ سالار کو دو تین عشوہ سازاداؤں سے مسرور کیا۔

کل ہم بارک پور روانہ ہوں گے اور وہاں سے جہاں تک جلد ممکن ہو سکا ہم ملک کے بالائی حصہ میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہماری طرف سے اشتیاق بسیار

۱۱
پندرہ روزہ خط

آپ کے الطاف و عنایات کا شکریۂ وافر!!

ایک دن اور ایک شام کی یاد میرے قلب کو ہمیشہ مضطرب رکھے گی جس طرح سے کہ سرود سرمدی کسی کے کانوں میں ہر وقت گونجتی رہتی ہو۔

اے میرے مہمان نواز مخلص! میرا خیال ہے کہ ہمارے آنے سے تمہیں زیادہ تکلیف ہوئی ہے اور ہم اس قدر خوش ہیں کہ میری رائے میں شاید ہم یہاں سے جلد جانا پسند نہ کریں۔

ہندوستان کی دلفریبیوں۔ سحرکاریوں اور خاص طور پر اُس کے ایک فرزند نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔

شاہانہ شان و شوکت۔ فراوانیٔ مسرت اور رنگ و روشنی کی عجائب ریز کثرت نے ہمارے ان تمام گزشتہ لمحات میں ایک تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے۔

کیا آسمان سے ہمیشہ اسی طرح شان برستی ہے؟ اور کیا یہ ملک برکتوں اور طلوعِ آفتاب کی ضیا باریوں میں اسی طرح ملفوف رہتا ہے جس طرح کہ آج کے دن ہے اگر ایسا ہی ہے تو آخر تک زندگی خوب گزرے گی۔

خدا حافظ۔ پیارے اور دلربا محبوب! میں یہ خط تمہیں چپراسی کے ہاتھ علی الصباح بھیجوں گی۔ اس خیال سے مجھے کس قدر مسرت ہوتی ہے کہ ہم تم کل ملیں گے اور خدا کرے ایسے دن بہت سے میسر ہوں۔

۱۲

دو شنبہ ۵ ½ بجے

میں آپ کے حسین تحفہ اور اس خط کا جو اُس کے ساتھ بھیجا گیا تھا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ ایسے بیش بہا عطیہ کے میں قابل نہیں ہوں۔ لیکن جی بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے آپ کو ایسی دلفریب چیز سے علیحدہ رکھوں۔ اس وقت طلائی انگشتری کے زمردیں نگیں سے شوخ اور سبز شعاعیں اِدھر اُدھر منتشر ہو رہی ہیں۔

براہِ کرم سنسکرت کے اُن عشقی خطوط کا میرے لئے ترجمہ کر رکھئے آج شام کو جب ملاقات ہو گی میں آپ کا بہت ہی بلیغ الفاظ میں شکریہ ادا کرونگی جن کے اظہار سے خامہ عاجز ہے۔

میرا خیال ہے کہ آج آپ نے خوب شکار کھیلا ہوگا۔ اور میلوین کی خواہش شکار پوری ہوگئی ہوگی۔

مکرر آنکہ تم بہت ہی زیادہ ہوشیار اور ذکی الحس ہو۔ اس بات کے اظہار کی جرأت نہیں کہ میں کس قدر مسرور اور تمہاری مرہونِ منت ہوں۔

یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسی مسرت ریز ساعتیں میسر آئیں گی یا ایسے نئے تعجب انگیز خیالات نادرہ اور ولولہ خیز جذبات مجھ پر مستولی رہیں گے۔ کسی جادوگر نے اپنے عصائے سحر سے اِن تمام چیزوں کو تبدیل کر دیا ہے۔ گویا عالمِ خواب میں پرواز کر رہے ہیں۔

میری آپ سے آج شام تک ملاقات نہ ہو سکے گی کیونکہ آرام کرنے کے بعد میں وطن کو خطوط لکھنے میں مصروف رہوں گی۔

۱۳

ہفتہ وار خط

میرے محبوب!

میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ اور ہاں۔ کیوں ہونے لگی تھی۔ میں گزشتہ شب تلاطم جذبات سے مجبور ہو کر خاموش رہی نہ کہ قلب جذبات سے۔

پیارے محبوب مجھے تمہارا بہت ہی زیادہ خیال ہے۔ واقعاتِ گزشتہ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے تم مجھے ہر شخص سے زیادہ عزیز ہو۔ یہانتک کہ اُس موسم

ے بھی زیادہ محبوب ہو جس کے لئے میری دوشیزگی وقف کر دی گئی تھی۔

حقیقتاً میں اِس امر کے اعتراف سے کسی قدر پشیمان ہوں۔ اِس خیال سے نہیں کہ مجھے تم سے نسبت ہے بلکہ صرف اِس لئے کہ جان و دل سے کسی کے ہو رہنے ہی میں راحت و آرام مضمر ہیں۔ کسی کو اقلیمِ دل پر حکمرانی کی اجازت دیدینا گویا دونوں کو تباہ کر دینا ہے تاہم یہ بھی کوئی بات نہیں۔

میں یہ چند سطور تمہیں عجلت میں لکھ رہی ہوں۔ کیونکہ سواری کے لئے گھوڑے آ گئے ہیں۔ جب ہماری ملاقات ہو گی تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ لیکن شاید اُس روز زیادہ مصروف رہوں گی اور تنہائی کا موقع مشکل سے مل سکے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں بستر پر جانے سے قبل ایک طویل خط لکھوں گی۔

میں ہمیشہ تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی۔

ایم ۔ بی ۔

۱۴

۱۲ بجے شب

عزیز ترین محبوب

وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ مہمانوں کی کثرت کے باعث میں تم سے گفتگو کرنے کے لئے ایک لمحہ بھی نہ نکال سکی، گرمی، گرد و غبار اور شور و غل سے تنگ آ گئی ہوں اور مقابلتاً سایہ دار برآمدہ ایک فردوسِ سکون معلوم ہوتا ہے۔

اے دلربا اور ہوشیار دوست۔ گلاب کے پھولوں اور خط کا شکریہ دلی قبول ہو۔

نہیں نہیں میں نہیں چاہتی کہ تمہاری قومیت اور ملک کی بابت کوئی توہین آمیز لفظ سنوں۔ لیکن تم بہت ہی سریع الحس ہو۔ مجھے کوئی تعجب نہیں اور اگر میں متعصب ہوتی تو تمہاری صحبت کا اثر اب تک اُس کو بالکل زائل کر دیتا۔ میں ایسی رکیک باتوں کو نہیں مانتی کہ صرف دماغی اور جسمانی خوبیوں کی قائل ہوں۔ خدا کے لئے ایسی سفاکانہ باتوں کا نہ تو تم خیال کیا کرو اور نہ تحریر کیا کرو۔ جیسا کہ تم نے گزشتہ شب کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک انگریزی خاتون ایک ہندوستانی مرد سے سچی محبت کر سکے۔ وہ کیوں نہیں کر سکتی؟ ہاں پیارے کیوں نہیں؟ میں اپنا دل تمہیں دینے میں فطرت کے کون سے قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہوں؟ محبت تمام خصائص کو متحد

کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام محبت نہیں۔ تم آنا موقع ہی کیوں دیتے ہو کہ دنیا والے میری یا تمہاری بابت چہ میگوئیاں کر سکیں۔ یقیناً تم میں ان سب باتوں سے درگزر کرنے کے لئے قوت دماغ اور شریفانہ خصوصیات کافی طور پر موجود ہیں۔

اپنی زندگی سنبھالنا اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم اس پر عمل پیرا ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری اخلاقی ہمت اور خودداری میں جو ایک شخص کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے لابدی ہیں۔ بہت زیادہ کمزوری اور کمی ہے۔

میں اپنی خود مالکہ ہوں۔ اپنی زندگی تمہارے سپرد کروں گی تمہیں اختیار ہے جو جی چاہے کرو۔ ہماری شادی ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ میرے ہم قوم بھی اس رشتہ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اوروں کی مجھے پرواہ نہیں۔

وہ ایام جن میں میری قسمت کا فیصلہ دوسروں نے کیا گزر چکے۔ کاش ان ایامِ گزشتہ کو میرے واسطے کوئی پھر خرید دے۔ اب مجھے وہ موقع حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی کو اپنے منشا کے مطابق بہترین طریقہ سے گزاروں اور اس لئے اپنی زندگی تمہارے قدموں پر ڈالے دیتی ہوں۔

میں پوری قوت کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں جو کہ حقیقتاً ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری مخالفت پر بہت سے آمادہ ہوں گے۔ لیکن مذہبی رکاوٹ نہ ہو گی اگر یہ باتیں ہماری مسرت بسیار اور محبتِ صادق میں سدِّ راہ ہوں تو یہ سب ہیچ ہیں۔

میرے پیارے! میں کیا بتلاؤں کہ میری کیا آرزو ہے؟ میری یہ صرف چرب زبانی ہی نہیں ہے۔ لیکن جب میں اپنے دل کی حالت کا اندازہ کر کے تم سے کہنے کی تمنا رکھتی ہوں تو ہیجانِ جذبات سے میری زبان بند ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے ہمارے تعلقات منقطع کرنے والی باتوں کا ذکر نہ کیا کرو۔ کیونکہ ایسی بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ میں نے اس عجیب چیز کو حاصل کر لیا ہے جس کا نام مسرت ہے اور اے میرے پیارے اس کے لئے میں تمہاری مرہونِ منت ہوں۔ اس کو میں صرف اب محسوس کرنے لگی ہوں کہ تمہارے انگلینڈ سے روانگی کے بعد میرے دن کس طرح گزرے اور تمہارا خیال مجھے کیوں ستاتا رہا۔ حالانکہ تم میرے خیالات کے مرکز سے دور تھے۔ اور اس کی اصل وجہ مجھے اس وقت تک معلوم نہ تھی۔ اور آہ وہ کیا زمانہ تھا جب کہ میرے تخیلات دوامی شاکی اور مجھے تمہارے منشا کے مطابق میں اپنے

مستقبل کے متعلق کچھ لکھوں گی تاوقتیکہ تم تھوڑے واپس نہ آجاؤ۔
کیوں جا رہے ہو؟ کیا واقعی بہت اہم کام ہے۔
اچھا رخصت۔ تمہاری آخر دم تک محبت کرنے والی
ایم۔بی۔

۱۵
ہفتہ وار خط

ہم نے تمہاری عدم موجودگی کو بہت محسوس کیا۔ آہ! یہ ساعتیں کس قدر طویل اور سنسان معلوم ہوتی ہیں۔

گزشتہ شب جنرل صاحب کے یہاں ایک شاندار دعوت میں ہم شریک ہوئے تھے۔ جنرل صاحب بہت ہی کم سخن اور اختصار پسند ہیں۔ حقیقتاً وہ اس قدر مردہ دل ہیں کہ اُن میں زندہ دلی کا نام بھی نہیں ہے اور وہ برف کے اُس انبار کی طرح ہیں جس کو دُور کی دھیمی روشنی نے چمکا کر دوسروں کو دھوکے میں ڈال دیا ہو۔

وہاں بہت آہستہ آہستہ دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن میرے خیالات باز وئے آوارہ تمہارے تجسس میں مصروفِ پرواز تھے۔

کس قدر افسوس ہے کہ تم یہاں نہیں ہو اور نہ ہم نے اپنی آمد کا اعلان عام طور پر کیا تھا۔ ایک لاطینی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ "جو کچھ ہمیں کرنا ہے وہ آج ہی کرلیں" اور یہ کس قدر حماقت اور ناشکر گزاری ہے اگر ہم خوش قسمتی کے اُن عطیات سے لطف اندوز نہ ہوں جو ہمیں عطا کئے گئے ہیں۔

بسا اوقات مجھے غلط فہمی سی ہو جاتی ہے کہ آیا تم مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہو جس قدر میں تم سے کرتی ہوں۔ بالفرض اگر تمہیں ہوتی تو تم باوجود کسی امر اہم کے بھی اپنے دل میں اس قدر دور دراز سفر کا ارادہ بھی نہ کرتے۔

اوّل تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو میں زیادہ عرصہ تک تم سے چھپا نہیں سکتی ہوں۔ لیکن تم ابتدائے محبت ہی میں مجھے اپنے ساتھ رہنے کی مسرت سے محروم رکھتے ہو۔

مفارقت مجھے ہمیشہ موت کی طرح ظالم اور بے رحم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہم تم دونوں کی رگوں میں محبت کا ایک ہی خون دوڑ رہا ہے

میں خوش ہوں کہ جمعرات سے ہم دورہ پر جانے والے ہیں۔ میں اِن جُدائی کے لمحوں کو گزارنے کی بہت کوشش کرتی ہوں۔ وہ پہلا سا جوش زائل ہوتا جاتا ہے۔ اب مجھے آفتاب اُس قدر درخشاں دکھائی نہیں دیتا اور نہ یہ ملک مجھے پہلے کی طرح فسوں ریز اور روشن معلوم ہوتا ہے۔ کیا تم اس کی وجہ بتا سکتے ہو۔؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حدتِ آفتاب تاریک طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔؟

مجھے یقین نہیں کہ اس خط کے پہونچتے ہی تم ضرور آجاؤ گے۔ اور کیا تم غدر کی بیہودہ افواہوں کو بے حقیقت سمجھ کر واپس نہ آؤ گے؟ آؤ ہم مل بیٹھیں، ہمیں اب زندگی کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ آؤ ہم اُن خوابوں کا خواب دیکھیں جو کہ محبت و مسرّت کا ماحصل ہیں۔ بہ پاسِ خدا کے لئے جلد آؤ۔

۱۶
پنج روزہ خط

عزیز ترین!۔

عرصہ سے تمہاری خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ اور علاوہ ازیں افواہوں نے متردد بنا دیا ہے۔ اس کی بابت میں کیا یقین یا خیال کر لوں؟ اس سے قبل مسرتِ عظیم کی روشنی میرے دل کو منور کئے ہوئے تھی لیکن اب اُس کی جگہ غم نے لے لی ہے جس سے میرا قلب لبریز ہے۔ میں بہت مغموم ہوں اور بدگمانیاں ترقی پر ہیں۔ ہائے تم نے مجھے چھوڑنا کس طرح گوارا کیا؟ محبت صادق کی فسوں کاریوں کے علاوہ دُنیا میں اور کیا وجوہات ہو سکتے ہیں؟

اے تغافل شعار! تم اُس قیمتی وقت کو ضائع کر رہے ہو جس کا بہترین استعمال کسی دوسرے طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ اے دل کے مالک للہ جلد واپس آؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہاں مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہاری موجودگی میری حیات کو انوارِ مسرت سے چمکا دیتی ہے۔ کیا یہ میری منت زائیاں مقبول نہیں ہیں؟

تمہارے ابنائے وطن یا کسی دوسرے ملک والوں کے خیالی توہمات سے کیا میں تمہیں زیادہ عزیز نہیں ہوں۔؟

میں انتہائے محبت سے اس بات کا دعویٰ کرتی ہوں کہ تمہاری زندگی میری زندگی ہے ایک ایسا شخص جس کی زندگی ہماری زندگی سے مختلف ہے اور کوئی صنفِ نازک اُس کی فریفتہ نہیں اگر

وہ شخص تمہارا قائم مقام بنا دیا جائے تو کیا وہ میری پرستش نہ کرے گا؟

میرے پیارے۔ وہ ایام جو کہ تمہارے ساتھ گزرے ہیں اب تک میری نظروں میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جس طرح سے کہ طلائی زنجیر میں جواہرات جڑ دئے گئے ہوں۔ اور جب میں موجودہ حالت سے تمقابلہ کرتی ہوں تو تنہائی کا غم مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ تم نے یہ علش پیدا کرکے مجھے غیر ضروری آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اُف! کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سوزِدل سے قرطاس خط جل اُٹھے۔ میں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تمہاری مسلسل غیر حاضری نے یہ دُنیا میرے لئے غمکدہ بنادی ہے۔ اور مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اس دُنیا میں اب اور زندہ رہوں۔

خدا حافظ! یہ وقت طلوعِ سحر کا ہے اور پرند اپنے آشیانوں میں سے چہچہا رہے ہیں مجھے اس خیال سے نفرت پیدا ہوتی ہے کہ ان الفاظ کو تم تک پہونچنے کے قبل ایک طویل سفر طے کرنا پڑیگا لیکن آخرکار تم تک پہونچ تو جائیں گے اور اس لحاظ سے یہ الفاظ بہ نسبت ان کی لکھنے والی کے زیادہ مسرور اور خوش قسمت ہیں۔

۱۷

گورنمنٹ ہاؤس

کلکتہ

پیارے۔ تمہارے تین محبت ناموں کا شکریہ وافر۔

میں تمہارے دلائل کی قائل نہیں۔ اور نہ کوئی اہم وجہ یہاں پر جانے کی میری سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک خاموش ہوں جب تک تم مفصل نہ لکھو۔

میں مدت مدید تک یہاں تک کہ حشر تک تمہارا انتظار کرسکتی ہوں اگر تم پیارے وہاں مجھے ملنے کی اُمید دلاؤ۔

وحشت ناک افواہیں اُڑ رہی ہیں اور ہزایکسیلنسی متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں ابھی تک قطعی طور پر کچھ بھی نہیں معلوم ہوا ہے۔ تاہم عام خیال خوشگوار نہیں ہے۔ خوفناک لفظ بغاوت کی گونج دُور تک پہونچ گئی ہے۔ لیکن میرے خیال میں صحیح نہیں۔

میں جنگ سے اور خاص طور پر بے ترتیب لڑائی سے بہت زیادہ گھبراتی ہوں۔ میرے

نزدیک وہ صلح۔ صلح نہیں جو عارضی ہو۔

میری جان! کاش تم سپاہی ہونے کے بجائے کچھ اور ہوتے۔ مجھے مہیب توپوں سے بہت خوف معلوم ہوتا ہے اور صرف تمہاری وجہ سے تمام سپاہی مجھے عزیز ہیں۔

کل شام جب ہز ایکسیلنسی تمہاری شاندار وفاداری کا ذکر کرتے تھے اُس وقت میرا دل سینہ میں دھڑک رہا تھا۔ اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ تمہاری وفاداری یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ تم نے اپنی زوجیت کے لئے ایک انگریزی خاتون کو انتخاب کیا ہے تو وہ کیا خیال کریں گے؟

یہاں سامانِ تفریح بہت ہے۔ لیکن میں اب بہت کم دلچسپی لیتی ہوں۔ جب کوئی کسی کو محبت کرتا ہے تو وہ کس قدر اپنے خیالات میں منہمک ہو جاتا ہے۔ ہر وقت تمہارا تصور پیش نظر ہے اور ہر وقت تمہارا خواب دیکھتی رہتی ہوں۔

انسان بساطِ عالم کے گوشہ پر کس قدر حقیر کھیل کھیلتا ہے کہ اُس کا بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں رہتا کہ جس کے ساتھ کھیل شروع کیا ہے۔ اُسی کے ساتھ کھیلے جائے۔

جانِ من! اُس مقام سے آجاؤ جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان حد فاصل ہے۔

۱۸

کلکتہ

میں نے تمہیں بہت سے خطوط لکھے تھے۔ لیکن سب چاک کر ڈالے۔ کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ جو کچھ میں تحریر کرتی ہوں وہ تم تک پہونچتا ہے یا نہیں۔

پیارے میں دُنیا سے تنگ آگئی اور مجھے اپنی زندگی کاٹنا دوبھر ہو گئی ہے۔ ہر شخص کو تعجب ہے کہ ہم وطن کو واپس کیوں نہیں جاتے۔ باوجودیکہ میں اُن کے کام میں خصوصاً کم دلچسپی لیتی ہوں میرے محبوب اگر ہم ابتدا ہی سے اِن باتوں کا مقابلہ کرتے آتے ہوتے تو لوگوں کا استعجاب ابتک ختم ہو گیا ہوتا۔ میری جان! تم باہمت آدمی ہو۔ لیکن تم میں اتنی جرات نہیں کہ نکتہ چینیوں کا مقابلہ کرو اور خاص طور پر اُن اعتراضات کا جو کہ ہماری شادی کے متعلق ہوں۔

پیارے۔ تم خود واقف ہو کہ میں تمہیں الزام نہیں دے سکتی ہوں اور نہ کوئی میرے دل میں ایسی بات ہے جو تمہیں معافی دینے سے مانع ہو۔ لیکن یہ زیادہ باہمت کام ہوتا اگر فوجوں کو چلا جانے دیتے اور تم میرے پاس قیام کرتے۔

جو کہ تم نے میرے لیے بیان کی ہے ۔ اور یہی ہے کہ جب تک تم اجازت نہ دو میں کیسی [illegible]

یہاں تک کہ میں اُن سے کچھ کہہ سکتی ہوں ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تم اُس سے واقف نہیں ہو ۔ ہمارے تمام دوستوں سے اُس کا مزاج مختلف ہے وہ بہت زیادہ حلیم اور سلیم الطبع ہے ۔ ذرا سی غلطی پر بھی اُس کے احباب اُس کے بہترین اوصاف کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن وہ حقیقتاً شریف النفس ہے ۔ اگر تم اُس سے میری طرح ہوتے تو تم اُس کے دل و دماغ سے اندازہ کر لیتے کہ وہ ہمارا کس قدر ہم آہنگ ہے اس لئے اُنکی مخالفت اور تعصب سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔

تم اپنے مستقبل کی بابت کچھ بھی نہیں بتلاتے اور کیا اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہو ؟ لیکن تم یہ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۔

یہاں واقعات خوشگوار نہیں ہیں ۔ ہز ایکسیلینسی کی چیں بجبیں میرے قیاس المعلومات ہیں ۔ وہ ہمیشہ مراسلات کے لکھنے میں مشغول و مصروف رہتے ہیں ۔

میں نے اُن کے ایک مصاحب کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ہم خطرہ کے بہت ہی قریب ہیں ۔

پیارے مجھے تم پر اور صرف تم پر بھروسہ ہے ۔ آہ ! اگر نسبتاً میری طرح تم نصف بھی پروا کرتے تو تم ضرور اب تک میرے ہو گئے ہوتے ۔

پیارے ۔ مایوسی مجھ پر طاری ہے ۔ شکوک نے اِس طرح میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے جس طرح کہ خودرو گھاس ایک باغ پر ۔ تمہارے خط سے ناامیدی ٹپکتی ہے اور تمہارے دل سے میری محبت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے ۔ واقعات اور تمہارے ملک کے باشندے تمہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہیں ۔

پیارے نہ تو مجھے تم سے شکوہ ہے اور نہ بدگمانی ۔ میں تمہارے تخیلات کو اچھی طرح سمجھتی اور قدر کرتی ہوں ۔ حالانکہ دُنیا کے نزدیک یہ تو خام اور مجنونانہ ہیں اور مجھے اس کا پورے طور پر احساس ہے کہ ان پر عمل کرنے ہی میں شرافت اور اصلیت پنہاں ہے ۔ اور کسی حد تک تمہاری جوانی کے احساسات کا نقطۂ نظر اور جیسا کہ تم کہا کرتے ہو کہ گمشدہ مقاصد کی تلاش ہی شریفانہ فعل ہے ۔ لیکن پیارے کیا اِس کے لئے میری موزوں ہے ؟ شاید تم نے یہ دونوں سمجھو ۔ لیکن میں ایک عورت ہوں اور تمہارے لئے محبت مجھے دنیا اور [illegible] کر کے [illegible] اور جو ہستی کے پاس وہ [illegible] ہوں سے [illegible] کی ہوئی محبت بھی مال اور [illegible] ہے ۔ ہماری محبت دنیا کی تمام

چیزوں سے نادر اور غیر مشابہ ہے اور وہ معمولی جذبات سے کہیں زیادہ لطف دالی ہے کیا قدرت نے یہ چیزیں عبث عطا کی ہیں؟

میری جان۔ واپس آجاؤ۔ ہاں واپس آجاؤ۔ میں صرف تمہارے لئے زندہ ہوں! اور ہمیشہ تک تمہاری یاد میں زندہ رہوں گی۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ تم میرے پاس رہو نہ کہ اُن دور دراز اور وسیع میدانوں میں جہاں بیماری اور موت سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔

تسلیم خدا حافظ

خدا کی قسم۔ ہمیشہ تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔

۱۹

دو روزہ خط

گرمی زیادہ پڑنے لگی ہے۔ مجھے خفیف حرارت سی ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت ناساز رہتی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بغرض تفریح ساحل سمندر تک جائیں اور جلد واپس آجائیں۔ تمہاری خیریت کے جلد نہ معلوم ہونے کی وجہ سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ کیا ہم تم صرف جدا ہونے کے لئے ہی ملے تھے؟ جب میں اپنی طویل تنہائی کے منظر اور افسردہ زمانہ پر نظر ڈالتی ہوں تو میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کسی طرح بھی اس سزا کی مستحق نہ تھی۔ لیکن آہ بیرحمی کا یہ مہذب طریقہ خوب ہے۔

جنگ ہوگی یا نہیں؟ خدا کے لئے اس کی بابت مجھے لکھو۔ پیارے میری جان آج کل تم اپنے خطوں میں غیر معمولی اختصار سے کام لیتے ہو۔ کیا تم مجھ سے اُکتا گئے ہو؟ اور کیا تمہاری موجودہ زندگی کے غیر یقینی تغیرات نے تمہارے دل سے تمام تعلقات اور واقعات کو محو کر دیا ہے۔ واقعی اگر ایسا ہے تو میں خوب سمجھتی ہوں۔ اور اس لئے تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن پیارے میں ملتجی ہوں کہ تم اُس عورت کو فراموش نہ کرنا۔ جس کی محبت غیر مختتم ہے۔ خدا سے اور بہتر سے وہ صرف اس بات کی خواستگار ہے کہ تم بھی اُس سے اُسی کی طرح محبت کرو۔

تا اختتام حیات وہ تمہاری رہے گی

۲۰

میرے پیارے۔ تمہاری محبت ریز تحریر کا ہزار ہزار شکریہ۔

میں واقف ہوں اور جانتی ہوں کہ تمہارے وقت اور توجہ پر مصروفیت کا کس قدر بار ہے اور ایسی حالت میں خط لکھنا بہت زیادہ دشوار ہے۔ میں شاکی نہیں ہوں میں کوشش میں ہوں اور

ہاں بہت زیادہ خوش ہوں۔ صرف اس لئے کہ مجھے تمہارے دل و دماغ پر قبضہ حاصل ہے۔ لیکن آج کل جینا دشوار ہے۔ تم نے میرے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگا دی ہے کہ جس کی وجہ سے میں اُس عجیب تعلق کا اظہار نہیں کر سکتی ہوں جو کہ ہندوستان سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ روزانہ حالت نازک ہوتی جاتی ہے اور میں جانتی ہوں کہ اس حالت کے تماشائی دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں اور وہ اپنے اُن ہم مشربوں کی طرح ہیں جنھوں نے اس مختصر ڈرامہ میں میری اور تمہاری شرکتِ خاص کو نہ تو دیکھا اور نہ کبھی سُنا۔ خوش قسمتی سے اِس ملک کے باشندوں کے جذبات کی اِن پیچیدہ اور وحشت ناک خبروں نے جو کہ ہر ساعت یہاں پہونچ رہی ہیں۔ ہر ایک کو مصروف کر رکھا ہے لیکن مجھے اِن سے کچھ تعلق نہیں اور میں تو صرف تمہاری سلامتی اور جلد تر واپسی کی دعائیں مانگا کرتی ہوں۔

ہماری پالیسی کے درست نہ ہونے کی بابت تمہارے خطوط سے شکوک کا ترشح ہوتا ہے کیا ہم بہت سختی سے کام کر رہے ہیں؟

انگریزوں میں یہ عام طور پر نقص ہے۔ تاہم تمام افواہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلاشبہ شدید ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ شب ایک مختصر سی محفلِ رقص منعقد کی گئی تھی۔ اُس میں شریک بھی وہی لوگ تھے اور قریب قریب ایک ہی قسم کی خرافات باتیں تھیں صرف ایک کمی تھی جو کسی کے دل سے کوئی پوچھے۔

خدا حافظ میرے پیارے

میں نے تمہارے آخری خط کو مکرر سہ کرر پڑھا۔ بلاشبہ تم کسی حد تک صحیح ہو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرے پیارے! یہ بے وفائی نہیں بلکہ میری بزدلی ہوگی۔ اگر میں تمہارے عزم سے تمیں منحرف کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں تمہارے ان عمدہ جذبات کی قدر کرنے میں کمی کرتی ہوں۔ جو کہ صرف میرے ستانے کے لئے اختیار کئے گئے ہیں لیکن میرے اور صرف لئے میرے محبوب! میں ایک عورت ہوں اور خود غرضی میری فطرت میں داخل ہے۔ تم مجھے بہت زیادہ عزیز ہو۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ کرانا کاتبین بھی میری اُن خواہشات اور مطالبات کی بابت جن کی میں تم سے خواستگار ہوں۔ میرے نامۂ اعمال میں بطور عصیاں کبھی بھی درج نہ کریں گے۔

میں بہت ہی مخمل اور پریشان خاطر ہوں۔ ہز ایکسلنسی جو کہ تمہارے [illegible] ہیں

تم فرماتے تھے کہ ہم سے تعلقات منقطع کرنے کے بارے میں تمہاری نسبت بے بنیاد افواہیں گرم ہیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ اس استفسار کی معافی چاہتی ہوں مجھے تمہاری محبت پر بھروسہ ہے۔ اس لئے تم کبھی بھی میرے اہلِ ملک کی مصیبت کے وقت اُن سے علیحدہ ہونیکا خیال بھی نہ کروگے۔

اور اگر اس پر بھی تمہیں سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ ہو کہ تم ہم سے تعلقات ترک کر دو۔ تو پھر میں تمہارا ساتھ کیوں نہ دوں۔ اور تمہارے فیصلہ پر کوئی اعتراض نہ کروں۔ بس تمہارا اشارہ چاہئے اور پھر کوئی چیز مجھے تمہارے ساتھ جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ تمہارا تصور ہمیشہ پیشِ نظر ہے تمہیں خالقِ کونین کا اور میرا واسطہ۔ اگر تمہیں انگریزوں پر اعتماد نہ رہے تو تمہیں ایک ہستی پر ضرور بھروسہ رکھنا چاہئے جو ہر وقت مصیبت و مسرت میں صرف تمہاری ہے۔

۲۱

قاصد کی روانگی سے قبل چند سطور اور تحریر کرتی ہوں۔

اے میرے سرمایۂ ناز .... میں تم سے ملتجی ہوں کہ تم مجھے مایوس نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انقلابِ زمانہ اور ضمیر کے شکوک تمہیں جوابِ خط سے باز رکھیں۔

میری عقیدت نسائیت کے تم ہی اور صرف تم ہی ایک جذبۂ خاص ہو اور صرف اِس خیال نے کہ تم میرے ہم قوم نہیں ہو تمہیں اور بھی زیادہ محبوب بنا دیا ہے۔ اور میرے دل کی صرف یہی خواہش ہے کہ تم پر یہ ظاہر کر دوں کہ میری محبت کس قدر گہری ہے اور اُس پر کسی تبدیلی کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ بجز اس کے کہ یہ عزمِ محبت اور بھی راسخ اور مستحکم ہو۔ اگر مستقبل تاریک بھی ہو اور رنج و الم سے لبریز لیکن مجھے اِس کی قطعی فکر نہ ہوگی بلکہ جس کا کہ میں اب اقرار زبان سے کرتی ہوں اُس وقت اُسے اپنے عمل سے ثابت کروں گی۔

کوئی اُفتاد کیوں نہ پڑے میں تیار ہوں۔ اگر تمہاری قسمت میں تحسین و آفریں ہیں تو میں اُن سے شادکام ہوں گی اور اگر اس کے خلاف ہے تو میں تمہاری شریکِ حال۔ سوائے اس کے میری اور کوئی خواہش نہیں کہ زمانہ ہم کو باہم یکجا کر دے۔ یاد رکھو کہ بعض پودے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ خوشبو میں کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ لیکن مرغزار کی بہ نسبت ایک ویران زمین میں بہت زیادہ بالیدہ اور خوشبودار ہو جاتے ہیں۔

تمہاری

ایم

۲۲

پندرہ روزہ خط

مجبی۔ وحشت ناک افواہیں مجھ تک پہونچ رہی ہیں۔ میں بہت زیادہ مغموم اور مضمحل ہوں۔
کل ہزایکسیلینسی کے سامنے جب تمہارا نام لیا گیا۔ تو وہ بہت برہم ہوئے۔ پیارے مجھے اپنے پاس بلالو۔ تم تمام میرے خیالات اور زندگی کے مالک ہو۔ اب میں زیادہ عرصہ تک تم سے جُدا رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ میں بہت ہی بدبخت ہوں۔ اگر تمہیں صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ میں روزانہ ہر لحہ کس کرب و بے چینی سے گزارتی ہوں تو شاید تم مجھ سے اظہار ہمدردی کرو۔ میں اپنی شہرت وطن اور تمام امیدوں کو خیرباد کہنے کو تیار ہوں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میری باقی ماندہ زندگی تمہارے ساتھ بسر ہوگی۔ اگر اسی حالت میں رہی تو میری زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور اگر تمہارے ساتھ رہی تو میں نئی زندگی حاصل کر لوں گی۔

میں یہ چند سطور ایک خاص قاصد کے ذریعہ سے بھیج رہی ہوں۔ میرے اور صرف میرے پیارے بواپسی ڈاک جلد جواب دو کہ آیا میں تمہارے پاس فوراً چلی آؤں میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی اور وطن پہونچ کر بھی مجھ میں گزشتہ جذبات عود نہیں کر سکتے۔

تم اسے مقسوم کے نام سے موسوم کرو یا اور کسی نام سے۔ لیکن میری زندگی ابدالآباد تک تمہاری زندگی کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے۔ خواہ مستقبل سے ہمیں فائدہ پہونچے یا نقصان خواہ تحسین ہو یا تضحیک۔ لیکن ہم تم شریک رہیں گے تا اختتامِ حیات۔ تمہارے اہلِ وطن میرے اہلِ وطن ہوں گے۔ اور تمہارا خدا میرا خدا۔

میرے چہیتے

تمہاری۔

۲۳

جواب نامہ

میری حسین خاتون!

تمہارا محبت نامہ پڑھ کر خاطر جمع ہوئی کہ تم سے کہا ہوا تھا پہونچا۔ اور الفاظ نہائے الطاف و کرم نے مجھے بہت شاد کیا

میں خود بھی تمہاری طرح گزشتہ چند ہفتے سے بوجہ وحشت زدہ شکوک اور خوف کے جن کے اظہار کی میں نے کبھی جرات نہیں کی پریشان خاطر رہا۔

اے دلربا اور فخر خواتین! آہ!! میں تم سے اُس وقت علیحدہ ہوا جب کہ تم میری زندگی کو خوبصورتی کے ایک نادر پھول میں تبدیل کر چکی تھیں وہاں جانا شاید اپنی غلطی سے اپنا فرض سمجھتا رہا اور اپنے کئے پر اب بھی عرصہ سے دل عجیب اور روز افزوں بدگمانیوں سے لبریز ہو گیا ہے۔

تم بخوبی واقف ہو کہ میں نے ہمیشہ تمہارے اہلِ وطن کا ساتھ دیا ہے اور اب بھی آخر دم تک اسے نباہنے کا ارادہ ہے۔ اُن کا عدل۔ اُن کی روشن خیالی اور اُن کی آزادروی کی صدائے بازگشت نے میرے دل سے جواب حاصل کیا ہے۔ لیکن اب یہ پہلا موقع ہے کہ میں اُن کے خصائل اور حکمت عملی پر اعتراض کر رہا ہوں۔ میں تفصیل سے تمہارے دماغ کو پراگندہ کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ تم اپنی حورانہ خوبیوں کی وجہ سے میرے اور میری لغزشوں کے لئے دل کو کڑا کرو گی۔ دوسروں کو بُرا کہنے دو۔ کیونکہ وہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اے سرمایۂ راحت! طویل اور غیر منفصل کشاکش کے بعد مجھے اچھی طرح معلوم ہوا ہے کہ میرے مستقبل کا فیصلہ کر دیا گیا اور تقدیر کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔ یہ خیالات یکایک پیدا نہیں ہوئے بلکہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے رہے ہیں شاید اس سے قبل میں اس نتیجہ پر نہ پہونچتا لیکن اب تو بلاشبہ یہ نازک وقت قریب تر ہے۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہم مشرق کے رہنے والے زندگی کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ صرف اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالدوں لیکن میں تمہارے ساتھ ایسا ہونا پسند نہیں کرتا ہوں۔ اِس لئے ملک کی عزت کی خاطر اب اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کہ تم سے علیحدہ ہو جاؤں۔ حالانکہ میں اِسے محسوس کرتا ہوں۔ لیکن میں حریص نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں بجائے تمہاری محبت کے شاندار اور اکمل عطیہ کے ان چیزوں سے مطمئن ہو چکا ہوتا۔ میں صرف یہ اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ میرے ملک کو میری ضرورت ہے۔ انگریز مجھے غدار اور ایک دیوانہ کا خطاب دیں گے اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی قسمت کے فیصلہ پر شاکر رہنا چاہئے۔ مجھے وہ نادر جذبہ جسے دُنیا جذبۂ حبِ وطن کے نام سے پکارتی ہے [illegible] کئے ہوئے ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ زبردست کمزوروں کو ستا رہے ہیں۔ اس لئے مجھے کمزوروں کی حمایت میں لڑنا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تاریکی تمام ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن میری طرح [illegible] جاتے ہیں

اے شریف اور نیک دل خاتون! میں اپنی قسمت کے فیصلے سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ خواہ تم
در تمہاری محبت مجھ سے چھوٹ جائے۔

اگر میں اس وقت تمہارا کہنا مان لوں تو میں اُس جذبۂ خالص سے جو کہ میرے دل میں اس وقت
وجزن ہے محروم ہو جاؤں گا۔

شاید تمہیں میرے خیالات اور مطمح نظر مہمل سا معلوم ہوتا ہو۔ لیکن میں اُمید پر قانع ہوں کہ شاید
رنے کے ایک عرصۂ دراز کے بعد میری قربانی کا معمولی تخم زمانہ کے ہاتھوں سے پرورش پا کر ایک
میدافزا پھول پیدا کرے۔

ان خیالات کی وجہ سے میں ارادتاً اپنے احباب قدیمی سے قطع تعلق کر رہا ہوں۔ اے میری محبوبہ
ور اے میری ملکہ! کیا تم اپنے تصوّرات میں میرے خیال سے باز رہو گی؟ تم میں وہ نفیس خصوصیات موجود
یں جن کے ذریعہ سے تم صراطِ مستقیم اختیار کر سکتی ہو۔ حالانکہ دوسرے ایسا نہیں کر سکتے۔

علاوہ میرے اگر کوئی میرے جذبات کو سمجھ سکتا ہے اور اُن تاثرات سے جو کہ مجھ میں پیدا ہوئے ہے
یں چشم پوشی کر سکتا ہے۔ تو وہ اے مہربان خاتون صرف تم ہی ہو۔

پیاری خاتون! میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تم سے مل کر اُن تمام ارفع و اعلیٰ حسیات کو حاصل
کر لیا ہے جو کہ محبت اور زندگی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور باتوں کی مجھے پرواہ نہیں۔

تم میرے لئے دونوں جہان سے زیادہ عزیز ہو۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ شاید میں تمہاری محبت و
عنایت کا کوئی معاوضہ نہ دے سکونگا اور میں اُس چیز کا وعدہ کرنا نہیں چاہتا۔ جس کے ایفا میں ناکام
رہوں۔ ایسا خیال کرنے میں اگرچہ میں اپنے اور شاید تمہارے دل کو مجروح کر رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی
قوم اور اُس کی روایات کا وفادار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ جذبہ ہے کہ جس کے سمجھنے کی اگر تم نے
پوری طرح کوشش کی تو تم نہ تو مجھے الزام دو گی اور نہ مجھے حقارت سے دیکھو گی۔ اگر میری یہ صاف
دلی تمہاری نگاہوں میں معتوب ہے۔ تو اے خاتون میں حقیقت میں بہت بڑی سزا کے قابل ہوں
جو کہ میرے خیال سے بھی باہر ہے۔

میں نے اپنے صادق جذبات کو تجزیہ کر کے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے کیا میں نے غلطی کی؟
میں تمہیں محبت کرتا تھا اور اب بھی میری محبت غیر محدود ہے۔ دُنیا کی ہر شے سے زیادہ۔ بلکہ اُس
سے بھی بالاتر۔ اور اس لئے تم سے ترکِ تعلقات کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی زندگی کو ناقابلِ برداشت
بنا رہا ہوں۔

مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ آج تک کسی سے نہیں ہوئی اور کوئی دوسرا انسان محبت کر سکتا ہے۔ اور جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں تم سے ہر حالت میں ادنیٰ ہوں اور تم اس پر بھی مجھ پر عنایت کرتی ہو تو میں کھو سا جاتا ہوں۔

تمہیں جاننے سے قبل میری پیاری زندگی مختلف اقسام کی دلچسپیوں سے معمور تھی۔ میں ایک لاپرواہ نوجوان کی طرح مسرور لیکن ایک بے رُوح ہستی تھا۔ نہ کبھی میں نے اپنے نقصانات کا خیال کیا۔ کیونکہ میں جانتا ہی نہ تھا اور اُس زمانہ میں جبکہ میری زندگی کے دِن مسرتوں اور رنگینیوں سے لبریز تھے نہ تو مجھے کوئی تمنا تھی اور نہ کوئی غم۔ لیکن ہاں اُس وقت جبکہ انگلستان میں ایک حسین۔ ملیح و دلربا خاتون سے جس کے سینہ پر بنفشئی پھولوں کا ایک چھوٹا سا گل دستہ مزین تھا۔ میری آنکھیں دوچار ہوئیں۔ تمام دنیا مجھے بدلی ہوئی اور غیر مادی رنگوں سے شاندار معلوم ہوتی تھی حالانکہ اس کی بابت میں خیال کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ قوم و ملت کی دیوار حائل تھی۔ لیکن تاہم میں دیوتاؤں کی طرح خوش رہا۔

اس کے بعد غیر مختتم تاریکی اور مایوسی کا زمانہ آیا۔ ایسی تاریکی جو کہ ضیائے آفتاب کے باوجود بھی عرُوج پذیر تھی اور بعد ازاں فردوس بریں کے گلاب کے پھولوں کی شبنم میں تحلیل ہوگئی۔

میری پیاری کیا تمہیں وہ وقت اور وہ جگہ یاد ہے۔ مجھے مختصر سی بات بھی تفصیل کے ساتھ یاد ہے اور میں اُس وقت تک یاد رکھوں گا جبکہ تمام مادی چیزیں مجھ سے جدا ہو رہی ہوں گی۔

دُنیا مجھے دُور معلوم ہوتی تھی۔ اور بہشت بہت قریب۔ میرے تصور میں تمام تاروں کی جھلملاہٹ کے نیچے چاندنی رات میں کھڑی ہوئی ہو اور شب کی شوکت تمہیں احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ ایک شکستہ دل پرندہ پیپل کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا اور پھول آہیں بھر رہے تھے اور آبشار کی آواز باغ میں سے گزرتی ہوئی ایک ملائم نغمہ کی طرح ہم تک پہونچ رہی تھی۔ ایک تخت نما کرسی پر تم جلوہ گر تھیں اور تمہارے لباس کی زرکاریاں چاند کی شعاعوں میں چمک رہی تھیں اور تمہاری گردن میں جواہرات کا ہار تمہاری پیاری آنکھوں سے زیادہ چمک دار تھا۔ آہ! وہ آنکھیں جو کہ اس قدر تابناک ہونے پر بھی اشکوں سے لبریز تھیں۔ جب کہ میں نے ہمت کر کے اپنے آپ کو تمہارے قدموں پر ڈال دیا تھا اور وہ الفاظ جو کہ میرے لبوں پر تڑپتے تھے میں نے تم سے کہے تھے۔ مجھے وہ اب بھی یاد ہیں میری ملکہ! میری ملکہ! اب مجھے مستقبل اس سے زیادہ اور کیا دے سکتا ہے۔

اور باوجود اس قدر مشکلات کے کہ تم نے میرے پاس آنے کا خیال ظاہر کیا اپنی [illegible] کے

سر پہ ایک زریں تاج رکھا ہے۔

میری جان! میری زندگی تمہاری زندگی کے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہے لیکن میں زندہ رہوں گا۔ غالباً تمہاری شرافت مجھے ناسپاس نہ بنائے گی۔ اور نہ مجھے قطعی نااہل۔ میں تمہارے عطیہ کو قبول نہ کروں گا۔ شاید تمہیں اس کی وجہ معلوم ہو جائے۔ اور اگر معلوم نہ ہو تو تم مجھے اُس وقت تک معاف نہ کرنا جب تک قبر مُنہ کھولے ہوئے مجھ سے بدلہ نہ لے۔ (اس اثنا میں مفقود الخبر ہو جاؤں گا۔) اور اے میری رُوح رواں! شاید تمہارے خیال سے بھی محو ہو جاؤں۔ ایسا کیوں نہ ہونا چاہئے؟

میں نے اپنے دونوں ہاتھ زندگی کی آتشِ فروزاں پر گرم کر لئے ہیں اور مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ اب قریب الختم ہے۔

پیاری میں نے اپنے حسیات تمہارے سامنے صاف طور پر پیش کر دئے اور کشاکش میں کافی حصہ لیا۔ لیکن اب ایسا نہیں کر سکتا ہوں۔

اب میں بجز اس کے اور کیا کر سکتا ہوں کہ میں اپنی بڑھتی ہوئی آرزوؤں اور غیر محدود مصیبتوں کا ذکر کروں یا اپنی مُردہ امیدوں اور تلخ کامیوں کا جو کہ میری رُوح کو مضطرب بنائے ہوئے ہیں۔ . . . . لیکن اب میں خود بیش بہا چیز کو چھوڑ کر صرف اپنے مادرِ وطن کے باشندوں کی پیروی کی خاطر ایک غیر معلوم جگہ کو جلاوطن ہو رہا ہوں۔

اب میں تمہیں کوئی خط نہ لکھوں گا اور نہ میں اس کی معذرت یا معافی چاہتا ہوں۔ مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ میں تمہاری پرستش کرتا ہوں اور ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔

خدا حافظ!!

ڈاکٹر عبدالغفور بسمل

رُباعی

کوئی مرکز تو حسرتوں کا ہے   تھی ضرورت تعین دل کی

ڈوبنے والے پھر ابھرتے ہیں   ڈوب کر حسرتوں میں ساحل کی

(حضرت گیا جہان آبادی)

نوائے سروش

(عطیۂ مولانا ماہر القادری)

جو دل کا درد نمایاں نہیں تو کچھ بھی نہیں — گلوں کا چاک گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ضمیر صاحبِ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں — جو اپنی ذات کا عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہوا میں جنبشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں — شمیمِ گل جو پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
قسم خدا کی غلامی سے موت اچھی ہے — تو اپنے وقت کا سلطاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ علم و حکمت و دانش کی بزم آرائی — یقیں کی شمع فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد ہزار بنائے نئے نئے دستور
جو اس میں حکمتِ قرآں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک رُوسی مستشرق

اِگناتی کراچ کوفسکی

(از جناب ل احمد صاحب اکبر آبادی)

اِگناتی کراچ کوفسکی ایک بلند پایہ مستشرق ہے اور اس کا شمار دنیا کے بہت بڑے ماہر عربیات میں ہوتا ہے۔ عربی ادب لسانیات اور جغرافیہ اس کے خاص موضوع ہیں۔ اس وقت کراچ کوفسکی کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ حال میں سویٹ حکومت نے کراچ کوفسکی کو اس کی علمی عظمت خدمت کے اعتراف میں "آرڈر آف لینین" کا برترین تمغہ عطا کیا ہے۔ اس موقع پر سویٹ اخبارات میں کراچ کوفسکی کے متعلق متعدد مضامین شائع ہوئے، اردو داں پبلک کے لئے جن کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

کراچ کوفسکی سویٹ روس کی جامعۂ علوم (اکیڈمی آف سائنسیس) کا اور دمشق کی جامعۂ علوم کا ممبر ہے، سویٹ ماہرین عربیات کی انجمن کا ڈین ہے اور پوری سویٹ یونین کے جغرافیین کی سوسائٹی کا وائس پریسیڈنٹ ہے۔

وہ عربی ادبیات کے کسی خاص دور یا عہد پر نہیں بلکہ ہر زمانے پر سند مانا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی ادبیات و جغرافیہ بلکہ عام مسلم کلچر کے متعلق بھی کراچ کوفسکی کی رائے مستند ہے۔

کراچ کوفسکی نے سنٹ پیٹرسبرگ (اب لینن گراڈ) یونیورسٹی سے عربی ادبیات کی سند حاصل

کرنے کے بعد بیروت اور پھر قاہرہ چلا گیا، اور وہاں کے دارالعلوم میں تعلیم مکمل کی۔ برسوں اور مستند ماہروں کے لکچروں میں شریک رہا اور سندیں حاصل کیں۔ اس طرح کامل دو سال تک تحصیل و تکمیل علم کرتا رہا اور پھر اسکندریہ و دمشق کے کتب خانوں میں بیٹھ کر بوسیدہ اوراق پریدہ پری کی اور مردہ صدیوں کے دھندلکوں میں روشنی کی تلاش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ادبیات عرب کے مطالعے کا ایک نیا زاویہ ڈھونڈ نکالا۔

کراچ کوفسکی سے پہلے تک دنیا کے عالم و مستشرق اس بات پر بلا بحث اور روایتی طور پر متفق الرائے چلے آ رہے تھے کہ عربی ادبیات میں قابل مطالعہ و مستحق تحقیق قدیم یا ازمنہ متوسط کے شعرا و ادیب ہیں۔ عہد جدید کے شعر و ادب پر توجہ دینا سنجیدہ علمیت کے درجے سے گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ عربی ادبیات پر جتنی کتابیں اور مقالے شائع ہوتے تھے ان میں وہی زیادہ موقر سمجھے جاتے تھے جو قدیم تر عربی ادب سے بحث کرتے ہوں۔ کوئی کتاب یا رسالہ جتنا قریب تر زمانے کے عربی ادب سے متعلق ہوتا اتنا ہی کم توجہ حاصل کر سکتا تھا۔

اس کی اپنی یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۱۰ء میں کراچ کوفسکی کو لکچروں کے ایک سلسلے کی دعوت دی تو اس وقت کراچ کوفسکی کی عمر چھبیس ۲۶ سال کی تھی۔ اس دعوت کو منظور کر کے اس نے اپنے پہلے لکچر کا موضوع "جدید عربیات میں تاریخی ناول کا درجہ" مقرر کیا۔ اس اعلان کو سن کر روسی دار الحکومت کے تمام مستشرق حیران رہ گئے۔ اس لئے کہ علم کے کسی شعبے میں مسلمہ عقائد اور روایات کے خلاف بدعت کرنا بڑے سے بڑے عالم کے لئے روا نہ تھا۔ پھر خاص کر ایسے موضوع کے باب میں جن کے متعلق کبھی کوئی اختلافی آواز اٹھی ہی نہ ہو، کوئی بدعت کیسے روا رکھی جا سکتی تھی۔

بالآخر وہ دن آیا اور بڑے بڑے ساونت و مستشرق لکچر ہال میں اس لئے پہنچے کہ نوجوان کراچ کوفسکی کی بدعت یا بت شکنی دیکھیں۔ علم و تحقیق کے ان متشکلین کو سان گمان بھی نہ تھا کہ آج ان کی موجودگی میں عربی کے مطالعے کے لئے ایک نیا میدان کھل جائے گا، اور انیسویں بیسویں صدی کے عربی ادب میں احیائے ثانی کے منضبط مطالعے اور باقاعدہ تحقیق کی بنیاد پڑ جائے گی۔

کراچ کوفسکی نے اپنے لکچر میں اس روایتی عقیدے کو باطل ٹھہرایا کہ جدید عربی ادبیات کا مطالعہ علمیت اور تحقیق کے رتبے سے گری ہوئی بات ہے۔ اس نے بتایا کہ لیٹن کی طرح عربی زبان ایک وقت پر یا ایک منزل میں پہونچ کر مردہ نہیں ہو گئی ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ عربی ادب نے کسی دور میں بھی زندگی کی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کی۔ عربی ادب ہر زمانے میں زندگی کے بروز

ے دو چار [illegible] ہے، اور آج کے زندہ دوزی جات [illegible] میں بھی زندگی سے بھر پور ہے۔ عربی زبان کے متعلق یہ گمان کر لینا کہ وہ صدیوں سے مردہ ہو چکی ہے، کم نظری کی دلیل اور علمیت کی شان کے خلاف ہے۔ ماضی قریب اور زمانہ حال کے عرب شاعر و ادیب اور عربی مشرق کے نئے اہل قلم جدید خیالات کے حامل اور مستقبل کے متعلق ترقی پذیر عندیات کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں فناعتی قدریں ہیں اور اُن کے اندر سماجی مقصد منظر عام پر لائے گئے ہیں۔

کراچ کوفسکی نے اپنے اس نظریے کی تائید و تصدیق میں قاسم امین کی "جدید عورت" اور طہٰ حسین کی "خود نوشت حالات زندگی" کو روسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا (طہٰ حسین ایک نابینا عالم، ترقی پسند مصنف اور ممتاز شخصیت کا مالک تھا)۔ ان مصنفوں پر کراچ کوفسکی نے مقالے اور رسالے لکھے جن سے علم و سائنس کی مغربی دنیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ حد یہ ہے کہ مشرقی علما و محققین نے کراچ کوفسکی کو جدید عربی ادبیات کے مطالعہ و تحقیق کا بانی و موجد تسلیم کیا، اور دمشق کی جامعۂ علوم نے اسے اپنا ممبر بنایا۔

کراچ کوفسکی کی تصنیفات کا شمار ریاز سو تک پہونچتا ہے۔ تصنیف کی یہ طویل فہرست کسی آدمی کی بھی عالمانہ حیثیت قائم کرنے کے لئے کافی ہے بہت زیادہ ہے لیکن اس کا رتبۂ علم و فضل اس حقیقت سے بہت زیادہ بلند ہو جاتا ہے کہ عربی ادبیات سے بحث کرتے ہوئے کراچ کوفسکی کا حوالہ ناگزیر ہو گیا ہے۔

اس کی عالی مرتبتی کی ایک مزید وجہ یہ بھی ہے کہ آج تمام سوویت ماہر عربیات اور دوسرے ملکوں کے بہت سے مستشرق کراچ کوفسکی کے شاگرد ہیں۔

تصنیف و تالیف کی اتنی لمبی فہرست یہ ثابت کر دیتی ہے کہ کراچ کوفسکی ایک ان تھک کام کرنے والا آدمی ہے۔ مگر اس کی مشغولیت تصنیف و تالیف تک محدود نہیں، وہ یونیورسٹیوں میں لکچر بھی دیتا رہتا ہے، عام مجمعوں میں بھی تقریروں کے لئے مدعو کیا جاتا ہے اور بے شمار استفسارات کے جواب دینا بھی اس کی زندگی کا روزمرہ ہے۔

پرانے روس میں علم کے مرکز دو تھے۔ سینٹ پیٹرسبرگ، ماسکو اور کازان۔ سوویت عہد میں بہت سے مرکز بن گئے ہیں۔ ازبکستان میں تاشقند، آذربائیجان میں [illegible] اور قازقستان میں الما آتا [illegible] علم کے مرکز اور [illegible] عربیات [illegible] بنے ہوئے ہیں۔

کراچ کوفسکی کی علمی خدمات میں ایک روشن کارنامہ یہ ہے کہ وہ تنہا اور پہلا مستشرق ہے جس نے جنوبی عرب کے تقریباً دو ہزار سال پرانے مسودے پڑھے، سمجھے اور شائع کیے۔ یہ مسودے قدیم ترین شعر و ادب کے نمونے تھے جن کو سوویٹ حکومت نے حاصل کر کے محفوظ کر لیا ہے۔ ان نادر و نایاب مسودوں کا ترجمہ و اشاعت حقیقتاً ایک عالمگیر واقعہ ہے۔

کراچ کوفسکی کا ایک دوسرا بڑا کارنامہ اس کی وہ کتاب ہے جس کا نام "عربی مخطوطات" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی علمی کتاب تحقیق کے چند علماء و مستشرقین ہی کے لئے دلچسپی کی چیز ہو سکتی ہے۔ لیکن طرز تصنیف کا یہ ایک معجزہ کہا جائے گا کہ کراچ کوفسکی کی یہ کتاب عام پڑھنے والوں کے لئے بھی اتنی ہی دلچسپی کا باعث ہے جتنی ایک محقق عربیات کے لئے ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ایک افسانے کے برابر دلچسپ اور مسحور کن ہے۔ اس کا انداز بیان دلکش اور عبارت دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا عہدِ ماضی کے علماء و مستشرقین کی تصویریں اس طرح دیکھتا ہے جیسے سینما کی تصویریں۔ کراچ کوفسکی نے اپنی اس تصنیف میں اُس انہماک کی تصویریں کھینچی ہیں جو ایک تحقیق یا ریسرچ کرنے والے کو اپنے کام میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا پڑھنے والا ہر صفحے پر خود کراچ کوفسکی کے شغف اور ولولۂ کار کو دیکھ لیتا ہے اور اس کے قول کی تائید کرتا ہے۔ کراچ کوفسکی نے ایک مقام پر لکھا ہے:۔

"پرانے قلمی مسودے اپنے راز چھپائے رکھنے کی زبردست کوشش کرتے ہیں اور جس وقت تک تحقیق کرنے والے کی تمام قوتوں پر غالب نہیں آ جاتے اپنے راز ظاہر نہیں ہونے دیتے ہیں۔ ایک محقق اگر مطالعے میں ڈوب جا نہیں سکتا تو وہ ان مسودوں کے مصنفوں کے بھید بھی نہیں پا سکتا۔"

کراچ کوفسکی کے اس بیان کا ثبوت سغدیانی مخطوطے کا واقعہ ہی جو اس پر گزرا تھا۔

۳۴ء میں سوویٹ مستشرقین کی ایک جماعت تاجکستان کی سیاحت سے ماسکو واپس پہونچی تو اپنے ساتھ چمڑے کا ایک ٹکڑا بھی لائی جس پر کچھ عربی عبارت لکھی تھی۔ یہ مخطوط تقریباً ایک ہزار سال پرانا ہے۔ کراچ کوفسکی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس وقت وہ بستر علالت پر پڑا تھا۔ لیکن اس خبر کو سنتے ہی وہ اپنی بیماری کو بھول گیا۔ بستر سے اٹھا، کپڑے پہنے، اور سیدھا اکیڈمی کو ہو لیا۔ اکیڈمی میں پہونچ کر اس چرمی مخطوطے کا معائنہ کیا۔ کراچ کوفسکی جانتا تھا کہ ساری دنیا میں چرمی مخطوطوں کی تعداد صرف چھ ہے، اس لئے اسے اس نئی دریافت کے واقعی اور مستند ہونے میں شک تھا۔ لیکن مسودہ دیکھنے کے بعد اس کے پڑھنے اور

تحقیق کرنے میں ہلاک ہوگیا۔

اس تحقیقات کی درجہ بدرجہ ترقی کا حال اُس نے اپنی اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ایک تبصرہ نگار لکھتا ہے کہ:۔

"کراچ کوفسکی کے اس بیان کو پڑھنے سے اس شدید ہیجان کا پورا احساس ہوجاتا ہے جس میں کہ کراچ کوفسکی اُس وقت خود مبتلا تھا، اس سے کہ پڑھنے والا خود بھی ایسی ہی ہیجانی کیفیت کا شکار ہوجاتا ہے، وہ بھی کراچ کوفسکی کی طرح مبتلائے طلسم بن جاتا ہے۔"

اس چرمی مخطوطے میں ایک لفظ "دِیْواستی" (DIVASTI) بھی تھا جس نے کراچ کوفسکی کو سخت الجھن میں ڈالے رکھا۔ ایک دن اسے اچانک خیال آیا اور وہ دوڑا ہوا "انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیالوجی" پہنچا۔ وہاں اس نے عربی لغت کی کتابیں الٹنا شروع کردیں۔ اور بالآخر اس لفظ کی صحت ہوگئی۔ کراچ کوفسکی خود کہتا ہے کہ:۔

"اگر بیس سال پہلے کا زمانہ ہوتا تو اس لفظ کی صحت کر لینے کے بعد میں سیڑھیاں اُتر کر نہ آتا بلکہ زینے کے جنگلے پر سے پھسلتا ہوا اُترتا۔"

کراچ کوفسکی اس لفظ کی تصدیق کر لینے کے بعد ہانپتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس پہنچا اور بتایا کہ:۔

"وہ چرمی مخطوطہ مستند ہے اور اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس زمانے کا یہ مخطوطہ ہے، اُس وقت کے سغدیانی حکمران کا نام دِیْواستی تھا۔"

اس تصنیف میں کراچ کوفسکی نے دنیا کے مشہور و معروف مستشرقین کے درجے اور مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"جو اور بہت سے تحقیق کرنے والے ہو گزرے ہیں جن کے نام بھی ہم تک نہیں پہنچے، ان کی علمی خدمات بھی کم درجہ نہیں ہیں، اس لئے کہ آنے والے محققوں کے لئے جو آج اپنی کاوشوں سے انسانی کلچر کی ترقی کا سبب ہوئے زمین تو ان گمنام تحقیق کرنے والوں ہی نے تیار کی تھی۔"

ابوالعلا کی عربی شاعری کو دقیق ترین مانا گیا ہے۔ اس کے شارح ہونے کی حیثیت سے کراچکوفسکی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور کارنامۂ عظیم وہ تحقیق و تدقیق ہے جو ں منسوب بہ جزیرہ نشین پر کی اور جس پر کراچ کوفسکی سے سند لی جاتی ہے۔

لہ [illegible]

لیکن عربیات کی تحقیق و تفتیش کے معاملے میں دوسرے مستشرقین کی طرح کراچ کوفسکی ایک عالم
ین اور خشک سائنسداں نہیں ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے عربی شرق سے ایک
ی لگاؤ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا بچپن ازبکستان میں گزرا تھا جو کسی زمانہ
ں عرب خلافت کے اندر شامل تھا۔ بعد کے زمانوں میں عربی ملکوں سے کراچکوفسکی کے تعلقات قائم
دنا اور ذاتی دوستیاں بھی ہو جانا اسی لگاؤ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

آج کل بھی کراچ کوفسکی ایک نہایت اہم تصنیف میں مصروف و منہمک ہے۔ وہ عربی دنیا
ند سوویٹ یونین کے درمیان کلچری رشتے کی تلاش و جستجو کر رہا ہے۔ اپنی تحقیق کا راستہ روشن
رنے کے لئے اس نے قفقاز کی عربی تاریخوں کا منضبط مطالعہ کیا ہے۔ چودھویں، پندرھویں
بدی میں عرب لوگ قفقاز کے ایک حصے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کراچ کوفسکی نے ان کی زبان
بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور ماسکو میں بیٹھا ہوا اس تحقیقاتی غرض سے روسی زبان کے عربی الاصل
لفاظ کی ایک فرہنگ بھی طیار کر رہا ہے۔

کراچ کوفسکی کی یہ نئی تصنیف نہایت اہم تحقیقات پیش کرے گی جو پڑھنے والوں کو
یک مارتے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں کی سیر کرا دے گی۔ اور اس تحقیقات سے یہ بڑی
حقیقت از سر نو سامنے آجائے گی کہ انسانی کلچر بنیادی طور پر ہم رشتہ ہے۔ ہر دم متغیر ہونے کے باوجود
فانی ہے اور ایک ہی چیز ہے جو بدلتی بھی رہتی ہے۔

اس جنگ عالمگیر ۲ میں جب لینین گراڈ کو فاشی حملہ آوروں نے محاصرے میں لے لیا، تو
سویٹ حکومت کراچ کوفسکی کو کسی ایسے محفوظ مقام پر بھیج دینا چاہتی تھی جہاں وہ سکون کے
ساتھ اپنا علمی شغل جاری رکھ سکے۔ مگر کراچ کوفسکی نے لینین گراڈ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ پھر جب
یہاں کے مختلف علمی اداروں کے سائنسی، تاریخی، اور کلچری خزانوں کی حفاظت کا سوال پیدا
ہوا تو لینین گراڈ اکیڈیمی نے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا اور کراچ کوفسکی کو اس کا صدر
بنایا۔ چنانچہ اس پیر جواں ہمت یا جواں پیر سال نے لینن گراڈ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں
کے تمام نوادر محفوظ مقامات پر پہونچانے میں ان تھک کام کیا اور تمام مشرقی مخطوطے اور
ادارۂ شرقیات (انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیالوجی) کے کتب خانے کی خاص حفاظت کی۔
اس اہم مصروفیت کے ساتھ اپنی تصنیف "عرب جغرافیہ داں" کے بارہ باب بھی مکمل
کئے۔ اور یہ سب کچھ اس حالت میں کیا جب لینن گراڈ کے لوگ بھوک یا دشمن کے گولوں کا

کثرت سے شکار ہو رہے تھے۔

یننن گراڈ اکیڈیمی آف سائنسس نے ان تمام لوگوں کو اعزاز تقسیم کئے جنھوں نے
یسے نازک وقت میں علم وفن کی خدمت میں اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور اس طرح کلچری
ادر کو محفوظ کیا تھا۔ اس فہرست میں پروفیسر کراچ کوفسکی کا نام سب سے اوپر درج تھا۔

ل۔احمد

ُدنیا میں چاہا وہ اکثر نہ پایا — وفا کا کسی کو بھی خوگر نہ پایا
نگ و دو بہت کی زمانہ میں ہم نے — بہت کچھ کیا پھر بھی کچھ کر نہ پایا
مرے عمر بھر جستجو میں ولیکن — سوا اک لحد کے کوئی گھر نہ پایا
ست واعظوں کو بہت صوفیوں کو — جو دیکھا تو اپنے سے بہتر نہ پایا
ھیں سب سے بدتر سمجھتی تھی دُنیا — اُنھیں ہم نے برتا تو بدتر نہ پایا
ت جستجو کی ۔ مگر ہم نے کوئی — تغزل میں حسرت کا ہمسر نہ پایا

تمنا میں مرنے کی اے وَرد تو نے
بہت سر کھپایا مگر مر نہ پایا

(علامہ سید عبدالودود وَرد مرحوم بریلوی)

کاروان پیداست

(از جناب رشید احمد صاحب صدیقی)

"اِس دَور میں دو ہی ایسی ہستیاں ہیں جن کی شہرت اور قدردانی، موت کی پابند اور منتظر نہ رہی۔ ایک مولوی عبدالحق، دوسرے رشید احمد صدیقی۔ اِن کی ادبی عظمت جو آج ہے اُس سے زیادہ کل ہوگی ـــ اِسے ہندوستان کی روائت پرستی کہیے ـــ!

اُردو ادب میں دو ہی ایسی شخصیتیں ہیں جن کا آج تک صحیح مقام متعین نہیں کیا جاسکا۔ شاعروں میں انیس (مرحوم) اور زندوں میں رشید احمد صدیقی ـــ!

انیس کو مرثیہ گو کہہ کر اس کی ہمہ گیر شخصیت کو محدود کرنا ہے۔ اُسی طرح رشید احمد صاحب کو مزاحیہ نگار یا طنز نگار کہہ کر اُن کی ادبی ہمہ جہتی کا استخفاف کرنا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مزاح یا طنز نگاری کوئی آسان کام ہے۔ بلکہ اس سے یہ مدعا ہے کہ مزاح اور طنز کی دیواروں میں ان کو کیوں قید کیا جائے ـــ ادب کی بسیط فضا میں ان کے اور بھی تو مقامات ہیں ـــ!

رشید احمد صدیقی اِس دَور کے سب سے بڑے مضمون نگار ہیں

اُردو میں اِس صنفِ ادب کی بڑی کمی ہے۔ سرسید اور ان کے رفیق اِس اسلوب کے موجد بھی ہیں اور موسس بھی۔ ان سے پہلے کے لکھنے والے Fssayist کی تعریف میں نہیں آتے۔ سرسید اور محمد حسین آزاد نے خصوصًا اِس فن کو جِلا دی۔ یہ سب کے سب اڈیسن اور اسٹیل کے خوشہ چین ہیں۔ ان کے دماغ کے پردوں پر Spectator کا گہرا عکس ہے۔ سرسید کی " امید کی خوشی " اور " بحث و تکرار " کامیاب اور غیر فانی تمثیلیں ہیں۔ اِسی طرح نیرنگِ خیال میں آزاد نے بعض نمایاں اور خوشگوار نقش چھوڑے ہیں۔ ان کے بعض مضامین Allegory کے ذیل میں

آتے ہیں۔ اِن کا ڈانڈا بھی Spectator ہی سے جا ملتا ہے۔ اِس موضوع پر اڈیسن کے دو غیر فانی شاہکار Vision Of Mirza اور Dream میں جو انگریزی ادب میں آج بھی بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں ——!

نذیر احمد ناول نگار تھے، مضمون نگار نہیں، ان کی ناول نگاری کی حیثیت بھی محتاجِ بحث ہے۔ شبلی سب کچھ تھے لیکن اُنھیں مضمون نگار نہیں کہا جا سکتا۔ اِسی طرح حالی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ——!

۱۸۷۷ء سے اُردو ادب کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ اِسے مزاحیہ نگاری کا آغاز کہہ لیجیے۔ اودھ پنچ نے بقول چکبست "زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اُٹھائی"۔ منشی سید سجاد حسین کے رفیقوں میں، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، مولوی سید محمد عبد الغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، سید اکبر حسین، مولوی احمد علی کسمنڈوی، اودھ پنچ کے منت کش ہیں۔ اودھ پنچ کے دورِ اوّل کے لکھنے والوں میں سرشار، اکبر اور آزاد تھے۔ اُس کے بعد کے عہد میں سید مقبول حسین صاحب ظریف اس کے بہترین علم بردار رہے (۱۹۱۳ء میں اودھ پنچ بند ہو گیا۔ دو سال بعد حکیم ممتاز حسین صاحب نے مولانا جسٹس کرامت حسین صاحب مرحوم کے مشورہ سے اودھ پنچ کو نئے سرے سے شائع کیا)۔

منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ جس زمانہ میں اپنے پورے شباب پر تھا، اُسی زمانہ میں ریاض (خیر آبادی) کا "ریاض الاخبار" گورکھپور سے بڑی آب و تاب سے نکل رہا تھا۔ فتنہ اور عطر فتنہ ریاض الاخبار کے ساتھ نکلا کرتے تھے۔ فتنہ کے خاص لکھنے والوں میں خود حکیم برہم (مرحوم) علی اصغر آزاد چشتی اور ع۔ک۔ آزاد مرحوم تھے۔

پنچ اور فتنہ کی آوازیں دھیمی پڑنے لگی تھیں کہ کچھ لوگ اِس میدان میں بڑے تیوروں کے ساتھ اُترے۔ سید محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں، اور سلطان حیدر جوش ——!

ہمدرد (دہلی) میں تجاہلِ عامیانہ کے ماتحت، نقیب میں ملا بو دھالوئی اور علیگڑھ میگزین میں شمع بے نور کے نام سے سید صاحب کے بڑے ہی دل کش اور زعفران زار مضامین نکلے۔ جن کو ہمیشہ "اندازِ قدر" سے پہچانا گیا۔

مولانا ظفر علی خاں طنز نگار کے ذیل میں (شاعرانہ حیثیت سے قطع نظر) آتے ہیں ——!

سلطان جوشش کے ساتھ ساتھ ولایت علی بمبوق کا نام آتا ہے۔ ان کا مشہور مضمون "پٹواری" اور جوش کے اکثر مضامین علی گڑھ کی فضا میں پھولے پھلے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم، لطیف الدین احمد اکبر آبادی اور نیاز (فتح پوری) نے بھی بعض اچھے "مضامین" لکھے۔ خصوصاً یلدرم اور نیاز نے Light Literature کے بھی بعض اچھے نمونے پیش کئے۔ یلدرم اور نیاز دونوں کی تحریروں کو بوجھل ترکیبوں، ترکی، فارسی اور عربی کے شدید اثر نے کہیں کا نہ رکھا۔ اس لئے آج زمانہ اُن کا متحمل نہیں ہوتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی کا قلم تاریخ، فلسفہ، مذہب اور تفسیر میں خوب کھل کھیلتا ہے۔

قاضی عبدالغفار بھی اسی حلقہ میں ہیں۔ اسی حلقہ میں رہتے ہوئے بھی ان کا اپنا ایک مخصوص دائرہ ہے۔ یہ اِن سے دُور بھی ہیں اور قریب بھی —!

اب اس موجودہ دَور میں مزاحیہ نگاروں کی فہرست میں منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے اُردوؤں سے لے کر پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم چغتائی، شوکت تھانوی، ملا رموزی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں . . . .

سید امتیاز علی تاج (چچا چھکن کی وجہ سے) میاں محمد اسلم (مرزا کی وجہ سے) اور فلک پیما بھی بعض مضامین لکھ کر اس محفل میں شریک ہو گئے ہیں . . . .

. . . .

آپ نے دیکھ لیا ان میں سے بعض مزاحیہ نگار ہیں، بعض طنز نگار، کچھ فکاہی مضامین لکھتے ہیں، کچھ مطائبات کے علم بردار ہیں . . . .

مضمون نگار نہیں ہیں اور اگر ہیں تو بہت کم —! میں "مضمون نگار" جب کہتا ہوں تو میرا ذہن اس کے مترادف انگریزی لفظ Essayist کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس لفظ کے ساتھ فرانسس بیکن سے لے کر، ولیم ہزلٹ، چارلس لیمپ، اڈیسن اور سٹیل، اسٹی ون سن، چسٹرٹن، برٹرنڈ رسل، آرنلڈ بینٹ، اور ہکسلے تک کے بھی نام میرے دماغ کے پس منظر میں آ جاتے ہیں . . . .

مہدی افادی، سجاد انصاری اور رشید احمد صدیقی کو حقیقی معنوں میں "مضمون نگار"

کہا جاسکتا ہے۔ اِن میں رشید احمد صدیقی کا پایہ سب سے بلند ہے اس لئے کہ . . . ."

"مزاح اور طنز ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دُور ہیں۔ مزاح اور طنز کی سرحدیں ایک دوسرے کو چھوتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔

مزاح میں ایک معتدل سنجیدگی اور طنز میں ایک خوشگوار تلخی ضرور ہونی چاہئے۔ مے سے سرور ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن تلخی شراب کی جان ہے۔ یہ نہ ہو تو شراب شراب نہ رہے۔

طنز میں زہرناکی بھی بری نہیں اگر وہ حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔ اس کی کامیاب مثال "لیلیٰ کے خطوط" ہے۔ اِس کے برخلاف سجاد انصاری "محشرِ خیال" میں اعتدال کی حدوں کو توڑ پھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ مذہبی موشگافیوں سے قطع نظر، سجاد کی طنز میں گستاخی اور شعلہ سامانی زیادہ ہے۔ وہ خود آگ سے کھیلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کھیل میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ . . . . محشرِ خیال اردو ادب میں طنز کی انتہائی صورت ہے۔

اِسی طرح مزاح ادب کی ایک نازک اور لطیف صنف ہے۔ ذرا سی بے پروائی سے اِس آبگینے پر بال پڑ جاتے ہیں۔ مزاح ظرافت کی ایک ارتقائی منزل ہے۔ ظرافت سے ایک قدم پیچھے ابتذال کی وادی ہے۔ اور اِس منزل سے ایک قدم آگے طنز کی سرحد ہے۔ مزاح اور طنز ایک دوسرے کے ساتھ لیکن متوازی چلتے ہوئے "ہجو" کی راہ اختیار کرلیتے ہیں۔ ہجو، مزاحیہ بھی ہوسکتی ہے اور طنزیہ بھی۔ دونوں میں صرف لب ولہجہ کا فرق ہے۔
غرض طنز یا مزاح بڑی خطرناک سرزمین ہے۔ ذرا لغزش ہوئی اور لکھنے والا کہیں کا نہ رہا . . . . ."

۹ ـ مثال چاولوں کی طرح مضمون نگاری ذو برکت ہے۔

"خندہ (Laughter) کیا ہے؟ ارسطو کے زمانہ سے آج تک فلسفی اِس مسئلہ پر غور کرتے آئے ہیں۔ کانٹ (Kant) سپنسر (Spencer)

لپس (Lipps) میرے ڈتھ (meredith) برگساں (Bergson) نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور عجیب نادر نکات پیش کئے ہیں۔

خندہ لاتعلقی کی علامت ہے۔ زندگی کو جو شخص دُور سے دیکھتا ہے اور خود بے پرواہ رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اُس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا . . . .

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطفِ خواب کی علامت ہے۔ اطفال شیرخوار سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں . . . .

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے۔ اِس مسئلہ پر برگساں اپنی کتاب خندہ "Le-Rire" کے خاتمہ پر لکھتا ہے:۔

> "قہقہہ زندگی کے سمندر کا کف ہے۔ جو شخص اس کے رقص کو فاصلے سے دیکھتا ہے، خوش ہوتا ہے۔ لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب کھاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے . . . . "

"رشید صاحب نے زندگی کو دُور سے نہیں، بہت ہی قریب سے بلکہ اُس میں ڈوب کر دیکھا ہے۔ اس لئے وہ ہنستے نہیں، زندگی کے "فریب" اور اُس کی "تلخ کامیوں" سے روتے بھی نہیں، اِس کے "رقص" کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی زہرخند ضرور جھلک آتا ہے، اون کی تحریروں کو پڑھ کر اگر کچھ لوگ ہنستے ہوں تو یہ رونے کا مقام ہے . . . . وہ رونے کی بھی تلقین نہیں کرتے . . . . . . وہ خود بھی تو نہیں روتے . . . . وہ فطرتِ انسانی کے ایک ماہر نباض ہیں۔ وہ کائنات کی نبض چھوتے ہیں، دکھتی ہوئی رگیں خود اُن کی انگلیوں سے مس ہو جاتی ہیں۔ اِس لمس سے وہ خود متاثر نہیں ہوتے (کم از کم ظاہر تو ایسا ہی کرتے ہیں) مگر اُن کے پڑھنے والے اگر کوئی اثر لیتے ہوں اور رونے بھی لگتے ہوں تو یہ مصنف کی نہیں ناظر کے صبر اور ضبط کی شکست ہے ——— یہی تو رشید صاحب کا سب سے بڑا کمال ہے!

رشید صاحب کا ایک اپنا اندازِ فکر ہے۔ وہ فکر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ زندگی کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی۔ تنقید میں اگر مزاح یا

قلم کی رو میں آجاتے ہیں تو اس سے انھیں صرف مزاح یا طنز نگار تو نہیں کہا جا سکتا۔ رشید صاحب، اڈیسن اور اسٹیل کی طرح سوسائٹی کے بہترین نقاد ہیں۔ وہ ایک فلسفی کی نظر اور ایک مفکر کا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب نظر اہلِ قلم ہیں۔ مزاح یا طنز تو فروعی چیزیں ہیں جو اُن کے اسلوب کے ساتھ آجاتی ہیں۔ مزاح یا طنز سے رشید صاحب کا رتبہ نہیں بڑھتا، مزاح، اور طنز کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ ....

"..................................

"چسٹرٹن اور برنارڈ شا (Paradox) کے امام ہیں اور (Pithy) فقرے کہنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔ رشید صاحب بھی ایسے ہی پُرمغز اور معنی آفریں فقرے ایسے چپکے سے لکھ جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والوں کی اُن پر نظر تک نہیں پڑتی۔ ان چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایسی باریک اور فلسفیانہ بات چھپی ہوتی ہے جسے پاکر سنجیدہ طبائع جھوم اُٹھتے ہیں:۔

"عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کو منتخب کیا..."

"محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا۔ خود موت پر کیا گزری ہوگی[1]......"

"زندہ رہنے میں ارادہ کو بڑا دخل ہے[2]......"

"نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔"

"میرے نزدیک ہر ایک راز کی ایک عمر ہوتی ہے جس کے بعد اس کو صیغۂ راز میں رکھنا بد مذاقی ہے۔"

"میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب وعدہ کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا سلام علیکم۔ میں نے کہا وعلیکم۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے......"

---

[1] جولیس سیزر کی موت پر ایک انگریزی کے مصنف نے کیا اچھی بات کہی:۔

When Great men die even Nature feels shock:

Life is a firm determination. [2]

نقاد کا ایک خوشگوار فرض یہ بھی ہے کہ وہ جو بات کہے اس خوبصورتی سے کہے کہ پڑھنے والے کے دل میں کھُب کے رہ جائے۔ کبھی کبھی رشید صاحب دو چار لفظوں میں ایسی جامع اور مکمل بات کہہ جاتے ہیں کہ ساری تنقید سمٹ کر آجاتی ہے :۔

"میں انیس کو اردو کی آبرو سمجھتا ہوں۔"

(محمد علی) لکھتے تو معلوم ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔"

الگ الگ ہر ایک کا ذکر کرنے کے بعد صرف ایک فقرے میں ان سب کی طنز کو لپیٹا ہے:۔

"ان تمام خیالات کو اور مختصر کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً مولانا ماجد اصلاح سے مایوس، ابوالکلام اصلاح سے بے نیاز، ظفر علی خاں آمادۂ اصلاح، قاضی عبدالغفار ان سب کے حدِ اوسط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"شوکت (تھانوی) میں "شگفتگی" ضرور ہے لیکن ابھی "شگفتہ نگاری" پر پوری قدرت حاصل نہیں ہے۔"

"ملا رموزی صاحب کی تحریروں میں ایک چیز اکثر کھٹکتی ہے اور اس چیز کا احساس سوائے ملا صاحب کے ہر ایک کو ہے یعنی وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اُچھالنے کی زیادہ فکر کرتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کے سبب ان کی بہترین ظرافت بدترین طنز اور بہترین طنز بدترین ظرافت میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چغتائی صاحب کی مانند فرحت صاحب کو بھی جزئیات خوب سوجھتی ہیں اور یہی چیز صحیفۂ ظرافت میں "جان سخن" بھی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ فرحت کی سوجھ میں بوجھ کو بھی دخل ہے اور چغتائی کو صرف سوجھتی ہے لیکن خوب سوجھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

آخر میں یہ چند "ٹکڑے" منھ کا مزہ بدلنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ رشید صاحب کا ایک یہ بھی انداز ہے اور خوب ہے کہ ایک ہی سانس میں دو ایسی متضاد باتیں کہہ جائیں گے جن کا

آپس میں کوئی ربط نہ ہو اور ایک ہی فقرے میں دو ایسے لفظ رکھیں گے جن کا ایک دوسرے سے دُور کا بھی علاقہ نہ ہو ـــــ تضاد سے بات میں خوبی اور گہرائی پیدا کرنا تو بس رشید صاحب پر ختم ہے۔ اِس رو میں کہیں کہیں ایسے مقام بھی آ جاتے ہیں جہاں زیرِ لب تبسم کے بجائے دانتوں میں انگلی دبانا پڑتی ہے۔ لیکن کیا مجال جو رشید صاحب مبتذل ہو جائیں۔ چاہے وہ "چارپائی کے "نازک مراحل" ہوں یا "ارہر کے کھیت" کے "معاشرتی مسائل" ـــــ!

"مجھ کو مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔"

"عطاء اللہ خاں بھی عجیب و غریب شخص تھے .... دُنیا سے ڈرتے تھے اور ایک لڑکی پر عاشق تھے..."

"آم کی فصلیں اور کالج کی تعطیلیں آتی رہیں اور گزرتی رہیں۔ تا آنکہ مرشد نے مردم شماری کی رپورٹ میں تابڑ توڑ دو تین غلطیاں کیں........"

مرشد اور مولوی نصیر الدین صاحب علوی "سنّتِ غسل" پر ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ آدمی دونوں کرتے تھے اور دونوں کو "غسل" کے بعد ایک ہی کام کرنا تھا یعنی مولانا محمد علی کی تقریر کا جواب دینا۔ آخر رشید صاحب بیچ میں پڑے۔ رفع شر کیا۔ ایک چھوٹی سی شرط لگا کر الگ ہو گئے اور چپ کر دیا:-

"کل صبح تک مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اِس درمیان میں کسی کو "حقِ غسل" پیدا ہوا تو خیر ورنہ کل صبح غسل خانہ آپ دونوں پر بند!"

"صورت دیکھئے تو سقراط اور حرکات دیکھئے تو ظہور وارڈ[1]"

"عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ

---

[1] اس بات کو اب تو ایک مدت گزر گئی۔ اب رشید صاحب کو لفظوں کی نشست میں کچھ ہیر پھیر کرنا پڑے گا۔ مثلاً:-
"حرکات دیکھئے تو سقراط اور صورت دیکھئے تو ظہور وارڈ"

ہوا، جیل خانہ، اسپتال، فنونِ لطیفہ، مضمون نویسی، اوکاسا، وصیت نامہ اور پاگل خانے غرض کہ تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ہندوستان کی سرزمین دو ہی چیزوں کے لئے موزوں ہے ۔ مہابھارت یا ارہر کا کھیت "

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شادی، بیاہ، داروغہ، پٹواری، زیور سے لے کر حمل، بچہ اور بچھیا تک کے نازک مسائل اس زنانہ پارلیمنٹ میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ سی میں کچھ اختلافِ رائے ہو جاتا ہے اور ——————

" ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ " بات بڑھ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ " سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا ۔ نہ خشک طہارت کا خیال رہا نہ تر نجاست کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"رشید صاحب شریف ہیں اور زندگی کو بڑی دیانت سے محسوس کیا ہے اور یہی اُن کی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔ رشید صاحب کو اُن کی زندگی سے اور زندگی کو ان کی ادبی کاوشوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ رشید صاحب اپنے مضامین میں " انسان" کی حیثیت سے اتنے ہی جلوہ گر ہیں جتنے ادیب کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں ۔

علی گڑھ سے اُنھیں محبت ہے اور وہ محبت صرف " دل" سے کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

علی گڑھ نے اُن کو بڑا بنایا ۔ اور اُنھوں نے اس " قرض" کو کبھی کا اُتار بھی دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک بڑے ادیب کے ہزاروں صفحات اور بیسیوں مضامین میں سے کچھ صفحوں اور کسی ایک مضمون کو اُس کا شاہ کار کہنا، بڑی ناانصافی ہے ۔

" مضامینِ رشید " لکھنے کے بعد رشید صاحب اگر لکھنا ترک بھی کر دیتے تو اُن کے مستقبل کو بس نہ پہنچتی ——— " گنج ہائے گراں مایہ " اُن کے لئے اور " سامانِ عافیت " ہم پہنچاتی ہے ۔

" کاروان پیدا است " ——— اس دَور کا مضمون ہے جب رشید صاحب کا قلم توانا تھا ۔ ۔ ۔ رشید یہی ایک مضمون ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے ۔

اس مضمون میں رشید صاحب علی گڑھ اور علی گڑھ میں رشید صاحب سمائے ہوئے ہیں ۔ ان کے طرزِ نگارش

در اسلوب بیان کی ایک کامیاب اور نادر تخلیق ہے۔

"کاروان بیداست" کی کئی حیثیتیں ہیں :۔

اس میں "بت کدہ" بھی ہے اور ظہور وارڈ بھی۔ میاں بیوی بھی ہیں اور مصنف اور معلم بھی۔ ایفائیڈ بھی ہے اور سینیر اور جونیر بھی، بیماریاں بھی ہیں اور ڈاکٹر بٹ بھی ——

غرض وہ سب کچھ ہے جو ہندوستان کے ایک متوسط الحال ادیب کی زندگی میں ہو سکتا ہے . . . . . اور ہوتا ہے ——!

یہ مضمون اگر ناظرین "مصنف" کے پسند آجائے تو الطاف صاحب کے شکر گزار ہوں اور اسے رشید صاحب کا "بہترین" مضمون وہ نہ سمجھیں تو مجھ سے شکایت کریں میں زمانہ گلہ کروں گا۔

اس "انتخاب" میں رشید صاحب کا میری رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اور اگر دوسرے مجھ سے اتفاق کریں تو میں رشید صاحب سے متفق ہو جاؤں گا ۱۲

اظہر رضوی

کہتے ہیں ایک بار تین بزرگ ہم سفر ہوئے، ایک نائی، ایک گنجا، ایک فلسفی۔ رات کا وقت ہوا اور طے یہ پایا کہ ہر شخص باری باری سوئے جاگے۔ ترتیب یہ قرار پائی کہ سب سے پہلے نائی پہرہ دے۔ اس کے بعد فلسفی اور اس کے بعد گنجا۔ چنانچہ مؤخر الذکر دونوں بزرگ سو رہے اور نائی پہرہ دیتا رہا۔ کچھ دیر تک تو نائی جاگتا رہا، آخر طبیعت اکتائی تو اس نے سوچا کہ کوئی شغل ہونا چاہئے ورنہ وقت کٹنا دوبھر ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے کسوت کھول کر استرہ نکالا اور بیٹھے بیٹھے علا سفر کا سر مونڈ دیا۔ وقت معینہ ختم ہونے پر اس نے فلسفی کو جگایا اور خود سو رہا۔ فلسفی جمائی لے کر اتفاقاً سر پر ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا اور متحیر ہو کر بولا۔ باری تو میری تھی اس کمبخت نائی نے گنجے کو کیوں جگا دیا!"

---

[1] مجید صاحب اور مجھ میں بالمشافہ یہ طے ہوا کہ ہو سکا تو کاروان کے لئے مضمون لکھ دوں گا۔

اپنے اختیار کی بات ہے۔ چنانچہ مجید صاحب نے یاد دہانی کے لئے تار بھی بھیجے۔ لیکن میں دُنیا کی بے ثباتی پر ہنستا رہا۔

ایک روز دروازے پر ایک موٹر آکر رُکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ موٹر اپنی سج دھج اور شور و شغب میں نرالی تھی۔ رُکی رہتی تو معلوم ہوتا کوئی سنیاسی حبس دم کئے ہوئے ہے۔ چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا جاپان میں زلزلہ آرہا ہے، چلتی تو پھر

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ڈاکٹر بٹ[1] صاحب نمودار ہوئے، ایک نعرہ لگایا، کہاں ہے رشید۔ نوکر، بچے، اعزا سب بھاگ کر گھر میں آئے باوجود اس کے کہ میں اپنے مکان کے اس کمرے میں تھا جہاں اندر صحن کی آواز بھی بمشکل پہنچ سکتی، اس خلفشار نے مجھے بھی سراسیمہ کر دیا، اب باہر نکلا تو آواز آئی المے مجید کا خط آیا ہے تم نے کارواں کے لئے مضمون لکھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے ذہن میں اس امر کا جائزہ لیا کہ مکان میں کوئی شخص بیمار تو نہیں ہے، جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا، کیسا مضمون؟ ڈاکٹر صاحب بولے ناک میں دم ہے۔ تم نے کارواں کے لئے مجید سے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اُس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیجد جائے۔ میں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے اُن سے کیا تھا، آپ مجھ پر کیسے مسلط ہو گئے۔ بولے سلام علیکم، گاڑی پر لرزہ طاری ہوا، محلہ والوں کے کان کھڑے ہوئے، انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب!

برق تھی، صرصر تھی یا تھا زلزلہ

نائیفائڈ نے ورود فرمایا گھر میں بچی بیمار ہوئی۔ خیال آیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلوں، ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا، معاً جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی، ایک مصرعہ بھی ذہن میں آگیا اور ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے دیکھتے پوری نظم مرتب ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ کوٹھی میرس روڈ پر ابھی حال ہی میں تیار ہوئی ہے نہایت وسیع، نہایت خوش قطع، سامنے گھاس کا کشادہ میدان، آمد و رفت کا راستہ بھی نہایت ستھرا، ہموار اور کشادہ، ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انفلوئنزا میں مبتلا دیکھتے ہی بولے، خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کرو۔ میں نے کہا آپ نے یہ رو کار پر کیا لکھا رکھا ہے۔ فرمایا حمید بٹ، اور محمود بٹ۔

---

[1] ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ، پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

میں نے کہا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرۂ نسب، کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرٹ سے تعلق، ثواب کی خاطر رکھتے تو کراماً کاتبین میں کیا قباحت تھی اور آرٹ مدنظر تھا تو یاجوج ماجوج رکھتے، الجھ کر بولے، ناک میں دم ہے آخر تم ہی بتاؤ، لیکن میں منزل ونزل کا تو قائل نہیں میں نے کہا پھر ظاہر ہے بت کدہ نام رکھئے، ہندوستانی حکومت اور اردو رسم الخط بدلتے بدلتے بتکدہ رہ جائے گا!

فرمایا کہو کہاں چلے، میں نے عرض کیا بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے۔ کہنے لگے حال سناؤ میں نے حال کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا، میں نے ابھی بحر بھی تقطیع نہیں کی تھی ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی۔ اتنے میں طائرہ بی دوڑی آئیں اور فرمایا باجی نے پوچھا ہے آپ نے کارواں کے لئے مضمون نہیں لکھا۔ میں نے کہا باجی سے کہدیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں ایڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات سے ان کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں کو للکارا کمرے سے نکل جاؤ۔ طائرہ بی تو بیچاری گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں، میں نے کہا جناب والا آپ کا یہ حکم بحیثیت مالک مکان کے ہے یا بحیثیت ڈاکٹر کے۔ فرمایا بحیثیت ڈاکٹر کے تم کو معلوم ہے کہ انفلوئنزا متعدی ہوتا ہے، میں نے کہا جناب من انفلوئنزا کا متعدی ہونا مسلم لیکن آپ کا بداخلاق یا بدحواس ہونا کہاں تک روا ہے۔ آپ ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوا بنا رکھا ہے۔ مرض میں مبتلا ہو ہو کر جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحۂ عظیم نہیں جتنا کہ مریض سے بھاگنا بزدلی اور شقاوت ہے۔ کہنے لگے لفاظی اور لسانی کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرو۔ یہ تو بتاؤ مضمون بھی لکھا یا نہیں اس کے لئے میں تیار ہو کر آیا تھا، بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ لیکن بچی کی بیماری کو کیا کروں، فرمایا اچھی ہو جائیگی مضمون تیار کر لو، میں نے کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا، کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں ''کیا ہوا'' تھا۔ میں نے عرض کیا، ڈاکٹر صاحب وعدہ کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا سلام علیکم میں نے کہا وعلیکم السلام۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا یقیناً حق آسائش میں "خلل اندازی" ہے۔ فرمایا اچھا رخصت سلام علیکم۔

تعطیلوں میں بارش اور چوروں کی یورش ہوئی۔ اس پر لطف یہ کہ مکان کے ایک حصہ کی توسیع ہو رہی تھی۔ بارش اور سلسلۂ تعمیر نے "کاشانہ کا کیا یہ رنگ"

کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار

بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا، دن بھر تو ڈاکٹر اور دواخانوں کی سیر رہتی، رات بھر تیمارداری کا سلسلہ جاری رہتا، میں نے ایک بار تنگ آکر کہا تیمارداری سے تو بہتر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہونا ہے، بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ۔ اللہ کی مصلحت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں، میں نے کہا چون و چرا کون کرتا ہے رات بھر بیمار بچی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مذہب کے معاملات میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ۔ مصلحت کی قائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دیکھتی نہیں آج کل چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کس درجہ پریشان اور سراسیمہ ہیں، ہم تم کس قدر بیفکر ہیں، بچی چوروں سے نجات کا باعث ہوگئی ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو ہماری تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی، تمہاری کفایت شعاری اور میری زیرباری دونوں مال مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ رہو رات کے وقت چور ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے لیکن آخر برسات میں مکان کو کس نے کہا تھا، میں نے کہا، کہا کس نے تھا مصیبت کہیں کہہ کر آتی ہے۔ ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں تم ہی بتاؤ ہماری تمہاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفانِ نوح اور کشتی نوح میں ہو۔ بیوی نے جھلا کر کہا کہاں کی بات کہاں پہنچا دی، تم تو مجھے ہمیشہ سے وبالِ جان ہی سمجھتے رہے۔ میں نے کہا بڑی مشکل ہے، میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو، میں نے سوچا (ذیست شب بخیر) شادی کا قصہ چھیڑوں اس پر تم چراغ پا ہوگئیں۔

تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اتنے میں بچی نے ایک چیخ ماری اور میں پھر ٹہلنے لگا۔ اور موسیقی کی وہ دھن شروع کر دی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدون ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی، شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا نم آلود سکر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ دماغ، اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ اس وقت میں زندگی کا ماحصل یا زندگی کی تمام زبونی و درماندگی کا معاوضہ اس آرام کی نیند سے تعبیر کر رہا تھا جو مجھے اپنے اس صاف ستھرے بستر پر میسر آسکتی تھی جس پر میں نے کبھی اپنی طویل بیماری میں نہایت مایوسی اور بیقراری کی راتیں گزاری تھیں۔ زندگی کے بعض لمحات بھی کس درجہ عجیب ہوتے ہیں جب انسان بے اختیار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے عمدہ بڑا یا لطف اندوز ہونے کیلئے اپنی قیمتی ترین متاع بھی قربان کی جاسکتی ہے!

مریض بچی کو میں لے چارپائی پر آہستہ سے سُلا دیا خیال آیا کہ بیوی کو جگا کر خود سو رہوں، اتنے میں چوکیدار کی چیخ سُنائی دی۔ ہمارے محلہ کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ بیوی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا میں نے ہی چیخ ماری ہے، فرمایا دیکھئے نہیں بچی بیمار ہے، میں نے کہا دیکھنے کی کونسی بات ہے، میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں، چوکیدار چیخ رہا ہے، بارش ہو رہی ہے اور میں اُلو کی طرح بیٹھا ہوں فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہوئے ہیں اچھا اب جا کر سو رہئے تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا چاہئے اور اُس دن آمنہ بی بھی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے اب تک پورا نہیں کیا۔ اب میرے تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، میں نے جھلا کر کہا وعدہ تو کیا تھا آپ کیوں سر پر سوار ہو گئیں۔ جی میں آیا لکھوں گا جی میں نہ آیا نہ لکھوں گا۔ نیک بخت بولیں اچھا شور نہ مچائیے۔ اتنا بھی تو لحاظ ہونا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں پر کتنا کرم کرتے ہیں اس کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی سارا گھر سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔ میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اسی دن میں خودکشی بھی کر لوں گا، فرمایا خودکشی کے اس سے بہتر مواقع پیش آیا کئے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔ اس وعدہ فراموشی کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، اس لئے نہیں کہ اس سے دفع شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا، جا کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ خواب دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر[1] صاحب کی موٹر پر کارواں کا انبار ہے، موٹر بے تحاشا اور بدحواس چلا آرہا ہے، گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ، دھڑ دھڑ، تڑ تڑ، تڑ تڑ، چر چر، اور...... ارارارا دھڑام، میرے اوپر سے گزر گیا، آنکھ کھل گئی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بچی کو دیکھنے آئے ہیں اور دروازے پر کھڑے نعرے لگا رہے ہیں!

ڈاکٹر خاں بیمار ہوئے، ایک آدھ دن ملاقات نہیں ہوئی، میں نے خیال کیا الموڑہ سے بیوی بچے نہیں آئے ہیں ممکن ہے کسی فکر میں ہوں بالآخر معلوم ہوا بیمار ہیں، کوئی کہتا ہے ملیریا ہے، کوئی کہتا ہے ٹائیفائڈ ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا گویا الموڑہ سے آواز آرہی ہے

---

۱) ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صدر شعبہ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

بخار ہے میں نے کہا اللہ رحم کرے، لیکن یہ بتاشے کی طرح بیٹھے کیوں جا رہے ہیں بخار ہے تو ہوا کرے، سراسیمہ ہونے کی کونسی بات ہے۔ ذرا اور نحیف آواز میں بولے، ٹائیفائڈ ہوا تو؟ میں نے کہا میں اپنے سارے قرضے ابھی معاف کئے دیتا ہوں۔ اس پر تو خان صاحب چونکے ہوئے، آواز میں کرارا پن پیدا ہوا، بولے کیسا قرض۔ ارے تم میرے مقروض ہو یا میں تمہارا، میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقع تو صرف معاف کر دینے کا ہے، بولے غچہ دیتے ہو، میں نے کہا خاموش ہو جائیے، بیماری میں رد و قدح نہیں کرتے۔

خون کا معائنہ کیا گیا، رپورٹ دیکھ کر اصغر[۱] صاحب نے فرمایا ٹائیفائڈ تو ہے نہیں، ملیریا البتہ ہے، میں نے کہا آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی رائے لینے کے کوئی معنی نہیں اور دنیا اس سے زیادہ جہل۔ فرمایا، آپ احمق ہیں، ٹیمپریچر چارٹ دیکھو تو معلوم ہو، گراف کا نشیب و فراز کبھی ٹائیفائڈ کا نہیں ہو سکتا، میں نے کہا ٹائیفائڈ اور ملیریا دونوں ہوں تو کیا ہو، فرمایا ممکن ہے۔ میں نے کہا آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے تو تھوڑی سی ہومیوپیتھک پڑھ ڈالئے، کہنے لگے خوب یاد دلایا۔ ٹائیفائڈ میں ہومیوپیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے اگر یہ متیقن ہو جائے تو یقیناً ہومیوپیتھک علاج کرنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہوا اور آپ کی رائے ہو تو میں زعفران سے آیۃ شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب بولے مذاق کی کونسی بات ہے، کیا معلوم زعفران کی یہ مقدار بجائے خود ہومیوپیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا آپ تو بحیثیت ایک سائنس داں کے زعفران کے معتقد ہوں گے خود ڈاکٹر خاں آیۃ شفا کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر خاں نے منغض ہو کر کہا کہ تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قایم رہا، انار سنگترہ کا عرق، آش جو، مسہل سب کچھ دیا گیا، ایک پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب مریض کو دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا اور غذا دونوں سے بیزار ہیں اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم سب دخل در معقولات دیتے۔ چنانچہ مریض کے پاس پہنچے پوچھا آخر دوا کیوں نہیں پیتے۔ فرمایا کچھ استعمال نہیں کروں گا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں ٹھیرتی۔

---

(۱) ڈاکٹر اصغر علی صدر شعبہ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا دوا تو ہر حال میں پینی پڑے گی۔ آپ کو جو تکلیف اور شکایت ہے اس کا دفعیہ صرف دوا سے ممکن ہے۔ اصغر صاحب اور مجھ کو دیکھئے تندرستی میں بھی دوا ترک نہیں کرتے، اصغر صاحب نے چمک کر فرمایا، جھوٹے ہو، تم ہی تندرستی میں دوا پیتے ہوگے۔ ڈاکٹر خاں نے کہا، باتیں مت کرو میں کچھ نہ کروں گا۔ میں نے کہا اسے خوب سمجھ لیجئے آپ کی ایک پیش نہ جائے گی۔ آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے عزیز شاگرد آپ کی جتنی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب کو رشک ہے۔ کہتے تھے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ اصغر صاحب نے کہا تم دنیا بھر کے جھوٹے لپاٹئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں بیمار ہونے کو تیار ہوں، ڈاکٹر خاں کچھ مسکرانے پر آمادہ ہوئے تو میں نے کہا دوا پی لیجئے، فرمایا بکومت۔ میں نے کہا آپ کے اس جواب سے تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانے پر آمادہ ہونا محض منافقت تھی، خیر آپ کچھ ہی کیوں نہ کریں دوا تو پینی ہی پڑے گی۔ بولے معاف کیجئے اور تشریف لے جائیے، میں نے کہا مجھے نہایت تعجب ہے کہ آپ کی تندرستی میں مجھے کبھی یہ خطرہ نہیں گزرا کہ آپ اس درجہ بے تکے اور ضدی ہیں، میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی تالیف قلوب کے لئے دنیا کی بڑی سے بڑی حماقت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا لا بھائی، جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کروں گا۔ سوڈا اور دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس آئے۔

الموڑہ سے بیوی بچے واپس آئے، بیمار اور تیمار دار کم ہونے لگے، ایک دن ہم سب ڈاکٹر خاں کے یہاں پہنچے تو لوگوں نے اندر جانے سے منع کیا کہ آج اضمحلال زیادہ ہے، میں نے کہا آج ہی تو ہماری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا۔ ہم لوگ اندر پہنچے تو واقعی ڈاکٹر صاحب نڈھال پائے گئے نہایت نحیف آواز سے بولے، طبیعت بہت درماندہ ہے۔ حرکت کرنے میں بھی تکلف ہوتا ہے، اتر نے بس اضمحلال بڑھتا ہے کہنے لگے بکواس مت کرو۔ میں نے کہا جناب مذاق ختم کیجئے جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ بخار نہیں رہا تو مرض بھی نہیں رہا اس لئے آپ کو خوش ہونا چاہئے آپ کے مسرور اور مطمئن ہونے سے بیوی بچے تیمار دار سب خوش ہو جائیں گے مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا اوکا سا سے زیادہ مفید اور مقوی ہے۔ ڈاکٹر خاں مسکرائے، بولے اچھا ہو جاؤں تو تمہاری خبر لوں۔

میں نے کہا آپ نے کچھ اور بھی سنا خاں صاحب جرمنی جانے والے ہیں اور اصغر حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب بولے خاں صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا ارادہ جرمنی جانے کا ہے۔ میں نے کہا یہ تو آپ لوگ ایک بار کر چکے ہیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا میری رائے یہ ہے کہ

اب آپ حج کرنے جائیں اور خانصاحب جرمنی ہو آئیں اس طور پر ہندوستان مذہب اور آرٹ یا مولوی اور عورت کی کشاکش سے آزاد ہو جائے گا" ڈاکٹر خان بولے، خود کیوں نہیں ہو آتے ہیں نے کہا میں اور آپ دونوں وجود معطل ہیں، میں شیروانی پاجامہ پر ہیٹ لگاتا ہوں اور آپ کوٹ پتلون میں مزارات پر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر خاں اس طور پر شگفتہ ہوئے گویا وہ اپنی بیماری بھول گئے تھے۔

ہم لوگ باہر نکلے اور ابھی آخری زینہ سے اتر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب اپنی بھونچال پر سوار آدھمکے اور دور ہی سے للکارا تم لوگ مریض کے پاس کیسے پہنچے۔ میں نے کہا کیوں نہ پہنچتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بگڑ کر فرمایا میں نے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے، میں نے کہا ہم لوگ "شخص" کب ہیں، ہم تو علاج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ناک میں دم ہے اور کیوں جی مضمون لکھا۔ اب میری باری تھی، میں نے کہا ناک میں دم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اچھا رخصت سلام علیکم۔ ہم لوگ ٹانگے پر بیٹھ کر واپس ہوئے۔

راستہ میں اصغر صاحب نے فرمایا کیوں جی آٹھ دس دن سے ٹانگے پر یہاں آتے جاتے ہیں، کرایہ کون دیا کرتا ہے۔ میں نے کہا ٹانگے والے سے پوچھئے۔ بگڑ کر فرمایا ٹانگے والے سے کیوں پوچھا جائے۔ تم جو مفت خوری کرتے ہو۔ میں نے کہا اور کبھی آپ کو یہ بھی خیال آیا ہے میں تعظیماً برابر آگے بیٹھتا ہوں۔ دنیا جانتی ہے جو شخص ٹانگے پر آگے بیٹھتا ہے اس کا کرایہ معاف ہوتا ہے۔

اصغر صاحب نے فرمایا یہ سب صحیح ہے لیکن آپ خود کیوں نہیں تانگہ کرتے۔ میں نے کہا سوال سینیر اور جونیر کا ہے۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ سفر سواری میں ایک شخص کو سردار بنا لیا جاتا ہے۔ بقیہ جتنے لوگ ہوتے ہیں وہ اس کی متابعت کرتے ہیں۔ سینیر اور جونیر میں فرق یہ کہ میں (جونیر) آپ (سینیر) کی معیت میں ہوں تو پھر میرا خوشگوار فرض ہوگا کہ میں تانگہ پکڑ لاؤں، اسباب بار کراؤں، کرایہ چکاؤں، دکان پر جائیں تو آپ تانگہ ہی پر بیٹھے رہیں، میں کپڑے، موزے، جوتے، پھل پھلیری لا لا کر آپ کو دکھاؤں، کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کے پیسے میں سے خیرات دیدوں مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں، کہیں بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ برج کی صحبت ہو اور ہم آپ ایک طرف ہوں تو اگر ایک نو ٹرمپ کہیں تو میں دونوں ٹرمپ کہوں دشمن آپ کو ڈبل کرے تو میں "ری ڈبل" کر دوں۔ آپ غلطی کریں تو مجھے برا بھلا کہہ لیں مختصر یہ جونیر کے کوئی

حق نہ ہوگا کہ سینیر کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نکالوں۔

اصغر صاحب نے فرمایا "شکریہ لیکن آپ خود کیوں نہ سینیر بنیں" میں نے کہا سینیر بننا آسان نہیں ہے، اس کے لئے صورت، شکل، وضع قطع ارکھ رکھاؤ ضروری ہے؛ مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں پیش آئی ہیں اور ایسی رسوائی کہ اکثر جی میں آیا ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں، اول تو قلی پوچھتا ہے کہ صاحب انٹر کلاس میں اسباب رکھوں؟ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آتا ہے، خوانچے والے دہی بڑے پیش کرتے ہیں، اور پانی والا تا ملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے!

ایک بار ایک صاحب بہادر بھی ہمسفر تھے۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ نہایت دلنوازی لہجہ میں فرمایا یہ تو فرسٹ کلاس ہے۔ میں نے ان کی اطلاع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو بولے یہ سکنڈ کلاس نہیں ہے۔ میں اب بھی خاموش رہا' ارشاد ہوا انٹر کلاس آگے ہے' میں نے کہا گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ فرمایا تو تھرڈ میں بیٹھ جاؤ میں نے عرض کیا سفر لمبا ہے اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ فرمایا یہ فرسٹ کلاس ہے مقدمہ چلایا جائے گا۔ میں نے کہا شکریہ لیکن ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اب تو ہم دونوں صحیح انگریزی بول رہے تھے اس لئے کسی قسم کی ناہمواری نہیں ہوئی، صاحب نے سگریٹ سلگا کر کچھ اور فرمایا جس کو میں نہ سمجھا' میں نے ڈبیہ میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور عرض کیا مکرر ارشاد ہو۔ فرمایا ہم بولا تم دوسری گاڑی میں جانا مانگتا میں نے عرض کیا "ہم سمجھا بٹ' یہی جگہ بیٹھنا مانگتا۔ صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا اور خاکسار نے بھی خلافِ معمول اپنے چہرے پر کچھ آثار تغیر پائے۔ صاحب نے انگریزی میں فرمایا، تم کہاں جا رہے ہو' میں نے بھی انگریزی میں کہا تم کہاں جا رہے ہو۔ فرمایا جہنم کو۔ میں نے کہا مجھے رفیق سفر سمجھئے لیکن میرا ٹکٹ واپسی کا ہے۔ صاحب بہادر ہنس پڑے، کہنے لگے جب منزل ایک ہے تو ذریعہ سفر کے ایک ہونے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ بولے کیا کام کرتے ہو۔ میں نے کہا جاہلوں کو مہذب بناتا ہوں۔ صاحب کسی قدر سرگرجبیں ہو کر بولے لینی؟ میں نے کہا یونیورسٹی میں معلم ہوں۔ صاحب بہادر نے لپک کر نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، معذرت چاہی اور اپنے طالب علمی کے قصے سناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر صاحب بہادر اتر پڑے، ٹکٹ بابو نے آکر مجھ سے ٹکٹ مانگا، میں نے نکال کر دکھا دیا۔ لیکن اس کو کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے صاحب بہادر کی طرف اس طور پر دیکھا

گویا وہ چاہتا تھا کہ موصوف احتیاطاً اپنا ٹکٹ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا میرے دوست کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے آپ کا ٹکٹ تو نہیں نکال لیا

میں نے اصغر صاحب سے عرض کیا کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے خدارا انصاف فرمائیے مجھ میں سینیر بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے۔ دوسری طرف اپنے آپ کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ اور وائس چانسلر صاحب بہادر سے زیادہ یونیورسٹی میں نہ کوئی خوش لباس اور نہ جامہ زیب۔ آپ کا پاندان میری بیوی کے سنگھاردان سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اُبلا پانی پیتے ہیں، ٹیکے لگواتے ہیں مکھی زندہ نہیں رہنے دیتے، قاعدے سے برج کھیلتے ہیں۔ خواہ قاعدہ کے سبب سے نتیجہ ہوئے حکم کے بجائے دو چار ہاتھ داؤں ہی کیوں نہ ہو جائیں، سالن میں مرچ نہیں کھاتے۔ چا میں دودھ نہیں ڈالتے، بدتمیزی معاف نہیں کرتے، قرض کا تقاضا نہیں کرتے۔ دن میں ایک بار خط بناتے ہیں اور دو بار غسل کرتے ہیں، نہ کبھی کلاس چھوڑتے ہیں اور نہ ٹرین۔ میں تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لوں تو کسی کو یقین نہ آئے، آپ بے ٹکٹ بھی سفر کریں تو کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ پڑے، آپ سے ہاتھ ملانے کے لوگ متمنی اور منتظر، میرا اسلام لینے سے مستغنی اور بیزار۔ آپ ہی انصاف کیجئے ایسی حالت میں کون سینیر بننے کا مستحق اور سزاوار ہے۔

فرمایا آپ ہیں احمق، مسخرہ بننے کی کوشش فرماتے ہیں، ذرا آئینہ میں شکل تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے کہا آپ کے یہ خیالات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں اس لئے کہ چندہ دیتا ہوں خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں، ہال میں رقص کرتا ہوں، غریب پر آنچ آئے تو گورنمنٹ کا ساتھ دیتا ہوں، اپنے اوپر آفت آئے تو جہاد کی تلقین کرتا ہوں۔ رہی مسخرگی اس کا الزام یوں غلط ہے کہ یہ بجائے خود کوئی مرض نہیں ہے۔ بلکہ علامت مرض ہے۔ آپ درباراری کا مطالبہ نہ کریں میں مسخرگی سے دست بردار ہو جاؤں۔ آئینہ میں شکل دیکھنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جونیر کی شکل ہی ایسی ہوتی ہے۔ مرشد کا مقولہ نہیں سُنا ہے، فرماتے تھے دنیا میں رہنے کے صرف دو مقصد ہیں نشاط یا نجات یعنی قلوپطرا یا سقراط۔ فرمایا جناب کا مسلک کیا ہے میں نے کہا وہی خودکشی یا شہادت، کہنے لگے شکل تو سقراط ہی کی پائی ہے۔ میں نے عرض کیا اس وقت یونیورسٹی کو قلوپطرا سے زیادہ سقراط ہی کی ضرورت ہے۔ ایک طرف سے صدا آئی۔

"اور کارواں کو ایک مضمون کی"

ایک صاحب نے مجید صاحب کا "تار" لا کر دیا جو ابھی ابھی گھر پر آیا تھا۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا، خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے۔ تمام چیزیں بے ترتیب ہیں۔ ان کی صفائی کر لوں تو پھر اطمینان سے لکھوں۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا۔ سب چیزیں قرینے سے رکھی گئیں، قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی نہیں، فوراً بک ڈپو پہنچا کہ سیاہی کی شیشی خریدوں، وہاں معلوم ہوا کہ بک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے؛ فلاں کتاب نہیں۔ پارسلوں کی بلٹیاں وی۔ پی۔ آئی ہیں، روپیہ کا انتظام کیجئے۔ ایک خریدار منیجر سے الجھے ہوئے ہیں۔ منشی اور دفتری کی جھک جھک ہو رہی ہے۔ کتابوں اور کاپیوں کا آرڈر بھیجنا ہے۔ اسٹیشنری کی قیمت نہیں لگائی گئی ہے۔ تین گھنٹے اس کی نذر ہوئے، شام ہو گئی، مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلہ کے سلسلہ میں لڑکے معہ والدین آئے ہوئے ہیں۔ "تھرڈ کلاس پاس ہوئے ہیں" گھر سے ایک پیسہ کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہئے۔ قرض حسنہ دلوائیے، آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجئے۔ فرنیچر گھر سے دیجئے، صبح حبیب صاحب سے ملائیے، وائس چانسلر صاحب کے ہاں لے چلئے، قوم کی غفلت، مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا رہا اور ماحضر کھاتا کھلاتا رہا۔

۹ بجے رات کو زنان خانے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ دو ایک صاحب بیمار ہیں۔ ایک صاحب کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں، دوسرے صاحب اس قدر کھا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرہ میں ہے اور ماں عنقریب ایسا سلوک کرنے والی ہے جس سے ان کے اعضا و جوارح خطرہ میں ہیں۔ ان کے قضیئے فیصل کر کے بیٹھا تھا کہ اب کلاس پڑھانے کے لئے کچھ پڑھ لوں۔ کچھ دیر تک مراقبہ میں رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے۔ آواز آئی پانی پیوں گا، جب تک پانی مہیا کیا جائے ایک دوسرے بزرگ نے ایک نالہ سر کیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا ہم بھی پانی پئیں گے، ان کے حکم کی تعمیل کی گئی واپس آ کر پھر کتابیں اٹھائیں۔ اقبال سے رجوع کیا گیا، کل کا سبق ہے ارتقا، نظم نکالی گئی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل مسلمان نوجوان اسے سمجھیں گے، کس طور پر؟ "چراغ مصطفوی" پر ایمان نہیں "شرار بولہبی" کے قائل نہیں، اچھا مسئلۂ خیر و شر سے بحث کی جائے گی لیکن خیر و شر کو سمجھ [illegible]

نہ ہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا، چلو آگے بڑھو۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

اس شعر کو سمجھانا ذرا دشوار ہے، ایسی حیات جس نے "مشکل کشی" اور "جفا طلبی" سے ترکیب پائی ہو اُن نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کی کفالت کے ذمہ دار اُن کے والدین یا مسلم یونیورسٹی ہو اور ہندوستانی آزادی کے ذمہ دار ہندو، تکلیف ہو تو چیخنے لگیں، راحت ہو تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے، اچھا اُن کو مثال دے کر سمجھایا جائے گا، مسلمانوں کی تاریخ تو اُن کے نزدیک افسانہ کہن ہے ممکن ہے موجودہ ترکوں کی مثال ان کی سمجھ میں آجائے لیکن اگر کوئی "شمشیر بے نیام" یہ بول اُٹھا کہ موجودہ ترک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب ہوگا۔ کچھ ہر نہیں۔ حکومت ترکیہ جدیدہ اور حکومت ترکیہ اسلامیہ کے مظاہر شخصی بھی دو ہیں، مصطفےٰ کمال اور رؤف بے لیکن اسلامی حکومت، ممکن ہے ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آئے کیونکہ اس چیز کو مہاسبھا اور برطانوی کابینۂ وزارت دونوں بُرا سمجھتے ہیں۔ اس لئے اخلاق اور عقل دونوں اعتبار سے یہ قابلِ احتراز ہے۔ بہر حال اس پر مفصل بحث کرنی ضروری ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے اگر کے اشعار مشکل ہوئے تو پھر محفوظ طریقہ کار فریقین کے لئے بھی ہوگا کہ ساغر اور شراب کے قصہ کو پھیلا کر بیان کیا جائے گفتہ ختم ہو جائیگا اور جان بچ جائے گی۔

اچھا تو اس بحث ہی کو کیوں اُٹھایا جائے "مشکل کشی" اور "جفا طلبی" کا فلسفہ موجودہ جرمن قوم کی مثال سے سمجھایا جائے گا، چلئے ساری دقت حل ہو گئی، ان مسلمان نوجوانوں کی سمجھ میں اُس وقت تک کوئی چیز نہ آئے گی جب تک آپ اسلامی ادب یا تاریخ کی مثالیں پیش کرتے رہیں گے، ہاں آپ کی غیر اسلامی چیز کو اُٹھائیں اور یہ آپ کے معتقد اور ہمنوا بن جائیں گے لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں ہے کہ قوم کا ماتم کیا جائے۔ کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے۔

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

خدا کا شکر ہے کہ اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ اول تو یہ بحث مشکل کشی اور جفا طلبی کے سلسلہ میں آ چکی ہوگی لیکن اگر کچھ کسر رہ گئی تو پھر ان کو وہ زمانہ یاد دلاؤں گا جب امتحان قریب ہوتا ہے اور کورس کورا! شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں، نیند آتی ہے تو اُٹھ کر ٹہلنے

ہیں، پھر پڑھتے ہیں، نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چار کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اٹھاتے ہیں، پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے، ذرا سی نیند آتی ہے، تھوڑا سا کورس باقی رہ جاتا ہے، اب بغیر دودھ شکر کے چائے پی جاتی ہے اور آخری حملہ ہوتا ہے، کورس ختم ہو جاتا ہے اور پاس کے درختوں پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے، افقِ مشرق سے آفتاب ابھرتا ہے، یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبریل!

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

یہ دونوں اشعار "گون" کے ہیں، اس عہد کے نوجوان" ساغر اور شراب کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ دقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر اور شراب کو تصوف یا تصوف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فنِ تعلیم یا فنِ معلمی کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے موضوع کو دلچسپ بنا دیا جائے اور ساغر اور شراب وہ چیزیں ہیں جو "دلچسپ" بھی ہیں اور لذیذ بھی!

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تپ و تابِ ملتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس کشاکشِ پیہم پر بحث ہو چکی ہے، ملتِ عربی کو پیش کرنے کا موقع دیکھا جائے گا۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔ موجودہ دور میں اردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر پیش کر دیا گیا، "ستارہ می شکنند آفتاب می سازند" کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائے گا جن میں سے ایک صاحب مغاں کو فغاں پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ خیر اللہ مالک ہے، اگر سمجھا نہ سکا تو اردو کا ایک شعر پڑھ کر بھاگ کھڑا ہوں گا۔

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

دوسری کلاس میں غالب پر درس دینا ہے۔ رات زیادہ آگئی ہے، مگر کوئی مفر نہیں ہے، خدا کرے سبق آسان ہو، غالب کا دیوان کھولا گیا، سبق ہے،

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لیکن اب الفاظ اور سطروں کی بجائے کچھ اور پیش نظر ہے، مضمون کے بجائے نیند چلی آتی ہے، پہلا مصرعہ تو مسلم لیکن دوسرا خلافِ واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دوسرے دن علی الصباح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ سیاہی کی شیشی خریدنا بھول گیا، پنسل ڈھونڈھ کر نکالی، مضمون کا عنوان کیا ہو، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر طے کیا، عنوان ہی، مضمون کی نذر کر دو۔ لیکن مضمون کا بھی پتہ نہیں، اچھا عنوان پر پھر زور لگاؤ مثلاً ہندو مسلم اتحاد، برطانیہ کا اخلاص، اور ہندوستان کا افلاس، پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس، سٹی اسکول علی گڑھ، انجمن اقوامِ عالم اور ہم، اچھوت اور ہم، ہٹلر اور ہم، بم اور ہم، کارواں اور ہم۔

ہندو مسلم اتحاد پر لکھنا آسان ہے، مثلاً محرم، گاؤ کشی، تناسب آبادی اور بربادی، ریاست متحدہ اسلامیہ، پورن راج، مخلوط انتخاب، مخلوط ازدواج، اُردوئے معلی۔ ناگری پرچارنی سبھا، لاٹھی چارج، شفیع داؤدی، پنڈت مالوی۔ لیکن اس ماگھ میلا کی طرف متوجہ کون ہوگا، "برطانوی اخلاص اور ہندوستانی افلاس" بھی اچھا مضمون ہے، لیکن اس قسم کی چیزوں سے میرٹھ کا مقدمۂ سازش بھی مرتب ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے اس سے بھی اجتناب لازم ہے۔ فائدہ کیا خود جیل خانہ گئے۔ گورنمنٹ کو زیر بار ہونا پڑا۔ پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس، سٹی اسکول علی گڑھ بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن اس کا صدر ہونا اس پر مضمون لکھنے سے زیادہ موزوں ہے، اور آسان بھی، اس لئے اس کو نمائش اسپیان علی گڑھ کے موقع پر دیکھا جائے گا" انجمن اقوامِ عالم اور ہم" خاصا عنوان ہے۔ لیکن اقبال نے ایک شعر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہم سے ایک جلد میں بھی نہ لکھا جائے گا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

"اچھوت اور ہم" البتہ ایک چیز ہے، کیا کہنے، کس قدر حسب حال ہے۔ کیسا بولتا ہوا مصرعہ ہے، مصرعہ نہیں فقرہ سہی، فقرہ نہیں واقعہ سہی! "ہٹلر اور ہم" بھی خوب ہے، لیکن ہٹلر کو ہم اپنی یونیورسٹی کے نقطۂ نظر سے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے اور بزرگوں سے سنا ہے کہ ایسوں کا نام بھی نہ لینا چاہئے ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ادھر نام لیا اُدھر وہ آدھمکے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو

ظر انداز کیا جائے۔

"بم اور ہم" قافیہ کے اعتبار سے خوب ہے۔ عنقریب ہز ایکسیلنسی گورنر کا ورود ہوگا ایسی
ہیں اس کا تذکرہ مناسب نہیں ہے، محفوظ طریقہ کار یہ ہوگا کہ اس عنوان کو خواجہ
ظامی صاحب کے پاس بھیج دیا جائے پچھلی بار کسی ایسے ہی موقع پر موصوف نے پیاری
صنیف فرمائی تھی جو اُردو ظرافت نگاری میں اب تک یادگار ہے۔ ممکن ہے اس دفعہ بھی کچھ ہو جائے

اب رہا کارواں اور رہم، چنانچہ

چل مرے خامہ بسم اللہ۔

رشید احمد صدیقی

[illegible]

حیاتِ حافظ الملک حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اُردو زبان میں پہلی مکمل مبسوط باتصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور ولولہ انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت تام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۵ روپئے (زیر طبع بار دوم)۔

مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد — (بہ زبانِ انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور مسلمانانِ یوپی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جدوجہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ روپیہ (زیر طبع بار دوم)۔

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی دس سالہ پبلک لائف کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت دو آنے۔

رباعیاتِ عرش فاروقی — بریلی اور روہیلکھنڈ کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے درد انگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونہ کلام اُن کی نعت اور رُباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۶ آنے۔

صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رُکاوٹیں درپیش ہیں، اُن پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حلِ مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۸ آنے۔

دلاور الملک نواب دوندے خاں — (بہ زبانِ انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریکِ کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت ۴ آنے۔

غلام قادر روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) — بہ زبانِ انگریزی و اردو۔ (زیر طبع)
قیمت ۸ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بکڈپو سلطان جہاں منزل علیگڑھ

بھی نہ لیتا پ

[illegible] نمبر ۱۹

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ماہواری علمی رسالہ

[illegible]

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی - بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ - للعہ چار روپے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[illegible]

[illegible]

مُصنف

جلد ۵	بابت ماہ اگست سنہ ۴۶ء	نمبر ۱۹

فہرست مضامین

اڈیٹوریل مصنف علی گڑھ
بابت اگست ۴۷ء

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ!

۳ جون ۴۷ء کو مسلمانانِ ہند کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی، پاکستان بن گیا۔ کل تک جو چیز محض خیالی سمجھی جاتی تھی، آج ایک حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور مشرقی بنگال و سلہٹ کے وسیع علاقوں میں ایک نئی سلطنتِ اسلامی معرضِ وجود میں آگئی جس پر دنیائے اسلام جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ قیامِ پاکستان کی تحریک میں قریب ایک لاکھ مسلمان مجاہد شہید اور کئی لاکھ خانماں برباد ہوئے۔ لیکن ملکوں اور قوموں کی آزادی کے لئے ہمیشہ بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی رہی ہیں اور ہماری یہ ناچیز قربانی اُن کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ آیندہ نسلیں جب آزادی کی فضا میں سانس لیں گی اور ہندستان جنت نشان کی سرسبز و شاداب سرزمین پر سینہ تان کر اور سر اُٹھا کر چلیں گی تو اُس وقت شہدائے اسلام کی پاک اور متبرک روحیں خوش ہوں گی کہ "کارے کردیم"۔

لیکن بے پناہ مسرت و شادمانی کے موقع پر ایک خیال اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں دل و دماغ کو بے چین کئے ہوئے ہے اور عام طور پر حسبِ ذیل سوالات کئے جا رہے ہیں:-

(۱) پاکستانی علاقوں کے مسلمان ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے اور وہ آزادی کی تمام مشہور و معلوم نعمتوں سے متمتع ہوں گے، ہندوستان کے

صوبوں کے ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان ہر قسم کی قربانیاں دینے اور تکالیف برداشت کرنے کے باوجود غیر مسلم اکثریت کے تابع فرمان رہیں گے؟

(۲) مسلمان ذمہ دار عہدوں سے محروم رکھے جائیں گے، اور سابقہ حکومت میں جو خصوصی مراعات اُن کو حاصل تھیں وہ واپس لے لی جائیں گی۔ جہاں جہاں اُن کی آبادی کمزور ہے اُس کو غیر مسلم اکثریت پریشان کرے گی۔ ہندی زبان، ہندی رسم الخط، اور ہندو کلچر رواج پذیر ہوگا۔ اِن چیزوں کے خلاف اگر مسلمان آواز اُٹھائیں گے یا اپنی موجودہ آزادیٔ خیال و عمل کو قائم و برقرار رکھنا چاہیں گے تو اُن پر ناقابلِ بیان مظالم توڑے جائیں گے؟

(۳) مصیبت کے وقت جس طرح آج تک افغانستان اور ایران وغیرہ اسلامی سلطنتیں مسلمانانِ ہند کی کبھی کوئی امداد نہ کرسکیں، پاکستانی حکومت بھی ہندوستانی مسلمانوں کی بروقت اور مؤثر مدد نہ کرسکے گی؟

(۴) اگر پاکستانی حکومت مسلمانانِ ہند کی مدد کرنا بھی چاہے گی تو وہاں کی غیر مسلم طاقت ور اقلیتیں سنگِ راہ بن جائیں گی؟

(۵) خود مسلمانانِ پاکستان میں آگے چل کر غیر ملکی ہندی مسلمانوں کے خلاف ایک قسم کا احساسِ برتری پیدا ہو جائے گا اور وہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ایسی ہی ذلیل نظروں سے دیکھنے لگیں گے جس طرح کہ اب تک ترک، عرب، ایرانی اور افغانی ہندوستانی مسلمانوں کو دیکھتے رہے ہیں؟

(۶) اقتصادی و معاشی مفادات کا اقتضا ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان میں دخیل و با اختیار نہ ہونے پائیں۔

مندرجہ بالا سوالات سے مستقبل بہت زیادہ تاریک اور مایوس کن نظر آرہا ہے اور اُس کے نتیجہ میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں

ے دنوں میں قیام پاکستان کی مسرت و شادمانی کے ساتھ ہی ساتھ ایک
م کا ہراس بھی طاری ہے۔

سابقہ قومی روایات اور تاریخی کارناموں کی روشنی میں مسلمان
کل پست ہمت نہیں ہیں۔ اور اُن میں یہ جذبہ بھی پایا جاتا ہے کہ اکثریت
ر اقلیت کچھ نہیں۔ ہم اپنے جوشِ اسلامی سے مشکلات پر غالب
جائیں گے اور حریفوں کو اُن کے عزائم بے جا میں کامیاب نہ ہونے
یں گے۔ لیکن یہ کوئی مضبوط اور اطمینان بخش صورت نہیں ہے۔
نصوص ایسی حالت میں جب کہ حکومت کے اختیارات، فوج، اور
یس پر اقتدار۔ نیز بقائے قومی کے لئے ہر قسم کے ذرائع و وسائل پر
ثرس تمام تر ووٹوں کی کثرت و قلت پر موقوف ہوگی۔

دل کو سمجھانے کے لئے کچھ اس طرح بھی سوچا جاتا ہے کہ آیندہ
اپنا پروگرام تبلیغ مذہب کا بنائیں گے اور کچھ عرصہ کے بعد
ی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر لیں گے۔ لیکن مسلمانوں کی اقتصادی
حالی اور خود اُن میں صحیح تعلیم اسلامی کے فقدان کے پیشِ نظر اس
ر پر بھی حصر کرنے کی بالفعل ہمت نہیں ہوتی۔
آیندہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے سب رہنے بسنے
لے مذہبی پارٹیوں کے بجائے اقتصادی اور سیاسی جماعتوں
تقسیم ہو جائیں اور ہندو۔ مسلم اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا
ہو۔

لیکن برادرانِ وطن کی ہزاروں سال کی تاریخ کو جب سامنے
ا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں کیسے ہی سیاسی و اقتصادی
قلابات کیوں نہ برپا ہوں۔ یہ قوم نہیں بدل سکتی۔ ایک ہندو
ہے وہ کانگریسی ہو یا سوشلسٹ اس کی معاشرت و ذہنیت میں

عروج ہیں اسلام۔
بدھ مذہب کا سارے ہندوستان پر غلبہ ہوا اور اس کی حکومت بھی رہی لیکن برہمنی مذہب نے اُسے دیمک کی طرح چاٹ لیا۔
ایک ہزار سال تک پورے ملک ہندوستان پر مسلمانوں کا اقتدار رہا۔ لیکن آگرہ۔ دہلی۔ لکھنؤ اور بریلی۔ حکومت کے خاص مرکزوں میں ہندوؤں کی اکثریت رہی اور ہندوانی رسم و رواج اور میلوں، تیوہاروں کی بھیڑ بھاڑ اور رونق میں ترقی ہی ہوتی رہی۔ دو سو سال سے یورپین تہذیب و کلچر کی اس ملک میں کارفرمائی ہے لیکن مسٹر گاندھی بارایٹ لا، پنڈت جواہر لال نہرو سوشلسٹ، اور مسٹر جے پرکاش نرائن انقلابی کے رجحاناتِ مذہبی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم کو سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنا ہے کہ ہندوستان میں گزشتہ ہفت سالہ تحریک آزادی کا مقصد کیا صرف پاکستانی علاقوں کی آزادی سے تھا؟ اور کیا ہندوستان میں دو قوموں کے وجود کو تسلیم کرانے سے مُراد محض مسلم اکثریت کے صوبوں کو فائدہ پہونچانا تھا؟
اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمان، کیا مسلمان نہیں ہیں؟ کیا اُن کا حق آزادی کوئی حق نہیں ہے؟ اور کیا وہ دائمی غلامی ہی میں رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی زندگی کا دارومدار محض مراعات و تحفظات پر ہوگا؟

اور یہ مراعات و تحفظات بھی آٹھ سال کی شدید باہمی منافرتوں۔ تلخ کلامیوں اور خونریزیوں کے بعد کون مانگے! کس سے مانگے!! اور کس مُنہ سے مانگے!!!
یہ کام "آل انڈیا مسلم لیگ" کے کرنے کا تھا۔ لیکن اُس کا صدر دفتر

کراچی منتقل ہو رہا ہے اور اُس کے ذمہ دار افسران گورنمنٹ پاکستان کے بڑے بڑے عہدے سنبھال چکے یا سنبھالنے والے ہیں۔ جو لوگ باقی بچے ہیں اُن پر عالمِ اضطراب طاری ہے یکجہتی مفقود اور انتشار خیال کی کارفرمائی ہے۔ من حیث القوم اور من حیث الجماعت بعد استصوابِ رائے عامہ کوئی کام ذمہ دارانہ حیثیت سے نہیں ہو رہا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک حملہ آور فتحمند فوج کو ناکامی و نامُرادی کا سبب بتائے بغیر اچانک میدانِ جنگ سے پسپائی کا حکم دے دیا گیا ہو۔ اور عام بھگدڑ اور ابتری پھیل گئی ہو۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کوئی کہتا ہے مسلم لیگ رہے گی۔ کوئی کہتا ہے نہیں رہے گی۔ کسی کا ارشاد ہے پاکستان چلو؟ کسی کا حکم ہے یہیں جمے رہو۔ کوئی للکارتا ہے کانگریس میں داخل ہو جاؤ۔ کوئی منع کرتا ہے، ہرگز نہیں! الغرض جتنے مُنہ ہیں اُتنی باتیں۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا کیا علاج ہے؟ ایک اور صرف ایک!

علی گڑھ چلو! علی گڑھ!

یہ بوڑھی اور ضعیف مادرِ علمی جس نے ۱۸۵۷ء کی ہولناک بربادی کے بعد تمہیں راہِ نجات دکھائی۔ جس نے ۱۹۰۶ء میں اپنی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کو قائم کیا۔ تا ایندم پروان چڑھایا۔ جس کے فرزندوں نے پاکستان کا خیال پیش کیا اور سارے ملک میں پیغامِ عمل پہنچایا۔ آج بھی تمہیں اپنے آغوشِ شفقت میں لینے اور تمہاری درد مندی کو تیار ہے۔

دارالعلوم علی گڑھ کی ... [illegible]

قائد اول سرسید علیہ الرحمۃ کے مزارِ پاک کی برکاتِ روحانی فکر صحیح سے بہرہ یابی کی ضمانت ہیں۔ آؤ اور ۱۵ اگست کے بعد ایک "آل انڈیا مسلم کنونشن" کا انعقاد کرکے اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرو۔

اس کنونشن میں تمام مسلم اخبار نویس۔ مسلم ممبرانِ مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز ضلع و شہری مسلم لیگوں کے عہدہ دار نیز دوسری غیر لیگی مسلم جماعتوں کے ارکان، جمع ہوں۔ اور یہ فیصلہ کریں کہ مسلمانانِ ہند:۔

(۱) پاکستان ہجرت کر جائیں یا ہندوستان ہی میں رہیں؟

(۲) کانگریس سے اتحادِ عمل کریں یا مخالفت کو جاری رکھیں؟

(۳) ہندوستان میں مسلم لیگ کو قائم رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے؟

اگر قائم رکھنے کے حق میں تصفیہ ہو تو آیندہ اس کا مرکز نقل علی گڑھ بنایا جائے تاکہ علی گڑھ کی مرکزیت و اہمیت کو نقصان پہنچنے کا جو احتمال پیدا ہو گیا ہے وہ بھی دور ہو جائے۔ اور ایک متفقہ اور مشترکہ پروگرام پر دلیرانہ عمل کیا جائے۔

کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنی جگہ اس ملک میں روایتی شان اور قوت کے ساتھ نہ قائم رکھ سکیں ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

سید الطاف علی بریلوی
(مدیر)

علی گڑھ
یکم اگست ۴۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلاموں اور پست اقوام پر اسلام کے احسانات

(از جناب مولوی محمد امین صاحب علیگ)

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب الٹ دو بدل دو فضا زمانے کی

(۱) مدعیانِ تہذیب یورپ کا دعویٰ ہے کہ سرزمینِ یورپ - ایشیا - افریقہ و امریکہ سے لامی کے انسداد کا سہرا انکے ہی سر ہے اور کہ اس تحریک کا آغاز انہی سے ہوا اور اس کی کامیابی نہی کی کوششوں اور فیاضیوں کی رہینِ منت ہے -

(۲) سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے باب ۳۷ صفحہ ۵۲۲ میں غلامی کی ترقی کا الزام اسلام کے سر ان الفاظ میں لگاتے ہیں کہ :-

"اسلام سے تین سب سے بڑی برائیاں پیدا ہوئیں جو ہر ملک اور ہر زمانے میں رائج ہیں اور اس وقت تک برابر قائم رہیں گی جب تک کہ مسلمانوں کا ایمان قرآن پر ہے - اولاً کثرت ازدواج - ثانیاً طلاق - ثالثاً غلامی - یہ وہ مسائل ہیں جو اخلاقِ عوام کی جڑ پر تبر کا کام کرتے ہیں - معاشرتی منزلی زندگی کو مسموم بناتے ہیں اور سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کرتے ہیں۔"

کثرتِ ازدواج اور طلاق کے مسائل اِس وقت ہماری بحث سے خارج ہیں۔ ان پر بھی ہمارے علمائنے کافی اور شافی جواب دئے ہیں اور اور بھی دئے جا سکتے ہیں۔ اگر آج سر ولیم میور زندہ ہوتے تو یورپ کی موجودہ کثرتِ طلاق کو دیکھ کر ان سے پوچھتے کہ اب کیا فرماتے ہیں آپ۔

خیر اس وقت ہم واقعات اور دلائل کی روشنی میں یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ مدعیانِ تہذیب یورپ کا دعویٰ اور سر ولیم میور کا اتہام متعلق غلامی کہاں تک صحیح اور درست ہے یا ان صاحبان نے از راہِ تعصب روشنی اور نور پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم دکھلاویں کہ اسلام نے غلاموں پر کیا کیا احسانات کئے ہیں اور ان کی آزادی اور ترقی کے لئے اور اس قبیح رسم کی روک تھام اور نیست نابود کرنے کے لئے کیا کیا سامان مہیا کیا، غلامی کی تاریخ اور آغاز اسلام کے وقت اس کی حالت بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کے آغاز اور پیدائش انسانی کے ایک مدت بعد جبکہ نسلِ انسانی بڑھی اور زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی اور رفتہ رفتہ خوفِ خدا ان کے دلوں سے جاتا رہا اور خود غرضی و طمع و لالچ نے انھیں گھیر لیا تو نتیجہ کے طور پر انسانی ہمدردی اور رحم و محبت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ ایک انسان نے دوسرے انسان کو یا ایک جماعت نے دوسری جماعت کو اپنی حفاظت اور ترقی کی راہ میں سدِ راہ پایا تو اس سے جنگ کی اور مخالف کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ نہ معلوم کتنا زمانہ اسی حالت میں گزر گیا۔ اس کے بعد انسانوں میں کچھ شعور پیدا ہوا تو جنگ میں جو لوگ گرفتار کئے گئے وہ نیست و نابود نہیں کئے گئے بلکہ ان کو قید کر کے غلام بنایا گیا۔ اور ان سے محنت کا کام لیا گیا۔ اگر قیدی ضرورت سے زیادہ ہوئے تو مثل جانوروں اور املاک کے فروخت کر دئے گئے۔

اس سے غلاموں کی تجارت کی بنیاد پڑی۔ رفتہ رفتہ غلامی اور غلاموں کی تجارت نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی۔ ایک طرف مالکوں نے غلاموں پر زیادہ سے زیادہ محنت اور مشقت ڈالدی اور کثیر سے کثیر نفع حاصل کرنے کے لئے جور و ظلم شروع کر دئے۔ دوسری طرف یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ غلام حاصل کئے جاویں۔ علاوہ جنگ کے لوگ دشمنوں کے ملکوں میں جاتے اور اِدھر اُدھر سے زبردستی یا دھوکہ سے جو لڑکیاں لڑکے اُن کے ہاتھ لگتے اُن کو

امیروں اور دولت مندوں کے ہاتھ فروخت کرتے اور نفع حاصل کرتے تھے۔ جنگوں کے بعد ہزیمت خوردہ فوج اور باشندگانِ ملک غلام بنائے جاتے تھے اور فاتح لشکر اور اُسکے سرداروں میں حسب مراتب تقسیم ہوکر مناسب حال بازاروں میں فروخت کر دیئے جاتے تھے اُن سے مختلف خدمتی کام لئے جاتے تھے یا پیشے کرائے جاتے تھے اور آقا اُن کی کمائی سے نفع اُٹھاتے تھے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں اِس کا رواج پھیل گیا۔ ... قوم نے اس تجارت میں ایک منظم صورت پیدا کر دی۔ یورپ والے افریقہ نکل جاتے۔ امریکہ پہنچتے اور وہاں کے باشندے ان کی گرفت میں آسکتے اُن کو چوپایوں کی طرح جہازوں پر لاد کر یورپ کی منڈیوں میں پہنچاتے اور فروخت کرتے تھے۔ اس طرح ان ظالموں نے بستیاں۔ قصبے اور بڑے شہر خالی اور تباہ کر دئے اور یورپ کے بازار غلاموں سے پٹ گئے۔ ہر قسم کے مظالم ان بیکسوں پر توڑے جاتے تھے۔ نہ اُن کے آرام و آسایش کا کسی کو خیال ہوتا تھا اور نہ ان کی بھوک پیاس کا۔ یہاں تک کہ منڈیوں تک پہنچتے پہنچتے اُن میں سے بہتیرے ناقابل برداشت تکالیف اور اذیتوں کی وجہ سے جاں بحق تسلیم کر جاتے تھے۔ خطرہ اور طوفان کے موقعہ پر سمندر میں زندہ پھینک دئے جاتے تھے۔

ذرا ذرا سے قصور پر سخت سے سخت سزائیں دینا یہاں تک کہ قتل اور نذر آتش کرنا بھی خلافِ انسانیت نہ سمجھا جاتا تھا۔ آقاؤں کو غلاموں کی جان و مال۔ بال بچوں۔ گوشت پوست پر کلی اختیار تھا۔ ان کو انسان خیال کرنا ہی ایک گناہ تھا اور حسن سلوک اور خدا ترسی کے تمام دروازے ان بدنصیبوں پر بند تھے۔ غلاموں کی ماؤں۔ بیبیوں۔ بہنوں اور بیٹیوں کی آنکھوں کے سامنے عصمت دری ہوتی تھی۔ مگر ان بدنصیبوں کو لفظ شکایت زبان پر لانے کا یارا نہ تھا اور کسی کو ان مظلوموں پر رحم اور ترس نہ آتا تھا۔ یونانیوں کی علم دوستی اور تہذیب بھی اِسکے آڑے نہ آسکی۔

یہ سچ ہے کہ افلاطون نے سب سے اوّل عامتہ الناس کی فلاح و بہبودی کی تجاویز پیش کیں اور بہت سے مفید مسائل پر روشنی ڈالی۔ مگر غلاموں سے رواداری اور رحم و کرم کے مسئلہ میں وہ بھی خاموش رہا۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود گرداب غلامی میں گرنے سے نہ بچ سکا۔ حکیم ارسطو باوجود دعویٰ ہمدردی انسانی رکھنے کے رسم غلامی کا موید اور ترقی دینے والا تھا۔ دیماستھینز غلامی کے دستور کا پورا پورا دلدادہ تھا اور اتھینز دارالخلافہ یونان کو غلاموں کی

سب سے بڑی منڈی بنانا چاہتا تھا۔

اُس وقت بھی جبکہ سلطنتِ روما کی ترقی، عظمت اور تہذیب کا آفتاب بلند تھا اِن غریبوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی بلکہ برعکس اُس کے جیسا کہ ایڈورڈ گبن اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

"رومیوں نے غلامی کو انتہائی مکروہ اور بھیانک صورت دیدی تھی۔ قانون نے غلاموں کو جائداد قرار دیا ہوا تھا اور آقاؤں کو اُن پر زندگی اور موت کے کلی اختیارات حاصل تھے۔ رومی ان سے انتہائی مشقتیں لیتے تھے اور ذرا ذرا سی لغزش پر شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ دُرّے اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔ پانی میں غوطے دئے جاتے تھے۔ گرم لوہے یا تیل سے داغے جاتے تھے۔ جلتے ریت پر سخت دھوپ میں لٹائے جاتے تھے اور سینہ پر بھاری پتھر رکھدئے جاتے تھے۔ شکنیں کس کر پیروں میں رسّی باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا۔ قتل اور نذرِ آتش یا سمندر کئے جاتے تھے۔"

غرضیکہ ایذا رسانی اور تکلیف دہی کی عجیب و غریب اور نئی نئی ترکیبیں اُن مظلوموں پر ختم کیجاتی ہیں۔ ممالک رومی پر کیا منحصر تھا تمام دُنیا کی قریب قریب یہی کیفیت تھی۔ اہلِ کسٹائل کی یہ ت تھی کہ وہ جس شہر یا قصبے کو فتح کرتے تھے وہاں کے باشندوں کو قتل کر دیتے تھے اور جو رہتے تھے اُن کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ بخت نصر کے عہد میں بکثرت غلام موجود تھے وہ صرف ت المقدس سے ایک لاکھ غلام پکڑ کر لے گیا۔ بابل اور نینوا میں غلاموں کی بھرمار ہو گئی۔ عیسو نشاہ چین کے پاس بھی بے شمار غلام اور لونڈیاں تھیں۔ ہندوستان میں ٹیکسلا ایک ت بڑی منڈی غلاموں کی تھی۔ لالہ لاجپت رائے نے تاریخ ہند میں صرف اس قدر تحریر یا ہے کہ ویدک زمانہ میں ہندوستان کے اندر غلامی موجود تھی۔ چندر گپت جب شکار کو تا تھا تو اس کی لونڈیاں ہی اس کی حفاظت کا کام کرتی تھیں۔ مگر آریوں کے زمانہ میں جو ت غلامی کی تھی وہ سب سے نرالی اور ہولناک تھی۔ اُنھوں نے ملک کو فتح کر کے اسکے ی باشندوں کو اپنا غلام بنایا اور اُن کو شودر کے نام سے ملقب کیا۔ اُن کو ایسے آہنی وں میں جکڑا جس کی مثال دُنیا میں نہیں ہے۔ بہتیروں کو جنگلوں اور ویرانوں کو فرار نے اور جنگلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور تہذیب اور شائستگی کے تمام دروازے اُن پر ر دئے کہ آج تک وہ اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں اور جو بچے اُن کو ہندو دھرم میں شامل تے ہوئے تمام ملکی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی اور مذہبی حقوق سے محروم کر دیا۔ اُنسے

پوری پوری خدمت لیتے ہوئے اُن کو نجس عین قرار دیا۔ قانون اور مذہب کے رُو سے ایک برہمن کو حق حاصل تھا کہ اگر کوئی شودر اپنا سایہ ڈال کر یا کسی اور طرح اُس سے گستاخی کرے تو فوراً اُس کی زبان کاٹ لے۔ اگر کوئی اچھوت مقدس وید کا منتر پڑھنا اور یاد کرنا تو درکنار سننے کی کوشش کرے تو اُس کے کانوں میں کھولتا ہوا سیسہ ڈالا جائے اور اگر کوئی ملیچھ کسی بت پر نظر غلط انداز بھی ڈالے تو آگ میں سلائیں گرم کرکے اُس کی آنکھوں میں پھیر دی جاویں۔ برہمنوں کے مقابلہ میں شودروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اُس کے مال و اسباب یہاں تک کہ اُن کی عورتوں میں بھی مذہبی پیشوا اور حاکم وقت حصہ دار تھے۔ اسکے علاوہ ان مجبوروں پر وہ وہ مظالم توڑے جاتے تھے کہ جن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ زبان سے آہنسہ کی رٹ لگانے والے اور رحم دلی کی تلقین کرنے والے۔ ایک کیڑی کو بھی مارنا گناہ سمجھنے والے اپنے جیسے انسانوں کو خود غرضی۔ نفس پرستی اور شقاوت کی دراز چھُریوں سے ذبح کرنا اپنا مذہبی حق اور کارِ ثواب سمجھتے تھے اور اب بھی وہ سلسلہ باوجود جناب گاندھی کی پولیٹکل تحریک کے ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ مسئلہ محض سیاسی وجوہ پر ہندوؤں کو فائدہ پہنچانے اور مسلمانوں کی نقصان رسانی کے لئے اُٹھایا گیا ہے۔ اس تحریک کی بنیاد اس اندیشے پر ہے کہ اچھوت کہیں اسلام میں شامل نہ ہو جاویں یا اُن کی علیحدہ اقلیت نہ تسلیم کرلی جاوے۔ خلوص اور صداقت سے یہ تحریک خالی ہے۔ ہندو من حیث القوم کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ اچھوت اور وہ برابر ہو جاویں۔ اِن کا مذہبی قانون سختی سے اس کی مخالفت کرتا ہے۔

الغرض دُنیا کے ہر ایک ملک ہر ایک سلطنت ہر ایک تہذیب نے بجائے کسی قسم کی روک تھام کرنے کے غلامی اور غلاموں کی تجارت کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس کو برابر فروغ دیا۔ دنیا میں بے شمار بزرگ۔ نبی۔ رسول۔ رشی۔ منی۔ اوتار اور ریفارمر پیدا ہوئے ہیں مگر ہمارے رسول کریمؐ سے قبل کسی کو بھی مظلوم غلاموں کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔

عیسائیت نے باوجود اپنی تعلیم "اپنے دشمن سے بھی محبت کرو" کے ان بے زبانوں کے لئے کچھ نہ کیا بلکہ برعکس اس کے بڑے بڑے مظالم اُن بدنصیبوں پر مذہب کے نام سے توڑے گئے۔ بقول مسٹر چارلس ووڈ ہون برٹن کے اگر ہم زبور۔ توریت اور انجیل کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی غلامی کی قدیم رسم پائی جاتی ہے۔

آرچ ڈیکن کننگھم کہتے ہیں کہ پولوس رسول کے وقت سے آج تک عیسائیوں میں سے کسی نے رسم غلامی کو بُرا قرار نہیں دیا۔ پولوس رسول کی ہدایت تھی کہ عیسائیت قبول کرنیوالے غلاموں کو بجائے آزاد کرنے کے اُن کے آقاؤں کے پاس بھیجدیا جاوے۔ مسز تو برا پنی کتاب "عیسائیت اور اُس کا چلن" میں لکھتی ہیں کہ عیسائیت نے غلاموں کو کبھی آزاد نہیں کیا، بلکہ اِس نے غلامی کے رواج کو سراہا ہے اور عیسائی پادریوں نے اِس رواج کو ترقی دی اور مضبوط کیا۔

راجہ اشوک جو بودھ مت کا سب سے بڑا علم بردار تھا لاکھوں غلام رکھتا تھا۔ مذہب اہل ہنود نے جو مذہبی قانون غلاموں کے لئے بنایا اُس کا خلاصہ اوپر دیا جاچکا ہے۔ اُس نے غلاموں کو ایسے آہنی بندوں میں جکڑا جس کی مثال موجود نہیں ہے۔ غرضیکہ دنیا کے کسی مذہب نے سوائے اسلام کے ان بدنصیبوں اور بے زبانوں پر رحم وکرم کرکے اُن کی بہبودی اور فلاح کی تدبیر پیش نہیں کی۔ سب سے پہلا قدم دُنیا کی تاریخ میں غلاموں کی اصلاح وہمدردی کے لئے جو اُٹھایا گیا وہ اسلام کا تھا اور وہ آواز جو سب سے پہلے اُن کی حمایت میں بلند ہوئی جناب محمد صلعم کی تھی۔

مدعیانِ تہذیب یورپ غلامی کے انسداد کے دعویدار ہیں کس قدر حیرت اور تعجب کا مقام ہے ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کے قدرتی حق آزادی کے سلب کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ یورپ والوں کا ہے۔ خود اُن کے ملک میں سرفوں کی حالت مثل شودروں کے رہی ہے اور غلامی کو اُنھوں نے کمال کو پہنچایا اور آج بھی وہ دوسری صورتوں میں دُنیا کے حق آزادی کو سلب کرنے کے لئے بڑے بڑے خطرناک ساز وسامان کے ساتھ تیار اور آپس میں بھی دست گریباں نظر آرہے ہیں۔

امریکہ میں اگرچہ غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ قانون کبھی شرمندۂ معنی ہوا ایک انگریز مصنف مسٹر بریس لکھتا ہے کہ افریقی غلاموں کی تجارت بدترین لعنت بنی نوع انسان کے لئے ہے اور اِس جرم کا گناہ کلیسا کے سر ہے ؎

عطا کی ہے تجھے تہذیب یورپ نے وہ آزادی
کہ ظاہر میں آزادی ہے باطن میں گرفتاری

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد (اقبال)

نہیں بلکہ وہاں اب بھی حقیقتاً غلامی موجود ہے۔ تھوڑے زمانے کے واقعات ہیں کہ اگر کوئی حبشی کسی سفید عورت کو بوسہ دیتا ہوا پایا گیا تو زندہ جلا دیا گیا۔ قریب کے زمانہ میں عیسائی غلام رکھتے اور گرجا کے نام سے غلاموں کی خرید و فروخت کرتے رہے ہیں۔ غلام بھی وہ غلام تھے جن کو عیسائی کہا جاتا تھا۔ ایک مسیحی انجمن ملک گائنا میں غلاموں کی تجارت میں مصروف تھی جو باربڈوس کی نوآبادی میں اُن سے زراعت کا کام لیتی تھی۔ بپٹسٹ اور میتھوڈسٹ عیسائی فرقوں کے پاس ابراہیم لنکن کے زمانہ میں دو اور ڈھائی لاکھ غلام بالترتیب موجود تھے اور جنوبی ریاستوں میں غلام لڑکیاں جو مسیحی کہی جاتی تھیں بذریعہ نیلام عام فروخت ہوتی تھیں سنہ ۱۷۶۰ء میں صرف لندن میں قریب ایک لاکھ سیاہ فام غلام موجود تھے۔

اگرچہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے اعتبار سے دورِ حاضرہ روشن ترین زمانہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مبصرین کے نزدیک دنیا میں ایسے انسانوں کی تعداد ۵۰ لاکھ کے قریب ہے جن کی دیگر تجارتی اشیاء کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے سنگاپور۔ شنگھائی۔ ہانگ کانگ اور چین کے دوسرے حصوں میں ۳ برس کے بچے ۵ شلنگ میں علانیہ فروخت ہوتے تھے۔ ان بچوں کے ساتھ جو گھروں میں کام کرتے ہیں وحشیانہ سلوک کیا کیا جاتا تھا۔ خود انگلستان میں ہزار ہا لڑکیاں دھوکہ دے کر کنیڈا اور دوسرے انگریزی نوآبادیوں میں بھیج دی جاتی ہیں جو وہاں غلامانہ زندگی بسر کرتی ہیں اور باوجودیکہ مجلس اقوام نے انسداد غلامی کا مسئلہ اپنے پروگرام میں شامل رکھا تھا، مگر اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ (خلافت مورخہ ۹ مارچ ۱۹۲۶ء)۔

آئیے اب ہم واقعات کی روشنی میں دیکھیں کہ مدعیانِ تہذیب یورپ و امریکہ نے غلاموں کی آزادی کے لئے کیا کیا اور کن حالات میں کیا اور کیا واقعی انکا مقصد غلاموں کی پوری ہمدردی تھی یا صرف ریاکاری اور نمائش۔

ابراہیم لنکن جو غلاموں کا بڑا ہمدرد کہا جاتا ہے مسیحی انداز میں ناز سے کہتا ہے کہ اس نے غلاموں کو آزاد کرنا محض اس لئے ضروری سمجھا کہ ملک میں اتفاق ہو جائے اور ابتری نہ پھیلے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ ملک میں اتحاد غلاموں کو آزاد کئے بغیر قائم کر سکتا تو وہ غلاموں کو ہرگز آزاد

نہ کرتا۔ یعنی اُس نے جو کوشش غلاموں کے حق میں کی وہ بعض واقعات، مشکلات اور مجبوریوں کے تحت میں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت کلیسا کی مختلف جماعتوں میں زیادہ سے زیادہ غلام حاصل کرنے کی سعی تھی اور اُن میں رشک و حسد کی آگ بہت بلند ہو چکی تھی۔ اُس پر ابراہیم لنکن کا جو حشر ملک اور ہم قوموں کے ہاتھ ہوا وہ دُنیا کو معلوم ہے۔ واقعات صاف بتاتے ہیں کہ اہلِ فرنگ نے یہ اقدام محض نیکی کے لئے نہیں کیا۔

افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی نوآبادیات کے حالات کا مطالعہ کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ان ممالک کے اصلی باشندگان کے ساتھ یورپین اقوام نے کیا سلوک کیا اور کہاں تک ان کو آزادی عطا کی۔ ایف ڈبلیو ٹی صاحب کہتے ہیں کہ تمام گوری اقوام اس پر متفق ہیں کہ جنوبی افریقہ میں وہاں کے اصلی باشندگان کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ پولیٹکل اور سول حقوق حاصل کریں۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں تہذیب اور شائستگی کی بہشت بریں یعنی امریکہ متحدہ میں ایک سوسائٹی تھی جس کا نام "کلوکلکس کلان" تھا۔ جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ نیگرو اقوام کو غلامی سے آزاد نہ ہونے دیا جاوے۔ اس انجمن کے ممبر لاکھوں تھے اور ہر طبقہ یورپین سے تعلق رکھتے تھے۔

سنہ ۱۸۸۹ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک ۳۲۲۴ اور سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک ۱۸۰۰ امریکہ کے اصلی باشندے نہایت بے دردی اور شقاوت کے ساتھ اس لئے قتل کئے گئے کہ وہ گوری قوم کے ہم رنگ نہ تھے۔ یہ بدبخت وہ تھے جو کسی جرم میں ماخوذ ہوئے مگر بجائے قانونی مواخذہ کے ان کا شکار اس طرح کیا گیا کہ کسی کو سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر جسم کا قیمہ قیمہ کر دیا گیا۔ کسی پر مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ کسی کی چھروں۔ قرولیوں اور برچھیوں سے تکہ بوٹی کی گئی اور اگر کسی نے ان تہذیب سوز طریقوں کو جن کو امریکہ کی اصطلاح میں "لنشنگ" کہا جاتا ہے روکنے کی کوشش کی تو اس کو مذاق میں اُڑا دیا گیا (بحوالہ پانیر مورخہ ۲۴ فروری سنہ ۱۹۳۹ء) حال کے واقعات لنشنگ" اخبارات میں آ چکے ہیں اور نامبردہ سوسائٹی امریکہ کے اصلی باشندگان کو حقوق دئے جانے کے تذکرہ پر پھر وجود میں آ گئی ہے۔

آئیے اب ہم آپ کو یہ بھی بتائیں کہ وہ اسباب کیا تھے کہ جنھوں نے یورپین اقوام کو نمائشی اور پُر فریب انسدادِ غلامی کی طرف مجبور کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد یورپین اقوام کی ریشہ دوانی اور اسلام کے سبقِ اتفاق۔ اخوت۔ یک جہتی و حریت کو مسلمانوں کے فراموش کر دینے کی وجہ سے

[illegible]

افریقہ کی مسلم سلطنتیں روبہ تنزل ہونی شروع ہوئیں۔ کلیسائے یورپ نے پیشوائوں کے اپنے مسیحی مبلغ ایشیائی اقوام میں روانہ کرنے شروع کر دئے۔ ان کی پہلی یورش افریقہ پر ہوئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ اول اول تو افریقہ کے باشندے عیسائیت کو آزادی۔ مساوات حریت اور انسانیت کا مجسمہ سمجھ کر پادریوں کے فریب میں آگئے مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ استبداد کے عفریت کا لقمہ ہونیوالے ہیں اور باوجود عیسائیت قبول کر لینے کے ان کی حیثیت ہندوستانی شودروں سے کچھ بھی اونچی نہیں اور کہ دراصل مسیحیت کے پردہ میں ملک گیری کا حربہ پوشیدہ ہے تو مسیحیت کی رو ایک دم رک گئی۔ افریقی اقوام نے تاڑ لیا کہ سفید اقوام اور ان میں باوجود یگانگت مذہبی کے حقیقی معنوں میں اخوۃ قائم نہیں ہے اور اس کے ساتھ ان پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ان کے اور مسلمان ہمسایہ میں مساوات اور ہمدردی بہتر رنگ میں کارفرماں ہے۔ نسلی اور ملکی امتیاز ان میں مفقود ہے۔ غلام اور آقا مذہب کی نظر میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔ اور مسلمان باوجود اپنی ناداری کے غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے میں برابری کا سلوک ہے تو قدرتاً انکے دل اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی طرف سے نہ مبلغین مامور تھے اور نہ باقاعدہ تبلیغ کا کام جاری تھا۔ چنانچہ جنرل سمٹس جیسے شخص نے تسلیم کیا کہ افریقہ میں اگر عیسائیوں کے تمام گرجوں کی متحدہ کوششوں سے ایک آدمی عیسائی ہوتا ہے تو اسلام کی آغوش میں دس چلے جاتے ہیں۔ ارباب کلیسا شکست خوردہ ہو گئے اور انھوں نے اپنے اپنے ممالک کی حکومتوں کو توجہ دلائی کہ وہ بھی غلاموں کو آزاد کرنے کی تحریک شروع کر دیں تاکہ اسلام کی بڑھتی ہوئی رو کا کچھ تو مقابلہ کیا جاوے۔ جنوبی افریقہ کے زولو قوم کی نسبت مسٹر گاندھی نے اسی زمانے میں لکھا تھا کہ ایک زولو عیسائیت قبول کرنے کے بعد دیگر عیسائیوں کے برابر نہیں سمجھا جاتا اور اس کو مساوات کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جب وہ مسلمان ہو جاتا ہے تو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی پیالہ سے پانی پیتا ہے اور ایک ہی رکابی سے کھانا کھاتا ہے۔

اسی ضمن میں ریورنڈ کینن نے انگلستان کے گرجاؤں کی کانفرنس میں ایک موقعہ پر کہا کہ اگر کوئی نیگرو قوم اسلام کے آغوش میں آجاتی ہے تو وہ قوم بت پرستی۔ اوہام پرستی۔ شیطان پرستی کو یک لخت ترک کر دیتی ہے پھر وہ نہ بہیمانہ زندگی بسر کرتی ہے نہ انسانی قربانیاں کرتی ہے اور نہ بچوں کو قربان گاہوں کے نذر کرتی ہے۔ وہ ستر پوشی اختیار کرتی ہے اور خودداری اور عزت نفس کی روح حاصل کر لیتی ہے اور انسانی مروت اور برادرانہ روا داری

کی رُوح اُن میں پیدا ہو جاتی ہے اور اپنی عزت کا ان کو یقین ہو جاتا ہے۔ رسم غلامی خاص قوانین اور نظام کے تحت میں آ جاتی ہے اور اُس کی بُرائیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ رسم غلامی مذہب اسلام کا کوئی جزو نہیں ہے۔ چونکہ اس کا کسی نہ کسی صورت میں ہونا ناگزیر ہے اس لئے ان میں برائے نام رہ جاتی ہے اور اُس کو بھی مکروہ خیال کیا جاتا ہے۔ غلامی اسلام میں ملازم ہی سی رہ جاتی ہے اور اُس کے قوانین ان قوانین سے بہت نرم بن جاتے ہیں جو امریکہ میں نافذ ہیں۔ اسلام نے تہذیب اور تمدن کے ارتقاء کے لئے عیسائیت سے زیادہ کام کیا ہے اور یہ افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایسا ہوا ہے۔" غیر مسلم کی زبان سے اللہ تعالےٰ اعتراف کراتا ہے کہ غلاموں کو حقیقی آزادی اور درجۂ مساوات صرف اسلام نے بخشا ہے۔

آئیے اب اسلام کا جائزہ لیں کہ اِس نے اور مسلمانوں کے ہادی برحقؐ نے کیا حقوق اور کس طرح غلاموں کو عطا کئے اور کیا وہ حقوق واقعی ایک غلام کو عام مسلمان کے برابری کا درجہ دیتے ہیں۔

رسولِ خداؐ کی تشریف آوری کے وقت عرب کی بھی وہی کیفیت تھی جو دیگر ممالک کی تھی کوئی آسودہ گھر غلاموں سے خالی نہ تھا۔ بردہ فروشی کمال کو پہونچ چکی تھی۔ ایک آقا کو حق حاصل تھا کہ تعمیل حکم کے لئے اپنے غلام کے ساتھ جس طرح چاہے سلوک کرے اور جن ذرائع کو چاہے استعمال کرے۔ ہر قسم کا جور و تشدد جائز تھا۔ غلاموں کو اپنے آقا کے لئے روپیہ پیدا کر کے دینا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک آقا جس کے پاس چند غلام عورتیں ہوتی تھیں اُن کو اپنے فائدہ کے لئے کسب کمانے پر مجبور کر سکتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا۔ غلاموں پر انواع و اقسام کے مظالم دن رات ڈھائے جاتے تھے۔

آخر رحمتِ باری تعالےٰ جوش میں آئی اور جناب محمدؐ دنیا کی درستی اخلاق۔ اخوت۔ ہمدردی اور مساوات کا صحیح سبق دینے کے لئے رحمۃ اللعالمین بنا کر دنیا میں بھیجے گئے۔ آپ نے اپنے گرد و پیش جہاں اور بُرائیاں لوگوں میں ملاحظہ فرمائیں اور اُن کی اصلاح کی وہاں غلاموں کی حالت کو بھی بغور مشاہدہ کیا۔ گھر اور خاندان اور قبیلے ہی میں غلام موجود تھے اُن پر جو گزرتی تھی اُس کو دیکھا وہ سلوک نظروں سے گزرا جو اُن غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ روا رکھا گیا جو ابتدا میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اُن مظالم میں سے جو میں اوپر کسی جگہ بیان کر آیا ہوں شاید ہی کوئی ہو گا جو ان مظلوموں پر روا نہ رکھا گیا ہو۔ غلام زبانِ حال سے گویا تھا۔

ہمہ حسرت ہوں سراپا غم و بربادی ہوں　ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے

ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

غرضیکہ غلاموں کی ہر ایک تکلیف کو دیکھ کر آپ کا دل دُکھتا اور ماہی بے آب کی طرح بیتاب تھا۔ آپ اُن کی آزادی اور نجات غلامی کے لئے بے چین رہتے تھے مگر مجبور تھے۔ صرف بارگاہِ ایزدی میں اُن کی بہتری کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے اور قبل بعثت اپنے احباب۔ اعزا اور ملنے جلنے والوں کو غلاموں سے حسن سلوک کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہو جانے پر ممدوحہ نے اپنی تمام جائداد حضور کو منتقل کر دی۔ ممدوحہ ایک متمول خاتون تھیں اور آپ کی املاک میں مال و دولت کے علاوہ غلام بھی تھے۔ چنانچہ یہ موقعہ حاصل ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ غلاموں کو آزاد کر دیا مگر آپ کے مخالفین اس نیک تحریک کی بھی مخالفت اس لئے کرتے رہے کہ غلاموں کی آزادی سے اُن کا وقار فنا ہو جائیگا۔ بعثت کے بعد باوجودیکہ مخالفین اسلام نے اپنی کنیزوں اور غلاموں کے ہاتھوں آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بے شمار انواع و اقسام کی تکالیف اس لئے پہنچائیں کہ غلاموں کی ہمدردی کے خیالات آپ کے دماغ سے نکل جاویں۔ لیکن کیا مجال جو آپ کے قدمِ استقامت کو ذرا بھی لغزش ہو۔ جتنا غلاموں کے ہاتھوں حضور ستائے گئے اُتنا ہی زیادہ ذوق اور دلچسپی کے ساتھ آپ نے اُن کی ہمدردی اور بہبودی کے لئے کوشش فرمائی۔

آخر وہ زمانہ بھی آگیا جبکہ آپ کو اقتدار حاصل ہوا۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ یکلخت غلامی کو مسدود اور غلاموں کے آزاد کرنے سے نظام ملک میں بہت بڑی ابتری پیدا ہو جائیگی۔ لاکھوں غلام خاندانوں اور قبیلوں میں موجود تھے جن پر صَرف کثیر ہو چکا تھا اور لوگوں کے کاروبار اُنہی ذریعہ فروغ پا رہے تھے۔ لاکھوں نفوس کی بیکاری سے جو نتیجہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا وہ بھی مدنظر تھا۔ اس لئے آپ نے نہایت دُور اندیشی کے ساتھ تدریجاً ہدایاتِ ربانی کے تحت غلامی کو منسوخ کرنیکی مصلحت آمیز تدابیر اختیار کیں۔

(۱) سب سے اوّل آپ نے حکم دیا کہ کسی آزاد انسان کو فروخت کرنے والا واجب القتل ہوگا۔ اسطرح غلامی کی جڑ کاٹ کر رکھدی اور اُن لوگوں کے لئے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورتوں بچوں و مردوں کو زبردستی پکڑ کر غلام بنالیا کرتے تھے عرصہ تنگ کر دیا۔

(۲) اس کے بعد محض غلام بنانے یا مال و دولت لوٹنے کی غرض سے ہمسایہ قوم پر حملہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اگر مومنین میں سے دو قومیں مقابلہ پر آمادہ ہو جاویں تو اُن میں صلح کرا دو اور زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو جب تک کہ وہ راہ راست پر نہ آجائے یعنی جلب منفعت کے لئے بلا وجہ حملہ کرنے اور غلام بنانے کا انسداد کر دیا گیا۔

(۳) کفار سے جنگ کرنے کے متعلق فرمان الٰہی سورۂ محمدؐ میں یہ نازل ہوا کہ جب کفار سے تم جنگ کرو تو تم اُن کی گردنیں مار دو یہاں تک کہ تم اُن پر غالب ہو جاؤ اور اُن کو قیدی بناؤ۔ بعدہٗ اُن پر احسان کر کے آزاد کر دو یا اُن کو فدیہ لیکر رہا کر دو یہانتک کہ جنگ ختم ہو جائے۔

اِس فرمانِ الٰہی میں مسلمانوں کو وہ طرزِ عمل سکھایا گیا ہے کہ اُن کو کفار کے ساتھ جنگ کرنے میں ہزیمت خوردہ کفار کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ صرف جنگ ایسے جائز وجہ پر رکھی گئی کہ جس میں انسانی آزادی چھینی جا سکتی ہے اور باقی تمام صورتیں جن سے غلامی ترقی پکڑ سکتی تھی ممنوع قرار دیگئی مگر جنگ کی صورت میں بھی حکم یہ ہے کہ جب تک جنگ جاری رہے دشمنوں کو جو مسلمانوں کے قبضہ میں آجاویں قید کیا جاوے اور پھر یا تو بطور احسان کے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاوے۔ یہ حکم نہیں ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو بطور غلام فروخت کیا جائے۔ آج بھی وہ قومیں جو تہذیب اور شائستگی کی دعویدار ہیں مفتوح اقوام سے فدیہ وصول کرتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فدیہ کا نام تاوان جنگ رکھا گیا ہے۔ اور اِس نام سے مفتوح قوم کا خون چوس لیا جاتا ہے۔

رسولِ خداؐ کا عمل زیادہ تر یہی تھا کہ جنگ کے قیدی بطور احسان آزاد کر دئے گئے جیسا کہ بنی مصطلق کے سو خانداں اور ہوازن کے چھ ہزار جنگی قیدی بغیر کسی قسم کا فدیہ لئے ہوئے آزاد کئے گئے۔ صرف جنگ بدر میں ستر قیدی معاوضہ لے کر چھوڑے گئے اور وہ بھی بدیں وجہ کہ اُس وقت مسلمانوں کی حالت بہت کمزور تھی اور دشمن اسلام کی بیخ کنی پر تُلا ہوا تھا۔ مذکورہ بالا احکام کا خلاصہ یہ ہوا غلاموں کے حاصل کرنے کے دروازے قطعی طور پر بند کر دئے گئے۔ اب رہ گئے وہ غلام جو پہلے سے قبیلوں اور خاندانوں میں موجود تھے۔ اُن کی آزادی کے لئے دیکھئے کہ کیا تدابیر اختیار کیجاتی ہیں۔

(۴) سورۂ بقر میں حکم نازل ہوتا ہے کہ نیکی اور احسان کرو۔ اِن کے ساتھ جو تمہارے غلام بن چکے ہیں۔ پھر سورۂ بقر میں دوسری جگہ حکم ہوتا ہے۔

(۵) کہ اپنے مال سے اپنے قرابتیوں۔ یتامیٰ۔ مساکین۔ مسافروں۔ ضرورت مندوں اور غلاموں کو دو۔
(۶) پھر سورۂ توبہ میں صدقات میں فقراء مساکین وغیرہ کے علاوہ غلاموں کو بھی حصہ دار قرار دیا گیا۔
(۷) پھر سورۂ البلد میں اللہ تعالےٰ غلاموں کو آزاد کرنے کو نیک کاموں میں شمار کرتا ہے۔
(۸) پھر دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ نیک وہ ہیں جو اللہ کی محبت میں مسکین۔ یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ان تمام احکام کی غرض اور غایت یہ ہے کہ غلام خیرات اور صدقات کے ذریعہ روپیہ حاصل کرکے اپنی آزادی خرید سکے۔

اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب نے یہ تعلیم نہیں دی کہ کس طرح اپنے دشمنوں سے محبت کا اظہار کیا جاوے۔ ایک فاتح قوم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن کو اپنی دولت کا ایک حصہ۔ اقربا۔ یتامیٰ۔ مساکین۔ سائل وغیرہ کے علاوہ جنگ کے قیدیوں کے آزاد کرنے کے لئے صرف کرنا ہوگا۔ قرآنِ پاک کے باہر اور کہیں ایسی بلند اور پاکیزہ تعلیم کا وجود نہیں ملتا۔ اپنے دشمن سے محبت کی بلند تعلیم عیسائیت نے دی تو ضرور مگر لفظی۔ اِس کا عملی ثبوت صرف اسلام میں ملتا ہے۔

اِس نیک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان جہاں والدین۔ اقربا۔ یتامیٰ۔ مساکین وغیرہ کے ساتھ حُسنِ سُلوک کرنے لگے وہاں غلاموں سے بھی نیک برتاؤ شروع ہوگیا اور یہ بات نیکی کے کاموں میں شامل ہوگئی اور وہ اپنے اندوختہ میں سے غلاموں کو بھی دینے لگے تاکہ وہ ان عطیات کو جمع کرکے اور اس میں اپنی کمائی شامل کرکے اپنی آزادی خرید سکیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنے غلاموں کو چوبیس گھنٹہ میں کچھ وقت فرصت کا دیا کریں تاکہ وہ دیگر لوگوں کی محنت مزدوری کرکے کچھ رقم فراہم کرسکیں۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ اگر کوئی فدیہ دے کر آزادی کا مطالبہ کرے تو اُسے فوراً آزاد کردیا جاوے۔ فدیہ ادا کرنے کے لئے یہاں تک سہولت پیدا کردی کہ اگر فدیہ یکمشت نہ دے سکے تو قسطیں مقرر کرلی جاویں۔ چنانچہ اس قانون کی بدولت ہزاروں غلاموں نے آزادی حاصل کی دُنیا کا کوئی ملک۔ کوئی قانون۔ کوئی تہذیب کوئی مذہب اِس حُسنِ سلوک کی نظیر پیش نہیں کرسکتا۔ معاملہ یہاں ہی ختم نہیں ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اور کتنے ذرائع غلاموں کو آزادی دلانے کے پیدا کئے گئے ہیں:۔

(۹) مومن کے ہاتھ سے غلطی یا غیر ارادی طریقہ پر قتل ہو جائے تو علاوہ خون بہا کے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔

(۱۰) کسی دباؤ یا غلطی سے معاہدہ یا قسم توڑ دی جائے تو بطور کفارہ ایک غلام آزاد کیا جائے۔
(۱۱) اگر میاں بیوی میں تنازعہ ہو اور مرد غصہ میں عورت کو کہ بیٹھے کہ وہ اس پر حرام ہوئی۔ مگر بعد میں طبیعتیں صاف ہو جاویں اور مرد عورت کی طرف رجوع کرنا چاہے تو کفارہ لازم ہے اور وہ کفارہ ایک غلام کا آزاد کرنا ہے۔
(۱۲) روزہ قصداً توڑا جائے تو کفارہ غلام کا آزاد کرنا ہے۔

مندرجہ بالا احکامِ الٰہی کے علاوہ حضور اکرمؐ کا دردمند دل یہ دیکھنا پسند ہی نہ کرتا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھے۔ آپ نے اپنے احباب اور عقیدت مندوں سے پُرزور سفارش کی کہ وہ غلاموں کو حتی المقدور آزاد کر دیا کریں۔ آپ نے بیتُ المال کا ایک مصرف یہ بھی رکھا تھا کہ ہر سال اس میں سے کچھ رقم لے کر غلام خریدے اور آزاد کئے جاتے تھے۔ غلاموں کی آپ نے یہاں تک دستگیری فرمائی کہ حکم دیدیا
(۱۳) کہ اگر کوئی مالک اپنے غلام کو زدوکوب کریگا تو غلام مار پیٹ کے بعد فوراً آزاد تصور ہوگا۔ اِس حکم کا یہ اثر ہوا کہ مالکوں کی مطلق عنانی اور تشدد یک لخت بند ہو گئی۔ اور غلاموں کو کلی امن حاصل ہو گیا۔

لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب فاطمہؓ نے خانگی محنت و مشقت سے مجبور ہو کر بمشورہ جناب علی مرتضیٰؓ رسول کریمؐ سے ایک کنیز کے لئے درخواست کی تو آپ نے بجائے کنیز عطا فرمانے کے فرمایا کہ اللہ کی یاد زیادہ کیا کرو اور ایک وظیفہ بتا دیا کہ اس کو پڑھا کرو یعنی آپ کو گوارا نہیں ہوا کہ پیاری بیٹی اپنی خدمت کے لئے ایک کنیز رکھے۔ ایک عورت کی آزادی سلب کرنے کے مقابلہ میں آپ نے بیٹی کی تکلیف اور محنت و مشقت کو گوارا فرما لیا۔ آپ نے خود غلاموں سے وہ سلوک کیا کہ وہ گھر وطن تو کیا اپنے والدین تک کو بھول گئے۔ حضرت زیدؓ غلام تھے باپ فدیہ لیکر آزاد کرانے آیا اور بیٹے کو وطن لیجانا چاہا تو بیٹا رو کر کہنے لگا کہ مجھے اِس غلامی میں آزادی سے زیادہ لطف و عیش ہے۔ اِس سے زیادہ آزادی کی مجھ کو ضرورت نہیں اور وطن جانے سے انکار کر دیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں دس سال حضورؐ کی خدمت میں رہا مگر اس طویل زمانہ میں رسول کریمؐ نے مجھ سے کبھی زجر و تنبیہ کے طور پر بھی کوئی خفگی کا لفظ نہیں فرمایا۔ حضرت بلالؓ کاشانۂ نبوی کے مہتمم رہے۔ رسول اللہؐ نے اِن کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی

خلافت کے زمانہ میں آقا کے لفظ سے مخاطب کیا۔
ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے حضرت ابو سعید انصاریؓ کو دیکھا کہ اپنے غلام کو زدوکوب کر رہے ہیں۔ پیچھے سے آواز آئی کہ ابو سعید جانتے ہو کہ جتنا اختیار تمہیں اس غلام پر ہے اس سے کہیں زیادہ اختیار تم پر خدا تعالےٰ کو حاصل ہے۔ مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ صلعم تھے۔ عرض کیا کہ غلام نے قصور کیا ہے۔ فرمایا کہ معاف کرو۔ عرض کی کہ بار بار قصور کرتا ہے کہاں تک معاف کروں۔ فرمایا کہ ستر بار روزانہ معاف کرو۔ تھر آگئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ خدا کی راہ میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ فرمایا کہ اگر تم آزاد نہ کرتے تو والله آتش دوزخ میں جلتے۔
ماہ رمضان کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے آپ نے ایک موقعہ پر ہدایت فرمائی کہ جو اس ماہ میں غلام کا کام ہلکا کر دے گا اُسے اللہ تعالےٰ بخش دے گا۔
ابوذر غفاریؓ ایک دن غصہ میں اپنے غلام کو گالی دے رہے تھے آپ نے سُنا اور فرمایا کہ تجھ میں ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ غلام بھی تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ اور پہنو وہی ان کو دو اور کام اتنا دو کہ آسانی سے کر سکیں زیادہ کام ہو تو خود ان کی امداد کرو اور اس کی آپ نے بار بار تاکید فرمائی۔ چنانچہ آپ کی آخری وصیت یہی تھی جس کو آپ نے رحلت سے قبل کئی بار دُہرایا کہ نماز اور غلاموں کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ انسان کے بُرا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ دوسرے بھائی کو حقیر اور ناچیز سمجھے۔ مسلمانوں پر مسلمان کی جان و مال و آبرو پر دست برد حرام ہے۔
ابوذر غفاریؓ نے ایک شخص کو ان الفاظ سے مخاطب کیا کہ "اے حبشی کے بیٹے"! آپ نے سنا تو فرمایا کہ اے ابوذر دونوں پلڑے مساوی ہیں، سفید آدمی سیاہ آدمی پر کچھ فضیلت نہیں رکھتا۔ ابوذر شرمندہ ہو گئے اور اُس شخص کے پاس جا کر کہا کہ میرے مُنہ پر تھپڑ لگا اور مجھے معافی دے۔ چنانچہ ان احکامات الٰہی۔ ان ہدایتوں تلقین اور نمونہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں غلام آزاد کر دئے گئے۔ آپ کے دوستوں میں سے صاحبِ ثروت لوگوں نے بڑی بڑی تعداد میں غلام خرید کر آزاد کر دئے۔
حضرت عثمان غنیؓ نے تو اس حکم کے تحت میں سیکڑوں غلام آزاد کئے۔ آپ کا دستور تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہمیشہ ایک غلام ضرور آزاد کرتے تھے۔ اور آخر وقت تک اس نیک عمل کو جاری رکھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ صدقہ کے اونٹوں کو تیل لگا رہے تھے کسی نے کہا کہ یہ کام تو

غلام سے لینے کا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ سے بڑھ کر غلام کون ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کا ولی مسلمانوں کا غلام ہے۔ حضرت علیؓ اکثر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے " آخرت کی دنیا ہم اپنے لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں نہ فساد کرنا"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسندِ خلافت پر متمکن ہو کر خطبۂ اوّل میں اعلان فرمایا کہ تمہارا ضعیف فرد میرے نزدیک قوی ہے اُس وقت تک کہ میں اس کے حق کو اس کے لئے حاصل کر لوں اور ہر قوی شخص میرے نزدیک ضعیف ہے اُس وقت تک کہ میں اُس سے غریبوں کے حق حاصل کر لوں۔ یہ تھا ذہنی انقلاب جو رسولِ پاک کی بلند تعلیم نے پیدا کیا۔

رسمِ غلامی کے استیصال کے لئے ضروری تھا کہ لونڈیوں کے متعلق بھی اصلاح کی جائے اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً یہ کام ادھورا رہ جاتا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کریمانہ نظر ان کی جانب بھی مبذول فرمائی۔ سورۂ نور میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو۔ اِن کو نکاح سے روکنا زنا پر مجبور کرنا تھا۔ اوپر ذکر آ چکا ہے لونڈیوں سے جلبِ منفعت کے لئے حرام کاری کرائی جاتی تھی۔ اِس حکم کے صدور سے اس قبیح گناہ کا سدِ باب ہو گیا۔

دوسرا حکم اِسی سورۃ میں ایسا نازل ہوا کہ لوگوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنی نیک لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنی لونڈیوں سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد یہ حکم ہوا کہ ہر لونڈی بچہ جننے کے بعد آزاد متصور ہو گی۔ کیونکہ اسلام مسلمانوں کی ماؤں کو لونڈیاں دیکھنا پسند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہزاروں لونڈیاں آزاد ہو گئیں۔

رسول اللہؐ کی مساعی جمیلہ سے قبل کوئی آزاد عورت کسی آزاد شدہ غلام سے شادی کرنا اپنی ہتک سمجھتی تھی اور سوسائٹی بھی اس میں معترض تھی، اس خیال کی اصلاح کرنے کے لئے حضورؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح ایک آزاد شدہ غلام زید بن حارث سے کر دیا۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ حضرت بلالؓ نے جو آزاد شدہ حبشی غلام تھے جب عقد کا خیال ظاہر کیا تو مدینہ کے بڑے بڑے گھرانے اپنی لڑکیاں دینے کو تیار ہو گئے اور آپ کی شادی قبیلۂ قریش کی ایک خاتون سے ہوئی۔ ہے کوئی دعویدار جو دنیا کی تاریخ میں اتنے بڑے حُسنِ سلوک اور ایثار کی مثال دکھا سکے۔

حضور اکرمؐ نے محض اس لئے کہ غلاموں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جاوے اپنے خاندان کی جو عرب میں سب سے بلند اور ممتاز سمجھا جاتا تھا لڑکی کا ایک آزاد شدہ غلام کے ساتھ عقد کر دیا۔ اس شفقت اور کرم کی کوئی نظیر مل سکتی ہے کہ آپ نے حکم جاری فرمایا کہ کوئی شخص غلام کو میرا غلام اور

لونڈی کو میری لونڈی نہ کہے بلکہ میرا بچہ یا میری بچی کہے اور حکم دیا کہ جو غلام جس قبیلہ یا خاندان میں آزادی حاصل کرے گا وہ اسی قبیلہ یا خاندان کا جزو اور متصور ہوگا۔ مثلاً ہاشمی خاندان کا غلام آزاد ہو کر ہاشمی کہلانے کا مستحق ہوگیا۔ پھر تکبر اور نخوت کو مٹانے اور حریت اور مساوات کے سبق کو دل نشیں کرنے کے لئے حضورؐ نے بالارادہ کئی جنگوں میں کمانڈر ایسے شخص مقرر کئے جو آزاد شدہ غلام تھے۔ مثلاً زیدؓ بن حارث۔ موسیٰؓ بن عقبہ۔ اسامہؓ بن زید اور ان کے ماتحت نجیب الطرفین سردار مثل حضرت عمرؓ و حضرت ابوبکرؓ کو معمولی سپاہیوں کی حیثیت سے کردیا۔ بعض لوگوں نے حضرت اسامہؓ کی سرداری پر اعتراض کیا تو فرمایا کہ اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اسامہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔

کیا دنیا کی تاریخ ایسی مثال پیش کرسکتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ غلاموں نے وہ ترقی کی کہ جس سے دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اکثر ممالک میں غلاموں نے یہاں تک ترقی کی کہ وہ سریر آرائے سلطنت اور شاہی خاندانوں کے بانی ہوئے۔ اسلام نے امیر و غریب۔ بڑے چھوٹے۔ غلام و آقا سب کو ایک کردیا اور ہر قوم و افراد کے لئے مساوی طریقہ پر ترقی کی راہیں کھول کر رکھ دیں۔ اسی کا مطالعہ کرتے ہوئے اخبار "نیر ایسٹ" کی ایک فاضل مضمون نگار مس بیٹ لکھتی ہے کہ عرب کا غلام دراصل غلام نہیں بلکہ وہ عرب کا لاڈلا بیٹا ہے۔ مسٹر آرنلڈ مشہور فاضل کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں غلاموں کی حالت عیسائیوں کے غلاموں سے بالکل جداگانہ تھی۔

ایڈورڈ گبن لکھتے ہیں کہ غلامی جسے کہتے ہیں وہ عرب سے بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ پھر دیکھئے کہ وہی سر ولیم میور جنھوں نے تعصب کی عینک لگا کر اسلام پر غلامی کے بانی ہونے کا اتہام لگایا۔ دوسری جگہ اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ خود پیدل چلے اور غلاموں کو اونٹوں پر سوار کیا اور آپ بھوکے رہے اور غلاموں کو کھانا کھلایا اور ان کی طرف سے ذرہ برابر غفلت نہیں برتی۔ اسلام کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ حقیقتاً۔ بقول اقبالؔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے　　تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ذرا ٹھنڈے دل سے اس تعلیم پر غور تو کیجئے کہ فتح مکہ کے بعد رسولِ خدا نے مردانِ قریش کو

مخاطب کرکے فرمایا کہ آج تکبر۔ غرور اور نسلی امتیاز مٹا دیا گیا۔ سب انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ ہم میں سب سے بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ تمام مخلوق اللہ تعالےٰ کی عیال ہے۔ اللہ مخلوق میں سب سے زیادہ اُسے پسند کرتا ہے جو اُس کے عیال کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرتا ہے اور اپنی نسبت فرمایا کہ مجھے اللہ کے عطا کئے ہوئے مرتبہ سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔ میں صرف تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ البتہ میری طرف وحی کیجاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی

آخری وعظ میں حضور صلعم نے اعلان فرمایا کہ عربوں کو غیر عربوں پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ غیر عربوں کو عربوں پر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اُس وقت تک سچا ایمان والا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ قرآنِ پاک کہتا ہے کہ ہم نے تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا اور خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔

عیسائیوں نے بحالتِ مجبوری مسلمانوں کی دیکھا دیکھی غلاموں کی آزادی کے قانون مرتب کئے مگر وہ قانون کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوئے اور آج ہمارے ہندو بھائی نمائشی طریقہ پر پولیٹکل اغراض کے لئے مساوات کا ہاتھ ہمارے اچھوت بھائیوں کی طرف بڑھا رہے ہیں مگر اس میں کامیابی ہونا مشکل۔ نیکی اور خلوص کے جذبہ سے یہ تحریکات خالی ہیں۔ مدعیانِ تہذیب وشائستگی۔ حریت و مساوات اگر حقیقی معنوں میں بھی خواہ انسانیت ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ تعصب کا جامہ اُتار کر رسول مقبول جناب محمدؐ کی زندگی کے حالات اور آپ کی تعلیم کا بغور اور بہ نظرِ انصاف مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کے علاوہ جس قدر راستے مساوات اور ہمدردی انسانی کے دُنیا نے تجویز کئے ہیں اُن میں سے ہر ایک صحیح راستہ سے ہٹا ہوا ہے اور خطرات سے پر ہے۔ حقیقی آزادی۔ حریت اور مساوات و یگانگت کا سبق جو اسلام نے دُنیا کو دیا ہے اس سے نہ تو کبھی کوئی سبقت لیجا سکا ہے اور نہ لیجا سکے گا بالآخر دُنیا کو اسی راستہ پر چلنا پڑے گا۔

مسٹر ایچ جی ویلس اپنی کتاب "آوٹ لک آف ہسٹری" میں لکھتے ہیں کہ اسلام نے خدا کی نظروں میں تمام بنی نوع انسان کی برابری اور مسلمانوں کی اندرونی اخوت پر بلا لحاظ رنگ۔

نسل و درجہ بہت زور دیا ہے اور یہ اصول اسلام کی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ یعنی اسلام میں کالے گورے۔ چھوٹے بڑے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اگر کسی کے دماغ میں ایسا خیال ہو تو وہ تعلیم اسلام کے سراسر خلاف اور اس ملک میں ملکی آب وہوا اور خیالات کا اثر کہا جا سکتا ہے جس کو مٹانا ہر مسلم کا فرض ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو فرماتی ہیں کہ ملک گیری اسلام کا عارضی مقصد رہا ہے اس کا اصلی مقصد حریت کی اشاعت اور غلامی کا استیصال تھا۔ مشہور انگریز مفکر برنارڈ شا فرماتے ہیں کہ اگر آج محمدؐ سا کوئی شخص ہم میں موجود ہوا اور تمام دنیا کا اُن کو ڈکٹیٹر بنا دیا جاوے تو تمام جھگڑے آن واحد میں مٹ سکتے ہیں۔ "ویدر اسلام" میں اس کے مصنفین صفحہ ۳۷۷ پر لکھتے ہیں کہ:-

> "مغربی تہذیب یک سمتی ہونے کی وجہ سے زیروزبر ہو چکی ہے اس کو اعتدال پر لانے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اسلامی سوسائٹی کی اعانت حاصل کریں۔"

اور صفحہ ۳۷۹ پر لکھتے ہیں :-

> "مختلف اقوام و قبائل کو ملانے اور متحد کرنے اور برابری کے درجہ پر پہنچانے کا کارنمایاں دنیا کی کسی اور سوسائٹی نے نہیں کیا۔ افریقہ۔ ہندوستان و انڈونیشیا کی بڑی بڑی اسلامی فرقوں اور غالباً چینی کے کمتر اور جاپان کے اس سے بھی کمتر اسلامی فرقوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اب بھی اسلام نسلی اور قومی فخر کو مٹانے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر مغرب اور مشرق کی عظیم سوسائٹی کا درمیانی تفرقہ باہمی اتحاد اور یک جہتی سے تبدیل ہو سکتا ہے تو یہ عظیم کام صرف اسلام کی وساطت سے ہو سکتا ہے۔"

آؤ ہم سب ایک بات پر جمع ہو جاویں جس میں ہم تم سب ایک جیسے ہیں ۔

محمد امین

بابائے صحافت سید جالب دہلوی

(از جناب سید جمیل صاحب جالبی)

مرحوم سید جالب صاحب کے انتقال کو قریب سترہ سال ہوگئے۔ عرصہ سے آرزو تھی کہ کوئی اُنکے حالات لکھے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خدمت خود اُن کے لایق و ذی علم پوتے میاں سید جمیل کے ہاتھوں انجام پائی۔ عزیز موصوف سے ابھی حال میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی تھی اور ہماری فرمایش پر آپنے یہ مضمون 'مصنف' کے لئے عنایت کیا۔

جمیل صاحب بہت محنت و کاوش سے سید صاحب مرحوم کے مقالات بھی جمع کر رہے ہیں جو شایع ہو جانے پر یقین ہے کہ دُنیائے صحافت اور علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔
(مدیر)

مستقبل، حال بنتا رہتا ہے اور حال ماضی اور یونہی برق رفتاری کے ساتھ زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ ماضی قریب رفتہ رفتہ ماضی بعید بن جاتا ہے اور اس پر گمنگی کا دبیز پردہ پڑ جاتا ہے۔ اس طرح نامور ہستیاں جن کے کارناموں اور خدمات جلیلہ سے دنیا کبھی باخبر تھی دائمی طور پر فراموش کردی جاتی ہیں۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھکر میں نے ایک دن سوچا کہ دادا جان مرحوم (سید جالب دہلوی) کی جتنی تحریریں ملیں میں ان کو شائع کراتا رہوں تاکہ اُن کی ملکی، قومی اور ادبی خدمات کے نقوش مٹنے نہ پائیں۔ کافی عرصہ تک یہ خیال محض خیال ہی رہا اور نامعلوم کب تک خیال رہتا کہ ابھی پچھلے دنوں مجھے ایک کتاب کی ضرورت تھی اور اس کی تلاش میں میں مختلف صندوق ٹٹول رہا تھا۔ آخر ایک صندوق کھولا جس میں پھٹے ہوئے کاغذوں، کرم خوردہ رجسٹروں اور بوسیدہ کتابوں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ چونکہ کتاب کی شدید ضرورت تھی اس لئے سب کاغذوں کو الٹتا پلٹتا رہا۔ اسی چھان بین اور طلب و جستجو میں ایک موٹی سی کاپی نکل آئی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا تو "پانی پت کا خونی میدان" کا مسودہ تھا۔ ذہن فوراً اُس خیال کی طرف منتقل ہوا جس کی ایک عرصہ ہوا دماغ

میں تخلیق ہو چکی تھی۔ لیکن اِس کے بعد میں دیگر مشغولیتوں میں اس قدر گھرا کہ سر اُٹھانے کی مہلت نہ ملی۔ ارادہ تھا کہ ایک بسیط سوانح لکھ کر میں شائقین اُردو ادب کے سامنے پیش کروں اور انھیں کسی فراموش شدہ شخص کی یاد دلاؤں۔ مگر وقت نہ ملنے کے باعث مجبور رہا۔ اب مجبوراً ایک مختصر سی سوانح لکھ کر پیش کرتا ہوں۔ انشاء اللہ یہ آرزو شاید میں پھر کبھی پوری کر سکوں۔ اس سوانح حیات میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو رہ گئیں، بہت سے واقعات ایسے ہیں کہ جو طوالت کے باعث چھوڑ دئے گئے اور بہت سی دلچسپیاں ایسی ہیں کہ جو میں نے آیندہ کے لئے اُٹھا رکھیں۔ غرضکہ یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ اُن کے کردار، خصائل و اطوار، مشغولیت، علمیت، واقفیت، اخلاق اور ذوق و شوق کا۔

جو قوم اپنے فدائیوں کو فراموش کرے اُسے کوئی حق نہیں کہ ایسے لوگ اس میں پیدا ہوں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کسی شخص نے بھی (الّا ماشاءاللہ) ان پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

۱۸۷۸ء بمقام دہلی کوچۂ چیلاں میں پیدا ہوئے۔ کوچۂ چیلاں ہندوستان کے اُن مردم خیز محلوں میں سے ہے جس نے متعدد نامور بزرگ پیدا کئے۔ سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، حکیم مومن خاں مومن، منشی ذکاءاللہ، اور علامہ راشد الخیری وغیرہ اِسی مقدس محلے کی پیداوار ہیں۔ جب دادا مرحوم چار برس کے ہوئے تو ایک مولوی کے زیر سایہ کسب علم کے لئے چھوڑ دئے گئے۔ دو برس کے اندر ہی اُردو میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی اور تھوڑی بہت فارسی بھی سیکھ لی۔ پر دادا مرحوم کا زردوزی کا کارخانہ تھا۔ شام کو یہ کارخانے جایا کرتے تھے۔ کاریگران کو دیکھتے ہی کام چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور "طلسم ہوشربا" "الف لیلیٰ" "امیر حمزہ" وغیرہ کی ضخیم ضخیم جلدیں اُن سے سُنا کرتے تھے حالانکہ بہت چھوٹے تھے لیکن اتنی تیزی، صفائی اور آواز سے پڑھتے تھے کہ کاریگر ہمہ تن محو اُن کی صورت کو تکتے رہتے تھے۔ معصوم سا چہرہ، تیز آواز اور دلچسپ قصّہ، موقع کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا کرتا تھا۔ کئی سال تک متواتر اِسی طرح کتابیں سُناتے رہے، پھر ایک انگریزی اسکول میں داخل کر دئے گئے اور وہاں سے انھوں نے دسویں جماعت

امتیاز کے ساتھ کامیاب کی۔ چونکہ قدرت نے اخبار نویسی کی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اسلئے توجہ ابھی سے اُدھر کی طرف منعطف ہو گئی۔ اُس زمانے میں ایک اخبار "چلتا پُرزہ" دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ میر صاحب اسکول میں پڑھتے تھے، لیکن اسکول سے چھٹی ملنے پر اُسکی اداراتی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ سب سے پہلا اخبار ہے جو اُنھوں نے ترتیب دیا۔ طالبعلمی کے زمانے میں ایک اخبار کے مُدیر کی حیثیت سے کام کرنا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ کافی مدت تک اخبار چلتا رہا۔ لیکن پھر نہ معلوم کیوں بند ہو گیا۔ میر صاحب نے ایف۔ اے پاس کیا۔ اور پھر بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ لیکن چند اسباب کی بنا پر بی۔ اے کے امتحان سے ایک ماہ قبل گھر چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور مختلف مقامات پر ملازمتیں کرتے رہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر۔ نائب تحصیلدار۔ ایڈیٹر۔ نامعلوم کیا کیا، کیا اور کیا کیا بنے۔

اسی طرح ایک کافی عرصہ گزر گیا اور میر صاحب مختلف مقامات پر گھومتے رہے۔ طالبعلمی کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی انگریزی ناولوں کا بہت شوق رہا۔ کوئی انگریزی ناول ایسا نہیں جو اُن کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ یورپ کا پورا سٹ مختلف ناول نگاروں کے اُنکے پاس موجود تھے، جو اُن کی ذاتی ملکیت تھے، کئی سال کے بعد جب گھر واپس آئے تو اُن کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد اُن کو فکر معاش لاحق ہوئی۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ کافی مدت تک سوچتے رہے آخر کار پھر وہی مشغلہ اختیار کیا جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ مسلمان اپنے ماضی کو یاد کر رہے تھے، تمام ملک پر ایک زبردست جمود طاری تھا۔ سید صاحب مختلف اخبار نکالتے رہے۔ جس اخبار کے مُدیر ہوتے وہی ہندوستان کا ممتاز اخبار سمجھا جاتا۔ "پیسہ اخبار" "اودھ اخبار" "ہمدرد" "وکیل" "شریف" "رسالت" وغیرہ اُنھوں نے اِس دوران میں ترتیب دئے اور صحافتی دُنیا کو بام عروج پر پہونچا دیا۔ اور اُردو اخبار انگریزی اخباروں کے ہم پلہ نظر آنے لگے۔ اس طرح صحافت کا غیر معمولی تجربہ حاصل کیا۔ اس کے بعد اخبار "ہمدم" کے مُدیر ہو کر لکھنؤ تشریف لائے اور اپنی بقیہ زندگی یہیں گزار دی۔

جس صورت سے مرحوم نے "ہمدرد" کو ترتیب دیا غالباً اُن صورتوں میں اور اُن حالات میں کسی دوسرے کے بس کا نہ تھا۔ عمریں تمام ہو جائیں۔ زندگیاں ختم ہو جائیں

سید جالب دہلوی اور مولانا محمد علی مرحوم جیسے فدائے قوم و ملت مسلمان پیدا ہو سکیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے اُن کے خمیر میں، اُن کی سرشت و فطرت میں قومی ہمدردی اور ملی درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اُن کے دِل ملک و ملت کی محبت سے اِس درجہ لبریز تھے کہ ستار کے تاروں کی طرح ذرا سی لرزش سے بے قراری و اضطراب کے نغمے پھوٹ نکلتے تھے۔ اب کہاں ایسے لوگ؟

اس زمانہ میں محمد علی جیل میں تھے۔ "ہمدرد" سیّد جالب ایڈٹ کر رہے تھے۔ ملک کی حالت بے انتہا نازک تھی، بات بات پر بلوے ہوتے تھے۔ ذرا سے اشارے پر گرفتاری عمل میں آتی تھی۔ اور اخبار ضبط ہو جاتے تھے۔ "ہمدرد" اخبار پر خصوصاً اور دیگر اخبارات پر عموماً سخت پابندیاں تھیں۔ اخباروں میں اشاروں اور کنایوں کی بھی اجازت نہ تھی۔ سیّد صاحب افتتاحیہ لکھتے اور وہ روز سنسر ہو جاتا۔ حالات و واقعات کو پیٹ پلیٹ کر رکھتے مگر پھر بھی حکومت سنسر کر دیتی۔ کئی مرتبہ ہمت ٹوٹی۔ شجاعت نے جواب دے دیا۔ الوالعزمی اور استقلال نے دامن چھوڑ دیا مگر قوم کے درد بھرے نالوں نے پھر ڈھارس بندھائی اور اخبار متواتر نکالتے رہے۔ اُسی شان سے اور اُسی کرّو فر سے۔ پابندیاں اُسی طرح لگی رہیں بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی رہیں۔

آخر تنگ آ کر ایک دِن سیّد صاحب نے (ایک چڑیا تھی اور ایک چڑا) کہانی کی صورت میں افتتاحیہ لکھا۔ لیکن اس افتتاحیہ کو بھی حکومت نے روک دیا اور سبب اِس کا یہ بتایا گیا کہ اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ حکومت سیّد صاحب سے بے انتہا ناخوش تھی اور اُن کو گرفتار کرنے کی فکر میں تھی، مگر وہ کسی صورت سے بھی گرفت میں نہ آتے تھے۔ حکومت یونہی پریشان ہوتی رہی۔ سیّد صاحب اخبار نکالتے رہے قوم اُنھیں دادِ شجاعت دیتی رہی۔ باوجود پابندیوں کے پیغام قوم تک پہنچتا رہا۔ آخر تنگ آ کر حکومت نے اخبار کا اجراء خلافِ قانون قرار دے کر بند کر دیا۔ وہ اپنی رائے کو ہمیشہ آزادی سے ظاہر کرتے تھے، بڑے سے بڑا مالی نقصان، آزادیٔ رائے کے لئے اُٹھانے کو تیار تھے۔ اُن کی رائے ہفت اقلیم کی بادشاہی دے کر بھی نہیں خریدی جا سکتی تھی —— آہ جالب!

دُنیا میں مصلحوں کی کمی نہیں، ایک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے۔ لیکن دُنیا کا بڑا مصلح وہی مانا جاتا ہے جس کے کردار و گفتار میں فرق نہ ہو، جو وہ کہتا ہو وہی کرتا ہو۔ سیّد جالب مرحوم

اُن مصلحوں میں سے تھے جن کا دل تنوع پسند ہوتا ہے۔ جن کی نظر بلند ہوتی ہے۔ جن کا ظرف اعلیٰ ہوتا ہے۔ جن کا دل ایک وسیع و شاداب میدان کی طرح ہوتا ہے۔ جن میں ہر قسم کی بات پرورش پا کر اصلاح و خوبی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ دنیا ان کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتی۔ اُن کے خیالات و افکار کو حرف غلط کی طرح مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ انھیں پیہم تکالیف و مصائب کا نشانہ بناتی ہے۔ مگر وہ ایک قدم پیچھے نہیں ہٹاتے اس صورت میں یاس و ناامیدی، مجبوری و ناچاری انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ لیکن یہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اُمڈے ہوئے دریا کی طرح۔ ایک بے پناہ سیلاب کی مانند۔ "کارل مارکس" جس کے نظریات پر لوگ خندہ زن ہوئے۔ جس کو جرمنی اور فرانس سے نکال دیا گیا۔ آخر کار وہ دُنیا پر غالب آ کر رہا۔ ڈارون جس کو اُس کے نئے نظریے کی بنا پر قید کے مصائب جھیلنا پڑے آخر کامیاب ہو کر رہا۔ لیکن یہ سب کیوں ہوا۔ اُن کو کامیابی کیوں نصیب ہوئی اس کا سبب ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ایسے مصلحین کے سینوں میں شرر آباد ہے۔ اُن کی چھاتیوں میں شعلہ ریز دل دھڑکتا ہے۔ اُن کے دل و دماغ اور اُن کے رگ و پے میں فسردہ چنگاریاں نہیں بلکہ آتش فشاں پہاڑ کے شعلے سرایت کر گئے ہیں۔ کروٹ کروٹ پر بے چینی۔ قدم قدم پر مصیبتیں، چپے چپے پر تکلیفیں اور مصائب لیکن پھر بھی یہ مرد مجاہد اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹاتے۔

سر سید احمد خاں مرحوم پر کیا کیا ظلم نہیں توڑے گئے، کن کن مصائب سے انکا سامنا نہ ہوا۔ وہ کون سے فتوے تھے جو اُن پر نہ لگائے گئے، مگر ایسے لوگ دُنیا سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں شب و روز لگے رہتے ہیں ؎

سنگ را چوں رہ دہم می تابد
تابش آفتاب زر گردد

در آخر کار کامیابی اُن سے بغل گیر ہوتی ہے۔ عزت و شہرت اور بلندی و اقبال اُنکی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے اور اُن کا نام صفحۂ دنیا پر سنہرے اور موٹے لفظوں میں کندہ کر دیا جاتا ہے۔

سید جالب مرحوم کی قربانیاں و ایثار، قوم و ملت سے ہمدردی و موانست ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے عظیم المرتبت انسان دُنیا کم پیدا کرتی ہے یا یوں کہیے کہ کم پیدا

ہوتے ہیں۔
کاش! ایک جالب اور پیدا ہو۔

ہمدم کی تیرہ۱۳ برس خدمت کرنے کے بعد اُس کے مالکان سے اختلاف ہوا اور اُنھوں نے ایک دوسرا اخبار "ہمت" کے نام سے نکالا۔ جس کے سرورق پر یہ شعر ہوتا تھا

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا وُ خلق
باشد بہ قدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

یہ اخبار بڑی آب وتاب سے نکلا اور فوراً ہی ہندوستان کے ممتاز ترین اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ جالب صاحب ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کے افتتاحیہ میں لکھتے ہیں ؎

باز آمدم کہ خدمتِ آں خاکِ پاکنم
در طاعتے قضا شدہ، باشد ادا کنم

"" ہمدم" کے قلم ایک ایسی زمین میں لگانے کے بعد جو صحافتِ اسلامی کے لئے ناموافق وشورہ زار سمجھی جاتی تھی میں نے تقریباً تیرہ سال تک اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ اور اپنی جوانی کی تمام تر قوتوں اور سرگرمیوں کو ان کے لئے وقف کئے رکھا۔ مجھے اپنے موقر معاصرین، مُدیران، اُردو وہندی جرائد سے عموماً اور اپنے دیرینہ کرم بابو دیا نرائن نگم بی، اے قابل مُدیر رسالہ "زمانہ" و "آزاد" کانپور و نوجوان دوست حکیم یوسف حسن صاحب مدیر "نیرنگِ خیال" و "تازیانہ" لاہور اور قدیم قدردان محترم مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے علیگ آنریری سیکریٹری انجمن ترقی اُردو و مُدیر رسالہ "اردو" اورنگ آباد (دکن) سے خصوصاً اس امر پر سخت ندامت و انفعال ہے کہ اس تمام عرصے میں میں ترسیلِ مضامین کے متعلق اُن کی مسلسل فرمائشوں کی تعمیل سے قاصر رہا۔ اور اُن حضرات کی طرف سے ہر قسم کے دوستانہ اثرات ڈالے جانے اور مالی ترغیبات بھی پیش کئے جانے کے باوجود "ہمدم" کے فرائضِ ادارت کی مصروفیتوں سے اُن کی خدمات کے لئے کوئی وقت نہیں نکال سکا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ جانفشانی قربانی میری بدنصیبی سے بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ . . . .

اور ایک بدنصیب جو سالہا سال سے تمام نگاہوں کا مرکز تھا وہاں اب اس کا نام لینا ممنوع قرار دیا گیا، اور اُس کے طریقِ کار کا حوالہ دینا بھی لوگوں کو صاحبانِ اقتدار کی نگاہوں میں معتوب کرنے کا باعث ہوگیا ؎

"یار اغیار ہو گئے اللہ   کیا زمانہ کا انقلاب ہوا"

ہندوستان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تہنیت نامے ہندوستان کے طول وعرض سے موصول ہوئے اور سید صاحب کی ہمت بڑھائی گئی۔

خوشی دُنیا میں بڑے لوگوں کو کبھی میسر نہیں ہوتی۔ کوئی خردمند دُنیا میں شادماں نظر نہیں آتا۔ ابوشکور بلخی کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آگیا ؎

سراسر گردگیتی گر بگردی !!
خردمندے نیابی شادماناں

اخبار کے اجراء پر انقلابی وہمت افزا نظمیں شائع ہوتیں۔ تمام ہندوستان میں پُرشکوہ خیرمقدم ہوا۔ اور اخبار کامیابی سے نکلنے لگا۔

دُنیائے صحافت میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو سید جالب مرحوم کے درجے کو حاصل کر سکے۔ سید صاحب کی معلومات، سید صاحب کا حافظ، سید صاحب کی ہمہ گیریت، سید صاحب کا زورِ بیان اور زورِ قلم، سید صاحب کا علم، یہ سب کچھ ایسے تھے کہ جو کسی دوسرے صحافی میں مشکل سے جمع ہوں گے۔ محبوب عالم کی علمی قابلیت کے سب معترف ہیں، مگر لکھنے کی قوت اُن میں مفقود تھی۔ وہ جب لکھنے بیٹھتے تھے تو سب معلومات اُن کے دماغ سے نکل جاتی تھیں۔ لیکن جب سید جالب کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتے تو اتنا کافی مسالا اُس موضوع پر اکٹھا کر دیتے تھے کہ دوسری جگہ ملنا مشکل ہوتا تھا۔

سید صاحب کو نو[9] زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ فارسی[1]، عربی[2]، اردو[3]، ہندی[4]، سنسکرت[5]، انگریزی[6]، فرانسیسی[7]، بنگالی[8]، اور قدیم ترکی[9] —— اپنی فارسی پر سید صاحب کو ناز تھا۔ انگریزی سے ترجمہ اُردو میں اتنا عمدہ اور اتنی تیزی سے کرتے تھے کہ اگر ایک انگریزی کا اخبار یا کوئی اور کتاب شے کر اُن کو پس پردہ بٹھا دیا جاتا اور اُن سے اُس کو اردو میں پڑھنے کو کہا جاتا تو یہ شناخت کرنا نا ممکن تھا کہ اخبار یا کتاب اُردو زبان میں ہے یا انگریزی میں۔

ویسے تو اُنھیں ہر قسم کے موضوع سے دلچسپی تھی مگر تاریخ سے خصوصاً فطری لگاؤ تھا۔ تاریخ وفات، تاریخ پیدائش، واقعات اور اس کے جزئیات، نتائج وسیاسی اسباب، غرضیکہ دنیا کے کسی تاریخی واقعے کو دریافت کر لیجئے ایسی خوبی اور ایسی وضاحت سے بتاتے

ی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس موضوع پر برسوں سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ سیّد صاحب
یادداشت اتنی عمدہ اور اچھی تھی کہ ایک بات جو کان سے سُن لیں اور آنکھوں سے دیکھ لیں،
دماغ سے نہ نکلتی تھی اور یہی سبب تھا کہ دُنیا کے ہر موضوع پر بہ وضاحت اور تفصیلی
ی تجیص کرلیا کرتے تھے، سیّد صاحب چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ دُنیا کے کسی موضوع
گُو کر لیجئے، ایسی شرح و بسط اور اتنی عمدگی کے ساتھ بتائیں گے کہ یہ معلوم ہوگا یہ ان کا خاص
موضوع رہا ہے، فلکیات و عرضیات، جغرافیہ اور تاریخ، قانونِ حکومت اور قانونِ اسلام،
فہ منطق، مثنوی مولانا روم، حافظ و سعدی، شیکسپیر، ملٹن، ہیگلے، نپولین، چندرا
ائی، کبیر، المتنبی، ابن رشیق، ابن خلدون، کالی داس، سائیکل کے پرزے،
ر کا انجن، مغربی تہذیب، چینی حکومت، کسی کے خاندانی حالات، گھوڑوں کے اقسام،
سامان اور انواعِ طعام، چوہے، بلیاں غرضیکہ وہ کون سا موضوع تھا جس پر سیّد صاحب
بنہ کرسکتے ہوں، یا لکھ نہ سکتے ہوں۔ اگر گھوڑوں پر بات کر رہے ہیں تو یہ معلوم ہوتا کہ
ن خود یہ بڑے اچھے شہسوار اور گھوڑوں کی پشتہاپشت نسلوں سے بخوبی واقف ہیں۔
سامان کا ذکر ہوتا تو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مدت سے یہی کام کر رہے ہیں۔

اگر شیکسپیر پر گفتگو چھڑتی تو یہ خیال گزرتا کہ تمام عمر سے شیکسپیر پڑھ رہے ہیں، اگر
ن حکومت کا ذکر ہوتا تو ایک بہت عمدہ بیرسٹر معلوم ہوتے اور قانونِ اسلام کا تو
زبردست مولوی۔ اگر کسی مرض کا ذکر ہوتا تو یہ محسوس ہوتا کہ بڑے کامل طبیب ہیں
صاحب انسان نہیں ہیں فرشتہ تھے۔ اگر ایسا شخص کسی مغربی مُلک میں پیدا ہوتا
معلوم اُس کی شخصیت میں کتنا اضافہ ہوتا اور وہ کیا سے کیا ہو جاتا۔ مگر وہ جاتے ———
آپ مشرق میں ہیں نہ مغرب میں ——— کہاں ہیں؟ دُور بہت دُور ——— جہاں سے
کو کسی کی خبر نہیں آتی۔

علامہ راشد الخیری اُن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میر بشارت علی جناب عمر میں مجھ سے بڑے نہ تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان بھر کا
کوئی مسلمان سیّد مرحوم کی واقفیت کو نہیں پہونچا۔ اُن کو جہاں علوم مشرقی و مغربی میں یدطولیٰ حاصل
تھا، وہاں تیراکی، پہلوانی کے ہنروں سے بھی پوری طرح واقف تھے، وہ جس طرح سرگل امام کے
بیان کھاتے کی تحریر و جہاں وہ ادیب و دونوں دعو تھے، مخلوط انتخاب کے سلسلے میں ایسی جامع بحث

کرسکتے تھے کہ حاضرین متحیر ہو جائیں۔ اسی طرح دلّی کے مشہور پتنگ باز مرزا فخرو سے بھی اوپر کے پیچ پر ایسی تقریر کرسکتے تھے کہ سننے والے دنگ ہوں۔ علمی یا معاشرتی کوئی ایسا ہی بدنصیب فن ہوگا جس کی تاریخ پر سیّد صاحب کو عبور نہ ہو۔ ہندو مسلمان مشکل سے کوئی لیڈر ایسا ہوگا جس کی سات پشتوں سے سید صاحب باخبر نہ ہوں۔ اِس بڑھاپے میں بھی کہ فکر معاش نے دم بھر کو ان کا پیچھا نہ چھوڑا وہ اپنا کوئی لمحہ ضائع نہ کرتے تھے اور ہر وقت کتاب اُن کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اُن کا کتب خانہ اُنکے علمی ذوق کا پتہ دے رہا ہے، اِس دَورِ پُر آشوب میں کہ مسلمان اپنے درخشندہ جوہر کھو بیٹھے سیّد صاحب وہی نصف صدی پیشتر کے مسلمان تھے، بہن بھانجوں کے حقوق، غریب عزیزوں کے ساتھ سلوک آج بھی سیّد صاحب کی چار دیواری میں نظر آ رہے تھے۔ اسلامی روایات جن کا خاتمہ ہوگیا سیّد صاحب کے گھر میں موجود تھیں۔ وہ اسقدر مہمان نواز تھے کہ اُن کے دسترخوان سے انسانوں کے علاوہ کتے، بلی، اور پرند بھی اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ اُن کی مالی حالت بہت اچھی کیا، کچھ بھی اچھی نہ تھی، لیکن میں نے اُن کو تنہا کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ اِنکسار اس قدر تھا کہ ایک طرف وہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر سے گفتگو کر رہے ہیں اور دوسری طرف کُنجڑے اور کباڑی کی دکان پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ ان کے بچپن کے دوست ہیں۔

سیّد صاحب دلّی کے متوطن ہی نہیں، دلّی کے دلدادہ تھے۔ اور اُن کا عشق اِس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ یہ تک گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ لکھنؤ کی بالائی دلّی سے بہتر ہے۔"

اپنے چھوٹوں اور بڑوں سب کا احترام کرتے۔ بڑوں اور برابر والوں کا نام پورے لوازمات تکریم و تعظیم کے ساتھ لیتے۔ کسی کی پردہ دری گناہِ کبیرہ سمجھتے۔ دشمن کے بھی محاسن ہی پر نظر رکھتے اور معائب سے چشم پوشی اختیار کرتے۔ ہر شخص سے برابری کا سلوک کرتے خواہ وہ کسی درجہ کا آدمی ہو۔ تکبّر اور غرور پاس کو چھو کر نہ گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے کو طالب علم تصوّر کرتے۔ کسی سے کوئی بات دریافت کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ سڑک پر پڑا ہوا کاغذ تک اُٹھا کر پڑھنے لگتے شاید اِس سے کچھ حاصل ہو جائے۔ تانگے میں بیٹھتے تو تانگے والے سے طرح طرح کی باتیں دریافت کرتے چلے جاتے موٹر میں بیٹھتے تو ڈرائیور سے کچھ نہ کچھ پوچھنے لگتے۔ جہاں جاتے بہت کچھ دے کر آتے اور کچھ نہ کچھ لے کر بھی آتے۔

ایک لطیفہ سنئے! ایک مرتبہ دعوت کے کھانے پکوانے کے ارادہ سے ایک بہت ماہر خانساماں کو بلایا۔ کچھ دیر اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ مختلف کھانوں کے متعلق دریافت

کرتے رہے ۔ اسی دوران میں خانساماں سے دریافت کیا کیوں میاں! فلاں کھانا کیسے پکاؤگے۔ خانساماں اس سوال سے کچھ گھبرا سا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے غیر معقول سا جواب دیا۔ سیّد صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ کیوں میاں کیا کام کرتے ہو!

ایک دلچسپ بات اور سنئے! ایک مرتبہ علالت کے سلسلہ میں کسی ڈاکٹر سے رائے لینے کی غرض سے گئے۔ ڈاکٹر نے جو مرض تجویز کیا وہ سیّد صاحب کی تشخیص کے خلاف تھا۔ فوراً مرض کا مختلف اعضائے جسمانی سے تعلق دریافت کیا۔ کہنے لگے چونکہ یہ چیز خراب ہے اور اِس کا تعلق اس حصّے سے ہے اور اس کا تعلق وہاں ہونے سے یہ بیماری ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں کی رگیں اِس مقصد کے لئے ہرگز نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر معقول جواب سُن کر خاموش ہو گیا اور کہنے لگا سیّد صاحب کل کتاب میں دیکھ کر تیقن کے ساتھ بتاؤں گا۔ سیّد صاحب چلے آئے۔

سیّد صاحب کو کھانے میں کھٹی چیزیں بہت پسند تھیں، کچّے آم، کیریاں، کھٹّے فالسے اور کرک، اتنی تعداد میں کھاتے تھے کہ توبہ بھلی۔ کچھ اصحاب کو کیا، اکثر اصحاب کو حتیٰ کہ جو اُن کے معترب تھے اُن کو بھی یہ مغالطہ اور غلط فہمی ہے کہ سیّد صاحب میٹھا بہت پسند کرتے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ مغالطہ اس سبب سے ہے کہ وہ افیون کھاتے تھے ۔۔۔ لیکن اکثر دعوتوں میں میٹھی چیزیں ہوتی تھیں۔ مگر وہ کبھی اُنھیں پسند نہیں کرتے تھے۔

سیّد صاحب کو آم بہت پسند تھے، دُور دُور سے آم کی بلٹیاں اور پارسل اُن کے پاس آتے تھے اور فصل بھر میں سینکڑوں روپیہ کا آم خود کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے تھے۔ کھانے کے ساتھ برفی کا ہونا لازمی تھا۔ بغیر برفی کھائے اُنھیں چین نہ آتا تھا۔ لیکن کُل دو چار لقمے۔ خوراک بہت کم تھی، مشکل سے دو روٹی کھاتے تھے، شاید وہ بھی زندہ رہنے کے لئے، نہ معلوم وہ دُنیا سے اس قدر بے نیاز کیوں تھے؟

سیّد صاحب شاعر بھی نہایت پایہ کے تھے، جو زمانہ اُن کے شباب کا تھا اس میں داغ کا طوطی بول رہا تھا، ہر شخص داغ کے رنگ میں شعر کہتا۔ سیّد صاحب بھی داغ کے شاگرد ہوئے اور اُسی رنگ میں زبان کے شوخ و شنگ اشعار کہے۔ غزل کہتے ہی مشہور ہو جاتی اور دلّی کے گلی کوچوں میں گائی جاتی۔ اب آخری ایام زندگی میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے۔ شعر فہم ایسے تھے کہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ غالب مرحوم کی ایک شرح خود لکھنا چاہتے تھے مگر تنگیٔ وقت نے فرصت نہ دی اس لئے بیخود موہانی مرحوم سے

کہا کہ تم لکھو، نظرِ ثانی میں کر دوں گا۔ شرح لکھی گئی اور سید صاحب نے اُس پر کافی روپیہ خرچ کیا، مگر نہ معلوم اُس کا مسودہ کہاں گیا کہ پھر پتہ ہی نہ لگا، بہت ڈھونڈا، بہت تلاش کیا مگر بے سود۔ سید صاحب جیسے اپنی طرف سے بے نیاز تھے ایسے ہی اپنی چیزوں سے بھی۔ ایک غزل کا بھی پتہ نہیں کہ کیا ہوئی۔ خم خانۂ جاوید۔ لالہ سری رام کے تذکرہ میں کچھ اشعار موجود ہیں اور بس۔

سید صاحب کیا نہیں تھے، وہ سب کچھ تھے، شاعر۔ اُدیب۔ فلسفی۔ صحافی۔ مقرر۔ مولوی۔ سیاست داں وغیرہ۔ جب سید صاحب کو روپیہ کی ضرورت ہوتی تو ایک ناولٹ رات کو لکھ لیتے اور صبح جا کر چپکے سے فروخت کر آتے۔ پچاسوں ناول لکھے جو دہلی اور لاہور کے بازاروں میں دوسروں کے نام سے چھپ کر شائع ہوئے۔

سید صاحب بڑے سے بڑے علمی مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ موضوعات کی تہ میں ایسی سہولت سے پہونچ جاتے گویا کوئی بات ہی نہیں اور پھر اس کو اس خوبی سے سلجھا کر پیش کرتے کہ وہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی۔ جب لوگ اُن سے کسی موضوع کے متعلق دریافت کرتے تو وہ اس موضوع پر ایک ایسی عالمانہ اور محققانہ گفتگو کرتے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہتا۔ وہ جتنا تیز پڑھتے تھے اُتنا ہی تیز بولتے اور اتنا ہی تیز لکھتے تھے، یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے جو سید صاحب میں موجود تھی۔ کسی کی تقریر ہوتی تو اُس کو ہو بہو اور لفظ بہ لفظ لکھتے جاتے، خود تقریر کرتے تو اتنی تیزی سے اور اتنی جلدی کہ معلومات کا چشمہ اُبلنے لگتا۔ گھنٹوں باتیں کرتے گھنٹوں لکھتے اور پہروں پڑھتے۔ مگر تکان کا احساس کبھی نہیں ہوتا۔ دورانِ گفتگو میں دلشکنی کبھی نہ کرتے۔ حالانکہ مُلاقاتیوں میں مختلف مشرب کے لوگ ہوتے۔ ہر ایک کے خیالات کا پاس رکھتے۔ افتتاحیہ میں یا اخبار کے کسی کالم میں دلشکن جملے کبھی نہ ہوتے تھے۔ سخت سے سخت بات کہتے، حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے، قوم کو اُبھارتے مگر مجھے۔ انداز میں۔

سید صاحب کی طرزِ تحریر میں ایک عجیب بانکپن تھا، روانی۔ سلاست۔ جوش اور خلوص اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مضمون لکھ کر کبھی دُہراتے نہ تھے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی غلطی رہ جائے (اِلّا مَا شَاءَ اللّٰہ) گاہے گاہے مضمون کے درمیان میں ایسا شعر چسپاں کرتے گویا وہ اسی جگہ کے لئے موزوں کیا گیا تھا۔ اشعار کی نہ اتنی بہتات ہوتی جتنی ابوالکلام آزاد کی نثر میں اور نہ اتنی قلت کہ سرے سے شعر ہی نہ ہو۔ وہ اپنی علمیت، معلومات اور واقفیت کے مطابق ہی اظہارِ بیان پر قادر تھے۔ ہر قسم کی اصطلاحات اور ہر پیشے کے مخصوص الفاظ اُن کی

تحریروں میں بلا تکلف ملتے ہیں۔

سرسید کی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی مضمون کے موافق بدل جاتا ہے۔ سیاسی عقلمندی، اخلاقی اقتدار، اور نفسیاتی تحلیل ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ سینکڑوں فرانسیسی، عربی اور انگریزی الفاظ کے بہت عمدہ ترجمے کئے جو ان کی تحریروں میں اکثر ملتے ہیں۔ وہ قواعد کی سختی سے پابندی کرتے تھے لیکن روانی میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا تھا۔ انھوں نے اردو ادب میں گوناگوں مضامین لکھنے کی صلاحیت کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ ہر قسم کے موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھا اور زورِ بیان، تاثر اور قوتِ اظہار ہمیشہ یکساں رہی۔ ہر قسم کا مضمون اس تیزی اور معلومات سے پُر طریقہ سے لکھتے تھے۔ ایک مدت تک اردو ہندی تنازعہ پر "ہمدم" اخبار میں بحث کرتے رہے۔ وہ بحث اس قدر جامع ہے کہ اگر اس کو یکجا کر دیا جائے تو وہ اس موضوع پر جس کی کوئی انتہا نہیں ہے ایک جامع و مانع چیز ہو جائے۔ یہ مضامین لسانی حیثیت سے بھی بہت قیمتی ہیں۔

ان کی طرزِ تحریر میں شبلی کا استدلال، ارسطو کی منطق، حالی کی روانی، آزاد کی انشا پردازی، نذیر احمد کا زور و شور، عربی و فارسی کے اچھے اچھے الفاظ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے فقرے طویل ہوتے ہیں لیکن پیچیدہ کبھی نہیں ہوتے بلکہ اس طوالت میں ایک قسم کے زور و شور اور جذبات کے تاثر کا شدید احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات ابوالفضل کی فارسی نثر کی طرح مبتدا، خبر میں کافی فصل ہو جاتا ہے مگر زور جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ مجھے اردو ادب کے مشاہیر میں بہت کم لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کی معلومات سید صاحب کی طرح ان کے ہر مضمون میں جلوہ گر ہوں۔ جب جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو تاثیر کے ساتھ، کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں تو اس کی جزئیات تک ان کی بصیرت افروز نظر پہنچتی ہے۔ کبھی کبھی نثر میں ظرافت کا شائبہ بھی نظر آتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، قوتِ استدلال، اشعار کی موزونیت، واقعات کی سنجیدگی اور متانت، جذبات سے گزارش کر کے سحر نگاری و جادو بیانی، موزوں قسم کی تشبیہ و برمحل استعاروں کا استعمال، شاعرانہ تخیل، ملکۂ ایجاد، تنوعِ اسالیب، ندرتِ خیال، تیزیٔ طبع، گاہے گاہے ہندی کے کومل الفاظ کا استعمال، دقتِ نظر، وسعتِ خیال اور لطافتِ تخیل — ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ع

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

سید صاحب دن اور رات اس قدر مشغول رہتے تھے کہ اُن کو اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اتوار کے دن نخاس جاتے تھے اور وہاں اپنی شیروانی کا دامن سمیٹے بغیر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے اور کتابوں کو ٹٹولنے لگتے تھے اور پھر انہیں خبر نہ رہتی کہ وہ کہاں ہیں۔ موٹر گزر جائے۔ برات نکل جائے۔ قتل عام ہو جائے۔ مگر سید صاحب کتابوں کے الٹ پلٹ اور ورق گردانی ہی میں منہمک رہتے اور توجہ کا مرکز بجز کتابوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ اور وہ ایسی پرچھاتی سے لگائے درجنوں کتابیں لئے چلے آتے۔ پاجامے کا پائینچہ مٹی میں بھر رہا ہے۔ ازار بند بغل میں ہے۔ شیروانی کے ایک دامن میں کتابیں لپٹی ہوئی ہیں اور سید صاحب چلے آ رہے ہیں۔ تیز تیز۔ ہانپتے ہوئے۔ لپکے ہوئے۔

جب کبھی شہر سے باہر جاتے اور یہ خیال ہوتا کہ رات وہیں گزارنی پڑے گی تو "ایک چیز" اخبار میں لپٹی ہوئی ہاتھ میں ہوتی۔ دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ اس میں یا تو کمخواب کا تھان ہے یا اطلس کا۔ یا کم از کم جائداد کے ضروری کاغذات تو ضرور رہیں۔ ایک مرتبہ سر یعقوب صاحب بدایوں کے یہاں کھانے کی میز پر مدعو تھے۔ کوئی بہت بڑی ضیافت تھی۔ بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ سید صاحب کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، حسب عادت اپنی اُس لپٹی ہوئی "ایک چیز" کو کھانے کی میز پر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اور بات کرنے اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا۔ سید صاحب اِس اخبار میں کیا لپٹا ہوا ہے۔ وہ بھی شاید اطلس، کمخواب یا کچہری کے ضروری کاغذات سمجھا ہوگا۔ سید صاحب نے نہایت سادگی اور سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جی اِس میں میرے سلیپر ہوتے ہیں۔" اور پھر کھانے اور بات کرنے میں مشغول ہو گئے۔

پڑھنے سے قبل چائے کے لئے کہتے فوراً چائے آجاتی۔ میز پر رکھی رہتی۔ گھنٹوں ہو جاتے اور سید صاحب پڑھتے رہتے، "ملازم کہتا، چائے تو پی لیجئے، دیکھئے مکھیاں گر رہی ہیں ــــ" ہیں ــــ چائے۔ اور پھر ہنستے ہوئے کہتے اِن کو بھی اپنی خوراک لینے دو، اور مکھیاں پھینک کر چائے پی لیتے۔ رات کو بارہ، ایک بجے تک مطالعہ کرتے رہتے اور صبح چار بجے اٹھ بیٹھتے اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔

سید صاحب کو بلیوں کا بہت شوق تھا۔ دُور دور سے بلیاں منگاتے اور پالتے۔ اور سوتے وقت ٹانگیں سکیڑ کر سوتے اور بلیاں اِدھر اُدھر آرام کرتیں۔ بلیاں اُن کے پیر

باتیں۔ اور جب وہ پڑھتے یا لکھتے تو خاموشی سے دو زانو بیٹھ کر سنتیں۔ اگر گھر آنے میں
راسی دیر ہوتی تو سب بلّیاں یکے بعد دیگرے دفتر پہونچ جاتیں اور غرّاتیں، اِس سے یہ
قصود ہوتا کہ چلئے۔ آج بہت دیر کر دی۔
مشہور عربی شاعر المتنبی کا یہ قول اکثر دُہراتے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدُّنیٰ سرجُ سابحٍ
وخیرُ جلیسٍ فی الزمانِ کتابُ

(کہ دُنیا میں سب سے معزز جگہ تیز رفتار گھوڑے کی زین اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے......)
دنیا میں معزز جگہ تیز رفتار گھوڑے کی زین ہو یا نہ ہو، اُن کی زندگی کی بہترین ساتھی
تاب رہی ——— کتاب اور بس کتاب۔ البتہ جوانی کے زمانہ میں بہت اچھے شہ سوار تھے۔
قلم چلے جا رہا ہے۔ رُوکنے کا نام نہیں لیتا۔ خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں، اتنا کچھ کہنے
کے بعد بھی یہی کہنا پڑتا ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

۱۹۲۷ء میں ہندوستانی ایکیڈمی الہ آباد میں قائم ہوئی، اِس ادارہ کی ادبی خدمات
ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔ سب سے بڑا کارنامہ و قابلِ ستائش چیز جو اس ایکیڈمی
کی نمایاں خصوصیت ہے وہ یہ کہ اُس نے زمانے کے بڑے بڑے عالموں اور اکابر ہستیوں
سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوائیں اور اس طرح سے اُردو ادب میں گراں بہا و
بیش قیمت اضافہ کیا اور اُس خلا کو جو اُردو ادب ایک طویل مدت سے محسوس کر رہا تھا پورا
کیا۔ یہ ادارہ اب بھی ادبی خدمات اُسی شان و شوکت اور بے لوث طریقے سے انجام دے رہا ہے۔
اسی سلسلے میں اِس ادارہ نے سیّد جالب مرحوم سے بھی گزارش کی تھی کہ وہ اپنے محبوب
موضوع "نپولین" پر ایک کتاب ایک ہزار صفحات کی لکھ دیں۔ سیّد صاحب راضی بھی ہو گئے
تھے۔ مگر افسوس کہ جب انھوں نے کتاب لکھنے کا راسخ عزم کیا تو ہاتفِ غیبی اُن کے سر پر آ دھمکا
اور اُن کی رُوح کو اس دارالمحن سے دارالبقاء لے گیا۔
جس دن نتیجہ تھا اُسی دن خط آیا کہ مہربانی فرما کر جلد از جلد کتاب لکھنا شروع کر دیں، مگر
اُن کی زندگی کی کتاب کے تمام اوراق لکھے جا چکے تھے اور کتاب مکمل ہو گئی تھی۔ اور وہ "نپولین"

پر کتاب مکمل کرنے سے قبل اپنی کتابِ زندگی بند کر کے چلے گئے —— ہمیشہ کے لئے —— ابد تک کے لئے —— دُور بہت دُور ——

۱۰ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد میں نستعلیق کانفرنس ہوئی جس میں ہندوستان کے زبردست عالم اور قابل لوگ مشاورت کے لئے مدعو کئے گئے۔ سیّد صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ حالانکہ عدیم الفرصت ہونے کے سبب کہیں نہ جاتے تھے لیکن چونکہ یہ بھی ایک زبردست قومی و ادبی خدمت تھی اِس لئے اُس میں گئے۔ اور ایسے گئے کہ دُنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جانے کا سامان کر آئے۔ واپسی پر "گسٹ ہاؤس" بھوپال میں قیام کیا اور وہاں کئی دن کے باسی اور ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ غسل کرتے ہی بائیں ہاتھ میں درد ہونے لگا۔ اِسی درد میں واپس لکھنؤ آئے۔ تکلیف بڑھتی گئی مرض افزوں ہوتا گیا۔ حالت غیر ہوتی گئی تندرستی روز بروز گرتی گئی جسمانی حالت ابتر ہوتی گئی اور آخر جب اور دوسرے مرضوں نے ایک دم گھیر لیا تو اُن کو میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا۔

اُس وقت اُن کی حالت عجیب تھی۔ پیشاب متواتر آ رہا تھا۔ بند لگ گیا تھا۔ لیکن دماغ کی کیفیت بالکل صحیح تھی۔ کتاب پڑھنے کے لئے بے چین تھے۔ اِسی ناگفتہ بہ حالت میں کئی مرتبہ لکھنے کے لئے قلم اور دوات مانگی۔ تکلیف روزانہ زیادہ ہو رہی تھی۔ نقاہت و لاغری دن دونی اور رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر اور اطبا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، مگر موت کا علاج —— ؟ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

لب پر خاموشی تھی۔ منھ سے کوئی نا اُمیدی، دبے زاری تکلیف کے کلمات نہیں نکالے بلکہ بالکل خاموش لیٹے رہے، شدّتِ تکلیف کو خاموشی سے برداشت کرتے گئے —— خاموشی بالکل ایسی خاموشی۔ جیسی اُن پر کتاب پڑھتے وقت طاری ہوتی تھی۔

مغرب سے کچھ پہلے آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں —— بے نور —— ساکت و صامت —— خاموش —— جامد و ساکن ——

حاضرین میں سے ایک نے دریافت کیا "سیّد صاحب کیسی طبیعت ہے ؟" سانس اُکھڑ چکی تھی، دم صرف گلے میں باقی تھا، لیکن ایسی حالت میں بھی کیا جواب دیا۔ جس پر ہزاروں شجاعتیں نثار ہیں، جس پر بہادری اور جراءت کو حیرت ہے۔ "اچھا ہوں —— ہاں ذرا یٰسین شریف سُنا دو" یہ الفاظ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہے۔ اور پھر یہ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا، صحافت کے بابا آدم (سیّد بشارت علی جانب دہلوی) ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اِس دُنیا سے دوسری دُنیا

ں چلے گئے۔ بدن سرد ہوگیا، آواز جو بڑی تیزی اور جھنکار کے ساتھ منہ سے اُبلا کرتی تھی مستقل
طور پر خاموش ہوگئی ——— آہ جالب — انسانیت کے مخزن، علم کے معدن، شرافت
ور اخلاق کی سچی اور لاثانی تصویر اب آپ جیسے انسان کہاں پیدا ہوں گے؟ مشرق ہمیشہ
آپ کی جدائی پر ماتم کرتا رہے گا۔

ادب اور اخبار نویسی آپ کی موت کے لازوال صدمے کا تدارک نہیں کر سکتی، مرنیوالے
جالب الوداع۔ ایک لامحدود مدت کے لئے الوداع ——— آخری بار الوداع۔

صاحبِ "سحر البیان" میر حسن دہلی کا پہلا جواہر ریزہ تھا جو لکھنؤ کی خاک میں پنہاں ہے
ور مُدیر "ہمت" دوسرا ہیرا ہے جس کو لکھنؤ کی خاک نے اپنی گود میں چھپا لیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

جمیل جالبی

میرٹھ چھاؤنی
۲۵ رمئی ۴۷ء

تاریخ کے پوشیدہ ماخذ

(۱)

(مرسلہ جناب مولوی بشیر احمد صاحب علوی ناظر کاکوروی)

"تاریخ داں ماضی کے متعلق اپنی معلومات سے کام لے کر پریشان کن مسائل کا حل تجویز کر سکتا ہے اور اہل سیاست و تدبیر کو مشکل حالات میں عقلمندی سے عمل کرنے کا راستہ دکھا سکتا ہے۔"
یہ تھے وہ الفاظ جو آنریبل سر جوگندر سنگھ نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے ۲۲ ویں اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہے۔ اجلاس مذکور ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو پشاور میں منعقد ہوا۔

ذیل میں صاحبِ صدر کا پورا خطبہ درج کیا جاتا ہے:۔

میں اپنی اور انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے ممبروں کی جانب سے آپ کی اور آپ کی حکومت کی مہمان نوازی کا پُرجوش شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کے تاریخی شہر میں کمیشن کو دعوت دی۔ ہمارے اس اجلاس کا افتتاح کر کے آپ نے ہماری جو عزت افزائی کی ہے اس کو ہم قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہ امر آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ امپیریل ریکارڈز کمیشن کے پاس ایسی تاریخی اہمیت کی دستاویزوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جن کا تعلق شمال مغربی صوبہ سے ہے۔ یہ دستاویزیں ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۳ء تک کے زمانہ کی ہیں۔

محکمہ کی لیبارٹری میں ان ریکارڈوں پر سائنسی عمل کیا گیا ہے اور اب ان کی چھان بین کر کے ان کی درجہ بندی کی جا رہی ہے اور نہایت احتیاط سے ان ریکارڈوں کو آپ کیلئے محفوظ رکھا جا رہا ہے تاکہ جونہی آپ کی حکومت ایک اطمینان بخش ریکارڈ آفس قائم کرے ان کو منتقل کر دیا جائے۔ جناب والا مجھے امید ہے کہ آپ اور ہمارے جو دوست یہاں موجود ہیں وہ بعض دستاویزات کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ جنھیں ڈاکٹر سین نے جمع کر کے نہایت احتیاط سے محفوظ کیا ہے۔

پشاور کے دروازہ کی راہ سے

آج یہاں ہندوستان کو ایشیا سے ملانے والے ایک دروازہ پر کھڑے ہو کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے درۂ خیبر کی راہ سے آنے والے حملہ آوروں کے قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی ہے۔ یہی وہ دروازہ ہے جس کی راہ سے آرین نمودار ہوئے تھے اور ان کے بعد سیتھین۔ ہن۔ افغان اور ترکمان داخل ہوئے اور ہندوستان کے باشندے بن گئے۔ نسلوں اور مذہبوں کی یہی آمیزش ہے جس سے خاص طور پر پنجاب کے لوگ بنے ہیں۔ آہ۔ بنی نوع انسان تاریخ کے سبق سے کب فائدہ اُٹھائیں گے؟ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ آپس میں مل جُل کر رہنا سیکھ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نیا سیاسی جوش شہروں کی پُرسکون زندگی کو درہم برہم کر رہا ہے لیکن عوام کے دلوں میں رفاقت کا وہ جذبہ موجزن ہے جو مشترکہ خوشیوں اور غموں کا پھل ہے۔ اس وقت ہندوستان اس بے راہ رو دنیا کو شاید کچھ پیش کر سکے گا جو مادی ذرائع سے مادی کامیابیاں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ صرف خدا کی محبت کی روشنی ہی میں یہ طاقت ہے کہ انسان کے موروثی خود غرضانہ رجحانات کو دوسرے انسانوں کی خدمت کے لئے پھیر دے۔

آپ کا صوبہ قومی وحدت اور آزادی کا پورا پورا حامی ہے۔ آپ کے پاس کارکنوں کی ایک ایسی جماعت ہے جو اپنے آپ کو خدائی خدمت گار سمجھتی ہے۔ حالانکہ باقی ساری دُنیا میں دولت کے پرستاروں کی بھرمار ہے۔ آپ دلیر اور خلیق ہیں۔ رومان اور جاں بازی سے آپ کو اُنس ہے۔ آپ کا اخلاص بے پایاں ہے اور اولوالعزمی آپ کو ورثہ میں ملی ہے زمانۂ حال کی جنگوں نے ان اعلیٰ اخلاق کو برباد کر دیا ہے جس کے تحت شکست کھائے ہوئے دشمن سے نرمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اور کمزور کو پناہ دی جاتی تھی۔

ماضی پر ایک نظر

اگر ہم قدیم اور تاریک زمانہ پر نظر ڈالیں تو ہم محسوس کریں گے کہ اسکندر کا حملہ ابھی کل کی بات ہے۔ پشاور کے چاروں طرف جو اونچے اونچے ٹیلے نظر آ رہے ہیں یہ فی الحقیقت پرانے قصبوں اور شہروں کے کھنڈرات ہیں۔ اسکندر کے زمانہ میں اس علاقے کا دارالحکومت پشکل وتی تھا جو چارسدہ کے مقام پر ایک سو فٹ اونچے ٹیلے کے نیچے دبا پڑا ہے۔
محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر مارٹیمر وھیلر نے اس اہم مقام کی کھدائی کر کے

شہر کا کھوج لگانے اور اس کے مخفی خزانوں کو ظاہر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس مقام کی تحقیق و تفتیش سے ویدوں کے قدیم زمانہ کے زبردست تمدن پر ایک نئی روشنی پڑے گی۔

گزرے ہوئے زمانہ کے بادشاہ اور سپہ سالار اب کہاں ہیں؟ وہ سب موت کی نیند سو چکے اور اپنے اچھے یا بُرے اثرات کو اپنے ساتھ لے گئے لیکن روحانی معملوں کے کلمات اب تک موجود ہیں۔ اور ان میں آج بھی وہی قوت اور شوکت پائی جاتی ہے جو اُس وقت اُن میں موجود تھی جبکہ وہ منہ سے نکالے گئے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوچی خاندان کے بادشاہ کنشک کو بُدھ کی تعلیم پہنچی تھی اور اگرچہ بُدھ مت اس سرزمین سے ہٹ چکا ہے جہاں اُس نے جنم لیا تھا۔ مگر مشرق بعید اب بھی اس سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔

کنشک نے چار سو فٹ بلند ایک اسٹوپا تعمیر کیا۔ آج اس عظیم یادگار کی نشانی صرف چند پست ٹیلے رہ گئے ہیں جنھیں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے کھُدوایا ہے۔ ان ہی ٹیلوں میں سے قیمتی دھات کا بنا ہوا وہ صندوقچہ بھی برآمد ہوا ہے جس پر کنشک کا نام اور اُس کی تصویر کندہ ہے اور جس کے اوپر مہاتما بُدھ کا بُت اور دو بُدھی استوا کھڑے ہیں۔ یہ نوادر آجکل آپ کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

اس جگہ شہباز گڑھی کے مقام پر اشوک نے اس بے چین دنیا کے نام جس نے مادّی فائدوں کی خاطر اپنی روحانیت کو کھو دیا تھا۔ محبت اور امن کا پیغام کندہ کرایا تھا۔ اس مقام پر یونان۔ بُدھ طرز کے نقاشی کے ماہروں نے مہاتما بدھ کی آپ بیتی پتھروں میں کندہ کی تھی۔ ان تصویروں میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح بُدھ نے نروان کے آٹھ پہلو راستہ کی تلاش کی اور آخر اُسے پا لیا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ آپ کا شہر مشہور "گندھارا" فن کا مرکز تھا جس کا رواج سن عیسوی کی پہلی چار صدیوں میں بہت تھا۔ اس فن کے زمانے کے متعلق اور یہ کہ ہندوستان اور مغرب نے اُس سے نسبتاً کیا فائدہ اُٹھایا۔ مورخوں میں اختلاف ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق ہندوستان ہی سے نہیں بلکہ چین اور انڈونیشیا کے ملکوں سے بھی ہے۔ جہاں کے لوگ بُدھ مت کے پیرو ہیں۔ شہر پرشاپورا کے کھنڈرات اور دریائے کابل اور سندھ سے سیراب ہونے والے علاقے سے اب بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کس طرح مشرق کا اثر مغرب پر اور مغرب کا اثر مشرق پر پڑا تھا۔

علم وادب کا بڑا بھاری مرکز

آپ کا شہر علم و ادب کا بھی بڑا بھاری مرکز تھا۔ اس شہر میں مشہور نحوی پانینی رہا کرتا تھا جس سے فیض حاصل کرنے کے لئے طالب علم آیا کرتے تھے۔ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں کہ اُس شہر نے خوشحال خاں خٹک کے جس میں شاعرانہ اور جنگجویانہ صفات پوری طرح موجود تھیں اور ہری سنگھ نلوہ کے جس کے لئے موت بے حقیقت چیز تھی کارنامے دیکھے ہیں۔

"سرحدیں بلاشبہ اُسترے کی ایک ایسی تیز دھار کے مترادف ہوتی ہیں جن پر امن و جنگ اور قوموں کی زندگی اور موت کے سخت ترین مسائل منحصر ہوتے ہیں۔" شمال مغربی سرحدی صوبہ ان مسائل کا سامنا کر چکا ہے اور ایک زمانے تک غیر یقینی حالات کا شکار رہا ہے اب جبکہ ہوائی بیڑوں کے نزدیک سرحدیں کچھ معنی نہیں رکھتیں ممکن ہے انسانی ذہن اتنی ترقی کر جائے کہ وہ بنی نوع انسان کے بھائی چارے کو تسلیم کرلے۔ اپنے ہمسایہ کو کنگال بنا دینے کی پالیسی ممکن ہے اب کسی کے لئے ممکن العمل نہ ہو۔ تاریخ داں اپنے ماضی کے تجربے کی بنا پر ممکن ہے ان پیچیدہ مسائل کا حل بتا سکے اور اُن دقت طلب صورتِ حالات میں جن کا اسے سامنا ہے مُدبّر کو صحیح راہِ عمل اختیار کرنے کی ہمت دلا سکے۔

پُرانی تاریخی دستاویزیں

مجھے اپنی تقریر کے نفسِ مضمون سے زیادہ نہیں ہٹنا چاہئے اور اگر میں ایسا کروں گا تو ڈاکٹر حسین مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔ وہ یہ توقع کرتے ہیں کہ میں صرف اس موضوع سے بحث کروں جس سے اُنھیں براہِ راست تعلق ہے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے بہت سی تاریخی دستاویزیں تباہ ہو چکی ہیں۔ اُن میں سے کچھ دوسرے ملکوں میں چلی گئی ہیں۔ اِن کے علاوہ بہت سی دستاویزیں ذاتی ملکیت میں حالتِ گمنامی میں پڑی ہیں۔ ذاتی ملکیت میں جو دستاویزیں ہیں اُنھیں حاصل کرنے کی ضرورت پر سب کو اتفاق ہے۔ اس خاص مقصد کے لئے بہت سے صوبوں اور ریاستوں میں ریجنل سروے کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں مگر جنگ کی وجہ سے وہ کچھ خاص کام انجام نہ دے سکیں۔

خوش قسمتی سے اب امن بحال ہو چکی ہے۔ اور ہم معقول وجوہ کی بنا پر یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ تمدن کے تمام شعبوں میں دوبارہ سرگرمی سے کام شروع ہو جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام صوبوں اور ریاستوں میں مستقل علاقہ وار سروے کمیٹیاں مقرر

کی جائیں تاکہ وہ پوشیدہ تاریخی مواد کا پتہ لگائیں اور اسے حاصل کریں۔ جہاں مستقل کمیٹیاں قائم کرنے میں دیر لگے وہاں اس کام کے لئے مخصوص کمیٹیاں بنا دی جائیں۔ جن کے لئے متعلقہ حکومتیں ایسی سہولتیں بہم پہنچائیں تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے مقصدوں کی تکمیل کر سکیں۔

صرف ریکارڈوں کو نظر انداز ہونے اور تباہ ہونے سے بچانا اُس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا۔ جب تک سائنسی اصولوں کے مطابق پُرانے ریکارڈوں کو ذخیرہ کرنے۔ محفوظ رکھنے اور اُن کی مرمت کرنے کے لئے ایسے انتظامات مہیا نہ ہو جائیں جن سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن نے اس امر کی بار بار تاکید کی ہے کہ صوبوں اور ریاستوں میں سنٹرل ریکارڈز آفس قائم کئے جائیں جو سرکاری دستاویزوں کے علاوہ اُن نجی قلمی نسخوں کو بھی اپنے پاس رکھ کر اُن کی دیکھ بھال کریں جو اُس کے سپرد کئے جائیں اور قلمی نسخوں کے ان مالکوں کو ماہرِ فن کی حیثیت سے امداد دیں جو اپنے قلمی نسخوں کی مناسب حفاظت کے لئے اس قسم کی امداد طلب کریں۔ مجھے یہ بات یاد کر کے خوشی ہوتی ہے کہ جن صوبوں اور ریاستوں میں سنٹرل ریکارڈز آفس نہیں ہیں ــــ جن میں صوبۂ سرحد بھی شامل ہے ــــ ان میں سے بہتوں نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ وہ جنگ کے خاتمہ پر اس قسم کے ادارے قائم کر لیں گے۔ ہمیں اُمید کرنی چاہئے کہ اب بے عملی کا طویل دَور ختم ہو چکا ہے۔

ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کی اسکیمیں

امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کی فرمائش پر مختلف اسکیموں پر جو کام شروع کیا تھا وہ زمانہ جنگ میں برابر جاری رہا۔ لیکن کاغذ کی کم یابی کی وجہ سے اشاعت کا کام نہیں جاری رہ سکا۔ اب چونکہ کاغذ کی صورتِ حال سُدھر گئی ہے لہٰذا اس محکمہ کو اُمید ہے کہ وہ بہت جلد متعدد کتابیں شائع کر سکے گا۔

یور ایکسیلنسی اور حضرات قدیم ترین دستاویزوں میں ہم اس امر کی جھلک دیکھ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان کے افراد ہمیشہ بھائی چارے کے متلاشی رہے ہیں۔ دُنیا کے تمام گوشوں کے پیغمبروں اور فلسفیوں۔ حکما اور شاعروں نے تمام نوعِ انسان اور تمام قوموں کے اتحاد کا راگ گایا ہے۔ سیاسیات۔ اقتصادیات۔ جنگ امن اور سلامتی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ بنی آدم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں زندگی بسر کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اِس وقت ہمارے لئے اس کی آزمائش کا وقت۔ دیکھیں ہم اس سے کیا فائدہ

اُٹھاتے ہیں۔ متحد رہتے ہیں یا فرقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر فرقہ یا مذہب کے نام پر جس کی تعلیم اتحاد ہے دھرتی ماتا میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرتا ہے یا قوم۔ مذہب اور رنگ کی تفریق کے بغیر ہر ایک کی خدمت کرنے کے لئے متحد ہو جاتا ہے؟ یہ کون بتا سکتا ہے۔

(۲)
ہندوستان کی ثقافتی تعمیر جدید

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ہندوستان کی ثقافتی تعمیر جدید کے لئے بعض تجویزیں پیش کی ہیں۔ اُن تجاویز پر انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن ۳۰ اکتوبر کو اپنے پشاور والے اجلاس میں غور کرے گا۔ سوسائٹی کی تجویزیں حسب ذیل ہیں۔ (الف) ہندوستان میں سیاحوں کے ایک محکمہ کا قیام بنگال میں ایک سنٹرل ریکارڈ آفس کا قیام۔ دہلی میں ایک نیشنل میوزیم کا قیام۔ ماہرین تعمیر کا ایک اسکول اور نیشنل اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز کا قیام۔ (ب) محکمۂ آثارِ قدیمہ کی آئندہ ترقی۔ (ج) پُرانی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کے قانون میں ترمیم۔ (د) ایک نیشنل کلچرل ٹرسٹ کا قیام اور (ھ) نیشنل پارکوں کا آئین۔

سوسائٹی کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹوں کو مارچ ۱۹۴۵ء میں انڈین ہسٹاریکل ریسرچ کمیشن کی مجلس تحقیقات و مطبوعات کے چھٹے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا جو دہلی میں منعقد ہوا تھا اور مختلف اسکیموں پر مجلس کی سفارشات کو جن میں سوسائٹی کو دلچسپی تھی حکومت ہند کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے مشورہ دیا کہ مجلس کی سفارشات کو کمیشن کے پشاور والے اجلاس میں غور و خوض کے لئے پیش کیا جائے۔

مطبوعات کا پانچسالہ پروگرام

مطبوعات کے پانچسالہ پروگرام کے سلسلہ میں جو کام ہو چکا ہے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کی ریسرچ اور پبلیکیشن کمیٹی اس پر نظر ثانی کرے گی۔ کمیٹی کے گذشتہ اجلاس سے لے کر جو دہلی میں ہوا تھا اب تک اس اسکیم کے تحت شائع ہونے والے عام خطوط کی ترتیب وغیرہ کے سلسلہ میں کافی کام ہو چکا ہے۔ یہ کام جن اعزازی ایڈیٹروں کے سپرد ہے اُن کی رپورٹوں کی بنا پر پوری پوری اُمید کی جا سکتی ہے کہ ۱۷۴۸ء - ۱۷۷۲ء پر مشتمل پہلی چھ جلدوں کا مواد طبع کی غرض سے اس سال کے آخر میں مل جائے گا۔ ۱۷۷۳ء - ۱۷۸۸ء پر مشتمل جلد نمبر ۷، نمبر ۸، نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ کی ترتیب کے متعلق اطلاعات کا انتظار ہے۔ اس اثنا میں اگلی چار جلدوں کے

متعلق بہت حد تک کام ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان جلدوں کے لئے مکمل مواد جو ٹائپ کے ۴۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے ایڈیٹروں کے حوالے کیا جا چکا ہے۔ اس مجموعہ کی پہلی تین جلدوں میں پبلک ڈیپارٹمنٹ کے عام خطوط جو ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۰ء پر مشتمل ہیں۔ لیجسلیٹو (قانون سازی کے متعلق) خطوط جو ۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۰ء پر مشتمل ہیں اور سیپریٹ ریونیو (جداگانہ محاصل) کے خطوط جو ۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۰ء پر مشتمل ہیں شامل ہیں اور اس کی آخری جلد محکمۂ خارجہ کے خفیہ خطوط (۱۷۶۴ء تا ۱۷۸۱ء) اور مجلس منتخبہ کے خطوط (۱۷۵۹ء تا ۱۷۷۱ء) پر مشتمل ہے۔ خفیہ خطوط (۱۷۸۲ء تا ۱۸۰۰ء) سیاسی خطوط (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۰ء)۔ غیر ملکی خطوط (۱۷۸۴ء تا ۱۸۰۰ء) اور فوجی خطوط (۱۷۸۰ء تا ۱۸۰۰ء) پر ابھی کمیٹی نے غور نہیں کیا۔ یہ تمام خطوط تقریباً ۷۰ مسودوں پر مشتمل ہیں۔ ان مسودوں کو نقل کرنے کا کام کافی حد تک ہو چکا ہے اور امید ہے کہ کم سے کم چار جلدوں کا مواد ترتیب وغیرہ کی غرض سے مئی ۱۹۴۶ء کے آخر تک دستیاب ہو جائے گا۔

(۳)

مغل بادشاہوں اور کمپنی کی حکومت کے بعض حالات

انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کا ۲۲واں اجلاس ۲۹ر اکتوبر کو پیشاور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں نامور تاریخ دانوں نے ایسے مقالے پڑھے جن کا ماخذ غیر مطبوعہ تاریخی دستاویزیں تھیں۔ ان مقالوں پر بحث و تمحیص بھی ہوئی۔ تاریخ ہند کے ان طالب علموں نے جو تحقیقاتیں حال ہی میں کی ہیں اُن کے نتیجے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مسلمان فرمانرواؤں کے فرامین کی تاریخی اہمیت

عہدِ وسطیٰ کے سرکاری کاغذات اور فرمانوں کا احتیاط کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اُس وقت کے نظم و نسق اور انتظامِ سلطنت کی زیادہ مکمل تصویر سامنے آجائے گی اور ان اہم افسروں کے ناموں اور حالات سے واقفیت پیدا ہو جائے گی جو وقتاً فوقتاً متعدد حیثیتوں سے اہم کام انجام دیتے رہے ہیں۔ اُن دستاویزوں کے باقاعدہ مطالعہ سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں فنِ کتابت کو کس طرح ترقی ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تاریخ کے لکچرار ڈاکٹر لطیف حلیم نے مذکرہ دونوں باتوں کے سلسلہ میں مطالعہ کیا۔ حال ہی میں آپ نے اکبر کے ایک فرمان کو جانچا جو ۱۵۷۲ء کا ہے اور

اُس میں ۱۱۵۹ ٹکے قاضی کمال کو واپس کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ قاضی کمال ایک ایماندار اور وفادار افسر اور قانون شریعت کے جج تھے۔ اُن سے بعض بد دیانت افسروں نے یہ رقم لے لی تھی۔ یہ فرمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ فرمان پر جو آٹھ مہریں لگی ہوئی ہیں اُن سے دارالحکومت کے مختلف محکموں کے افسرانِ اعلیٰ کے نام ظاہر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حلیم کا بیان ہے کہ "آئینِ اکبری" سے ہمیں ان اہم افسروں میں سے چند کے سوا باقی افسروں کا حال معلوم کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ لہٰذا اُن مہروں میں ناموں کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے ایک نمایاں کمی پوری ہوتی ہے۔

۱۸۳۸ء میں پشاور کا تجارتی سامان

امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کے مسٹر اوبیندر ناتھ سرکار نے "پشاور میں اپریل ۱۸۳۶ء میں دیسی سامان تیار کرنے والوں کی فہرست" کا مطالعہ کیا ہے جو سر الیگزنڈر برنز نے پیش کی تھی جن کو ۱۸۳۶ء میں ایک مشن پر کابل بھیجا گیا تھا۔ برنز نے پشاور در ارد گرد کے علاقوں کے بازاروں کے تجارتی امکانات کا مطالعہ کیا تھا اور ۱۸۳۸ء میں یہ فہرست لارڈ آکلینڈ کی خدمت میں پیش کی تھی یہ فہرست امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں محفوظ ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سو سال پہلے ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں کس قسم کے پارچات استعمال ہوتے تھے اور لوگوں کی رسمیں کیا تھیں اور لباس کس قسم کے ہوتے تھے نیز کیا قیمتیں رائج تھیں۔

برنز نے کابل کی منڈی کی اشیا کی جو فہرستیں دی ہیں وہ بھی اتنی ہی دلچسپ ہیں۔ یہ اشیا دیسی اور غیر ملکی یعنی رُوسی۔ ہندوستانی۔ اور انگریزی ساخت کی تھیں۔ انگریزی سامان کے رواج سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزی کمپنی کی طرف سے افغانستان کے سیاسی اقتدار کی منصوبہ بندی تیار ہونے سے بہت پہلے انگریزی تجارت وہاں داخل ہو چکی تھی مختلف رنگوں اور قسموں کی انگریزی شالیں اور پگڑیوں کے لئے سوتی ڈوریا جامدانی۔ ابرا فرنگی سفید جامدانی۔ مختلف رنگ کی چھینٹ۔ سفید نین سکھ۔ ساہان یا سفید لنکلاٹ۔ سفید جالیاں۔ قمیصوں۔ کوٹوں۔ پاجاموں اور دستمالوں (رومالوں) کے لئے ململ کابل میں فروخت ہوتی تھی۔ امیر لوگوں کے استعمال کی بہت سی خوبصورت اور قیمتی اشیا کے علاوہ غربا کے لئے بستروں اور پاجاموں کے لئے چوڑی رنگین دھاریوں والی" ناصر خانی

چھینٹیں۔ قمیصوں کے لئے سرخ اور زرد دھبوں والا " بادل خانی " سوتی کپڑا اور پاجاموں کے لئے سیاہ رنگ کا " سونا ناگری " کپڑا ہندوستان سے بھیجا جاتا تھا۔ دہلی کی بکری کے چمڑے کی بنی ہوئی جوتیاں جنھیں لوگ اُن کی پائداری کی وجہ سے استعمال کرتے تھے " کابل کی منڈی میں کافی معروف تھیں۔

کابل کی منڈی میں نہ صرف باہر سے آئی ہوئی اشیاء کا بھاری ذخیرہ موجود رہتا تھا بلکہ اس میں مختلف قسم کی دیسی چیزیں بھی پائی جاتی تھیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے باریابی

شاہ شجاع کو دوبارہ کابل کے تخت پر بٹھانے کی اسکیم میں ایک غیر معروف شخص گورنر اور کونسل کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ کمپنی کے ملازمین کے رہنے سہنے کے طریقوں اور اخلاق و کردار پر گہری نظر رکھیں اور جب کبھی ضرورت ہو انھیں تنبیہ کریں۔ اعلیٰ ملازمین کو جہاں تک ممکن تھا رہنے سہنے کے ایسے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرنا پڑتا تھا جن پر بہت مصارف آئیں۔ اس بات پر خاص نظر رکھی جاتی تھی کہ کم عمر ملازمین اس قسم کی فضول خرچیاں نہ کریں جو ان کی آمدنیوں سے بڑھ جائیں اور محکمہ کی طرف سے یہ حکم نافذ تھا کہ کوئی محرر اپنی محرری کے زمانے میں پالکی یا گھوڑا نہیں رکھ سکتا۔

اس خط کو روانہ کرنے کا ایک فوری سبب " گزشتہ واقعات کی ناسازگار صورتِ حال تھی "۔ بظاہر یہ " واقعات " وہی ہو سکتے ہیں جو ۱۷۴۶ء میں مدراس پر فرانسیسیوں کے قبضے اور اس کے بعد رونما ہوئے جس میں ۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۱ء کے درمیان کرناٹک پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں لڑائیاں اور ۱۷۵۴ء میں انگریزی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے درمیان معاہدہ اور صلحنامہ شامل ہیں۔ اُس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا کہ عوام کے اخلاق بہت پست ہو گئے تھے۔

دورِ مغلیہ کا ایک ایسا معرکہ جو ضبطِ تحریر میں نہیں آیا

راجا رام کالج ریاست کولھاپور کے پروفیسر تاریخ و معاشیات ڈاکٹر اے۔ جی۔ پاور کو ریاست کولھاپور میں ایک انعام دار خاندان کی خاندانی دستاویزات دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن دستاویزوں میں دوسرے بہت سے کار آمد کاغذات کے علاوہ ایک ایسی دستاویز بھی ملی ہے جس میں مغلوں کا ایک ایسا معرکہ درج ہے جو اورنگ زیب کے دور کی کسی تاریخ

یں جہاں تک پروفیسر کی معلومات کا تعلق ہے تحریر نہیں ہے۔ یہ قلعہ بھدر گڈھ کے محاصرہ کا واقعہ ہے جو ۹۱-۱۶۹۰ء میں پیش آیا تھا۔ یہ قلعہ کولہاپور کے جنوب میں ۳۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مغلوں اور مرہٹوں کی جنگ میں اسے زبردست اہمیت حاصل ہے۔ مگر اُس جنگ کی جو لکھی ہوئی تاریخیں موجود ہیں اُن میں اُس جگہ کے متعلق کوئی اہم واقعہ درج نہیں۔ صرف کیشو پنڈت کی "راجہ رام چرتم" میں اس کا ایک مشکوک ذکر ہے۔ اُس دستاویز میں وہ اصلی حکم ہے جو مرہٹہ بادشاہ راجہ رام کے ایک ڈویژنل افسر نے، نومبر ۱۶۹۱ء کو دیا تھا۔ اُس میں اُس عطیہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اجرا سب ڈویژن کے دیسائیوں۔ دیش کلکارنیوں۔ ندا گوداؤں کو اِس بنا پر دیا گیا تھا کہ انھوں نے "اس زمانہ میں جب مغلوں نے بھدر گڈھ کا محاصرہ کیا تھا بھدر گڈھ کو رسدیں بھیجنے کے لئے سخت تکلیف برداشت کی"۔

اُس دستاویز میں محاصرہ کی تاریخ بیان نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر پوار کا خیال ہے کہ یہ عطیہ محاصرہ کے بہت عرصہ بعد نہیں دیا گیا۔ یعنی یہ واقعہ ۹۱-۱۶۹۰ء کا ہے۔ اورنگ زیب کی تاریخ "مآثر عالمگیری" میں اس سال کے جو واقعات لکھے گئے ہیں اس سے اُس رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مذکورہ دستاویزوں میں اُس محاصرہ کا جو مختصر ذکر ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ محاصرہ اس وجہ سے اُٹھا لیا گیا تھا کہ سب ڈویژن اجرا کے افسروں نے اُس محصور قلعہ کو برابر رسدیں پہنچائیں تھیں۔ اس محاصرہ کی دوسری تفصیلات ابھی تک معلوم نہیں ہوئیں۔

ڈاکٹر پرسیول بارٹن لارڈ کا بھی حصہ تھا۔ یہ ڈاکٹر حکومت بمبئی میں ملازم تھا۔ ۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ نے اس کو حکومت برطانیہ کے مسلّہ ایجنٹ کی حیثیت میں پشاور بھیجا "تاکہ اُن تمام لوگوں کو جو شاہ شجاع کی طرف سے لڑنے کے لئے آمادہ تھے ایک جگہ جمع کرکے انھیں اسلحہ مہیّا کئے جائیں"۔ ڈاکٹر پرسیول برٹن پشاور جاتا ہوا امرتسر ٹھہرا۔ جہاں اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کی۔ امپیریل ریکارڈ کے محکمہ کے مسٹر سری کرشن سکسینہ کہتے ہیں کہ "علمائے تاریخ نے آج تک اس واقعہ کو ظاہر نہیں کیا لیکن یہ ملاقات اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے ڈاکٹر لارڈ کے پشاور جانے کے مقصد کا پتہ چلتا ہے"۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کے دوران میں ڈاکٹر لارڈ نے کہا کہ اگر برطانوی حکومت کے کسی افسر کو شاہ شجاع کے معاملات کے سلسلہ میں مہاراجہ کی حکومت کے کسی شہر میں (پشاور

ان دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے علاقہ میں تنہا متعین کر دیا جائے۔ تو یہ امر ساری دنیا کے سامنے اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اُس اہم موقع پر یہ تین بڑی طاقتیں اتحاد اور ایکے کے جذبات سے سرشار ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس تجویز کو بڑی گرم جوشی سے قبول کیا۔

جیسا کہ ڈاکٹر لارڈ نے مہاراجہ صاحب کو بتایا اُن کے فرائض یہ تھے "حسب ضرورت مختلف افغانی قبائل کے سرداروں سے رسم و راہ پیدا کرنا، شاہ کے دوستوں کی ہمت افزائی کرنا، اس کے دشمنوں کو ڈرانا دھمکانا، مذبذب عقائد کے لوگوں کو پکا کرنا، شرارت پسندوں کو دبانا، اس کے علاوہ ڈاکٹر لارڈ کی کوشش یہ بھی تھی کہ لوگوں کو یہ جتا دیا جائے کہ اب جبکہ شاہ کی پشت پر سکھوں اور انگریزوں کی طاقت ہے اور شاہ کو دوبارہ تخت مل گیا ہے تو شاہ اس قابل ہے کہ اپنے حامیوں اور دوستوں کو انعام و اکرام اور اپنے دشمنوں کو سزا دے سکے، مہاراجہ نے ان باتوں کو معقول اور پسندیدہ بتایا تھا۔

کمپنی کے عہد حکومت میں عوام کی راستبازی

راؤ بہادر سی۔ ہایا وادانا راؤ ایڈیٹر میسور اکنومک جرنل بنگلور اپنے مقالہ "ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازم" میں لکھتے ہیں۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی دلچسپ باب نہیں کہ کمپنی نے اپنے زمانے کی سرکاری ملازمتوں میں دیانتداری اور راستبازی کا اعلیٰ سے اعلیٰ معیار مقرر کرنے کی اکثر و بیشتر پیہم کوششیں کیں۔

کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ہندوستان میں اپنے سرکاری ملازموں پر سختی سے نگرانی کرنے کی جو سنجیدہ کوششیں کیں ان کی شہادت اس خط سے ملتی ہے جو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۱۷۵۴ء میں "فورٹ سینٹ جارج میں اپنے صدر اور کونسل" کو تحریر کیا تھا۔ یہ خط تنبیہ اور نصیحت سے بھرا ہوا ہے اور اس میں ان مختلف طریقوں کا بھی ذکر ہے جنہیں ہندوستان میں کمپنی کے کارخانوں سے مروجہ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کورٹ اختیار کرنے کی آرزومند تھی۔

ناظر کاکوروی

علمائے گوپامئو

(نوشتہ جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

گوپامئو ہردوئی کے ضلع میں واقع ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی 'مولانا بحرالعلوم' کے احوال میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

گوپامئو وہ مردم خیز بستی ہے جہاں کی خاک سے 'قاضی مبارک' اور 'قاضی ارتضیٰ علی' جیسے نامور علما پیدا ہوئے۔ یہ لکھنؤ کے اطراف میں ہے۔[1]

'راجہ گوپی نامی' نے گوپامئو آباد کیا تھا۔ سنہ ۱۰۱۱ء میں پہلے پہل درویش 'عزت اللہ شاہ' وارد ہوئے۔ اس کے بعد حضرت 'سالار مسعود غازی' شرک جاتے ہوئے راجہ گوپی سے بھی دو دو کرتے گئے۔ اور سید اعزالدین سرخ عرف لال پیر کو گوپامئو پر قبضہ کرنے کے لئے مقرر کر گئے۔

سلطان التمش کے عہد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی مع خواجہ تاج الدین غزنی کے یہاں آئے۔ ایک قلعہ اور مسجد اور اپنے پیر مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ارشاد سے سنہ ۱۲۳۴ء میں لال پیر کی درگاہ کی تعمیر کی۔ شہنشاہ علاء الدین خلجی کے عہد میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی بھی یہاں آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں خانقاہِ مفتیان کی بنیاد رکھی گئی۔ عہدِ ہمایوں میں سید معین الدین قنوج سے آئے اور سنہ ۱۵۶۲ء میں زید پور سے قاضی عبدالرحمٰن نُہریا یہاں آکر مقیم ہو گئے۔ اس زمانہ میں شیخ الاسلام بندگی نظام الدین عثمانی امیٹھوی نے یہاں آکر چلہ کشی کی۔

اُچ ملتان سے سنہ ھ میں شیخ آدم نبیرۂ شیخ الشیوخ شہاب الدین سُہروردی اور قنوج سے شیخ عبدالقادر عمری برادر زادہ حضرت فریدالدین گنج شکر یہاں آئے اور گوپامئو کے قدیم خاندان خواجہ مبارک اولیاء ادھمی خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی سے ہم رشتہ ہوئے۔ خواجہ کی اولاد 'مولویان' کہلائی۔ شیخ آدم کی اولاد مفتی کے عہدہ پر مقرر ہوتی رہی۔ قنوجیوں میں علم و فضل کیسا تھ امارت بھی رہی۔ سراج الدولہ انورالدین خاں صوبہ دار ارکاٹ اور

---

[1] رسالہ 'الندوہ' نمبر ۵ - جلد ۳ -

داب والا جاہ امیرالہند محمد علی والئ مدراس نواب بدرالاسلام خاں صوبہ دار اور نواب نیرالدین خاں بہادر نائب صوبہ دار بنگال اسی خاندان کے تھے۔ قاضی لہری کے اخلاف جو مفتیوں کے نواسے تھے۔ غلام حسین خاں صدیقی صوبہ دار گجرات اور شیخ غلام محمد منصب دار نظم شاہی بھی مفتیوں کے نواسے تھے۔ امام الفقہا مفتی عبداللہ شہابی سبط شیخ جعفر بن نظام الدین بندگی امیٹھوی۔ مفتی علیم اللہ سبط قاضی صدرالدین ہرگامی۔ علامہ ابوسعید صاحب بحرالحقائق شیخنا میاں محبیب اُجین و منصب دار عالمگیری وغیرہ بھی خاندان مفتیان سے تھے۔ حکیم محمد سعید صدرالصدور مجلس عالیہ حیدرآباد۔ مولانا محمد رشید دویم تعلقہ دار اورنگ آباد کا مولد و منشا بھی یہی قصبہ ہے۔

شعرا میں انور، خوشدل، خوشنود، ناظر، نصر، قدرت، مکرم، رخصت، حیدر، شہرت سے حضرات عربی فارسی کے قادرالکلام تھے۔

تذکرہ علماء و مشائخین گوپامئو کے انساب پر ۱۰۶۰ھ میں ملا وجیہ الدین شہابی نے رسالۂ انساب لکھا اور اپنے اسلاف کے حالات عربی میں لکھے ۱۱۹۰ھ میں مولوی مصطفیٰ علیخاں نے "تذکرۃ الانساب" مرتب کیا۔ نسب نامہ کے ساتھ مختصر مشاہیر کا ذکر بھی کیا ہے۔ اُنکے خلف قاضی مجتبےٰ علی خاں خوش دل نے "مواقیت الفواتیح" لکھی۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر جھندس نے ۱۳۶۰ھ میں "خزینۃ الاصفیاء" مرتب کی۔ ان کے خلف مولوی اکرام اللہ شہابی صاحب نے تصویرالشعراء، ذکر علمائے گوپامئو' اور' شعرائے گوپامئو' پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جو مولوی یادر حسن عمری نقش بندی نے ۱۹۲۰ء میں شائع کئے۔ گوپامئو کی مکمل تاریخ مولوی حکیم بہاءالدین صدیقی نے مرتب کی ہے جو حلیۂ طباعت سے ابھی آراستہ نہیں ہوئی ہے۔ ' آثار علماء' راقم سطور نے چند سال ہوئے شائع کیا ہے مگر یہ مضمون جامعیت سے حتی الوسع مرتب ہے جو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

علمائے کرام

حضرت مولانا عبدالرحیم صدیقی خاندان متولیان سے تھے۔ مولوی اکرام اللہ' ذکر علماء' میں لکھتے ہیں:۔

" او جامع علوم عقلیہ و نقلیہ بود و مولانا شیخ الاسلام مخدوم نظام الدین عثمانی بود فتاوی مجمع المسائل' تالیف وے اند در سنہ نہ صد و ہشتاد و نہ مرحلہ زندگانی بعالم جاودانی

ارتحال فرمودہ۔

"اعلم العلماء افضل المعالی ملا وجیہ الدین فقیہ اعظم مولف 'فتاویٰ عالمگیری' بن مفتی شیخ عیسیٰ سہروردی چشتی بن شیخ آدم الشہابی گوپاموی بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم اول بن محمد بن احمد بن یحییٰ بن عماد الدین بن شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی۔"

انہالی تعلق شیخ جعفر بندگی ابن بندگی نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے نواسہ تھے۔ بروز یکشنبہ ۲ رجب المرجب ۱۰۰۰ھ بمقام گوپامئو جلوہ آرائے عالم شہود ہوئے۔

نسب آپ کا سلسلۂ نسب بواسطہ حضرت شیخ الشیوخ ابوحفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری السہروردی سیدنا قاسم بن محمد بن محمد بن سیدنا افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے۔[1]

خاندانی حالات شیخ الشیوخ نے اپنے چچا حضرت ابوالنجیب سہروردی سے علوم عقلی و نقلی حاصل کئے اور اُن کے ہی خلیفہ اور مُرید تھے۔ اور غوث پاکؒ سے بھی فیوضات حاصل کئے۔ اور خلافت پائی۔ مدتوں جزیرۂ عبادان میں ابدالوں کی صحبت اُٹھائی۔ شریعت محمدیہ کے درجۂ غایت متبع اور امام شافعی کے پیرو تھے۔ بعمر ۹۲ سال عشرۂ محرم الحرام ۶۳۲ھ میں بمقام بغداد وفات پائی۔ 'عوارف المعارف'، 'اعلام الهدیٰ' وغیرہ کثیر التعداد تصانیف کیں۔ علاوہ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی۔ شیخ نجم الدین علی برغش۔ شیخ حمید الدین ناگوری۔ میر سید مبارک علی غزنوی آپ کے تلامذۂ خاص ہیں۔ اُنھیں منصب خلافت بھی حاصل تھا۔ عارف شیرازی شیخ مصلح الدین سعدیؒ آپ کے حلقہ بگوشں اور جاں نثار مُرید تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ؎

مرا پیر دانائے مُرشد شہاب دو اندرز فرمود بر رُوئے آب
یکے آں کہ بر خویش خود بیں مباش دگر آں کہ بر غیر بد بیں مباش

خاندانی حال حضرت جامیؒ نے شیخ الشیوخ کے ذکر کے بعد شیخ عماد الدین محمد سہروردی متوفّی ۶۵۵ھ خلف الصدق شیخ الشیوخ شہاب الدین کا مختصر ذکر کیا ہے[2] اور یحییٰ بن عماد الدین کا تذکرہ الفاظ ذیل میں احمد رازی 'ہفت اقلیم' میں یہ کرتے ہیں:-

" او از کملائے محدثین عہد است و بزہد و ورع و تقویٰ و درس حدیث قیام داشت ہرگاہ حسب الطلب خان اعظم شیر خاں المخاطب بہ خان المعظم ادام اللہ تعالےٰ آثارہ در ملتان آمد بعد

---

[1] ابن خلکان و طبقات شعرانی۔ [2] نفحات الانس جامی

بزارت ممتاز شد بمراسم المکلفات و آداب ملوک مقید نمی شد۔"

ہذا من مسودات جلدی شیخ آدم قدس اللہ سرہٗ وہو العالم الفاضل العارف الکامل الشیخ محمد بن الشیخ الاجل الاکرم والمحقق اعظم شیخ خواجہ بن الشیخ المہتدین قدوۃ علماء الراسخین الشیخ الاعظم الافضل قطب الدہر مرجع الجد مظہر الکرامات مظہر الخوارق والعادات اجل المتقدمین وصفوۃ المرسلین شیخ آدم قدس اللہ سرہم اجمعین وہو الذی کان متوطناً فی اچ ملتان وجاپا وزیراً بین یدی سلطان الزمان تمام بینہ وبین السلطان فالقی القلم علی سریرہ وقال من کان علی الباطل یخزیہ اللہ بہ ولیظہر الحق اظہاراً لاستترۃ فاذا ہی اے السلطان لیلۃ فقام السلطان من مقامہ وقال الامان الامان الامان فردہا نحو القلم کان ان اترث العارف رحمۃ اللہ علیہ لکنہ حتی وصل فی سنۃ نصف وثمانماۃ الی ہذہ القصبۃ فتوطن بہا تاخیرنا بہن اعمی والے خلق بشرفراہم قال اخبرنی آدم عن ابیہ وہو الشیخ شیخ بن آدم حین توکل فی ہذا المکان فتوطن۔

مفتی شیخ بن آدم اول

شیخ آدم نے گوپامئو میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ اُن کے بعد شیخ آدم جلیل المرتبہ اور صاحب درس و تدریس تھے گوپامئو کے مفتی مقرر ہوئے۔

مفتی محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم مولانا جلال دوانی مولانا علی بیتر کے معاصر تھے۔ اُن کے صاحبزادے شیخ آدم دانشمند شیخ احمد بن شیخ فرید چشتی، مخدوم سید نظام الدین اللہ دیا خیر آبادی کے دادا[1] اور حضرت بندگی نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے خسر تھے[2]۔ تلمذ شیخ معروف جونپوری سے تھا۔ سلسلہ طیفوریہ سنائیہ مداریہ میں علامہ وجیہ الدین گجراتی کے خلیفہ تھے۔ ۹۳۳ھ میں ظہیر الدین محمد بابر نے المغ مرحمت کیا۔ جس کا فرمان یہ ہے:۔

فرمان شاہنشاہ بابر

"امرائے نامدار وزرائے کفایت شعار و متصدیان الحال حویلی آں ذات المال پرگنۂ مذکور کہ تمع آں مبلغ ۔۔۔ ہیزدہ ہزار و پانصد تنکہ مشہور می آمد از آں تاریخ بجناب فضیلت مآب تقوی شعار دیانت آثار شیخ آدم عالم ولد شیخ محمد ارزانی مذکور معاف فرمودیم حاصلات آں را گرفتہ وورجہ مدد معاش خود صرف جاری نمایند کہ بدیں موجب من گذشتہ تغیر و تبدیل بقواعد آزادہ نہ دہند و بعلت بالوجہات و اخراجات و عوارضات وکل تکالیف دیوانی و مقدمات سلطانی مزاحم نشوند

---

[1] تذکرۂ انساب تعمیر بی مصطفیٰ علی خاں گوپامئوی۔ [2] ملفوظات بندگی امیٹھوی۔

دہر سال فرمان و پروانچہ مجدد نہ طلبند۔

موضع ربع اشرف — اعمال سہلاشتہ اعتماد

رجب المرجب سنہ ۹۳۴ھ

سنہ ۱۰۱۰ھ بعمر ۹ سال وفات پائی۔ اُن کی وفات کے بعد شیخ عیسیٰ ابن آدم سہروردی مفتی گوپاموؤ باپ کے جانشین مقرر ہوئے۔ حضرت شیخ عیسیٰ فقیہ محدث صوفی گوپاموی علامہ وجیہ الدین گجراتی کے شاگرد تھے۔ مفتی عیسیٰ شعبان سنہ ۹۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ عالم اکمل فقیہ اجل علم حدیث و فن تفسیر کے ماہر مخدوم نظام الدین اللہ دیا خیرآبادی کے نواسے بندگی جعفر بن عرفان پناہ بندگی نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے داماد اپنے والد مفتی شیخ آدم بندگی کے تلمیذ رشید اور خانوادہ ہائے جعفریہ، ادہمیہ، یعقوبیہ، مغربیہ، بدیقہ طیفوریہ، جنیدیہ، ماوزبہ، فردوسیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ، بکروبیہ، اسحاقیہ، چشتیہ، معینیہ، چشتیہ مفتی مجاز و صاحب ارشاد تھے ۲۹ ذالحجہ سنہ ۱۰۲۲ھ میں انتقال کیا۔

تحصیل علم | ملا وجیہ الدین نے ابتدائی کتب اپنے برادر کلاں مفتی عبداللہ الشہابی سے پڑھیں۔ اور تکمیل اپنے نانا بندگی جعفر بن شیخ نظام الدین امیٹھوی سے کی۔

ملازمت | علمی مراحل طے کر لینے کے بعد ملا صاحب علیہ الرحمۃ کی شہرت ہوئی۔ حتیٰ کہ شاہجہانی دربار دربار میں ان کا نام پہونچا۔ طلب کئے گئے۔ تقرب شاہی کے ساتھ مختلف خدمات مثل داروغگی کتب خانۂ شاہی، امین قلمدان و مہرزک شاہجہانی و معلمی شاہزادہ محمد داراشکوہ عہدہ صدارت صوبۂ الہ آباد و بہار وغیرہ پر سرفراز ہوئے۔

فرمان

"عبارت نشانی ۱۔ بسم اللہ ۲۔ طغرائی ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی صاحب قران ثانی ۳۔ طغرائی نشان عالی سلطان محمد داراشکوہ ۴۔ مہر داراشکوہ ۵۔ عبارت فرمان احکام عظام و متکفلان امور اشتغال و متصدیان مہمات حال و استقبال صوبہ الہ آباد و پرگنات صوبۂ اودھ و صوبۂ بہار کہ بجاگیر وکلائے سرکار عالی متعالی اند۔ بدانند کہ چوں ہمت والا نہمت مصروف پرداخت ہام عموم انام و بتوجہ خاطر فقرا و مساکین و ائمہ عظام است۔ لہذا فضائل پناہ شیخ وجیہ الدین را کہ گمان راستی و درستی و امانت بر دست برخدمت صدرات محال مذکور از تغییر ملا محمود صدر سابق سرفراز فرمودیم۔ باید کہ عمال و حکام و اہالی و موالی و وضیع و شریف

وجمہور سکنہ وعموم متوطنہ آں محال مشارالیہ را صدر مستقل آنجا دانستہ لوازم امر مذکور راشل ملاحظہ نمودن فرامین مطاعہ و اسناد صحیحہ وغیر صحیحہ او استحقاق وعدم استحقاق اشخاص فوتی وفراری وتجویز ورثہ وانچہ متعلق بخدمت داشتہ باشد بموی الیہ رجوع نمودہ دست تصدی مشارالیہ در امور متعلقہ قوی شناختہ قول وفعل او معتبرہ انند واز استصواب وصلاح دید او کہ مطابق حکم دحق وحساب باشد بیروں نہ روند ودر استقرار واستمرار ایں حکم لازم الامتثال درنہ گزند تخلف واعتراف وعدول وانصراف نورزند۔ تحریر فی التاریخ بست وسوم شہر محرم ۱۰۵۶ھ۔"

واپسی گوپامئو

۱۰۶۷ھ میں شاہ جہاں بیمار ہوئے۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں برادرانہ جنگ ہوئی۔ دارا کام آئے اورنگ زیب نے تخت نشینی اختیار کی۔ شاہ جہاں آگرہ کے قلعہ میں نظربند کئے گئے۔ نظام حکومت میں تبدیلی ہوئی۔ ملا صاحب بھی ملازمت ترک کر کے وطن چلے آئے۔ اور آبائو اجداد کی درس و تدریس کی گدی سنبھالی۔

بختاور خاں "مرآۃ العالم" میں لکھتا ہے:۔

"چوں اورنگ سلطنت وجہانبانی بجلوس حضرت خاقانی فر آسمانی یافت او در وطن خود منزوی بود اوقات خود را بسر می برد۔"

طلبی

اورنگ زیب آپ کے علم وفضل اور تبحر علمی سے واقف تھا۔ ارکان دولت کے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے آپ کو طلب کیا۔ اور منصب عطا کیا۔

"ودر سنہ نہم جلوس ولا برہنمونی بخت بیدار بدرگاہ کیواں جاہ رسید۔ بمنصب سرفراز گردید۔"[۱]

تالیف فتاویٰ عالمگیری

عالمگیر کو علوم شرعیہ سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اس نے یہ ضرورت محسوس کر کے کہ اہل اسلام مستند مسائل حنفیہ پر عمل پیرا ہوں نیز شرعی مقدمات میں بھی مفتی بہ مسائل سے فیصلہ کیا جائے مگر اختلافات قضاۃ ومفتیان بالارادات کی وجہ سے ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جو تمامی مسائل پر حاوی ہو اور اس کے مطالعہ سے ہر شخص بلا وسعت نظر واستحضار کافی دستگاہ وافی استنباط مسائل کر سکے۔ اپنے متوسلین دربار کے علماء وفضلاء کے اجتماع سے ایک مستقل محکمہ "تالیف فتاویٰ" بسرکردگی ملا نظام[۲] قائم کیا گیا۔ اور شاہی کتب خانہ جس میں بے شمار کتابیں تھیں اسی ضرورت کے لئے وقف کر دیا گیا اور تقریباً سوا لاکھ روپیہ نقد صرف

۱؎ مرآۃ العالم۔ ۲؎ عالمگیرنامہ۔

کرکے کتاب تیار ہوئی۔ جو "فتاویٰ عالمگیر شاہی" کے نام سے موسوم ہے۔ اسی بادقار جماعت علماء میں ملا وجیہ الدین سُہروردی گوپامؤی بھی تھے۔[1]

"وترتیب تالیف فتاویٰ ربعے از فتاویٰ عالمگیر شاہی معمور شدہ و ذکس دیگر از فضلائے عہد و اعانت او مقرر شدند و او در اں کار مساعی جمیل بکار برد۔[2]

خطاب بادشاہ کی جانب سے علمی خدمت کے صلے میں افضل العمال کا خطاب عطا ہوا۔ صاحب "مرأۃ العالم" لکھتے ہیں :-

"ملا شیخ وجیہ الدین گوپاموی عالم تحریر بود و بہ تقریر دل پذیر واقعات ذہن وصفائی خیمہ اتصاف داشت" الشیخ الفاضل العلامہ المفتی وجیہ الدین ولد ونشا بگوپامئو والعلم علی حرہ الشیخ جعفر علی غیرہ من العلما، والے الاۤن ومکان وولوہ بگوپامئو ولا شرکتہ فی تصنیف الفتاوی الہندیہ ذکرہ السامی فی مرأۃ جہاں نما انہ بتالیف الرابع من ذالک الکتاب وتحریرہ عشرۃ رجال من الفقہا وکان کثیر الشد والافادۃ قرا علیہ شیخ مبارک والقاضی عصمت اللہ الموی وخلق کثیر من العلماء ذکر"

نزہتہ الخواطر۔

سلسلۂ طریقت ملا صاحب جملہ خانوادوں میں اپنے والد ماجد مفتی شیخ عیسیٰ سہروردی کے مرید و خلیفہ تھے۔

شجرۂ طریقت شیخ عیسے ابن آدم خلیفہ شیخ نظام الدین امیٹھوی۔ وہو من حضرت شیخ معروف جونپوری وہو من مولانا اللہ داد شارح کافیہ جونپوری وہو من راجی حامد شاہ مانک پوری وہو من شیخ حسام الدین مانک پوری وہو من المشائخ شیخ نظام الدین دہلوی قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم۔

تعبیر خواب فن تعبیر میں بھی ملا صاحب کو مہارت تام حاصل تھی۔ ملا ابن حسن بیجاپوری نے تزک والاجاہی میں یہ واقعہ لکھا ہے :-

"اگرچہ نواب حاجی انوار الدین خاں بہادر گوپاموی فرزندان بسیار یافت۔ اما غیر از ان کہ در عالم کم سنی ہر یک الم انتقال آنہا بر می داشت۔ دیدۂ امید از شمع جوانی احدے روشن نمی ساخت۔ بنا براں اکثر بہ تمنائے فرزند طویل الحیات می گریست و بخواہش زیست کہ شبے بزرگے را در خواب دید کہ گوہر تابندہ بدستش سپرد۔ چوں ایں خواب پیش علامہ وجیہ الدین گوپاموی بیان کردہ شد

---

[1] سوانح عمری ملا وجیہ الدین۔ [2] مرأۃ العالم۔

تعبیرش بعطائے فرزند طویل الحیات ببیند۔"

وفات ملا صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔ وہیں بتاریخ ۵ رجادی الثانی ۱۰۸۳ھ بعمر ۸۰ سال وفات پائی۔ تابوت وطن لایا گیا۔ اپنی مسجد کے صحن میں دفن ہوئے۔ مزار مرجع خلائق ہے مگر بدعات سے محفوظ۔

تصانیف "نفائس وجیہ" (تصوف) حاشیہ عربی بر حاشیہ خیالی۔ مطول شرح حصن حصین۔ رسالہ" در تحقیق چہاردہ علوم"۔ "عقائد وجیہ"۔ "رسالہ سجدہ" نتیجہ تصانیف سے ہیں۔ "عقائد وجیہ" وغیرہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہیں۔

تلامذہ مولوی عصمت اللہ بن ملا عبدالقادر بدایونی[۵۱]۔ ملک بہاءالدین بلگرامی[۵۲]۔ شیخ محمد محسن صدر محتسب خیرآبادی۔ مولوی شاہ محمد آفاق خلیفہ و جانشین شاہ پیر محمد لکھنوی[۵۳]

قاضی مبارک شارح سلم منطقی

قاضی مبارک بن دائم ادھمی مشرقی دنیا کے مشاہیر میں سے ہیں۔ جن کا نام اُن کے علمی کارنامہ کی وجہ سے لوحِ روزگار پر سنہری حروف سے رہتی دنیا تک لکھا رہے گا۔ اور ان کی ذات گوپامئو کے ہی لئے نہیں جو ان کا مولدگاہ تھا بلکہ تمام ہندوستان کے لئے سرمایہ افتخار و نازش ہے اور ان کا نام دنیائے علوم عقلیہ میں ہر جگہ ادب و احترام سے آج لیا جاتا ہے اور آئندہ جب تک ان کی کتاب "قاضی مبارک" رہے گی۔ لیا جائیگا۔

نسب نامہ و خاندانی حال قاضی مبارک بن قاضی دائم بن عبدالحی بن عبدالحکیم بن قاضی محمد مبارک ثانی بن قاضی شہاب الدین بن علاءالدین بن قاضی حاتم بن قاضی کبیر بن خواجہ مبارک اولیا ابن کریم الدین بن فریدالدین بن خواجہ تقی الدین بن صدرالدین بن کمال الدین بن ابراہیم ثانی بن جلال الدین بن خواجہ ابراہیم بن ناصح الدین نواسہ حضرت امام علی موسیٰ کاظم بن سلطان ابراہیم ابن سلطان ادھم بلخی بن منصور بن یزید بن جابر عجلی۔

عجلی ایک شاخ بکر بن وائل کی تھی (کذا ذیل ابن خلکان) حضرت سلطان ابراہیم ادھم کے پوتوں میں سے ہندوستان آئے اور گوپامئو میں مقیم ہوئے۔ خواجہ مبارک اولیا، کا تذکرہ غوثی مانڈوی گلزار ابرار میں یہ کرتے ہیں:۔

---

۵۱ سوانح عمری علامہ وجیہ الدین گوپاموی مرشد حکیم بہاءالدین صدیقی۔
۵۲ مآثر الکرام۔
۵۳ تذکرہ علمائے ہند۔

خواجہ مبارک اولیاء گوپاموی ابتدائے احوال میں سلطان علاؤالدین کے میر عدل تھے۔ میر خورد جامع سیرالاولیاء ولد سید نور محمد کرمانی بیان کرتے ہیں مجھ کو آپ کے ساتھ اور آپ کو میرے ساتھ خاص خصوصیت تھی اکثر اوقات آپ کی زبان سے یہ باتیں نکلا کرتی تھیں کہ مبارک آپ کے پدر بزرگوار کا مسلمان کیا ہوا ہے۔ اس طرح کہ میں درویشوں کے احوال کا منکر تھا ایک روز آپکے پدر بزرگوار مجھ کو نظام الدین اولیاء کی خدمت میں لے گئے اور انکار کے شکنجہ سے رہائی دلاکر میرا اعتقاد اور اخلاص درست کرادیا اور آپ کی باعظمت ملازمت سے دنیاوی ساز و سامان کے ترک کی استعداد میرے قلب میں پیدا ہوئی۔ [۵۱]

آپ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی اُن سے ملنے گوپامئو آئے اور کچھ عرصہ تک چلہ کش بھی رہے۔ دہلی میں انتقال ہوا۔ متصل مزار امیر خسروؔ دفن کئے گئے۔ آپ کے پوتے قاضی شہاب الدین نامور تھے جن کا ذکر مولوی مصطفیٰ خاں "تذکرۃ الانساب" میں یہ کرتے ہیں:-

"قاضی شہاب الدین بن علاء الدین تمامی مردماں محلہ قضاۃ گوپامئو عالم مدرس و خلیفہ حضرت مخدوم شیخ سعید و قاضی گوپامئو بودند۔ با دختر قاضی میاں ساکن قصبہ کتخدا بودند از ایشاں سہ پسر یکے قاضی محمد مبارک ثانی۔ دوم قاضی احمد عرف میاں مدا۔ سوم عبدالمجید متولد شدند۔

ملا عبدالقادر بدایونی قاضی مبارک ثانی کے احوال میں لکھتے ہیں:-

"قاضی علمے بروجہ اتم و دیانتے و صیانتے عظیم در منصب قضاۃ داشت۔ کہ کسب علوم و تہذیب اخلاق در ملازمت میاں شیخ نظام الدین امیٹھی قدس سرہ نمودہ از آں ہنگام کہ میاں در مغانقہ تحصیل علم می نمود بروے نظر خاص داشتہ تربیتش می فرمودند و ہرگاہ کہ قاضی بالتماس میگفت چہ باشد اگر از مشرف دلا مرانیز بہرہ شود جواب میداند کہ قاضی مبارک دنیا و عقبیٰ برو تا آخر عمر معزز و مکرم و محترم زیست۔" [۵۲]

درس تدریس شغل تھا۔ مخدوم میاں بدماہ ابن میاں ابوالفتح خراسانی اور سید محی الدین آپ کے خاص شاگرد تھے۔ "قرۃ الکونین" میں ہے ملا عبدالقادر بدایونی بھی تلامذہ سے تھے۔

قاضی کے پوتے قاضی عبدالحیٔ عالم فاضل تھے۔ درس تدریس مشغلہ تھا۔ قاضی با دختر مخدوم سید عبداللہ نبیرہ مخدوم سید اللہ دیا رضوی خیرآبادی کتخدا بودند۔ از ایشاں سہ پسر یکے قاضی محمد دائم۔

---

[۵۱] گلزار ابرار صفحہ۔۔ [۵۲] منتخب التواریخ۔

دوم قاضی علیم الدین۔ سوم قاضی جیون متولد شدند۔ قاضی محمد دائم علم و فضل کے ساتھ سلسلۂ فقر میں بھی قدم رکھتے ہوئے تھے۔ ان کے صاحبزادے قاضی مبارک شارح سُلّم تھے۔

تعلیم و تربیت قاضی مبارک نے ابتدائی تعلیم باپ سے اور قاضی شہاب الدین ثانی گوپاموی سے پائی مولوی حکیم عبدالحی "نزہۃ الخواطر" میں لکھتے ہیں:۔

"وتلقی العلم فی عصرہ عن القاضی شہاب الدین گوپاموی"

یہاں سے خیرآباد گئے۔ محدث حاجی نعمت اللہ سے سند حدیث حاصل کی۔ منقول کی تکمیل اکبرآباد جاکر سید زاہد ابن اسلم ہروی سے کی۔ مولانا فضل امام خیرآبادی "آمدنامہ" میں آپ کا یہ حال لکھتے ہیں:۔

"شاگرد ملا قطب الدین گوپاموی قدس سرہٗ بود۔ کسب علم و تہذیب و اخلاق در خدمت شیخ موصوف نمود۔ عالم تجرد۔ مشتہر صاحب تصانیف کثیرہ۔ (دلی میں اقامت اختیار کر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے) فضائل و کمالات بسیاری داشتند۔ چنانچہ مردمان شاہ جہاں آباد ایشاں را امام اعظم ثانی می گفتند۔" [1]

بیعت سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں حضرت شاہ اکرم دہلوی کے مُرید تھے۔ خرقۂ خلافت قلندریہ سلسلہ میں شاہ علاء الدین احمد شاہ اللہ دیا احمد لاہوری سے پہنا۔

علوم عقلیہ علوم عقلیہ میں منطق پر عبور تھا۔ مولانا فضل امام لکھتے ہیں:۔

"قاضی مبارک ذہن رسا و طبیعت عالی داشت و در امور عامہ دانی مشہور بود۔ اوّل کسے کہ حاشیۂ میرزاہد نوشت و سلّم را شرح کرد او بود و تتبع طرز میر باقر داماد ست۔ در عبارت شرح سلّم پیروی میر اختیار کردہ۔" [2]

قاضی کی شرح سلم جو قاضی مبارک کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلّم کی کثیر التعداد علماء نے بھی حواشی و شرح لکھی ہیں جن میں ملا شریح ابوالبرکات مولوی تراب علی لکھنوی۔ ملا محمد حسن بن حافظ دراز پشاوری۔ مولوی عبدالحکیم نبیرۂ ملا بحر العلوم لکھنوی۔ قاضی میر جمال کابلی۔ مولوی نور الاسلام۔ ملا محمد یوسف فرنگی محل۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مولوی عبدالحق بھوپال کے شروح حواشی مشہور ہیں۔ علاوہ شرح سلّم حواشی سلسلۂ میرزاہد رسالہ و دوانی کا حاشیہ۔ سراج اللہ وقت کا حاشیہ آپ کی تصانیف سے ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الانساب مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی۔ [2] آمدنامہ (ذکر فضلاء ہند) از مولانا فضل امام خیرآبادی۔

۵ مولوی محمد علی بدایونی۔ حکیم سید امام الدین رہتکی۔ مولوی محمد میران کشمیری متخلص بہ فرحت۔
(ذکر فضلاء ہند) از مولانا فضل امام خیرآبادی۔ ملا نور محمد کشمیری۔ قاضی محمد امیر خلف حضرت قاضی
ن آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

دہلی میں قاضی نے ۱۱۶۴ھ میں بعہد احمد شاہ بادشاہ وفات پائی۔ حسن خاتمہ
ت مادۂ تاریخ ہے۔ ۱۱۶۴ھ

نعش او را بگوپامئو آوردند۔

اپنے دادا کے مدرسہ میں دفن ہوئے۔

قاضی محمد امیر اور قاضی حکم علی خاں دو صاحبزادے تھے۔ قاضی حکم علی کے حال میں مولوی
عبدالحی لکھنوی 'نزہۃ الخواطر' میں لکھتے ہیں:۔

"الشیخ الفاضل حکم علی خاں بن القاضی المبارک گوپاموی احد الافاضل المشہورین ولد ونشأ فی گوپامئو وقرا العلم علی من بہا من العلماء ثم سافر الی ارض الدکن قرا علیہ غیر واحد من العلماء فی الدکن فی غیرہا من البلاد"

قاضی شہاب الدین ثانی گوپاموی

قاضی شہاب الدین بن محمد حسن بن عبدالسلام بن احمد عرف مبارک جد ابن قاضی شہاب الدین
ملا الدین ادھمی علمائے اعلام وقت سے تھے۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی 'مآثر الکرام' میں لکھتے ہیں:۔

"از علمائے اعلام وقت بود و کسب کمال از خدمت مولوی عبدالرحیم مرادآبادی تلمیذ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی نمود۔ و در جمیع علوم سیما ہیئت و ہندسہ عدیم المثل بود"

ری حکیم عبدالحی 'نزہۃ الخواطر' میں آپ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"کان ابن بنت الشیخ العلامہ محب اللہ حیدرپوری ثم الٰہ آبادی وقرا العلم علی الشیخ قطب الدین بن عبدالحکیم الانصاری السہالوی و قرأ علیہ ولدہ القاضی قطب الدین گوپاموی و مولانا محمد صالح بنگالی و مولانا محمد اشرف شارح سلم والقاضی مبارک کما فی رسالۃ القطبیہ وفاتش در عشرۂ ثالثہ بعد مأۃ والف واقع شد ۱۱۲۲ھ"

ب کی شادی مولوی اللہ داد بن اللہ بخش سبط مفتی شیخ عیسے محدث گوپاموی سے ہوئی۔ اُن سے ملا

---

۵ 'سوانح الفواتح' از قاضی مجتبیٰ علی خاں گوپاموی۔

قطب الدین تھے۔

"ملا قطب الدین عالم متبحر و مشتہر مدرس بودند او شاگرد دیدہ بزرگوار در ہمہ علوم معقول و منقول عصرا عد روزگار بود و بحکم ارث در فنون ریاضی رایت مہارت باآسماں می افراخت و اہل استفادہ را بہ اشعۂ کمال بہرہ می ساخت"۔[۵۱]

"در مدت ایشاں زیادہ از چار مدرس فارغ التحصیل شدند و از بنگالہ تا پنجاب شاگرداں ایشاں در می گویند[۵۲] بست و پنجم رمضان ۱۱۶۰ھ در آغوش بہشت آرمید۔"

علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی "مآثر الکرام" میں یہ تاریخ وفات تحریر کرتے ہیں:۔

مولوی زمانہ قطب الدین | کرد از عالم فنا رحلت

سال تاریخ او طلب کردم | ہاتف گفت وارث جنت

۱۱۶۰

مولوی محمد سعید جعفر القادری بدایونی آپ کے تلامذہ میں سے تھے[۵۳]۔ مولوی دہاج الدین بن مولانا قطب الدین گوپاموی صاحب ذہن رسا تھے۔ فن منطق میں ید طولیٰ تھا۔ شغل درس و تدریس تھا۔ مولانا فضل امام خیرآبادی لکھتے ہیں:۔

"صاحب ذہن ثاقب صائب وغور دقیق بودند۔ طبع بہ دقائق علمی خوب می رسید۔ در علوم اصول نظر خود داشتہ در ہدایہ دانی مشہور بود۔ خلق کثیر در حلقۂ درس او حاضر شدہ استفادۂ علوم می کردند یک مرتبہ در مجلس عرس در بلدۂ کہ مجمع از فضلا و علما و معتقدان بودہ از مولوی محمد حسن لکھنوی و مولوی صاحب در فن اصول مباحثہ شدہ بود سخن لطیف کشید و وقت نماز در کشید المقدمہ تا صاف ماند و ہر دو صاحباں برخاستند"۔[۵۴]

آپ مخدوم قدرت اللہ شاہ بلگرامی کے مرید و خلیفہ تھے۔ مولانا عبد الواجد کرمانی خیرآبادی مولوی دیدار علی جائسی مجتہد سے لوگ تلامذہ سے تھے ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا۔ مادۂ تاریخ "دہاج الدین بحق فردوس" ہے۔[۵۵]

مولانا شاہ صلاح الدین قادری

شاہ صلاح الدین بن فضل الدین محمد خاں بن خیر الدین بن خیر اللہ بن عبد اللہ ...گوپاموی صلح و تقویٰ اور فقاہت فی الدین میں ضرب المثل تھے۔ علوم دینیہ، حدیث و فقہ و تفسیر میں فرید العصر

---

[۵۱] مآثر الکرام۔ [۵۲] تذکرۂ انساب [۵۳] تذکرۃ الواصلین صفحہ ۲۲۰۔
[۵۴] ؟ دنامہ [۵۵] مواقیت الفوائح۔

دیگانۂ روزگار۔ غرضکہ مجمع کمالات ظاہری و باطنی تھے۔ مولانا محمد اعلم سندیلوی سے تلمذ تھا۔ شاہ غلام یحییٰ صفی پوری اور شاہ سید معشوق علی خیرآبادی کے خلیفہ تھے۔ فضل امام خیرآبادی اور عبدالکریم رہتکی آپ کے حلقۂ ارادت سے تھے بر ۱۲۳۶ھ میں وصال ہوا۔ مسجد خیراللہ شاہ عمری میں دفن ہوئے۔

قاضی محمد عظیم بن شیخ کفایت اللہ گوپاموی منطق میں ملا قطب الدین گوپاموی اور ملا محمد عوض کے شاگرد تھے۔ سند حدیث مولانا حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے لی۔ درس و تدریس شغل تھا۔

سلم العلوم محب اللہ بہاری پر شرح لکھی۔ میرزاہد ثلثہ پر حواشی بھی ان کے ہیں۔ آخر عمر میں ملانواں چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔ ملا محمد عوض عرف ملا کالے بسلسلۂ طالب علمی گوپامئو آئے اور مقیم ہو گئے۔ قاضی محمد عظیم کے استاد تھے۔

کتب منطق پر متعدد حواشی و تعلیقات یادگار ہیں۔ وفات گوپامئو میں ہوئی۔[۵]

آپ کا قطعہ یہ ہے

بحمد اللہ تائید سعادت ... بہ بیعت برگزیدہ دست گیرم
زہاتف بہر تاریخ ارادت ... ہوا لے بود مکنون ضمیرم
بلطف خود یکا یک کرد الہام ... بگو خوش دل مرید خاص پیرم

مولانا قاضی غلام احمد مجتبےٰ خاں فاروقی ابن مولوی مصطفےٰ علی خاں گوپاموی ملقب مصطفےٰ علی خاں ثانی مختار جنگ قاضی القضاۃ مدراس ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل فارسی کے بعد علوم عربیہ مولانا رحیم الدین گوپاموی و مولوی غلام طیب بہاری، مولوی حیدر علی سندیلوی سے حاصل کئے، حافظ قرآن بھی تھے۔ شاہ غلام پیر خلف شاہ یٰسین بلگرامی کے اور شاہ نصیرالدین سعدی بلگرامی کے خلیفہ تھے۔ مادۂ تاریخ بیعت "مرید خاص پیرم"؛ ۱۲۰۰ھ مدراس گئے اور نواب محمد علی والا جاہ کی قدردانی سے مخاطب بہ مصطفےٰ خاں بہادر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب والا جاہ نے گوپامئو میں مدرسۂ سرکاری والا جاہی قائم کر کے آپ کو اس کا صدر مدرس کیا۔ بحیات نواب موصوف آپ اس عہدہ پر ممتاز رہے۔ بر ۱۲۱۱ھ میں دوبارہ مدراس گئے۔ نواب عمدۃ الامراء نے بہت سی مراعات فرمائیں۔

---

[۵] مصنفین گوپامئو مرتبہ مولوی حکیم بہاءالدین صدیقی گوپاموی۔

گوپاموی رحلت کیا۔ سنہ ۱۲۱۶ھ میں آپ سہ بارہ مدراس گئے اور قاضی دائرۂ سائر ترچناپلی مقرر ہوئے۔

مولوی محمد مستعد خاں گوپاموی قاضی القضاۃ کی وفات کے بعد حسب خواہش ارباب حکومت مدراس بمشاہرہ سات سو روپیہ ماہواری قاضی القضات ممالک محروسہ مدراس مقرر ہوئے۔ اور اس عہدہ پر تاحیات خود فائز رہے۔ شعرگوئی کا بھی شوق تھا۔ خوشدل تخلص تھا۔ عربی دیوان فکر سے ہے۔ ۹ رجب سنہ ۱۲۳۴ھ میں وفات پائی۔ صحن مسجد بندر چیناپٹن میں پہلوئے والد خود مصطفےٰ علی خاں مدفون ہوئے۔ [1] مواقیت الفواتح یادگار رہے ہے۔

قطعہ تاریخ از قاضی ارتضا علی خاں خوشنود

چونکہ قاضی القضاۃ بحر علوم	رخت بربست زیں جہانِ فنا
شد الہام خوشدلِ مرحوم	فکر کردم بسالِ تاریخش

۱۲۳۴ھ

تاریخ اتمام دیوانِ خود ——— ۱۲۳۴

قطعہ عربی

رب اغفر خطیتی فی الارقام	سودت صحیفۃ بفضل المنعام
علمتنا انک انت العلام	سبحانک لا علم لنا الا ما

فرد

یا بدایں دیوانِ خوشدل نذبۂ حسن قبول	یا الٰہی از طفیل احمد واہلِ بتول

افضل العلماء قاضی ارتضا علی خاں فاروقی ابن قاضی احمد مجتبیٰ علی خاں بہادر بن مصطفےٰ علی خاں بن شیخ خیرالدین بن شیخ خیراللہ بن عبدالوالی بن محمد منور بن نعم اللہ بن عبدالحیٔ بن شیخ عبدالقادر گوپاموی بن قاضی عبداللہ المعروف قاضی لاڈ بدایونی ثم قنوجی ابن ابراہیم بن نعمت اللہ بن علاء الدین حطابی بن محمد بن علاء الدین اکبر بن شیخ علی بن فخرالدین بن شیخ شعیب بن احمد بن یوسف بن سلطان شہاب الدین علی فرخ شاہ عادل کابلی بن فخرالدین بن شیخ محمود بن سلیمان بغدادی خلیفہ سری سقطی بن شیخ مسعود بن عبداللہ واعظ الاصغر حجازی بن ابراہیم

---

[1] تذکرہ صبح دکن و نتائج الافکار از مولوی قدرت اللہ گوپاموی۔

ن شیخ ناصر تابعی (ابن جناب فاطمہ بنت امام حسن علیہ السلام) بن شیخ عبداللہ بن امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

خاندانی حالات قاضی شیخ سلیمان سلطان محمود غزنوی کے خواہرزادہ تھے۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ خلیفہ منصور دانقی عباسی کے زمانہ میں بخارا میں مع اہل و عیال کے آکر مقیم ہوئے۔ سلیمان شاہ نے کابلستان کو فتح کیا اور خود حکمراں بنے۔ اور یہ سلطنت فرخ شاہ عادل تک رہی۔

"در عہدِ فرخ شاہ عادل کابل بحوادثِ روزگار خللے پذیرفت۔ و مملکتِ کابل بدست سلاطین غزنیں افتادہ و فرزندانِ سلطان در کابل ماندہ بودند تا وقتیکہ چنگیز خاں خروج نمود۔ مملکتِ ایران و توران زیر تیغ آوردہ لشکر بجانب غزنی فرستادہ و ملک کابل گرفت۔ دآں دیار خراب گردید و پدر و جد بزرگوار درآں ضرب شہادت یافت۔ جداں حضرت قاضی شعیب باسہ پسر دخیل و تبار در لاہور آمد و در قصبۂ کھتے وال کہ از مضافات ملتان است بحکم شاہ ہندوستان قرار و طن گرفت۔ [۵]

قاضی شعیب کے تین صاحبزادے شیخ کمال الدین سلیمان جن سے حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ دوسرے شیخ عبداللہ جو مورثِ اعلیٰ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے تھے۔ تیسرے شیخ فخرالدین سبط مولانا وجیہہ الدین خجندی تھے۔ شیخ شعیب قاضی قصبہ مقرر ہوئے۔ اُن کے بعد شیخ کمال الدین سلیمان قاضی تھے۔

مولوی غلام مصطفےٰ علی خاں اپنی تصنیف "تذکرۃ الانساب" میں لکھتے ہیں:۔

"جدِ ما شیخ عبدالقادر ابن شیخ لاڈو ابن شیخ ابراہیم ابن شیخ نعمت اللہ بن قاضی علاء الدین بن قاضی شیخ محمد بن قاضی علاء الدین بن قاضی شیخ علی بن قاضی شیخ محی الدین خطابی فاروقی قنوجی کہ جدِ اعلیٰ ایشاں در وقت چنگیز خاں، ہلاکو از بخارا آمدہ چندے در ہانسی حصار بودہ واز انجا بدہلی رسیدہ مامور خدمت شرعیہ گردیدہ بہ بلدۂ قنوج آمدند و سکونت اختیار کردند و دراں جا محلۂ ایشاں مشہور بخطابیاں دراں محلہ سوائے یک مسجد دیگر نشانے نماندہ چوں جدِ ما متعلق اللہ از قنوج برائے طالب علمی در قصبۂ گوپامئو آمدہ تحصیل علوم ظاہری نمودند و بیعت ارادت بجناب اقدس قطب الاقطاب حضرت بندگی نظام الدین امیٹھوی کہ سکونت گوپامئو اختیار فرمودہ بودند

---

[۵] سیر الاقطاب

آوردند۔ شیخ مبارک کفایہ روتی ادھمی رئیس محلہ پردہ کہ عالم مدرس وبسیار بزرگ بودند محلہ ایشاں دراں وقت معتبر ومتقدم از ہمہ محلہائے شہر بود۔ شیخ موصوف الصدر فضائل وکمالات ظاہری وباطنی جدنا شیخ عبدالقادر دیدہ اشخاص معتبر ومعتمد قنوج فرستادہ۔ از رؤسائے آں شہر نسب جدنا ونسبات ایشاں کہ با شرفائے آں شہر وجوار بود تحقیق نمودہ دختر برادر خود شیخ خیراللہ نام میداشتند بجدنا معزاللہ کتخدا کردند۔ ازیں بی بی پنج پسر یکے جد امجد مخدوم شیخ عبدالحی دوم شیخ عبدالجلیل سوم شیخ عبدالوہاب چہارم شیخ عبدالفتاح پنجم عبدالرزاق متولد شدند . . . .

ذکر جدنا شیخ عبدالحی مخدوم عارف باللہ وعالم علوم ظاہری وباطنی صاحب تقوی وفتوی بودند۔ وبیعت ارادت بجناب قطب الاقطاب حضرت بندگی امیٹھوی می داشتند حضرت بندگی ایشاں را بہ تلقین خلافت فرمودہ خلیفۂ اول خود فرمود۔ چنانچہ درذکر محامد وبزرگی ایشاں بسیار در ملفوظات حضرت بندگی مذکور است ۔ واکثر برآمد حاجات وخرق عادات وتصرف وکرامات داشتند۔ وازروحے پاک ومزار شریف ایشاں جاریست ۔ در محلۂ پردہ در برادر تہائی خود کتخدا شدند . . . . . .

غلام مصطفےٰ مخاطب بہ مصطفےٰ علی خاں ابن خیرالدین خاں ابن شیخ خیراللہ با دختر دری حکم علی خاں ابن قاضی محمد مبارک ابن قاضی دائم ادھمی در محلۂ قضاۃ گوپامؤ کتخدا است ازیں بی بی دو پسر یکے مولوی غلام احمد یحییٰ دوم غلام سعد و دو دختری دارد۔"[1]

۱۲ ربیع الاول ۱۱۹۸ھ میں انتقال کیا ۔ مسجد معمورہ چیناپٹن میں دفن ہوئے۔ ایک دختر اپنی برادرزادہ معظم الحق (بن ذکی الدین خاں ابن سبحان خاں بن شیخ خیرالدین العمری) صدر الصدور مدراس متوفی ۱۲۶۱ھ سے منسوب کی ۔ اُن سے جو لڑکی تھی وہ مفتی انعام اللہ خاں بہادر ابن مفتی محمد اسحاق شہابی گوپاموی سے منسوب ہوئیں۔[2] شیخ عبدالوالی ابن شیخ محمد منور مذکور کے بھائی حاجی محمد انور تھے جو شاہجہاں کے تسبیح خانہ کے منتظم تھے ۔ ان کو جاگیر عطا ہوئی اور خطاب انوارالدین خاں بہادر شہامت جنگ عطا ہوا۔ ۱۱۶۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے سراج الدولہ انوارالدین خاں بہادر ظفر جنگ تھے ۔ جو آگے چل کر ارکاٹ مدراس کے صوبہ دار ہوئے۔ اُن کے ہی خلف نواب محمد علی والاجاہ والئی مدراس تھے

---

[1] تذکرۃ الانساب ۔

[2] انفاس بے خبر صفحہ ۲۲ ۔

قاضی ارتضا علی خاں ۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی درسیات کے ساتھ کافیہ تک
نے والد سے پڑھا۔ پھر تحصیل علم کے لئے لکھنؤ گئے۔ سندیلہ پہونچ کر مولانا حیدر علی کے
ں میں شریک ہوئے۔ علوم معقول کی تکمیل کی۔ سات برس تک بلگرام میں مولوی محمد ابراہیم
آبادی سے اکتساب علوم عربیہ کیا۔

"بخدمت مولوی حیدر علی سندیلوی علوم عقلی و نقلی اخذ کردہ و فن ادب از مولوی ابراہیم بلگرامی آموختہ جامع شریعت و طریقت بود۔" ۵۱

بعد فراغتِ تحصیل علوم حضرت شاہ نصیر الدین سعدی بلگرامی کے مُرید اور خلیفہ ہوئے۔
۱۲۲۶ھ میں اپنے والد کے پاس مدراس گئے اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔ تمام
ں عام شہرت ہوگئی۔ ۱۲۳۰ھ میں نواب عظیم الدولہ بہادر نے دارالافتا کا کام اُن کے سپرد
کردیا۔ پانچ سال بعد خود مستعفی ہوگئے۔ اربابِ حکومت نے مقام چینور کی قضاۃ آپ کے
سپرد کی۔ ۱۲۴۰ھ میں افتائے صدر اور ۱۲۴۴ھ میں اپنے آبائی منصب قاضی القضاۃ کے
عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس پر بھی درس و تدریس کا شغل جاری رہا۔ ۵۲
ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد نے آغاز نفائس ارتضائیہ میں قاضی صاحب کے حالات لکھے
ہیں۔ اُس کی عبارت ذیل میں درج ہے:-

"المفرد الجمع الفضائل صدر الا فاضل العالم العلامہ والبحر والمقام السامی والمجد النامی صاحب خلق الفائق والعالی بین الاقران علامۃ الزمان افضل العلماء قاضی القضاۃ القاضی محمد ارتضا علی خان قادری الصفوی الجبارری المتخلص خوشنود۔ کان معدن علوم المعقول والمنقول عالماً بالحدیث والتفسیر والاصول نادرۃ العالم۔

قاضی القضاۃ اہل السنۃ والجماعۃ فی مملکت المدراس ممتازاً بین اقران والاماثل والفحول للحقائق والدقائق والفرع والاصول وحید الدھر فرید العصر مشہور فی الآفاق مرجع الکل بالاتفاق فما کان فی عصرہ فد ہو لا فی زمانہ الخ۔" ۵۳

اخلاق | خوش خُلق، منکسر المزاج، مسلمان نواز تھے۔ طلباء کی خبرگیری کا یہ عالم تھا کہ

---

۵۱ تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۰۔ صبح وطن و نتائج الافکار۔
۵۲ " " " " " "
۵۳ نفائس ارتضائیہ ترجمۃ المؤلف صفحہ ۸۶۔

رات کو اُٹھ کر اُن کی حالت کو دیکھتے کہ کوئی بھوکا تو نہیں سویا ہے اور کس حال میں ہے۔ دُور دُور سے طالب علم آتے خود کفالت کرتے جو کچھ کماتے سب طلباء پر صرف کر دیا کرتے۔ مولوی حکیم ناظم حسین فاروقی گوپاموی کہتے تھے کہ ایک دن قاضی صاحب اپنے صاحبزادہ کو گود میں لئے انار کے درخت کے پاس کھڑے ہوئے انار کے پھول سے بچے کو بہلا رہے تھے۔ طلباء دالان میں بیٹھے ہوئے قاضی صاحب کو دیکھ رہے تھے کہ قاضی صاحب آئیں اور سبق دیں۔ قاضی مجتبیٰ علی خاں بہادر محل سرا سے مردانہ میں نکل آئے۔ یہ جو عالم دیکھا بیٹے پر بہت بگڑے کہ طالب علم منہ تک رہے ہیں آپ بچہ کھلانے میں مبتلا ہیں۔ باپ کی خفگی کا یہ اثر تھا کہ تمام عمر پھر اپنے بچے کو گود میں نہ لیا اور جہاں طالب علم جمع ہوئے اور درس میں لگ گئے۔

مطالعہ کتب | کتب بینی کا قاضی صاحب کو بہت شوق تھا۔ رات رات بھر مطالعۂ کتاب میں گزار دیتے۔ مدراس میں اپنی نگرانی میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ۱۸۴۷ء میں قائم کرایا۔ [۱]

ذوقِ علم | عربی علم ادب سے دلی لگاؤ تھا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ فکرِ سخن فارسی میں ہے۔ صاحبِ دیوان ہیں۔ آپ کے ہمشیر زادہ مولوی اکرام اللہ صاحب گوپاموی تذکرۂ تصویر الشعراء اپنی تصنیف تذکرۂ علماء میں ایک جگہ قاضی صاحب کے احوال میں لکھتے ہیں:-

"سرآمد شعرائے زماں و فضلائے دوراں بود"

تصانیف | شرح صدرا حاشیۂ میر زاہد۔ رسالۂ جلالیہ حاشیۂ تہذیب تعلیقات زاہدیہ مقدمۂ میر زاہد۔ شرح مواقف نفائس ارتضیہ۔ فرائض ارتضیہ۔ تصریح المنطق۔ فوائد سعدیہ شرح مواقف۔ نقو الحساب۔ مواہب سعدیہ۔ صلوٰۃ ارتضیہ۔ تنبیہ العقول فی اثبات اسلام آباء الرسول۔ شرح قصیدۂ بردہ۔ فارسی شرح اسماء الحسنیٰ۔ اردو میں کلام پاک کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ مسودہ کتب خانۂ یادریہ گوپامئو میں موجود ہے۔

تلامذہ | مولوی قادر علی بن محی الدین مدراسی۔ قدرت اللہ خاں بہادر۔ ابن محمد کامل مؤلف تذکرۂ نتائج الافکار۔ مولوی محمد یحییٰ علی خاں ابن علامہ شیخ احمد مجتبیٰ۔ مولوی غلام غوث۔ صوفی مولوی سید شاہ وجیہ الدین احمد قادری صدر مہتمم دار العلوم حیدر آباد۔ مولوی محمد حیات خاں مولوی زین العابدین صدر مدرس دار العلوم۔ مولوی سید محمد مودودی معتمد صدر المہام العدلیہ

---

[۱] تذکرۂ علماء۔

حیدرآبادی ۔ مولوی غلام قادر ۔ مولوی محمد حسین قادری مخاطب افضل الفقراء ۔ خان بہادر نجم الدین حسن نواب محمد غوث خاں ابن عظیم الدولہ بہادر ۔ مولوی سید شاہ قادر بادشاہ ۔ مولوی قادر علی ابن محی الدین احمد خاں ۔ مولوی سید محمد حسین ابن سید امام الدین ۔ مولوی قدرت علی ناظم العدالت ۔ مولوی رضا حسین خان بہادر ۔ مولوی سید محمد اسحٰق مخاطب بہ شمس العلماء ۔ مولوی شہاب الدین ۔ مولوی محمد عبداللہ خان بہادر ۔ مولوی قدرت الرسول ۔ مولوی غلام ضامن ۔ مولوی مظفر علی ۔ مولوی غلام مصطفیٰ ابن ندیم بیگ مدراسی ۔ اہلواری سے شاگرد تھے[۵]

انتقال آپ کا فریضۂ حج ادا کرکے مکہ معظمہ کے واپسی حج پر شعبان ۱۲۷۰ھ بمقام حدیدہ وصال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے۔ (صبح وطن مطبوعہ مدراس)

ابوالمحامد مولانا محمد یوسف علی عثمانی ابن مولانا الحاج محمد یعقوب علی ابن الحاج مولوی فضل علی خاں گوپاموی ولد شیخ رحیم علی ابن شیخ عماد الدین سندیلوی!

شیخ رحیم علی سندیلے سے گوپامئو آئے اور نواب کرم علی خاں فاروقی قنوجی کی دختر سے منسوب ہوئے ۔ ان کے پوتے محمد یعقوب نے ابتدائی تعلیم پانے کے بعد بعمر بیس سال برائے تکمیل کمالات علمی و عملی نزد برادر بزرگ خود مفتی حاجی صادق علی خاں المخاطب بحاجی فضل علی خاں ثانی رخصت بہ مدراس کشیدند و دراں جا از خدمات اقضی القضاۃ افضل العلماء مولوی محمد ارتضیٰ علی خاں بہادر گوپاموی و مولوی تراب علی خاں خیرآبادی و مولوی حسن علی ماہی مدرسین مدرسۂ عالیہ مدراس از محصلین علوم معقول و منقول گردیدند ۔ و حکام انگریزی آں جا بفضل و کمال شاں گرویدہ اولاً بعہدۂ افتاء ملک ملیبار و ثانیاً بمنصب قضاۃ و صدر الصدوری مچھلی بندر و راج مندری برگزیدند ۔ بستم ماہ مبارک صیام سنہ ثلث و ثمانین و الف بجوار رحمت ایزدی پیوستند۔

مولوی یوسف علی مذکور ۲۴ر شعبان ۱۲۴۸ھ میں وطن میں پیدا ہوئے ۔ صغیر سن تھے کہ راج مندری ملک مدراس اپنے والد کے پاس گئے ۔ اُن سے مختصر رسائل عربیہ پڑھے ۔ بلوغ پر لکھنؤ آئے بقیہ کتب درسیہ مولانا قدرت علی لکھنوی داماد ملا بحر العلوم سے پڑھیں ۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں بھوپال گئے ۔ اور صحاح ستہ مولانا عبدالقیوم نواسہ شاہ محمد اسحاق دہلوی اور شیخ حسین بن محسن انصاری

---

۵ ؎ "نفائس الارتفیہ" ترجمۃ المؤلف صفحہ ۶ "تحفۃ الفضلائے ہند" صفحہ ۔

تیمی سے پڑھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں عرصہ تک عہدۂ نظامت پر فائز رہے۔ آخر عمر میں صدر الصدور ریاست ہو گئے تھے۔ بھوپال میں وفات پائی۔

جواہر فریدہ شرح قصیدۂ بردہ۔ شرح نظم الفرائض دختر۔ المیزان در منطق رسالۂ عروض قافیہ تصنیف سے ہے۔ بیعت طریقت در خانوادۂ چشتیہ بر دست سید محرم علی نمود۔[۵۱]

مولوی قدرت اللہ خاں صدیقی قدرت ابن مولوی محمد کامل گوپاموی۔ آپ کے بزرگ عرب سے آئے اور قنوج میں مقیم ہوئے۔

"از اجداد او دراواخر سلطنت غوریہ در گوپامئو طرح سکونت انداختہ"

جناب قدرت ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔

"کتب درسیہ فارسی را کسب نمودہ سلیقۂ مناسب بہم رسانید و مشق سخن در خدمت خوشدل کرد مرید شاہ نصیر الدین سعدی بلگرامی است۔ در مدراس بمنصبے شائستہ امتیاز داشت"[۵۲]

افضل العلما، قاضی ارتضا علی خاں کی مرضی سے نواب عظیم جاہ بہادر نے متولی مقبرہ نواب رحمت مآب مقرر کیا۔ مشاہرۂ معقول کے علاوہ خطاب خان پایا۔

تذکرۂ شعرا، نتائج الافکار نامی یادگار رہے ہے۔ بعمر پختہ سالگی ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔

قاضی غلام غوث صوفی گوپاموی

"فاضل افضل و فقیہ اکمل از احفاد قاضی مبارک شارح سلم بود"[۵۳]

افضل العلما، قاضی ارتضی علی خاں سے تحصیل علوم کی۔ قاضی ممدوح کی روانگی مدراس کے بعد اساتذۂ لکھنؤ سے تکمیل علم کر کے بطلب معاش مدراس گئے اور قاضی صاحب مفتی ضلع کنتور علاقۂ مدراس مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی درس و تدریس تالیف و تصنیف کا بھی شغل رہا۔ بہت ہی قلیل عرصہ تک اس منصب سے مستفید ہوئے تھے کہ سخت بیمار ہو گئے۔ اثنائے سفر حیدرآباد دکن میں جہاں بغرض علاج جا رہے تھے ۱۲۳۲ھ میں وفات پائی۔ متولی قدرت اللہ خاں قدرت گوپاموی نے پُر درد مرثیہ آپ کی وفات پر لکھا ہے۔

"دو جلد فتاویٰ از تصانیف او مشہور اند"

مولوی غلام حیدر ۱۲۲۱ھ میں بمقام گوپامئو پیدا ہوئے۔ درسیات فارسی سے فارغ ہو کر

---

۵۱ شمع انجمن از نواب صدیق حسن خاں قنوجی ...... ۵۲ شمع انجمن ...... ۵۳ دو جلد فتاویٰ از تصانیف صفحہ ۱۵۵۔

تا قطب ادھی اور اپنے چچا مولوی قدرمعین صفوی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی۔ عمر کا بیشتر حصہ
یزی ملازمت میں صرف ہوا۔ حتّٰی کہ صدر منصری بندوبست سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار کی
پائی۔ فرائض ملازمت کے ساتھ ساتھ سلسلۂ تالیف و تصنیف بھی جاری رہا۔
شجرۂ معرفت گلدستۂ شجاعت (اردو ترجمہ سکندرنامہ) ترجمہ قصائد عربی۔ کنزالاسرار
مثنوی بوعلی شاہ قلندر۔ نتائج حیدریہ اردو۔ شرح قصیدۂ بُردہ۔ اخبار مرأۃ العارفین۔
ۃ الاذکار۔ رسالۂ حکمت در فلکیات و عنصریات اردو آپ کی علمی یادگار ہیں۔ ۶۹ سال کی
یں بتاریخ ۱۹ر مارچ ۱۸۸۸ء مطابق یکم جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ گوپامؤ میں وفات پائی۔ اور
م باڑی میں مدفون ہوئے۔
قاضی محمد اسمٰعیل شہابی بن مفتی محمد ولی بن محمد امان بن علامہ ابوسعید بن علیم اللہ بن مفتی عبداللہ
شیخ عیسٰے صوفی محدث گوپاموی۔ اہل خاندان سے اکتساب علوم کرکے کسب معاش کی طرف
توجہ ہوئے۔ ارباب حکومت مدراس نے آپ کو ضلع چنور میں قاضی دائر و سائر کے عہدہ پر فائز
لیا۔ بعد حصول پنشن خانہ نشیں ہوگئے ۱۲۹۵ھ میں وطن میں وفات پائی۔ الفقہ۔ نکات تفسیر
دگار رہے ہیں۔
ملا محمد مقیم شہابی نبیرۂ مفتی عبیداللہ گوپاموی اہل خاندان کے شاگرد رشید تھے۔ علم صرف
سے زیادہ مناسبت تھی۔ میزان الصرف کی طرح میزان جدولیہ تالیف سے ہے۔
مولانا قدرت احمد گوپاموی۔ مولانا عبدالحق محدث گوپاموی کے شاگرد و شاہ نصیرالدین
سعدی بلگرامی کے مرید و خلیفہ تھے۔ کسمنڈی ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرس عربی رہے۔ بعد مطبع
حسینی لکھنؤ میں منسلک ہوگئے۔ نوے سال کی عمر میں غرۂ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی بیرون
مقبرہ نفضل احمد خاں میں دفن ہوئے۔ خلاصۃ الانساب۔ نہج الحداقت۔ فقہ احمدی۔ مختصر المیزان
بدیع المیزان۔ حاشیہ میزان۔ منطق۔ حاشیہ تہذیب۔ جدول اشکال۔ اربعہ منطق۔ دیوان
فارسی یادگار رہے ہے۔
مولوی ابوالعلٰے خیرالدین عرف مظہر علی خاں ابن قاضی مجتبٰی علی خاں بہادر بن مولوی مصطفٰے علیخاں
فاروقی گوپاموی نے اپنے برادر کلاں افضل العلماء قاضی ارتضٰی علی خاں سے علوم عربیہ کی تحصیل
کی۔ مدرسۂ والاجاہی گوپامؤ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد مدراس چلے گئے۔ اورنگ آباد
دکن میں منجانب سرکار نظام مفتی مقرر ہوئے۔ بصارت کی کمی پر سرکار نظام نے منصب مقرر کردیا۔

وطن لائے اور اپنے خلف ارشد حاجی محمد رضا کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔
۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔ خیر الاسباب۔ فی فہم احادیث۔ ریاض الازہار۔
خیر الارکان، تحفۃ المراقبہ یادگار ہے ہیں۔

مولانا شاہ عبدالحق محدث گوپاموی آپ قدوۂ علمائے باعمل اور مدرس بافیض بے بدل تھے۔ تحصیل علم علمائے وطن اور مولانا بحر العلوم سے کی۔ مولانا شاہ صلاح الدین کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ علمی قابلیت اور زہد و تقویٰ کے واقعات شہرۂ آفاق تھے۔ ان کا تقرر فرخ آباد میں نواب شوکت جنگ و حشمت جنگ بہادر کی تعلیم و تربیت کے لئے عمل میں آیا۔ ایک عرصہ تک مسند درس و تدریس پر فائز رہے[1]

مولانا شاہ محمد معین الدین۔ مولوی تبارک علی الدین۔ مولوی خادم حسین خاں ابن مولوی فرید الدین چکلہ دار گوپاموی۔ مولوی امیر الاسلام خاں فاروقی۔ مولوی قدرت احمد۔ مولوی مقبول احمد آپ کے تلامذہ سے تھے۔ انتقال تہجد کے وقت عین حالتِ سجدہ میں بتاریخ ۱۴ شعبان ۱۲۵۰ھ میں ہوا۔ درگاہ مخدوم اعز الدین سرخ علیہ الرحمتہ میں دفن کئے گئے۔

مولوی حافظ مقبول احمد فاروقی ابن مولوی قدرت احمد گوپاموی عالم باعمل تھے۔ علوم درسیہ اپنے والد بزرگوار سے تحصیل کئے۔

انشاء پردازی میں ید طولیٰ تھا۔ بہارِ عجم کے جواب میں گلزارِ عجم لکھی۔ رقعات بیدل اور سہ نثر ظہوری پر حواشی لکھے۔ تسہیل المیزان۔ شرح ایساغوجی اور فقہ میں تنبیہ الانسان فیما یحل و یحرم من الحیوان۔ کامل العروض۔ فرہنگ شاداب۔ حاشیہ توقیعات کسریٰ۔ حاشیہ کبریت احمر یادگار ہے ہیں۔ غرۂ شوال ۱۲۶۵ھ میں بمقام انبالہ وفات پائی۔

مولانا غلام قادر عرف مولوی میاں جان گوپاموی نواسہ مولانا فضل امام خیر آبادی مولانا فضل حق کے تلمیذ رشید تھے۔ غدر سے پہلے گڑھ گاؤں میں ناظر سر رشتہ دار عدالت دیوانی رہے۔ پھر تحصیلدار ہو گئے۔ بعد غدر وطن لوٹ آئے۔ آخر عمر میں مدراس چلے گئے۔ وہیں ۲ جمادی الاول ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ اور ہاتھی کنڈ مدراس روضۂ بیگم صاحبہ میں دفن ہوئے۔

محب اللہ بہاری کی سلم العلوم پر حاشیہ مبسوط لکھا۔ اور بحر الانساب کمی کا اردو ترجمہ کیا۔ جو آپ کی یادگار ہے ہیں۔

---

[1] تاریخ گوپاموی۔

مفتی انعام اللہ خاں بہادر

مولانا مفتی انعام اللہ ابن مفتی محمد اسحاق شہابی ابن مفتی محمد ولی نبیرۂ ملک العلما ملا وجیہ الدین گوپاموی نے اپنے والد سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ بعد فراغت علمی چکلہ داری کے لئے لکھنؤ گئے وہاں سفارش کی ضرورت پیش آئی۔ کلکتہ پہونچے۔ سر ایڈورڈ کول برک سے تعلقات ہو گئے۔ وہ رزیڈنٹ دہلی کے مقرر ہوئے۔ مفتی صاحب کو اپنے محکمہ کا سررشتہ دار کرا دیا۔ اکبر شاہ ثانی سے خطاب "خانی" مرحمت کرایا۔ جب کول برک ولایت جانے لگے محکمہ شریعت دہلی کے مفتی مقرر ہوئے۔ یہ محکمہ توڑا گیا اور صدر نظامت قائم ہوا تو وکیل سرکار مقرر کئے گئے۔[51] خان بہادر خطاب ملا۔ اس سلسلہ سے آگرہ آکر اقامت اختیار کی۔ دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراس کی ہم نوائی سے حکومت کا نزلہ ان پر بھی گرا[52] خط و کتابت پکڑی گئی[53] ان کے اکثر ساتھی مولانا غلام امام شہید مولانا محمد قاسم داناپوری و دیگر علما جو صدر نظامت کے عہدہ دار تھے ان پر مقدمے چلا دئے گئے مگر مسٹر ولسن جج نے انصاف کو کام میں لاتے ہوئے سب کو بری کیا دو صاحبوں مولانا شہید اور مولانا قاسم پر فیصلہ بحال رکھا۔ آگے جا کر وہ بھی بری ہو گئے[54] علمائے ہند کے خلاف پہلا مقدمہ تھا۔

مفتی صاحب کو نواب وزیر الدولہ بہادر نے ٹونک بلا کر مہتمم بند و بست ریاست کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف پہلی مجلس علما آپ کے ہی کاشانہ پر قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کا گھر علمی ادا بنا ہوا تھا۔ تصنیف و تالیف میں اسرار قاسمی کا ترجمہ کیا۔ خزینۃ الاصفیا، شرح رسالۂ اسطرلاب۔ فکاہا ربع حصہ مشکوۃ المصابیح کا اردو ترجمہ کیا جو کتب خانہ شعیب محمدیہ کالج میں موجود ہے۔ ماہ شوال[55] میں انتقال ہوا[56] درگاہ شاہ ابوالعلا احراری میں دفن ہوئے۔

خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث بے خبر آپ کے داماد اور مولوی اکرام اللہ شہا تصویر الشعرا، خلف ارشد تھے۔

انتظام اللہ شہابی

---

۵۱ تاریخ مفتیان گوپامئو از مفتی محمد حسن گوپاموی۔
۵۲ " داستان از پروفیسر حامد حسن قادری۔
۵۳ اسعد الاخبار آگرہ [illegible] نمبر ۲۵۔
۵۴ خم خانۂ جاوید حصہ چہارم لالہ سری رام دہلوی (ذکر ساحر) انعام اللہ گوپاموی۔
۵۵ تذکرہ آفتاب عالمتاب از ملک الشعرا محمد صادق خاں اختر۔
۵۶ آثار علما و فضلائے ہند و انڈیا کمپنی و باغی علما و اولیائے ہند از انتظام اللہ شہابی و تاریخ گوپامئو مرتبہ حکیم بہار الدین صدیقی ہردوئی۔

تقلیدِ مغرب

(مترجمہ صاحبزادہ ممتاز علی خانصاحب بی۔ اے (علیگ)

{محمد آسد (جو پہلے ایک جرمن عیسائی تھے اور ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے) نے ایک کتاب "اسلام آن دی کراس روڈ" لکھی ہے۔ کتاب مذکور بہت جامع ہے اور کدوکاوش سے لکھی گئی ہے۔ ہر انگریزی داں مسلمان (اور غیر مسلم کو بھی) کو اس کا مطالعہ کرنا اور اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ ذیل میں اس کے ایک باب "نقالی" کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔}

مغربی طرز زندگی کی نقالی ـــــ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ـــــ بلاشبہ اسلامی تہذیب کے بقاؤ قیام کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ اس تمدنی بیماری (اس کے علاوہ اسے کسی اور نام سے موسوم کرنا ممکن نہیں) کی ابتدا اب سے بہت پیشتر ہوئی تھی۔ فی الحقیقت اس کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جبکہ مسلمانوں کی ہمتیں صدیوں کی جدوجہد کے بعد پست پڑ گئی تھیں اور وہ مجبوری و ناکامی کا شکار ہو گئے تھے۔ ان بے ہمت مسلمانوں نے جب مغرب کی مادی ترقی کو دیکھا اور اس کا موازنہ اپنی زبوں حالی سے کیا تو اسلام کی رہی سہی وقعت بھی ان کے دلوں سے جاتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ وہ اس وقت تک زمانہ کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ مغرب کے عمرانی اور اقتصادی اصول اختیار نہ کرلیں۔ لیکن اس عام خیالی کی اصل وجہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت تھی ـــــ جس کی زیادہ تر ذمہ داری اِس دَور کے علما کی تنگ نظری پر عائد ہوتی ہے۔ اُس وقت مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ فلہذا بہت سے مسلمان اس نتیجہ پر پہونچے کہ اسلام کا عمرانی اور اقتصادی نظام ترقی کا ساتھ دینے سے قاصر ہے اس لئے اس کی مغربی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر ہونی چاہئے۔ ان "روشن دماغ" افراد نے یہ تحقیقات کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے کہاں تک مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار ہے؟ اور نہ انھوں نے اسلام، یعنی قرآن وسنت، کے اصل مسلک کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کی کوشش کی۔

انھوں نے صرف اتنا ظاہر کرنے پر اکتفا کیا کہ اُن کے ہم عصر مولویوں کی تعلیمات کا اکثر حصہ ترقی اور مادی ارتقا کی راہ میں ایک روڑا ہے ۔ اپنی توجہ کو اسلام کے اصل سرچشمہ کی طرف مبذول کرنے کے بجائے اُنھوں نے خاموشی کے ساتھ شریعت کو موجودہ دور کے منجمد فقہ سے تطبیق دیدی ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت و فقہ کا یہ ناقص امتزاج ان کی تشنگی کو رفع کرنے سے عاجز رہا اور اُن کی شریعت سے ساری عملی دلچسپی ختم ہوگئی اور اُنھوں نے اسے تاریخ اور دوسرے کتابی علوم کی حیثیت دیدی ۔ ایسی صورت میں زوال امت کی دلدل سے نکلنے کا ذریعہ سوائے مغربی تہذیب کی تقلید کے اُنھیں اور کوئی نظر نہ آیا ۔

موجودہ زمانہ کی زیادہ دقیق تصنیفات ــــ ان میں سے ایک سید حلیم پاشا کی لاجواب کتاب " اسلاملشمق " ہے ــــ جنھوں نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ یہ خیال کہ شریعت اسلامی موجودہ ترقیوں کی راہ میں حائل ہے قطعاً بے بنیاد ہے ۔ مغرب کی کورانہ عظمت کے سیلاب کو روکنے کے لئے بہت تاخیر سے منصۂ شہود پر آئیں ۔ اُن تصانیف کے جان پرور اثر کو دوسرے درجہ کے معذرتی ادب' کی بہتات نے کم کر دیا ۔ اُس ادب کے مصنفین نے اگرچہ کھلم کھلا طور پر اسلام کی عملی تعلیمات سے انکار نہیں کیا لیکن بالواسطہ اُنھوں نے اِس چیز کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ شریعت کو کسی قسم کی زک پہنچائے بغیر، مغرب کے معاشرتی اور اقتصادی نظریات کے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے ۔ اِس طرح مغربی تہذیب کی تقلید مسلمانوں کے لئے بظاہر جائز ثابت ہوگئی ۔ اور اسلام کے انتہائی بنیادی اصولوں کو بتدریج ترک کرنے کے لئے میدان ہموار ہوگیا ۔ جو آج ترقی یافتہ مسلم حکومتوں میں سے اکثر کے ارتقا کی امتیازی خصوصیت ہے ۔

یہ خیال کہ طرزِ رہائش اور لباس یا رسم و رواج سے کوئی روحانی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا بالکل غلط ہے (یہ توجیہ مسلمانوں کا اہلِ دماغ طبقہ . . . . اکثر پیش کرتا ہے)۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کا دامن تنگ نہیں اور وہ جیسا کہ پہلے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے انسان کو اُس وقت تک جب تک کہ وہ اس کے بنیادی احکامات کی خلاف ورزی نہ کرے وسیع اختیارات دیتا ہے ۔ لیکن علاوہ اس بات کے کہ بہت سی چیزیں جو مغربی تہذیب کا ایک ضروری جزو ہیں ۔ مثلاً عورتوں ۔ مردوں کا بے حجابانہ اختلاط یا سرمایہ پر سود بلاشبہ تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہیں ، مغربی تہذیب میں جیسا کہ میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مذہبیت کے لئے یقیناً کوئی گنجائش نہیں ۔ اور صرف بے انتہا سطحی لوگ یہ نظریہ قائم کر سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کا خارجی

معاملات میں اتباع اس کی رُوح سے متاثر ہوئے بغیر ممکن ہے۔ ایک تہذیب ایک خالی خول نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ قوت ہوتی ہے۔ جوں ہی ہم اس کے ظاہر کو اختیار کرتے ہیں اس کے مخفی اثرات ہم کو متاثر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بتدریج اور غیر محسوس طور پر ہماری ساری ذہنیت کو مسخور کر لیتے ہیں اور ہم کلیتاً اس کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

اس کے متعلق آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو ۱۳۵۰ سال قبل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا (اور بالکل بجا فرمایا تھا) کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" "جو کسی قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اس میں سے ہو جاتا ہے۔" (مسند ابن حنبل، سنن ابی داؤد) یہ مشہور و معروف حدیث ایک اخلاقی اشارہ ہی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ایک بین دلیل ہے کہ مسلمان جس غیر مسلم تہذیب کا فروعی معاملات میں اتباع کریں گے اسی میں جذب ہو جائیں گے اور اپنی انفرادی شان کو کھو دیں گے۔ اس کلیہ سے کوئی غیر مسلم تہذیب مستثنیٰ نہیں۔

جہاں تک معاشرتی زندگی کا (social life) تعلق ہے اس کے "اہم" اور "غیر اہم" پہلوؤں میں بنیادی فرق محسوس کرنا بہت دشوار ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی چیز غیر اہم نہیں۔ اس سے زیادہ اور کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ یہ خیال کیا جائے کہ لباس مثال کے طور پر، خالصتاً فروعی چیز ہے۔ اور اس لئے انسان کی ذہنیت اور روحانیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لباس عام طور پر ایک قوم کے مذاق کے (ایک خاص سمت میں) مدت العمر کے نشو و نما کا ماحصل ہوتا ہے۔ اس کی وضع اس قوم کے جمالیاتی نظریات کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اُس (لباس) کی قوم (یعنی وہ قوم جو اسے استعمال کرتی ہے) کے کردار اور میلانات میں تغیرات کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور برابر ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً یورپ کا موجودہ فیشن اس کے ذہنی اور اخلاقی کردار کے عین مطابق ہے۔ یوربین لباس استعمال کرتے ہوئے مسلمان غیر ارادی طور پر اپنے مذاق کو یورپ کے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور اپنے ذہن اور اخلاق کو اس طرح موڑتا ہے کہ آخر الامر وہ نئے لباس کے موزوں ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کے اپنی قوم کے تمدن سے دلچسپی رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اُس (اپنی قوم) کے روایتی مذاق کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور اس کے جمالیاتی اقدار اور پسند اور ناپسند کو پس پشت ڈال کر اُس ذہنی اور اخلاقی غلامی کی وردی کو قبول کر لیتا ہے جو ایک اجنبی تہذیب کی بارگاہ سے اسے عطا ہوتی ہے۔

اگر ایک مسلمان یورپ کے لباس، اطوار اور طرزِ زندگی کی تقلید کرتا ہے تو اس کا صاف
ب یہ ہے کہ وہ یورپ کی تہذیب کو (اپنی تہذیب پر) ترجیح دیتا ہے وہ اپنی زبان سے
ر کچھ ہی کیوں نہ کہے۔ کسی اجنبی تہذیب کا جمالیاتی اور ذہنی مقاصد میں اتباع اس کی
ح سے دلچسپی کے بغیر عملاً ناممکن ہے۔ اور کسی ایسی تہذیب کو جو زندگی کے متعلق مذہبی نظریہ
نے کے مخالف ہو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سچا مسلمان رہنا اسی قدر محال ہے۔

ایک اجنبی تہذیب کے اتباع کی طرف میلانِ طبع احساسِ کمتری کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس
ر کا اطلاق اُن مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے جو شاہدِ مغرب (تہذیبِ یورپ) کے دامِ محبت میں گرفتا
ں اور اس کی ہر ہر ادا پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ
ں کی قوت اور ٹیکنیکل صلاحیتوں اور درخشاں سطح کا مقابلہ دنیائے اسلام کی دگرگوں حالت سے
تے ہیں اور یہ یقین کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں سوائے مغربی اصولوں کو اختیار کرنے کے
ر کوئی چارہ کار نہیں۔ اپنی کمزوریوں کا اسلام کو ذمہ دار قرار دینا ایک عام بات ہوگئی ہے۔
دہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نام نہاد پڑھے لکھے افراد معذرتی رویہ (apologetic
attitude) اختیار کر لیتے ہیں اور خود کو اور دوسروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے
ں کہ اسلام کو مغربی تہذیب کے ساتھ تطبیق دی جا سکتی ہے۔

احیائے اسلام کے لئے کسی قسم کی جد و جہد کرنے سے قبل مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے
ہب کے متعلق معذرت کرنے کے جذبہ سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ ایک مسلمان کو خودداری کی زندگی
ر کرنی چاہئے[1]۔ اسے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ وہ تمام اقوام سے مختلف اور
ماز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس اختلاف پر فخر کرنا سیکھنا چاہئے۔ اسے اس امتیاز کو بحیثیت
ب متبرک خصوصیت کے محفوظ رکھنے کی جد و جہد کرنا اور اس کا دنیا کے سامنے بآوازِ بلند اعلان
نا چاہئے ۔۔۔ بجائے اس کے لئے معذرت کرنے اور دوسری تہذیبوں میں مدغم ہونے کے لیکن
س کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو ماسوا سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ ایک شخص ہمیشہ اجنبی تہذیب کے
ے اور مثبت اثرات کو اپنی تہذیب کو خیرباد کہے بغیر خوش آمدید کہہ سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال
رپ کا نشاۃ ثانیہ ہے۔ تعلیم اور طریقِ تعلیم کے معاملہ میں یورپ والوں نے عربوں کے اثرات کو

---

[1] یہاں سلطان ٹیپو شہید کے مقولہ کا اعادہ بیجا نہ ہوگا۔ اُن کا قول تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو برس کی زندگی سے بہتر ہے۔"

خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ لیکن انھوں نے کبھی عربی تمدن کو نہیں اپنایا اور نہ کبھی اپنی ذہنی اور روحانی آزادی کو قربان کیا۔ انھوں نے صرف اپنی ناکارہ سرزمین کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے عربی اثرات کو استعمال کیا۔ بجنسہٖ یہی وطیرہ عربوں نے اپنے زمانہ میں یونانی علوم کے معاملہ میں اختیار کیا تھا۔ دونوں صورتوں میں مفید نتائج مترتب ہوئے اور ہر دو تہذیبوں کو مضبوط نشوونما نصیب ہوا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خودداری اور فخر کی دولت سے مالا مال رہیں۔ کوئی تہذیب اس فخر کو ضائع کرنے اور اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے بعد بار آور ہونا تو بڑی بات ہے قائم بھی نہیں رہ سکتی

مگر افسوس کہ مسلمان تقلید یورپ کی روز افزوں ذہنیت کے زیر اثر بتدریج اپنے ماضی کے ساتھ تعلقات کو منقطع کر رہے ہیں اور اس طرح اپنی تمدنی متاع ہی کو نہیں بلکہ روحانی دولت کو بھی ضائع کر رہے ہیں۔ ان کی مثال اُس درخت کی سی ہے جو اُس وقت تک تناور رہا جب تک کہ اس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے قائم رہیں۔ لیکن مغربی تہذیب کے تیز رو سیلاب نے اُن کو کمزور کر دیا اور وہ درخت غذا دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے دن بدن کھوکھلا چلا جا رہا ہے اور آخر میں خود جزئیت و نابود ہونے والی ہے۔

پس مغربی تہذیب اپنانے اسلام کا صحیح ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں اسلام کو اس ذہنی اور معاشرتی پستی سے جس میں وہ ایک رواجی اور رسمی مذہب بن جانے کی وجہ سے جا پڑا ہے، نکالنے کی صلاحیت نہیں۔ تو پھر مسلمانوں کو رہنمائی اور صحیح قیادت کے لئے جس کی اِس دَور میں شدید ضرورت ہے، کس سے رجوع کرنا چاہیئے؟ اور کون حقیقی معنوں میں ان کی روحانی اور ذہنی رہنمائی کے بار گراں کو اُٹھا سکتا ہے؟

اِس کا جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوال بلکہ وہ پہلے ہی سے سوال میں موجود ہے۔ اسلام، جیسا کہ پہلے کئی بار بتایا جا چکا ہے، صرف "ایمانِ قلب" ہی کا نام نہیں بلکہ وہ ایک بہت واضح انفرادی اور اجتماعی نظامِ زندگی کا بھی حامل ہے۔ اگر اسے کسی غیر تمدن کے تابع فرمان بنا دیا جائے۔ کسی ایسے تمدن کے جو مختلف اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو، تو وہ ایک قالبِ بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جوں ہی اسے اس کے اصل مرتبہ پر پہنچا دیا جائے اور ایک ایسے عامل (factor) کی حیثیت دے دی جائے۔ جسے ہماری نجی اور معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ پر تصرفِ کلی حاصل ہو، تو اس کی تازگی و شگفتگی عود کر آتی ہے اور وہ زندگی

در حرکت سے معمور ہو جاتا ہے۔

نئے خیالات اور متصادم تمدنی نظریات کے اُس دور میں جس سے کہ ہم گزر رہے ہیں اسلام ایک بے جان ڈھانچہ کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا۔ وہ صدیوں کی مسحورانہ نیند سے بیدار ہو گیا ہے اب اسے یا اُٹھنا چاہئے یا فنا ہو جانا چاہئے۔ آج مسلمانوں کی حیثیت اُس مسافر کی سی ہے جو چوراہے پر کھڑا ہو۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہ سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ نہ تنہ کی موت ہوگا۔ وہ وہ سڑک منتخب کر سکتا ہے جو مغربی تہذیب کی طرف جاتی ہے۔

ایسی صورت میں اسے اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑے گا۔ یا وہ اس سڑک کو قبول کر سکتا ہے جو اسلام کی حقیقت کی طرف جاتی ہے۔ یہ اور صرف یہ ایسا راستہ ہے جو ان لوگوں کے لئے جاذبِ توجہ بن سکتا ہے جو اپنے ماضی سے شغف رکھتے ہیں اور اس کے ایک زندہ مستقبل میں تبدیل ہونے کے امکان کا اُنھیں یقین ہے +

ممتاز علی خان

تہذیبِ حاضر

(از علامہ اقبال مرحوم)

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اُٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

کیا ذرہ کو جگنو، دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی

تغیّر آگیا ایسا تدبّر میں، تخیّل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

کیا گم تازہ پروازوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دلکشا، دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا!
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اُٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ! ایں گرمی زِ شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

روہیلکھنڈ عہدِ اسلامی میں

سنہ ۱۷۰۷ء میں حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد اُن کے کمزور جانشینوں کے عہد میں سنہ ۱۷۷۴ء تک ہمارے وطن روہیلکھنڈ پر روہیلوں کی اور سنہ ۱۸۰۱ء تک شاہان اودھ کی حکومت رہی۔ سنہ ۱۸۰۲ء سے تا ایندم ۱۴۶ سال انگریز حکمراں رہے۔ اور اب ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے وطن عزیز برادران ہنود کے زیر نگیں آگیا ۔۔۔۔ اس جدید حکومت میں کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ اُن دردانگیز اطلاعوں سے ہو رہا ہے جو روزانہ ہر چہار جانب سے مسلمانوں کے جان و مال اور ناموس کی وسیع پیمانہ پر بربادی کی مل رہی ہیں۔

بلووں۔ فسادوں اور قتل و غارت گری کی واردات کے علاوہ بعض ذمہ دار افراد حکومت کو بھی منتقمانہ کارروائیوں پر عنقریب از جلد عمل درآمد کرنے کی بڑی بے صبری سی معلوم ہو رہی ہے۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد گھٹا کر آیندہ چودہ فی صدی ہوگی۔ مشترکہ زبان اُردو کے بجائے ہندی مادری زبان قرار دیجائیگی اور عنقریب گائے کُشی بند کی جائیگی۔ غرض ہر طرح مسلمانوں کو دبا کر اور دبوچ کر رکھنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا یوپی کے (۸۵) لاکھ مسلمان بالخصوص روہیلکھنڈ کے بیس (۲۰) لاکھ غیور بہادر مسلمان (ظالمانہ کارروائیوں کی انتہا ہو جانے پر) کیا علاج کریں گے ۔۔ یہ بعد کی چیز ہے۔ پہلے ہم اپنے نئے حکمرانوں کی جانب دوستی اور اتحادِ عمل کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں مشتے نمونہ از خروارے خود اپنے سابقہ طرز حکومت کی ایک جھلک دکھانا چاہتے ہیں ۔۔۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ہم نے اپنے زمانہ اقتدار میں اپنوں اور بیگانوں سے کیسا سلوک کیا اور اُس کے بدلے میں اب ہمارے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔

ذیل کا مضمون ہماری کتاب "حیاتِ حافظ رحمت خاں" کا ایک باب ہے۔ جو سنہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کو آنریبل سر سیتا رام صاحب پریسیڈنٹ یوپی کونسل نے اپنے گرانقدر "مقدمہ" سے مفتخر فرمایا تھا۔

سیّد الطاف علی بریلوی

حکومت روہیلکھنڈ جس کی بناء داؤد خاں نے ڈالی جس کو نواب علی محمد خاں نے ترقی دی اور جس کو

ظ الملک نے مضبوط و مستحکم اور ترقی پذیر بنایا۔ اٹھارویں صدی کی اُن کثیر التعداد ہندوستانی
ستوں میں سے ایک تھی جو دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے کے باعث عالمِ وجود
آئی تھیں۔ لیکن روہیلکھنڈ کے حکمرانوں نے باوجودیکہ حکومت دہلی کو حتی الامکان کسی قسم کا خراج
ہیں دیا۔ تاہم ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ شاہانِ دہلی سے ان کے تعلقات خوشگوار رہیں۔
ب کبھی دہلی پر کوئی مصیبت نازل ہوئی یا بادشاہِ دہلی کو ان کی امداد کی ضرورت ہوئی۔ یہ حکمران
راسینہ سپر ہوکر سرفروشی پر آمادہ ہو گئے۔ اگر صفدر جنگ اور شجاع الدولہ والیانِ اودھ کی
سہ دازیاں اُس زمانہ میں کارفرما نہ ہوتیں اور یہ لوگ روہیلوں کو اپنی طاقت بڑھانے اور اُس
ائم رکھنے کی کچھ بھی فرصت دے دیتے تو ناممکن تھا کہ ان کی موجودگی میں سلطنت دہلی یا آگے چل کر
دریاست اودھ کا باآسانی خاتمہ ہو جاتا۔ خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں مرحوم اپنی غیر مطبوعہ
تاریخ شاہجہاں پور میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان میں اسلامی حکومت کا خاتمہ روہیلکھنڈ میں دراصل حافظ الملک کی شہادت کے دن ہو چکا تھا۔ اودھ کی حکومت رقصِ بسمل تھی جو بہت جلد سرد ہو گئی۔ اگر شجاع الدولہ نے انگریزی توپوں کے استعمال سے روہیلوں کا خاتمہ نہ کیا ہوتا تو لارڈ ڈلہوزی کی باریک بین نظر کو انڈیا کے نقشہ پر ریاست اودھ بھی بدنما داغ نہ معلوم ہوتی اور وہ اُس کو مٹانے میں عجلت سے کام نہ لیتے۔" [1]

روہیلوں کی یہ طاقت و سلطنت جس کو بداندیش اور خود غرض لوگوں نے اس قدر بے دردی کے ساتھ برباد کر دیا۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی ماتحتی میں بڑے بڑے سرداروں پر علاقوں اور جاگیروں میں بٹی ہوئی تھی۔ مثلاً پچاس لاکھ روپیہ کا علاقہ خاص حافظ الملک کی جاگیر میں اور بقیہ عبداللہ خاں رئیس شاہجہاں پور۔ نواب دوندے خاں۔ نواب فیض اللہ خاں۔ فتح خاں خانساماں اور بخشی سردار خاں وغیرہ پر علیٰ قدر مراتب منقسم تھا۔ یہ تمام روہیلہ سردار گو ایک دوسرے کے تابع فرمان نہ معلوم ہوتے تھے لیکن بباطن یک دل اور یک قالب تھے۔ دانش مندی۔ بہادری اور آپس کے اتفاق میں مشہور تھے۔ جس کے باعث جس وقت ہندوستان میں لاہور سے راس کماری تک کہیں امن و امان نہ تھا اور ہر طرف فتنہ و فساد کی گرم بازاری تھی۔ اُس وقت روہیلوں کے ملک میں کہیں پتہ بھی نہ ہلتا تھا۔ روہیلوں کے اتفاق کی یہ صورت تھی کہ ضرورت کے وقت اپنے

---

[1] منقول از تاریخ "پیچ" مؤلفہ مولوی محمد صبیح الدین میاں صاحب شاہجہاں پوری مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔

سردار کی ایک آواز پر ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اگر کسی ایک سردار کی ریاست پر کوئی حملہ کرتا تو تمام دوسرے سردار قومی جوش میں آکر لڑنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے۔

روہیلہ قوم کے قوانین نہایت قابل تعریف تھے۔ ان کی عملداری میں چوری۔ ڈکیتی اور ٹھگی ہرگز نہ ہوتی تھی۔ اگر اتفاقیہ کسی شخص کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو کسی نہ کسی طرح اُس کا کھوج لگایا جاتا۔ دیہات اور شہروں میں مختلف اہلِ مذاہب کی مخلوط پنچائتیں اور برادریاں اُن پیشوں کے اعتبار سے جو اُنھوں نے اختیار کر رکھے تھے قائم تھیں۔ اُن کا ایک سرپنچ یا چودھری ہوا کرتا تھا۔ جس کا فیصلہ جملہ اُمور میں سرکاری حکم سے زیادہ وقعت رکھتا تھا۔ ان پنچایتوں میں ہر قسم کے مال اور فوجداری کے مقدمات طے ہونے کے علاوہ بازار میں فروختنی اشیاء کے نرخ بھی طے ہوتے تھے۔ اور حکومت کے مقرر کردہ عاملوں۔ قاضیوں۔ اور مفتیوں کے پاس پنچائتی برادری کے لوگوں کے مقدمات شاذ و نادر ہی جاتے تھے۔ عوام کی اس اندرونی آزادی و خود مختاری کو حافظ الملک نے عام رواج دینے کی بہت کوشش کی۔ چنانچہ چودھریوں کی انتہائی عزت و توقیر کرتے تھے اور اُنکی ہمت افزائی کی تمام ممکن تدابیر عمل میں لاتے تھے۔

شخصی حکومت میں جمہوری حکومت کی برکات حافظ الملک کی حکومت اُس زمانہ کے عام رواج کے مطابق شخصی تھی لیکن اُس کا انداز اور اُس کے نتائج جمہوریت سے ملتے جُلتے تھے۔ اُمورِ مملکت میں عوام کو دخل اندازی کا زیادہ سے زیادہ حق حاصل تھا جو جمہوری حکومت کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے رُکن سلطنت حتےٰ کہ مسند نشین حکومت کی اولاد تک کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی عامی سے عامی مسلم یا غیر مسلم فرد قوم پر بیجا جبر و تشدد کر سکے۔ راعی و رعایا کے درمیان "تحفظاتِ خاص" کی خلیج حائل نہ تھی۔ اخوت اور مساوات و آزادی کا دَور دورہ تھا۔ اور جس طرح اللہ کی اس سرسبز و شاداب سرزمین پر حکمران جماعت کے لوگ افتخار و سربلندی کے ساتھ چلتے تھے۔ اسی طرح ایک معمولی دہقان اکڑ کر اور سینہ تان کر چلتا تھا۔ سردار قوم کی حریت نوازی کے باعث کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ عوام کی آزادئ خیال اور آزادئ عمل میں رخنہ اندازی کر سکے۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا تو عام اس سے کہ اس کی شخصیت کیسی ہی بڑی سے بڑی کیوں نہ ہوتی ہرگز ہرگز خطا پوشی نہ کی جاتی تھی۔ اس طریقہ حکمرانی کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام میں رُوحِ آزادی و حریت فنا نہ ہونے پاتی تھی۔ جو حافظ الملک کو صد درجہ عزیز تھی۔ چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ ایک روز حافظ صاحب کے صاحبزادے حافظ محمد یار خاں نواح پیلی بھیت میں ہرن کے

شکار کے واسطے گئے۔ جب جنگل کے قریب پہنچے تو اپنے ہمراہیوں اور ہاتھی گھوڑوں کو ایک گاؤں میں چھوڑ کر تنہا محمد خاں علیؒ کو جو فنِ شکار میں بڑی مہارت رکھتا تھا ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ اثنائے راہ میں چند ہرن دکھائی دیئے۔ فوراً ان کا تعاقب کیا اور نزدیک پہنچ کر خود تو ایک جگہ تاک لگا کر بیٹھ گئے۔ اور محمد خاں کو ہرنوں کے گھیر کر لانے کے واسطے روانہ کر دیا۔ اتفاقاً ایک دہقان بھی اُس وقت اُدھر آنکلا اور ہرنوں کی طرف جانے لگا۔ محمد خاں نے آواز دے کر اُس کو ہرنوں کی طرف جانے سے منع کیا۔ لیکن وہ آواز سننے کے باوجود اپنا قدم اُٹھائے آگے ہی چلا گیا۔ محمد خاں نے بار بار آوازیں دیں لیکن اُس نے کچھ پروانہ کی۔ یہاں تک کہ اُس کے پیروں کی آہٹ سے ہرن دہشت کھا کر دوسری طرف بھاگ گئے اور نظروں سے غائب ہو گئے۔ اس پر محمد خاں غضبناک ہو کر اُس کی طرف جھپٹا۔ وہ دہقان بھی لوٹ پڑا۔ محمد خاں نے اُس کو گالی دیکر کہا کہ :-

"تجھ کو کیا ہو گیا تھا جو تو نے میری بات نہیں سُنی اور میرا شکار نکال دیا۔"

گالی کے جواب میں دہقان نے بھی محمد خاں کی شان و شوکتِ ظاہری کا لحاظ کئے بغیر گالی دی۔ اور کہا :-

"میں تمہارے واسطے کیوں اپنا راستہ چھوڑ دیتا۔؟"

اس جواب پر محمد خاں نے اُس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ دہقان طمانچہ کھا کر ایک طرف کو چند قدم بھاگا اور ساتھ اور دہقانوں کو جو اپنے چھکڑوں پر جنگل سے لکڑیاں لاد کر لا رہے تھے بُلا لایا اور آتے ہی اپنے ساتھیوں کے بھروسہ پر ایک لاٹھی محمد خاں کے سر پر ماری۔ محمد خاں قوی الجثہ شخص تھا دہقان کو لپٹ گیا اور زمین پر پٹک کر اُس کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔ اسی دار و گیر میں حافظ محمد یار خاں بھی وہاں آپہنچے اور انھوں نے غصہ میں بھر کر اپنی چُھری نکال کر محمد خاں کے ہاتھ میں دیدی۔ عنقریب تھا کہ محمد خاں دہقان کا چھری سے کام تمام کر دے کہ دوسرے دہقانوں نے اپنے ساتھی کو بچا لیا اور سب کے سب محمد خاں اور حافظ محمد یار خاں کو لات گھونسوں سے مارنے لگے۔ محمد خاں نے حتی الوسع اپنی اور حافظ محمد یار خاں کی بہت مدافعت کی لیکن ایک پیش نہ گئی مجبوراً محمد خاں نے کہا کہ :-

"کمبخت بیوقوفو! یہ حافظ الملک کے صاحبزادے ہیں ان کی خدمت میں کچھ بے ادبی نہ کرو۔"

لیکن ان مغلوب الغضب لوگوں نے محمد خاں کی بات کا یقین نہ کیا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ بھلا حافظ الملک کا بیٹا کیوں اکیلا حیران و پریشان جنگلوں میں مارا مارا پھرے گا مار پیٹ سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ اتنے میں حافظ محمد یار خاں کے پیادے اور سوار جو دیر ہو جانے کے باعث اُنکی تلاش

میں نکلے تھے اس طرف کو آتے دکھائی دیئے۔ دہقانوں نے اس لشکر کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ محمد خاں سچ کہتا تھا۔ واقعی یہ حافظ الملک کا لڑکا ہے اور اب اُس کی ہمراہی فوج آرہی ہے۔ بدحواس اور خوف زدہ ہو کر جنگل میں بھاگ گئے اور منتشر ہو کر درختوں کی آڑ میں پوشیدہ ہو گئے۔ جب سوار اور پیادے وہاں پہنچے تو صاحبزادے صاحب کے حکم سے حملہ آور دہقانوں کی تلاش شروع کی گئی۔ ہر چند ڈھونڈھا مگر ایک شخص ہاتھ نہ لگا۔ آخر کار اُن کی گاڑیاں کھینچ کر پیلی بھیت لے آئے۔ چند روز کے بعد دہقان مذکور از خود شہر میں داخل ہو کر ملک سیّد خاں خٹک عامل پیلی بھیت کے پاس آئے اور کہا کہ:۔

"کوئی شخص ہماری گاڑیاں جنگل سے ہانک کر پیلی بھیت لے آیا ہے۔"

جب ملک سیّد خاں نے اُس شخص کا نام دریافت کیا تو کہا کہ نام ہم حافظ الملک کے حضورِ اقدس میں بتائیں گے۔ ملک موصوف نے اس واقعہ کو حضورِ اقدس میں عرض کیا۔ جس پر اُن لوگوں کو حاضر ہونے کا حکم صادر ہوا۔ جب وہ حضور میں حاضر ہوئے حافظ الملک نے اپنے نزدیک بلا کر بکشادہ پیشانی اُن کو حقیقت حال بیان کرنے کا حکم دیا۔ اُن لوگوں نے عرض کیا کہ:۔

"حضور کے صاحبزادوں میں سے ایک صاحبزادے ہمارے گاڑی بیل جنگل سے لے آئے ہیں۔"

ارشاد ہوا کہ:۔

"اس کا سبب کیا تھا اور ہمارے بیٹوں میں سے کس نے یہ کام کیا ہے۔"

چونکہ یہ لوگ قصور وار تھے اس لئے حافظ الملک کے بار بار اصرار کے باوجود صاف صاف نہ بتلا سکے۔ اس پر حافظ الملک نے فرمایا کہ:۔

"ثابت ہوتا ہے کہ قصور تمہارا ہے۔ لیکن میں تمہارے قصور کو معاف کرتا ہوں۔ اب تم بتلاؤ کہ کون تمہاری گاڑیاں زبردستی لے آیا ہے اور اس کا سبب کیا تھا۔"

جان بخشی اور معافی قصور کا اطمینان ہو گیا تو دہقانوں نے کہا کہ:۔

"خداوندزادے حافظ محمد یار خاں ہماری گاڑیاں اور بیل جنگل سے لے آئے ہیں اور اُن کے گاڑی خانہ میں اب تک موجود ہیں۔"

حکم ہوا کہ حافظ محمد یار خاں کو مع گاڑیوں اور بیلوں کے حاضر کیا جائے۔ جب وہ حضور میں حاضر ہوئے بکمال قہر و غضب اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:۔

"ان بے گناہوں نے کیا گناہ کیا تھا کہ ان کی گاڑیاں اور بیل تم زبردستی یہاں پکڑ لائے ہو۔"

حافظ محمد یار خاں نے عرض کیا کہ اس کا سبب انھیں لوگوں سے دریافت کیا جائے۔ حافظ الملک دوبارہ نہایت شفقت و محبت سے فرمایا کہ:۔

"اس وقت مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہیں۔ واقعہ بے کم و کاست بیان کرو۔ عدالتی معاملات میں ہمارے نزدیک اپنے اور بیگانے سب برابر ہیں۔"

اُن لوگوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے بعد حافظ محمد یار خاں کو حکم کہ تم ہی اس واقعہ کا اظہار کرو۔ بموجب حکم حافظ محمد یار خاں نے اصل واقعہ کو مفصل عرض کیا اپنا ہاتھ اور اپنی پیٹھ جو ابتک زخمی تھی کھول کر دکھلائی۔ ساتھ ہی محمد عثمان خلجی کو بھی حضور میں کرکے اس کا تمام جسم زخموں سے چور چور ہو گیا تھا مشاہدہ کرایا۔ حافظ الملک نے تمام حال سننے بعد ارشاد ہوا کہ:۔

"ان بے چارے بے خبر لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم خود اس تکلیف و صعوبت کے سزاوار ہو.... خبردار آیندہ پھر اس قسم کی حرکت ناپسندیدہ کے مرتکب نہ ہونا..... ان بے خبر لوگوں سے نادانستگی کے عالم میں اس قسم کی حرکت وقوع میں آئی ہے۔ اس وجہ سے ان سے کوئی مواخذہ اور باز پُرس نہیں ہو سکتی۔ جاؤ ان لوگوں کی گاڑیاں اور بیل مع اُن تمام چیزوں کے جو اُن میں ہوں اِن لوگوں کے حوالے کر دو اور ان کو رضامند کرو۔"

ظ محمد یار خاں جو حافظ الملک کے غصہ اور غضب سے سہمے ہوئے تھے اس حکم کو غنیمت سمجھ کر دربار اُٹھ کر چلے گئے۔ اور مطابق حکم علاوہ بیلوں۔ گاڑیوں اور اُن چیزوں کے جو اُن میں تھیں کچھ روپیہ بھی نے پاس سے دے کر اُن لوگوں کو حضور اقدس میں روانہ کر دیا۔ تاکہ یہ لوگ خوش ہو کر حافظ الملک و اُن کی طرف سے مطمئن کر دیں۔[۵]

عدالت و انصاف

حافظ الملک کے عہد فرخ مہد میں رعایا اور برایا دولت مند یا گدائے بے نوا کوئی ظلم و ستم کا نام نہ جانتا تھا۔ زبردست لوگ اُن کے انصاف کے ڈر سے کمزوروں ر زیردستوں پر ظلم کرنیکے بجائے مسکینوں اور ناتوانوں کی امداد کرتے تھے۔ اور باز پُرس کے خوف خصائل ذمیمہ اور افعال شنیعہ سے تائب ہو گئے تھے۔ اُن کے انصاف کی کچہری میں وضیع و شریف رد و بزرگ۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جاتا تھا۔ اور قانون کے اجرا میں جو مطابق ریعت اسلام ہوتا تھا۔ امرا کے بیٹوں۔ عزیزوں اور دیگر عوام الناس میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔

---

۵ گلستان رحمت۔

خطاکاروں۔ گنہگاروں اور مجرموں کی سزادہی میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کیا جاتا تھا اور حکومت کی جانب سے بڑے سے بڑے اشتعال کے موقع پر بھی حق و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ خود حافظ الملک کی ذات پر قاتلہ حملہ کیا جاتا اور مجرم کو صرف اس قدر سزا دینا گوارا کرتے جس قدر کہ قانونِ شریعت اجازت دیتا۔ یہ نہیں کہ اپنی شخصیت کو فوق المعمول تصور کرکے غیر معمولی سزا دیتے۔ نواب عبداللہ خاں ابن نواب علی محمد خاں نے اپنے مکان میں حافظ صاحب کو بُلا کر قتل کرانا چاہا تو اُس کی سزا اُنھیں صرف یہ دی گئی کہ عارضی طور پر کچھ عرصے کے لئے ملک بدر کر دئے گئے۔ اسی طرح ایک اور اہم واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک روز حافظ الملک بریلی میں اپنے محلسرا مبارک محل میں مقیم تھے[۵] رات کے وقت موافق معمول نماز تہجد کے واسطے اُٹھے اور حسب قاعدہ کسی اہلِ حرم یا ملازم کو بیدار کئے بغیر جب پہلے بیت الخلاء تشریف لے گئے تو اُس کے دروازے پر اُنھیں پاؤں کی آواز معلوم ہوئی۔ خیال کیا کہ اہلِ حرم میں سے کوئی اندر ہے۔ کچھ دیر توقف کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسی آہٹ معلوم ہوئی جیسے کوئی بیت الخلاء کے اندر سے باہر نکلتا ہے۔ لیکن وہ آہٹ دروازے تک پہنچنے کے بعد موقوف ہوگئی۔ اُس پر حافظ الملک کو شبہ ہوا کہ شاید کوئی چور ہے۔ بلاپس وپیش اندر داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قوی الجثہ شخص ایک بہت بڑا چھُرا ہاتھ میں لئے ایک گوشہ میں کھڑا ہے۔ اُس شخص کو بعض ناعاقبت اندیش سرداروں نے روپیہ کا لالچ دے کر حافظ الملک کو قتل کرنے کی غرض سے بھیجا تھا اور یہ شخص پہرے والوں اور دربانوں کی آنکھ بچا کر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ حافظ الملک نے اُس کے ارادۂ بد کو محسوس کرنے اور اپنے پاس کوئی ہتھیار نہ ہونے کے باوجود نہ تو قدم پیچھے ہٹایا اور نہ کسی ملازم کو آواز دی بلکہ فوراً ایک ہاتھ سے اُس شخص کے چھُرے والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پر ایسے زور سے طمانچہ مارا کہ وہ چکر کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اِس کے بعد اُس کو کھینچ کر اندرونِ مکان سے باہر لے آئے اور دربانوں کو سپرد کرکے فرمایا کہ اپنے اس دوست کو پکڑو۔ پاسبان اور دربان اس حال کو مشاہدہ کرکے بدحواس ہو گئے اور سب کو یقین ہو گیا کہ اُن سب کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ لیکن حافظ الملک اُس شخص کو ان لوگوں کے سپرد کرکے محلسرا میں تشریف لے گئے۔ اور نماز تہجد اور درود و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے روز

---

[۵] مبارک محل نام کی ایک پُرانی حویلی محلہ بہاری پور شہر کہنہ بریلی میں موجود ہے۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حویلی حافظ صاحب کی محلسرا نہ تھی۔ حافظ صاحب کی محلسرا غالباً شہر کہنہ میں مرزائی باغ کے قریب واقع تھی جس کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔

طرق معمول جب دیوانِ عام میں تشریف لائے تو راؤ پہاڑ سنگھ دیوان اور دوسرے سرداروں نے اُس واجب القتل کے قتل کا حکم صادر کرنے کی التجا کی۔ حافظ الملک کو چونکہ حدِ شرعی سے تجاوز ہرگز منظور نہ تھا اس لئے اُن کے معروضہ کو قبول نہ کیا تب اُن لوگوں نے عرض کیا کہ:۔

"اگر حکم ہو تو اس معاملہ کی حقیقتِ حال کا استفسار کریں تاکہ یہ معلوم ہو کہ کن کن لوگوں کے اغوا سے اس شخص نے یہ جرأت و جسارت کی۔"

لیکن حافظ الملک نے اِس رازِ سربستہ کی تفتیش اور انکشاف کی بھی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ:۔

"اس معاملہ کی تحقیق و تفتیش میں بہت سے خطرات ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ فتنہ پرواز شخص گروہِ اشرار کے اغوا سے ہمارے دولت خواہوں اور خیر اندیشوں میں سے کسی کو متہم کر دے یا سرداروں میں سے کسی بے گناہ کا نام بتا دے۔ اس صورت میں لازم ہوگا کہ اُن لوگوں کے ساتھ واجبی سلوک کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے خیر اندیشوں اور ان کے علاوہ بہت سے بے گناہوں کو نقصان پہنچ جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ شخص جن لوگوں کے نام بتائے ان کو بھی سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ یہ بات آئینِ امارت و ریاست سے بعید ہوگی۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ اس زیاں کار سے کسی قسم کی تحقیق و تفتیش نہ کی جائے۔"

اس ارشاد کے بعد حافظ الملک نے مجرم کو صندل خاں[1] شحنۂ بریلی کے سپرد کر دیا۔ اور تاکید تمام حکم دے دیا کہ اس کو کھانے پینے کی کوئی تکلیف مطلق نہ دی جائے۔ دو تین دن کے بعد صندل خاں مذکور نے دیوان پہاڑ سنگھ وغیرہ ارکانِ دولت کے مشورہ سے اُس شخص کی آنکھیں نکلوا دیں جب حافظ الملک کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اُن کے غیظ و غضب کی کوئی حد نہ تھی اور قریب تھا کہ اس کے قصاص میں صندل خاں نورِ بصارت سے محروم کر دیا جائے لیکن دوسرے اعیانِ دولت کی منت و سماجت اور انتہا درجہ کی الحاح و زاری سے مجبور ہو کر بدقت اس کے جرم سے درگزر کی۔ اُس شخص کو مجلس سے نکال کر جرّاحوں کے سپرد کیا۔ اور کوشش بلیغ کی کہ کسی طرح اُس کی آنکھیں اچھی ہو جائیں۔ چنانچہ چند روز کے بعد زخم اندمال پذیر ہو گئے اور حافظ الملک نے ایک روپیہ یومیہ اُس کے جیب خرچ کے لئے اور اُس کا کھانا اپنے مطبخ خاص سے مقرر فرما دیا کہ مدت العمر فارغ البالی کے ساتھ ایام گزاری کر سکے۔

زراعت و تجارت | حافظ الملک کے دورِ حکومت میں اُن کی تمام مملکت آباد۔ زراعت مکمل اور

---

[1] صندل خاں کا بازار بریلی میں قلعہ کے قریب موجود ہے۔ جو صندل خاں کی بزریہ کے نام سے مشہور ہے اور حافظ الملک کے زمانہ کی یادگار ہے۔

رعایا خوشنود تھی۔ اُفتادہ زمین کی کاشت ہوتی تھی۔ اور مزارعین کو تقاوی کے ذریعہ امداد دے
کاشتکاری کرائی جاتی تھی۔ مالگزاری صرف چوتھائی روپیہ لی جاتی تھی۔ اسی طرح تجارت کی ترقی بھی وہ
الشان تھی۔ ۱۷۶۲ء میں حافظ الملک نے اپنے مقبوضات میں سامانِ تجارت کی درآمد و برآمد پر ہر قسم
کا محصول قطعی معاف کر دیا تھا۔ گو اُس حکم کے صادر ہونے پر روہیلکھنڈ کے تمام سرداروں اور اہلکارو
نے سخت احتجاج کیا۔ کیونکہ معافی محصول سے حکومت کو کئی لاکھ روپیہ سالانہ کا نقصان ہوتا تھا۔ لیکن
حافظ الملک نے جو امورِ سیاسی کے ساتھ ساتھ مسائلِ اقتصادی کے صحیح طور پر سمجھنے میں بھی یکتائے
روزگار تھے۔ اور ان معاملات میں اپنے ہمعصروں سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ فوج کے
مصارف کثیر اور خزانہ میں روپیہ کی کمی کے باوصف اپنے حکم کو منسوخ نہ کیا۔ اس ایثار و تدبیر کا یہ نتیجہ
ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آزاد تجارت کی بدولت باشندگانِ روہیلکھنڈ میں اس قدر خوشحالی
و فارغ البالی اور اشیاء خوردنی و پوشیدنی کی اس درجہ فراوانی و ارزانی ظہور میں آئی کہ کسی زمانہ
میں نہ دیکھی گئی تھی۔ رعایا کی خوشحالی سے حکومت کی آمدنی اور اُس کے استحکامات میں بھی علاوہ
غیر معمولی ترقی ہوئی۔ مسٹر فرینکلن نے اُس زمانہ کی بریلی کو جو اُس وقت بھی روہیلکھنڈ کا صدر مقام
تھا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ کہا تھا کہ:۔

"یہ شہر حافظ رحمت خاں کی خصوصی دوربینی کے سبب سے ایک بہت بڑی تجارت گاہ بن گیا ہے"

عمارات

حافظ الملک کو مخلوق کی آرام و آسائش اور اپنے مقبوضات کی رونق و خوبصورتی بڑھانے
کے لئے عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اُن کا ایک مستقل محکمہ تعمیر تھا۔ جس میں بہت
سے ہندوستانی اور ولایتی ماہرینِ فنِ تعمیر اور کاریگر بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے۔ چنانچہ اپنے
عروج و خوشحالی کے زمانہ میں اسی محکمہ کی امداد سے اُنھوں نے طول و عرض روہیلکھنڈ میں بکثرت
گڑھیاں۔ قلعے۔ شہر پناہیں۔ محلسرائیں۔ مسافرخانے مہمان خانے۔ بازار۔ باغات۔ سڑکیں۔ پل
نہریں۔ تالاب۔ مدرسے۔ مسجدیں اور مقبرے تعمیر کرائے۔ بریلی۔ آنولہ۔ حافظ گنج۔ پیلی بھیت
جلال آباد اور بدایوں وغیرہ میں اکثر عمارات تعمیر کرائیں۔ جن میں بعض شکستہ اور بعض ابتک بہتر
حالت میں ہیں۔ بدایوں میں ایک خوبصورت مسجد جس کے احاطہ میں اُن کے والد شاہ عالم خاں کا
قبر موجود ہے اور حضرت سیدنا احمد رحمۃ اللہ علیہ والد حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی ثم دہلوی کی
درگاہ جو آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے اُنھیں کی تعمیر کردہ ہے۔

آنولہ میں نواب علی محمد خاں کا خوشنما مقبرہ اور پیلی بھیت میں ایک نہایت خوبصورت اور ا

رفیع الشان جامع مسجد خاص طور پر اُن کے شوقِ تعمیر کی شاہد ہے۔ جامع مسجد کے علاوہ پیلی بھیت میں دو اور مسجدیں اور دریائے کھکرہ کا پُل آج تک اُن کی یادگار باقی ہیں۔

خاص بریلی کی عمارات میں مبارک محل۔ دیوانِ عام۔ دیوانِ خاص۔ اور قلعہ تھا۔ جن کا صرف نام ہی نام باقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شجاع الدولہ نے ان کو مسمار کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا یہاں تک کہ اُن کی صحیح جائے وقوع کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ مولوی ابوالحسن صاحب قہجور میرٹھی جرنلسٹ اس واقعہ کی تائید میں لکھتے ہیں کہ:۔

"والیانِ ملک کے صنادید عہد کے آثار ہزارہا سال تک قائم رہتے ہیں۔ جن کو مٹانے کے لئے ادوارِ لیل و نہار کو قرنوں تک مصروف جد و جہد رہنا پڑتا ہے۔ لیکن مقامِ عبرت ہے کہ حافظ رحمت خاں کے عہد کو صرف ڈیڑھ سو سال گزرے ہیں مگر اُن کے گھر بار کا کوئی شکستہ اور ریختہ کھنڈر بھی اب کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا اس سے والیٔ اودھ کی بربریت کا پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے اپنے غضب انتقام سے حافظ الملک کے محلات کو مسمار کر کے گدھوں کے ہل چلوا دئے۔ جس کا پتہ پیلی بھیت کی سڑکوں کی کھڑنجہ والی لکھوری اینٹیں دے رہی ہیں۔ البتہ اُن کے دیوانِ ریاست کے عالی شان وسیع محل کا کھنڈر پیلی بھیت میں اور کٹرہ مانرائے کا بلند پھاٹک بریلی میں باقی ہے۔ یا ایک حمام کی شکستہ عمارت مرحوم کے غم میں گرم گرم آنسو بہاتی نظر آتی ہے۔ کیا اس کثیر العیال والیٔ کٹھیر نے اپنی اولاد کی بود و باش کے لئے خس پوش مٹی کے چند جھونپڑے ہی بنوائے تھے جو چند ہی سال میں آندھیوں کے طوفان سے اُڑ گئے اور بارشوں میں بہہ گئے۔ مشہور ہے کہ بریلی میں حافظ الملک کے محلات (مبارک محل وغیرہ) مرزائی مسجد کے جانب شمال مشہور مرزائی باغ کے وسیع قطعہ پر واقع تھے۔ اور اُس باغ کی سطح مرتفع سے پتہ چلتا ہے کہ مکانات کے انہدام سے یہ جگہ بلند ہو گئی ہے۔ اور نواب اودھ کے جوشِ انتقام کی نوحہ خواں ہے وہ تو مذہبی ممانعت اور شورشِ عام کا خوف مانع تھا ورنہ یہ خدا ناترس شخص حافظ الملک کی تعمیر کردہ جامع مسجد کو بھی گرا کر اُس کے ملبہ سے چالیس لاکھ کے تاوان کا ایک جز ضرور وصول کر لیتا۔" (منقول از روزانہ اخبار بریلی)

یہ روایت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بریلی شہر کہنہ میں مرزائی مسجد و باغ جو اس وقت موجود ہیں اُنھیں کے قریب مبارک محل وغیرہ واقع تھے۔ رہا قلعہ وہ شہر کے جانب غرب واقع تھا اور آج بھی ایک پورا محلہ اس نام سے موسوم ہے۔ رحمت خانی عمارت کا پتہ نہیں یہاں تک کہ قلعہ کے موجودہ دروازے بھی مسٹر جان انگلس کلکٹر ضلع کے عہد کی تعمیر ہیں۔

حافظ الملک کے عزیزوں اور سرداروں نے بھی اُن کے عہد میں بکثرت محلات اور مساجد تعمیر کیں۔

جن میں سے آنولہ میں بخشی سردار خاں - فتح خاں خانساماں - اور بیگم کی مسجدیں - بریلی میں بی بی جی کی مسجد جو حافظ الملک کی ہمشیرہ تھیں - اور بسولی میں نواب دوندے خاں کا قلعہ مسجد اور حمام وغیرہ اب بھی باقی ہیں - حافظ الملک کوئی عمارت بنواتے تو ان کے اس ارادے میں ثواب عقبیٰ اور نفع رسانی خلق اللہ کی نیت ضرور شامل ہوتی تھی - بلکہ کچھ عمارتیں تو بنوائی ہی اس غرض سے گئیں کہ اُن کی تعمیر کے سلسلہ میں ضرورت مند اور مفلوک الحال لوگوں کو روزی کمانے کا موقع ملے - مثلاً سنہ ۱۷۶۲ء میں راجپوتانہ میں بڑا سخت قحط پڑا - جس کی وجہ سے کثیر التعداد مارواڑی اور میواتی اپنا وطن چھوڑ کر دار الامن روہیلکھنڈ میں آنے لگے - حافظ الملک نے براہ غربا نوازی ان کے لئے روزینہ کے طور پر کچھ رقم مقرر کر دی - لیکن جب اُن لوگوں کی تعداد حد سے متجاوز ہو گئی تو محض اُن کو ذریعہ معاش بہم پہنچانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ اُن لوگوں کو پیلی بھیت کے گرداگرد شہر پناہ خام بنانے کا حکم دیا - جب سنہ ۱۷۶۳ء میں شہر پناہ مذکور بن کر تیار ہو گئی اور پھر بھی یہ ضرورت باقی رہی کہ جو امداد اس تعمیر کے سلسلے میں غریبوں کو مل رہی تھی وہ جاری رہے تو حکم دیا کہ اسس کو توڑ ڈالا جائے اور از سر نو پختہ بنایا جائے - پختہ شہر پناہ کی سنہ ۱۷۶۹ء میں تکمیل ہوئی - حافظ الملک کی اس عدیم المثال فیاضی کی بدولت تمام مارواڑی اور میواتی جو نہایت غریب اور تنگدست تھے مالدار ہو گئے - اور روپیہ جمع کر کے زراعت و تجارت میں مشغول ہو گئے - آیندہ کے لئے اُنھوں نے روہیلکھنڈ ہی میں مستقل سکونت بھی اختیار کر لی -

جامع مسجد پیلی بھیت کی تعمیر کا واقعہ اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے گو اُس کی نوعیت ایک حد تک مختلف ہے - بریلی و بدایوں کی طرح پیلی بھیت میں کوئی جامع مسجد نہ تھی اور مسلمانوں کو جمعہ کی نماز ایک جگہ مجتمع ہو کر ادا کرنے کا موقع نہ ملتا تھا - عام مسلمانوں کی اس تکلیف کا احساس کر کے حافظ الملک نے سنہ ۱۷۶۹ء میں اپنے محکمہ تعمیرات کے خاص خاص کارپردازوں کو جمع کیا اور جامع مسجد دہلی کے نقشے کے مطابق ایک عالی شان مسجد بنانے کا حکم دیا -

جگہ کا سوال بہت پیچیدہ تھا - حافظ الملک کی خواہش تھی کہ دیوان خاص و عام اور محلسرا سے قریب کوئی مقام ہو لیکن یہاں محلسرا سے شمال رویہ بجز ساگر تال نامی ایک بہت بڑے اور نہایت گہرے تالاب کے کوئی دوسرا میدان نہ تھا - حافظ الملک نے اس تالاب ہی کو پاٹ کر مسجد بنانے کی خواہش ظاہر کی منتظمین نے عرض کیا کہ :-

"اس تالاب کے پاٹنے میں بے شمار روپیہ صرف ہوگا - اگر اس کی بجائے کوئی دوسری جگہ پسند کی جائے تو مناسب ہوگا تاکہ ایک عالی شان مسجد بھی بن جائے اور اس قدر روپیہ بھی صرف نہ ہو"

حافظ الملک نے فرمایا کہ :۔

"ہمارا منشاء یہ ہے کہ مسجد دیوان عام و خاص سے قریب بنے۔ تاکہ اکثر اوقات نماز جامع مسجد میں ادا کی جائے۔ علاوہ بریں کوئی اور جگہ بھی خالی نہیں ہے جہاں اس عمارت کو قائم کیا جا سکے۔ بہت سے غرباء فقراء اور علماء کے مکانات ہیں جن کو ہموار کر کے مسجد تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس بات کو ہماری طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ ہمارے نزدیک بے شمار روپیہ صرف کرنا آسان ہے۔ لیکن محتاجوں اور مسکینوں کو تکلیف دینا غیر ممکن ہے۔"

مہتمین تعمیر نے عرض کیا کہ :۔

"اگر ان مکانوں کے عوض میں اُن کے مالکوں کو دوسرے مکان سرکار سے تیار کرا دئے جائیں تو اس میں اس قدر روپیہ صرف نہ ہوگا جس قدر کہ اتنے بڑے تالاب کو پاٹنے میں صرف ہوگا۔"

حافظ الملک نے جواب دیا کہ :۔

"تمہارا مشورہ ہماری خیر خواہی پر مبنی ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان کے انہدام پر راضی نہ ہوگا اگر چہ اس کے عوض میں اچھے سے اچھا مکان اُس کو بنوا دیا جائے۔"

کارپردازوں نے عرض کیا کہ :۔

"اُن غرباء کو ہم راضی کر لیں گے۔"

ارشاد ہوا کہ :۔

"یہ لوگ کمزور ہیں زبردستی کے خوف سے خواہ نخواہ راضی ہو جائیں گے اور اُن کی اس طرح مجبورانہ رضامندی ہم کو ہرگز منظور نہیں ہے۔ یہ امر عدالت و انصاف سے قطعی بعید ہے۔"

اس آخری جواب کے بعد مزید عرض و معروض کی بالکل گنجائش باقی نہ رہی سب لوگ خاموش ہو گئے اور حکم کے موافق اس عظیم الشان تالاب کو پاٹنے میں تعجیل تمام عمل میں لانے لگے۔ تالاب پٹ گیا تو حافظ الملک نے بناء سنگ بنیاد کی رسم کے روز روہیلکھنڈ کے تمام علماء، فضلاء، فقراء، شیوخ اور قضاۃ کو مدعو کیا۔ جب یہ تمام بزرگ جمع ہو گئے تو حافظ الملک نے ایک ممبر پر کھڑے ہو کر یہ تقریر کی کہ :۔

"اے بزرگانِ ملت اس مبارک تقریب کے موقع پر میں نے آپ صاحبوں کو اس غرض سے جمع کیا ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک ایسے بزرگ جنھوں نے کبھی اپنی آنکھ، اپنا ہاتھ اور اپنا قدم حرام کی طرف نہ اُٹھایا ہو وہ بسم اللہ کر کے خانۂ خدا کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں تاکہ اس کی برکت سے یہ پاک عمارت تا ابد الآباد

قائم ودائم رہے۔"

ان الفاظ کو سنکر تمام حاضرین پر سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا اور سب نے اپنی اپنی گردنیں جھکالیں تھوڑی دیر توقف فرمانے کے بعد حافظ الملک نے پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ:۔

"الحمدللہ مجھ عاجز فقیر نے مدت العمر اپنی آنکھ۔ اپنا ہاتھ۔ اور اپنا قدم حرام کی طرف نہیں اُٹھایا ہے۔
اس لئے مجبوراً میں ہی اس خانۂ خدا کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھتا ہوں۔ خدا میری مدد کرے۔"

اس کے بعد حافظ الملک نے اپنے دست حق پرست سے مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اُسی روز سے تعمیر کا کام جاری ہو گیا اور ایک مدت کے بعد جامع مسجد دہلی کے نمونہ کی ایک بہت خوبصورت اور وسیع وعظیم الشان مسجد جس میں بکثرت حجرے۔ دالان۔ لانبا چوڑا حوض ایک بڑا گہرا کنواں اور بہت سے سقاوے اور غسل خانے وغیرہ شامل ہیں بن کر تیار ہو گئی۔ ملا حافظ سعد اللہ خطیب اور ملا موسیٰ موذن مقرر ہوئے۔ ایک عالم نے اختتام تعمیر کی تاریخ حدیث نبوی سے یہ نکالی تھی۔

"المسجد بیت المتقین"

۱۱ ھ ۸۱

تعمیر میں تین لاکھ اور چند ہزار روپیہ صرف ہوئے۔ اِس مسجد اور جامع مسجد دہلی میں بے حد مطابقت ہے۔ چند چھوٹی چھوٹی باتوں میں ضرور فرق ہے۔ اوّل یہ کہ دہلی کی مسجد بلند کرسی پر بنائی گئی ہے جس سے اُس کی شان دو بالا ہو گئی ہے۔ پیلی بھیت کی مسجد نشیبی جگہ میں واقع ہونیکے باعث نیچی کرسی پر بنائی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ دہلی کی مسجد سنگ سرخ وسفید سے نہایت استحکام کے ساتھ اور کمال وسعت وفراخی کے ساتھ بنی ہے اور اُس کے دروازے بھی زیادہ بلند ہیں پیلی بھیت کی مسجد چھوٹی اینٹ اور گچ سے نسبتاً کم وسعت اور مقابلتاً نیچے دروازے کے ساتھ تعمیر ہوئی ہے۔ تیسرے یہ کہ دہلی کی مسجد کا دالان بمقابلہ صحن بلند ہے اور اگلی محراب بہت بڑی ہے۔ پیلی بھیت کی مسجد کا دالان اُس کے صحن سے قریب قریب ہموار ہے۔ اور سامنے کی محراب مختصر ہے۔ چوتھے یہ کہ جامع مسجد دہلی کے چاروں طرف ایک طویل بازار واقع ہے۔ جامع مسجد پیلی بھیت کے چاروں طرف بازار نہیں ہے۔ [1]

ترویج واشاعتِ علوم | حافظ الملک کے عہد حکومت میں روہیلکھنڈ میں پانچ ہزار علما اور فضلا مشاہرہ و سرکاری مدارس میں درس وتدریس میں مشغول تھے۔ ہر ایک عالم با

لہ [illegible]

فاضل کی اُس کے علم وفضل کے موافق تنخواہ مقرر تھی۔ تمام مدرسوں میں کتب درسیہ بڑے بڑے علماء کے مشورہ سے حافظ الملک خود مقرر فرماتے تھے اور طالب علموں کو مقررشدہ کتابیں حکومت کی طرف سے مفت مہیا کی جاتی تھیں۔ ملازمین سرکار کے لڑکوں کے علاوہ تمام طالب علموں کو قیام و طعام کی سہولتوں کے ماسوا فرداً فرداً سنو روپیہ سالانہ بطور جیب خرچ بھی دیا جاتا تھا جب طالبعلم فارغ التحصیل ہوکر درجۂ فضیلت کو پہنچ جاتا تو علماء، فضلاء اور طلباء ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوکر اور جلوس ترتیب دے کر اس کو حافظ الملک کے حضور میں لے جاتے۔ حافظ الملک اُن تمام لوگوں کی دعوت کرتے اور دعوت کے بعد طالب علم مذکور کے سر پر اپنے دست مبارک سے دستار فضیلت باندھ کر اُس کو زمرۂ علماء میں منسلک کرتے۔ نیز اُسی روز سے جس قدر تنخواہ علماء کو دی جاتی تھی اُس طالب علم کے لئے بھی مقرر کردی جاتی۔ اور تعلیم وتعلم یا کوئی دوسرا کام جس سے اُس کی طبیعت کو موزونیت ہوتی اُس کے سُپرد کردیا جاتا تھا۔ طالبانِ علم کی ایسی عدیم النظیر عزت وحرمت اور خاطرداری وہمت افزائی جیسی کہ حافظ الملک کرتے تھے شاید ہی کبھی کسی حکمراں نے کی ہو۔

طالب علموں کی دلداری کرنے میں انھیں جس قدر شغف تھا اُس کا ذیل کے ایک نہایت دلچسپ واقعہ سے اندازہ ہوگا۔

ایک روز ایک طالب علم نے جو دس طالب علموں پر جمعدار تھا، سرکاری خزانہ میں آکر مہتمم خزانہ سے درخواست کی کہ اُسے مبلغ دو ہزار روپیہ بابت تنخواہ اور کچھ روپیہ پیشگی پرگنہ جہاں آباد سے دلوایا جائے۔ مہتمم خزانہ نے پیشگی روپیہ دینا قبول نہ کیا۔ اور صرف ایک ہزار روپیہ جو اُس کا اور اُس کی جماعت کے دس طالب علموں کا واجب الادا تھا خزانہ جہاں آباد سے برآمد کرنے کی تحریر لکھکر دیدی۔ طالب علم نے اس تحریر کو لینے سے انکار کردیا۔ اور وہاں سے اُٹھ کر اور دو ہزار روپیہ کی عرضی لکھکر سیدھا حافظ الملک کے حضور میں پہنچا، جہاں ہر حاجت مند کو بلا روک ٹوک حاضر ہونے کی اجازت تھی۔ حافظ الملک نے طالب علم کی عرضی ملاحظہ فرماکر اُس کی خواہش کے موافق فرمان لکھنے کا اپنے میرمنشی کو حکم دے دیا۔ دو ہزار روپیہ اس قدر آسانی سے ملنے لگے تو طالب علم صاحب کو اب دُور کی سوجھی اور عرض کیا کہ "میرا کام تو پانچ ہزار روپیہ میں نکلے گا" حافظ الملک نے اُس کی اِس حرکت پر تبسم کرکے ارشاد فرمایا کہ "پہلے تو تو دو ہزار روپیہ طلب کرتا تھا اب اپنے قول سے تجاوز مت کر" طالب علم نے کہا کہ "میں اپنے سابق قول پر پشیمان ہوں"۔

حافظ الملک نے اُس کے اس عذر کو قبول نہ کیا اور محلسرا میں تشریف لے جانے کے لئے کھڑے

ہو گئے۔ اس پر طالب علم نے جھپٹ کر دامن پکڑ لیا اور آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ "میری عرضی پر پانچہزار روپیہ کا حکم اپنے قلم سے ارقام فرما دیجئے"
حافظ الملک جنہیں طالب علموں کی معمولی سی دلشکنی بھی گوارا نہ تھی۔ طالب علم کو دامن پکڑتے دیکھ کر خود بھی فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اور شفقت پدرانہ کے ساتھ اس کی بہت کچھ تسلی و تشفی کر کے پانچہزار روپیہ کا حکم درخواست پر لکھدیا اور طالب علم مذکور کو زیادہ رنجیدہ نہ ہونے دیا۔[۱۵]
حافظ الملک کی اسی حسن نیت اور حسن عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے زمانِ سعادت اقتران میں بکثرت بے مایہ لوگ علوم ظاہری حاصل کر کے عالم متبحر بن گئے۔
اس طرح حافظ الملک طالب علموں کے ساتھ شفقت و محبت کرتے تھے، اسی طرح اُن کے اُستاد اور علما اور فضلا کا کمال درجہ احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ اُن کی صحبت سے انتہائی محظوظ و مسرور ہوتے تھے اور ان کی صحبت کے واسطے رات کا وقت مخصوص کر دیا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:-

"جب سفر سے پیلی بھیت کو واپسی کا اتفاق ہوتا ہے تو مجھ کو خوشی ہوتی ہے کہ میں ایک ایک فاضل اور عالم کے مکان پر جا کر اُن کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہ لوگ پیش دستی کر کے میری ملاقات کے واسطے خود چلے آتے ہیں اور میرے دل کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ اتنا انتظار نہیں کرتے کہ میں ان کے مکان پر جا کر ملاقات کروں۔ صرف شاہ ابوالفتح اور مولوی عبدالرزاق انتظار کرتے ہیں جس سے مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے"۔[۱۶]

اخلاق و عادات | حافظ الملک نے تمام عمر اتقا، پرہیزگاری اور پاکبازی کی زندگی بسر کی۔ ہر قسم کے لہو و لعب سے نفرت تھی۔ مسکرات کا تو ذکر کیا ہے حقہ بھی نہ پیتے تھے۔ دنیاوی مباکر سے رغبت تھی۔ لباس نامشروع کبھی نہ پہنتے تھے۔ اور کلام فضول اور گالی گلوج سے سخت نفرت تھی۔ لوگوں کی خطا پوشی اور دلداری اُن کا شیوہ تھا۔ جود و سخا۔ رحم و حلم۔ اور عجز و فروتنی کے مجسمہ تھے۔ معدلت شعاری۔ پرہیزگاری۔ حق شناسی۔ دین داری اور صدق گفتاری ان کے کیریکٹر کی خصوصیات تھیں۔ اور عقل و ادب سیاست و تدبر۔ حُسن عمل اور حُسنِ کلام کی خوبیاں اُن کی ذات والاصفات میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

معمولات روزانہ | شرع شریف پر پوری استقامت رکھتے تھے۔ ہر وقت باوضو رہتے اور کسی وقت درود شریف یا ادعیہ ماثورہ کے ورد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ سوائے نماز ظہر چاروں وقت

[illegible]

نماز با جماعت ادا کرتے تھے۔ آخر شب میں اپنے خادموں میں سے کسی کو بیدار کئے بغیر بستر سے اٹھتے اور خود غسل و وضو سے فارغ ہو نماز تہجد ادا کرتے۔ اس کے بعد ایک منزل قرآن شریف کی تلاوت کرتے۔ یہاں تک کہ سپیدۂ صبح نمودار ہو جاتا اور اس وقت تھوڑی دیر کے لئے دوسری دعاؤں اور اوراد میں مشغول رہ کر حرم سرا سے برآمد ہوتے اور قصر کی مسجد میں نماز فجر با جماعت ادا کرتے۔ بعد نماز مصلّے ہی پر بیٹھے بیٹھے اپنے تمام اوراد و وظائف پورے کرتے۔ نماز اشراق پڑھ کر مصلّے سے اٹھتے۔

اور دربار عام میں تشریف لاکر دربار، حاجت مندوں اور مظلوموں کی احوال پرسی اور خلق اللہ کی حاجت روائی میں مشغول ہو جاتے۔ دربار عام کے لئے دربانوں کو حکم تھا کہ کسی حاجت مند یا دادخواہ کو حضوری میں حاضر ہونے سے نہ روکیں۔ چنانچہ ہر شخص بلا روک ٹوک آتا اور اپنی مراد پاتا تھا۔ کچھ دن چڑھے دربار عام کو برخاست کر کے نماز چاشت ادا کرتے اور پھر دربار خاص میں جاکر معاملات، مالی و ملکی میں مصروف ہو جاتے۔ قریب دوپہر دربار خاص سے اٹھ کر کبھی حرم سرا میں تشریف لیجاتے اور اپنی اولاد کے ہمراہ خاصہ تناول فرماتے اور وہیں قیلولہ فرماتے اور کبھی باہر کے خلوت خانے میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ کھانا کھا کر آرام فرماتے۔ تین گھنٹے قیلولہ کرنے کے بعد بیدار ہو کر نماز ظہر ادا کرتے اور دلائل الخیرات، حصن حصین وغیرہ دیگر دعائیں اور اوراد جو ہمیشہ پڑھتے تھے ان میں مشغول ہو جاتے۔ جمعہ کے روز قیلولہ سے جلد بیدار ہو کر دوبارہ غسل فرماتے اور تبدیل پوشاک کر کے نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا کرتے۔ اس کے بعد محتاج لوگوں کو جو جامع مسجد کے دروازے پر جمع ہو جاتے تھے خیرات و عطیات سے بہرہ اندوز کر کے محلسرا کو واپس تشریف لاتے اور حسب معمول ورد و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ اگر پیلی بھیت میں ہوتے تو جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ بلا ناغہ اپنی والدہ ماجدہ کے مقبرہ میں تشریف لے جاتے۔ وہاں سے واپس ہو کر حسب معمول دربار عام میں جلوس کرتے۔ عصر کے وقت روزانہ دربار سے اٹھ کر علماء اور مشائخ کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہو جاتا اور نماز سے فارغ ہو کر دو گھڑی چہل قدمی فرماتے۔ اسی چہل قدمی کی حالت میں وظائف معمولی بھی ختم کر لیتے تھے۔ اس کے بعد علماء و فضلاء اور مشائخ کی صحبت میں بیٹھ کر تفسیر و حدیث اور مسائل فقہ کا تذکرہ ہوتا۔ ایک پہر رات گئے نماز عشا ادا کی جاتی جس سے فراغت پاکر سادات و علماء کے ہمراہ رات کا کھانا تناول فرماتے تھے۔ اس وقت قوال بھی حاضر ہوتے اور حمد و نعت اور انبیا و اولیا کی مدح و ثنا میں سوز و گداز کے ساتھ اشعار گاتے تھے۔ کھانے کے بعد قوال رخصت ہو جاتے لیکن علماء حاضر رہتے تھے۔ اور کہیں نصف شب کے قریب حافظ الملک حرم سرا میں

تشریف لے جا کر آرام کرتے تھے۔ حافظ الملک کا معمول تھا کہ شب و روز میں صرف تین گھنٹے شب میں اور تین گھنٹے دن میں کُل چھ گھنٹے سوتے تھے۔ بقیہ اٹھارہ گھنٹے کا دستور العمل وہی تھا جو اُوپر بیان کیا گیا۔

معمولاتِ ماہِ صیام و عید الفطر

رمضان المبارک کے مہینے میں سُنتوں۔ تراویح۔ اور نوافل میں چند ختم کلام اللہ کراتے تھے۔ جب سے کہ صاحبزادہ حافظ محمد یار خاں نے کلامِ پاک حفظ کر لیا تھا اول اُن سے کلام اللہ سُنتے تھے اس کے بعد اور حافظ مامور کئے جاتے تھے۔ جماعت کثیر کے ساتھ تراویح ادا کرنے کے بعد دو تین حافظوں کے ہمراہ خلوت خانہ میں تشریف لا کر نوافل میں خود ایک منزل قرآن سُناتے۔ ماہِ رمضان کے عشرۂ آخر میں حافظ الملک مسجد میں اعتکاف کرتے تھے اور عید کے دن تمام امیروں اور غریبوں کے ساتھ عیدگاہ تشریف لیجا کر نماز ادا کرتے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر دربارِ عام میں جلوس کر کے انعامات و تصدقات لوگوں کو عطا کرتے تھے۔

احترامِ عشرۂ محرم

عشرۂ محرم میں تیرہ تاریخ تک حکم تھا کہ نوبتی لوگ نوبت نہ بجائیں۔ ہر قسم کا گانا۔ بجانا اِن ایام میں قانوناً ممنوع تھا۔ ہر روز ہزاروں کی تعداد میں فقرا اور غربا حافظ الملک کے درِ دولت پر حاضر ہوتے تھے اور انھیں صبح و شام نیازِ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ بالخصوص ساتویں تاریخ سے دسویں تاریخ تک بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ سادات۔ علما۔ مشائخ اور صلحا کی دعوتِ عام ہوتی تھی۔ اول سادات کو دیوانِ عام میں طلب فرما کر انواع و اقسام کے کھانے کھلائے جاتے تھے۔ حافظ الملک اپنے ہاتھ میں لوٹا لے کر ہر ایک سیّد کے ہاتھ خود دُھلاتے اور ایک ایک شخص کے سامنے اپنے ہاتھ ہی سے کھانا رکھتے۔ کھانے کے بعد بطور نذر زرِ نقد بھی پیشکش کیا جاتا تھا۔ جب سادات رخصت ہو جاتے تو علما۔ صلحا۔ اُن کے بعد مساکین اور نابینا و یتیم لوگوں کو گروہ در گروہ باری باری سے طلب کیا جاتا۔ اور قسم قسم کے کھانوں سے اُن کی تواضع کی جاتی۔ اس کے بعد صلائے عام دے دی جاتی۔ بیوہ عورتیں۔ فقیر اور غریب جس قدر بھی حاضر ہوتے انھیں کھانا اور کچھ نقد دیا جاتا۔ الغرض سات سے دس تک مسلسل چار روز صبح سے لے کر پہر رات گزرے تک یہی عالم رہتا اور حافظ الملک بے شمار روپیہ صرف کر کے نہایت اہتمام و عقیدت کے ساتھ ہر سال حضرت امام حسین علیہ السلام کے مصائب کی یاد تازہ کرتے تھے[5]

---

[5] سرزمین روہیلکھنڈ میں موجودہ زمانے کی سی دھوم دھڑکے کی محرم داری جس میں باجے۔ تاشے۔ نوبت و علم اور تخت تعزیوں وغیرہ کے جلوس نکالے جاتے ہیں اس کا روہیلوں کے دورِ حکومت یا اس سے قبل کے زمانہ میں جہاں تک تحقیق کی گئی وجود

حرمت ماہ ربیع الاول جس طرح حافظ الملک ماہ رمضان المبارک اور عشرۂ محرم میں نذر و نیاز اور لاکھوں روپیہ کی خیر خیرات کرتے تھے اسی طرح ماہ ربیع الاول میں دسویں تاریخ سے بارھویں تاریخ تک محافل و مجالس منعقد کرکے بڑی دریا دلی کے ساتھ تقسیم طعام و شیرینی وغیرہ کرتے تھے۔

سادات کے ساتھ عقیدت حافظ الملک کو حضرت رسالت پناہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضور سلطان الاولیا، حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو زبردست عقیدت و ارادت تھی۔ اس کی وجہ سے سادات عظام کی بے حد عزّت و توقیر کرتے تھے۔ اور اُن کے پاس خاطر کو اپنے اوپر واجب و لازم سمجھ کر غایت حق شناسی سے سادات کا اس حد تک ادب بجا لاتے کہ اگر سادات کے بچوں میں سے کوئی بچہ دربار عام یا دربار خاص میں چلا آتا تو دیکھتے ہی اُس کی تعظیم کے واسطے کھڑے ہو کر اُس کو اپنے پہلو میں بٹھا لیتے تھے اور پرسش احوال کرکے جب تک اُس کا کام نہ ہو جاتا دوسرے کام کی طرف التفات نہ فرماتے۔ ہرگز اس امر کو گوارا نہ کرتے تھے کہ سادات میں سے کوئی فرد بے وجہ یا بوجہ رنجیدہ خاطر ہو۔ چنانچہ اسی سلوک کے باعث اطراف و اکناف عالم سے صحیح النسب سادات کے اکثر قبائل اور صحیح النسب پیرزادے روہیلکھنڈ میں آکر سکونت پذیر ہو گئے اور حافظ الملک نے اُن سب کو بیش قرار وظیفے۔ جاگیریں۔ اور حویلیاں مرحمت کیں تاکہ کمال اطمینان سے بسر اوقات کریں۔ مذکورہ سادات کے مستند خاندانوں میں ایک خاندان سید احمد شاہ عرف شاہ جی بابا کا تھا جو سید علی ترمذی المعروف بہ پیر بابا کی اولاد میں سے تھے اور افغانستان سے بریلی تشریف لائے تھے۔ بڑے نیک خصلت۔ اہل باطن۔ عقل و دانش میں ارسطوئے زمانہ اور تہور و مردانگی میں یگانۂ روزگار تھے۔ افغانوں کے بہت بڑے پیر تھے۔ اُن کا کچھ حال نواب قائم خاں بنگش والیٔ فرخ آباد کی جنگ میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ سید احمد شاہ کے ایک صاحبزادے سید معصوم شاہ صاحب تھے جن سے حافظ الملک کو کمال درجہ عقیدت تھی اور اسی عقیدت کی بنا پر ان کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ سید معصوم کا بالعموم قلعہ نومحلہ واقع بریلی میں قیام رہتا تھا۔ اس قلعہ کا اب کوئی وجود نہیں ہے صرف نومحلہ کی عظیم الشان مسجد ضرور باقی ہے۔ جس میں حضرت شاہ جی بابا اور سید معصوم کے مزارات ہیں۔[۱]

م میں ملتا۔ اس قسم کی تعزیہ داری کا سلسلہ بعد شہادت حافظ الملک والیان اودھ کے بست و ہفت سالہ عہد سلطنت میں شروع ہوا کالا امام باڑہ اور بریلی میں شیعہ حضرات کی دوسری مقدس عمارتیں بھی اُسی زمانے کی یادگار ہیں۔

[۱] کچھ عرصہ ہوا خان بہادر سردار محمد رحیم داد خاں مرحوم رئیس اعظم بریلی نے رقم کثیر صرف کرکے مسجد نومحلہ کی مرمت کرائی ہے۔

حافظ الملک سادات کے فرقۂ عالیہ کی جس درجہ قدر و منزلت کرتے تھے اُس کا اندازہ ذیل کی چند معتبر حکایات سے ہوگا۔

حکایت اوّل :۔ ایک سیّد صاحب سیّد خواجہ حسین نامی برفاقت نواب محبت خاں روہیلکھ میں قیام رکھتے تھے۔ ایک روز سیّد صاحب کی حافظ الملک کے صاحبزادے نواب حرمت خاں سے کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ سیّد صاحب نے جلال میں آکر حرمت خاں کی گردن پر چھرا مار دیا۔ یہ خبر حافظ الملک کو معلوم ہوئی تو گھبرا کر پوچھا کہ :۔

"حرمت خاں زندہ ہے یا مرگیا؟"

لوگوں نے عرض کیا کہ :۔

"زندہ ہے زخمی ہوگیا ہے۔"

اس پر حافظ الملک سجدۂ شکر بجا لائے اور فرمایا :۔

"الحمد للہ کہ حرمت خاں بچ گیا۔ ورنہ میں ہرگز ایک غلام زادے کا قصاص شاہزادے سے نہ لیتا۔"

اور اس کے بعد اس واقعہ کا کبھی کوئی تذکرہ بھی سیّد صاحب مذکور سے نہ کیا۔[1]

حکایت دُوم :۔ ایک روز دو ڈاکوؤں نے پیلی بھیت کے قریب ایک مسافر کو قتل کر دیا اور اُس کا اسباب لوٹنے لگے۔ ہنوز غارت گری میں مصروف تھے کہ اُس نواح کے زمینداروں کو خبر ہوگئی۔ اور اُن لوگوں نے آکر ڈاکوؤں کو پکڑ لیا۔ اور مقتول مسافر اور مجرموں کو حافظ الملک کے حضور میں لے آئے۔ مجرموں نے اقرار جرم کیا۔ اور حافظ الملک نے قصاص میں اُن کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ جس وقت دونوں شخص قتل گاہ کو بھیجے جا رہے تھے تو زندگی سے مایوس ہو کر اُن میں سے ایک نے کہہ دیا کہ :۔

"ہم سیّد ہیں"

یہ بات فوراً حافظ الملک کے گوش گزار کرائی گئی جس پر ارشاد ہوا کہ :۔

"چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو سادات سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے قتل میں جلدی نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ حوالات میں بند کر دینا چاہئے۔"

حاضرین مجلس نے ان دونوں کو اس دعوے میں دروغ گو سمجھ کر عرض کیا کہ :۔

"سادات سے ایسا فعل قبیح کب سرزد ہوا کرتا ہے اور رہزنی کا پیشہ سادات لوگ کب کیا کرتے ہیں محض

---

[1] تاریخ سلیمانی۔

جان کے خوف سے ان لوگوں نے سید ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ایسے شرارت پیشہ لوگوں کا قتل کرنا نہایت ضروری ہے۔"

حافظ الملک نے فرمایا کہ :۔

"چونکہ میں ان لوگوں کے حسب و نسب سے واقف نہیں اور سوائے ذات علام الغیوب ان کے جھوٹ اور سچ کا کسی کو علم نہیں۔ اس لئے میں کہ حضور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت مولا علی رضہ کا کمترین غلام ہوں۔ مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں ان کی تعظیم و تکریم کروں۔ تاہم چونکہ ان سے بڑا بھاری گناہ سرزد ہوا ہے اس واسطے تھوڑے عرصہ کے لئے ان کو محبس میں بھیجتا ہوں تاکہ متنبہ ہو کر شاید اس پیشہ ذمیمہ سے تائب ہو جائیں۔ میں نے محض ان کے اصلاح حال کے لئے یہ تجویز کی ہے۔ ورنہ میری کیا مجال کہ ان کو سزا دے سکوں۔"

چنانچہ حسب الارشاد مجرم قتل گاہ سے واپس لائے گئے۔ اور جیل خانے میں قید کر دئے گئے۔ ان لوگوں کو قید میں مشکل سے دو چار روز گزرے تھے کہ حافظ الملک نے ان کو اپنے حضور میں طلب کیا اور فرمایا کہ :۔

"اپنے شیوۂ نامرضیہ سے توبہ کیجئے۔ اگر تنگ دستی کی وجہ سے آپ ایسا کرتے تھے تو نوکری کر لیجئے۔ روپیہ کا لالچ اگر ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہو تو جس قدر چاہئے روپیہ لے لیجئے۔"[۱]

دونوں شخصوں نے تہ دل سے توبہ کر کے ملازمت اختیار کر لی اور جب تک زندہ رہے حافظ الملک کے لئے سرفروشی کرتے رہے حتیٰ کہ حافظ الملک کی شہادت کے وقت جو معدودے چند لوگ اُن کے ہمراہ رہ گئے تھے اُن میں یہ دونوں شخص بھی تھے۔

حکایت سُوم :۔ قصبہ سینتھل ضلع بریلی کے سادات زمانہ قدیم سے شاہی فرامین کی رو سے ایک ہزار بیگہ آراضی خام پر قابض تھے۔ حافظ الملک کے دورِ حکومت میں یہ قصبہ ملک بیند خاں خٹک کے پاس مستاجری میں تھا اور اُس کا نائب ملا خوشحال خاں اُس کی طرف سے تحصیل وصول کرتا تھا۔ اُس وقت سادات مذکور سات ہزار بیگہ آراضی اپنے پاس کاشت میں رکھتے تھے۔ اور اُس کا لگان بدستور سابق ادا کرتے تھے۔ ملا خوشحال خاں نے پیداوار زیادہ ہونے کے باعث نئے بند و بست کے بموجب کچھ زیادہ روپیہ طلب کیا تو سادات نے اس کے دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ملا خوشحال خاں نے ملک بیند خاں کو لکھکر درخواست کی کہ :۔

---

[۱] گلستان رحمت

"اگر حافظ الملک کا پروانہ خاص قصبہ سینتھل کے سادات کے نام اس مضمون کا صادر ہو جائے کہ بندوبست حال کے بموجب اضافہ کا روپیہ بھی سرکار میں داخل ہوا کرے تو سیدوں سے روپیہ وصول ہو جائے گا۔"

اس درخواست کی بناپر ملک سید خاں نے اس معاملہ کو حضور میں عرض کیا۔ ارشاد ہوا کہ:۔

"جدید بندوبست کے موافق سیدوں سے روپیہ وصول کرنا ہمیں منظور نہیں کیونکہ سادات کو اور لوگوں کے زمرہ میں کیونکر شریک کیا جا سکتا ہے۔"

ملک سید خاں نے پھر عرض کیا کہ:۔

"خوش حال خاں اور مسلمانوں کے برابر ہی سادات سے روپیہ طلب کرتے ہیں اور یہ لوگ اس کے دینے سے بھی انکار کرتے ہیں۔"

حافظ الملک نے جواب دیا کہ:۔

"سادات لوگ اور مسلمانوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لہٰذا عام مسلمانوں کے برابر ان سے روپیہ وصول کرنا آئین عقیدت و ارادت سے بعید ہے۔"

لک نے عرض کیا کہ پھر جیسا ارشاد ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ حکم ہوا کہ:۔

"سادات کے حق میں سات ہزار بیگہ کاشت کی معافی کا پروانہ تحریر کر دیا جائے۔"

ب یہ حکم نامہ ملا خوش حال خاں کو اس کی اُمید کے خلاف موصول ہوا تو اُس نے یہ پروانہ سادات کو دکھایا۔ لیکن ساتھ ہی روپیہ کا مطالبہ بھی ترک کر دیا۔ اور جب سادات لوگ معمول کے موافق اُس کے س روپیہ لے کر جاتے تو وہ لینے سے انکار کر دیتا اور کہدیتا کہ کچھ عرصہ کے بعد جیسی تمہاری خواہش ہے س کے موافق عمل میں آ جائے گا۔ کئی مرتبہ یہی صورت پیش آئی تو سیدوں کو خوف ہوا اور آپس میں شورہ کیا کہ زرلگان نہ لینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملا خوشحال خاں نے ہمارے معاملے کو حافظ الملک ے حضور میں لکھا ہوگا وہاں سے جیسا حکم آوے گا اُس پر عمل کرے گا۔ ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ اتِ خود حضور میں پہنچ کر اپنے معاملات کو من وعن عرض کر دیں۔ یہ خیال اپنے دل میں مستحکم کر کے اگروہ میں سے دو تین آدمی پہلی بعیت حاضر ہوئے اور جمعہ کے دن جبکہ حافظ الملک جامع مسجد تشریف رکھتے تھے حضوری میں باریاب ہوئے۔ حافظ الملک نے دیکھتے ہی اُن سے دریافت مایا کہ:۔

"آپ صاحبوں نے یہاں تک آنے کی کیسے تکلیف گوارا کی۔"

اُن لوگوں نے عرض کیا کہ :-

"ہم لوگوں نے کئی مرتبہ سابق کا زرِ مقررہ ملا خوشحال خاں کو دینا چاہا لیکن اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اُس کے اس فعل کا سبب ہم کو نہ معلوم ہو سکا۔ اور ہم نے خیال کیا کہ مبادا اُس نے ہمارے متعلق حضور میں کوئی تحریر بھیجی ہو تب ہم حاضر ہوئے ہیں تاکہ اپنے معاملات کو خود حضور میں عرض کر دیں"

حافظ الملک نے ارشاد فرمایا کہ :-

"آپ کے یہاں آنے کی صرف اتنی ہی وجہ ہوئی یا اس کے سوا کچھ اور بھی ہے"

اُن لوگوں نے جواب دیا کہ :-

"جو واقعہ تھا ہم نے عرض کر دیا"

فرمایا کہ :-

"الحمد للہ میرے دل میں پہلے ہی یہ بات گزری تھی کہ خوشحال خاں نے آپ کے معاملہ میں کوئی مزاحمت کی ہوگی جس کے باعث آپ نے سفر کی تکلیف اپنے اوپر گوارا کی۔ اب آپ وطن کو واپس تشریف لے جائیں اور خاطر جمعی کے ساتھ اپنے گھروں پر بیٹھ کر ساتنہ زادہ بیگہ اراضی کو اپنی مملوکہ سمجھیں اور ایک کوڑی کسی کو نہ ادا کریں۔ یہ معافی ہے"[۱]

حافظ الملک کا یہ فرمان سنکر سادات دعائیں دیتے ہوئے خوش خوش اپنے اپنے مکانوں کو واپس آئے۔ مذکور الصدر واقعات سے ظاہر ہوا ہوگا کہ حافظ الملک گروہ سادات کی کس درجہ مراعات ملحوظ رکھتے تھے اور اُن کی قدر و منزلت میں کس قدر اہتمام کرتے تھے۔

مشائخ و صوفیہ کرام کے ساتھ ارادت

ایک دوسرا گروہ جس سے حافظ الملک کو بہت زیادہ عقیدت و ارادت تھی وہ مشائخ و صوفیہ کا تھا۔ ہمیشہ فقرا اور عرفا کے متلاشی رہتے تھے اور جس شخص میں مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی کی بو پاتے اُس سے تعلق کی سلسلہ جنبانی کرتے۔ چنانچہ حافظ الملک کے گرد بریلی و پیلی بھیت میں اکثر مشائخ مثل آخون فقیر صاحب[۲]۔ حافظ شاہ جمال اللہ صاحب

---

[۱] گلستانِ رحمت۔

[۲] آخون فقیر صاحب کا پورا نام آخون محمد زیارت خاں صاحب تھا۔ ۱۲۰۲ھ میں بریلی میں انتقال ہوا۔ اور محلہ جسولی میں دفن ہوئے۔ اُن کا مقبرہ اُن کی مسجد میں جو آخون زادے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے آج تک موجود ہے۔ مشہور ہے کہ اُنکو جنات نے دفن کیا تھا۔ اُن کے دو لڑکے تھے ایک آخون زادے ارادت خاں جو لاولد فوت ہوئے۔ دوسرے آخون زادے عباس علی خاں افتخار الدولہ صمصام جنگ بہادر جن سے ایک لڑکا اور چند لڑکیاں ہوئیں۔ ایک لڑکی جو اُن کی پہلی بیوی سے تھیں وہ علی محمد خاں خاں ابن معظم خاں ابن سعد اللہ خاں سے منسوب ہوئیں۔ (موخرالذ دونوں صاحب افغانستان سے

شاہ ابوالفتح صاحب۔ حافظ صدیق صاحب۔ شاہ کلیم اللہ صاحب اور میاں شاہ عزت اللہ وغیرہم جمع ہو گئے تھے۔ شاہ عزت اللہ صاحب کو جو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔ حافظ الملک نے مبلغ چھ ہزار روپیہ سفر خرچ بھیج کر سرہند شریف سے بلا کر بریلی میں مقیم کیا۔ شاہ صاحب کو حافظ الملک نے بریلی میں مقیم کیا۔ اور اُن کے متعلقین میں سے ہر ایک کے لئے مقرر فرما دیا۔ اسی طرح حافظ الملک سید احمد صاحب۔ میر احسن صاحب اور سید معصوم صاحب کی خدمت کرتے تھے۔ ان بزرگوں میں بعض مثل شاہ جمال اللہ صاحب اور آخون فقیر صاحب بسبب اشتغال ذکر و فکر دائمی حافظ الملک کے پاس نہ آتے تھے۔ اُن لوگوں کی خدمت میں حافظ الملک تشریف لے جا کر حقائق و معارف کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اہل اللہ کی اسی قسم کی صحبتوں و بزرگانِ دین کی توجہات باطنی و التفاتِ قلبی نیز ذاتی زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی بدولت حافظ الملک نے اس قدر سرمایۂ باطنی حاصل کر لیا تھا کہ اُن کے ایک کلمۂ ارشاد و ہدایت سے مبتدی منتہی ہو جاتا تھا۔ لیکن غایت حق طلبی و خدا جوئی سے اپنے آپ کو معمولی سالک کے طور پر تصور کرتے تھے[1]۔ مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ جو اور فقرا اور مشائخ روہیلکھنڈ کے جس گوشے میں بھی تھے حافظ الملک اُن کے حالات سے باخبر رہتے تھے اور اُن کا سالانہ مقرر کر دیا تھا جو اُن کے مقاموں پر پہنچایا جاتا تھا۔ روہیلکھنڈ سے باہر میاں شاہ لال صاحب رائے بریلوی جن کا وطن و مسکن شجاع الدولہ کے علاقہ میں تھا باوصف بُعدِ مکان اور عدم ادراکِ صحبت حافظ الملک کی سرکار سے ماہانہ و سالانہ وظیفہ پاتے تھے۔ حافظ الملک نے شاہ مسیح اللہ صاحب مارہروی کا بھی دو روپیہ یومیہ مقرر فرمایا تھا۔ جب تک قیامِ حکومت روہیلکھنڈ جاری رہا اسی طرح کئی ہزار روپیہ حضرت سلطان الہند شیخ الشیوخ خواجۂ بزرگ معین الملت والدین چشتی رحمۃ اللہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ فرید الملت والدین حضرت شیخ فرید شکر گنجؒ۔ سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاؒ۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ۔ شیخ سلیم چشتیؒ اور شیخ بدیع الدین مدارؒ اور دیگر بزرگانِ دین کے

---

۴ آکر بریلی میں سکونت پذیر ہوئے تھے) جن کے بطن سے حافظ محمد جعفر خاں اور محمد عمران خاں پیدا ہوئے۔ حافظ محمد جعفر خاں کے بیٹے محمد رفیع الشان خاں اور اُن کے بیٹے محمد عظیم الشان خاں ہیں جن کا ذکر دیباچہ میں کیا گیا ہے۔

[1] یہ امر کثرت واقعات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ حافظ الملک نہایت زبردست اہل باطن اور اولیا اللہ میں سے تھے۔ جو لوگ اس نقطۂ نظر سے اُن سے عقیدت رکھتے ہیں اُن کو اُن کے فیوض روحانی سے بہت کچھ فیض پہنچ چکا ہے۔ و بسا حاجت مند مزار اقدس پر فاتحہ پڑھ کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ں دعوف ہندوستان میں ۔فون ہیں، اُن کے مزارات کے مجاورین کی خدمت میں بھیجتے
تے تھے۔ فی الجملہ حضرات اولیاء اللہ کے ساتھ حافظ الملک کو جس قدر عقیدت و ارادت تھی، اُس کا
ں کرنا حد تحریر سے باہر ہے۔

ونکے ساتھ سلوک | حافظ الملک کے عہدِ حکمرانی میں عورتوں اور مردوں کے ساتھ مساویانہ سلوک
ہوتا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات عدالتیں عورتوں کی حمایت و طرف داری میں
دں کے حقوق کو نظر انداز کردیا کرتی تھیں۔ جو مرد اپنی عورتوں کے ساتھ بیجا مظالم کرتے تھے
ُوباز پُرس کے بعد سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ محلہ محلہ لڑکیوں کے مدارس کھُلے ہوئے تھے
یر مستطیع اُستانیوں کو حافظ الملک کی سرکار سے وظیفے مقرر ہو جاتے تھے۔ سرکاری اخراجات
ایک مد ایسی بھی تھی جس سے غریب لڑکیوں کی شادی کے وقت اُن کے والدین کو سامانِ جہیز
رہ کے لئے مدد دی جاتی تھی اور اُس امداد کے پہنچانے میں اس قدر رازداری کو کام میں لایا جاتا
کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ حافظ الملک اپنی لڑکیوں کی شادی ہمیشہ شب کے وقت
تے تھے اور سامان جہیز کو پوشیدہ کر کے دیتے تھے تاکہ غریب لڑکیوں کو حسرت و یاس نہ ہو۔
ے کے مواقع پر اہالیان فوج کو تاکید اکید کر دی جاتی تھی کہ عورتوں اور بچوں کو نہ ماریں اور نہ اُن
ساماں کو ہاتھ لگائیں۔ حتیٰ کہ مفتوحہ علاقوں کی اُن عورتوں کے لئے جن کے خاوند مارے جاتے تھے
ائف مقرر کر دئے جاتے تھے۔ چنانچہ اوائل ۱۷۵۰ء میں پرگنات دامنِ کوہ کی فتح کے سلسلہ میں
ایک مقام کھیرا گڑھ بھی فتح ہوا اور دوسرے مفتوحہ مقامات کی طرح حسب معمول اُس مقام کی تمام
اؤں کے نام بھی وظائف مقرر ہوئے تو گرد و نواح کے غیر مفتوحہ علاقوں کی مفلوک الحال عورتوں نے
اپنے آپ کو کھیرا گڑھ کی بیوہ کہکر اپنے نام لکھوا دئے اور اُن کے نام بھی وظائف مقرر ہو گئے تو
اپر یہ مثل اب تک مشہور ہے کہ :-

"کہیں کی مرے کھیرا کی رانڈ"

اپنی فوج کے جو سپاہی مارے جاتے تو یہ قاعدہ مقرر تھا کہ اُن کی بیواؤں کے خیال سے خالی
رہ آسامیوں پر اُن کے بیٹوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ جن کے بیٹے نہ ہوتے اُن کی بیواؤں سے بارگیر
ب کرلئے جاتے تھے۔ جو عورتیں بارگیر بھی نہ دے سکتی تھیں اُن کے نام بطریق خیرات وظائف
ر کر دئے جاتے تھے۔

دوؤں کے ساتھ برتاؤ | طرزِ حکمرانی اور ذاتی حالات کے ضمن میں ہم نے عام رعایا کے ساتھ حافظ الملک

کے حسن سلوک اور اُن کی عطا کردہ مراعات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ محض مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ ہندو بھی اُن سے مستفیض ہوتے تھے۔ شریعتِ اسلامیہ کے سچے اور پکے پیرو ہونے کے باعث اور اسلام کے پاک اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی وجہ سے حافظ الملک اپنی اُس رعایا کو جو امن پسند تھی اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں خلل اندازی نہ کرتی تھی ہر طرح کا آرام پہنچانا اور اس کے لئے ترقی کی راہیں کھولنا اپنا فرض ایمانی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اپنے فرائض مذہبی کی ادائگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ آئے دن بڑے بڑے مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کی تعمیر ہوتی تھی اور حکومت کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتی تھی۔ مذہبی تیوہار بدستور قدیم بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔ ور مسلمانوں کی جانب سے کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہوتی تھی۔ گائے۔ باجا اور محرم و رام لیلا کے قضیوں کا وجود نہ تھا۔ اور روہیلوں کے ابتدائے زمانۂ حکومت سے انتہا تک کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں ملتا۔ پہلا ہندو مسلم فساد دارالحکومت بریلی میں ۱۸۳۷ء میں ہوا جبکہ روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مخالف و موافق مورخین کی مستند تاریخوں کی ورق گردانی کر جائیے لیکن ایک ایسا واقعہ نظر سے نہ گزرے گا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوؤں نے اس سرزمین میں اپنی غالب اکثریت کے باوجود حریف القوم مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ طاقتور حکومت کا خوف اس امر میں مانع ہوا ہو۔ لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں تو روہیلہ سلطنت کو زوال ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ پھر بھی جب حافظ الملک کے پوتے خان بہادر خاں نے از سر نو روہیلہ حکومت قائم کرنا چاہی تو اُن کی تقریباً ساٹھ ہزار فوج میں بہ تعداد کثیر ہندو شامل تھے۔ اِس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ روہیلوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں کس قسم کا سلوک کیا ہوگا کہ جس کی خوشگوار یاد نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

علما۔ صوفیا اور مشائخ بطور خود مذہبی تبلیغ کرتے تھے لیکن تبلیغ حکومت کے فرائض میں شامل نہ تھی۔ نہ حکومت کی طرف سے اِس کام کے لئے روپیہ دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرت کو پسند کر کے یا اُن کے عمدہ مذہبی اصولوں کو بہتر سمجھ کر اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ خود ہندوؤں میں زمانۂ حال کی طرح اُس زمانہ میں تبلیغ مذہب کا طریقہ رائج نہ تھا۔ ورنہ اُس کی یقیناً ممانعت نہ ہوتی۔ اور جس طرح عہدِ قدیم میں اسلامی حکومت سے پہلے ہندو راجاؤں نے اپنی اپنی مملکتوں میں عرب کے مبلغ مذہب تاجروں کو مسجدیں بنانے اور تبلیغ اسلام کی اجازت دینے میں

پس وپیش نہ کیا۔ اسی طرح مسلمان حکمراں ہندوؤں کو اپنا مذہب پھیلانے کی اجازت دیدینے میں مطلق تکلف نہ کرتے۔

اگر روہیلے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بناتے تو آج روہیلکھنڈ میں ہندوؤں کی نہیں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ روہیلکھنڈ کے صدر مقام یعنی خاص ضلع بریلی اور دارالاقامہ پیلی بھیت تک میں ہندوؤں کی آج تک زبردست اکثریت ہے اور تمام ضعیف العمر ہندو اپنے تجربہ سے اور اپنے اسلاف کے اقوال سے یہی بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اور انھوں نے کبھی ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔

مذہبی آزادی کے علاوہ ہندوؤں کو زراعت و تجارت میں بھی گراں قدر مراعات و حقوق حاصل تھے۔ بلکہ مسلمان تو بالعموم فوجی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ زراعت و تجارت تمام و کمال ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوؤں کی بعض قومیں مثل کھتری، ٹھاکر اور راجپوت فوج میں نوکری کرتے تھے۔ وثیقہ خزانچی کے عہدوں کے لئے موزوں سمجھے جاتے تھے۔ اور کایستھ اہلِ قلم ہونے کے باعث حکومت کے تمام دفاتر میں ملازم تھے۔ سفارت کے اہم اور نازک فرائض بھی بالعموم ہندو معتمدین کے سپرد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ الملک نے منشی ٹیک چند اور منشی چتربھوج کو بارہا بڑی بڑی اہم سفارتوں پر بادشاہ دہلی۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ شجاع الدولہ اور انگریزوں کے پاس روانہ کیا۔

دیوان کا عہدہ جو مدار المہام یا وزیراعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا۔ پہلے راجہ مان رائے حافظ الملک کے دیوان رہے۔ اور ان کے بعد رائے پہاڑ سنگھ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے جن کی جاگیر میں کم و بیش ۲۶۰ گاؤں تھے۔ ان لوگوں کے حافظ الملک سے نہ صرف برادرانہ اور عزیزدارانہ تعلقات تھے بلکہ یہ لوگ اُن کے جملہ مالی و ملکی معاملات میں سیاہ و سپید کے مالک اور غیر معمولی اختیارات کے حامل تھے۔ حافظ الملک کی مجلس مشاورت جس میں اہم معاملات طے پاتے تھے اُس میں ہندو اعیان دولت بھی شریک ہوتے تھے جن کی موجودگی کے بغیر بالعموم کوئی مجلس انعقاد پذیر نہ ہوتی تھی۔ اور اُن کی رائے کو بڑی وقعت دیجاتی تھی۔

حافظ الملک کی نظر میں اللہ کی تمام مخلوق یکساں طور پر عزیز تھی۔ جب وہ بذل و احسان کرتے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون ہندو اور کون مسلمان ہے۔ شہر پناہ پیلی بھیت کی تعمیر کا واقعہ لکھا جاچکا ہے۔ میواتیوں اور مارواڑیوں کے واسطے جن میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو تھے محض وجہ معاش

مہیا کرنے کے لئے انھوں نے کس طرح ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اسی طرح ۱۷۶۶ء میں آتش زدگی اور زلزلہ سے شہر بریلی پر تباہی آئی تو انھوں نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا وہی ہندوؤں کے ساتھ کیا۔ ایک اور واقعہ ہے کہ حافظ الملک جب صاحبزادہ ارادت خاں کی شادی کرکے شاہجہانپور سے لوٹ رہے تھے تو پہلی منزل پر کسی رسالدار کا ایک ہندو ملازم کارپردازانِ رسد کے پاس آیا اور اُس نے بیس سیر آٹا اور بیس سیر گھی طلب کیا۔ کارپردازوں نے اُس سے دریافت کیا کہ تم تنہا ہو یا تمہارے ہمراہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم کس امیر کے ملازم ہو اور کیا کام کرتے ہو۔ اُس ہندو نے اپنے رسالدار کا نام بتایا اور کہا کہ میرے ساتھ دس اور آدمی ہیں اور یہ گھی رسالدار صاحب کے گھوڑوں کے واسطے لئے جاتا ہوں۔ میں خود رسالدار کے کہاروں میں ملازم ہوں۔ اتفاقاً جس رسالدار کا نام لیا گیا اُس کے ملازم اسی وقت تمام اشیاء مطلوبہ لیجا چکے تھے۔ لہٰذا کارپردازوں کے دل میں شک پیدا ہوا اور انھوں نے تحقیق احوال کے لئے ایک شخص کو اُس رسالدار کے پاس بھیجا۔ تحقیق کے بعد اُس ہندو ملازم کا جھوٹ اور فریب کھُل گیا۔ چنانچہ اُس کو فوراً پکڑ کر حافظ الملک کے حضور میں لے گئے اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حافظ الملک نے حکم دیا کہ اس شخص کو پچیس سیر آٹا اور پچیس سیر گھی دیا جائے اور فرمایا کہ:-

"اس قسم کی تحقیقات سے جو غریب لوگوں کے واسطے موجبِ خجالت ہوتی ہے آیندہ پرہیز کیا جائے۔"

حافظ الملک کی اسی رحمدلی۔ بیدار مغزی۔ روشن خیالی۔ بےتعصبی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ انکی ہندو رعایا نے بھی اپنے قابل احترام آقا کے لئے وفاداری کی مثال قائم کر دی۔ جس وقت تمام مسلمان عزیز و اقارب اور سرداروں نے حافظ الملک کی جان بچانے کے لئے روپیہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا اُس وقت دیوان پہاڑ سنگھ کا چالیس لاکھ روپیہ کا پیشکش کرنا اور جب سخت بےسروسامانی میں حافظ الملک نے وطن عزیز کی خاطر جنگ آزادی کے لئے علمِ جہاد بلند کیا اُس وقت جوق جوق راجپوتوں کا آکر شریکِ حال ہونا ایسے واقعات نہیں ہیں جن کو دُنیا جلد فراموش کر سکے گی۔ ایسے واقعات ہیں جن کو تاریخ عالم میں ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جائے گا۔

سیرچشمی حافظ الملک کی ایک مشہور و معروف صفت سیرچشمی تھی، جس نے اُن کی شخصیت کو اپنے ہمعصر حکمرانوں میں بہت ممتاز کر دیا تھا۔ عام ملکی واقعات میں دوسروں کی خاطر انھوں نے ایثار و قربانی اور سیرچشمی کی جو عدیم النظیر مثالیں قائم کیں ان کے دوبارہ اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ روزمرہ کے نجی معاملات میں اُن کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی امیر یا فقیر اگر اپنی بڑی سے بڑی خواہش و ضرورت کو

اُن کے سامنے پیش کرتا تو سوائے حرفِ قبول دوسرا کلمہ زبان سے نہ سُنتا۔ ساتھ ہی لوگوں کی آرزوئیں پوری کرنے کے بعد اُن کی یہ عادت تھی کہ حد درجہ عذر خواہی کرتے اور جس پر احسان کرتے اُس کا اِس قدر احسان مانتے گویا کہ خود ان پر احسان کیا گیا ہے۔

اپنے یہاں کی تقریبات میں ایسی اولوالعزمی اور سیر چشمی کا ثبوت دیتے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ بالخصوص لڑکوں کی شادیوں میں تمام ہندو مسلمان غریب و امیر اہلِ شہر کی دعوت کرتے اور جملہ سرداروں اور اہلِ سپاہ اور اُن کے ملازموں کو جن کی تعداد اکثر ایک لاکھ تک ہو جایا کرتی تھی۔ ایک ایک مہینہ مہمان رکھتے تھے۔ اور اتنے کثیر آدمیوں کی اس طویل مہمانداری کے لئے اِس قدر سامانِ خورد نوش فراہم کرتے کہ صرف ہو جانے کے بعد بھی باقی بچ رہا کرتا تھا۔ مثلاً صاحبزادہ ارادت خاں کی شادی میں تقریباً ایک لاکھ براتیوں کے ساتھ شاہجہاں پور سے برات رخصت کرا کر واپس ہوئے اور پیلی بھیت کے قریب پہنچے تو کارپردازانِ مطبخ سرکاری نے عرض کیا کہ سامان خورد و نوش میں جو ضیافت لشکر کے واسطے ہمراہ تھا اُس میں سے بہت زیادہ اشیا باقی بچ رہی ہیں، پیلی بھیت میں جو سامان مہیا ہے وہ اِس کے علاوہ ہے۔ حافظ الملک نے حکم دیا کہ :-

"کل جب ہم پیلی بھیت میں داخل ہوں تو باقی ماندہ سامان کو اکٹھا کر کے ہمیں دکھانا"

بموجب حکم تعمیل کی گئی۔ اور دوسرے روز صبح کے وقت حافظ الملک سوار ہو کر اُس جگہ جہاں سامان جمع تھا تشریف لے گئے۔ سامان مذکور کو ملاحظہ فرما کر اہلِ لشکر اور شہر میں منادی کرا دی کہ :-

"ان ذخائر میں سے جس شخص کو جس قدر سامان درکار ہو لے جائے۔"

تمام اہلِ شہر و لشکر کے انبوہ در انبوہ ٹڈی دل کی طرح جملہ سامان پر ٹوٹ پڑے۔ تمام دن لوٹ جاری رہی۔ لیکن پھر بھی شام کو وقت پانچ ہزار بھیڑ بکریاں۔ کئی سو من آٹا اور اسی تناسب سے چاول۔ دال۔ گھی۔ شکر۔ اور نمک۔ مسالہ وغیرہ بچ رہا۔ لوگ لوٹتے لوٹتے تھک گئے۔ مگر سامان ختم نہ ہوا۔

شادیوں کے موقع پر محل خاص کی بیگمات کی مجالس بالعموم نصف شب تک رہا کرتی تھیں اس کے بعد جب بیگمات وہاں سے اُٹھ کر آرام کرتی تھیں تو خادمات فرش اُٹھا کر تقسیم سے بچی ہوئی الائچی اور سپاری وغیرہ جمع کر لیتی تھیں۔ اور یہ سامان اس کثرت سے اُن کے پاس جمع ہو جاتا تھا کہ اُس کو فروخت کر کے اُس کی قیمت سے پختہ عمارتیں اور طلائی زیورات تیار کرا لیا کرتی تھیں۔

حافظ الملک کی سیر چشمی اور اُن کے زمانِ سعادت اقتران کے دراصل یہی وہ فوائد تھے جنھوں نے مخلوق کے دلوں میں اُن کی یاد کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

مسٹر الیٹ حافظ الملک کی شہادت کے چالیس سال بعد بریلی میں کچھ عرصہ قیام کرکے لکھتے ہیں کہ:

"یہاں حافظ رحمت خاں کو لوگ انتہائی عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔"

زندۂ جاوید گشت ہر کہ نکو نام زیست
کز عقبش ذکرِ خیر زندہ کند نام را

شجاعت و شہامت

معرکہ ہائے حرب و میدانِ کارزار میں حافظ الملک سے جو شجاعت و شہامت ظہور میں آتی تھی اس کا مختلف لڑائیوں کے بیان میں بالتفصیل ذکر آچکا ہے۔ حافظ الملک کی دلیری و مردانگی ضرب المثل تھی اور وہ اپنے زمانہ میں ہندوستان کے سب سے زیادہ بہادر خیال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مستند حکایت ہے کہ سرہند کے معرکوں میں جب اُن سے غیر معمولی بہادری ظہور پذیر ہوئی تو جہان خاں مالیری نے جو رستم پنجاب کے لقب سے مشہور تھا اپنی تلوار کمر سے کھول کر حافظ الملک کے سامنے رکھدی اور عرض کیا کہ:۔

"میں نے اِس وقت تک اِس مرتبہ کی شجاعت کسی شخص میں نہیں دیکھی پس اپنے ہاتھ سے میری کمر سے تلوار باندھ دیجئے تاکہ آپ کے دست مبارک کی برکت سے میں بھی شجاعت کے اس درجے کو پہنچوں جس سے آپ ممتاز ہیں۔"[۱]

ایک اور معتبر حکایت ہے کہ ایک مرتبہ حافظ الملک بریلی سے پیلی بھیت تشریف لئے جاتے تھے چند مخصوص اہلِ صحبت اور کچھ اہلِ فوج بھی ہمراہ تھے۔ اتفاقیہ سرکاری ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی جو سرکشی اور بدمستی میں اپنا نظیر و ثانی نہیں رکھتا تھا اور بہت سے فیل بانوں اور دوسرے لوگوں کو ہلاک کرچکا تھا کسی گاؤں سے پیلی بھیت کو آرہا تھا، دریائے دیوہا کے کنارے حافظ الملک کی سواری سے اس کا مقابلہ ہوگیا۔ فیل بان نے بہت ہوشیاری سے اس کو سواری خاص سے ایک تیر کے فاصلہ پر کرلیا اور پیچھے پیچھے چلنے دیا۔ اس حال میں تھوڑا ہی راستہ طے ہونے پایا تھا کہ ہاتھی مذکور نے سرکشی پر آمادہ ہوکر بدخوئی اور سرتابی شروع کردی اور حافظ الملک کی سواری کی طرف رُخ کیا۔ فیل بان نے ہرچند چاہا کہ اس کا منھ کسی اور طرف پھیر دے مگر نہ پھیر سکا اور وہ بدمست آنکس کے بکثرت زخم کھاکر بھی اپنی کجروی سے باز نہ آیا۔ مجبوراً فیل بان نے چلاکر آواز دی کہ یہ دیو صفت بدخصلت میرے قبضہ و اختیار میں نہیں رہا ہے سب لوگوں کو اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس آواز کو سنتے ہی حافظ الملک کے تمام ساتھی پیادے اور سوار اس کو دوڑتا ہوا دیکھکر جس کا جدھر کو منھ اُٹھا فرار ہوگئے۔ پالکی خاص

---

[۱] گل رحمت۔

کے کہار بھی پالکی لے کر بعجلت تمام ایک طرف کو روانہ ہوگئے۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ہاتھی پالکی کے قریب آگیا۔ اور کہار لوگ بھی پالکی کو زمین پر رکھ کر بھاگ گئے۔ اس حال کو مشاہدہ کرکے حافظ الملک جواب تک بہت اطمینان اور سکون سے پالکی کے اندر تشریف فرما تھے۔ نہایت تمکین و وقار کے ساتھ پالکی سے برآمد ہوئے۔ بڑا اصفہانی چھرا ہاتھ میں تھا جس کا قبضہ مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔ ایک پاؤں پالکی میں اور ایک پاؤں باہر زمین پر جما کر نیم قد سینہ ابھار کر کھڑے ہوگئے تاکہ ہاتھی حملہ کرے اور وہ اس کے سر سے بھیجا نکال لیں۔

ادھر وہ فیل مست پالکی سے چار پانچ گز کے فاصلہ پر آکر ٹھہر گیا۔ ایک دو منٹ حافظ الملک کو غور سے دیکھا، پھر منھ پھیر کر کسی دوسری طرف کو چنگھاڑیں مارتا ہوا بھاگ گیا۔

اس عرصہ میں حافظ الملک بڑے استقلال کے ساتھ تنہا اُسی شان سے نیم قد کھڑے رہے۔ اُس موقع پر صرف یار محمد خاں خٹک حافظ الملک کے پاس اس طرح ٹھہرا رہا کہ اُس کے اور ہاتھی کے درمیان پالکی حائل تھی۔ حافظ الملک نے پہلی بیعت پہنچ کر یار محمد خاں خٹک کو پیادوں کے زمرہ سے نکال کر جمعداری کے منصب پر سرفراز کیا۔ اور ایک گھوڑا خاص عنایت کیا۔

علم و فضل عام مورخ حافظ الملک کی علمی قابلیت کے بارے میں خاموش ہیں۔ "گلستان رحمت" سے ضرور اتنا پتہ چلتا ہے کہ حافظ الملک ذہین و ذکی تھے، طبع رسا رکھتے تھے۔ اور مسائل ضروریہ تقریبًا مدت قلیل میں عبور کلی حاصل کرلیا تھا۔ ایشیائی مورخین کی اسی افسوسناک خاموشی کا نتیجہ ہے کہ بعض یورپین مستشرقین اور محققین نے ان کو سرے سے جاہل مطلق ہی سمجھ لیا۔ اور جب ہیسٹنگز پر انگلستان واپس ہونے کے بعد اس کے ہندوستانی مظالم کی بنا پر پارلیمنٹ میں مسٹر برک وغیرہ نے مقدمہ چلوایا تو اُس کے وکیل مسٹر لا نے ہیسٹنگز کی صفائی میں جو تقریر کی اُس کے دوران میں نہ صرف حافظ صاحب کی شاعری سے انکار کیا بلکہ اُن کو جاہل مطلق ثابت کرنے میں کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اور اُن کو شاعر ماننے والوں کے دعوے کی یہ کہکر تغلیط کی کہ حافظ رحمت خاں سے جو اشعار منسوب کئے جاتے ہیں وہ اُن کے نہیں بلکہ حافظ شیرازی کے ہوں گے۔ مسٹر لا فرماتے ہیں کہ:۔

"حافظ رحمت خاں پر مظالم کا خاص طور پر اظہار افسوس کیا گیا ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ کوئی خاندانی شاہزادہ تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بہت بڑا بہادر تھا۔ اپنے میں سپاہیانہ صفات رکھتا تھا اور شاعر تھا۔ میں نے حال ہی میں اس موضوع پر ایک دلچسپ رسالہ پڑھا ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ تمام مشرق میں نہ صرف اپنی بہادری بلکہ اپنی پاکیزہ شاعری کے لئے بھی مشہور تھا۔ حافظ شیرازی ضرور ایک بہت بڑا شاعر تھا۔ لیکن یہ شخص حافظ رحمت خاں

شاعر تو شاعر اگر وہ ملخنامہ (شاہ آباد) پر دستخط کرتا تو مجھے شبہ ہوتا کہ آیا اُس کو اپنا نشان انگوٹھا بھی لگانا آتا تھا یا نہیں۔"

اسی طرح حافظ الملک کے 'حافظ' ہونے میں مسٹر لا نے اپنا شبہ ظاہر کیا ہے کہتے ہیں:۔

" وہ حافظ اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ اُن کو نواب علی محمد خاں نے اپنے لڑکوں کا محافظ (گارجین) مقرر کیا تھا۔"

حافظ الملک کے حافظ قرآن ہونے سے انکار کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، وہ صرف بر لئے نام حافظ نہ تھے بلکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ہر سال ماہ صیام میں تراویح میں کلام مجید سُناتے تھے۔ اب ہی اُن کی شاعری کی بحث اس کے متعلق برک جیسے محقق کے اس فرمانے پر کہ:۔

" روہیلوں کا وہ مقتدر سردار ...... جس نے اپنی ادبی تصنیفات اور لطیف شاعری سے حافظ کا نام زندہ کیا۔"

مسٹر لا کا یہ کہنا کہ 'حافظ رحمت خاں شاعر نہ تھے بلکہ شاعر حافظ شیرازی تھے' ایک مضحکہ خیز نظریہ ہے حافظ شیرازی کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے اور اُن کا کلام اس قدر مشہور و معروف ہے اور اُن کا ایک ایسا مخصوص رنگ ہے کہ کوئی معمولی عقل و فہم کا شخص بھی اُس کو کسی اور کا کلام نہیں کہہ سکتا۔ حافظ الملک کا زمانہ اٹھارویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے اور جس قدر ان حافظین کے عہد میں تفاوت ہے اُسی نسبت سے اُن کے کلام میں بھی امتیاز ہونا لازمی ہے۔ افسوس کہ ہمیں حافظ الملک کا کچھ کلام دستیاب نہ ہوا۔ ورنہ ہم چودھویں صدی اور اٹھارویں صدی کے ان ہر دو شاعروں کے کلام کا موازنہ کر کے مسٹر لا کی عقل سلیم کی داد دیتے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے کہ حافظ الملک پشتو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔

سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب "ہیسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار" میں 'حافظ رحمت بحیثیت ایک شاعر کے' ایک باب لکھا ہے جس میں مذکور ہے کہ:۔

" ایم ڈارمس ٹیٹر اپنے رامپور جانے کی کیفیت اس طرح بیان کرتا تھا کہ جب وہ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو اُس کو ایک روہیلے نے حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلا سرداروں کا ایک قلمی مجموعۂ کلام دیا۔ یہ مجموعہ جو اُس کو رامپور میں دیا گیا اور جو اب برٹش عجائب خانہ کے مشرقی نوشتجات میں محفوظ ہے اُس میں بہت سے دوسرے افغان سرداروں کی غزلیات کے علاوہ پشتو زبان کی ایک نظم حافظ رحمت خاں کی بھی ہے جس کا مضمون پٹھانوں اور مغلوں کی موروثی عداوت ہے۔ یہ شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ

یہ حافظ رحمت خاں ہی کی تصنیف ہے۔ . . . . اس نظم کے علاوہ ایم۔ ڈی۔ اس ڈیٹر نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ :-

"گو حافظ رحمت خاں کا دیوان میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا لیکن تعلیم یافتہ افغانوں میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ وہ ایک دیوان چھوڑ مرے تھے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دیوان اب بھی ہندوستان میں ہوگا لیکن خود مجھے نہ مل سکا۔ رام پور اور بریلی میں تو اب اس کے وجود تک کا لوگوں کو علم نہیں ہے۔"

سر جان اسٹریچی لکھتے ہیں کہ :-

"بہرحال جب یہ کتاب پریس میں جارہی تھی تو مجھے ہندوستان سے چار فارسی کی غزلیں موصول ہوئیں جن کی بابت یہ لکھا گیا تھا کہ وہ حافظ رحمت خاں کی ہیں۔ بحالتِ موجودہ میں اس بیان کی صحت و عدم صحت کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن وہ لوگ جن کی رائے اس بارے میں بہت وقعت رکھتی ہے کہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے یہ غزلیں ضائع شدہ دیوان کا ایک جزو ہوں۔"

ان تاریخی شہادتوں سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ حافظ صاحب صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ خود جس شخص کا یہ قول ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہو کہ :-

"ایک سردار یا سپاہی کی شہرت اُس وقت تک نامکمل رہتی ہے جب تک وہ صاحبِ دیوان نہو۔"

تو پھر یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ اُنھوں نے اپنا دیوان نہ چھوڑا ہو۔ حافظ الملک نے جو زمانہ پایا تھا اُس عہد کی یہ خصوصیت تھی کہ اُس زمانہ کے اہلِ سیف اہلِ قلم بھی ہوتے تھے اور اُن کا قلم نہ صرف ملکی و مالی گتھیوں کے سلجھانے کے لئے وقف ہوتا تھا بلکہ علم و ادب کے نکات (شاعری کو جس سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا) حل کرنے میں بھی ید طولےٰ رکھتے تھے۔

ہر شخص جس کو علم تاریخ سے تھوڑا سا لگاؤ ہے جانتا ہے کہ احمد شاہ دُرّانی جیسا بہادر شاعری کا بھی مردِ میدان تھا اور صاحبِ دیوان تھا۔ اُس کے اکثر جانشین بھی شاعر تھے۔ جن میں شاہ شجاع کا نام زیادہ مشہور ہے۔

سر جان اسٹریچی حافظ الملک کے اہلِ ذوق اور اہلِ علم ہونے پر مزید روشنی اس طرح ڈالتے ہیں کہ :-

"حافظ رحمت خاں کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب تھا جس کو ان کی شکست و شہادت کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ لے گئے اور جو بعد کو شاہانِ اودھ کے شاہی کتب خانہ کی زینت بنا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اُن کتابوں کی فہرست مُرتب کی تھی جس کی ایک جلد ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔"

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "مجھے اسلحہ خانے میں چالیس صندوق خراب و خستہ حالت میں رکھے ہوئے ملے اُن میں حافظ رحمت خاں کا تمام علمی خزانہ موجود تھا۔ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض پشتو کی

تصنیف تھیں جو بڑی کاوشس کے ساتھ بکمال حسن وخوبی بہادر اور صاحب علم وفضل روہیلہ سردار کے لئے لکھی گئی تھیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لکھنؤ کا کتب خانہ لٹ لٹا کر برباد ہوگیا۔ لیکن پھر بھی کافی تعداد میں اُس کی کتابیں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہی ہیں۔"

حافظ الملک کی کتابوں میں ایک کتاب مسمّٰے بہ 'خلاصۃ الانساب' ہے جو مؤلف اوراق ہذا کو بڑی کوشش سے دستیاب ہوئی۔ اِس کتاب میں مصنف نے اپنے بزرگوں کے نام ونسب وغیرہ کے تفصیلی حالات تحقیق کرکے لکھے ہیں۔

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں بھی محفوظ ہے۔ ایک اور کتاب موسوم بہ 'تواریخ رحمت خانی' ہے جس میں یوسف زائیوں کے کابل پر قبضہ کرنے اور ہندوستان آنے کے تاریخی واقعات مفصل اور مشرح طور پر درج ہیں۔ یہ کتاب ابتداً سنہ ۱۶۲۲ء میں پشتو زبان میں لکھی گئی تھی اور اِس کا حافظ الملک نے سنہ ۱۷۷۲ء میں آسان اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ اب یہ کتاب انڈیا آفس لائبریری لندن میں مل سکتی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کی بہت پرانی نقول 'خدابخش لائبریری پٹنہ' اور ہمارے ایک دوست سید عزت علی صاحب کے پاس آگرہ میں موجود ہیں۔

سید الطاف علی بریلوی

ہماری قومی زندگی میں گھریلو صنعتوں کی اہمیت

(از سیّدہ انیس فاطمہ بیگم سیّد الطاف علی بریلوی)

اقتصادی غلامی سیاسی غلامی کی تمہید ہوتی ہے۔ خود ہندوستان میں شاہ جہاں سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے عہد کے معاشی و اقتصادی حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہماری محکومی کی تاریخ اُسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جبکہ انگریزوں نے تجارت کرتے کرتے ہماری ان ملکی صنعتوں کو برباد کرنے کا تہیہ کیا تھا جنھوں نے ایک عرصہ دراز تک خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کی جیبوں کو سیم و زر سے بھرا تھا اور یہ کام انھوں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے انجام دیا کہ ہم جس وقت باخبر ہوئے بلکہ رنگِ محفل ہی بگڑ چکا تھا۔ ع

گویا کہ وہ زمین نہ وہ آسماں ہے اب

ہماری اقتصادی بدحالی اور ملکی مصنوعات کی بربادی نے ہی ایسے اسباب پیدا کر دئے کہ سوداگروں کی جماعت حکومت کے تخت پر بیٹھ گئی۔ اب حکومت اور تجارت ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

مذکورہ بالا حقائق بادی النظر میں قابلِ وقعت ہوں یا نہ ہوں لیکن ہندوستان کے دو مفکر مولانا سیّد طفیل احمد صاحب مرحوم اور گاندھی جی نے اِس نکتہ کو سمجھا اور یہ بات عوام کے ذہن نشین کرائی کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے باوجود اپنے محدود ذرائع کے گھریلو صنعتوں کے ذریعہ پہلے اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائی جائے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے رسالہ ”سودمند“ جاری کیا جس کے اجراء کا مقصد یہ تھا کہ اقتصادی و معاشی مسئلوں سے عوام کو دلچسپی پیدا ہو۔ اس رسالہ کے کئی کالم قدیم گھریلو صنعتوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے وقف ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ مولانا نے علی گڑھ مسلم ہائی اسکول قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک صنعتی اسکول بھی کھولا جس میں کپڑا بُننے، رنگنے، اور چھاپنے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اِس کی تیار شدہ چیزیں استعمال کرنے کے بعد تجربہ سے ثابت ہوا کہ اگر گورنمنٹ اس کی خاطر خواہ مدد کرتی تو وہ صوبہ کا ایک نمونہ کا صنعتی ادارہ ہوتا۔

گاندھی جی اور مولانا کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ مطابقت ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ گاندھی جی صرف چرخے پر زور دیتے ہیں اور مولانا چرخے کے علاوہ دوسری گھریلو صنعتوں کی ترویج بھی چاہتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے گاندھی جی کے لاکھوں عقیدت مند ان کی "چرخہ سنگھ" تحریک سے وابستہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے گھروں میں چرخے کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کا کہ وہ مستحق تھا اور اُس کی ذمہ داری ہم خواتین پر ہے۔ دس فیصدی خوش حال گھرانوں کی ریس میں غریب اور متوسط الحال طبقہ کی خواتین بھی کوئی اُجرت کا کام کرنا اپنی ذلت کا باعث سمجھنے لگی ہیں۔ جس کا اثر نہ صرف اُن کی اقتصادی حالت پر پڑ رہا ہے بلکہ بے کاری سے اُن کی صحت جسمانی بھی دن بدن روبہ انحطاط ہو رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایامِ جنگ میں دوسری ضروریاتِ زندگی کے مقابلہ میں کپڑے کا مسئلہ حد درجہ پریشان کن بنا رہا۔ چنانچہ بنگال کی ایک خاتون نے اخباری نامہ نگار کو بتایا کہ پورے خاندان کے استعمال کے لئے جو سات آدمیوں پر مشتمل ہے صرف ایک دھوتی ہے جس کو باہر جانا ہوتا ہے وہی باندھ لیتا ہے۔ بقیہ سب لوگ ڈھاک کے پتے لپیٹ کر ستر پوشی کرتے ہیں۔

اُس نامہ نگار کا بیان ہے کہ ڈھاکہ کے ایک پرائمری اسکول میں بچوں سے لیکر اُستاد تک کے پاس بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں تھا۔ عُریانی سے بچنے کے لئے ایک قسم کی بڑے پتوں کی گھاس کو جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ کیا ہم ایک غیر ملکی حکومت کے اس بے دردانہ طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ جو اس نے ہماری گھریلو صنعتوں کے متعلق اختیار کیا تھا اپنی ذات کو اُس سے بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا ناگفتہ بہ صورتِ حال میں ہماری کاہلی کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ زمانہ قدیم کے ہندوستان میں کپڑا بُننے کی صنعت عام رہی ہے۔ مرد کرگھے پر کپڑا بنتے تھے۔ عورتیں اس کو رنگنے، چھاپنے، استری کرنے اور کلف دینے کا کام کرتی تھیں۔ کپڑے لئے سوت بھی

وہی کاتتی تھیں جن خاندانوں میں کپڑا نہیں بنا جاتا تھا اُن گھرانوں کی عورتوں کے بھی یہ چیز فرائض میں شامل تھیں۔ کہ وہ باریک سوت کات کر گھر بھر کی ضرورت کے لائق دریاں، پلنگ پوش اور فردیں تیار کرائیں۔

بغیر سرمایہ اور مشینری کی مدد کے ہر گھر بجائے خود ایک کارخانہ معلوم ہوتا تھا جس میں سب افراد خاندان مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور ہمارے یہ چھوٹے چھوٹے گھریلو کارخانے جس سلیقہ سے اپنا کام کرتے تھے اس کے متعلق ایچ مورکینڈ لکھتے ہیں:۔

"جن سواحل تک ہماری رسائی ہوئی تھی وہاں کی صنعت پارچہ بافی منظم تھی اور ایشیائی منڈیوں کو مال وساور بھیجنے کے لئے اس حد تک ترقی کر چکا تھا کہ فرنگی تاجروں کو اُسی سابقہ دستور اور طریقوں کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا اور اُس سے پارچہ بافوں کو جو نفع پہنچا اُس کا اندازہ اُن کی قیمتوں سے ہو سکتا ہے جو برسر موقع فرنگی خریدار ادا کرتے تھے۔"

اس کے بعد پھر صاحب موصوف ہندوستانی کپڑے کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"انفرادی طور پر ہندوستانی کپڑا بننے والے جیسا جی چاہتا تھا کپڑا بُنتے تھے۔ اور خریدار کو اپنی ضرورت کے لحاظ سے ایک ایک تھان منتخب کرنا پڑتا تھا۔ اس موقع پر سب سے اچھے تھان انگلستان کے لئے چھانٹے گئے تھے۔"

برعکس اس کے اُس زمانہ میں تھوڑا سا موٹا سامان مثلاً دریاں، نواڑ وغیرہ بنانے اور اُس کی پائداری اور خوبصورتی کا انحصار اس پر ہے کہ انگلستان کا سوت میل کے لئے رنگا جائے درآنحالیکہ کبھی ہندوستان میں اس قدر باریک اور عمدہ سوت تیار ہوتا تھا کہ فنچ لکھتا ہے:۔

"سوت جہازوں میں دساور بھیجنے کے لئے نہایت موزوں چیز تھی ۱۶۲۰ء میں گجرات سے ۵۴۵ گٹھے انگریز سوداگروں نے بھیجے تھے ۱۶۴۱ء میں کمپنی نے لکھا کہ وہ کچھ روز سے ہندوستانی تاگے سے سب کام لینے لگے ہیں۔ تاگے کی خرید انتہائی جوش پر تھی تا آنکہ پارچہ بافوں کو خوف ہوا کہ سوت کی اس قدر مقدار دساور جانے سے ان کو نقصان پہنچے گا اور باقاعدہ انگریزوں کے مقاطعہ کا اس طرح انتظام کیا گیا کہ اگر سوت خریدتے ہیں تو کپڑا خریدنے نہ پائیں۔"

بنگال پر کمپنی کا تسلط ہو جانے کے بعد ہر قسم کے حربوں سے تاگے کی صنعت کو نیست و نابود کیا گیا۔ پہلے باریک تاگا کاتنے پر سخت قانونی پابندیاں عائد کی گئیں اور جب اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو کاتنے والوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے۔

اسی طرح چھاپنے اور رنگنے کی صنعت نے حیرت انگیز ترقی کی تھی ایچ مورلینڈ رقمطراز ہیں:۔

"ملبوسات اور اسباب تکلف کی جس میں چھپا ہوا کپڑا چھینٹ، رنگے ہوئے تھان، گل بوٹے اور ریشم کے ساتھ بُنے ہوئے کپڑے بھی شامل تھے۔ ایشیائی بازاروں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔"

چنانچہ مدراس کے ایک نائک نے یہ ذمہ لیا تھا کہ اگر انگریزوں نے رنگ سازوں کو کوئی رقم دینے سے ہمیں آگاہ کر دیا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جو رقم ان کے حساب میں ہوگی وہ خود ہم پوری کریں گے کپڑے کی قسمیں اسقدر تھیں کہ ان پر فن کی واقفیت کے بغیر کوئی بحث نہیں کیجا سکتی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام دنیا کی دولت سمٹ سمٹ کر ہندوستان میں جمع ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۶۳۴ء میں بیٹر بروایک ولندیزی سیاح اپنی سرگزشت میں تحریر کرتا ہے:۔

"جب میں اس ملک میں سفر کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اتنا زیادہ روپیہ کہاں سے آجاتا ہے۔"

ایچ مورلینڈ نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"اس ملک میں سونے کا سکہ چلتا ہے کیونکہ سب قومیں اپنے سکے یہاں لاتی ہیں اور یہ ہندوستان ہی میں گڑ جاتے ہیں اور پھر باہر نہیں جاتے۔"

خیر یہ تو اُس وقت کی حالت تھی جبکہ مغلیہ حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی ہماری صنعتوں کو حاصل تھی۔ لیکن حکومت اور تجارت پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد جبکہ ہمارے یہ نئے آقا کچے مال کی کثیر مقدار باہر لیجا کر ملکی مصنوعات کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ کشمیر کی شال، ڈھاکہ کی ململ۔ بنارس کی زربفت، دریاباد کے لٹھے کی جگہ مانچسٹر اور لنکا شائر کے پارچہ جات کے لئے خالی کرائی جارہی تھی۔ ہم نے اپنی توجہ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں پر مبذول کرکے اپنی اقتصادی خوشحالی کو برقرار رکھا۔ عسرت اور کاہلی کی زندگی کس طرح بسر کی جاتی ہے یہ بات ہمارے وہم و گمان سے بالاتر تھی۔ اس سلسلہ میں چند واقعات کا ذکر کر دینا غالباً بے موقع نہ ہوگا۔ جن میں سے اکثر میرے مشاہدے میں آئے یا خاندان کے بزرگوں سے مجھ تک پہونچے۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں سادات کے سینکڑوں خاندانوں کو دُور دُور سے لاکر اپنے دارالسلطنت بریلی اور اُس کے گردو نواح میں آباد کیا تھا۔ اُن کی خدمت اور محبت کو وہ اپنی دینی اور دُنیوی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ حافظ صاحب کی شہادت اور روہیلوں کی بربادی نے اُن گھرانوں پر بھی مصیبت کے پہاڑ توڑے اور گردش روزگار کے ہاتھوں خوب ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن اس کے باوجود کیریکٹر کی وہ اعلیٰ خصوصیات جو سادات کا ہمیشہ

طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ عرصہ تک قائم رہیں۔ ان ہی ستم زدوں میں کا ایک مفلوک الحال مختصر سا گھرانہ جو تین بیوہ سیدانیوں پر مشتمل تھا ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، ان کی خاموش پر مشقت زندگی محلے کے لوگوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ صبح چار بجے سے چھ بجے تک چکی پر پسائی کا آٹا پیستی تھیں بعد فراغ نماز و کلام پاک آٹھ سے بارہ بجے تک سوت کاتا جاتا۔ پھر سلائی یا کشیدہ کاری کا کام کیا جاتا۔ اس کے بعد اُن کی بوڑھی ماما جو گزرے ہوئے خوشحالی کے زمانہ کی یادگار تھی، ان سب محنتوں کی اُجرت لاتی تھی۔ جس سے کچھ کھانے پینے کا سامان منگوایا جاتا۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی کسی نے نہ جانا کہ اُن کے یہاں صرف ایک وقت کھانا پکتا ہے۔ کیونکہ اہتمام خاص کے ساتھ ایک صاف دیگچی پانی ڈالکر چولھے پر رکھدی جاتی تھی کہ چاول دم ہو رہے ہیں۔

ایک اور سیدانی تھیں، شوہر اور جوان بیٹے کے انتقال کے بعد پانچ آدمیوں کی کفالت کا بار تنہا اُن کی ہمتِ مردانہ کے ذمہ تھا۔ صبح سے لیکر غروب آفتاب تک " سان" پر زیورات اور چوڑیوں کے نگ بنایا کرتی تھیں اور دو ڈھائی روپیہ کی آمدنی میں اچھی خوشحال زندگی بسر ہوتی تھی۔ بہت سے گھروں میں جانوروں کے بالوں کو خوشنما اور گہرے رنگ دیکر چھلے۔ بٹوے۔ چوڑیاں۔ چھلے اور انگوٹھیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔ دو گھنٹہ میں ایک درجن چوڑیاں ہاتھ سے اس قدر صفائی اور خوبصورتی سے بن جاتی تھیں کہ بس دیکھتے رہئے۔ یہ چھوٹی سی گھریلو صنعت سینکڑوں خاندانوں کی روزی کمانے کا واحد ذریعہ تھی۔ لکڑی اور ٹین کے ڈبوں کو معمولی اوزاروں سے تراش کر ایسی کارآمد چیزیں تیار کرلی جاتی تھیں کہ اب سُن کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ٹین کے برتن۔ کھلونے۔ ڈبیاں۔ فری پین۔ لیمپ وغیرہ وغیرہ۔

کھانڈ اور مٹی اور کاغذ کو رنگ دیکر ایسے خوبصورت کھلونے بنائے جاتے تھے کہ لوگ بطور تحفہ ایک دوسرے کو تیوہاروں کے موقع پر دیتے تھے لیکن اس طرح اپنی اقتصادی۔ اخلاقی اور جسمانی برتری کو محفوظ رکھنے کی یہ جدّ وجہد حریفوں کو سخت ناگوار گزری۔ کیونکہ ایک غلام قوم کو یہ حق نہیں کہ وہ مذکورہ بالا خصائل کی حامل ہو۔ اغیار کے نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کو پستی کی جس گہرائی تک پہنچنا چاہئے تھا ہنوز اُس کی تکمیل سب کچھ چھین لینے کے باوجود نہیں ہوئی تھی۔ عوام اپنے دستِ بازو کی محنت سے روزی کماتے تھے اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی یہ خوشحالی ہی تھی جو اُن کو چشم زدن میں بڑی سے بڑی اور منظم بغاوت پر آمادہ کر دیتی تھی۔

چنانچہ اس کے لئے ہماری مہربان گورنمنٹ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ غیر ملکی مصنوعات جن میں انگلستان

کے علاوہ دوسرے ممالک بھی شامل تھے۔ ان کا محصول اس قدر کم کر دیا کہ وہ بہتر سے بہتر ضروریات کی چیزیں کم سے کم داموں پر فروخت کرنے لگے حتیٰ کہ بچوں کے کھلونے تک بڑی تعداد میں باہر سے آنے لگے۔ دوسری طرف خود ہندوستان میں انگریز سرمایہ داروں نے سینکڑوں کارخانے کھول ڈالے۔ جو چیزیں گھروں میں بنائی جاتی تھیں وہ اُن میں بنائی جانے لگیں۔ اس کی تابِ مقاومت ہم کس طرح لا سکتے تھے آخر ہار ماننے ہی بن پڑی۔ مالی بدحالی نے جملہ عیوب و نقائص پیدا کر دئے۔ کاہلی، مفسدہ پن، بیکاری، سستی ہماری فطرتِ ثانیہ بن گئیں۔ ہاں ایک دروازہ ہم پر البتہ کھلا رہنے دیا اور وہ گداگری کا پیشہ تھا چنانچہ اسی کو اختیار کیا گیا۔ ہماری انتہاپسند طبیعتوں نے یہاں پر بھی حد کمال پر پہونچ کر دم لیا اور اس میدان میں فکر رسا نے وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ ہندوستانی جوگیوں کے کمالات سارے جہان میں مشہور ہیں۔

قبروں کی باقاعدہ پرستش یا تجارت شروع کی گئی۔ جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے ذریعہ سے سورج کو مشرق کی بجائے مغرب سے نکالنے کے دعوے کئے گئے۔ مجذوب بن کر غیب داں بنے۔ دوسروں کو خدا سے لاکھوں روپئے دلانے کے لئے خود ایک ایک دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔

یہ سب کام تو اونچی سمجھ کے لوگوں کا تھا، عام لوگوں نے ڈھٹائی سے خالص بھیک ہی کو ذریعہ معاش بنانا۔ بڑے سے بڑے شہر اور چھوٹے سے چھوٹے دُور اُفتادہ گاؤں میں چلے جائیے ناممکن ہے کہ زہرہ گداز مناظر سے آنکھیں بچائی جاسکیں۔ عورتیں۔ بچے۔ مرد کچھ ان میں تندرست اور بقیہ کئی متعدی مرض میں مبتلا اور اپنے گلے سڑے ہوئے اعضا، کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملیں گے۔ سینکڑوں نابینا کشتی حیات کو لاٹھی کے بل پر کھیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اُن میں سے ایک نہیں ان گنت کھال اور ہڈیوں کے ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ہماری شاہراہوں سے کریہہ مناظر ختم ہی نہیں ہوتے۔ ایک ختم ہوگا تو اس کے بعد اُس کی اولاد جگہ لے گی۔ کیونکہ امراض متعدیہ اور غربت کا ورثہ ہندوستان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

ہندوستان کے قحطوں اور گرانی کا سبب بڑھتی ہوئی آبادی کو قرار دیا جاتا ہے۔ جو شرارت آمیز پروپیگنڈا ہے۔ تاکہ سول سروس کی بڑی بڑی تنخواہوں، انگریز سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی بے جا نفع اندوزی سے ملک میں جو ہولناک تباہی آئی ہے اور مخلوق کنگال

ہوئی ہے۔ اُس پر پردہ پڑا رہے -

متذکرہ بالا ناگفتہ بہ صورتِ حال کا جلد از جلد خاتمہ کرنا ہماری صوبائی حکومتوں اور نئی سنٹرل گورنمنٹ کا پہلا فرض ہونا چاہئے۔ غیر ملکی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کئے جائیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں حکومت کی زیرِ نگرانی گھریلو مصنوعات کو از سرِ نو فروغ دیا جائے۔ حکومت کچا مال دے کر کاریگروں سے مال تیار کرائے۔ نیز امداد باہمی کے اصول پر قسطوں پر چھوٹی چھوٹی مشینیں لوگوں کو دی جائیں۔ تمام کارخانوں اور ملوں کو قومی ملکیت بنا دیا جائے تاکہ غیر ملکی اور ہندوستانی سرمایہ داروں سے عوام کو نجات ملے۔ ورنہ واضح رہے کہ ملک تیزی کے ساتھ دہریت اور کمیونزم کی طرف جا رہا ہے۔ اور اگلے الیکشن کے نتائج کانگرس اور مسلم لیگ کے حق میں وہ نہ ہوں گے جو حالیہ انتخاب میں رہے ہیں۔

سیّدہ انیس فاطمہ

تبصرے!

از جناب مولوی امیر الدین صاحب قدوائی

عرفانِ عزیزؒ کا دوسرا ایڈیشن
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ قیمت ...

کوئی بیس برس ہوئے ہوں گے کہ عزیزی جلیل قدوائی صاحب نے کلامِ عزیزؒ کو متعارف عوام کرانے کا خیال فرمایا تھا، لیکن ہر کام کے لئے ایک وقت ہے اور ہر آدمی کے لئے ایک کام۔ بارے یہ سعادت برادرم قبلہ سیّد حصلت حسین صاحب صابری ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے حصہ میں آئی اور ———

حق بہ حقدار رسید

عزیزؒ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ اہلِ دل، صاحبِ علم، ذی شعور، اور پختہ کار، اگر وہ صفی پور میں نہ ہوتے تو اُن کے شعور و صلاحیت کو یہ جلا نہ ملتی جو روحانیت کے ہی بیدار ہونے سے ممکن ہے اور اگر وہ لکھنؤ ورامپور وغیرہ میں ہوتے تو اُن کا کلام یوں "تہہِ دریا" نہ رہتا۔ بقولؔ ؎

ہر لفظ بہ ہر بحر پُر از گوہرِ معنی

دیوانِ عزیزؒ است کتابِ تہہِ دریا

اِن کے مُریدوں نے اس سے قبل بھی ان کی تصانیف شائع کرائیں لیکن صابری صاحب کی بات ہی اور ہے

اگرچہ صدق دریں جا بہائی دارد

من آں متاعِ فروشم کہ بے بہا باشد

اپنے وجدانی احساس سے ایک انتخاب انہوں نے مرتب فرما کر ڈرتے ڈرتے شائع کیا اور جب تمام کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں تو اس مرتبہ ذرا دلیری کے ساتھ ابرار فاروقی صاحب کی ترغیب سے خود سامنے آئے۔ ؏

برافگندی نقاب از رُخ، مبارک جلوہ آرائی!

پہلے اڈیشن کا دیباچہ ڈاکٹر لیث نے لکھا تھا اس مرتبہ خود سیّد صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ کتاب ۹۴ صفحوں سے بڑھ کر ۱۳۸ ہو گئی ہے لیکن داموں میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے۔ لکھائی، چھپائی، جلد، گرد پوش سب دیدہ زیب اور باسلیقہ ہیں۔ سیّد الطاف علی صاحب سلرانی "مصنف حیرتی" کے لئے اس باب میں بھی قابلِ مبارکباد ہیں۔ "مبارک میکشوں کو یک حریفِ بزمِ رندانہ"

بعض اشعار اتفاقی احساسات پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے اُن سے قطع نظر ضروری ہے۔ مثلاً

"جو امد ہے وہی احمد ہے یہی ہے ایمان" "عزیز" کا دین نہ تھا صرف ایک غزل تھی جو گزر گئی اور وہ اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ پر تادمِ آخر قایم رہے۔

امید ہے کہ سید صاحب سرکاری خدمات سے سبکدوشی کے بعد جب علم و ادب کی اس اہم خدمت پر پوری توجہ کے لئے "خالی" ہوں گے تو کلامِ عزیز کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں عالمِ عرفان کے منازلِ ارتقائی اور نظریاتِ خصوصی کی کہانی موصوف کی زبانی خود ان کے کلام بلاغت التزام سے مدون و مرتب فرمائیں گے جو عزیز کا صحیح تعارف ہوگا اور اُن کی عظمتِ فکر کا حقیقی اعتراف۔

عزیز کا اردو کلام اسی قدر بلند پایہ ہے جس قدر فارسی۔ ان کی نثر میں وہ سلاست ہے جو ان کے ہمعصروں کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کی نظر وسیع، فکر پختہ اور تحریر ایسی برجستہ ہے کہ اپنے زمانہ کے تمام شعرا و ادبا میں وہ بے تکلف ممتاز نظر آتے ہیں۔ غالب اور امیر ان کے معترف تھے اور دورِ آخر میں ان کا دم صبح کے ستارے سے زیادہ غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

زندگی درویشانہ تھی جس میں محمدی رنگ غالب تھا بلکہ فدائے محمد صلعم تھے۔ "رو کے لکھتا ہوں تری نعت خبر ہے تجھ کو" انھوں نے سچ کہا ہے۔ اللہ کے محبوب کا نام نہیں لے سکتے تھے بغیر بیتاب ہوئے اور ان کے مریدوں میں اکثر کو یہ فیض ان سے پہنچا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

چونکہ "انتخاب" صاحبِ کلام سے زیادہ خود ناشر کے مرتبہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے "عرفانِ عزیز"، سید خصلت حسین صاحب کا بھی بے نقاب تعارف ہے۔ ان کی ناقص فہمی، ان کی نیاز مندی، ان کی اپنے مرشد سے عقیدت اور ادبی صلاحیتیں، ہونیوالی فرصت میں ہر طرح سے جلوہ گر ہو کر مفید سے مفید تر ہو سکتی ہیں۔۔۔ "خدا وہ دن کرے جب وہ بھی فارغ ہو لے اور یہ بھی"

مقالاتِ شروانی | کتاب "مقالاتِ شروانی" ایک چمنستانِ بوقلموں ہے۔۔۔ یا عنایت رنگ و بو۔۔۔۔ بہار بداماں اور جانِ بہار۔۔۔۔ اپنے حسن آفریں کے سلیقہ کی آئینہ دار۔۔۔ اور فکری صلاحیتوں اور ادبی شعور کے ارتقا کا بے تکلف مرقع۔ جس کی تیاری میں وادیٔ طلسماتِ ادب کے بہترین نمونے اور منزل بہ منزل مسافرت کے تحائف و تاثرات کسی دوسرے مصنف کی ساٹھ سالہ کاوشوں کا کوئی مجموعہ اس عہد میں شائع نہیں ہوا کہ جو ایسا جامع اور قابلِ قدر ہو۔ اس کتاب کی بڑی خوبی اس کے مضامین کی بے ترتیبی ہے۔ ہر مضمون بجائے خود ایک مدیقہ ہے۔ کیا بلحاظ نقد و نظر اور کیا بلحاظ شوخیٔ بیان و عذر، جس کی دلاویزیوں میں پڑھنے والا محو

ہوجاتا ہے اور دل و دماغ کاوشِ تحقیق اور اسالیب نگارش سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ بلاشبہ "کمالِ بلاغت اس میں ہے کہ واقعات کے بیان میں جوہر بلاغت نمایاں ہو۔"

مقالاتِ شروانی پر کچھ لکھنے کا واقعی حق تو "حبیب مکرم کے حبیب" کو ہی جو سخن شناسی اور سخنوری میں "بے خطا" اور صاحبِ مقالات کے قدر دانوں میں تقریباً بے ہمتا ہیں۔ اور بہ توثیق کاروانِ خیال، غبارِ خاطر "حریفِ" مخلص ہیں ـــــ گو بادیہا اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے یقیناً قاصر۔

مقالات کی نوعیت بنیاداً ایک ہی:۔ واقعہ نگاری . . . . اور صفتِ واحد بلاغت۔ واقعات جو قلمبند ہوئے ہیں اُن کی خصوصیت اہتمامِ صداقت ہے اور مبالغہ سے احتراز۔ فی الاصل موجباتِ بلاغت میں سی "حق" سب سے زیادہ اہم ہی جسے سنسکرت میں "لست" کہتے ہیں۔ اور قدیم ہندی ادب کے لوازم میں اس کا مرتبہ بہت زیادہ ہی۔ اہلِ چین باوجود ذوقِ استعارات کے اس باب میں بہت زیادہ محتاط رہے ہیں اور ان کی بلند پایہ ادبی تصنیفات میں اس کا خاص اہتمام پایا جاتا ہے حتیٰ کہ ہر چیز کے نام کو وہ خود اپنی زبان میں لکھنے کیلئے خصوصیت کے ساتھ اسی طرح ممتاز ہیں جس طرح انگریز اسے بگاڑ دینے اور ہندوستانی اسے دوسری زبان سی بعینہٖ اختیار کر لینے کے لئے۔ اُردو زبان کی اس گیرائی نے اس کے ادب میں کافی وسعت کی صورتیں فراہم کی ہیں۔ اور صاحبِ مقالات نے بھی بے تکلف انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن جو بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ کوئی لفظ زائد از کار کہیں استعمال نہیں ہوا ہے اور جہاں بھی کوئی استعمال ہوا گویا نگینہ ہی جو کسی ماہر جوہری نے ایسی جگہ نصب کر دیا ہی کہ اس کی آب و تاب محض اس جڑائی سے دوبالا ہو گئی ہی۔ عبارت کی سلاست۔ بیان کا ربط۔ مدارج کی ترتیب مفہوم کے تسلسل سے ایسے منضبط ہیں کہ کہیں سے کوئی لفظ اگر طباعت میں بگڑ گیا ہی تو بلا زحمت ذہن میں آجاتا ہے۔

عنوانات مختلف ہیں، تعزیت ناموں سے لیکر، مسلم یونیورسٹی تحریک، مکاتیب ڈاکٹر اقبال، تقسیم ترکہ کی برکت، تقریر جلسۂ ٹرسٹیان، اصلاحِ معاشرت، تقریظ مئے دوآتشہ اور دیوانِ عاشق دہلوی تک چھپن ۵۶ سی مضامین میں سے ہر ایک میں ایک جداگانہ خوبی ہے۔

بائیوگرافیکل نوٹ ہو یا قدیم کتابوں کا ذکر، کسی کتاب کی تنقید ہو یا مقدمہ، پیش لفظ ہو۔ بیانِ مضمون میں ہر جگہ "اپنا رنگ" نمایاں ہی اور یہ "اپنا رنگ" وہ خصوصیت ہی جو متوازن طریقہ پر بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ طرزِ نگارش ہی میں نہیں بلکہ ہر مضمون پر "نظر" اور باتوں کی کھوج میں بھی "اپنا رنگ" ایک نمایاں اور مخصوص پہلو ہے۔ جس قدر چھان بین، تلاش و تحقیق سے ہر امر کو پیش کیا گیا ہی۔ اس کی مثال اس نام نہاد ریسرچ میں دشوار ہی جو انگریزی کی ناقص تقلید میں آجکل سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔

لکھنے والے کی شخصیت اس کے مقام علم و فکر، دانش و دانائی کا پرتو اس کی تحریر میں بلا اہتمام و تصنع، شوقِ

خود نمائی و نمود ہونا ایک بڑھی بات ہے۔

لہجہ کی درشتی، ہلکے نشتر اور غیر مرعی نیش، قرآنی حمیت اور محمدی غائیت کے دعاوے اپنی فکرِ خام اور خیالات ناقص کا اظہار بعض حلقوں میں "عظمت" و گراں پائگی کے مترادف شمار ہوتا ہے لیکن اصل بلندی اس مقام کو قریب میں ہی جسے مسلمان "عند ملیکِ مقتدر" کہتے ہیں اور یہی افادہ عامہ کی ضامن بھی ہے۔ تنقید نگاری میں دوسری باتوں سے زیادہ اہلِ ہند اپنی ہزیمت خوردگی کے نفسیاتی ردعمل کے الجھاوے کے باعث انگریز کے تبع ہیں اور اس میں بھی بہت گھٹیا معیاروں کے پرستار۔ ہاری ہوئی قوم اپنے فاتح کے اسلحہ کو خوف، نفرت اور آخر کار توجہ اور قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے اور پھر بتدریج اس کے کلچر اور طریقِ فکر کو اختیار کر لیتی ہے۔ یہی ہزیمت تامہ ہے اور "مرگِ دوام"۔ ہندوستانی لکھنے والے اس خلا میں جس بُری طرح پھنسے ہیں اس کا احساس اب کسی حلقہ میں اگر باقی ہے تو وہ انہی صاحبانِ فکرِ آزاد، اور قلبِ بیدار کا ہے۔ ان کی تحریروں میں آپ ایک رُوح پرور نورانیت پائیں گے اور ایک بیدار کن سرورِ سحر افروز۔

نواب صدر یار جنگ بہادر الحاج ڈاکٹر علامہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی اسوقت ہندوستان میں سب سے پرانے لکھنے والے، صاحبِ ذوق اور علم دوست ادیب ہیں جن کی سخن فہمی اور سخنوری، زباں دانی اور ہنر پروری العلم کی دقتِ نظر اور جگر کاوی کے بقدر او رہر طور معروف و ممتاز ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں پہلا ہی مضمون اُن اُصولوں کو ظاہر کرتا ہے جن پر نواب صاحب نے کاربند رہ کر یہ منازل طے کی ہیں۔ دوسروں کے احساسات کا اندازہ اور صفاتِ حسنہ کا اعتراف کس قدر شائستہ انداز میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح کتاب فیوچر آف اسلام چونکہ ایک مغربی سفید فام کے قلم سے نکلی تھی، غلام نہاد مشرقیوں نے اسے سر پر اُٹھایا۔ حالانکہ وہ کتاب منجملہ ان دیگر تبلیغی اور سیاسی اقدامات کے تھی جو اسلام کے خلاف عمل میں آتے رہے ہیں۔ یہ شروانی ہی صاحب کا دل گردہ تھا کہ ۱۸۸۵ء میں اس کی واضح تنقید لکھ کر اس کے زہریلے مقاصد اور سفیہانہ خامیوں کو نمایاں کیا۔

ادیب کے لئے دلیری سے زیادہ اس عہد میں بیباکی بلکہ پھکڑ پن ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ وجہ اس کی خواہ کچھ بھی ہو۔ لیکن ایسا ادب نہ کسی ملک یا قوم میں زندہ رہا ہے نہ "اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب" ہندوستان میں رہ سکتا ہے "ست" یا "حق" کے اظہار میں جس خوبی سے "ادب" پیدا ہوتا ہے وہ بلاغت کے اور انسانی کیرکٹر کی خوبیوں میں اس کا شمار بیجا نہیں ہے۔ کوئی شخص جس کا کیرکٹر بلند نہ ہو اس صفت سے کماحقہٗ متصف نہیں ہوتا اور اس کے لوازمات سے جیسا کہ چاہئے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

فیوچر آف اسلام کی تنقید سے ان کی ادبی دیانت اور سیاسی بیانت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔

[illegible] شاعر [illegible] کی [illegible] اجتہاد [illegible] کلام پر اعتراضات کئے گئے۔ نواب صاحب نے ان کے جوابات بہت شائستہ [illegible] میں دئے ہیں جو وسعتِ مطالعہ اور قوتِ کلام کا اندازہ بے تکلف ہوتا ہے۔

چوتھا مضمون مولانا شاہ فضل رحمٰنؒ کی خدمت میں اپنی حاضری کے متعلق ہے جو حقیقت میں سحر [illegible] نمونہ ہے [illegible] الموسوم حیاتِ جاوید پر تبصرہ ہے۔ نثری مضامین میں سے غزل [illegible] اور [illegible] پر جو کچھ لکھا گیا ہے "معیاری" حیثیت رکھتا ہے۔ بائیوگرافیکل مضامین میں سب سے بڑی خوبی یہ [illegible] شخص مذکور کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجائے اور وہ زندگی [illegible] ہو۔ شاید ہی کوئی بائیوگرافر اپنے مختصر مضامین میں اتنی خوبی کے ساتھ اس پر قادر ہو سکا ہو جیسے کہ صاحبِ مقالات اپنے مختلف مضامین کی شخصیتوں کو پیش کر سکے ہیں۔ جس حد تک جو پہلو جس جگہ نمایاں کرنا مطلب کی وضاحت کے لئے ضروری ہے جس حسن کے ساتھ کیا گیا ہے اپنی مثال آپ ہے۔

کمال تو یہ ہے کہ ہر مضمون زندہ، ہر تحریر جاندار اور [illegible] بیان کی [illegible] اجاگر ہے خواہ وہ گوشوارہ فہرستِ کتب خانہ [illegible] یا "مختصر خیال" کے خلاف نوٹ ہو۔

ارباب [illegible] سے بیگانہ، بلند مقصدی سے بے تعلق، جن کے قلوب مردہ، روحیں افسردہ اور ذہن تھک گئے ہیں۔ ان مضامین کی "خضر سامانی" سے بہت کچھ نفع پا سکتے ہیں اور اردو زبان کی ترقی کے خواہاں اداروں کو چاہئے کہ وہ اس کتاب کی توسیع کریں اور ابنائے وطن کو اپنی زبان کی صحیح ترقی کے لئے اس کے استفادہ کی ترغیب دیں تاکہ تحریر و تقریر کا معیار بلند ہو سکے۔

ہم اس موقر مجموعہ کی اشاعت پر جناب نواب صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ ان کی [illegible] کتاب کی قدر دانی گرانبہا خدمت کے پورے اعتراف کا پیش خیمہ ہوگی۔

کتاب شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے اور موقر لائبریریوں، اکابر اہلِ قلم و ادبائے محترم میں بلاقیمت تقسیم کی گئی ہے۔

حجم ۴۷۸ صفحات۔ کاغذ نفیس اور لکھائی چھپائی قابلِ مطالعہ ہے۔

(جنرل قدوائی)

بیت المعتمد، علیگڑھ
[illegible]

[illegible]

تصانیف الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ)

[حیات] حافظ الملک حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی مستند سوانح
عمری یہی پہلی مکمل و مستند با تصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے
حیرت انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت
حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد عہ روپیہ (زیر طبع بار دوم)۔

[مسلمانوں] کی تعلیمی جد و جہد — (بزبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانان ہند
کی بالخصوص اور مسلمانان یوپی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جد و جہد کو تفصیل
[سے] درج کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ (زیر طبع بار دوم)۔

[مسلمانوں] کی دنیا — مصنف نے اپنی [illegible] سالہ پبلک لائف کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے
اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت دو آنے۔

[عرش] فاروقی — بریلی اور روہیلکھنڈ کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے مختصر
حالات زندگی اور بطور نمونہ کلام اُن کی کیف آور رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت دو آنے۔

[ہندوستان] میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات
اور رکاوٹیں درپیش ہیں، اُن پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حل مشکلات
[بھی] بتائی گئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے

[حیات] نواب دوندے خاں — (بزبان انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب
نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار [illegible] الدولہ جلادت الملک نواب دوندے خاں بہادر
کے مجاہدانہ کارنامے اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت چار آنے۔

روہیلہ (سلطنت مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبان انگریزی و اردو۔ (زیر طبع)
قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علیگڑھ

نئی زندگی کا

جمعیتِ اسلامیہ اور سیاسی

مجلس دستور

دستور نمبر

لکھنے والے

ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر ہمایوں کبیر، سید عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، ڈاکٹر محمد صدیقی، پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ، ڈاکٹر سید محمود، ایم۔ آر۔ مسانی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، سر شفاعت احمد خان، شافعی، سوشیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر سید حسین، علامہ رشید رضا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سید سجاد ظہیر، ایل۔ احمد اکبرآبادی ــــــ اور دوسرے ماہرین آئین و دستور حصہ لینے والے ہیں۔

چند عنوانات

ایڈیٹر ــــ سید انیس الرحمن

دستور کی تاریخ ــــ ہندوستان میں قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے دستور ــــ جمہوریت کیا ہے ــــ امریکہ اور روس کا نمونہ ــــ ہندوستان کی دستوری ترقی پر سیاسی تحریکوں کا اثر ــــ بین الاقوامی نظریات و مقامات کا اثر ــــ ہندوستان کی آئینی بحث ــــ سمجھوتے کی تاریخ ــــ ہندوستان کے لئے ایک مثالی دستور ــــ پاکستان کے لئے ایک مثالی دستور ــــ قرآن کا سیاسی نظام ــــ حکومت کی مشینری ــــ سوشلسٹ نظامِ حکومت ــــ مرکزی اور صوبائی اختیارات ــــ اقلیتوں کے مسئلے کا کیا حل ہو ــــ ریاستوں اور مرکز کے تعلقات ــــ وفاقی عدالت ــــ صوبوں کی لسانی تقسیم ــــ برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے شرائط ــــ آزاد ہندوستان کی ایک تصویر ــــ آزاد ہندوستان میں وزارت ــــ ہندوستانی فوج کا مقصد کیا ہو ــــ سب کی بعد از جنگ کی دستور ساز اسمبلیاں ــــ کانگریس کی دستوری آزادی ــــ دنیا کے بعض منتخب ملکوں کے دستور ــــ

علاوہ ازیں تمام معلومات، اعداد و شمار، اور متعلقہ سیاسی دستاویز بطور ضمیمہ شامل ہوں گے

اُردو میں اب تک کوئی ایسی سیاسی اور تعمیری کتاب شائع نہ ہوئی

حجم ۳۰۰ صفحات ــــ قیمت فی جلد تین روپے ــــ سالانہ چندہ ــــ

سالانہ خریداروں کو مفت ــــ مشترین حضرات جلد توجہ فرمائیں ــــ ایجنٹ جلد اطلاع دیں اور آرڈر دیں

قیمت نقد ارسال فرمائیں، وی۔ پی۔ نہیں بھیجا جائیگا

منیجر رسالہ نئی زندگی ۹۰ چک الہ آباد

مستقل خریدار بن جائیے

[illegible]

"غلط زاویے"

۳۲-۱۹۳۱ء میں "میری کانگریسیت" پورے شباب پر تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں "آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ نفرنس" قائم ہوئی تو میں نے اس کی پرزور عملی حمایت کی۔ اپنے وطن بریلی میں کانفرنس مذکور کی مقامی شاخ م کی اور اس کے بنیادی مقاصد کے تحت نشستوں کی تخصیص کے ساتھ مخلوط انتخاب پر ایک رسالہ لکھا ں کا نیشنلسٹ پریس، نیشنلسٹ رہنماؤں اور ملک کے طول و عرض میں پرجوش خیر مقدم ہوا۔ چوٹی کے بارات نے یہ اقساط اسے شائع کیا۔ قلیل عرصہ میں اردو کے دو اڈیشن اور سید عبداللہ صاحب بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل کے زیر اہتمام اس کا گجراتی ترجمہ چھپکر تقسیم ہوا۔ صوبہ بمبئی میں یہ رسالہ ضبط بھی ہوا اور کئی سال تک یو۔ پی۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے میری نگرانی کی۔ عقائد سیاسی کا یہ دور سنہ ۱۹۴۱ء تک قائم رہا چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں جب پاکستان کا رزولیوشن پاس ہوا تو میں نے اس کے خلاف علی گڑھ کے اخبار "سرگزشت" میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا، مولوی ظفر عمر صاحب مصنف "نیلی چھتری" نے اس کے جوابات لکھے لیکن بحث تمحیص کا یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا اور اس وقت تک ملازم ہو جانے کی وجہ سے مجھے اختلافی سیاسی مضامین لکھنے سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد یوماً فیوماً مسلم لیگ کا زور بڑھتا رہا۔ اور جب گرد و پیش کا سارا ماحول لیگی اور صرف لیگی ہو گیا۔ لیگ کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نکالنا گناہِ کبیرہ قرار پایا۔ میں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کہ میں جب تک کانگریس میں تھا تو اس وقت بھی میرا مقصد مسلمانوں ہی کی خدمت تھا۔ اب کہ مسلمان پرانے "کانگریسی زاویے" کو کسی بھاؤ پسند نہیں کرتے تمام سابقہ قدریں بے اثر ہو گئیں اور قوتِ عمل دن بدن مفلوج ہوتی جا رہی ہے تو کیوں نہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر ترقی پسندانہ سیاست کی تبلیغ و اشاعت کی جائے اور مسلمانوں کی بے لوث خدمت کے واسطے کیوں نہ ایک نیا میدان حاصل کیا جائے۔

علاوہ بریں "تحریکِ پاکستان" سے پہلے برادرانِ وطن کے ساتھ کام کرنے کا بھی یہ تجربہ ہوا کہ ہم "نیشنلسٹ" مسلمانوں کو ہر قسم کے ایثار و قربانی اور اپنی قوم میں انتہا درجہ غیر ہر دلعزیز اور بدنام ہو جانے کے باوجود زیادہ سے زیادہ بہ نظرِ ترحم تو دیکھا گیا۔ حقیقی عزت و احترام کے ساتھ ہمارا واجبی مقام ہم کو کبھی نہ دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد و مسٹر رفیع احمد قدوائی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب اور

خان برادران جیسے چوٹی کے رہنماؤں کے ماسوا باقی لوگ حضرتِ اکبر الہ آبادی کی اصطلاح میں 'بدھومیاں' اور 'مشتِ خاک' ہی شمار ہوتے رہے۔ ہم خود بربنائے وضع داری اپنے 'ان برادرانِ یوسف' میں بیٹھتے اور کام کرتے تھے۔ ان کو ہماری ضرورت نہ تھی۔ عامۃ المسلمین کے ساتھ بھی زندگی کے ہر شعبہ میں تعصب و تنگ نظری کا سلوک برابر ہوتا رہا۔

لہٰذا کسی نفع اور لالچ سے نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر 'لیگ' میں شرکت کی گئی۔ مگر یہاں آکر بھی اندازہ ہوا کہ۔ ع ——— "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

اکثر رہنمایانِ ملت مثلاً مولوی لطف الرحمن صاحب۔ چودھری خلیق الزماں صاحب اور مسٹر لاری وغیرہم کا ایک ہی نقطۂ نظر پایا کہ الکشنوں میں کامیابی حاصل کی جائے اور الکشنوں کے لئے اپنی اپنی پارٹی کو مضبوط کیا جائے، قومی فلاح و بہبود کا حقیقی تعمیری کام شہری لیگوں سے لے کر مرکزی لیگ تک میں مفقود، اور ہر شخص آپا دھاپی میں مبتلا تھا۔ اس کے برعکس غریب مسلم عوام ہر معاملہ میں حسبِ معمول اپنے لیڈروں کی تقلید میں سرشار اور پاکستان کو عہدِ خلافتِ راشدہ کی خواب کی سچی تعبیر سمجھ رہے تھے۔ ہر چند کام کا راستہ ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ تا آنکہ سنہ ۱۹۴۶ء کے مجالس قانون ساز کے انتخابات آ گئے۔ یہ زمانہ خصوصیت سے اپنے اپنے اکھاڑوں سے باہر کے لیگی کارکنوں کی بیخ کنی اور صرف اپنے حلوے مانڈے کا معاملہ درست کرنے کے سہالک کا تھا۔ ساتھ ہی پاکستان کے پروپگنڈا کو جیسی شدت کے ساتھ اس زمانہ میں بھولے بھالے مسلم عوام کو مسحور کرنے کے لئے چلایا گیا اس سے پہلے نہ چلایا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ کے حصول کی دوڑ میں ایسی ایسی کڑی شرطیں کار آمد آدمیوں پر لگائی گئیں کہ اگر ان کی پارٹی سے وفاداری میں ایک نکتہ یا معمولی زیر زبر کی بھی کمی ہوتی تو اُمیدوار کے مردود و مغضوب قرار دئے جانے میں ذرا بھی تامل نہ کیا جاتا۔

اپنی چار سالہ بے لوث خدماتِ مسلم لیگ اور خصوصیت سے مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمت کے جذبے سے میں نے بھی بریلی کے حلقۂ بہیڑی و کمایوں سے مسلم لیگ ٹکٹ کے لئے درخواست دی ۱۲ جنوری ۱۹۴۶ء کا وہ تاریخی دن مجھے یاد ہے جبکہ مصطفےٰ کیسل میرٹھ میں روہیلکھنڈ۔ میرٹھ اور آگرہ ڈویژن کے تین سو سے زائد امیدواروں کا اجتماع تھا۔ صوبہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔پی کا دربار پوری عظمت و جلال کے ساتھ جما ہوا تھا۔ وہ ڈرائینگ رُوم جس میں بڑے بڑے ذی رُتبہ اور ذی عزت مسلمان ادنیٰ اُمیدواروں کی طرح باری باری پیش ہو رہے تھے، آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ پارلیمنٹری بورڈ کی پوری ٹیم ایسے مہیب بت بنے تھے کہ اُن کے سامنے بڑے بڑے مونچھوں پر چراغ جلانے والوں کی پُرعقیدت پیشانیاں زمیں بوس ہونے پر مجبور تھیں۔ ہر اُمیدوار کے نامۂ اعمالِ سیاسی کے دفتر کھلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ الکشن کا چناؤ نہیں ہے

لہٰ یومِ حساب ہی موقع کی شہرت دیکھئے کہ جب فضائے مصطفےٰ کیسل میں صبح کے وقت آغازِ کار سے پہلے ایک پُروقار
خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہر شخص اپنے اپنے نامۂ اعمال کو میزانِ عدل پر تولے جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔
بلیدہ اُمیدواروں میں سے لاؤڈ اسپیکر نے سب سے پہلے مجھ گناہگار کا نام پکارا، جیوں ہی پیش ہوا عدالت
عالیہ کا ہر ایک جج شناسا اور واقفکار نکلا، طرزِ خطاب بھی شریفانہ اور معنیٰ خیز تھا۔ قریب تھا کہ نیکی کا پلڑہ بدی کے
پلڑے سے بھاری قرار پائے کہ میرے پُرانے کرمفرما مولوی عزیز احمد خاں قائد روہیلکھنڈ نے اُسی میری پُرانی مخلوط
انتخاب والی کتاب کا ذکر چھیڑا اور کہا "صاحب آپ وہی تو ہیں جنھوں نے اُس زمانہ میں مخلوط انتخاب کی پُرزور
حمایت کی تھی"۔ جواباً عرض کیا گیا حضور۔ ع ——— این گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند
صدرِ عدالت چودھری خلیق الزماں صاحب اور خود آپ بھی تو اسی عقیدہ اور خیال کے تھے۔ بات جی لگتی تھی۔
پھر پوچھا گیا کہ صاحب الکشن میں روپیہ بہت خرچ ہوگا۔ آپ کتنا صرف کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی آٹھ ہزار کی
ساری پونجی داؤں پر لگا دی لیکن جس پیپر پر لاکھوں کی بازی لگتی ہو اس آٹھ ہزار روپلی کو کون خاطر میں لاتا۔
نتیجہ ظاہر۔ مدت العمر کی خدماتِ ملی اور قابلیت کا راایک طرف اور مخالف اُمیدوار کی صرف دولت دوسری طرف
——— ایک تھرڈ ڈویژن نوعمر انٹرنس پاس تاجر گراموفون بسبب اس کے کہ اُن کا بینک بیلنس زیادہ
تھا اور وہ موٹر سوار تھے۔ مولوی عزیز احمد خانصاحب کی سفارشِ خاص۔ نیز مسٹر ظہیر الحسن لاری کے ہم قوم ہونے
کی وجہ سے میرے مقابلہ میں قابلِ ترجیح قرار پائے۔ سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کے اسقفِ اعظم نے اس سانحہ کے
پیش آنے سے پہلے بسبب واقفیتِ خاص اپیل کرنیکی ترغیب دے رکھی تھی۔ چنانچہ وہاں تک زور لگایا
گیا۔ لیکن۔ ع ——— وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا
جو سلوک مجھ حقیر فقیر کے ساتھ ہوا وہی پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کے ساتھ پیش آیا۔ غرض ہر حلقہ اور ہر صوبہ میں یہی غدر برپا ہوا۔
چھانٹ چھانٹ کر لائق، اہل اور صاحبِ ایثار امیدواروں کو نیچا دکھایا گیا اور اپنے اپنے جاہل عزیزوں
اور رشتہ داروں اور نااہل دوستوں کو نوازا گیا۔

الکشنوں ہی کی خاطر مسلمانوں کا تعلیم یافتہ اور عزت دار طبقہ زیادہ تر لیگ میں شامل ہوا تھا اور جب
اُن میں سے نوے فیصدی کو ذلت و رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو شکایتوں اور بددلی کی عام کیفیت
مسلم لیگی حلقوں میں پیدا ہو گئی۔ کھلی ہوئی عام بغاوت کا سامان بھی مہیا تھا۔ لیکن چونکہ کامیاب لیڈروں کے
ہاتھوں میں مسلم عوام پورے طور پر کھیل رہے تھے اس لئے کسی باغی کو فی الوقت مجالِ دم زدن نہ ہوئی۔
نیز کانگریس لیگ سیاست نے الکشن کے بعد ہی ایسی تیزی کے ساتھ اور ایسے ایسے زبردست پلٹے کھائے
کہ سوائے حصولِ پاکستان کے کسی دوسری بات کو سوچنے کی دماغوں کو فرصت ہی نہ ملی۔

۳ رجون ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کے اعلان اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو اس کے عملی جامہ پہننے کی ہماہمی میں ہماری سیاست اور نظریوں نے ایک نیا اور حیرت انگیز پلٹا کھایا۔ ہمارے 'پارلیمنٹری بورڈ' کے سارے معزز ارکان آپ کے سامنے ہیں۔ ایک سال سے کم عرصہ میں کیسی کیسی اَن کہی کہہ رہے ہیں۔ اِن حضرات کی صرف چند ماہ پہلے کی تقریروں یا ان کے اخباری بیانات کا آج کی تقریروں اور بیانات سے مقابلہ کیا جائے تو ایک انقلاب عظیم نظر آئے گا۔ نفرت و حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص اور اس کی ایک ہی زبان قلیل وقفہ میں کیسے کیسے رنگ برنگے گل کھلا سکتی ہے۔ بڑے بڑے نیر آج گیدڑ نظر آرہے ہیں۔ رہا احساس و خودداری مسلم تعلیم یافتہ طبقہ تو اُس پر جس طرح دس سال تک دو قوموں کے نظریہ کی زبردستی ٹھونسم ٹھانس کی گئی تھی آج اتنی ہی شدت کے ساتھ اس کے برعکس نظریوں کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ کم از کم اتنا ہی کیا جاتا کہ کچھ دنوں خاموش بیٹھتے یا رفتہ رفتہ اپنے کو اور عوام کو اس قلابازی کے لئے تیار کرتے۔

آج مجھ جیسا عامی مسلمان عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ انہی لیڈروں کے کہنے سے پُرانے رشتے اور ناتے اور وضعداریاں ترک کیں اور آج یہی لیڈر ناک کے بل زمین پر گھسٹنے کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ تبلیغ کر رہے ہیں۔ 'ابن الوقتی' اور خود غرضی کی انتہا ہو گئی۔ بات اس سے زیادہ نہیں کہ اگر یہ لوگ پاکستانی صوبوں کے گورنر۔ مرکزی پاکستان گورنمنٹ کے وزراء۔ اور ممالک غیر کے سفیر بنا دئے جاتے تو اُن کا طرز عمل دُوسرا ہوتا۔ لیکن دربار تک باریابی نصیب نہ ہوئی تو آخری جان توڑ کوشش انڈین یونین میں رسوخ حاصل کرنے اور کم از کم جان کی امان پانے کی دوادوش کر رہے ہیں۔ غریب و مفلوک الحال مسلم عوام —— ہر دور میں مظالم و ناانصافیوں کا شکار رہے اور اب بھی ہیں۔ ہمارے گندم نما جو فروش لیڈروں نے پہلے بھی مزے اُڑائے۔ اور اب بھی ہوائی جہازوں میں اُڑتے اُڑتے پھر رہے ہیں۔

اِن تاثرات کی روشنی میں سخت احساس کمتری طاری ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ خود اپنی چند ماہ بیشتر کی تحریروں پر جب نظر پڑتی ہے تو اُن سے گھن آتی ہے۔ ایک بھی تو حتمی نظریہ اور پُرزور دعویٰ اپنی جگہ پر قائم نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ سیاست نام ہی گرگٹ کے سے رنگ بدلنے اور روزانہ تبدیل ہونے والے اصولوں کا ہو گیا ہے۔ اور اس کسوٹی پر بڑے بڑے اخبارات کے اداریوں اور اونچے سے اونچے لیڈروں کے قول و عمل کا ماضی و حال کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو سر پیٹ لینے کو جی چاہے گا۔ مجھ جیسے پسماندہ لوگ کس شمار و قطار میں ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی پریشانی اور انتشارِ خیال کا جو پس منظر ہم نے پیش کیا۔ ہو بہو وہی نقشہ برادرانِ وطن میں جما ہوا ہے۔ کانگریس تقسیم ہند کی ایسی ہی شدت کے ساتھ مخالف تھی جس طرح کہ مسلم لیگ پاکستان کی حامی تھی۔ تقسیم ہند پر بالکل خلاف توقع اور اچانک اس کی رضامندی اور اس کے نتیجہ میں پاکستانی علاقوں کے ہندؤں اور سکھوں پر وہی مصیبت نازل ہو جانے سے جو ہم انڈیا کے مسلمانوں پر نازل ہوئی عام ہندؤں اور کانگریسیوں میں ایک ہیجانِ عظیم برپا ہو گیا —— کانگریس کا احترام اور اس کے لیڈروں کی وقعت کم ہو گئی —— اور ہر شخص مایوسی و بددلی کا شکار ہو کر ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا کانگریس کے پرانے سیاسی مخالفین جنہوں نے ہر الکشن میں اس سے ٹکر لی اور ناکامی کا منہ دیکھا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ہندو عوام کو اپنے اثر میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تا کہ آزاد ہند کا جدید آئین نافذ ہونے پر جب نیا الکشن ہو تو قیادت کی باگ ڈور کانگریس کے بجائے ان کے ہاتھ میں آ جائے۔

مختلف صوبوں اور مرکزی کانگریس پارلیمنٹری بورڈوں نے بھی انتخاب کے موقع پر بعض امیدواروں کے چناؤ میں ناانصافی سے کام لیا۔ بکثرت بڑے بڑے قابل اور عمر بھر جیل کی سختیاں جھیلنے والے لوگ کانگریس ٹکٹ سے محروم رکھے گئے اور صوبوں اور مرکز کی تشکیلِ وزارت میں بھی اہلیت سے زیادہ تعلقات کا پاس کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے مخلص کانگریسی کارکن اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں بالکل بے عمل منہ چھپائے پڑے ہیں۔ متعدد ذی اہلیت لوگوں کی ناقدری اور نااہلوں کا عروج کانگریسی حلقہ میں بھی اسی طرح رائج ہوا جس طرح کہ لیگی حلقوں میں۔ ہندو اور مسلم عوام کی حیثیت خام مواد سے زیادہ نہیں۔ شاطرانِ وقت اپنی اپنی وقتی ضرورتوں کے تحت من مانے کھلونے بنا لیتے ہیں۔ حق و انصاف کے فقدان کی فضا میں غریب عوام۔ بھوک کے مارے عوام۔ کپڑے سے محروم عوام۔ بیماریوں کا شکار عوام۔ جہالت سے سرشار عوام۔ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف سطحی غلط فہمیوں کے ماتحت دست و گریباں ہیں۔

پاکستان میں لیڈروں کی حکومت قائم ہوئی۔ ہندوستان میں نیتاؤں کا راج ہوا۔ عوام کے حصہ میں کیا آیا۔ یہی نا کہ ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصۂ ملک میں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائے جاتے ہیں اور مچھروں اور مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کا کیا علاج ہے اور یہ مصیبت کب اور کس طرح ختم ہو گی؟ یہ سوچنے اور جلد غور کرنے کی چیز ہے۔ موجودہ خلفشار اور جنگ نہ مذہبی ہے اور نہ عوامی حقوق کے لئے۔ ہم نادان اور بھولے بھالے لوگ اندھا دھند بلا سوچے سمجھے تباہی کے

گھرے غار میں دھنستے چلے جارہے ہیں اور کوئی نہیں جس کو ہم پر رحم آئے۔

اصلاح حال کی متعدد تجویزیں ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن اُن کو پیش کرتے ہوئے خوف لگتا ہے کہ مبادا پھر غلطی نہ ہو جائے اور غریب عوام ہماری غلط روی کا شکار ہو جائیں ——— تاہم چونکہ شدید حادثات کی گرم بازاری ہو چکی ہے اور ابتک ہراس طاری ہے اس لئے چند گزارشات ناگزیر ہیں۔

ہم ہندو۔ مسلمان اور سکھ عوام کو غور کرنا چاہئے کہ ہماری ہی اپنی یاد میں گزشتہ تیس سال کے عرصہ میں اتحاد و اتفاق اور نفاق و شقاق کے بڑے بڑے سیلاب اس سے پہلے بھی آچکے ہیں۔ ۱۹۲۰-۲۱ء میں ہماری آنکھوں نے ہندو۔ مسلم۔ سکھ یکجہتی کے لاجواب مناظر دیکھے ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۸ء میں شدھی سنگٹھن اور "تبلیغ و تنظیم" کا دور ہوا۔ صرف یو۔پی میں اس پانچ سال کے عرصہ میں نوے بڑے بڑے بلوے ہوئے ۱۹۳۱-۳۲ء کی دوسری تحریکِ آزادی میں کئی لاکھ مسلمان کانگریس کے ساتھ پھر جیل گئے۔ اور اُس کے نتیجہ میں جب ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت انتخابات ہوئے تو کانگریس۔ جمعیتہ العلماء اور جمعیتہ الاحرار نے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ مسٹر جناح کو مسلم عوام کا لیڈر بھی جمعیتہ العلماء کے اکابرین نے بنایا ۱۹۳۷ء میں وزارتوں کی تشکیل پر پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے تقسیم ملک کی شکل میں منتج ہوا۔

اب ہوا کا رخ پھر پلٹ رہا ہے۔ قائدینِ مسلم لیگ نے غیر مسلموں کے خلاف زجر و تہدید کی پالیسی نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی اپنی حکومت کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے ترک کر دی ہے۔ اسی طرح کانگریس نے اپنے ۱۵؍نومبر ۱۹۴۷ء کے حد درجہ دانشمندانہ رزولیوشنوں کے ذریعہ ملک و قوم کی ڈوبتی کشتی کو کنارہ لگا لیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ صرف چھ ماہ کے عرصہ میں وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تمام وہ ہنگامے جو ہم دس سال سے دیکھ رہے تھے آئندہ سننے میں بھی نہ آئیں گے۔ ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

جب یہ چیز ثابت ہو گئی کہ کوئی لیڈر۔ کوئی تحریک اور کوئی سی بھی فضا ایک حالت پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہتی تو ہمیں بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا چاہئے جس کے اثراتِ مابعد ہمارے بزرگوں کی سیکڑوں سال کی محنت و کاوشس اور ایثارِ جانی و مالی سے قائم کی ہوئی چیزوں اور حاصل شدہ نعمتوں سے ہماری آئندہ نسلوں کو محروم کر دے اور پوری کی پوری قوم آوارہ گرد اور خانماں برباد ہو کر اپنی تاریخی عظمت کو ہمیشہ کے واسطے کھو بیٹھے۔ ہندوستان میں ہماری جائیدادیں۔ ہماری تجارتیں۔ تعلیم گاہیں۔ قومی و مذہبی ادارے۔ تاریخی عمارات۔ ہمارا کلچر۔ زبان۔ اور بحیثیت مجموعی باعزت پوزیشن ایسی ہستی

اور بے حقیقت چیزیں نہیں ہیں کہ اُن کو مفروضہ یا حقیقی جانی و مالی خطرہ کی بناء پر کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا جائے۔

تاریخ اپنا سبق دُہراتی ہے۔ کل کے دُشمن آج کے دوست اور آج کے دوست آنیوالے کل کے دشمن ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہونگے۔ دوستی و دشمنی کے لئے مذہب۔ نسل اور خاندان کے بندھن کبھی دیرپا ثابت نہ ہوئے۔ ایک وقت تھا کہ اسلام اور عیسائیت کی خونریز جنگ تھی لیکن بیسویں صدی عیسوی کی دو بڑی جنگوں میں نیز اس سے پہلے بھی خالص عیسائی قومیں اور طاقتیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں اور ہو رہی ہیں سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء کی پہلی جنگِ عظیم میں یونانیوں نے ترکوں کا جو ہولناک قتلِ عام کیا اور اُسکے نتیجہ میں جو تباہ کُن تبادلۂ آبادی ہوا کون کہہ سکتا تھا کہ یونانی اور تُرک کبھی دوست بھی ہو سکتے ہیں لیکن سنہ ۱۹۳۹ء تا سنہ ۱۹۴۵ء کی دوسری جنگِ عظیم میں دُنیا نے مشاہدہ کیا کہ یہ متخاصم طاقتیں کس طرح ایک دوسرے کی معاون و مددگار رہیں۔

خاص ہندوستان میں مسلمانوں نے مذہبی جہاد کر کے ہندوؤں پر غلبہ حاصل کیا لیکن پٹھانوں اور مغلوں کی بکثرت لڑائیوں میں انہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی بہی خواہی میں اپنے خون کو پانی کی طرح بہایا۔ اور اعتبار و اعتماد کی منزلیں اس حد تک طے ہوئیں کہ پٹھانوں پر قابو رکھنے کے لئے راجہ مان سنگھ کو کابل کا گورنر بنایا گیا۔ پٹھانوں کے زوال سلطنت اور مغلوں کے عروج سنہ ۱۷۰۷ء میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال اور سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے کامل تسلّط کے درمیانی وقفوں میں متعدد زرّیں مواقع اُس زمانہ کے ہتیار بند اور مسلّح و منظّم ہندوؤں کو حاصل ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو سرزمینِ ہند سے نیست و نابود کر دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور مجبور و لاچار آخری شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کو از سرِ نو پورے ہندوستان کا حکمران بنانے کے لئے مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے اپنا خون بہایا۔

میسور کی ہندو ریاست پر حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے قبضہ کیا۔ معزول راجہ اور اُن کی آئندہ نسل کو دوبارہ ریاست ملنے پر عہد کر لینا چاہیئے تھا کہ پھر کبھی کسی مسلمان کو امورِ مملکت میں دخیل و با اختیار ہونے دیا جائے گا۔ لیکن آپنے دیکھا کہ اسی متعصب ہندو ریاست میں زمانۂ دراز تک سر مرزا محمد اسمٰعیل سیاہ و سپید کے مالک دیوان رہے۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ فرید کوٹ۔ الور اور بھرت پور کی تاریخوں کی ورق گردانی کیجئے صدہا واقعات آپ کے ملاحظہ سے گزریں گے کہ کتنی بار مسلم و غیر مسلم کی باہمی آویزش ہوئی۔ ایک نے دوسرے کا تختہ پلٹنے کی کوشش کی لیکن پھر کچھ دنوں بعد آپس میں شیر و شکر ہوگئے۔ ملکی و سیاسی ضروریات و مقتضیات حقیقی بھائی اور سگی اولاد کا گلا کاٹنے اور بدترین دشمن کو گلے سے لگا لینے

پر مجبور کر دیتی ہیں ـــــ ابھی حال میں خلیفہ محمد حسین مرحوم اور سر لیاقت حیات خاں پٹیالہ کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں اور مسلمانوں کی حالیہ بربادی کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ اسی ریاست کی حکمران جماعت خود اپنے ہم قوموں کے ہاتھوں تنگ آکر سر لیاقت حیات خاں کے بھتیجے سردار شوکت حیات خاں کو آیندہ قلمدانِ وزارت دوبارہ سپرد نہیں کر دے گی ـــــ!

ہندو۔ سکھ۔ جاٹ اور راجپوت ریاستیں مسلمانوں سے اور مسلمان ریاستیں غیر مسلموں سے بے وجہ کام نہ لیتی تھیں؟ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اپنی ہی قوم و خاندان کے لوگ اکثر اوقات گستاخی، بے تکلفی اور سرکشی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ مثلاً راجپوتوں کی از روئے رپورٹ مردم شماری نو سو ساٹھ قسمیں ہیں اور وہ سب باہم دست و گریباں رہتی ہیں ـــــ اور حکومت کا رُعب و دبدبہ قایم رکھنے کے لئے یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ قطعاً غیر متعلق لوگوں کو زمامِ اختیار دی جائے۔ آج "ہندوستان" اور "پاکستان" میں کیا ہوا۔ دونوں حکومتوں کے قیام و بقا کے لئے اندرونی بدامنی سمِ قاتل ہے لیکن چونکہ حکمران جماعتوں کے ہم مذہبوں ہی کی فوج اور پولس تھی۔ اس لئے حسبِ دلخواہ طریقہ پر حالات قابو میں نہ آسکے برعکس اس کے مخالف مذہب لوگ صرف راعی کی چشم و ابرو پر جان کی بازی لگاتے ہیں اور یہ سمجھ کر لگاتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اختیارات کسی مذہبی۔ نسلی۔ یا خاندانی رشتہ کی بناء پر نہیں ہیں ـــــ بلکہ صرف حاکم کی خوشنودی کے سبب سے ہیں۔

پس "ہندوستان" اور "پاکستان" کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ بے صبری اور جلد بازی سے کام نہ لیں۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اور پاکستان میں غیر مسلموں کی ضرورت اور شدید ضرورت پیش آئے گی۔ رہا جانی و مالی نقصان کا معاملہ تو ہماری اور آپ کی جان صرف "اللہ" کے ہاتھ میں ہے عزت۔ ذلت اور موت و پیدائش کا قدرت کی طرف سے ایک وقت معین ہے۔ وقت سے پہلے اور حکم خداوندی کے خلاف کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـــــ!!ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی ترست

ـــــ

سیّد الطاف علی بریلوی

علیگڑھ ۲۰ نومبر ۴۷ء

ـــ: ختم :ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانی پت کا خونیں میدان!

(از سید جالب مرحوم دہلوی)

(۱)

تاریخی خونیں علاقہ ممالک متحدہ اور پنجاب کے تقریباً وسط میں جو علاقہ انبالہ کی تحصیل سرہند سے لیکر دریائے جمنا کے کنارے کنارے دارالحکومت دہلی کی بیرونی سرحد "بادلی کی سرائے" تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہندوستان میں قدیم زمانے سے اپنی خون آشامی کے لئے مشہور رہا ہے اور انسانی خون کی ندیاں ہمیشہ اس میں بہتی رہی ہیں۔ تاریخ ہند کی وہ اہم اور عظیم جنگیں جو نئے خاندانوں، نسلوں اور قوموں کو حکومت ملک میں برسر اقتدار لانے کی باعث ہوئیں۔ زیادہ تر اسی میدان میں لڑی گئیں۔ اور انگریزی عملداری کے فتنۂ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں استحکام پذیر ہونے تک کوئی صدی ایسی نہیں گذری کہ اس علاقہ کی سرزمین دلاوران روزگار کے خون سے سیراب نہیں ہوئی اور اُن کی ہڈیوں نے اس میں چونہ کے اجزاء کا اضافہ نہیں کیا۔

مہابھارت چنانچہ ہندوستان قدیم کی سب سے زیادہ ہولناک اور خونخوار جنگ جو اسم با مسمےٰ "مہابھارت" (جنگ عظیم) کے لقب سے ملقب ہے۔ شمالی و وسطی ہند کے سب سے زیادہ طاقتور حکمران خاندان کی دو شاخوں "کوروؤں" اور "پانڈوؤں" کے درمیان اس علاقہ میں "کورکشیتر" کے وسیع میدان پر واقع ہوئی۔ جس کے تالاب نے اسی معرکۂ عظیم کی بدولت اہم تاریخی اہمیت اور اپنے اردگرد کے مندروں کے ساتھ ہندوؤں کے

ماتر متبرکہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور سورج گرہن کے موقعہ پر تمام حصص ملک کے لاکھوں جاتریوں کا وہاں اجتماع ہوتا ہے مہابھارت کے بعد بھی ہندو حکمرانوں کی اکثر باہمی لڑائیاں اسی میدان میں ہوئیں۔ اور مشہور یونانی فاتح اسکندر اعظم کی فوج اگر دریائے ستلج تک آکر اس کے عبور کرنے سے انکار نہ کر دیتی۔ تو غالباً شمالی اور وسطی ہند کے راجاؤں کی متحدہ قوت اسی میدان میں اس کے مقابل صف آرا ہوتی۔

یونانیوں سے لڑائی

اسکندر اعظم کے جانشینوں میں سلیوکس یا جس دیگر سپہ سالار نے ہندوستان پر حملہ کیا اس کو بظاہر اسی علاقہ میں ایسی قوت کا سامنا ہوا۔ اور اس جنگ کے نتیجے کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سپہ سالار موصوف نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور ہندوستانی حکمران "چندر گپت" کے ساتھ رشتۂ ازدواج پیدا کر کے جو ہر زمانے میں باہمی اتحاد کے استحکام کی ایک بڑی ضمانت سمجھا گیا ہے۔ وہیں سے واپس چلا جانا مناسب سمجھا۔ یونانی و ہندوستانی مورخین کے بیانات اس رشتہ کی نوعیت معین کرنے میں کسی قدر مختلف ہیں۔ اور یونانی چندر گپت کی لڑکی کے اپنے سپہ سالار سے منسوب ہونے اور ہندوستانی چندر گپت کے یونانی سپہ سالار کی بھانجی کو اپنی سلک زوجیت میں لانے کے دعویدار ہیں۔ ہمارے خیال میں عجب نہیں کہ دونوں طرف کے مورخوں کے بیانات درست ہوں اور یونانی سپہ سالار اور مہاراجہ چندر گپت نے باہم دگر اس قسم کے رشتے قائم کئے ہوں۔ اس واقعہ سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیر شاہ سوری نے جو ہندو راجاؤں سے اس قسم کے ازدواجی رشتے قائم کرنیکا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس کے بعد اکبر اعظم اور اس کے جانشینوں نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ اور زمانۂ حال کے ایک مشہور مورخ کے استعارے کے بموجب "اونٹنی کے دودھ میں اس قدر گنگا جل ملایا کہ آخر میں اونٹنی کا دودھ صرف برائے نام شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں کے جسم میں باقی رہ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلکہ قدیم ہندوستان کے ایک سابق طریقے کی تجدید کی گئی تھی۔

مسلمانوں کا داخلہ ہندوستان میں

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذہب عیسوی کی طرح اسلام بھی سب سے پہلے تاجروں کے ذریعے سے جنوبی ہند میں داخل ہوا۔ اور غازی محمد قاسم علیہ الرحمۃ نے جو ابتدائی پیش قدمی سندھ کی طرف سے ہندوستان پر کی۔ وہ جنوبی ہند میں اشاعت اسلام کا ایک نتیجہ تھی۔ کیونکہ وہاں کے راجہ کا جو مسلمان ایلچی معہ تحائف کے دربار

خلافت میں جا رہا تھا۔ اس کو سندھ کے بحری قزاقوں نے ساحل مکران کے قریب لوٹ لیا۔ تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے جب اس واقعہ پر سندھ کے ہندو حکمراں کو توجہ دلائی گئی تو بجائے استمالت کے یہاں سے رعونت آمیز جواب دیا گیا۔ اور مسلمانوں کو بحری راستے کا امن بحال کرنے اور قیدیوں کو چھڑانے کے لئے سندھ کے ساحلی علاقے پر فوج کشی کرنی پڑی۔ سندھ کی اندرونی سیاسی پیچیدگیوں کے باعث یہ معمولی سی فوج کشی اُمید سے بڑھ کر نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور غازی محمد قاسم علیہ الرحمۃ نے عالم شباب میں سندھ کے جنوبی علاقے میں امن وامان قائم کرنے کی ذمہ داری کو ایسے شاندار طریقے سے ادا کیا اور انسانی مساوات کا عملی طور پر وہ نقشہ جمایا کہ جنوبی علاقے کا حفظ امن و رفاہ عام شمالی علاقہ سندھ کے لئے جس کی حدود اُس وقت ملتان سے گزر کر ولایت لاہور کی حدود سے ملجاتی تھیں۔ باعث رشک ہوا۔ اور وہاں کے ارکان دولت نے خود جنوبی سندھ کے مسلمان حکمرانوں کو اپنے علاقے پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ اور اُن کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

فاتحین سندھ کو جہاں تک تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے بھٹنڈہ سے آگے قدم بڑھانیکا موقع نہیں ملا۔ اور سلطان محمود غزنوی کی افواج اگرچہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں اِس تاریخی علاقے کے بعض حصّوں سے گزریں۔ مگر اِس میدان میں کوئی قابل ذکر معرکہ اُن کو پیش نہیں آیا۔ اور محمود کے جانشین سلاطین غزنوی نے صرف دریائے ستلج کے اُس پار کے علاقہ تک اپنی توجہات کو محدود رکھا۔ جس میں وہ اِس قدر امن وامان قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ غوریوں کی روز افزوں قوت نے جب اُن کے موروثی مرکز حکومت (غزنی) میں اُن کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ تو "خسرو شاہ" نے پنجاب میں آکر لاہور کو اپنا مستقر حکومت بنایا اور خاندانِ غزنوی کا آخری حکمراں "خسرو ملک" لاہور کے باہر غوری افواج کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد بحالتِ اسیری اس مقام پر لیجایا گیا جہاں سے اُس کے مورثِ اعظم نے اپنی سلطنت کی حدود وسطِ ایشیا میں دریائے جیحوں سے نربدا کے کنارے تک وسیع کی تھیں!

شہاب الدین غوری کی لڑائیاں

غوریوں کے وقت سے مسلمانوں کا اقتدارِ حکومت مستقل طور پر اِس حصۂ ملک میں قائم ہوا۔ جو قدیم اصطلاح میں اصل "ہندوستان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کا اہم ترین حصّہ جو زرخیزی و نظافت آب وہو

میں ہندوستان کے سارے میدانی علاقوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ ہے جو گنگا و جمنا سے سیراب ہوتا ہے۔ جن دونوں دریاؤں کو اُن کے فوائدِ عظیم کے باعث جو کروڑوں انسانوں کو زراعت و دیگر صورتوں میں اُن سے پہونچتے ہیں۔ ہندوؤں نے مذہبی تقدیس کا مرتبہ دیدیا ہے۔ اُس علاقہ کے جو سارے ہندوستان کی جان سمجھا جاتا ہے۔ مرکزی مقامات پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے لئے سلطان شہاب الدین غوری کو اسی مشہور میدان کارزار کے قریب تراوڑی و تھانیسر میں مہاراجہ پرتھی راج اور شمالی ہند کے دیگر بیشتر راجگان کی متحدہ فوجی قوت کے بالمقابل اپنی شجاعت و بسالت کا ثبوت دینا پڑا۔ اور مہاراجہ پرتھی راج سے جو اہم سیاسی غلطی اپنی حُسن پرستی کی بدولت سرزد ہوئی تھی کہ اپنے خالہ زاد بھائی راجہ جے چند والیٔ قنوج کی لڑکی سنجوگتا کو وہ اُس کے "سویمبر" (جشنِ انتخاب شوہر) کے روز اُس کے باپ کی راجدھانی (قنوج) سے لے اُڑا تھا۔ اُس کا شدید ترین خمیازہ اُس کو تھانیسر کے میدان کارزار پر بھگتنا پڑا۔ کہ جے چند نے نہ صرف اپنی فوجی امداد اپنے جابر داماد سے دریغ رکھی۔ بلکہ اپنی ریشہ دوانیوں سے پرتھی راج کے حلیفوں میں بھی بددلی پیدا کردی۔ اس کے علاوہ مہاراجہ پرتھی راج نے فوج کی نگہداشت کے بدلے جو زمانہ محلوں اور باغوں میں مہارانی سنجوگتا کے گلشن جمال کی گلچینی میں گزارا تھا۔ وہ بھی اُس کے قوائے حربی و جسمانی پر اثر انداز ہوا اور ایک سال کی مسلسل عیش پرستی کے بعد میدان کارزار میں وہ مستعدی و سرگرمی اس سے ظاہر نہ ہو سکی جس نے سارے شمالی ہند کے حکمرانوں میں اُس کی دھاک بٹھا دی تھی۔

مہاراجہ پرتھی راج کے درباری شاعر چند بردے نے اپنے فیاض و حوصلہ مند مُربّی کا مرثیہ لکھنے میں مشرقی مبالغہ آمیزی و خیال آرائی کو جو دخل دیا ہے۔ اس نے ہندو عوام کے طبقہ میں جو "مہابھارت" کی رزم و بزم کی شاعرانہ داستانوں کو مستند تاریخ کا مرتبہ دیتے ہیں۔ ایک غلط افسانے کو شہرت دے دی ہے کہ مہاراجہ پرتھی راج نے شہاب الدین غوری کو ۱۸ مرتبہ میدانِ جنگ میں اسیر کرکے رہا کردیا تھا۔ مگر آخر الذکر نے مہاراجہ کو معرکۂ تھانیسر میں گرفتار کرنے کے بعد نہیں چھوڑا۔ اور قفس یا پنجرۂ آہنی میں بند کیا۔ اور عقوبت و ایذا رسانی سے اُس کی جان لینے کا درپے ہوا۔ حتیٰ کہ مہاراجہ کے درباری شاعر نے شہاب الدین کے دربار میں رسوخ اور خود سلطان موصوف کے مزاج میں در خور پیدا کرکے مہاراجہ پرتھی راج کو اپنے دشمن سے انتقام لینے کا ایک موقع اس طرح بہم پہنچایا کہ سلطان زرتی مہاراجہ پرتھی راج کے کمالِ تیراندازی کو دیکھنے کا مشتاق ہوا اور اگرچہ اُس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی تھی۔ مگر پرتھی راج نے اپنے بھاٹ سے شاعرانہ تلمیح میں اشارہ پاکر آواز پر ایسا درست

نشانہ لگایا کہ اُس کا تیر سلطان شہاب الدین غوری کے حلقوم کو توڑ کر گدی سے پار نکل گیا اور سلطان کی رُوح کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اِس واقعہ کے بعد سلطان کے سپاہیوں نے مہاراجہ پرتھی راج کو قتل کر دیا۔ مگر یہ تمام افسانہ بالکل فرضی ہے اور خود ہندو موٴرخوں کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہاراجہ پرتھی راج تھانیسر کے میدان میں لڑتا ہوا بہادروں کی طرح مارا گیا اور اُس کی لاش کُشتوں کے درمیان سے اُٹھائی گئی۔ شہاب الدین غوری کی موت اِس واقعہ کے ایک عرصے کے بعد دریائے جہلم اور اٹک کے درمیان اِس طرح واقع ہوئی کہ گکھڑ لٹیروں کی ایک جماعت شب کو موقع پا کر اُس کے خیمے میں گھس گئی اور سلطان کو بحالتِ خواب اس کے بستر پر قتل کر ڈالا۔

مسلمان بادشاہوں کا ہندوستان میں قیام

مگر سلطان موصوف نے ہندوستان سے اپنے وطن واپس جاتے ہوئے اِس ملک کی حکومت کا معقول انتظام کر دیا تھا اور اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو دہلی کے مرکز میں کامل اختیاراتِ حکمرانی کے ساتھ اپنا نائب قرار دے کر ملتان اور بنگال میں دو طاقتور و آزمودہ کار نائبوں کو جو قطب الدین کی مانند سلطان کے غلام تھے۔ اِس ہدایت کے ساتھ چھوڑا تھا کہ وہ قطب الدین کو اپنا افسر خیال کریں۔ سلطان شہاب الدین غوری کے مقتول ہونے پر چونکہ اس کا کوئی طاقتور جانشین باقی نہیں رہا تھا۔ اِس لئے قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں اپنی قوت کو مجتمع و مضبوط کرنے کی ضرورت سمجھی اور سرداروں کے مشورے سے تاجِ حکومت اپنے سر پر رکھا۔

اِس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت حرّیت، اخوّت و مساوات کے عملی مظاہرے سے شروع ہوئی۔ اور اِس ملک کے باشندے جو ذات پات اور چھوت چھات کی پابندیوں میں گرفتار تھے اور اب تک گرفتار ہیں۔ اُنھوں نے برأی العین اِس کا مشاہدہ کیا کہ اسلام انسانوں کو ان کی قابلیتوں کے موافق انتہائی ترقی کا موقع بہم پہنچاتا ہے اور ایک زر خرید غلام اپنی ہمت و لیاقت سے مرتبۂ شاہی حاصل کر سکتا ہے اور شاہی نسل کے لوگوں سے اپنا اقتدار تسلیم کرا سکتا ہے۔

ہندوستان کی واحد سلطانہ

ایبک نے اپنے ایک ترکی النسل غلام شمس الدین التمش کو اپنا جانشین نامزد کیا جس نے توسیعِ سلطنت و استحکامِ قوت میں اعلیٰ درجے کے جوہرِ قابلیت دکھائے اور اسی کی بیٹی سلطانہ رضیہ واحد ملکہ تھی جو ہندوستان میں تختِ شاہی پر بیٹھی۔ مگر اس کے عورت ہونے کی وجہ سے اُمرائے دربار نے اُس گہرے اعتماد کو جو سلطانہ رضیہ اپنے ایک حبشی غلام پر رکھتی تھی۔ خواہشاتِ نفسانی و جذباتِ حیوانی پر محمول کیا اور سلطانہ رضیہ

اسی مشہور میدانِ کارزار کے ایک حصے میں اپنے تاج کی حفاظت کرتی ہوئی گرفتار ہوئی۔ اور دوسری دفعہ کی کوشش میں بھی جو اُس نے محافظ قلعہ دار سے شادی کرکے دوبارہ تختِ شاہی حاصل کرنے کے لئے کی تھی ناکام رہ کر معہ اپنے شوہر کے دیہاتیوں کے ہاتھ سے ماری گئی۔ مگر اُس کا امتیاز و احترام آج سات صدیوں کے بعد بھی قائم ہے اور صنفِ نازک جوق در جوق دہلی میں اُس کے مزار پر۔ جو "رجی بجی کی درگاہ" کے نام سے موسوم ہے حاضر ہوتی اور لال چوڑیاں اور شیرینی اُس پر چڑھاتی ہیں!

سلطانہ رضیہ نے اپنے باپ کے اوصافِ قابلیت سے جو حصّہ پایا تھا وہ اُس کے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بارِ حکومت نہ سنبھال سکے۔ اور چھوٹے بھائی ناصر الدین محمود نے تختِ شاہی کو عملاً مصلّائے عبادت بنا کر ایک عابد مرتاض کی طرح زندگی گزاری اور انتظام سلطنت اپنے باپ کے ایک دانشمند و عالی ہمّت غلام غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خاں کو جو اُس کا بہنوئی بھی تھا تفویض کیا۔ جو اُس کی وفات کے بعد اُس کا جانشین ہوا۔ اور تاتاریوں کے حملوں کو بڑی حوصلہ مندی و ہوشیاری کے ساتھ مسترد کرتا رہا۔ اگرچہ اِس میں اُس کو اپنے قابل و ہر دلعزیز ولیعہد کی جان کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ جس کے صدمہ سے وہ خود جانبر نہ ہو سکا۔ اور خاندان غلامان کے اقتدار کی بنیاد بھی اسی واقعے کی وجہ سے مستاصل ہو گئی۔ کیونکہ بلبن کے دوسرے بیٹے قراخاں عرف بغرا خاں نے مرکزی حکومت کی خطرناک ذمّہ داریوں کو اپنے سر لینا مناسب نہ سمجھا۔ اور دانشمندی و عاقبت اندیشی کی راہ سے صرف بنگال کی حکومت پر قناعت کی۔ جس پر وہ اپنے بیٹے کیقباد کے دہلی میں مقتول ہونے اور خاندانِ غلامان کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی باطمینان تمام قریب تہائی صدی تک قائم رہا۔ اور اُس کی اولاد بھی عرصے تک وہاں صاحبِ اقتدار رہی۔

خاندانِ تغلق کے عہد کی لڑائیاں

سلطانہ رضیہ کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے بعد پانی پت کے تاریخی میدانِ کارزار میں قریب ڈیڑھ صدی تک قدرے سکون رہا۔ مگر امیر تیمور کے حملے سے تھوڑے عرصے قبل محمود شاہ تغلق و نصرت خاں ابن فرزند شاہ تغلق کی باہمی خانہ جنگی نے اِس علاقے کو بہادروں کے خون سے لالہ زار بنایا۔ اور امیر تیمور نے اپنے قریب نصف لاکھ قیدیوں کا خون اِسی میدان کے ایک گوشے میں بہایا۔ خاندانِ سادات کا حکمران محمد شاہ جب بہلول لودی کے دیپال پور اور ملتان کے علاقوں کو مسخر کرنے کے بعد اِس سے بدگمان ہوا۔ اور بہلول لودی ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ دار السلطنت دہلی کی طرف بڑھا۔

محمد شاہ سید اور بہلول لودی کی فوجوں کی پہلی مڈبھیڑ اسی میدان کے ایک حصے میں ہوئی اور محمد شاہ کی فوج تابِ مقاومت نہ لاکر دہلی چلی آئی۔ بہلول لودی کئی ماہ تک دہلی کا محاصرہ کئے رہنے کے بعد اُس وقت تو بے نیل مرام واپس چلا گیا۔ لیکن محمد شاہ سید کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے علاؤ الدین نے خود مرکزی حکومت بہلول کے سپرد کر دی اور خود بدایوں پر قناعت کی جو باپ کے وقت سے اُس کی جاگیر میں تھا۔

پانی پت کی پہلی جنگ

بہلول لودی اور اُس کے بیٹے سکندر لودی نے پون صدی سے زیادہ بڑے رُعب و دبدبے کے ساتھ حکومت کی۔ مگر وہ سلاطینِ شرقیہ جونپور کے جھگڑوں میں پھنسے رہے اور میدانِ پانی پت کو اُس کی مرغوب خونیں غذا نہیں پہونچا سکے۔ مگر سکندر کے بیٹے ابراہیم لودی نے یہ کمی سخت دردناک طریقے پر اس طرح پوری کی۔ کہ ایک لاکھ سواروں کی جمعیت اور ایک ہزار ہاتھیوں کی قوت کے باوجود نواحِ پانی پت میں بابر کے ہاتھوں جس کے ساتھ اُس وقت ۱۲ یا ۱۵ ہزار سواروں اور ۵ ہزار پیادوں سے زیادہ نہیں تھے شکست کھائی۔ اور اُس کی لاش میدانِ جنگ میں پٹھان سرداروں اور ہندو راجاؤں کی لاشوں کے درمیان پڑی ہوئی ملی۔ یہ پانی پت کی تین مشہور جنگوں میں سے پہلی جنگ تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی حکومت پٹھانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مغلوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور اگرچہ شیر شاہ سوری نے درمیان میں پندرہ سولہ برس کے لئے ہندوستان پر پٹھانوں کا اقتدار بحال کیا اور اپنی قابلیتِ حکمرانی کا ایک ایسا زبردست نقش بٹھایا کہ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کو اکثر امور خصوصاً بندوبست مالیہ اراضی میں اُس کی تقلید کرنی پڑی۔ اور آج انگریزی ریونیو سسٹم کے ایوانِ رفیع الشان کی بنیادوں میں بھی شیر شاہ کا وہ پرانا مصالحہ موجود ہے۔ مگر پانی پت کی پہلی لڑائی سے پٹھانوں کے اقتدار پر جو شدید ضرب لگی تھی اُس کے صدمے سے پنپنے کے لئے زیادہ مدت درکار تھی اور شیر شاہ کی عمر نے حصولِ سلطنت کے بعد پانچ سال سے زیادہ وفا نہیں کی۔ اور اُس کے جانشینوں میں اُس کی سی صلاحیت نہیں تھی۔ چنانچہ سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خاں کو اُس کی ترکِ سلطنت پر رضامند ہو جانے کے بعد بھی قدیم آبائی جاگیر بہار پر چین نہیں لینے دیا۔ اور آخر دونوں بھائیوں میں جنگ کی نوبت پہونچی۔

اسی طرح سلیم شاہ کی وفات کے بعد اُس کے فرزند فیروز خاں کو اُس کے حقیقی ماموں مبارز خاں نے قتل کر کے تختِ سلطنت پر قبضہ کیا۔ جس کے بعد خانہ جنگی کی آگ پٹھان سرداروں

کے درمیان سارے مُلک میں بھڑک اُٹھی اور پٹھانوں کے بحال شدہ اقتدار کے ایوان کو جلا کر خاک کرنے لگی۔ مُلک میں وہ بدامنی پھیلی کہ قمر بزخاں کے شاہی لقب "عدلی" کو بگاڑ کر لوگ "اندھلی" کہنے لگے۔ عدلی خود اسی خانہ جنگی میں مارا گیا۔ اور اسی اثنا میں ہمایوں نے براہ بھکر واپس آکر سندھ و ملتان اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ خاندانِ سُوری کے آخری حکمران سکندر نے نواح جالندھر میں بیس ہزار سپاہ کی جمعیت سے ہمایوں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ مگر شکست کھا کر کوہستانِ سوالک میں بھاگنے پر مجبور ہوا۔ اور ہمایوں نے دار السلطنت آگرہ تک راستہ صاف پایا۔ مگر چونکہ پٹھانوں کا خدشہ ابھی لگا ہوا تھا اور نوجوان ولیعہد جلال الدین معہ بہترین سپہ سالار بیرم خاں کے پہاڑوں میں شاہ سکندر کا تعاقب کر رہا تھا۔ اِس لئے ہمایوں نے قدیم دار السلطنت دہلی میں قیام کو ترجیح دی۔ اور شیر شاہ نے جو قلعہ ہندوؤں کے قدیم قلعہ کی بنیادوں پر تعمیر کرانا شروع کیا تھا اور ایک عالی شان مسجد و دیگر عمارات اُس میں بنائی تھیں۔ اُسی کو مکمل کر کے اپنا مسکن بنایا۔ مگر ہمایوں زیادہ عرصے تک اِس کو رہنا نصیب نہیں ہوا۔ اور پٹھانوں سے مُلک واپس لینے کی جدّ و جہد کا آخری اہم معرکہ کو وہ اپنے جانشین کے لئے چھوڑ گیا۔

پانی پت کی دوسری جنگ یہ آخری اہم معرکہ اکبر کو اپنی تخت نشینی کے بعد ہی عدلی شاہ سُوری کے دیوان ہیمو کے ساتھ جس نے بقّال ہونے کے باوجود ملک داری و سپہ سالاری کی اعلیٰ قابلیتوں کا ثبوت دیا۔ اِسی پانی پت کے میدان میں لڑنا پڑا۔ جہاں اِس کے دادا نے تیس برس پہلے شاہ ابراہیم لودھی کو شکست دے کر سلطنتِ مغلیہ کی حکومت کا جھنڈا سرزمینِ ہند پر نصب کیا تھا۔ ہیمو بقّال دہلی کو مغل حاکم تردی بیگ سے چھیننے میں کامیاب ہو گیا تھا اور گزشتہ معرکوں میں اِس نے اپنی فوج کو بڑی حکمتِ عملی سے لڑایا تھا۔ مگر بعض روایات سے پایا جاتا ہے کہ خود کو دہلی کی تاریخی سرزمین کا حاکم پا کر ہیمو کو سلطنت کی ہوس دامنگیر ہوئی اور شاہ عدلی کے جانشین کی نیابت اپنے لئے ناکافی سمجھ کر اس نے خود مہاراجہ کا لقب اختیار کرنا چاہا۔ پنجاب کے ایک اخبار میں چند ماہ قبل ہیمو کی ایک تصویر ایسی حالت میں شائع ہوئی تھی کہ وہ تخت چتر شاہی کے نیچے متمکن ہے اور خدّام مُورچھل لئے مگس پرانی میں مشغول ہیں۔ یہ تصویر بظاہر فرضی ہے۔ مگر تاریخ کی بعض روایات کے بموجب ہیمو کی دلی خواہش و ارادے کا اِس سے مترشح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہیمو کے سردارانِ فوج کو جو زیادہ تر پٹھان اور شاہانِ سُوری کے متوسلین تھے جب اِس کے اِس ارادے کا علم ہوا ہو گا تو اُن کے دلوں میں کیسے خطرات پیدا ہو گئے ہونگے۔

ہ اسی قسم کی ارادے کے اظہار کی غلطی جنگ سوم پانی پت سے قبل مرہٹوں کے سپہ سالار بھاؤ سے
ی سرزد ہوئی اور اُس کا خمیازہ بھی اُس کو ہیمو کی طرح بھگتنا پڑا۔

دوسرے ہیمو نے ہاتھیوں کے چابکدست مغل تیراندازوں کے سامنے کارآمد نہ ہونے کی بابت
ابراہیم لودی) کی پہلی لڑائی کے واقعات سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اکبر کے ایرانی و افغان سپاہیوں
رعب ڈالنے کے لئے ہاتھیوں کی ایک تعداد کثیر اپنے ساتھ میدانِ جنگ میں لے گیا۔ جن کی وجہ سے
ن کی فوج کی نقل و حرکت میں دقت پیدا ہوئی اور ہاتھی مغلوں کے تیروں اور آتشبازی سے پریشان
پنی ہی فوج کو پامال کرنے لگے۔ ہیمو نے ذاتی طور پر کافی شجاعت کا اظہار کیا۔ مگر جب دشمن کا ایک
ان کر اُس کی آنکھ میں لگا تو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے اُس تیر کو کھینچ کر باہر نکالا اور رُومال کو تہہ کر کے
ی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور فیلبان کو ہاتھی اُس جگہ لے چلنے کا حکم دیا جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔
فیلبان کی کوشش کے باوجود ہاتھی نے دوسری راہ اختیار کی اور ہیمو اِس طرح اکبری سپاہیوں کے
ہاتھوں میں گرفتار ہو گیا۔ جس کے بعد اُس کی سپاہ نے ہمت ہار دی اور باوجودیکہ اُس کی تعداد اکبر کی
ج سے زیادہ تھی مگر میدان سے اس کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ہیمو کی قوت کے منتشر ہوتے ہی پٹھانوں کا
در ٹوٹ گیا اور اُن کو پہاڑوں سے اُتر کر میدانی علاقوں میں قسمت آزمائی کے لئے آنے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ بلکہ
اعظم کے اقبال نے رفتہ رفتہ سب کو مطیع و منقاد بنا لیا۔ اور سلطنتِ مغلیہ کی مہمات اِن کے ہاتھوں سے
ر ہونے لگیں۔ اِس طرح پانی پت کی دوسری لڑائی نے مغل شہنشاہی کی متزلزل بنیادوں کو از سرِ نو مضبوط
ردیا۔ اور ہندوستان میں اُس دورِ عظمت و جلالت کا آغاز ہوا جو اس مُلک بلکہ دُنیا کی تاریخ میں
ہمیشہ قابلِ یادگار رہے گا۔

اکبر اعظم۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور عالمگیر کے عہدِ حکومت میں جو ڈیڑھ صدی سے زیادہ کے طویل زمانے
پھیلا ہوا تھا۔ اور نہ صرف مغلوں اور مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا درخشاں ترین دَور تھا۔
نی پت اور اُس کے گرد و نواح کے میدان کو اُس کی خونیں غذا محض برائے نام ملی۔ اور شہنشاہ عالمگیر کے
بیٹوں اور پوتوں کی باہمی لڑائیاں بھی حصولِ تخت کے لئے لاہور و آگرہ کے گرد و نواح میں ہوئیں۔

ندا بیراگی کے مظالم

مگر ان خانہ جنگیوں کی بدولت پنجاب میں سکھوں کو سر اُٹھانے کا موقع مل گیا۔
اور اِن کے دسویں گورو گوبند سنگھ جی کے دو نوجوان لڑکوں کے میدان
نگ میں کام آنے کے بعد ہی باقیماندہ دونوں خورد سال بچوں پر سرہند میں جو دردناک واقعہ ایک
برہمن کی دغابازی اور دوسرے برہمن کی غمازی سے گزرا تھا کہ مشہورِ عام روایت کے بموجب وہ

زندہ دیوار میں چنوا دیے گئے تھے اور زیادہ مستند روایت کے موافق اُن بچوں کے سر تلوار سے قلم کئے گئے تھے۔ اُس نے سکھوں میں ایک زبردست جوشِ غصّہ و انتقام کا پیدا کر دیا۔ چنانچہ بندا بیراگی کی قیادت میں اُنھوں نے لوٹ مار پر کمر باندھی۔ اور نواب وزیر خاں حاکم سرہند کے لڑائی میں مارے جانے کے بعد سرہند میں داخل ہو کر اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور مسلمان مردوں، عورتوں، اور بچوں کو بڑی عقوبت کے ساتھ قتل کرنے کے علاوہ مساجد و مقابر کو منہدم کیا۔ اور قبروں میں سے مُردوں کی لاشیں اُکھاڑ کر جلائیں۔ الغرض انتہائی شقاوت و بربریت بندا بیراگی اور اُس کی ماتحت سپاہ سے ظاہر ہوئی اور سرہند سے لے کر دیو بند اور پانی پت تک اپنا تسلط بٹھا کر اِس علاقے کے تمام دیہات و قصبات کو اُنھوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ آخر سلطان قلی خاں برادر زادۂ رستم دل خاں کو دربارِ شاہی سے اُن کی تادیب کے لئے مامور کیا گیا۔ جس نے پہلے پانی پت میں پہنچ کر سکھوں کی ایک طاقتور فوج کو جو بماتحتی کیہری سنگھ وہاں تعینات تھی۔ تھوڑے دنوں کے مقابلے کے بعد شکست دی۔ کیہری سنگھ مقتول ہوا۔ اور اُس کی فوج کے بقیۃ السیف آدمی بھاگ کر سرہند میں بندا کے پاس پہنچے۔ سلطان قلی خاں پانی پت پر اپنا دخل کر کے اُن کے تعاقب میں سرہند پہنچا اور دوسری طرف سے نواب خانخاناں کو بھی بادشاہ نے اِس مہم پر تعینات کیا۔ اِن دونوں شاہی سرداروں نے سرہند پر ایک خونخوار جنگ کے بعد بندا بیراگی کا شیرازۂ جمعیت پریشان کر دیا۔ مگر وہ گرفتار نہ ہو سکا اور بھاگ کر اپنی کوہستانی جائے پناہ قلعۂ لوہگڑھ میں چلا گیا۔ جس کو ایک طویل محاصرہ و رسد بندی کے بعد شاہی فوج نے مسخر کیا۔ اور بندا اکثر رفقاء کے مقتول ہونے کے بعد گرفتار کر کے دار الحکومت میں لایا اور کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔

نادر شاہ کی فوج کی لڑائی

اِس کے بعد قریباً چوتھائی صدی تک اِس خون آشام علاقے کو اُس کی مرغوب غذا نہیں پہنچی اور دربارِ شاہی میں طاقتور اُمراء اپنی "بادشاہ گری" کے کرتب دکھاتے اور شہنشاہ عالمگیر کے پوتوں اور پرپوتوں کو بطور کٹھ پتلیوں کے اپنی اُنگلیوں پر نچاتے رہے۔ محمد شاہ نے تورانی اُمراء کی حمایت و اعانت سے اِس ناگوار تماشے کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر سلطنت کی مرکزی قوت اِس طرح اور ضعیف ہوئی اور محمد شاہ کی عیش پرستیوں اور ارکانِ دولت کی خود غرضیوں اور اندرونی کاوشوں نے جب نادر شاہ کو ہندوستان کے حملے کی ہمت دلائی تو ایرانی اور ہندوستانی فوجوں کی باہمی نام نہاد لڑائی اِسی تاریخی میدانِ کارزار کے ایک گوشے میں کرنال کے قریب ہوئی۔

میں نے اِس کو "نام نہاد لڑائی" بدیں وجہ لکھا ہے کہ مغل شہنشاہی فوج کا صرف ایک چھوٹا سا
میدانِ کرنال پر نادرشاہ کے تقریباً نصف لاکھ جفاکش اور دلیر و خونخوار سپاہیوں سے نبرد آزما ہوا
اور فی الحقیقت نواب خان دوران خاں صمصام الدولہ اور اُن کے بھائی نواب مقام الدولہ
جو آخری شاہ اودھ کے آخری بدنام وزیر نواب علی نقی خاں کے بزرگ تھے، شجاعت کے ساتھ
حلالی و جاں نثاری کے جوہر دکھا کر اپنی جانیں خدمتِ سلطنت میں قربان کر دی تھیں۔ نواب
سعادت خاں برہان الملک بانیٔ حکومتِ اودھ بھی اِس میدان میں لڑے۔ مگر قزلباشوں کے ہاتھوں
گرفتار ہو گئے۔ باقی ماندہ امراء و سردار اپنے اپنے کیمپوں میں مشغولِ عیش و طرب رہے اور نواب
ز خاں صوبہ دار بنگال جو ایک بڑی فوج کے ساتھ محمد شاہ کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ ان کو
اِس معرکے کی اُس وقت خبر ہوئی۔ جبکہ ایرانی فوج صرف نادرشاہ کی خوش قسمتی اور محمد شاہ
فرمانروائے ہند کی سستی و سہل انگاری سے مظفر و منصور اپنے کیمپ میں داخل ہو چکی تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کے
زوالِ اقتدار اور خصوصاً حملۂ نادری کی داستان بڑی دردناک و عبرت انگیز ہے اور اگر کبھی اس پر
تفصیل سے لکھنے کا موقع ملے گا تو معلوم ہو گا کہ شہنشاہ عالمگیر کی نصف صدی کی مسلسل کوششوں کو اُس
کے نااہل جانشینوں نے کس طرح خاک میں ملایا۔ اور جس شہنشاہ نے اپنے سرحدی علاقے کے گورنر کی
اِس سفارش پر ناخوشی کا اظہار کیا تھا کہ ایرانی حاکم علاقہ سرحدی کو آدھ کوس اِدھر "چوکی خانہ" قائم
کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تاکہ وہ موسم کے شدائد سے محفوظ رہ سکے۔ اُس کے پڑپوتے نے عیش و
عشرت میں پڑ کر کس قدر غفلت برتی کہ نادرشاہ معہ اپنے لشکرِ جرار کے دارالسلطنت کے قریب آپہنچا۔ اور
دربار میں بادشاہ یا کسی امیر کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ بلکہ ایک مستند خیال کی یادداشتوں میں یہ روایت
بھی نظر سے گزری کہ علاقۂ اٹک کے حاکم کی عرضداشت نادرشاہ کے ہندوستان کی طرف بڑھنے کی
اطلاع کے متعلق اُس وقت محمد شاہ کے سامنے پیش ہوئی۔ جبکہ قلعۂ دہلی میں نادرشاہ کے ساتھ اُن کی صحبت
گرم تھی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

خاندانِ مغلیہ کی آخری شاندار فتح

نادرگردی کا ہولناک واقعہ جس میں دارالسلطنت کے ہزارہا باشندوں
کی جانیں اور مال نادری سپاہیوں کے ہاتھوں تلف ہونے کے
علاوہ شہنشاہانِ مغلیہ کے دو صدیوں کے فراہم کردہ خزائن و سامانِ تجمل بھی معہ تخت طاؤس کے ہاتھ
سے نکل گیا تھا۔ محمد شاہ اور اُن کے اُمراء کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہئے تھا۔ مگر افسوس
ہے کہ انھوں نے کوئی سبقِ عبرت نہیں لیا۔ اور نواب چین قلیچ خاں بہادر نظام الملک اوّل دربار

کے اِس رنگ کو اپنے لئے ناقابل برداشت پاکر جب اپنے صوبۂ دکن کو رخصت ہو گئے تو اُمرائے بادشاہی اور بھی کُھل کھیلے اور شمال و مغرب کی طرف سے حملہ آوروں کی فاتحانہ پیش قدمی کے جس پُرانے طریقے کی دو صدیوں تک ملتوی رہنے کے بعد نادر شاہ نے تجدید کی تھی۔ اُس کی روک تھام کی کوئی فکر نہ کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احمد شاہ ابدالی کو جس نے نادر شاہ کے مقتول ہونے کے بعد اپنے ہمقوم افغانوں کی رضامندی و اعانت سے افغانستان کی فرماں روائی کا لقب اپنے لئے اختیار کر لیا تھا۔ ناصر خاں نادری صوبہ دار کابل کی تادیب کے حیلے سے جو دربارِ دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے کابل و پشاور پر دستِ تعدی دراز کرنے کی فریاد لے کر گیا تھا۔ قریباً تیس ہزار افغان سوار کی جمعیت کے ساتھ دریائے اٹک۔ جہلم۔ چناب کو تیزی سے عبور کرنے کا موقع مل گیا۔ اور شاہنواز خاں بن زکریا خاں مرحوم نے جو اپنے بڑے بھائی یحییٰ خاں کو قید کر کے صوبہ دار لاہور بن بیٹھا تھا۔ اور چنداں انتظامی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا۔ جب اپنے میں شاہ ابدالی کے مقابلے کی تاب نہ پائی۔ تو لاہور کا شہر و قلعہ اُس کے سپرد کر دیا۔ احمد شاہ نے خزانۂ لاہور سے خاطر خواہ نقد و جنس لیکر اپنی قوت بڑھائی اور اپنے سابق آقا نادر شاہ کی روایت کو تازہ کرنے کے ارادے سے دار السلطنت دہلی کی طرف کوچ کیا۔ مگر لاہور کے بلا جنگ و جدل ہاتھ سے نکل جانے کی خبر سُنکر محمد شاہ کے دربار میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی اور ایک لشکر شاہی برائے نام ولیعہد شاہزادۂ احمد شاہ کے ماتحت لیکن فی الحقیقت وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین کی زیر قیادت احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی رُوکنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ جس میں نواب صفدر جنگ اور بعض راجپوت رئیس بھی مہاراجہ ایسری سنگھ کچھواہہ کی سرکردگی میں شامل تھے۔ یہ لشکر شاہی تیزی سے کوچ کر کے اِسی خون آشام علاقے کے شمالی مغربی سرے پر سرہند میں پُہنچا۔ جس کا نام ہی اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں سے "دہلی" ہندوستان" کی سرحد شروع ہوتی ہے

یہاں شاہی لشکر کا بھاری اسباب اور بھیر و بنگاہ وغیرہ چھوڑ دیا گیا۔ اور فوج کو شاہ ابدالی کی پیش قدمی رُوکنے کے لئے آگے بڑھا کر دریائے ستلج کے مشہور گھاٹ ماچھی واڑہ پر تعینات کیا گیا۔ مگر شاہ مذکور نے مغلوں کے لشکر کی آمد سے خبردار ہو کر اِس طرف کا رُخ نہیں کیا اور لُدھیانے کے گھاٹ سے دریائے ستلج کو عبُور کر کے وہ بالا بالا سرہند پر پہنچ گیا۔ اور حسب معمول شہر کو لوٹ لیا۔ اگر شاہ کی کوئی اور قلیل جمعیت بھی دریائے ستلج کے اُس طرف ہوتی۔ تو مُغلیہ لشکر دونوں طرف سے دشمنوں میں گھر جاتا۔ اور شاہ ابدالی کو دہلی کی شہنشاہی قوت پر ایک شدید ضرب لگانے کا موقع مل جاتا۔ مگر شاہ کی

ساری فوج اُس کے ساتھ دریا کے پار آگئی تھی۔ اِس لئے شاہزادہ احمد شاہ نے ماچھی واڑے سے بآسانی اپنے لشکر کا رُخ سرہند کی طرف پھیرا۔ اور موضع مانپور میں جو سرہند سے چند کوس کے فاصلے پر ہے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ احمد شاہ ابدالی نے جو سرہند کے باہر باغ شالامار میں مقیم تھا، وہاں سے نکل کر ایک مضبوط جگہ میں قیام کیا۔ اور سولہ ۱۶ روز تک توپوں اور تاخت کرنے والے دستوں کی باہمی جنگ ہوتی رہی۔ احمد شاہ ابدالی چونکہ بیگانے ملک میں تھا۔ لہٰذا لڑائی کے طوالت پذیر ہونے کے ساتھ اُس کا سامانِ رسد اور گولہ بارود گھٹتا جاتا تھا اور مغلیہ لشکر کو دونوں طرف سے مدد ملنے کی اُمید تھی۔ اِس لئے سترھویں روز احمد شاہ اپنے مورچوں سے نکلا اور اس نے لشکرِ مغلیہ پر حملہ کیا۔ ابتدائی حملے ہی میں اعتماد الدولہ امیر قمر الدین وزیر جو درِ اصل اِس لشکر کے رُوحِ رواں تھے۔ ابدالیوں کی توپ کے ایک گولے سے ایسے وقت پر مارے گئے کہ ولیعہد شاہزادہ احمد شاہ اپنے خیمے سے نکل کر میدانِ جنگ میں بھی پہنچنے نہیں پایا تھا۔

تُورانیوں کی ایک جنگی رسم

میر قمر الدین کی ہلاکت سے شاہی فوج میں بددلی پھیلنے لگی۔ اور دوسری طرف شاہ ابدالی کی سپاہ کے کچھ آدمی مغلیہ لشکر کے بھیر و بنگاہ میں گھس کر اُس کو لوٹنے لگے۔ اور متعدد اراب سامان و اجناس سے بھرے ہوئے اپنی طرف کھینچ لے گئے۔ اِس واقعے سے مہاراجہ ایسری سنگھ کچھواہہ پر افغانوں کی دہشت طاری ہوئی اور وہ اپنے دستۂ فوج کو شاہزادہ ولیعہد کے لشکر سے نکال کر اپنے مستقر "جے نگر" کی طرف چلا گیا۔ یہ تمام اُمور مغلیہ فوج کی شکست پر دلالت کرتے تھے اور ابدالی کے افغان سپاہی کمال بہادری سے لڑ رہے تھے کہ معین الدین عرف میر منو پسر اعتماد الدولہ امیر قمر الدین وزیر نے اپنے مقتول باپ کے اُن جذباتِ وفاداری سے جو مغلیہ فوج اور خصوصاً تورانی دستوں کے دلوں میں وزیر مرحوم کی طرف سے موجود تھے، ایک آخری اپیل کی۔ اور ترکوں کے دستور کے موافق وزیر مرحوم کی نعش کو آگے رکھ کر افغانوں کے قلبِ سپاہ پر ایک نہایت زبردست حملہ کیا۔ میرزا رفیع سودا اپنے ایک شعر میں ترکوں کے اسی جنگی دستور کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

لے دل یہ کس سے بگڑ کر آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

یہ طریقہ کامیاب ہوا۔ اور مغلوں اور تورانیوں نے اپنے مُربّی وزیر کی لاش کو بے حُرمتی سے بچانے کے لئے اس زور و قوت کے ساتھ حملہ کیا کہ افغانوں کو اپنی مسلّمہ جفاکشی و تہور کے باوجود تابِ مقاومت باقی نہ رہی۔ مغلوں کی یہ آخری فتح تھی جو اِسی مشہور خون آشام علاقے کے ایک حصے میں اُس مقام (پانی پت) سے تھوڑے ہی فاصلے پر اُن کو حاصل ہوئی۔ جہاں بابر نے قریباً ۲ دو صدی قبل ابراہیم لودی پر فتح عظیم

حاصل کرکے ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا جھنڈا گاڑا تھا۔ شاہ ابدالی کی فوج میں ایک یہ حادثہ بھی رونما ہوا کہ اُسی وقت کچھ ابر آکر مینہ برسنے لگا۔ سپاہی سامان خاص کر گولہ بارود کو بارش سے بچانے کے لئے دوڑے۔ اس گھبراہٹ میں کسی افغان سپاہی کی بندوق اتفاقیہ چل گئی یا کوئی اور سبب ہوا کہ بانوں کے ایک انبار میں آگ لگ گئی اور ہزاروں بانوں کے ایک دم چھٹنے سے شاہ ابدالی کی فوج کے سینکڑوں آدمی ہلاک ہوگئے اور ان سے زیادہ مجروح ہوئے۔ اس سے افغانی فوج میں ابتری پھیلی۔ اور شاہ ابدالی نے آفتاب غروب ہوجانے کو غنیمت سمجھا۔ اور طبلِ بازگشت بجواکر اپنی فوج کو مورچے سے باغِ شالامار کی طرف واپس لے گیا۔ اور وہاں اپنے سرداروں سے مشورہ کرنیکے بعد شب کی تاریکی ہی میں دریائے ستلج کو عبور کرکے واپس روانہ ہوگیا۔ لڑائی کا کوئی عملی نتیجہ شام تک نہیں نکلا تھا۔ مگر احمد شاہ ابدالی کے اپنے مورچے کو چھوڑنے پر مغلیہ فوج نے اس مقام پر قبضہ کرلیا اور شادیانے فتح کے بجنے لگے۔

احدیوں کی جانفشانی

دہلی میں یہ روایت مسن لوگوں سے سُنی گئی ہے اور بعض خاندانی یادداشتوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغلوں کو یہ آخری شاندار فتح "احدیوں" کی بدولت نصیب ہوئی۔ جن کی گھیتلی کفش اُن کو آسانی سے مڑنے کا موقع نہیں دیتی تھیں۔ اس لئے وہ افغانوں کی آتش باری کے سامنے دلیرانہ بڑھتے ہوئے چلے گئے۔ اور اگرچہ اُن کی بڑی تعداد اسی میدان میں کھیت رہی۔ مگر اس معرکے میں حکومتِ مغلیہ کو فتح دلاکر تقریباً ڈیڑھ صدی کے حقِ نمک سے ادا ہوگئے۔ اور قمر الدین وزیر نے میدانِ جنگ میں مقتول ہونے کے بعد بھی یہ کارنمایاں کیا۔ کہ اُس کی لاش نے مغلیہ سپاہ کی از سرِ نو ہمت بندھائی اور آخری زبردست ہلہ کا جوش ان میں پیدا کرکے ہاری ہوئی لڑائی کو جیت لیا۔ کاش کہ اس کے فرزند میر منو میں باپ کا سا حوصلہ ہوتا۔ یا لشکرِ شاہی میں دیگر سردار اسی قابلیت کے موجود ہوتے تو شاہ ابدالی کا تعاقب کیا جاتا اور شاید اُس کی قوت کو ہمیشہ کے لئے توڑا جاسکتا۔ مگر مصلحتِ ایزدی احمد شاہ ابدالی کی اعلیٰ جنگی قابلیت سے پانی پت کے میدان میں وہاں کے سب سے بڑے اور خونریز ترین معرکے میں کام لینا چاہتی تھی۔ اور اس کے ہاتھ سے بظاہر مرہٹوں کی قوت اور بباطن مغلوں کے شاہی اقتدار پر بھی ایک مہلک ضرب لگانا چاہتی تھی۔ اس لئے سرہند کی لڑائی فتح ہونے کے بعد شاہ ابدالی کے تعاقب میں سرگرمی ظاہر نہیں کی گئی۔ اور اس اثناء میں دہلی سے محمد شاہ کے وفات پانے کی خبر آپہنچی۔ جس نے شاہزادہ ولیعہد احمد شاہ کو بیرونی دشمن کا تعاقب چھوڑ کر اپنی میراث پر قبضہ کرنیکے لئے بےچین کردیا۔ اور وہ میر منو کو صوبہ داری لاہور و ملتان کا خلعت و فرمان دیکر جو پیشگاہِ محمد شاہ سے بعد فتح

سرہند اُس کے نام صادر ہو چکا تھا دارالسلطنت دہلی کو روانہ ہو گیا۔

پنجاب پر افغانوں کی دستبرد

میر منّو جو اب شاہی خطاب نواب معین الملک سے سربلند کیا گیا تھا۔ اُس وقت کے دیگر اُمرائے مغلیہ کی طرح اپنے باپ دادا کے اوصاف ملک داری و سپہ سالاری سے محروم تھا۔ اگر وہ طاقتور و مستعد ہوتا تو اٹک اور دوسرے دریاؤں پر گھاٹوں کی نگہبانی و حفاظت کا کافی انتظام کرتا۔ اور پنجاب میں امن و امان قائم رکھتا تو شاہ ابدالی کو سرہند کا سبق اس قدر جلد فراموش نہ ہو جاتا۔ مگر میر منّو کی کمزوری نے احمد شاہ ابدالی کو دوسرے ہی سال پنجاب پر حملہ آور ہونے کی ہمت دلائی۔ اور نادر شاہ کے مشرقی علاقوں کے حکمران کی حیثیت میں اس نے چار محال سیالکوٹ۔ گجرات۔ اورنگ آباد و پسرور کا خراج میر منّو سے طلب کیا۔ میر منّو نے زبانِ شمشیر سے جواب دینے کے بجائے اِس مطالبہ کو بڑی حد تک تسلیم کر لیا اور کچھ روپیہ نذر کر کے شاہ ابدالی کو ٹال دینا مناسب سمجھا۔ اس طرح پنجاب کی سیاست میں یہ اختلال پیدا ہو گیا کہ اُس کا مقامی حاکم ایک طرف مغلیہ دربارِ دہلی کی طرف سے باضابطہ صوبہ دار تھا اور دوسری جانب شاہ ابدالی کو بھی چار محالوں کا خراج دینے کا ذمہ دار تھا۔

سکھوں کی قوت بڑھنے لگی

اِس اثنا میں سکھوں نے پھر سر اُٹھایا اور دوآبہ بست جالندھر اور دوآبۂ باری میں شرارت و فساد پھیلانا شروع کیا۔ آدینہ بیگ خاں جو ذکریا بیگ خاں متوفی صوبہ دارِ لاہور کا عزیز اور ان دونوں علاقوں کی فوجداری پر مامور تھا۔ اور میر منّو نے پنجاب کی گورنری کا چارج لینے کے بعد اُس کو اِس منصب پر بحال رکھا تھا۔ سکھوں کے ساتھ مسامحت برتتا تھا۔ اور صرف اپنے مستقر سے اُن کو خارج کر دینا کافی سمجھتا تھا۔ سکھوں کی اِن شرارتوں نے دیہات کی آبادی کو سخت پریشان کیا۔ اور وہ دربارِ مغلیہ کے کمزور حکام کی طرف سے مایوس ہو کر شاہ ابدالی سے مضبوط حکومت کی توقعات وابستہ کرنے لگے۔ اِس لئے شاہ ابدالی کو تین سال بعد پھر لاہور پر حملہ کرنے کی ترغیب ہوئی۔ اور اگرچہ میر منّو کی طرف سے مہاراجہ کوڑا مل نے کمال شجاعت کے ساتھ افغانوں کا مقابلہ کیا۔ مگر آدینہ بیگ خاں کی شرارتِ باطنی کے باعث راجہ موصوف کو بروقت کمک نہ پہنچی اور وہ میدانِ کارزار میں بندوق کی ایک گولی کھا کر اپنے غافل و عیش پرست آقایانِ دہلی پر اپنی جان نثار کر گیا۔ راجہ کوڑا مل کے مقتول ہونے پر نہ صرف اُس کی ہراولی فوج ہمت ہار گئی بلکہ میر منّو اور آدینہ بیگ خاں کو بھی میدانِ جنگ میں ٹھہرنے کا حوصلہ باقی نہ رہا اور اُنھوں نے قلعے میں پناہ لیکر شہر لاہور کو شاہ ابدالی کے سنگدل و حریص افغان سپاہیوں کے رحم پر چھوڑ دیا جنھوں نے شہریوں کے خون

ورر دیئے سے خوب اپنے ہاتھ رنگے۔ اور میر منو بھی بعد میں قلعے سے تنہا شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اظہار عجز و نیاز کے ساتھ کچھ نقد و جنس پیش کر کے اُس نے شاہ افغانستان کی طرف سے صوبہ داری لاہور و ملتان کی سند باضابطہ اپنے نام حاصل کر لی۔

تھانیسر پر سکھوں کی یورش

شاہ ابدالی اس کے بعد کابل واپس چلا گیا۔ مگر آدینہ بیگ خاں چونکہ حسب الطلب میر منو شاہ ابدالی کے حملے کی روک تھام کے لئے معہ اپنی سپاہ کے لاہور گیا تھا۔ اس لئے سکھوں نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھایا۔ اور تھانیسر پر تاخت کر کے اس خونِ آشام علاقے کے ایک حصے کو پھر انسانی خون کی غذا پہنچائی۔ اور باشندگانِ قصبہ کے گھروں کو لوٹنے پر اکتفا نہ کر کے اُن کو مسمار بھی کر دیا۔ اور کورکھشیتر میں وہ تالاب تیار کرایا۔ یا پُرانے چھوٹے تالاب کو بڑھایا جس پر اس وقت بھی سورج گرہن کا میلہ لگتا ہے۔ دربارِ دہلی اپنے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا ہونے کے باعث سکھوں کی ان شرارتوں کا جو دارالسلطنت سے اس قدر قریب ہو رہی تھیں۔ کوئی سدِ باب نہ کر سکا۔ البتہ آدینہ بیگ خاں نے شاہ ابدالی کے رخصت ہونیکے بعد اپنے مستقر میں واپس آ کر سکھوں کو قرار واقعی سرزنش کی اور مغلیہ تھانے دوبارہ وہاں بٹھائے۔

ایک خاتون کا پنجاب میں انتظام

اس اثناء میں میر منو نے لاہور کے گرد و نواح میں مشہور روایت کے بموجب شکار میں گھوڑے سے گر کر اور ایک غیر مستند روایت کے وافق مرض ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور لاہور و ملتان کی صوبہ داری پھر خالی ہوئی۔ میر منو کی بیوی نے کابل و دہلی دونوں طرف سلسلہ جنبانی کی اور دونوں جگہ سے فرمانِ صوبہ داری اپنے ورد سالہ فرزند میر مومن کے نام حاصل کر کے خود فرائضِ حکومت بڑی ہوشیاری سے ادا کرنے شروع کئے۔ مگر میر مومن کا خورد سال لڑکا تھوڑے دنوں کے بعد فوت ہو گیا اور اگرچہ بیوہ میر منو نے اپنے داماد خواجہ مومن اعرازی کے نام سندِ صوبہ داری شاہ ابدالی سے حاصل کر لی۔ مگر خود صوبۂ مذکور کی عمال کو ایک عورت کی ماتحتی قدرتی طور پر ناگوار گزری اور اُنھوں نے دربارِ دہلی میں ریشہ دوانیاں کرنے کے ساتھ لاہور میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ان میں نواب روشن الدولہ کا فرزند میر بھکاری خاں ملقب بہ رستم جنگ بھی شامل تھا۔ جو مدار المہامی کے معتقد عہدے پر مامور تھا۔ بیوہ میر منو نے رستم جنگ کی بدنیتی سے آگاہ ہو کر اُس کو ایک حیلے سے محل میں بُلایا اور اپنی کنیزوں کے ہاتھوں سے پٹوا کر اس کی شرارتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا مگر ایک عورت کے لئے خواہ وہ کیسی ہی طاقتور و ہوشیار ہو۔ محل میں رہ کر مردوں کی اِن شرارتوں کا زیادہ عرصہ تک مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ چنانچہ

خواجہ عبداللہ خاں پسر نواب عبدالصمد خاں نے بیگم کو محل میں نظر بند کر دیا اور نیابتِ صوبہ کی سند شاہ ابدالی سے اپنے نام منگالی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد خواجہ عبداللہ خاں کو اپنی فوج کے ہنگامۂ طلبی تنخواہ سے بھاگنا پڑا۔ اور بیوۂ میر منو کا اقتدار پھر بحال ہو گیا۔ مگر اب نواب عماد الملک غازی الدین خاں ثانی وزیر اعظم مغل شہنشاہ دہلی کی شرارت و خود غرضی نے صورتِ حال میں ایک تغیرِ عظیم پیدا کیا۔ یہ امیر فی الحقیقت مغل سلطنت کے لئے نحوستِ مجسم تھا۔ جس نے دو بادشاہوں احمد شاہ و عالمگیر ثانی کو قتل کرایا اور پانی پت کی عظیم خونخوار جنگ بھی دراصل اسی کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔

مغل شہنشاہی کی "نحوستِ عظیم"

عماد الملک، نواب نظام الملک آصف جاہ اول کا پوتا۔ امیر الامراء نواب فیروز جنگ غازی الدین اول کا بیٹا اور نواب وزیر الممالک عماد الدولہ قمر الدین خاں کا جن کی لاش کو آگے رکھکر سرہند میں مغلیہ فوج نے شاہ ابدالی کی سپاہ پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اور افغانوں کا منھ پھیر دیا تھا۔ نواسا تھا۔ اس کا نام و رباپ جب نظام الملک اول کی خبر وفات سن کر اپنی موروثی مسند پر قبضہ کرنے کے لئے دکن روانہ ہوا۔ تو اپنے فرزند کو جس کا اصلی نام میر شہاب الدین تھا، بادشاہ کے دامنِ شفقت اور نواب صفدر جنگ کی سرپرستی میں چھوڑ گیا۔ اس کے بعد جب نواب فیروز جنگ نے دکن میں پہنچتے ہی وفات پائی اور ان کی لاش بغرضِ تدفین دہلی لائی جا کر اس مقبرے میں پُر دِ زمین کی گئی۔ جو امیر الامراء نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا اور اس میں ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا تھا۔ چنانچہ آج تک وہ عمارت "مدرسہ غازی الدین" کے نام سے مشہور ہے اور دار السلطنت دہلی کا دار الاسلامی (اینگلو عربک) کالج اس میں جاری ہے۔ تو بادشاہ اور صفدر جنگ دونوں کو میر شہاب الدین کی یتیمی پر رحم آیا۔ اور انھوں نے اس کے مرحوم باپ کا منصب و خطاب امیر الامراء غازی الدین فیروز جنگ اس کو عطا کر دیا۔ مگر حصولِ اقتدار کے بعد غازی الدین نے صفدر جنگ کے استیصال کی کوشش کی اور اسی کی وراندازیوں سے چھ مہینے تک بادشاہ اور وزیر صفدر جنگ کی باقاعدہ لڑائی شہر دہلی کے باہر ہوتی رہی۔ عماد الملک نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس موقع پر نادر شاہ کی خدمت ادا کرنے کیلئے بلایا۔ جو سہارنپور سے امروہہ تک کے علاقہ پر متصرف تھا۔ نجیب الدولہ نے آکر بادشاہ کی کافی خدمت گزاری و اطاعت کی۔

مرہٹوں کو دار السلطنت میں بلایا گیا

نجیب الدولہ کے علاوہ عماد الملک نے ملہار راؤ ہولکر کو مالوے سے اور جیاپا سیندھیا کو ناگور سے جہاں وہ ابھے سنگھ والیِ جودھپور مارواڑ کو محصور کئے پڑا تھا۔ طلب کیا۔ مگر ان کے پہنچنے سے قبل صفدر جنگ نے بادشاہ سے صلح کر لی۔ اور اپنے

علاقۂ اودھ کو روانہ ہوگیا۔ چونکہ سورج مل جاٹ والیِ بھرت پور نے صفدر جنگ کو امداد دی تھی۔ اس۔ ہولکر و جیاپا کے پہنچنے پر عماد الملک پہلے تو اُن کو سورج مل کے علاقے پر چڑھا لے گیا۔ اور جب اُس ایک مضبوط قلعہ مسخر نہ ہو سکا اور دربارِ احمد شاہ سے قلعہ گیر توپوں کی مدد عماد الملک و ہولکر کی درخواست پر نہیں ملی۔ بلکہ سورج مل کے عجز و الحاح پر رحم کھا کر احمد شاہ نے عاقبت محمود خاں کو شاہی توپیں بھیجنے سے باز رکھنے کے لئے خود دارالسلطنت سے سکندرہ تک قدم بڑھایا۔ تو ہولکر نے یکایک متھرا کو گھاٹ سے جمنا عبور کر کے شاہی کیمپ پر چھاپہ مارا۔ اور بہت سا اسباب لوٹ لیا۔ احمد شاہ معہ سربرآوردہ اُ سلطنت کے بمشکل جان بچا کر بھاگ گئے مگر ملکہ زمانیہ دختر شاہ فرخ سیر مرحوم اور دیگر خواتین تیموریہ ہولکر کی قید میں پھنس گئیں۔ جس نے اگرچہ اُن کی عزت و حرمت قائم رکھنے اور خدمت بجا لانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا فرد گزاشت نہیں کیا۔ لیکن محترم شاہی خواتین کا اس طرح اسیر ہونا بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو یکساں ناگوار گزرا۔ اور خواہ یہ فعل ہولکر نے عماد الملک کی بلا اطلاع کیا ہو۔ مگر اس کی بدنامی اُس عائد ہوئی۔ اس کے بعد عماد الملک نے ہولکر کی فوج کے ساتھ دہلی پہنچ کر احمد شاہ پر دباؤ ڈالا۔ اور ا خالو انتظام الدولہ کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے خارج کرا کے خود اس عہدے کو حاصل کیا۔ اور اُسی ر احمد شاہ کو قید کر کے عزیز الدین پسر جہاندار شاہ کو بلقبِ عالمگیر ثانی تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ اور احمد شاہ ا اُن کی والدہ قدسیہ بیگم کی جن کا باغ دہلی میں کشمیری دروازے کے باہر فصیل شہر سے متصل اس وقت بھی حکام انگریزی کا تفریح گاہ اور طلباء کالج کے مردانہ کھیلوں کا مقام ہے۔ آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادیں۔

عماد الملک کی پنجاب پر چڑھائی

اس کے بعد عالمگیر ثانی کو دہلی میں چھوڑ کر اور اُس کے ولیعہد شاہزادہ عالی گوہر کو جو بعد میں بلقب شاہ عالم بادشاہ ہوئے، اپنے ساتھ لے کر عماد الملک بجناحِ استعجال لاہور کی طرف چلا اور آدینہ بیگ خاں فوجدار لاہور سے چونکہ عماد الملک کی سازش ہو چکی تھی۔ اور اُس نے میر منو کی بیوہ کو عماد الملک کے اصل ارادوں سے بے خبر رکھا تھا اس لئے لودھیانے سے عماد الملک نے ایک فوج سید جمیل الدین و عباد اللہ خاں کشمیری کے ماتحت لاہور روانہ کی۔ جو رات ہی میں چالیس میل کا درمیانی فاصلہ طے کر کے صبح کو لاہور میں پہنچ گئی اور بیوۂ میر منو کے پہرہ داروں کو قید کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

عماد الملک نے اپنی ساس کو فریب دیا

عماد الملک کی نسبت چونکہ میر منو کی ایک بیٹی سے قرار پا چکی تھی اس لئے اُس نے بیوۂ میر منو کو اس بھلاوے میں رکھا کہ

اپنی دُلھن کو رخصت کرا لے آ رہا ہے۔ بیگم نے وزیر اعظم سلطنت سے اپنی بیٹی کی شادی کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھا اور عماد الملک کا بطور داماد کے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ مگر عماد الملک نے دامادی کے یہ جوہر دکھائے کہ اپنی بیوہ ساس کو قید کر لیا اور وہاں سے جو کچھ نقد و جنس ہاتھ لگ سکا وہ لے کر آدینہ بیگ خاں کو تیس لاکھ سالانہ خراج کے وعدے پر لاہور کا صوبہ دار مقرر کر کے مع بیوہ و دختر میر منّو دہلی واپس روانہ ہو گیا۔ عماد الملک کی یہ حرکت جب شاہ ابدالی کے گوش زد ہوئی تو اُس نے اِس کو صوبۂ لاہور کو افغانی سلطنت سے نکالنے سے تعبیر کیا۔ اور قندھار سے بڑی تیزی کے ساتھ خود کو لاہور پہنچایا۔ آدینہ بیگ خاں شاہ ابدالی کے حملے کی خبر سُنتے ہی بھاگا اور ہانسی حصار میں عماد الملک سے آ کر ملا۔ مگر عماد الملک میں بھی افغان بادشاہ کے مقابلے کی قوت نہیں تھی۔ اِس لئے اُس نے اپنی ساس سے اپنی سفارش کرا کے اور خود خوشامد و عاجزی کر کے شاہ ابدالی کے غصّے کو فرو کیا۔ اور سورج مل جاٹ۔ نواب احمد خاں بنگش والیِ فرخ آباد اور شجاع الدولہ نواب اودھ پر دباؤ ڈال کر تینوں سے دس بارہ لاکھ روپیہ علاوہ دیگر سامان کے شاہ ابدالی کو دلایا۔ اور شاہ افغانستان آگرہ کے نواح میں وبا پھیل جانے کے باعث ہندوستان سے اپنے مُلک کو واپس روانہ ہو گیا۔ اور بوقتِ روانگی تالاب مقصود آباد پر شہنشاہ عالمگیر ثانی سے ملاقات کر کے امیر الاُمرائی کا منصب نجیب الدولہ کو دلایا گیا۔ کیونکہ عماد الملک کی عالمگیر ثانی نے شکایات کی تھیں اور شاہ ابدالی کو بھی اِس سے کچھ زیادہ روپیہ نہیں مل سکا تھا۔

پنجاب کا افغانستان سے الحاق

شاہ ابدالی نے لاہور و ملتان دونوں صوبوں کی حکومت پر اپنے بیٹے تیمور شاہ کو چھوڑا جس کی شادی اِس نے دختر محمد شاہ مرحوم شہنشاہ دہلی سے کر کے دونوں بادشاہوں میں قرابتِ باہمی کی صورت نکالی تھی۔ اور آدینہ بیگ خاں کو تیمور شاہ کا نائب مقرر کیا۔ مگر عملی طور پر کامل اختیار اُس کو حاصل رہا۔ شاہ موصوف کی واپسی کے بعد عماد الملک نے اپنی شرارت کا جال دو طرف پھیلایا جس کا نتیجہ بالآخر پانی پت کی جنگ سوم کی صورت میں نکلا۔

عماد الملک کے ہاتھوں خاندان و ذاتِ شہنشاہی کی اہانت

عماد الملک نے جو اس وقت شاہزادگانِ تیموری کے ساتھ فرخ آباد میں نواب احمد خاں بنگش کے پاس مقیم تھا۔ جب نجیب الدولہ کے منصب "امیر الامرائی" پر فائز ہونے کی خبر پائی۔ تو چونکہ وہ اُس کو اپنا موروثی و ذاتی منصب خیال کرتا تھا اور نجیب الدولہ کو اُس نے صفدر جنگ سے لڑائی ہونے کے وقت احمد شاہ مرحوم کی خدمت ادا کرنے کے لئے دہلی میں بُلایا۔ اور شہنشاہی دربار میں عہدہ دلایا تھا۔ اِس لئے وہ نجیب الدولہ سے بیحد ناراض ہوا۔ اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کی بھی جن کو خود اُس نے تخت پر بٹھایا تھا مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔

اب تک ذاتِ شہنشاہی کی عقیدت سب لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھی اور جہاندار شاہ و فرخ سیر کے ساتھ ساداتِ بارہہ نے جو زیادتی کی تھی۔ اُس کو طبقۂ اُمرا، و عوام دونوں میں سخت نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ یہی امیر سیّدوں کے زوالِ اقتدار کا باعث ہوا تھا۔ مگر عمادالملک نے شاہی خواتین کے ملہار راؤ ہلکر کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا سامان پیدا کر کے اور بعد ازاں احمد شاہ کو گرفتار و قتل کرا کے رُعب و دابِ شہنشاہی کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اور اب وہ اپنے دست گرفتہ نجیب الدولہ کو اپنا رقیب تصور کر کے اُس کے استیصال کی فکر میں ہوا۔ اور شہنشاہ عالمگیر سے زبردستی اِسکی منظوری حاصل کرنے کے لئے اس نے شہنشاہ و نجیب الدولہ کو ایک دوسرے سے جدا کرنیکی فکر کی۔

مغل شہنشاہی کی عقیدت مرہٹوں کے دلوں میں

عمادالملک نے نجیب الدولہ کی عداوت میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ بالاجی باجی راؤ پیشوا کے بھائی رگھناتھ راؤ عرف "رگھوبا" کو اپنی امداد کے لئے بُلایا۔ رگھوبا اُس وقت مالوہ میں اُس استحقاق کی بناء پر لوٹ مار کر رہا تھا۔ جو باجی راؤ پیشوا کو صوبہ داریِ مالوہ کا فرمان پیشگاہ شہنشاہ محمد شاہ جنت آرام گاہ سے ۱۷۳۶ء میں عطا ہونے کی بناء پر پیدا ہوا تھا۔ مرہٹے اگرچہ لوٹ مار کے شائق تھے۔ مگر ذاتِ شہنشاہی کا اُن کے دلوں میں خاص ادب و احترام تھا۔ اور وہ تختِ مغلیہ کی آڑ میں اپنا اقتدار قائم کرنا۔ اور ہندوؤں کی مذہبی مراسم کی اُس آزادی کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ جو اکبر اعظم اور اُس کے جانشینوں نے اُن کو عطا کی تھی۔ مگر مغلیہ شہنشاہی اقتدار کے زوال پذیر ہونے پر بعض علاقوں میں خودسر مقامی حکام نے اس پر بندشیں عائد کر دی تھیں۔ صرف سداشیو راؤ بھاؤ نے اپنے سربرآوردہ مرہٹہ رفقاء و راجپوت رؤساء کی مرضی کے خلاف اپنے فرقہ کی مقررہ پالیسی سے انحراف کرنا چاہا تھا۔ جس کا تھوڑے عرصے بعد ہی پانی پت کے میدان میں اُس کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور اس کے بعد پھر مرہٹہ پیشوا اور اُس کے سرداروں نے اُسی قدیم پالیسی کو قائم رکھا۔ حتےٰ کہ ایک بیرونی قوت نے مرکزِ سلطنتِ مغلیہ میں اپنا اقتدار جمایا اور کمال حکمتِ عملی سے ہندوستان کی اندرونی قوتوں کو باہم لڑا کر سب کو بتدریج کچل دیا۔

مرہٹوں کا ہندو مسلمانوں سے یکساں برتاؤ

۱۷۳۶ء میں باجی راؤ پیشوا نے خود دارالسلطنت دہلی کے گرد و نواح میں لوٹ مار کی تھی۔ مگر اُس کا مقصد حصولِ زر کے سوا کچھ نہیں تھا اور کالکا کے میلے میں ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کی طرح لوٹا گیا تھا۔ اِس کے بعد مرہٹوں نے خود دارالسلطنت کا اُس وقت تک رُخ نہیں کیا۔ جب تک عمادالملک جیسے موروثی و شہنشاہی عہدہ دار نے اپنی ذاتی اغراض کیلئے ملہار راؤ ہلکر اور جیاپا سیندھیا کو نہیں بُلایا اور شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد نجیب الدولہ

کی ضرر رسانی کے لئے دوبارہ ہلکر اور رگھوبا کو طلب نہیں کیا۔ عماد الملک نے اپنی ذاتی سپاہ ان دونوں سرداران مرہٹہ کی فوج کے ساتھ شامل کرکے دہلی کو محصور کرلیا۔

نجیب الدولہ اور ملہار راؤ ہلکر کی دوستی کا ہنگام نجیب الدولہ نے تابمقدور وار السلطنت و ناموس تیموری و ذاتِ شہنشاہی کی حفاظت میں کوشش کی۔ اور ڈیڑھ مہینے تک توپوں کی لڑائی محاصرین و محصورین کے درمیان جاری رہی۔ مگر جب مرہٹوں نے عماد الملک کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے رسد کی آمد ہر طرف سے روکدی اور نجیب الدولہ کو باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ سکی۔ تو مجبوراً اس نے ملہار راؤ ہلکر سے خفیہ طور پر مصالحت کی سلسلہ جنبانی کرکے ایک رقم اخراجاتِ مہم کے نام سے اُس کو دی اور ناموس تیموریہ وذاتِ شہنشاہی کو مرہٹوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہونچنے کا حتمی وعدہ لے کر نجیب الدولہ اپنے علاقۂ سہارنپور کو چلا گیا۔ ملہار راؤ ہلکر سے نجیب الدولہ کی جو دوستی اس وقت سے شروع ہوئی وہ اِن دونوں سرداروں کی زندگی بھر قائم رہی اور ایک مرتبہ نجیب الدولہ اور دوسری مرتبہ ملہار راؤ ہلکر کی جانیں محفوظ رکھنے کی باعث ہوئی۔

عماد الملک کا مرہٹوں کو نجیب الدولہ کے علاقے پر بھیجنا عماد الملک کا اگر بس چلتا تو وہ نجیب الدولہ کو جو منصب امیر الامرائی پانے کی وجہ سے اس کا رقیب ہوگیا تھا تباہ و برباد کرڈالتا۔ مگر ہلکر سے اُس کی کچھ پیش نہ گئی۔ لہذا نجیب الدولہ اُس وقت توبخ کرمعہ اپنے سامان و رفقاء کے اپنے علاقے پر چلا گیا۔ مگر عماد الملک نے اس کی روانگی کے بعد دہلی میں کاروبارِ سلطنت پر متصرف ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ نجیب الدولہ کو امیر الامرائی سے معزول کرکے یہ شہنشاہی منصب نواب احمد خاں بنگش کو دلایا۔ اور کچھ عرصے بعد رگھوبا برادر پیشواء۔ دباؤ ڈلواکر و تاجی سیندھیا و ہلکر کو علاقۂ نجیب الدولہ پر چڑھائی کے لئے بھیج دیا اور نجیب الدولہ نے سکرتال میں جو مظفر نگر کے قریب واقع ہے محصور ہوکر سات مہینے تک بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اور اس اثناء میں مرہٹے برابر اُس کے علاقہ چاندپور و قصباتِ بادہیہ وغیرہ کو تاراج کرتے رہے۔ نجیب الدولہ نے بہت عاجزی کی درخواستیں بھیجکر شجاع الدولہ سے امداد طلب کی۔ اور اپنے بھائیوں سرداران روہیلہ کو بھی بُلایا۔ جو برسات کے زمانے میں بڑی دقت سے طویل منزلیں طے کرکے امروہہ میں پہنچے۔ اور شجاع الدولہ بھی ایک طاقتور فوج کے ساتھ لکھنؤ سے روہیلکھنڈ کی طرف بڑھے اور شاہ آباد ضلع ہردوئی میں ٹھہر کر دریائے گنگا کی طغیانی گھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ جو اُس وقت بوجہ برسات کے زور پر تھی۔ مرہٹوں کو جب شجاع الدولہ کے نجیب الدولہ کی مدد کے لئے روانہ ہونے کی خبر ملی تو دتاجی سیندھیا نے گوبند راؤ پنڈت کو جو مرہٹوں کی طرف سے

بندیلکھنڈ میں حاکم اور "بوندیلے" اور "جھانسی والے" کے القاب سے ملقب تھا۔ آٹھ دس ہزار سواروں کے ساتھ نجیب الدولہ اور روہیلوں کے دیہات کو لوٹنے کے لئے بھیجا۔ جن نے مہینے سوا مہینے کے اندر چاندپور۔ نگینہ و اطرافِ امروہہ کے تیرہ سو کے قریب گانوں تباہ کر ڈالے۔ اور ان مواضع کے باشندے جو زیادہ تر ہندو تھے مرہٹوں کی دستبرد سے بالکل مفلوک و محتاج ہوگئے۔ نواب شجاع الدولہ کو مرہٹوں کی قوت بڑھنے میں اپنے شمال مغربی علاقوں کی تاراجی کا اندیشہ ہوا۔ اِس لئے وہ بحتاج استعجال کوچ کرکے چاندپور پہنچے اور اپنی فوج میں سے ہندو گوسائیوں کے دستوں کو انوپ گر وامراؤ گر کے ماتحت اور نو دس ہزار سواروں کو میر نجف علی خاں و میر باقر میمونی کے ماتحت مرہٹوں کی مدافعت کے لئے روانہ کیا۔ گوسائیوں نے گوبند راؤ بنڈت کی فوج کو اپنی پیہم تاختوں سے سخت نقصان پہنچایا اور گھبراہٹ کے عالم میں گنگا کو عبور کرنے پر مجبور کردیا۔ جس میں مرہٹوں کے سینکڑوں آدمی ضائع اور بہت سا مال و اسباب تلف ہوا۔

نجیب الدولہ کی جان چھوٹی

شجاع الدولہ اور سردارانِ روہیلہ اب نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گئے۔ اور دتاجی سیندھیا و محاصرۂ سکرتال کمزور ہوگیا۔ اور ملہار راؤ ہلکر نے حقِ دوستی نجیب الدولہ کے ساتھ ادا کیا اور اپنے رسوخ و اثر سے دتاجی سیندھیا کو نجیب الدولہ اور روہیلوں سے صلح کرنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ دتاجی اپنی فوج کو لے کر دہلی کی طرف ہٹ گیا۔ عماد الملک کی تحریک و اغوا سے چونکہ مرہٹوں کا دباؤ روہیلوں کے علاقے پر پڑا۔ اِس لئے نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی سے فریاد کی اور روہیلوں نے ایک ایسے شخص کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر شاہ ابدالی کے پاس بھیجا۔ جو اُسکے وزیر شاہ ولی خاں سے قرابتِ قریبہ رکھتا تھا۔ سردارانِ روہیلہ کے علاوہ راجپوتانہ کے بعض راجاؤں کی طرف سے بھی جو مرہٹوں کی مسلسل تاخت و تاراج سے تنگ آچکے تھے۔ شاہ ابدالی کو تائید آمیز پیام پہنچے تھے اور شہنشاہ عالمگیر ثانی نے بھی عماد الملک کی حرکات سے تنگ آکر اُس کی خفیہ شکایتیں شاہِ موصوف کو لکھی تھیں۔

عماد الملک کی ولیعہد کو گرفتار کرنیکی کوشش

اُن میں سے ایک شکایت نامہ عماد الملک کے ہاتھ پڑ گیا۔ جس پر وہ شہنشاہ کی جان کا دشمن ہوگیا۔ اور پہلے تو اُس نے شہنشاہ اور اُن کے ولیعہد شاہزادۂ عالی گوہر دونوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ مگر جب شاہزادہ ولیعہد شہر دہلی میں واپس آنے کے بعد عماد الملک کی بدنیتی و اندرونی خصومت سے آگاہ ہوکر اپنی مردانہ وار جدوجہد اور اپنے بعض رفقاء کی جاں نثاری کی بدولت اُن لوگوں کو مار کر شہر کے باہر نکل گئے۔ جن کو عماد الملک نے اُن کی گرفتاری کے لئے بھیجا تھا۔ اور شہر سے باہر وٹھل راؤ مرہٹہ سردار نے جو اگرچہ عماد الملک کا بلایا ہوا

تھا۔ اُسی عقیدت کی بنا پر جو مرہٹوں کو تیموری شاہی خاندان کے ساتھ تھی۔ اُن کو عارضی پناہ دی اور بعد ازاں بحفاظت نجیب الدولہ کے علاقے میں پہنچا دیا۔ جہاں سردار موصوف نے سات ماہ تک اُن کی مہمانداری اپنے حوصلے وہمت کے موافق کی اور بعد ازاں اُن کو شرقی علاقوں میں قسمت آزمائی کے لئے جانے کی صلاح دی۔ تو عماد الملک نے بعد ازاں دار السلطنت میں اپنی انتہائی شرارت و بدباطنی کا اظہار کیا۔ اور پہلے اپنے خالو انتظام الدولہ کو قتل کرا دیا اور پھر شہنشاہ عالمگیر ثانی کو ایک درویش کی زیارت کے بہانے سے شہر کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ میں لیجا کر قتل کرا دیا۔ اور شاہزادہ کام بخش پسر شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ کے ایک بیٹے کو بہ لقب محی السنت تخت پر بٹھا کر خود بحیثیت صدر اعظم و امیر الامراء شہنشاہ کے نام سے احکام جاری کرنے لگا۔

عماد الملک نے مرہٹوں کو پنجاب پر چڑھایا

عماد الملک نے مرہٹہ سرداروں سے صرف دار السلطنت پر حملہ ہی نہیں کرایا تھا۔ بلکہ اس سے بڑھکر ایک شرارت و حماقت اس سے سرزد ہوئی تھی جس نے شاہ ابدالی کے چوتھی دفعہ پنجاب پر حملہ آور ہونے کو یقینی بنا دیا تھا۔ ابتک مرہٹوں کی ترکتاز زیادہ تر وسطِ ہند و راجپوتانہ تک محدود تھی اور صرف ایک مرتبہ باجی راؤ پیشوا نواب خان الملک کے ہاتھوں اپنے متعدد سرداروں کی شکست کا داغ مٹانے اور بالفاظِ خود اپنی موجودگی محسوس کرانے لئے دہلی کے باہر تک پہنچا تھا۔ اور محمد شاہ سے صوبہ داری مالوہ کی نیابت اور علاقہ جاتِ دکن کی "چوتھ" کا فرمان لے کر واپس ہو گیا تھا۔ عماد الملک نے صفدر جنگ کے قضیہ میں جیاپا سیندھیا و ملہار راؤ ہولکر کو دار السلطنت میں بادشاہ کی امداد کے لئے بلایا اور وہ قضیہ اُن کے آنے سے قبل طے ہو گیا تو ا سورج مل جاٹ کے علاقے پر چڑھایا جس کے ضمن میں خواتین شہنشاہی کے ہولکر کے ہاتھوں میں پڑجانے کا افسوسناک واقعہ رُونما ہوا۔ اس کے بعد عماد الملک نے دتا سیندھیا کو شمال کی طرف نجیب الدولہ کے علاقے پر بھیجا۔ اور پیشوا کے بھائی رگھوبا اور ملہار راؤ ہولکر کو پنجاب پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ جہاں تیمور شاہ خلف شاہ ابدالی لاہور و ملتان میں حکمران اور اُس کا ایک ہمقوم افغان جہان خاں معاملات منصرم اور آدینہ بیگ خاں نائب صوبہ دار تھا۔

سکھوں کا لاہور پر عارضی تسلط

شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد سکھوں نے پھر زور باندھا۔ اور چونکہ جہان خاں نے اُن کے مقدس مقام (امرتسر) کے گوردوارے کو جس کی بُنیاد حضرت شاہ میاں میر قدس اللہ سرہ العزیز نے گورو ہر رائے کے وقت میں رکھی تھی۔ اور جو اس وقت بہ لقب "دربار صاحب" سکھوں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز ہے توڑ پھوڑ ڈالا تھا اور اس کے تالاب کو مٹی دکوڑ

سے بھروا دیا تھا۔ اِس لئے جوشِ مذہبی میں سکھوں کی بڑی جمعیت اکٹھی ہوئی۔ اور اُنھوں نے دار الصدر لاہور کے گرد و نواح کے دیہات کو لُوٹنا شروع کیا۔ تیمور شاہ اور جہان خاں لاہور سے باہر نکل کر سکھوں سے لڑے مگر اُن کو مغلوب نہ کر سکے اور خود لاہور کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔

آدینہ بیگ کی سازش مرہٹوں سے

سکھوں کو آدینہ بیگ خاں کی غفلت و مسامحت سے اِس طرح زور باندھنے کا موقع ملا تھا جو جہان خاں سے دلی کاوش رکھتا تھا اور اپنے کو پنجاب کا حکمراں بنانا چاہتا تھا۔ آدینہ بیگ خاں کی عماد الملک سے بھی سازش تھی۔ جب سکھوں سے اُس کی توقعات پوری نہیں ہوئیں تو اُس نے عماد الملک سے رجوع کیا اور اس نے رگھوبا کو پنجاب پر حملہ آور ہونے کے لئے اُبھارا اور آدینہ بیگ خاں کی طرف سے اِس امر کا اطمینان دلایا کہ وہ اِن کے لئے تسخیر پنجاب میں ہر قسم کی سہولت پیدا کرے گا۔ رگھوبا نے پانچ دریاؤں کی زرخیز سرزمین کو تاراج کرنے کا یہ موقع بہت اچھا سمجھا اور پنجاب میں مغلیہ شہنشاہِ دہلی کا اقتدار بحال کرنے اور اُس کو افغانوں کے پنجے سے چھڑانے کا اعلان کر کے عوام کو اپنی اس مہم کا موافق و مُوید بنایا۔ آدینہ بیگ خاں نے حسب وعدہ مرہٹوں کا ساتھ دیا اور سکھوں کی طرف سے بھی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ سرہند پر شاہ ابدالی کا قلعدار سردار عبد الصمد خاں مرہٹوں کے سامنے تابِ مقاومت نہ لا سکا۔ اور قلعہ مسخر ہونے پر اُن کے ہاتھوں میں قید ہو گیا۔ مرہٹوں نے سردار موصوف کا سامانِ امارت ضبط کیا اور سکھوں نے جو آدینہ بیگ خاں کے ساتھ تھے اہلِ شہر کا مال و متاع لُوٹا۔

مرہٹے اٹک تک پنجاب پر قابض ہو گئے

سرہند سے رگھوبا اور مرہٹہ سردار باطمینانِ تمام بڑھتے اور مُلک پر اپنا عمل دخل کرتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اور وہاں سے اور آگے بڑھے گجرات کے مقام پر جہان خاں اور شاہ ابدالی کے دیگر سرداروں نے کسی قدر اُن کا مقابلہ کیا۔ مگر جمعیت کم ہونے کی وجہ سے شکست کھائی اور اٹک پار اُتر کر کابل بھاگ گئے۔ مرہٹوں نے دریائے اٹک تک اُن کا تعاقب کیا۔ اور بعد ازاں ملتان اور سندھ کا شمالی علاقہ بھی لے لیا۔ جب مرہٹہ سپاہیوں نے جن کو اپنے گھروں سے نکلے ایک عرصہ گُزر چکا تھا، رگھوبا سے واپسی وطن کا تقاضا کیا۔ تو اُس نے آدینہ بیگ خاں سے ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ شہنشاہ دہلی کے نام سے مگر فی الحقیقت مرہٹوں کے لئے مقرر کر کے اس کو اپنی طرف سے لاہور و ملتان دونوں صوبوں کا حاکم بنا دیا۔ اور سابا جی پٹیل اپنے ایک سردار کو مالیات کی نگرانی کے لئے لاہور میں اس کے ساتھ چھوڑا۔

مرہٹوں کا عروجِ اقتدار

اُس وقت مرہٹوں کی قوت انتہائے عروج پر تھی۔ اور شیواجی کے جانشین مہاراجہ شاہو نے بالاجی باجی راؤ کو اُس کے دادا اور باپ کے منصب پیشوائی پر مقرر

...رتے ہوئے جو تحریری ہدایات دی تھیں۔ اُن کے بموجب مغلوں کے تختِ شہنشاہی کی آڑ میں اُنھوں نے
...سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا اور دکن میں دریائے تنگ بھدرا کے کنارے سے
...شمال میں دریائے اٹک کے کنارے تک اپنے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اور ان کے عاملِ
...ہندوستان کے عرض میں احمد آباد گجرات سے لیکر بردوان تک اور طول میں راولپنڈی [illegible] سے
...ارکاٹ (احاطۂ مدراس) تک ان کے لئے "چوتھ" اور "سردیش مکھی" وصول کر رہے تھے۔ رگھناتھ
...ب شمالی ہند میں یہ فتوحات حاصل کرنے کے بعد پونا میں اپنے بھائی پیشوا کے پاس واپس گیا۔ تو وہاں
...کے لوگ اُس کے لشکر کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اور اس نے ہندوستان کے ایسے نادر
...تحائف پیشوا کی خدمت میں پیش کئے جن کی خوش نمائی اور چمک دمک نے مرہٹوں کی مرکزی حکومت
...کے کارکنان کی آنکھوں کو خیرہ کردیا۔ رگھناتھ راؤ کو اپنی اس عظیم الشان کامیابی پر ناز تھا کہ اس نے مرہٹہ
سرداروں کے گھوڑوں کو دریائے اٹک میں پانی پلایا تھا، ہندوؤں کی قدیم روایات میں دریائے اٹک
کو ہندوستان کی ایک قدرتی سرحد مانا جاتا تھا۔ لہٰذا اٹک تک کا علاقہ مرہٹوں کے ہاتھوں مسخر ہونے
...تمام دکنیوں میں فخر و مسرت کا ایک زبردست احساس پیدا ہوا اور رگھناتھ راؤ کو خاص طور سے راجہ ستارہ
...نے اپنے سامنے طلب کرکے خلعت عطا کیا۔

...ھناتھ راؤ کا تفاخر اور بھاؤ کا رشک

رگھناتھ راؤ کو اپنی شان و شوکت کی ان داستانوں کے بیان کرنے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ جس سے اُس کے بڑے
...بھائی سداشیو راؤ بھاؤ کو جو وسط ہند و کرناٹک کی لڑائیوں میں جوہرِ شجاعت دکھا چکا تھا
...قدرتی اوصاف سپہ گری سے متصف تھا، رشک پیدا ہوا۔ اور اس نے رگھوبا کے فخر و ناز کو توڑنے
کے لئے ایک پہلو نکال لیا۔ کیونکہ رگھوبا کو اپنی طویل مہمات کے دوران میں کثیر اخراجات کا زیر بار ہونا پڑا
تھا اور اس کی ہنڈیاں مرہٹوں کے مرکزی خزانے پر لکھی ہوئی شمالی و وسطی ہند کے اکثر مہاجنوں اور
...بینکداروں کے پاس تھیں۔ یہ ہنڈیاں جب کچھ عرصہ کے بعد پونا میں پہنچنے لگیں تو کارکنان ہمیشہ مال کو
ان کی ادائیگی میں دقتیں پیش آئیں اور بالآخر حساب کی رپورٹیں پیشوا تک پہنچیں۔ چند ماہ بعد حساب
کرنے سے معلوم ہوا کہ رگھوبا نے اپنی شاندار و کامیاب مہمات میں جتنا روپیہ پیدا کیا اس سے ایک
روایت کے بموجب ۳۰-۲۲ لاکھ اور دوسری روایت کے موافق اسی بیاسی لاکھ زیادہ اسکو فوجی
ضروریات میں خرچ کرنا پڑا۔ اور لوازمِ شان و شوکت بہم پہنچنے اور بعید علاقوں میں مرہٹوں کی دولت کا سکہ
لوگوں کے دلوں پر بیٹھنے کے سوا مرکزی خزانے کو ان تازہ فتوحات سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ

۳۰ لاکھ روپیہ علاقہ جات دکن کی آمدنی سے خرچ کرنا پڑا۔ اور چونکہ مرہٹے ابتدا سے لوٹ مار کے
ی تھے اور کسی مہم کی کامیابی کا اس کے مالی نتائج ہی سے اندازہ کرتے تھے۔ اس لئے بھاؤ کو رگھوبا
پچھاڑنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور اس نے پیشوا کے روبرو اس معاملے پر اس کو مطعون کیا۔

اؤ کی سپہ سالاری مہم ہندستان

رگھوبا کو قدرتی طور پر یہ ناگوار گزرا کہ مالی پہلو کو نمایاں کرکے اس کے شاندا
کارناموں پر پانی پھیرا جائے۔ اس لئے کچھ عرصے بعد جب احمد شاہ ابدالی
آمد آمد کا غلغلہ ہوا۔ اور جو مرہٹہ سردار رگھوبا کی واپسی پر شمالی ہند میں رہ گئے تھے اُن کو مدد پہنچانے
ابدالی کے حملے کو ایسی قوت کے ساتھ پس پا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ پھر ہندوستان کا رُخ
رسکے تو رگھوبا کو جس میں سیاسی جوڑ توڑ کی قابلیت یقیناً بہت زیادہ تھی۔ اور شمالی علاقوں کے
ات کا عملی تجربہ بھی ہو چکا تھا محض مالی پہلو کو مدِ نظر رکھ کر اس تازہ مہم کی کمان سپرد نہیں کی گئی۔ اور
راشیو راؤ بھاؤ کو اس کا افسر مقرر کیا گیا۔ جس نے اپنے برادرِ عم زاد پیشوا کو خوش کرنے کے لئے اُس کی
ے بیٹے وسواس راؤ کو جو ۱۷-۱۸ سال کی عمر کا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ مہم کا اعلیٰ افسر
رد کرایا اور خود برائے نام اُس کے ماتحت سپہ سالاری کا عہدہ قبول کیا۔ مگر درحقیقت پونا سے مرہٹہ
ج کی روانگی کے وقت سے لیکر میدانِ پانی پت میں اُس کی تباہی تک بھاؤ ہی اس کے سیاہ و سپید کا
مالک تھا۔ بعض مرہٹہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں رگھوبا ہی کو اس مہم کی افسری کے لئے
زد کیا گیا تھا۔ مگر اس نے بھاؤ کے طعنے کا خیال کرکے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا۔
پیشوا سے ایسے لوگوں کو بھیجنے کے لئے کہا جو خزانے کو کچھ فائدہ پہونچا سکیں۔

اہ ابدالی کے حملے کا آغاز

احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی اور اپنی شادیاں تیموریہ شاہزادیوں
سے کرکے دہلی کے خاندانِ شہنشاہی سے مذہبی اتحاد کے علاوہ دُنیوی قرابت
علق بھی پیدا کر لیا تھا۔ لیکن بہ حیثیت حکمرانِ افغانستان کے مغلوں کے اقتدار کی بحالی اُس کا کوئی دلی
صد نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر عماد الملک مرہٹوں کو پنجاب پر جس کو شاہ ابدالی نے سرہند تک عملاً اپنی
لطنت میں شامل کر دیا تھا مسلط نہ کراتا تو اس میں شبہ ہے کہ احمد شاہ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی
رورت محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ اُس کے لئے اپنے آبائی مُلک ہی میں کافی مصروفیتیں موجود تھیں اور افغانوں
فطرت ان کے مختلف قبائل کو شاہ موصوف کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ مرہٹوں کے
ب کو تاخت و تاراج کرنے کے وقت بھی وہ بلوچی سردار ناصر خاں حاکم قلات کی تادیب میں مصروف
۔ پہلے اس کا بیٹا تیمور شاہ جو سکھوں کی بغاوت کے بعد ہی لاہور سے رخصت ہو گیا تھا۔ شاہ کے پاس

پہنچا۔ اور بعد ازاں جہان خان نے پہنچ کر پنجاب پر مرہٹوں کی تاخت و دستبرد کا سارا حال بیان کیا
شاہ ابدالی قدرتی طور سے اس پر سخت غضبناک ہوا۔ مگر بلوچوں کی مہم نے کچھ عرصے تک اس کو
ہندوستان پر توجہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جب ناصر الدین کا زور ٹوٹ گیا اور شاہ کو بلوچستان
کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو اس نے وہیں سے اپنی سپاہ کو درست کر کے شکارپور کا راستہ لیا
اور بالائے سندھ سے دریائے اٹک کے کنارے کنارے شمال کی طرف بڑھ کر پشاور کے قریب
اس کو عبور کیا۔ یہاں افغانی سپاہ کی ایک اور جمعیت آکر شاہ کے ساتھ شامل ہوئی اور اس کو لے کر
لاہور کی طرف تیزی سے بڑھا۔ ساباجی مرہٹوں کا عامل اور آدینہ بیگ خاں صوبہ دار نے دتاجی سندھیہ
اور ملہار راؤ ہلکر کو جو روہیلکھنڈ میں اپنی فوجیں لئے پڑے ہوئے تھے۔ شاہ ابدالی کی پیشقدمی سے
مطلع کیا۔ مگر نجیب الدولہ سے مصالحت ہو جانے کے بعد بھی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ آدینہ بیگ خاں
کے پاس لاہور میں فوجی قوت بہت کم تھی اسلئے اس نے اور ساباجی نے فرار کو قرار پر ترجیح دی۔

شاہ ابدالی کی پیشقدمی ہندوستان کی طرف

احمد شاہ ابدالی کا پنجاب کی سرحد میں مقام سرہند تک اپنا عمل دخل
کرنا ضروری تھا۔ مگر لاہور پہنچنے سے پہلی ہی نجیب الدولہ کی
سے مرہٹوں کے ہاتھوں محصور ہونے کی فریاد اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کی طرف سے عماد الملک
شرارتوں کی شکایت شاہ موصوف کے پاس پہنچی تھی۔ اور لاہور سے سرہند تک متعدد قاصد پہنچے تھے

سورج مل کی مروت عماد الملک کے ساتھ

اسی وقت میں عماد الملک نے شہنشاہ عالمگیر ثانی کو قتل میں
کر کے محی السنہ کو دہلی میں تخت پر بٹھایا۔ جب شاہ ابدالی سرہند
سے آگے بڑھا تو عماد الملک اس کے غصہ سے خوف زدہ ہو کر سورج مل جاٹ کے علاقے میں جا
اور اگرچہ ابھی چند سال قبل ہی عماد الملک سیندھیا اور ہلکر دونوں کو اس کے علاقے پر چڑھا لے گیا
مگر امرائے شہنشاہی کا راجپوتانہ کے ہندو رؤساء کے دلوں میں اس قدر وقار و احترام تھا اور نہ
تعصب ایسا ناپید تھا کہ عماد الملک جب اس سے رجوع لایا تو سورج مل نے اس کی سابق شرارت
مطلق کوئی خیال نہیں کیا۔ اور اپنے ایک مضبوط قلعے میں اس کو اور اس کے رفقاء کو جگہ دی اور
دراز تک خاطر مدارات کرتا رہا۔

عماد الملک کا انجام

سورج مل جاٹ کے ایک قلعے میں پناہ گزیں ہونے کے بعد سے عماد الملک کا
سیاسی بالکل زائل ہوگیا۔ اور پھر اس نے ملکی معاملات میں کوئی نمایاں حصہ
لیا۔ بعد شاہ عالم ... کو دہلی کے دربار میں منہ دکھانے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ عرصہ دراز تک

کی مہانداری سے بہرہ ور ہونے کے بعد فرخ آباد۔ بوندیلکھنڈ و وسط ہند میں مختلف روساء کی فیاضی سے بسر اوقات کرتا رہا۔ اور اُسی زمانے میں حج و زیارتِ مدینہ سے بھی مشرف ہوا۔ اپنی عمر کا آخری زمانہ اس نے علاقۂ گوالیار میں بسر کیا۔ جہاں دربارِ سیندھیا کی طرف سے باون قریات عماد الملک کو گزارے کیلئے دیئے گئے۔ جو اب تک اس کی اولاد کے قبضے میں ہیں۔ اور ریاست باونی کدورہ کہلاتے ہیں۔ انگریزوں کا جب وسط ہند پر تسلط ہوا تو اُنھوں نے عماد الملک کے جانشین ناصر جنگ کو جاگیر پر قابض پایا اور اُن کا قبضہ برقرار رکھا۔ عماد الملک کی قبر وہیں واقع ہے۔ دربارِ مغلیہ کے اُمراء میں کوئی امیر ایسا نہیں گزرا جس کے طرزِ عمل سے ہندوستان کی قوت کو اس قدر نقصان پہنچا۔

دتاجی سیندھیا کی فوج کی تباہی

احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کے وقت دتاجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہلکر کی جو افواج شمالی ہند میں موجود تھیں۔ اُن کی قوت فارسی تاریخوں میں ۸۰ ہزار سوار جرار بیان کی گئی ہے مگر اس میں یقیناً مبالغہ ہے یا ان دونوں سرداروں کی پوری جمعیت کو مع بھیر و بنگاہ شمار کر لیا گیا ہے۔ مرہٹوں کے مستند مورخ کپتان گرانٹ ڈف نے دکنیوں کی تعداد ۳۰ ہزار لکھی ہے۔ جو سیندھیا اور ہلکر کے درمیان قریباً مساوی طاقت کے دو ٹکڑوں میں منقسم تھی۔ ایک روایت کے بموجب دتاجی نے بوڑیہ کے قریب احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اور اپنی فوج کو دہلی کی طرف ہٹا لے گیا۔ ملہار راؤ ہلکر ابدالی کے بڑھنے کی خبر پاکر مقام کوٹ پوتلی قصبۂ ریواڑی کے نواح میں جو علاقۂ میوات کی سرحد پر واقع ہے ہٹ آیا۔ دتاجی سیندھیا کا اس وقت دہلی میں رہنا بے موقع تھا۔ اور مرہٹوں کی ایک روایت کے بموجب اُسکی بی بی بھاگیرتی بائی نے جس کے وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ اس کی منت سماجت بھی کی کہ وہ دارالسلطنت سے جنوب طرف ہٹ جائے مگر دتاجی نے دہلی کو چھوڑنے سے انکار کیا۔ اور ایک سپاہ کو جن راؤ داجلے اور الوی سیندھیا کی ماتحتی میں بداؤں گھاٹ پر تعینات کر دیا کہ وہ احمد شاہ ابدالی کو عبورِ دریا سے روکیں۔ دتاجی نے خود اپنی بڑی فوج کے ساتھ دہلی میں چھاؤنی ڈالی۔ مگر دارالسلطنت کی عزت ملحوظ رکھی۔ اور اس کی فوج نے شہر والوں پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ حالانکہ چند روز بعد ہی جب احمد شاہ ابدالی دہلی پہنچا۔ تو افغانوں نے بے تکلف اہلِ شہر کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اور نجیب الدولہ اور سردارانِ روہیلہ نے جو سال گزشتہ مرہٹوں کے ہاتھوں سخت تکلیف اُٹھانے اور آئندہ اس سے زیادہ روزِ بد دیکھنے کا خوف رکھنے کے باعث شاہ ابدالی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ شاہ موصوف سے کہہ سُن کر بمشکل افغانوں کو باشندگانِ دارالسلطنت پر ایسی بدعات سے رُکوایا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج

صرف حصولِ زر کے مقصد پر مبنی تھی اور اس میں مذہبی عداوت یا قومی منافرت کا کوئی جذبہ شامل نہ تھا۔ اور ہندو چونکہ اپنی کفایت شعاری کی عادت اور بنج بیوپار کی قابلیت کے باعث آج کل کی طرح اُس وقت بھی نسبتہً مالدار تھے۔ اس لئے مرہٹہ لیڈروں کے ہاتھوں وہی زیادہ نقصان اُٹھاتے تھے۔ دِتاجی سیندھیا اور ہلکر کی فوجیں جن دیہات سے گزرتی تھیں اُن کو بے چراغ کر دیتی تھیں۔ لہذا دیہاتیوں کے دلوں میں مرہٹوں کے خلاف غم و غصّہ پیدا ہوا۔ اور اُس کا خمیازہ بالفاظ کپتان گرانٹ ڈف دتاجی کو یہ بھگتنا پڑا کہ گاؤں والوں نے باوجودیکہ ان دیہات کی آبادی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بوجہ نفرت و عداوت کے اس کو احمد شاہ ابدالی کی نقل و حرکت سے مطلع نہیں کیا۔ شاہ ابدالی نے اس موقع پر یہ چال کی کہ اپنی فوج کے ایک حصّے کو بداؤں گھاٹ کے گرد و نواح میں جمنا پار نقل و حرکت دیتا رہا۔ جس کو دتاجی نے شاہ کی اصل فوج خیال کیا۔ اور بداؤں گھاٹ کی حفاظت کا انتظام کر دینے پر مطمئن رہا۔ مگر شاہ ابدالی نے اپنی بڑی فوج کے ساتھ نجیب الدولہ کی واقفیتِ علاقہ اور دیہاتیوں کی چشم پوشی کی بدولت دہلی کے قریب چپکے سے جمنا کو عبور کر لیا اور عین مکر سنکرانت کے تہوار کے روز۔ جبکہ سیندھیا نے دہلی میں اپنی فوج کی پریڈ کرائی اور افسروں کو اپنے ہاتھ سے تل چاول تقسیم کئے تھے۔ شاہ ابدالی کی سپاہ نے اس کو دو طرف سے گھیر لیا۔ یعنی ہراول دستہ نے بداؤں گھاٹ پر جمنا سے گزر کر جن راؤ داسلے کے محافظ دستہ کو منہزم کر کے دہلی کا رُخ کیا اور شاہ ابدالی اپنی بڑی سپاہ کے ساتھ دوسری جانب سے حملہ آور ہوا۔ دتاجی سیندھیا نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ مگر چونکہ اُس کی فوج تعداد میں بھی شاہ ابدالی کی سپاہ سے کم تھی اور اس کے حملے سے غافل بھی تھی۔ اس لئے افغانوں نے بہت جلد اس کو مغلوب کر لیا۔ دتاجی اور اس کا سوتیلا بھائی جیوبتا میدان کارزار میں کھیت رہے اور اُس کا دلاور نوجوان بھتیجا جنکوجی پسر جیاپا سیندھیا دو تین ہزار بقیۃ السیف آدمیوں کے ساتھ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔ جس کی دتاجی نے خود نوجوان موصوف کو تاکید کی تھی۔ جنکوجی جب سورج مل جاٹ کے قلعہ کومبیر میں پہنچا۔ تو اُس کے بدن پر چھوٹے بڑے ستائیس زخم تھے۔ سورج مل نے اُسی وقت جراحوں کو بلوا کر بڑے بڑے زخموں میں ٹانکے دلوائے اور دوسروں میں ریشم جلا کر بھروایا اور جنکوجی کے رفقاء کو بھی پناہ دی۔ اس قلعہ کومبیر میں اِس وقت عماد الملک غازی الدین اور راجہ ناگر مل بھی موجود تھے اور اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر حضرت میر تقی میرؔ بھی راجہ موصوف کی رفاقت میں دہلی سے روانہ ہوئے تھے جس کا حال اُنھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" میں لکھا ہے اور اُس کے ضمن میں پانی پت کی جنگِ سوم کا بھی ذکر کیا ہے!

ملہار راؤ ہولکر کی فوج کی تباہی

دتا جی سیندھیا کی فوج شاہ ابدالی کی اس تیز دستی سے بالکل تباہ ہو
اور شاہ موصوف دہلی میں ٹھہرا۔ مگر اس نے دربارِ مغلیہ کی سیاسیات میں
کچھ دخل نہیں دیا اور محی السنہ۔ جس کو عماد الملک نے تخت نشین کیا تھا۔ بدستور حکمران رہا۔ اور شاہ ابدالی
دہلی سے رخصت ہو گیا۔ ملہار راؤ ہولکر نے اجل رسیدہ دتا جی سیندھیا سے زیادہ دانشمندی کا اظہار کیا
اور قصبۂ ریواڑی سے مرہٹوں کے قومی طریقے پر قزاقانہ لڑائیوں کا سلسلہ جاری کرنے کے ساتھ جنوب
کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہولکر نے سورج مل سے امداد چاہی۔ سورج مل نے صاف جواب
دے دیا کہ وہ ملہار راؤ کی موجودہ قوت کے ساتھ شاہ ابدالی سے نبرد آزما ہونے کی طاقت نہیں رکھتا
افغان اس کے علاقے پر حملہ آور ہوں گے تو وہ اپنے مضبوط قلعوں میں پناہ لے گا۔ اور جس طرح بن پڑے
اپنی جان بچائے گا۔ سورج مل نے ہولکر کو بھی صلاح دی کہ وہ فی الحال جنوب کی طرف ہٹ جائے اور
شاہ ابدالی کا سامنا نہ کرے۔ ہولکر نے اس مشورے پر عمل کیا۔ اور لمبے لمبے کوچ کر کے آگرہ کے اس پار
نکل گیا۔ مگر اس اثناء میں اس کو اپنے جاسوسوں سے یہ خبر ملی کہ ایک بڑا بدرقہ کثیر سامانِ رسد اور کچھ خزانہ
لئے ہوئے احمد خاں بنگش کے ایک سردار کی زیرِ حفاظت شاہ ابدالی کے لشکر کو جا رہا ہے۔ ہولکر
بمصداق۔ ع بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند۔ اس سے لالچ پیدا ہوا اور اس نے اپنے سواروں کی ایک
مضبوط جمعیت کے ساتھ تیزی سے جمنا کو عبور کیا۔ اور بدرقہ پر حملہ آور ہو کر احمد خاں بنگش کے محافظ
کو یکایک جا دبایا۔ اور کسی قدر سامانِ رسد اور روپیہ اُن سے چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ا
اس کے بعد جمنا کو دوبارہ عبور کر کے سکندرہ پہنچا۔ اور وہاں شہنشاہ اکبر اعظم کے مقبرے کے جوار
میں اپنا کیمپ ڈالا۔ کیونکہ ہولی کا تہوار آ گیا تھا۔ ملہار راؤ ہولکر کی فوج کے لوگ تو سکندرہ میں ہولی منا رہے
تھے اور یہاں احمد شاہ ابدالی کو جب بدرقہ کے لٹ جانے کی خبر پہنچی تو وہ قدرتی طور پر سخت غضبناک ہوا
اور اس نے افغان سواروں کا ایک زبردست دستہ جس کی تعداد دس سے پندرہ ہزار تک بتائی جاتی
ہے اپنے وزیرِ اعظم کے بھانجے شاہ پسند خاں کی سرکردگی میں ہولکر کی تادیب کے لئے بھیجا۔ جس نے
ایک شبانہ روز میں اسی کوس کا فاصلہ طے کیا اور دہلی پہنچ کر صرف ایک روز دم لیا اور یہاں سے ایک
رات میں درمیانی فاصلہ طے کر کے اور خاموشی کے ساتھ جمنا کو عبور کر کے علی الصباح وہ ایسے وقت
سکندرہ میں پہنچ گیا۔ جبکہ ملہار راؤ ہولکر کی فوج کے لوگ ہولی کا تہوار منا رہے تھے اور دھول دھپہ
کے نلیچ رنگ میں مشغول تھے۔ شاہ پسند خاں کے افغانوں کی ناگہانی تاخت نے ہولکر کی فوج کو بڑی
درجے تک تباہ کر دیا۔ اور ملہار راؤ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر چڑھ کر

بھاگنے کا موقع ملا۔ باقی اُس کا تمام سامان افغانوں کے ہاتھ آیا۔ جس میں وہ خزانہ بھی شامل تھا جو احمد خاں بنگش کے بدرقہ سے چند روز قبل چھینا گیا تھا۔ سیندھیا اور ہولکر کی اِن فوجوں کی تباہی سے دہلی سے لے کر منبل تک کا علاقہ قریب قریب مرہٹوں سے صاف ہو گیا۔ اور احمد شاہ ابدالی نے اس کے بعد قصبہ کول عرف علی گڑھ کی طرف متوجہ ہو کر قلعۂ ثابت گڑھ کو جس کا نام سورج مل نے بدلکر رام گڑھ رکھا تھا۔ لڑکر چھین لیا اور اس میں قیام اختیار کر کے اس کے گرد اپنی چھاؤنی ڈالی۔ اِس اثنا میں شاہ ابدالی کو پنجاب سے یہ اطلاع ملی کہ آدینہ بیگ خاں جو بہت چالاک و خود غرض تھا، فوت ہو گیا۔ اور سکھوں نے شورش کر کے اُس کے سالے اور دیوان اور پیشکار کو جو دونوں ہندو تھے۔ تباہ کر دیا۔ اِس پر شاہ ابدالی نے زین خاں کو فوجدار سرہند اور بلند خاں کو صوبہ دار لاہور و ملتان مقرر کر کے دس ہزار سواروں اور کچھ پیادوں کی جمعیت کے ساتھ پنجاب میں انتظام کی غرض سے بھیجا۔ اور خود فصلِ گرما کے تین سخت مہینے قصبۂ کول میں گزارے۔ جس کے نواح میں متعدد باغ واقع تھے اور شکار بھی بکثرت ملتا تھا۔

مرہٹہ فوج کی شان و شوکت کے ساتھ دکن سے روانگی

رگھوبا نے شمالی ہندوستان کے قدیم درباروں میں دخل و تصرف حاصل کر کے مرہٹہ فوج کا رنگ بدل دیا تھا اور اب وہ مفلوک الحال نیم برہنہ لٹیرے نہیں رہے تھے۔ جو قزاقانہ طریقے کی لڑائیاں لڑتے تھے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر بھی کوسوں کے دھاوے مارتے تھے۔ اور آندھی کی طرح یکایک پہنچ کر اپنے دشمنوں پر چھا جاتے تھے۔ اور سرسبز علاقوں کو لوٹ کر تباہ کر دیتے تھے۔ اب اِن میں ایک باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی اور شان و شوکت بڑھ گئی تھی۔ جو اُن کی قدیم تیز دستی میں مانع آتی تھی۔ دکن سے جو فوج شاہ ابدالی کے مقابلے کی غرض سے روانہ ہوئی۔ اُس کی کمان اگرچہ سداشیو راؤ بھاؤ کے سپرد کی گئی۔ جس نے رگھوبا کو فضول خرچی کا طعنہ دیا تھا۔ مگر اپنی ماتحت فوج کو رگھوبا کے تیار کردہ سامانِ شان و شوکت سے آراستہ کرنے میں اُس کو دریغ نہیں ہوا۔

ابراہیم خاں گاردی مرہٹوں کا معتمد افسر

چنانچہ مرہٹہ مورخ کپتان گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ بھاؤ کی فوج جو بوقتِ روانگی بیس ہزار چیدہ سواروں اور دس ہزار مغربی وضع پر تربیت یافتہ توپچیوں اور قواعد داں پیادوں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے آخر الذکر حصہ ابراہیم خاں گاردی کے ماتحت تھا۔ جس نے فرانسیسی افسران کے ماتحت رہ کر یورپین طریقے پر فوج کو آراستہ کرنے اور تربیت دینے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔ گاردی بھاؤ کا بڑا معتمد علیہ افسر تھا اور آخر وقت تک اپنے آقا کا نمک حلال رہا۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہو گا۔ زمانۂ حال کے تاریخ نگار کینکینڈ ڈپارسنس نے میدانِ پانی پت کی

ظلم تباہی کا الزام بھاؤ پر سے ہٹانے کی کوشش میں ابراہیم خاں گاردی پر اس کو دھکیاں دینے کا فرضی
لزام قائم کرنا چاہا ہے۔ مگر کوئی سند اپنے بیان کی پیش نہیں کی ہے۔ برخلاف ازیں فارسی تاریخوں میں
س کا ذکر موجود ہے کہ افغانوں نے معرکۂ پانی پت سے قبل ابراہیم خاں گاردی کو اتحاد مذہب و
دینیت کا واسطہ دلا کر مرہٹہ لشکر سے توڑ لینے کی سخت کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور
گاردی نے اپنے ماتحت آدمیوں کے ساتھ جن میں مسلمانوں کی معقول تعداد شامل تھی۔ مرہٹوں کی
رف سے پورے جوہر شجاعت دکھائے اور وہ میدان جنگ سے ایسی حالت میں اٹھایا گیا جب کہ
ن کا بدن زخموں سے چور چور تھا۔ ابراہیم خاں گاردی کے بھائی فتح خاں کا بعد میں عرصۂ دراز تک
یشوا کی ملازمت میں رہنا بھی ثابت کرتا ہے کہ گاردی پر گرینٹ ڈف و پارسنس کا عائد کردہ الزام غلط
ہے۔ ورنہ اگر وہ پانی پت کے معرکے میں کسی موقع پر بھاؤ کی ذرا بھی حکم عدولی کرتا تو پیشوا و مرہٹہ سردار
ن کے بھائی اور اہل خاندان سے ضرور بدگمان ہو جاتے اور اس کو اپنی ملازمت میں توپ خانے کی
سری کے اہم عہدے پر نہ رکھتے۔

مرہٹہ فوج کا ساز و سامان

بقول گرانٹ ڈف بھاؤ کی فوج کے پاس بلند و وسیع خیمے تھے جن کے
اندرونی حصے ریشمی اور سپید براق کپڑے سے منڈھے ہوئے تھے اور
پر بڑے بڑے طلائی و نقرئی کلس لگے ہوئے تھے۔ جو بڑی دور سے دکھائی دیتے تھے۔ رنگین
ھاری اور مضبوط کپڑے کی اونچی قناتیں بڑے بڑے افسروں کے خیام کے گرد تنی رہتی تھیں۔ ہاتھیوں
ی کثیر تعداد۔ ہر وضع کے جھنڈے۔ شاندار ساز و یراق سے آراستہ عمدہ نسل کے گھوڑے اور ایک
ندوستانی فوج کے ساتھ کے تمام وہ ساز و سامان جن کے باعث اس کا نظارہ اس قدر موثر ہوتا ہے
اؤ کے لشکر میں ہر جگہ سے فراہم کئے گئے تھے۔ افسران کا لباس زربفت و کمخواب کا تھا۔ اور فوج
ے تمام اشخاص اُن اسباب نمود میں جو آسانی حاصل شدہ دولت کا لازمہ ہوتے ہیں بلا تکلف لیجائی جا رہی
ھے جو شجاع و نامور افسر مرہٹوں کے مرکز حکومت میں اس وقت موجود تھے۔ وہ بھاؤ کی رفاقت میں
بھیجے گئے۔ مثلاً بلونت راؤ گنپت بنا لی۔ شمشیر بہادر جو باجی راؤ کا فرزند اس کی مسلمان بیوی سے تھا۔
ور جس کا بیٹا بعد میں علاقۂ بوندیلکھنڈ کا مرہٹوں کی طرف سے حکمران اور ریاست باندہ کا بانی ہوا۔
روشنکر (راجہ بہادر) وٹھل سیوادیو (ونچورکر) ترمبک سیوداشیو (پورندھری) جو سب اول درجے
ے سردار اور کئی کئی ہزار سواروں کے افسر تھے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے مرہٹہ سردار بھی بھاؤ کے ماتحت
ے جن کے اسلاف مغل شہنشاہوں کے عہد میں خاص اثر و اقتدار رکھتے تھے اور اب پیشواؤں کے زیر

انتظام برہمنوں کے عروج سے اُن کی وہ قوت باقی نہ رہی تھی مگر ذاتی شجاعت کے جوہر خاندانی سے وہ متصف تھے۔

بھاؤ کی روانگی سے قبل جملہ مرہٹہ سرداروں کے نام جو اِس وقت شمالی علاقوں میں موجود تھے۔ احکام جاری ہو چکے تھے کہ ان کو مع اپنی فوجوں کے بھاؤ کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ بھاؤ کی فوجی قوت اثنائے راہ میں برابر بڑھتی رہی اور دریائے چنبل کو عبور کرنے سے پہلے جنکوجی سیندھیا جو دتاجی سیندھیا کے تباہ شدہ لشکر سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا اور سورج مل کی زیر نگرانی قلعہ کومھیر میں اُس کے زخموں کا علاج کرایا گیا تھا۔ ملہار راؤ ہلکر جو سکندرہ پر اپنی فوج کے افغانوں کے ہاتھ سے تباہ ہونے کے وقت بمشکل اپنی جان بچا سکا تھا۔ دتاجی گائیکوار جسونت راؤ پنوار آپاجی راؤ اٹھاؤ کے۔ انتاجی منکیسر۔ گووند پنت بوندیلے۔ جس نے چاندپور و امروہہ کے گرد روہیلوں کے دیہات بڑی بیدردی سے تباہ کئے تھے۔ اور متعدد دیگر سردار اپنی فوجوں کے ساتھ بھاؤ کے لشکر میں شریک ہو گئے۔

اوّرین صاحب نے تاریخ زوال سلطنتِ مغلیہ میں مرہٹہ ذرائع سے اطلاع کی بنا پر لکھا ہے کہ چنبل کو عبور کرنے کے وقت گاردی کے دو ہزار سواروں اور نو ہزار پیادوں کے علاوہ جن کو مغربی طریقوں پر فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اور جو توڑہ دار بندوقوں سے مسلح تھے پانچ چھ ہزار مزید بے قاعدہ پیادے اور اٹھاون ہزار سواران جرار بھاؤ کے جھنڈے کے نیچے موجود تھے۔ جن میں سے پانچ ہزار ملہار راؤ ہلکر۔ دس ہزار جنکوجی سیندھیا۔ آٹھ ہزار دتاجی گائیکواڑ۔ دو ہزار جسونت راؤ پنواڑ۔ اور باقی ماندہ دیگر مرہٹہ سرداروں کے رسالوں کے جوان تھے۔ چالیس ۴۰ نئی وضع کی توپیں گاردی کے توپ خانے میں تھیں اور توپوں کی مجموعی تعداد دو سو سے کم نہیں تھی۔ جن میں سے اکثر توپیں بہت بھاری تھیں۔ ان کے علاوہ پنڈاروں کے دو سردار اپنے پندرہ پندرہ ہزار لٹیرے اور مفلوک الحال سواروں کے ساتھ بھاؤ کے لشکر میں آکر شریک ہو گئے تھے۔ ان پنڈاروں میں مسلمانوں کا عنصر کافی موجود تھا۔ چنبل کو عبور کرنے کے بعد راجپوتانہ کے راجگان بھی اپنی جمعیتوں کے ساتھ مرہٹوں سے آکر ملے اور سورج مل جاٹ بھی ہولکر کے کہنے سے تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا۔

مرہٹوں اور راجپوتوں کے احسانات

گرانٹ ڈف راجپوتوں کی شرکت سے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ شمالی ہند کے ہندوؤں نے اس معرکے کو اپنا قومی مقصد بنا لیا تھا۔ مگر یہ انگریزی مؤرخین کا عام رنگ ہے اور اس ملک کی معمولی سیاسی لڑائیوں پر اسی طرح مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ہندوستانیوں اور افغانوں کی باہمی کشمکش تھی اور بھاؤ کے خود

نے خواہ اس سے بعض فاحش غلطیاں کراوی ہوں۔ مگر ہولکر، سیندھیا وغیرہ مرہٹہ سردار اس کو اسی رنگ میں دیکھتے تھے اور راجپوت سردار اور سورج مل بھی یہی جذبات رکھتے تھے۔ اور شاہ ابدالی ان کے نزدیک ایک بیرونی حملہ آور تھا جو مغل شہنشاہی حکومت ہند کے دو صوبوں پنجاب اور سندھ کو چھین چکا تھا۔ اور بقیہ علاقوں کو بھی مسخر کرنا چاہتا تھا۔ ابدالی کے جو ہم قوم روہیلے اور بنگش پٹھان ہندوستان میں بعض شہنشاہی علاقوں پر متصرف تھے وہ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور مرہٹے اور راجپوت اُن پٹھانوں کا زور توڑنا، احمد شاہ ابدالی کو افغانستان واپس جانے پر مجبور کرنا، اور شہنشاہی صوبوں کو اس سے چھڑانا چاہتے تھے، اور خود شہنشاہ کے کارکنان کی حیثیت سے اُن پر متصرف ہوکر فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مرہٹوں کے ان خیالات کا ثبوت اُن خطوط سے ملتا ہے جو اُنھوں نے نواب شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کو لکھے تھے۔ جس کا نانا نواب برہان الملک اگرچہ خود مغل تھا اور نصف صدی قبل ایران سے آکر دربارِ شہنشاہی میں ملازم ہوا تھا۔ اور مرہٹوں نے اس کے ہاتھ سے ایک مرتبہ میدانِ جنگ میں شکست بھی کھائی تھی، مگر صفدر جنگ کے شہنشاہ کا وزیر اعظم بننے پر اب اس کے بیٹے شجاع الدولہ کو وہ ایک ملکی امیر سمجھنے لگے تھے اور شاہ ابدالی کی رفاقت سے باز رکھنا چاہتے تھے۔

بھاؤ کے ایک خط کا مضمون مرہٹہ سپہ سالار کا ایک خط بنام شجاع جو ہنوز محفوظ ہے اس میں بھاؤ نے نواب موصوف کو اس طرح نشیب و فراز دکھایا ہے کہ:۔

"ہم اور آپ ایک کشتی کے بادبان ہیں۔ یعنی شہنشاہ ہندوستان کے خادم و خیر سگال ہیں۔ افغان لوگ ہندوستان والوں کی جان و مال اور ناموس کے دشمن ہیں۔ اور یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بھی بدتر جانتے ہیں۔ ہندوستان کے اُمرا میں جس کو ان افغانوں سے دلی نفرت ہے۔ وہ صرف آپ ہیں۔ اور باقی سب امرا ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ احمد خاں بنگش کو اگرچہ دربارِ شہنشاہی سے امیر الامرا کا مرتبہ ملا ہے۔ مگر ہم قومی کے اثر سے وہ افغانوں کی شرکت اختیار کریں گے۔ بالفرض افغان اس وقت دکنیوں (مرہٹوں) پر غالب آگئے تو اس وقت شاہ افغانستان اور اُن کے رفیق سرداروں کا دور دورہ ہوگا۔ تمہیں کون پوچھے گا اور ولایت کے ہزارہا اُمرا کی آواز میں ایک (ہندوستانی) امیر کی آواز نقارخانے میں طوطی کی صدا کا حکم رکھے گی۔ اور شہنشاہِ ہند پھر کیا کر سکیں گے۔ اور اُن کو بیٹھنے کے لئے کونسا ٹھکانہ ملے گا۔

ہمارا مقصود پٹھانوں کی بیخ کنی ہے۔ جن کا دماغ شاہ ابدالی کی امداد سے فلک الافلاک پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد ہم امیر تیمور صاحبقران کے مکان کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اغیار ان کی

جگہ بیٹھیں اور وہ در بدر پھریں۔ اگر تم کو بھی اس خاندان کا پاس نمک ہے اور اپنے ولی نعمت کے مکان کی رونق منظور ہے تو بلا تامل ہمارے شریک حال ہو جاؤ۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم نے اغنیمہ پر فتح پائی تو وارثِ سلطنت شاہزادہ عالی گوہر کو تختِ شہنشاہی پر بٹھا کر اور تم کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب دلا کر آمدنی ملک میں سے اپنا حصہ مقرر کرانے کے بعد ہم دکن کو واپس چلے جائیں گے۔ اور ہمارا مقصد آپ کی رفاقت سے یہ نہیں ہے کہ آپ ہمارے لشکر میں شامل ہو کر غنیم سے لڑیں۔ بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کو واپس چلے جائیں۔ اور احمد شاہ ابدالی کے بلانے پر اُس کے پاس نہ جائیں۔"

خط کے اختتام پر نواب کے خاندان اور مرہٹوں کی روایتی دوستی کا حوالہ دیا گیا تھا کہ:۔

"شری منت باجی راؤ پردھان اور نواب برہان الملک مغفورین جو عہد و پیمان ہوئے تھے وہ خاص و عام پر ظاہر ہیں۔ پس باوجود ان قدیم مراسم دوستی و اخلاص شما ہی کے ہم سے موافقت نہ کرنا اور ہمارے خلاف دوسروں سے ملنا بعید از انصاف ہے۔"

اِس خط کو پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹوں کے دلوں میں مذہبی عداوت کے جذبات موجود تھے۔ یا شجاع الدولہ اِس قسم کے جذبات مرہٹوں کے دلوں میں سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بھاؤ کو ایسا نامہ و وداد شجاع الدولہ کے نام بھیجنے کی ہمت نہ پڑتی اور شجاع الدولہ شاہ ابدالی کی شرکت میں پس و پیش نہ کرتے۔ بلکہ سکرتال پہنچ کر نجیب الدولہ کو مرہٹوں کی گرفت سے چھڑانے کے بعد روہیلہ سرداروں کے ساتھ ہی شاہ ابدالی کے استقبال کو روانہ ہو جاتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور نجیب الدولہ کو خطرناک حالت سے نکالنے میں مدد دینے کے بعد اپنے علاقے کو روانہ ہو گئے۔ نجیب الدولہ چونکہ شجاع الدولہ کی شرکت شاہ ابدالی کے ساتھ بہت ضروری سمجھتا تھا۔ اِس لئے اُس نے شاہ ابدالی سے بوقتِ ملاقات یہ عذر کر دیا کہ شجاع الدولہ کسی قدر علیل بھی ہو گئے تھے۔ نیز اُن کو اپنے غربی علاقوں میں مرہٹوں کی شرارت سے بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فی الحال انھوں نے اپنے مستقرِ حکومت کو چلا جانا ضروری سمجھا اور وہاں کی حفاظت کے ضروری انتظامات کرنے کے بعد وہ شاہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ شاہ ابدالی شجاع الدولہ کی اِس حکمتِ عملی کو سمجھ گیا۔ کہ وہ اِس وقت الگ رہنا، فریقین سے ربط ضبط قائم رکھنا" اور آخر میں غالب فریق کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔

شجاع الدولہ کی شاہ ابدالی کے ساتھ شرکت

مگر جب مرہٹوں کے شجاع الدولہ سے نامہ و پیام کرنے کی شاہ کو اطلاع ملی تو نجیب الدولہ کو اندیشہ پیدا ہوا اور خط و کتابت اور معتمدین کی زبانی پیام رسانی پر اکتفا نہ کر کے اُس نے نواب شجاع الدولہ کو شاہ ابدالی کے ساتھ شرکت کی

ترغیب دینے کے لئے خود نواب موصوف کے پاس جانا ضروری سمجھا خصوصاً جبکہ انھیں یہ معلوم ہوا کہ بھاؤ نے اپنا خط ایک معزز شخص کے ہاتھ معہ تحائفِ گراں بہا شجاع الدولہ کو بھیجا ہے اور راجہ ناروشنکر اوّل درجے کا مرہٹہ سردار عنقریب شجاع الدولہ کو لانے کے واسطے جا رہا ہے۔ نجیب الدولہ چونکہ نواب شجاع الدولہ کی بروقت امداد کے بے حد منّت پذیر تھے اور "امیر الامرا" کا لقب شہنشاہِ دہلی سے حاصل کرنے کے باوجود سکرتال سے جو خطوط انھوں نے شجاع الدولہ کو جو ابھی تک اپنے باپ کے موروثی منصب وزارتِ عظمیٰ پر فائز نہیں ہونے پائے تھے لکھے تھے۔ ان میں "معروضہ" و "گزارش" کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اِس لئے بمصداق۔ ع خوشامد ہر کرا کردی خوش آمد۔

شجاع الدولہ کے دل میں اُن کی بڑی جگہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب نجیب الدولہ از خود یا شاہِ ابدالی کی طرف سے پیام رساں بن کر براہِ اٹاوہ قنوج آئے۔ تو شجاع الدولہ خود اپنے صدر مقام سے بڑھ کر مہدی پور مضافات ملانواں میں پہنچے۔ بوقت ملاقات اِن دونوں سرداروں کی جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ مالوہ میں بالتفصیل مندرج ہے اور وہاں سے لیکر تاریخ اودھ میں بھی مولوی نجم الغنی نے بجنسہٖ نقل کر دی ہے۔ لہٰذا اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ نجیب الدولہ نے مرہٹوں کی لُوٹ کھسوٹ کی عادت سے اُن کو خوف دلایا اور بھاؤ نے جو تحقیر آمیز طریقے نربدا سے پار ہوتے ہی اختیار کر لئے تھے اور جن میں گاہے گاہے مذہبی عداوت کا رنگ بھی جھلکنے لگتا تھا۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مرہٹے صرف زبانی شہنشاہِ دہلی کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔ مگر اُن کو موقع ملے گا تو وہ شہنشاہِ دہلی کو تخت سے اُتار دیں گے۔ اور دار السلطنت دہلی میں ہندو راج قائم کر لیں گے۔ جب مغلیہ سلطنت ہی نہ رہے گی تو آپ کو مرتبۂ وزارت کہاں سے ملے گا۔ اِس قسم کی باتوں سے نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کو شیشے میں اُتار لیا بلکہ ایک روایت میں یہاں تک مذکور ہے کہ شجاع الدولہ جب کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کیونکہ وہ افغانوں سے بھی مرہٹوں کے برابر ہی خوف کھاتے تھے تو نجیب الدولہ نے پہلے اُن کو اپنے سر کی قسم دی اور بعد ازاں تلوار نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی اور اپنا سر جھکا کر کہا کہ وہ اُس کو قتل کر ڈالیں۔ کیونکہ نواب موصوف کو ساتھ لئے بغیر تنہا جانے پر وہ شاہ ابدالی کا موردِ غضب ہوگا اور ایک بیرونی شخص کے ہاتھ یا حکم سے مارے جانے کے بجائے وہ اس کو ترجیح دیتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ جیسے شفیق سرپرست کے ہاتھ سے اُس کی زندگی کا اختتام ہو۔ اِس پر شجاع الدولہ مجبور ہو گئے اور اپنے نابالغ ولیعہد میرزا امانی کو جو بعد میں بہ لقب آصف الدولہ مسند نشین اور وزیر الممالک کے موروثی عہدے پر فائز ہوئے۔ اودھ میں اپنا قائم مقام اور راجہ بینی بہادر کو ان کا مختار بنا کر دس بارہ ہزار فوج کے ساتھ

ہمراہی نجیب الدولہ شاہ ابدالی کے پاس گئے۔ جس نے اپنے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کو ایک منزل استقبال کے لیے بھیجا۔ اور اپنے بیٹے تیمور شاہ سے سرحد لشکر پر استقبال کرایا۔ اور اپنی غیر معمولی عنایات سے نواب موصوف کے دل کا خوف زائل کرایا۔ تاہم شجاع الدولہ نے شاہ کے لشکر میں پہنچنے کے بعد بھی مرہٹوں سے سلسلۂ نامہ و پیام جاری رکھا اور اپنے طور پر در پردہ مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔

بھاؤ میں ناعاقبت اندیشی و غرور

بھاؤ کے تحقیر آمیز طریقوں سے مرہٹوں کو شدید نقصان پہنچا اور خود مرہٹہ مورخین بھی پانی پت کی تباہی کو انہی طریقوں کا ایک نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ رگھوبا جیسے ہوشیار و تجربہ کار شخص کو مرہٹہ فوج کی کمان اِس موقع پر سپرد نہ کیے جانے کی کمی اِس طریقے سے پوری ہو سکتی تھی کہ ملہار راؤ ہولکر۔ جنکوجی سیندھیا وغیرہ جو سردار ہندوستان کی مہمات و معاملات کا تجربہ رکھتے تھے، اُن کے مشوروں پر عمل کیا جاتا۔ اور سورج مل جاٹ اور راجپوت راجاؤں کی صلاح مانی جاتی۔ جو اپنے آپ کو مغل شہنشاہ کے کارکنان کی حیثیت سے پیش کر کے عام باشندگانِ مُلک کی ہمدردی و تائید بیرونی حملہ آور شاہ ابدالی اور اُس کے پٹھان رفقاء کے مقابلے میں حاصل کرنی چاہتے تھے۔ اور اس معرکۂ جنگ میں کوئی مذہبی رنگ پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ مگر بھاؤ نے از راہِ غرور اپنے تجربہ کار سرداروں اور سورج مل و راجپوت راجگان دونوں کے مشوروں کو ٹھکرایا اور اپنی حرکات سے ان کو سخت بددل کر دیا۔ سورج مل نے اپنے ایک قلعے میں بھاؤ اور سربرآوردہ مرہٹہ سرداروں کی ضیافت کی۔ جس میں بعض روایات کے بموجب عماد الملک بھی موجود تھا اور سورج مل نے متھرا کے حوالی میں جب بھاؤ کا استقبال کیا تھا۔ اُس وقت بھی عماد الملک اُس کے ساتھ تھا۔ دیگر روایات کے بموجب مرہٹوں کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد بھی عماد الملک خفیہ طور پر بھاؤ کی ملاقات کے واسطے آیا تھا۔ اثنائے ضیافت میں جو مشورہ سورج مل نے دیا تھا اُس کی عماد الملک نے بھی تائید کی۔ سورج مل کے مشورے کے الفاظ بھی بعض یادداشتوں میں مندرج ہیں۔ خلاصۂ مطلب ان کا یہ ہے کہ سورج مل نے بھاؤ کو صلاح دی کہ وہ اپنے لشکر کے بھاری سامان گرانبار توپوں اور عورتوں کو جنہیں بھاؤ نے فتح کی قوی امید پر اپنے ہمراہ لیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ قریباً تمام بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں نے اپنی زنانہ سواریوں کو شمالی ہند کی لڑائی میں ساتھ رکھا تھا اور اس طرح اپنے لشکر میں بڑی حد تک مغلوں کے لشکر کی سی ایک شان پیدا کر لی تھی۔ اُس کے قلعوں میں چھوڑ دیں۔ جن کی حفاظت کا وہ کامل اطمینان دلا سکتا ہے۔ اور خود ہلکی توپوں اور سواروں کے ساتھ آگے قدم بڑھا کر روہیلوں کے علاقے میں پھیل جائیں اور مرہٹوں کے قدیم طریقے کے بموجب قزاقی لڑائیوں کا سلسلہ جاری کریں۔ پٹھان سردار جب اپنے علاقوں کے مرہٹوں کی

دستبرد سے تباہ ہونے کی خبر پائیں گے تو مجبوراً شاہ ابدالی کا ساتھ چھوڑ کر اُن کی حفاظت کے لئے جائیں گے۔ اور چونکہ شاہ ابدالی کا سرہند سے آگے قدم بڑھانا محض اُن روہیلہ سرداروں کی عرضداشتوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جب یہ اُس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو پنجاب کو افغانستان سے ملحق کرنے کے سوا اُسے خاص ہندوستان کے معاملات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے گی اور اس مُلک کی گرمی بھی افغان سپاہیوں کو پریشان کرے گی۔ اس لئے شاہ ابدالی اپنے وطن کو واپس چلا جائے گا۔ اپنے حامی کی واپسی کے بعد رُہیلوں کے حواس بھی درست ہو جائیں گے اور وہ یا تو ہم سے پہلے کی طرح صلح کریں گے۔ یا ہم اُن کے علاقوں کو چھین لیں گے۔ اور اِدھر کے قضیوں سے نجات پا کر پنجاب کو بھی بآسانی افغانوں کی گرفت سے چھڑا سکیں گے۔ سورج مل کا یہ مشورہ اُس وقت کے حالات کی بناء پر بہت مناسب تھا۔ مگر بھاؤ نے اِس پر کان نہیں دھرا۔ بلکہ سورج مل کو یہ جواب دیا کہ وہ ایک چھوٹا سا زمیندار ہے اور ملک گیری کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اِسی موقع پر اُس نے بہترین کاردان مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہولکر کی بھی۔ جس نے سورج مل کے مشورے کو قرین صواب بتایا تھا۔ توہین کی اور اُس کے گڈریوں کی نسل سے ہونے کا ایسے طریقے پر اشارہ کیا کہ ملہار راؤ ہولکر کو سخت ناگوار گزرا اور چونکہ سورج مل کو مرہٹہ سرداروں میں ملہار راؤ ہولکر پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ اِس لئے ہولکر کی اہانت سے اُس کو بھی صدمہ پہنچا اور وہ موقع کا منتظر رہا۔

دہلی اور لال قلعے میں مرہٹوں کا داخلہ

اِس اثنا میں برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ شاہ ابدالی اپنی افواج کے ساتھ دریائے جمنا کے پار انوپ شہر میں مقیم تھا۔ لہٰذا مرہٹوں نے جمنا کے عبور کرنے میں دقت محسوس کر کے دارالسلطنت دہلی کا رُخ کیا۔ جہاں شاہ ابدالی دتاجی سیندھیا کی جمعیت کا قلع قمع کرنے کے بعد اپنے ایک سردار یعقوب علی خاں کو قلیل جمعیت کے ساتھ بغرض حفاظت چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ تخت وزارت شہنشاہی کی جو عظمت وعقیدت دیگر فرقہائے رعایا کی طرح مرہٹوں کے دلوں میں بھی تھی۔ اس کو مدِ نظر رکھ کر اس کا خیال نہ ہوتا تھا کہ مرہٹے دہلی پر کسی بُرے ارادے سے پیش قدمی کریں گے۔ بھاؤ اور اس کے سردار نواب سعد اللہ خاں مرحوم مشہور وزیر اعظم شاہجہاں، عالمگیر کی حویلی کے قریب آکر ٹھہرے۔ جس میں اس وقت ایک بہت بڑا محلہ آباد ہے۔ اور ایک پُرانی عمارت جو "نہر والی حویلی" کے نام سے ہنوز باقی ہے اور اصلی حویلی کی سابق عظمت شان کا کسی قدر پتہ دیتی ہے۔ اس حویلی کو اپنا مستقر قائم کرنے کے بعد مرہٹوں نے بھی لال قلعہ کو لینا چاہا۔ یعقوب علی خاں نے ابتدا میں مزاحمت کی۔ اور دتھل راؤ شیدیو اور ہولکر کے جو پانسو کے قریب آدمی اسد برج کی طرف سے فصیل پر چڑھ کر قلعے میں داخل ہو گئے تھے اُن میں سے بعض کو مغل قراولوں نے قتل کر ڈالا اور باقیماندہ نے فصیل سے کود کر

بھاگنے کی کوشش میں اپنے کو ہلاک کر لیا۔ قلعہ کے دوسری طرف خضری دروازے پر جھنکوجی سیندھیا کے آدمیوں نے ہتھوڑے بجائے، مگر بھاٹک کو توڑ نہ سکے۔ اس طرح اوّل روز مرہٹوں کا حملہ قلعۂ دہلی پر ناکام رہا۔ مگر دوسرے روز ابراہیم خاں گاردی نے دریا کی ریتی میں دو توپیں لگا کر جب قلعہ پر گولے پھینکنے شروع کئے اور اُن سے شاہی عمارات کو صدمہ پہنچنے لگا۔ تو یعقوب علی خاں نے جو ایسی قلیل جمعیت کے ساتھ کسی طرح قلعے کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ ملہار راؤ ہولکر کے ذریعے سے طرح مصالحت ڈالی۔ اور شہنشاہی ناموس و اسباب اور ساکنانِ قلعہ کی جان و مال کی حفاظت کے تحریری موثق وعدے حاصل کر کے خود معہ اپنے سامان و رفقاء کے قلعے سے نکل کر پہلے حویلی علی مردان خاں میں جو دریا کے قریب تھی جا ٹھہرا اور بعد ازاں کشتیوں پر دریائے جمنا کے پار اُتر کر شاہ ابدالی کی فوج میں جا ملا۔ یعقوب علی خاں کے قلعے سے نکل جانے کے بعد شاہی محافظوں نے قلعے کے دروازے مرہٹوں کے لئے کھول دئے۔ اور بھاؤ معہ اپنے نامی سرداروں اور راجپوت راجاؤں کے قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔

بھاؤ کی شدید غلطی اس موقع پر بھاؤ سے وہ نہایت شدید غلطی سرزد ہوئی جس نے اِس معرکہ کو ایک مذہبی رنگت دے دی اور اُس کے اکثر ہوا خواہوں کو اُس سے ناراض کر دیا۔ ملہار راؤ ہلکر کی وساطت سے یعقوب علی خاں دُرّانی محافظِ قلعہ سے جو عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اُن میں شاہی ناموس و اسباب، حکومت کے علاوہ ساکنینِ قلعہ کی جان و مال کے تحفظ کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ بھاؤ نے اُن عہود پر اس حد تک توعمل کیا کہ عماد الملک کے دست گرفتہ "محی السنہ" بادشاہ کو کسی قسم کا آزار نہیں پہنچایا اور شاہی ناموس پر بھی کوئی دستِ تعدّی دراز نہیں کیا۔ لیکن شاہ ابدالی کے حملے کو ٹالنے کیلئے اپنے کو روپئے کا ضرور تمند ظاہر کر کے عمالِ شہنشاہی پر دباؤ ڈالا۔ یہاں خزانۂ شاہی نادر شاہ کی دستبرد کی نذر ہو چکا تھا۔ اور اُس کے جانے کے بعد مُلک میں ہر طرف شورش تھی۔ صوبوں سے خراج بالکل نہیں آتا تھا اور جو آتا بھی تھا وہ راستے ہی میں لُٹ جاتا تھا۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ بعض شاہزادوں اور عمال کے پاس کچھ زر و جواہر موجود تھا۔ جو اُنھوں نے پوشیدہ کر رکھا تھا۔ یہ پوشیدہ مال چند سال کے بعد نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے شاہ عالم اور ارکانِ خاندانِ شہنشاہی و خدامِ دولت پر انتہا درجے کا جبر و تعدّی کر کے اُن سے وصول کیا۔ مگر وہ اِس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا اور سخت اذیت کے ساتھ ہلاک ہونے کے علاوہ اپنا نام نمک حراموں کی فہرست میں لکھوا گیا۔ اور ایک صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد آج بھی اُس کا تذکرہ غصّہ و نفرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بھاؤ کو جب خزانۂ شہنشاہی سے روپیہ حاصل کرنے میں مایوسی ہوئی تو اُس نے قلعے کے اسبابِ زینت و سامانِ شوکت پر نظر ڈالی

اور دیوانِ خاص کی نقرئی چھت اُکھڑوا کر ۱۷ لاکھ روپے اُس سے ڈھلوائے۔ اِس کے علاوہ اُس نے تخت و چتر اور دیگر سامانِ دربار کو بھی سونے چاندی کے لالچ میں توڑ دایا۔ اور قدم شریف۔ درگاہ محبوبِ الٰہی و قطب صاحب میں اور بہادر شاہ اوّل و محمد شاہ کے مقبروں پر جو طلائی شمعدان وعود وغیرہ تھے اُن کو بھی گلوا ڈالا۔

اِس ناگوار طریقِ عمل کی سورج مل و دیگر راجپوت راجاؤں نے سخت مخالفت کی اور ملہار ہولکر و جھنکوجی سیندھیا نے بھی بھاؤ کو روکا۔ راجپوتانہ کے راجاؤں نے صرف زبانی مخالفت پر اکتفا کی۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ چتر و تخت اور دربارِ شہنشاہی کے سامان کو ہاتھ نہ لگائے اور اس کے عوض میں وہ پانچ لاکھ روپے نقد بھاؤ کو نذر کریں گے۔ لیکن بھاؤ نے پہلے کی طرح اِن لوگوں کی نصیحت کا اثر قبول نہیں کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سورج مل اور راجپوتانہ کے راجگان سخت بددل ہو گئے۔ آخر کو موقع پاکر اپنی فوجیں بھاؤ کے لشکر سے نکال کر اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ راجپوتانہ کے راجاؤں اور ہولکر، سیندھیا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے دلوں میں دہلی شہنشاہی کا خاص احترام تھا۔ اور وہ اِس لڑائی کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ ایک معمولی سی کشمکش سمجھتے تھے۔ بھاؤ نے قدم شریف اور دوسری درگاہوں کے سامان پر جو دستبرد کی اُس سے ہندوؤں کو بھی رنج پہنچا اور مسلمانوں نے تو اُس کو ایک مذہبی اہانت سے تعبیر کیا۔

بھاؤ کی ہندو راج بحال کرنے کی کوشش

بھاؤ نے جس کی شامتِ اعمال نے مرہٹوں کو اِس تباہی عظیم میں مبتلا کیا۔ صرف دربارِ شہنشاہی کے سامان اور مآثر متبرکہ ہی کو غصب و برباد نہیں کیا بلکہ جو غلطی ہیمو بقال سے دو صدی قبل سرزد ہوئی تھی اُس کا بھاؤ کی طرف سے اعادہ کیا گیا۔ یعنی اُس نے پیشوا کے نوجوان بیٹے وسواس راؤ کو دہلی کے تخت پر بھی بٹھانا چاہا۔ ملہار راؤ ہولکر کی جو یادداشتیں جنگ سوم پانی پت کے متعلق موجود ہیں۔ اُن سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وسواس راؤ کو قلعۂ دہلی میں تخت پر بٹھا دیا گیا تھا اور دیوانِ خاص کی چھت کی چاندی اور چتر کے سونے سے کچھ روپے اور اشرفیاں بھی نئے فرمانروا کے سِکّے کی تیار کی گئی تھیں۔ مگر یہ صرف ہولکر کا بیان ہے۔ باقی ماندہ مرہٹہ سرداروں اور راجپوت رئیسوں کی یادداشتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسواس راؤ کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ بھی کیا گیا اور اس کے ابتدائی انتظامات بھی عمل میں آئے مگر آخر میں اِس کا عملدرآمد شاہِ دُرّانی سے تصفیہ ہونے تک ملتوی کر دیا گیا اور عماد الملک نے جس شاہزادہ محی السنت پسر کام بخش کو شہنشاہ بنایا تھا۔ اُس کو تخت سے اُتار کر شہنشاہ عالمگیر ثانی کے ولیعہد شاہزادہ عالی گوہر

ں وراثت تسلیم کیا گیا جو اُس وقت بہار و بنگال پر دوبارہ شہنشاہی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کر رہے
تھے۔ اور اُن کی عدم موجودگی کے باعث اُن کے بڑے بیٹے شاہزادہ جواں بخت عرف جہاں قدر کو جن
کی اولاد اس وقت بنارس میں اور ایک شاخ اُس کی لکھنؤ میں موجود ہے۔ اُن کے باپ کی نیابت
میں تخت پر بٹھایا گیا اور اُن سے وزارتِ عظمیٰ کا باضابطہ فرمان شجاع الدولہ کے حق میں جاری کرایا گیا
ن کے ساتھ مرہٹہ سرداروں کی خفیہ خط وکتابت برابر جاری تھی۔ اور شاہ ابدالی چونکہ اِس نامہ وپیام
سے بے خبر نہ تھا۔ لہٰذا وہ مرہٹوں کی وساطت سے اُن کے وزیر اعظم بننے پر شجاع الدولہ سے
بدگمان ہو سکتا تھا۔

وِسواس راؤ کو اگرچہ تختِ مہاراجگی پر نہیں بٹھایا گیا۔ مگر بھاؤ کی اِس تجویز نے بھی مرہٹوں کے
مقصد کو کافی نقصان پہنچا دیا۔ اور مسلمانوں کو قدرتی طور پر خوف زدہ کرنے کے علاوہ راجپوتانہ کے
راجگان کو بھی مرہٹوں کی طرف سے بدگمان کر دیا۔ کیونکہ یہ راجگان ہندوستان میں ہندو راج ـــ
کے بحال ہونے کی حالت میں تختِ فرماں روائی پر اپنا خاص حق سمجھتے تھے اور سیوا جی بانیٔ حکومت
مرہٹہ کو بھی قدیم خاندانی عزت میں اپنے سے گھٹ کر جانتے تھے۔ پھر پیشوا اُن کی جو ذات کے برہمن
تھے، حکومت اپنے اوپر وہ بھلا کس طرح قبول کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب بھاؤ کی فوج کو دہلی میں بڑے
بڑے رسد کی قلت محسوس ہونے لگی اور دریائے جمنا برسات کی وجہ سے طغیانی پر اور ناقابل عبور
ہونے کے باعث احمد شاہ ابدالی پر حملہ آور ہونے کا موقع نظر نہ آیا۔ اور بھاؤ نے دہلی سے ہٹ کر
شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا تو سورج مل اور دوسرے راجپوت راجگان معہ اپنی افواج کے
بھاؤ کے لشکر سے کھسک گئے۔

شجاع الدولہ کا خط بنام سورج مل اِس موقع پران رؤساء کے جو احساسات تھے اس کا پتہ کسی قدر
اُس خط سے چلتا ہے جو شجاع الدولہ نے سورج مل کو لکھا تھا اور
اس کا پورا مضمون مولانا نجم الغنی صاحب نے اپنی تاریخ اودھ میں بہ ضمن حالاتِ شجاع الدولہ نقل کر دیا
ہے۔ شجاع الدولہ نے سورج مل کو "کنہ صاحب برادر مہربان" کے القاب سے ملقب کیا ہے اور
روابط محبت باہمی کے افزائش پذیر اور مودت طرفین بھی واحد ہونے کا اطمینان ظاہر کر کے
اُس کی طرف سے کوئی نامہ و پیام موصول نہ ہونے کی شکایت کی ہے۔ اس کے بعد شاہ ابدالی
کے آنے اور افغان سرداروں کے اُن سے جا کر ملنے کی اطلاع دی ہے کہ شاہ موصوف کا شقہ
کے بلانے کے لئے بھی صادر ہوا تھا۔ اور جب بھاؤ کی آمد آمد کا شہرہ ہوا تو تمام سرداروں نے ٹکے

ساتھ عہدِ موافقت باندھا اور بھاؤ کے مقابلے کے لئے یک دل ویک جہت ہو گئے۔ کیونکہ بھاؤ کا آنا ہندوستان کے اختلال کا باعث ہے اور اِس فسادِ کشور آشوب کا دفع کرنا تمام رئیسوں کے اتفاق کے بغیر ممکن نہیں اور جو رفاقت سے پہلو تہی کرے گا، وہ ہدفِ تیرِ ملامت ہوگا۔ لہٰذا آپ بھی مصلحتِ کار کو سوچیں اور گو آج آپ بھاؤ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ لیکن وہ نخوت وغرور سے آج کسی کی قدر وقعت نہیں سمجھتا اور کل بگڑ جائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اُس کی رفاقت سے کنارہ کش ہو کر سردارانِ ہندوستان سے موافقت کریں اور شاہ ابدالی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے عرضداشت وشوقِ ارادت بھیج دیں جس کے بعد وہ شقۂ مرحمت اور جاگیر کا نسلاً بعد نسلٍ فرمان اُن کے لئے حاصل کر کے بھجوا دیں گے۔ سورج مل نے خفیہ طور پر شجاع الدولہ کو اُن کے محبت نامہ کا موافقت آمیز جواب دیا۔ مگر مرہٹوں سے بھی جو اس کے علاقے سے اس قدر قریب گویا اُس کے سر پر مسلط تھے۔ علانیہ بگاڑ نہیں کرنا چاہا اور قدرتی طور پر اُس کی ہمدردی بھی شاہ ابدالی کے مقابلے میں مرہٹوں کے ساتھ تھی جو اُس کے ہم وطن وہم مذہب تھے۔ چنانچہ اُس نے بھاؤ سے یہ عذر کیا کہ برسات کے بعد پٹھان شاید فرخ آباد کی طرف سے اُس کے علاقے پر حملہ آور ہوں گے۔ کیونکہ احمد خاں بنگش صرف پانچ چھ ہزار آدمی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اور اپنی سپاہ کے حصۂ اعظم کو بہادر و تجربہ کار سرداروں کے ماتحت فرخ آباد میں چھوڑ گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے جا رہا ہے اور وہاں سے سامانِ رسد مرہٹوں کے لشکر میں بھجواتا رہے گا۔ اور اُن کے مجروحین کو اپنے قلعوں میں رکھ کر اُن کا علاج کرے گا۔ بھاؤ اُس کے اصل منشاء کو پا گیا۔ مگر غرور نے اُس کو سورج مل و دیگر راجپوت سرداروں کے منانے کی اجازت نہیں دی۔ اُسے اپنی بھاری توپوں پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ جن کے ذریعے سے وہ کرناٹک و دکن میں مضبوط مقامات کو مسخر کر چکا تھا۔ کنکیڈ و پارسنیس نے اپنی تاریخ میں جو مرہٹہ ذرائع معلومات سے ترتیب دی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ بھاؤ نے ابراہیم خاں گاردی سے مشورہ کیا۔ تو اُس نے بھاؤ کے خیال کی تائید کی اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس کو سورج مل کے قلعوں میں چھوڑا جائیگا تو وہ اپنی توپوں سے مرہٹہ افواج پر فیر کرے گا۔ مگر اِس الزام کی اِن مورخوں نے کوئی سند نہیں دی ہے۔ نہ ہولکر یا نانا فرنویس یا وٹھل سشیدیو نے اپنی چٹھیوں میں گاردی کے اِس قسم کی کڑی دھمکی دہلی یا پانی پت میں دینے کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ فرضی افسانہ مرہٹوں کی تباہی انگیز شکست کا الزام بھاؤ پر سے ہلکا کرنے کے لئے بعد میں تصنیف کیا گیا ہے۔ اور اِس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

مرہٹوں کا کنجپورہ کو چھین لینا

دریائے جمنا کی طغیانی مرہٹہ اور شاہ ابدالی کے لشکروں کو باہم جنگی کاروائیاں شروع کرنے میں مانع تھی۔ مگر دریا کے کنارے کنارے وہ فوجی نقل و حرکت کے لئے آزاد تھے۔ چنانچہ شاہ ابدالی نے اپنی فوج کے ایک حصے کو انوپ شہر سے دہلی کی طرف حرکت دی اور جب مرہٹوں نے قلعۂ شاہ جہاں آباد میں عمل دخل کیا تو اُس وقت شاہ کی سپاہ قلعے کے سامنے دریا پار شاہدرہ میں موجود تھی اور یعقوب علی خاں قلعۂ دہلی سے نکل کر معہ اپنے رفقاء کے کشتیوں سے دریا کو عبور کر کے اِس ٹکڑے میں شامل ہو گیا تھا۔ بھاؤ شاید برسات کا پورا زمانہ دہلی ہی میں گزار دیتا مگر ایک طرف تو وہاں رسد ملنے میں دقت ہوئی اور دوسری جانب اِس کو یہ اطلاع ملی کہ شاہ ابدالی نے اپنا خزانہ اور غلے کا ذخیرہ معہ ایک دستہ سپاہ کے کنج پورہ میں چھوڑا ہے جو دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر اور اُن کے بھائی صاحبزادہ سلطان احمد خاں ممبر عدالت کونسل آف ایجنسی ریاست گوالیار اِسی مقام کے حکمران خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جنکے والد ماجد نواب غلام احمد خاں صاحب کلامی مرحوم بھی جو اعلیٰ درجے کے انشا پرداز و شاعر تھے، اِسی ریاست میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھے، مرہٹوں اور شاہ ابدالی کی باہمی آویزش کے وقت کنجپورہ کا قلعہ اِس زمانے کے عام طریقِ جنگ کے لحاظ سے خاصا مضبوط تھا اور سردار نجابت خاں وہاں کے جاگیردار تھے جن کی مدد کے لئے شاہ ابدالی نے اپنے سردار عبدالصمد خاں اور قطب خاں کو دس ہزار سوار و پیادہ کی جمعیت کے ساتھ وہاں خزانہ و غلہ کی حفاظت کے لئے چھوڑا تھا۔ یہ عبدالصمد خاں وہی سردار تھا جس کو ہولکر و سیندھیا نے پنجاب پر پیشقدمی کرنے کے وقت سرہند پر گرفتار کیا تھا۔ اور دریائے اٹک پر پہنچنے کے وقت اُس کو چھوڑ دیا تھا یا وہ خود کسی طرح ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر افغانستان چلا گیا تھا اور وہاں سے شاہ ابدالی کے ساتھ پھر ہندوستان آیا تھا۔ بھاؤ نے نارو شنکر پنڈت کو، جو بعد میں لقب راجہ سے ملقب ہوا۔ اور جس کے بھائی بھوانی شنکر کی ایک عظیم الشان حویلی مسجد فتح پوری کے بالمقابل اِس وقت بھی دہلی میں موجود ہے۔ چھ ہزار مرہٹہ سواروں کے ساتھ دہلی میں قلعہ و شہر کی حفاظت پر تعینات کیا اور باقی ماندہ لشکر کو ساتھ لے کر خود آگے بڑھا اور پندرہ (۱۵۰۰۰) ہزار تجربہ کار آدمیوں کو معہ ابراہیم خاں گاردی کے توپ خانے کے ایک حصے کے کنج پورہ کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ صمد خاں اور قطب خاں نے مقابلہ کیا۔ مگر گاردی کی توپوں نے بہت جلد قصبے میں آفت برپا کر دی۔ اور وہ قلعے کے حوالے کرنے پر مجبور ہوئے۔ اِس موقع پر بھاؤ نے پٹھانوں پر سخت مظالم کئے۔ قطب خاں و صمد خاں دونو کو قتل کرا دیا۔ اور شاہ ابدالی کا خزانہ اور غلہ کا ذخیرہ چھین لیا۔ اِس کے علاوہ مرہٹہ سپاہیوں نے قب

بں بعض مساجد وغیرہ کی بھی بے حُرمتی کی۔ جس سے مسلمانوں کے لئے مزید وجہ خوف پیدا ہوئی۔ اور بھاؤ کی
ناعاقبت اندیشی سے لڑائی میں مذہبی رنگ اور بڑھ گیا۔

شاہ ابدالی نے فوج کی موجودات لی

احمد شاہ ابدالی کو جب کنج پورہ پر مرہٹوں کے قابض ہونے اور اپنا
خزانہ اور غلّے کا ذخیرہ چھن جانے کا حال معلوم ہوا۔ اور مذہبی اہانتوں
کی بھی خبر ملی۔ تو اُس کو سخت غصہ آیا۔ اور اس امر پر شاہ نے بہت پیچ و تاب کھایا کہ وہ کنجپورہ سے اِس قدر
قریب تھا اور دریا کی طغیانی کے باعث وہاں کے پٹھانوں کو کوئی مدد نہیں پہنچا سکا۔ شاہ کے لئے اب
زیادہ عرصے تک صبر کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ کنجپورہ کے واقعے کے چند روز بعد ہی اُس نے ایک بلند مقام
پر ٹھہر کر اپنی سپاہ کی موجودات لی۔ پٹھانوں کے رسالے مرتب ہو کر اپنے اپنے سرداروں کے
ماتحت شاہ کے سامنے سے گزرتے تھے۔ اور متصدی ہر رسالے کے آدمیوں کی تعداد لکھتے جاتے تھے۔
فارسی تاریخوں کی روایات کے بموجب کُل چوبیس دستے یا رسالے اِس روز شاہِ ابدالی کے سامنے سے
گزرے۔ ہر ایک رسالے میں کم و بیش سوا ہزار سوار تھے۔ اور شاہ ولی خاں وزیر اعظم۔ خان جہاں خاں
دل پسند خاں۔ احمد خاں بلوچ۔ برخوردار خاں۔ امیر اللہ خاں قزلباش وغیرہ بڑے بڑے سردار ایک
سے لے کر پانچ رسالوں تک کے افسر تھے۔ انہی میں چھ دستے شاہ کے باڈی گارڈ رسالے کے تھے۔
ان میں افغانوں کے علاوہ اُزبک و ترکمان وغیرہ بھی شامل تھے اور ان میں ایک معقول تعداد شاہ کے
غلاموں اور غلام مون کی تھی۔ جن کی وفاداری و جاں نثاری پر شاہ کو بہت بھروسہ تھا اور اپنی لڑائیوں
کے نازک وقت پر وہ اُن سے کام لیتا تھا۔ دو ہزار اونٹ زنبورکوں کے تھے جو پرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقیں
تھیں اور ان میں سے چھوٹی اور موٹی شترنال کہلاتی تھیں۔ ہر دستے پر دو دو آدمی سوار تھے جو زنبورچی کہلاتے تھے۔ یہ زیادہ تر
قندھار اور اس کے نواح کے لوگ تھے۔ اِن کے علاوہ چالیس توپیں بھی شاہ کی فوج میں تھیں۔
شاہ کے ہندوستانی مددگاروں میں نواب شجاع الدولہ کے ساتھ دس ہزار سوار۔ دو ہزار پیادے،
بیس ضرب توپ۔ نواب نجیب الدولہ کے ساتھ چھ ہزار سوار۔ بیس ہزار پیادے بیس ضرب توپ۔ نواب
عنایت اللہ خان۔ حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں کے ساتھ چار پانچ ہزار سوار۔ پندرہ ہزار پیادے
اور ضرب توپ۔ نواب احمد خاں بنگش کے ساتھ دو ہزار سوار۔ تین ہزار پیادے۔ پانچ ضرب توپیں
شجاع الدولہ کی فوج میں گوسائیں۔ ناگے معقول تعداد میں شامل تھے۔ اور روہیلہ سرداروں اور
بنگش کی افواج میں بھی ہندوؤں کا عنصر موجود تھا اور انتظامی عہدے زیادہ تر ہندوؤں ہی
کے ہاتھ میں تھے۔

نا ابدالی نے جمنا کو عبور کیا

فوج کی موجودات لینے کے بعد شاہ ابدالی کو عبور دریا کی فکر ہوئی۔ اور شاہدرے سے جو شہر دہلی کے بالمقابل جمنا کے اِس طرف واقع ہے اور بند سال قبل اِردگرد کے چالیس پینتالیس دیہات سمیت ممالک متحدہ سے شہنشاہی صوبۂ دہلی کیلئے اصل کرلیا گیا ہے۔ تنہا سوار ہوکر وہ چند محافظین کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے پانی کی کیفیت یکھتا ہوا کوسوں تک چلا گیا۔ باغپت کے مقام پر جو دہلی سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ضلع میرٹھ میں ایک نصبہ اور تحصیل کا صدر مقام ہے۔ اور جہاں کے رئیس لفٹننٹ نواب جمشید علی خاں صاحب اِسوقت وبۂ ہذا کی قانونی کونسل کے ممبر ہیں۔ شاہ کو دریا کی حالت کچھ مناسب معلوم ہوئی اور اُس نے دریا کے کنارے اپنا ڈیرہ کھڑا کر کے فوج کے سواروں کو دریا میں پایاب جگہ تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ ئی سواروں کے گھوڑے اِس کوشش میں دو روز تک ڈوبتے رہے۔ مگر تیسرے دن ایک موقع پر دریا میں پانی کچھ کم پایا گیا۔ شاہ نے اسی موقع کو عبور دریا کے لئے منتخب کیا اور اپنی سپاہ کے سامنے یک تقریر کر کے اُن کو غیرت و ہمّت دلائی۔ اُس کے بعد حکم دیا کہ ہر سوار ایک ایک پیدل کو اپنے پیچھے ٹھالے۔ اور شاگرد پیشہ توپ نے کے بیلوں اور گھسیاروں کے ٹٹوؤں کا سہارا لے کر پار جائیں۔ ناہ ابدالی کے حکم نے افغانوں اور پٹھانوں میں ایک جوش پیدا کردیا۔ اور دو روز میں ساری فوج سی طریقے سے جمنا کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ قریباً پانچ سَو آدمی اور کئی سو مواشی اِس کوشش بں تلف ہوئے۔ جن کی لاشیں مختلف گھاٹوں پر نکالی گئیں۔ شاہ ابدالی نے خود نصف سپاہ کے دریا کو عبور کرلینے کے بعد اُس کنارے پر جاکر ڈیرہ کیا۔ اور دوسرے روز بقیہ فوج کو اپنی نگرانی میں دریا عبور کرایا۔

رہٹوں سے افغانوں کی پہلی مڈبھیڑ

بھاؤ کو دریا کی حالت دیکھتے ہوئے ابھی افغان سپاہ کے اِس طرف پہنچنے کی توقع نہیں تھی۔ اور اُس نے کنجپورے سے اپنے کچھ آدمیوں کو بلی سے توپخانہ شہنشاہی کی توپیں لینے بھیجا تھا۔ کیونکہ اب اس کی طرف سے راجہ نارو شنکر دہلی میں مرزا وال بخت ولیعہد کے ماتحت اُمورِ سلطنت کا کارپرداز تھا۔ شہنشاہی توپ خانے کی توپیں قدیم وضع کی بہت ھاری بھاری تھیں۔ اور میدانی لڑائیوں میں مطلق کارآمد نہیں ہوسکتی تھیں۔ البتہ سنگین مورچوں کے مسخر یا معوں کی غنیم کے حملے سے محافظت کرنے میں اُن سے کام لیا جاسکتا تھا۔ اِن بھاری توپوں سے رہٹوں کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ میدانِ پانی پت میں اُن کے گلے کے لئے چکی کا پاٹ بن گئیں یکن شہنشاہی توپوں کے ساتھ رکھنے سے بھاؤ کو اپنی جنگی قوت میں اضافہ کرنا اِس قدر مقصود نہیں تھا۔

جس قدر وہ اِس علاقے کے عوام کے دلوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتا تھا کہ مرہٹے شہنشاہِ دہلی کے عمّال کی حیثیت سے ایک بیرونی غنیم کے حملے کی مدافعت کر رہے ہیں۔ اور مُلک اور شہنشاہ کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اگر مرہٹوں کا خبر رسانی کا انتظام ناقص نہ ہوتا اور دیہات کی آبادی کو وہ اپنی لُوٹ کھسوٹ کی عادت سے اپنا مخالف نہ بنا لیتے۔ تو شاہ ابدالی کی فوج کو ایسی آسانی کے ساتھ دریا کے عبور کرنے کا موقع نہ ملتا اور ابراہیم خاں گاردی اگر دریا کے کنارے مورچے بنا کر اپنی توپوں کا استعمال کرتا۔ تو یقینًا افغانوں کو عبورِ دریا سخت دشوار ہو جاتا۔ مگر بھاؤ کو اُس وقت خبر ملی۔ جب افغانوں کی پوری سپاہ تین دن میں اطمینان کے ساتھ دریا کو عبور کر کے اس طرف آگئی اور سرائے سنبھالکہ کے قریب جو دہلی، انبالہ، کالکا ریلوے لائن پر ایک قصبہ ہے۔ افغانوں کے ہراولی دستوں سے مرہٹوں کے ہراولی دستوں کی مُڈبھیڑ ہوئی۔ یہ جہان خاں وہی سردار تھا جو ہولکر و سیندھیا کی پنجاب میں پیش قدمی کے وقت وہاں کا نائب تھا اور مقام گجرات پر۔ جہاں حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کا مزار شریف واقع ہے۔ جن کے "چوہے" سارے شمالی ہند میں مشہور ہیں۔ مرہٹوں سے ہلکا مقابلہ کر کے اور شکست کھا کر افغانستان بھاگ گیا۔ اِس پہلی مُڈھ بھیڑ میں دونوں طرف کے سواروں کی لڑائی ہوئی۔ دو دو تین تین ہزار آدمی فریقین کے مقتول و مجروح ہوئے۔ مگر لڑائی کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا اور شام ہونے کے بعد مرہٹہ و افغان اپنے اپنے لشکروں کو پلٹ گئے۔ بھاؤ نے اِس لڑائی میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہونے پر سونی پت کی طرف قدم بڑھایا اور شاہ ابدالی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ روزانہ فریقین کے آدمیوں میں ہلکی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہانتک کہ بھاؤ پانی پت کے تاریخی میدان میں پہنچ گیا۔ اور اُس نے قصبے میں اپنا عمل دخل کر کے وہاں ایک دوٹوک لڑائی کی طرح ڈالی۔

مرہٹہ افواج کی موجودات اُوپر شاہ ابدالی کے نشاہدرے پر اپنی فوج کی موجودات لینے کا ذکر کیا گیا۔ کاشی راؤ نواب شجاع الدولہ کے میر منشی نے سوم جنگِ پانی پت کا جو حال اپنے چشم دید واقعات کی بناء پر اپنے درشاہ کی اطلاع کے لئے تحریر کیا ہے۔ اور جو اس معرکے کا ایک مستند بیان سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کاشی راؤ نہ صرف خود نواب شجاع الدولہ کے لشکر ابدالی میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر جنگ کے اختتام اور نوابِ موصوف کے رخصت ہونے تک سارے معرکہ میں موجود رہا۔ بلکہ وہ نواب کے معتمد علیہ کارکن کی حیثیت میں مرہٹوں سے مصالحت کی گفت وشنید اور نامہ و پیام بھی کرتا رہا۔ اِس میں کاشی راؤ نے لکھا ہے کہ بھاؤ کنجپورہ کی تسخیر کے بعد دہلی واپس آیا اور اُس نے اپنی ماتحت سپاہ کی موجودات لی۔ دیگر تاریخوں سے بھاؤ کی اس واپسی دہلی کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر اُس کے اتنی اثنا

ں اپنی سپاہ کی موجودات لینے کا اُن میں بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ موجودات کنجپورہ پر چڑھائی کرنیکے وقت لی گئی
و۔ بہ حال کاشی راؤ نے اِس موجودات میں مرہٹہ سپاہ کی تعداد حسب ذیل ظاہر ہونیکا ذکر کیا ہے۔

ابراہیم خاں گاردی کے ساتھ دو ہزار سوار اور نو ہزار پیادے جو توڑے دار بندوقوں سے مسلح اور مغربی طریقے
ر قواعد داں تھے اور چالیس توپیں (جنکے گولا انداز اکثر مسلمان تھے) خاص پائگاہ کی فوج چھ ہزار سوار۔ ملہار راؤ ہولکر کی فوج
پانچ ہزار سوار۔ جنکوجی سیندھیا کی دس ہزار سوار۔ دتاجی گائیکوار کے ۳ ہزار سوار۔ جسونت راؤ پنوار کے ۲ ہزار سوار۔
شمشیر بہادر و بیلاجی جادون و راجہ وٹھل شیدیو کے ۳-۳ ہزار سوار۔ بلونت راؤ برادر نسبتی و معتمد علیہ بھاؤ کے
ہزار سوار۔ بسواس راؤ خلف پیشوا کی خاص پائگاہ کے ۵ ہزار سوار۔ انتاجی منکیسر کے ۵ ہزار سوار۔

اِن کے علاوہ بعض دیگر سرداروں کے ہزار ہزار اور ۵-۵ سو سواروں کے دستے تھے۔ جن کے نام
کاشی راؤ کو جنگ کا حال بہت عرصے کے بعد لکھنے کے وقت یاد نہیں آئے۔ مذکورہ صدر سرداروں کے دستوں
میں سواروں کے ساتھ کچھ پیادہ سپاہی بھی شامل تھے۔ اور ۲۵-۳۰ ہزار بے قاعدہ سوار پنڈاروں کے تھے
جن کے سرداروں کے نام کاشی راؤ نے چوکوری یا چرکھاری اور رہول سیوار یا ہل سوار لکھے ہیں۔ ان ناموں سے
یہ دونوں سردار بظاہر ہندو معلوم ہوتے ہیں مگر پنڈاروں میں بہت سے مسلمان بھی موجود تھے۔ ۲-۲ ہزار سوار
راٹھور۔ اور کچھواہہ راجگان کے وکلاء کے ساتھ تھے۔ یہ راجگان خود تو سورج مل کی طرح بھاؤ کے لشکر سے
چلے گئے تھے۔ مگر اپنے وکلاء اُنھوں نے مرہٹوں کے کیمپ میں باقی رکھے تھے۔ جو اپنے آقاؤں کو یہاں کے
واقعات سے مطلع کرتے رہتے تھے اور مرہٹوں کے لئے اپنے علاقوں سے رسد بھی منگاتے تھے۔

اِس طرح مرہٹوں کی طرف باقاعدہ سواروں کی جمعیت ۱۰۰ (بقول گرانٹ ڈف ۵۵) ہزار اور پیادوں کی ۲۵ سے
۳۰ ہزار تک تھی اور بھیر و بنگاہ کو ملا کر تاریخ الفنسٹن کے بموجب مرہٹوں کی طرف ۲ لاکھ آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور
دیگر محتاط اشخاص بھی ۲ لاکھ سے کم کا تخمینہ نہیں کرتے تھے۔ افغانوں کی سپاہ میں بقول گرانٹ ڈف مرہٹہ مورخ
۴۱ ہزار آٹھ سو سوار اور ۳۸ ہزار پیادے اور ۷۰ توپیں تھیں۔ افغان سپاہیوں کے ساتھ ایک بڑی تعداد
ایسے نوجوانوں کی بھی تھی۔ جن کی اُنھوں نے یتیم بچوں کی حیثیت سے پرورش کی تھی۔ یہ لڑائی میں حصہ نہیں لیتے
تھے لیکن سامان کے سنبھالنے میں مدد دیتے تھے اور لڑائی ختم ہو جانے پر لوٹ میں حصہ لیتے تھے۔ اِن اعداد کو مدنظر
رکھکر کہا جا سکتا ہے کہ افغانوں کی طرف جنگی سپاہیوں کی قوت مرہٹوں سے کچھ ہی کم تھی۔ لیکن بے قاعدہ سپاہیوں
اور بھیر و بنگاہ سے مرہٹوں کی جمعیت افغانوں سے قریباً دُگنی ہو گئی تھی۔ اُن میں سے اکثر آدمیوں سے
قزاقی لڑائیوں میں مرہٹوں کو قیمتی مدد مل سکتی تھی۔ مگر باقاعدہ میدانی لڑائی میں وہ نہ صرف بیکار بلکہ مرہٹہ لشکر
پر ایک بار تھے اور اِس بار نے آخر میں اس کی کمر توڑ دی۔

(باقی دارد)

انقلاب

(از جناب سید غلام بھیک صاحب نیرنگ)

چل رہی ہے باغِ عالم میں ہوائے انقلاب
آ رہی ہے پتے پتے سے صدائے انقلاب

انقلاب آئینِ ہستی ہے نہیں اس سے مفر
چلتی رہتی ہے ہمیشہ آسیائے انقلاب

زیر و بم سے ہے مرکب زندگی کا زمزمہ
زیست گاتی ہے جسے ہے اک نوائے انقلاب

ذرے ذرے سے ہے آہنگِ تغیر موجزن
سازِ ہستی سے نکلتی ہے صدائے انقلاب

ایک حالت پر نہیں ہے کارگاہِ ہست و بود
یعنی ہر ساعت نرالی ہے ادائے انقلاب

قطرہ گاہے بحر، گاہے ابر، گاہے برف ہے
کس قدر دلکش ہے حسنِ عشوہ ہائے انقلاب

ذرہ گاہے دشت، گاہے کوہ، گاہے قصر ہے
ہے سبق آموزِ ہمت ارتقائے انقلاب

جب تلک ہستی ہے گردش سے بھی چھٹکارا نہیں
انتہائے زندگی ہے انتہائے انقلاب

گردشِ دوراں تنزل کا مرادف کیوں بنے
کیوں ترقی کو نہ سمجھیں مدعائے انقلاب

زندگی کا راز ہے سعیِ مسلسل میں نہاں
اہلِ ہمت کو نہیں ممکن ڈرائے انقلاب

بارہا ہوتے آئے ہیں سبھی زیر و زبر
مجھ کو دھوکے میں نہ ڈالے ابتلائے انقلاب

یاس تو جب ہو اگر ساکن ہو دریائے حیات
مزرعِ امیدِ مرداں ہے فضائے انقلاب

زندگی سیلِ رواں ٹھہری تو پھر کیسا سکوں
قطرہ قطرہ ہے یہاں تو آشنائے انقلاب

دانہ کہتا ہے کہ مرکز سے اگر تم ہٹ گئے
پیس ہی ڈالے گی تم کو آسیائے انقلاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

اقبال میری نظر میں

(از سید لطیف حسین ادیب بریلوی!)

کائنات کی خوبی

"فرض کیجیے کہ ایک دن ہم میں سے ہر ایک کی زندگی کا دار و مدار شطرنج کی بازی جیتنے یا ہارنے پر ہوگا۔ غور کیجیے کہ ایسی صورت میں ہم سب مُہروں کو پہچاننے، چالوں کو چلنے، اور اُصولِ قلعہ بندی کو سمجھنے اور ماتوں پر مات سے بچنے کے تمام ذرائع کو جاننا اپنا فرض اولین سمجھیں گے۔ اُس حکومت اور اُس باپ کو حقارت کی نظر سے دیکھا جائے گا جو اپنے عوام کو یا اپنے بیٹے کو اتنا بھی نہ سکھا سکے گا کہ پیادہ اور وزیر میں کیا فرق ہے۔

لیکن تب بھی یہ صاف اور واضح ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی یا کم و بیش اُن لوگوں کی جو ہم سے وابستہ ہیں زندگی قسمت اور خوشی کا انحصار اِس سے بھی زیادہ مشکل اور اُلجھے ہوئے کھیل کے جاننے پر ہے۔ یہ وہ کھیل ہے جو مختلف ادوار میں کھیلا گیا ہے اور ہم میں سے کوئی دو افراد نے نبرد آزمائی کی ہے۔ بساط دُنیا ہے۔ مُہرے کائنات کے حادثات ہیں اور کھیل کے قواعد وہی ہیں جن کو ہم فطرت کا قانون کہتے ہیں۔ ہمارا مدمقابل ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کھیل راستی ایمانداری اور صبر و باری کا حامل ہے۔ حتی المقدور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا حریف ہماری غلطی یا نظر انداز اور ہماری غفلت کو کبھی معاف نہیں کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص عمدہ کھیلتا رہے تو اُس پر انعام و اکرام کی بارش کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مخالف کو راہِ راست پر لانے کے لیے اپنی طاقت کا مظاہرہ سرور و انبساط کے پیرایہ میں کرتا ہے اور وہ شخص جو خراب کھیلتا رہے اس کو بغیر کسی تردد کے بہت بیرحمی سے شکست فاش دیدی جاتی ہے۔"[1]

اس اقتباس[1] سے کائنات کی وضاحت ایک حد تک ہو جاتی ہے۔ "دُنیا بساط ہے اور مُہرے

---

[1] "آزادی تعلیم" مسٹر ٹامس ہکسلے کے مضمون سے راقم کا ترجمہ۔ کانفرنس گزٹ علی گڑھ ۸ جون ۱۹۴۲ء۔

ائنات کے حادثات ہیں۔ انسان ایک ایسے وجود سے نبرد آزما ہے۔ جو اس سے پوشیدہ ہی۔ لیکن انون عام ہے اور انحراف کی گنجایش نہیں۔ عمدہ کھیلنے پر انعام واکرام کی بارش ہوتی ہے اور غفلت و ساہل پر زدوکوب کیا جاتا ہے۔ بازی بھی لگی ہوئی ہے لیکن جان کی نہیں بلکہ آن کی۔ پوشیدہ ریف صرف ہماری محبت اور عقیدت جیتنا چاہتا ہے۔ کھیل سے اس کا مقصد اپنی برتری منوانا ہے۔ ب انسان چالیں چلتا ہے تو اکثر اُس سے غلطی ہو جاتی ہے۔ حسب الدستور اس کو سزا دیجاتی ہے۔ انسان ماب نہ لاکر چیخ اُٹھتا ہے ؎

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تُو بھی تو دلدار نہیں

اُمّتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

یہ شکایت نہیں، ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمان سے ہے دولتِ دُنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہ روِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے، رُسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
بادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

دردِ لیلےٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی　　نجد کے دشت وجبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حُسن کا جادو بھی وہی　　اُمّتِ احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیٔ غیرِ سبب کیا معنی ؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی ؟

سمت مخالف سے وہ گلے کرتا ہے، رو رو کے فریادیں کرتا ہے، اپنی بے چارگی و بے بسی پر آنسو بہاتا ہے لیکن بے سود! - اس کی حمیت جوش پر آتی ہے - وہ مارسیاہ کی طرح بل کھا کر کہہ دیتا ہے ؎

تیرے شیشے میں مئے باقی نہیں ہے؟　　بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے ؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے ؟

بالآخر وہ خدائی کو دردِ سر سے موسوم کرتا ہے ؎

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ!　　یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

ڈونکے کی عقل والے سمجھے کہ اقبال ملحد ہے۔ کفر بکتا ہے۔ لیکن وہ بے چارے رموز کے ان کوچوں کو کیا جانیں۔ ظاہر دیکھتے ہیں۔ باطن پر اپنی جہالت کا بسیط نقاب ڈال کر کہتے ہیں کہ یہ شرعی اور یہ غیر شرعی ہے۔ استغفر اللہ خدائی اور دردِ سر! معاذ اللہ بندگی سے انحراف! توبہ توبہ یہ انسان گستاخ نہیں کافر ہے۔ اللہ کے کرم کو بخیلی سے تعبیر کرتا ہے۔ افسوس صد افسوس مذہب کے ان ذی عل لوگوں نے ہی قوم کے بیڑہ کو غرق کیا ہے۔ ہمہ اوست کے یہ پجاری بھلا کس طرح قطرہ کو دریا سے جدا دیکھ سکتے ہیں ——— !

جب کھیل جاری ہے۔ فتح وشکست امر مسلم ہے۔ سزا و جزا لازمی ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ وجود نہاں قہار و جبار کے علاوہ رحیم و کریم بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں، اپنی مصیبتوں سے اس کو آشنا نہ کریں اور جب بھی موقع ملے طعن و تشنیع سے کام نہ لیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک معصوم بچہ اپنے باپ کا دامن پکڑ کر ضد کرتا ہے، مچلتا ہے، اور گاہے گاہے نفرے بھی چسپت کرتا ہے۔ لیکن باپ کبھی اس کی طفلانہ باتوں پر ہنستا ہے اور کبھی خاموش رہتا ہے اور اگر مقدور ہوتا ہے تو اس کی ضد بھی پوری کر دیتا ہے۔ ہمارا آسمانی باپ عجب کا باپ ہے۔ اس کے مقدور کا سمندر بیکراں ہے۔ جس میں کرم کے لاکھ بادل اُٹھنے کے بعد بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ضد کریں وہ جھٹلا دے۔ ہم مچلیں وہ دامن چھڑالے اور ہم طعن کریں وہ آگ برسائے۔ ہرگز نہیں

ہرگز نہیں۔ یہ مانگنے والوں کا اندازِ گداگری ہے۔ کوئی کسی ڈھب سے مانگتا ہے اور کوئی کسی اور طریقے سے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ کوئی ضد کرتا ہے، کوئی دامن پکڑ کر مچل جاتا ہے، اور کوئی طعن و تشنیع کرتا ہے۔ اِس اُمید پر کہ شاید پہلے اِس کا دامنِ حاجت بھر دیا جائے۔ دینے والا دیتا ہے اور خوب دیتا ہے۔ دینے سے کبھی نہیں گھبراتا وہ تو صرف اپنے انسان کی محبت جیتنا چاہتا ہے۔

ہند کے یہ کج بحث خدا کی مخلوق میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو شاہین کے بڑے خاندان میں ایک مگس کی کی حیثیت ہو سکتی ہے۔ اِن کے چہروں پر نقاب پڑی ہوئی ہے۔ ان کی نگاہ محدود ہے۔ وہ نانِ شبینہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے پیدا کرنے والے کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کے آئینہ میں زنگار لگی ہوئی ہے جس میں اپنے خالق کی صورت تو کجا اپنی صورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ملّتِ اسلامیہ پر افلاس کے بادل مُسلّط ہیں۔ پانچ وقت نمازوں میں سر جھکانے والے انسان دو گھونٹ پانی کو ترس رہے ہیں۔ خون میں حرارت نہیں اور اگر ہے بھی تو اُبھرنے کے لئے راستے مسدود ہیں۔ وہ انسان جس نے دُنیا سے اَللّٰہُ وَاحِدٌ منوا لیا، جس نے دیگر اقوام کو درسِ تہذیب اور درسِ کلچر دیا، جس نے اپنی سجدوں سے کعبہ کو عزت بخشی۔ جس نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا ـــــ محض وعدۂ حور اور الطافِ آخرت پر ـــــ ! کیا اُس خالق کا خلیفہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُولَدْ ۙ کا بندہ اور کائنات کی بساط پر لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ سے کھیلنے والا انسان۔ اِس قابل بھی نہیں کہ دبی زبان سے اپنا شکوہ اُس تک پہنچا دے۔ کیا بندہ اپنے آقا سے ہم کلام نہیں ہو سکتا؟ نہیں! تو زبان کیوں دی؟ ـــــ جب ہم اس کی تسبیح پڑھتے ہیں، اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں اور اُس کی رضا پہ مرنا فرضِ عین سمجھتے ہیں تو ہم کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اپنی آہ کو نارسا نہ سمجھیں۔ بلکہ ہر ممکن کوشش سے اُس کے گوش گزار کریں۔ بس یہی زندگی ہے۔ دُنیا ہمارے لئے ہے۔ ہم دُنیا کے لئے نہیں ہیں۔ ع

عنقا را بلند است آشیانہ!

کافر وہ ہے جو حق سے منکر ہو اور وجودِ نہاں پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ لیکن اقبال اُس پوشیدہ ہستی کا قائل ہے۔ وہ نہ صرف اس سے کائنات کی بساط پر کھیل میں مصروف ہے بلکہ اُس کے کرم کا متمنی ہے ـــ

منکرِ حق نزد ملا کافر است

منکرِ خود نزد من کافر تر است

خود یزداں کو اِس چھیڑ چھاڑ میں مزہ آتا ہے۔ دستِ دراز کی بیباکی میں اس کو طلب کی سچی خواہش نظر آتی ہے۔ پستی کے مکینوں اور غافل آدابِ سکانِ زمیں میں 'غم انگیز افسانہ' کی آواز آتی ہے۔

۰ برہمی میں شوخی پاتا ہے ـــ

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے   تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے
عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے   ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو!
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا   مئے فریاد سے معمور ہے پیمانہ ترا
ہے ہم آغوشِ فلک نعرۂ مستانہ ترا   کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!   راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں!
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں!   جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں!
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں!
ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں!

جس طرح احمدِ مختار ہے نبیوں میں امام   اُس کی اُمت بھی ہے دُنیا میں امامِ اقوام
کیا تمہارا بھی نبیؐ ہے وہی آقائے انام   تم مسلماں ہو تمہارا بھی وہی ہے اسلام
اُس کی اُمت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مئے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ خم تم میں نہیں

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے   نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے   میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور   شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور   مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں!
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں!

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یزداں کا یہ جواب انسان کی ٹوٹی ہوئی بے باک اُمیدوں کا سہارا بن جاتا ہے۔ کائنات کی بساط پر مات کھایا ہوا انسان اپنا سُراغ پا جاتا ہے ۵

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات!

وجودِ نہاں کو جنبش ہوتی ہے۔ بیدار کائنات میں انسان کی پشیمان رُوح بیدار نظر آتی ہے۔ فاتح پوشیدہ ہستی اپنے کرم کے خُم لنڈھاتی ہے تاکہ سائل لب تشنہ نہ واپس ہو۔ شوخ و گستاخ انسان میں محبتِ ابدی کی رُوح رقص کرتی پھرتی ہے۔ کائنات کی خودی کی بیداری یعنی بساط پر انسان کا مات کھانا اس کی تنظیمِ خودی کا سبب بن جاتا ہے۔ خدا اور بندہ کا رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔ قطرہ دریا سے دُور رہ کر بھی دریا کی کشش محبت کا مرکز بن سکتا ہے۔ بہرنوع قطرہ کی خودی بھی مسلّم ہے۔ بعدہٗ دریا میں محبت اور کرم کا سیلاب آتا ہے۔ وہ قطرہ کو اپنے ساتھ بہالیجاتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا اور بندہ میں ایک اہم رشتہ ہے۔ کائنات کی تشکیل خودی میں دونوں کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ وہ خود بساط پر خدا کے سامنے ایک بڑا مُہرہ ہے جس کو سامنے اِس لئے بٹھایا گیا ہے کہ وہ اپنی کمتری کو مانے اور وجودِ نہاں کی کبریائی کا قائل ہو۔ پس یہی خدائی محبت ہے جس کیلئے دستِ سوال دراز کیا گیا تھا۔ آیئے میں اس رشتہ کی اور وضاحت کردوں۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ سورۂ دخان۔ آیت ۳۸ تا ۳۹۔ پارہ۔ ۲۵۔

ایک جگہ اور قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ سورۂ بقر۔ پارہ دوم۔ رکوع ۲۰۔

پہلی آیت کالفظی ترجمہ یہ ہے: "اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعلِ عبث کرنے والے ہوں (بلکہ) ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے لیکن اکثر لوگ کم سمجھتے ہیں۔"

قرآن پاک کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف طور پر واضح ہے کہ زمین اور آسمانوں کی آفرینش میں کسی خاص حکمت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ وہ حکمت خاص اہم ہے تاکہ لوگ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں اور بہک کر فعل عبث کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔ یعنی یہ کہ کائنات کی خودی اور کائنات کی بیداری کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے من کا حکیم اور عارف بنے۔ ماحصل کلام کائنات خدا اور بندہ کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ جس طرح دو کھلاڑیوں کے درمیان بساط ایک واسطہ اور ذریعہ ہوتی ہے۔ جب اس واسطہ کی راہیں طے ہو جاتی ہیں تو انسان خودی کا عارف بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ بات اور بھی نمایاں ہو گئی کہ دونوں کی فعل جداگانہ اور مسلم ہیں۔ دونوں کو اختیار ہے کہ جس مہرہ کو چاہیں چلیں لیکن فتح و شکست دونوں کا مقصد کھیل ہے۔ آیندہ حیات کا مقصد اپنے اپنے فعل پر منحصر ہے۔ عمدہ کھیلنے پر انعام واکرام اور برا کھیلنے پر سزا و دشنام کا پانا لازمی امر ہے۔ لیکن پھر بھی خدا سے توقع یہی کی جاتی ہے کہ وہ طاقت والا ہونے کی حیثیت سے یقینی جیتے گا۔ چنانچہ ایسی صورت میں بندۂ ناچیز اس کے کرم کا ہی خواستگار رہتا ہے:-

وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝ سورۂ بقر پارہ ۱

"اور واسطے ہمارے ہیں عمل ہمارے اور واسطے تمہارے ہیں عمل تمہارے اور ہم واسطے اسکے اخلاص کرنیوالے ہیں"

دوسری آیت کالفظی ترجمہ یہ ہوا: "پیدائش آسمانوں کی اور زمین کی اور آنے جانے رات کی اور دن کی اور کشتیوں کی کہ جو چلتی ہیں بیچ دریا کے ساتھ اُس چیز کے کہ نفع دیتی ہے لوگوں کو اور جو کچھ کہ اتارا اللہ نے آسمان سے پانی سے پس جلایا ساتھ کے زمین کو پیچھے موت اس کی کے اور بکھیرے بیچ اس کے ہر جانور سے اور پھیرنے کے اور بادلوں کے جو حکم کے باندھے ہیں درمیان آسمان کے اور کہ البتہ نشانیاں ہیں واسطے اُس قوم کے کہ عقلمند ہیں۔"

اس طرح جگہ جگہ قرآن حکیم کائنات میں اپنی نشانیوں اور حکمتوں کی یاد دلاتا ہے تاکہ لوگ اُن کو دیکھیں اور عقل پکڑیں۔ اسی کے برخلاف اُن لوگوں کے متعلق جو آنکھیں رکھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے اور کان رکھتے ہوئے سُن نہیں سکتے۔ صاف ارشاد ہے:-

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ

"مہر کی اللہ نے اُوپر دلوں اُن کے اور اُوپر کانوں اُن کے اور اُوپر آنکھوں اُن کی کے پردہ ہے اور واسطے اُن کے ہے عذاب بڑا۔" سورۂ بقر۔ پارہ ۱۔ رکوع ۱۔

یا ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

"صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝"

"وہ گونگے ہیں، بہرے ہیں، اندھے ہیں، اُس کی طرف رجوع نہیں ہو سکتے"

اس سے مراد وہ طبقہ ہے جو خدا کی مخلوق ہونے کے باوجود اس کی نشانیوں سے منحرف ہیں اور اُسکی حکمتوں سے بے بہرہ - مردِ مومن اور خودی کے عارف کی یہ شان نہیں ہے۔

اب ذرا تصویر کے دوسرے رُخ کو دیکھئے - صوفیائے کرام کے یہاں کائنات ایک مسلّم شے ہے۔ لیکن خود کو وہ وجود سے جُدا تصور نہیں کرتے بلکہ وحدت کے قائل ہیں اور جیسا کہ اُوپر ثابت کیا گیا ہے یہ اقبالؒ کے فلسفہ کے بالکل برعکس ہے - جب عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ہند پر تسلط ہوا تو ان دونوں کے مذہبی خیالات کا ہی ایک دوسرے پر تصرف ہُوا - اس سے ایران میں تصوف نے فروغ پایا - لیکن فطرتاً تصوف آریہ نسل کے عجمی مسلمانوں کی طبائع سے زیادہ رابطہ تھا - عربی الخیال مسلمانوں نے عموماً اپنی قدیم اسلامی روایات کو قائم رکھا - شاعری ایک حد تک مذہب کی تابع ہے - ایک جانب صوفی شعراء خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ، خورند سبُوکش کی تفسیر بیان کرنے لگے - دُوسری طرف اسلامی شعراء ان الفاظ کا ورد کرتے رہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

اُردو شاعری میں بھی جو فارسی کا تتبع ہے دوئی کی کیفیت موجود ہے - ایک فریق فارسی 'ہمہ اوست' اور ایک عربی 'از ہمہ اوست' کا قائل ہے - اس کے برخلاف ہندو شاعری کی بنیاد ابتدا ہی سے وحدت الوجود پر مبنی ہے - فیضی کا سرِ دیوان شعر ہے ؎

یا ازلی الظهور یا ابدی الخفا
نورك فوق النظر عنك فوق الثنا

خواجہ میر درد اپنا کلام یوں شروع کرتے ہیں ؎

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا | حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے | کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

اقبال اس مسندِ عزت کا قائل ہے جس پہ وہ جلوہ نما ہے لیکن اس میں وصفوں کی رقم کا مقدور بدرجۂ اتم موجود ہے - جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں وہاں اس کا گزر ہے حتیٰ کہ وہ لوح و قلم کا بھی دعویدار ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اس کے قلم میں تعقل کی تاب گزر ہے۔ وہ اپنی منزل خرد کے مصاف میں نہیں ڈھونڈتا ہے بلکہ جنون کے پُرخار جادہ میں تعقل تو اس کی ابتدائی کاوش ہے لیکن جنون انتہائے راہ! سے

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں!
مرے اللہ مجھے صاحبِ جنوں کر!

وہ اپنی بلند مسندِ عزت کا نہ صرف قائل ہے بلکہ بہت بڑا دعویدار۔ وہ خود کو ثریا کے کاشانہ سے پرے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شاہیں ہے جس کا بسیرا آسمان کی چوٹیوں پر ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے "ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو" "قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو" "مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو" حاصل کلام وہ سے

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

وہ بہت بیباک ہے اتنا کہ اللہ سے بھی برہم ہے۔ اس میں دُوئی کی کیفیت اس قدر موجود ہے سے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

فارس کی شاعری میں بھی دُوئی کی کیفیت موجود ہے اگر ایک طرف وہ در و دیوار میں معشوق کی لذت محسوس کرتے ہیں سے

گر از خانہ برون بود کہ شب در کویش
ہیچ دو تم ز نگاہ در و دیوار نہ بود!

یا واقعاتِ عالم پر جب وہ عبرت کی نظر ڈالتا ہے تو ایک ایک ذرہ ناصح بن کر اس کو اخلاق اور عظمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عالم میں وہ گورِ غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ ہڈیاں علانیہ اس سے خطاب کرتی ہیں سے

کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر
کہ چشم و بناگوش و رُوئے است سر

یا جب بہار آتی ہے تو ہر منظر میں تا آنی کو معشوق کی بو آتی ہے سے

یکے بر لالہ پا کو بد کہ بُوئے رنگ می دارد
یکے از گُل بوجہ آید کہ وہ وہ بوئے یار آید

یا جب پھول پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے۔ ع

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

تو دوسری طرف قطرہ کو آنا کی اچھوتے انداز میں تعلیم دی ہے ؎

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم
چو خود را بہ چشم حقارت بدید
صدف در کنارش بہ جاں پرورید

ایک انگریز شاعر ہارٹلے کولرج[1] بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اس کی نظم باعنوان ہے "مجھے مت سوچنے دو"[2] وہ لکھتا ہے:۔

"مجھے مت سوچنے دو کہ میں بیکار پیدا کیا گیا ہوں
یا میری ہستی ایک اتفاقیہ امر ہے
تقدیر اپنے ممتاز ارادوں میں
نہیں چاہتی ہے کہ رکاوٹیں قبول کرے
طوفانی بارش میں ہر ایک ناچیز قطرہ
اپنا ذاتی مقصد رکھتا ہے۔ اور باقاعدہ بھیجا جاتا ہے
اپنی ہی پتی اور ڈنٹھل پر۔ نہیں ضائع کیا جاتا ہے
بحر بیکراں کے ہزاروں گڑھے دار رخساروں پر۔
ایک کیڑے کے پر کا سایہ بھی
جس کے دوران قیام میں گل بنفشہ نے پرواہ نہ کی
لیکن اس کے زوال کی بوجھل کشتی کو محسوس کیا
ثابت ہوا کہ سورج اس کے سایہ کے قریب پہنچ
تب کیا ابدی چشمہ کا ایک قطرہ
اور ابدی روشنی کا سایہ بیکار خلق کیا جا سکتا ہے "

1- Hartley Coleridge. 2- Let me not deem.

ٹیگور بھی اپنی آنا کے قائل ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ان کی نظر اقبال کے مقابلہ میں سطحی اور نافی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ وہ نقوش فطرت کی گرفت بڑی تندہی سے کرتے ہیں لیکن جنون کی منزل میں وہ طائر بے بال و پر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ جادۂ خودی میں وہ اقبالؔ کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ ان کا خودی سے متعلق خیال ہے۔ "دنیا ایک صنم کدہ ہے، میرا صورت گر خود میرا عاشق ہے، اس کا ذی حیات مس میرے تمام عضاء پر محیط ہے۔"

یا کہتے ہیں "عالم ایک محفل سماع ہے، فرش زمین سے عرش بریں تک عالم امکان ترانۂ معرفت سے لبریز ہے . . . . اور وہ نے میں خود ہی ہوں؟

یا لکھتے ہیں "عالم ایک باغ ہے جس میں میری ہستی ایک آرزومند پھول سے مشابہ ہے۔"

"سادھنا" میں لکھتے ہیں "ما سوا کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے انسان قوانین فطرت کا مطیع ہے لیکن بالذات 'انا' قطعاً آزاد ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں "زندگی کی خوشی کام میں ہے، کام میں ایک عجیب لذت ہے، یہ لذت تکمیل حیات میں ممد و معاون ہے۔ کوئی ذی حیات اس قدر محنت اور مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان۔ اور یہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے"

اقبالؒ کی نظم "گلِ رنگیں" سے بھی کائنات کی خودی پر سیر حاصل روشنی پڑتی ہے:-

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں ‏ ‏ اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہوں شریکِ شورشِ محفل نہیں ‏ ‏ یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں ‏ ‏ یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں ‏ ‏ کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے ‏ ‏ راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے ‏ ‏ میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو　　　یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو　　　رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراک انساں کو خرام آموز ہے

اقبال کی اِس معرکۃ الآرا نظم میں انسان اور پھول کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ کائنات کے دونوں باشندہ ہیں لیکن انسان اپنی خودی کی برتری کی وجہ سے اس سے بہت دُور کا علاقہ رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کو گلِ رنگیں پر افضلیت کا شرف و درجہ دونوں حاصل ہیں۔ کیونکہ گلِ رنگیں "خراشِ عقدۂ مشکل" سے شناسا نہیں ہے اسلئے اس کی ہستی سوز و ساز سے یکسر مبرا ہے۔ انسان کے پہلو میں ایک تڑپتا ہوا دل ہے لیکن گلِ رنگیں کا سینہ خالی ہے۔ اس کے پاس احساسات کے تنوع کا وجود نہیں ہے۔ دُنیائے محفل سکون و ثبات کا مقام نہیں۔ یہاں انسان کو اپنی تکمیلِ انسانیت کے لئے بھیجا ہے تاکہ حیاتِ بعد الموت ابدی سکون و انبساط سے ہم آغوش ہو سکے۔ جو شخص اس سوز و ساز کے میکدہ میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خم خالی کر سکے گا اور شرابِ حق سے اپنی رُوح میں یک گونہ تندی و طوفانیت پیدا کر سکے گا۔ وہی مرنے کے بعد کے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عشق کے امتحانات اِس دنیا تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ یہ سلسلہ آخرت میں بھی جاری رہے گا۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں　　　ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اُس عشق کے امتحان کے لئے جو شخص اپنی تعمیر جتنی کرے گا اُتنا ہی اس کا بوجھ ہلکا ہوگا اور ابدی خوشی جلد مل جائے گی۔ لیکن جو تساہل اور لاپرواہی کے شکار یہاں رہیں گے وہ وہاں پر خسارہ میں رہیں گے اور پھر ان کی تنظیم خودی بہر نوع کی ہی جائیگی۔ چنانچہ اس تنظیم کے مقام کو دوزخ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی کمی کو پورا کیا جائے گا اور وہ تکمیل جو اس نے دُنیا میں نہیں کی تھی وہاں پر کی جائے گی۔ بعد از تکمیل اس کو آرام و چین اور ابدی سکون ملے گا جس کو جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ عشق کی دوڑ میں اُن لوگوں سے پیچھے رہ جائے گا جو لوگ اس دنیا میں مطمح بلند تھے اور اپنی نگاہ سے نظامِ کائنات میں انتشار کے موجب ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ معبودِ حقیقی کا جزو لاینفک عرصہ مدید کے بعد ہو سکیں گے اور عشق کے امتحان کی صعوبتیں قدرے زیادہ اٹھانا پڑیں گی اسی لئے "شورشِ عمل" میں شریک ہونا ازبس ضروری ہے۔ بزمِ ہستی میں فراغت حاصل کرنے کے لئے شورش اور تپش کی ضرورت ہے۔ لیکن گلِ رنگیں اس شورش سے بالکل تہی دست ہے۔ اس کا وجود انسان کے وجودِ سوز و ساز کے مقابلہ میں بے گداز ہے یعنی اس کی پائیداری اور ابدیت مسلم نہیں۔

گیہوں کھیت میں پیدا ہوا۔ خلق کا سبب خدا کا کرم بنا۔ دانہ بنا اُگا بڑھا۔ کھلیان میں آیا۔ کھلیان سے گھروں میں اور گھروں سے چکی کے پاٹوں میں۔ یہ سب اس کے عشق کی منازل تھیں۔ بصورت آٹا آگ پر گیا۔ یہ اس کا کمالِ عشق اور سخت ترین امتحان تھا۔ پھر روٹی بنا اور روٹی کے بعد نوالا۔ بالآخر دانتوں میں چبایا گیا۔ یہ اس کا آخری امتحان تھا۔ اس کے بعد پیٹ میں گیا اور خون و پوست بن گیا۔ یعنی اس کا مشن پورا ہو گیا۔

بالکل اسی طرح سے کائنات کے کھیت میں انسان عشق کی منازل میں ہے۔ یہ اس کا ذاتی عمل ہے جتنا جلدی چاہے معبودِ حقیقی کا جزو لاینفک بن سکتا ہے۔

گلِ رنگیں کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ انسان نے کہا کہ تو حسین ہے دلفریب ہے خوشنما ہے۔ وہ حسین و خوبصورت بن گیا۔ حقیقتاً انسان کی نگاہ گل کی ترقی حسن کا سبب بنی۔ پس پھول کا وجود انسان تک محدود ہے۔ اپنی دو روزہ زندگی میں اس کا کام یہ ہے کہ جلد از جلد صبا رفتاری سے اپنی بو انسان تک پہنچا دے۔

انسان کو بھی اپنی بو اپنے خالق و معبود تک پہنچانا ہے۔ کس طرح پہنچانا ہے یہی اقبال کی تعلیم ہے ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

دوسرے بند میں اپنے کو بلبل کہا ہے جو گل کو دیکھ کر جیتا ہے لیکن کبھی ہاتھ سے چھوتا نہیں ہے۔ اس کی بے بسی و بے چارگی اس کے کامیاب عشق کا مظاہرہ ہوتی ہے۔ برخلاف ایک حکیم کے جو تجزیہ و تجربہ سے پھول کی پتی پتی جدا کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی فنا کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان کائنات میں اپنے سے پست مخلوق کے لئے گلچیں یا حکیم کی حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ ایک بلبل کی جو ہر وقت اس کی ثناء و حمد میں مصروف رہتا ہے۔

تیسرے بند میں قریب قریب مفہوم پہلے بند کا ہے۔ گل کی پتیاں یعنی زبانیں بہت سی ہیں لیکن قوتِ گویائی سے محروم۔ سراپا گوش ہیں کہ سنا کریں یا سراپا منتظر کہ انتظار کیا کریں۔ جب تک باتیں نہ تھیں اور دل کی کلی نہیں کھلی تھی تو سینہ میں کوئی راز مضمر تھا لیکن اس کا وا ہونا اس کے پیغام کا سبب بنا۔

گل کی کلی چٹک کے پیغام دے کسی کا

راز فاش ہو گیا اور زندگی اطمینان میں بدل گئی لیکن چمن ہنوز دور رہا۔ شاید اس وجہ سے کہ "زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو" نہ تھا!

آخری بند پوری نظم کی جان ہے۔ پریشانی اور جستجو ہی مقصدِ حیات ہے۔ جتنی پریشانی اور جگر سوزی میں اضافہ ہوگا اتنی ہی جلد منزلِ مقصود مل سکے گی۔ حکیم اور حکمت نجات کا سبب نہیں ہیں خرد کی راہیں تنگ ہیں۔ پریشانی اور تلاشِ مسلسل جنون کا حاصل ہے۔ اور جنون جلد منزل پا کر مراد تک

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   میرے اللہ مجھے صاحبِ جنوں کر

الغرض انسان سراپا سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو کا مرکز ہے۔ اس کے پہلو میں ایک دل ہے اور دل بھی کیسا؎

آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں   پہلوئے انسان میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

گل رنگیں دل سے محروم ہے اسی لئے 'سوز و ساز' سے وہ بہرہ ور نہیں ہے۔ انسان کی تیز گامی اور اس 'ذوقِ جستجو' اس کی کامیابی کا سبب ہے —— تب کیوں نہ ہو! ؎

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا

مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

غالباً انسان، خدا اور کائنات کے باہمی تعلق کی گتھی سلجھ گئی ہوگی اب یہ آپ کا فعل ہے کہ بساط پر اچھا کھیلیں یا برا۔ تعلیم کامل ہے عمل آپ جانیں!

خودی کے دشمن

خودی کے دشمن چار ہیں۔ (۱) فرنگی سیاست۔ (۲) چکبست۔ (۳) خوفِ مرگ (۴) ثباتِ زندگی۔

(۱) فرنگی سیاست:- اس ذیل میں کافی بحث میں قبل ہی کر چکا ہوں اس لئے اب کچھ اور کہنا بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

(۲) چکبست:- میری مراد پنڈت برج نرائن چکبست سے ہے۔ ان کو میں نے چوتھائی شا تسلیم کیا ہے۔ آپ اقبال کے شروع شروع میں بہت بڑے حامی تھے لیکن بعدہٗ اختلاف کی ایک بڑا خلیج درمیان میں آگئی۔ قوم دونوں کا نصب العین ہے اور دونوں ہند کی آزادی کے دل سے متمنی ہیں۔ یہ رنگ اقبال کے انگلینڈ جانے سے قبل تک قائم رہا۔ کیونکہ دونوں نظریۂ وطنیت کے قائل تھے۔ لیکن جب اقبال یورپ سے تکمیلِ تعلیم کے بعد واپس آئے تو اُن کے خیالات بالکل بدل چکے

بجائے قومیت کے مسئلۂ ملت ان کا نقطۂ نظر تھا۔ یہیں سے اختلاف کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ یہ اختلاف یہاں تک فطری تھا۔ قطع نظر قومیت کے مسئلہ کے چکبست فلسفۂ خودی سے نبرد آزما نظر آتے ہیں لیکن اُن کی مثال کالج کے اس لڑکے کی سی ہے جو منطق کی دو چار بحثیں سُن نے کے بعد ارسطو اور امام غزالیؒ پر آوازہ کسنے لگتا ہے۔ اس کے خیالات سرتاپا شاعرانہ اور دلائل و براہین کی سنگلاخ راہوں سے دُور ہیں۔ طرفہ یہ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں دبی زبان سے کہتے ہیں۔ یہ بانگِ دُہل کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اپنی ایک مقبول غزل میں بڑے لطیف کنایات سے کام لیا ہے ؎

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے — کچھ ابتدا ہی سے ہم انتہا کو بھول گئے
نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر — یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے
ہوا مزاج کا عالم یہ سیر یورپ سے — کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے
زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا — خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

پہلے شعر کو نظر انداز کر دیجئے۔ دوسرے پر ناقدانہ نظر ڈالئے۔ گبر اور مسلمان کے نفاق کے مٹنے کی وجہ یہ ہوئی کہ دونوں نے اپنے اپنے معبودوں سے فراموشی اختیار کر لی۔ مذہب سے یہ بیگانگی دونوں کی یگانگت کا سبب بن گیا۔ یہ خیال غلط ہے۔ ملٹن[1] کے اس مقولہ کی روشنی میں اس شعر پر نظر ڈالئے "تم کسی حریص سے اس کی تمام دولت چھین لو، لیکن پھر بھی اس کے پاس ایک موتی رہ جائیگا ——— اور وہ حرص ہے جو اس سے جُدا نہیں کی جا سکتی"۔ گبر کے پاس ایک موتی ہے یعنی بت کی پوجا کی عادت۔ اسی طرح مسلمان کے پاس ایک موتی ہے یعنی خدا کی عبادت یا اس کو واحد جاننے کا ذوقِ سلیم۔ دونوں بالکل متضاد زاویوں پر ہیں۔ دونوں کے مرکز جدا ہیں اور ان تک پہنچنے کے ذرائع مختلف ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے میں پیوست ہونے کے لئے یا کوئی لگاوٹ اور اتحاد حاصل کرنے کے لئے یہ نہایت ضرورت ہے کہ مرکز ایک ہی ہو کیونکہ ہر چیز اپنے مرکز ہی کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ باز باز کے ہی ساتھ اُڑ سکتے ہیں لیکن بس غیر کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن گبر اور مسلمان کے اتحاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک کسی ایک مرکز کی طرف رجوع ہو۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ گبر خدا کو مانے یا مسلمان نعوذ باللہ بُت کو معبود تسلیم کرے۔ لیکن شعر میں نفاق کے مٹنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ دونوں اپنے اپنے مرکز سے ہٹ گئے ہیں بلکہ کوئی ایسا خاص مقام ہے جہاں دونوں کی نگاہیں قائم ہیں حالانکہ یہ

۱- John Milton

دلیل سراپا مہمل ہے۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے وہ خدا سے بے نیاز ہونے کے بعد بھی اُس سے نیاز حاصل کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ پانچ وقت نمازوں کے ذریعہ سے بلکہ فطرت کی سخت تعلیم، اور تادیب اِس سے حقیقت منوا ہی لیتی ہے۔ انتہائی بے چینی اور تکلیف کے وقت جس طرح رُوٹھے ہوئے معصوم بچے کو "اماں" کہتے ہوئے بن پڑتی ہے۔ اسی طرح سے اُس مسلمان کو "یا خدا" کہتے بن پڑتی ہے۔ خدا کو دیدہ و دانستہ بھلا دینے والے مسلمان جتنی عاجزی سے توبہ کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی نیک معاش نہیں کرتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ الغرض کانٹا دل میں چبھتا ہی رہتا ہے۔ بس یہی چبھن وہ موتی ہے جو مسلمان سے لاکھ کوشش کے بعد بھی نہیں چھینی جا سکتی۔ اور جب چبھن برقرار ہے تو مرکز برقرار ہے اور جب مرکز برقرار ہے تو اس سے علیحدگی ناممکن ـــــــــــ اسلئے شعر کا مفہوم غلط۔ گو ظاہری در و بست سطحی نظروں کے لئے کافی کیف و انبساط کا حامل ہے۔ چکبست سے یہ غلطی اس وجہ سے سرزد ہوئی کہ ان کا مطالعہ مسلمان کی فطرت سے متعلق عمیق نہیں ورنہ ممکن ہی ہے وہ اس طرح اظہارِ خیال نہ کرتے۔ خودی کے عارف خدا کو بھولا نہیں کرتے ہیں بلکہ اُس سے قریب تر ہو جاتے ہیں!

تیسرا شعر کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ یہاں مراد اقبال ہی سے ہے۔ ملک کی آب و ہوا سے مطلب ملک کی قومی سیاست ہی ہے۔

چوتھا شعر چکبست کے دل کا راز ہے۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا۔ زبان رُکی لیکن رُک نہ سکی اور کہہ ہی گئے۔ 'خودی' سے کھُلی مخالفت ہے۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی اور دُور رسی کی کمی کا سبب ہے۔ وہ دراصل خودی کے مفہوم سے ہی نا آشنا رہے ہیں۔ قومیت کی عام عینک لگا کر وہ سرسری نظر سے اتنے بڑے فلسفہ کو دیکھتے ہیں جس میں بحث و تمحیص سے زیادہ فہم رسا اور ذوقِ سلیم کو دخل ہے۔ اقبال کا فلسفہ مذہب سے بغاوت نہیں ہے۔ وہ خدا کا قائل ہے ؎

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اس کے رسولِ برحق کو بھی پہچانتا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اُس کے تمام بندوں سے یوں خطاب کرتا ہے ؎

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اقبال کی تعلیم میں الحاد سے کوئی تعاون نہیں ہے۔ وہ دُنیا میں مسلماں کو بامِ عروج پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی اس منزل پر پہنچنے کے لئے اس نے ہم کو درس دیا ہے لیکن افسوس "وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْن"!

آخری شعر کا مطلب بھی مخصوص قومی رنگ میں ہے۔ اپنے سے اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے۔

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ چکبست، اقبال کے فلسفہ کے .... مخالف تھے۔ لیکن ؏

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے (میر)

کے مصداق مخالفت کی بھی ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چکبست کا اپنا ذاتی کوئی نصب العین نہ تھا۔ زمانہ کی روش کے مطابق وہ ہر وقت فلسفہ و نظریاتِ اقبال کو سمجھنے سے قاصر تھے اسکے واسطے بہت روشن ضمیری اور نگاہِ دوربین کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالباً فلسفہ کے کوچوں سے اُن کو کبھی گزرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ ان کے یہاں محض شاعرانہ باتیں ہیں۔ باقاعدہ منطقی استدلال و استنباط کا فقدان ہے۔ وہ آنکھ بند کرکے جذباتِ حب الوطنی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک قومی شاعر ہوئے ....

...... ہر مومن کا مفاد دلِ آتش ناک ہی کر سکتا ہے جو اس کے کلچر اور مذہب سے بخوبی واقف ہو کسی غیر کے ہاتھوں اس کی اصلاح ایسی ہی ہے جیسے کسی مصور کو ایک ایسا تخیل کھینچنے پر مجبور کیا جائے جس سے اس کی چشمِ باطن نا آشنا ہو۔

چکبست جب انیس کے تتبع میں مسدس کہتے ہیں تو وہ ایک مصور معلوم ہوتے ہیں جس کا ہاتھ مرضِ رعشہ کا شکار ہو، اور جب وہ اقبال کے رنگ میں قومی گیت گاتے ہیں تو ان کی حیثیت ایک ایسے راہ روکی ہوتی ہے ..... جو اپنی ابتدائی منازل پر ہو۔ پروفیسر حکیم الدین غالباً یہ کہنے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں :۔

"چکبست کی نظمیں اسکول کے طالب علموں کے لئے البتہ موزوں ہیں"

(۳) خوفِ موت :۔ موت ادب اردو کی غزل میں ایک اہم عنوان ہے۔ قریب قریب ہر چھوٹے بڑے شاعر نے اس کے متعلق خیالات پر زورِ طبع صرف کیا ہے۔ کچھ شاعر ہجر کی تکلیف کو ناقابلِ برداشت تصور کرکے موت کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو موت پر فلسفیانہ اور صوفیانہ جلا دیتے ہیں۔ اس ذیل میں دلی اسکول کے اربابِ سخن میں غالب کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ انھوں نے اپنے

تخیل کی بلند پروازی سے موت وحیات کی اہم گتھیاں سلجھائی ہیں۔ وہ موت کو غم سے نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

علاوہ بریں ان کا یہ شعر بہت مقبول اور ادب کا ایک تابندہ گوہر ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یعنی زندگی اور موت دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ دنیا کی نشاط کا سبب موت ہی۔ اگر موت نہ ہوتی تو یہ مقام نشاط خانہ نہ ہوتا بلکہ ایک غمکدہ ہوتا۔ چکبست نے بھی قریب یہی خیال ادا کیا ہی ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

میر تقی میر کے یہاں بھی موت کے مضامین ہیں لیکن ان کا رنگِ فلسفہ کی چاشنی کے ساتھ شانِ تغزل لئے ہوئے ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔۔۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ایک مستقل عمل اور جستجو کی تعلیم ہی۔ موت در اصل موت نہیں ہے بلکہ کچھ دیر آرام کے لئے وقفہ ہی۔ محبت کے امتحان کا اختتام فنا کے سبب سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اس مقامِ رنگ و بو سے صرف روپوشی ہو جاتی ہے۔ چمن اور آشیاں اور بھی باقی رہ جاتے ہیں۔ جہاں تکمیلِ محبت کی جھلکیاں محسوس کی جاتی ہیں۔ اقبال کے فنا کے مضامین بہت کچھ اس شعر کی زبان ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اقبال کی نظر محدود ہے۔ اقبال نے اس ذیل میں بہت کچھ وسعت پیدا کی ہے۔ فنا کو فنا کے رنگ میں دیکھا ہے اور اس کو اس کا ہی رُخ دکھا کر حقیقت حاصل کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنا کے اوپر مسلط ہیں اور چاہتے ہیں کہ امت مصطفویؐ میں یہی خو پیدا ہو جائے۔ مسلمان کی فنا فنائے محض ہے، فنائے کامل نہیں ؎

پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

عارضی فرقت محض ایک ماندگی کا وقفہ ہی۔ ابھی دم لے کر آگے چلنا باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ موت سے خوف ایک فعل عبث اور نشانِ بزدلی ہے۔ حالانکہ ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

دنیا میں ہر شے کو موت ہے۔ اس کا ذائقہ ہر ایک کو چکھنا پڑے گا۔ انسان خواہ کتنی ہی بلندی پر ہو، دنیا میں کہیں بھی روپوش ہو لیکن سمندر کے موتی کی طرح اس کو نکال لیا جائے گا۔ جب یہ امر مسلمہ ہے کہ موت اول ہے اور موت آخر ہے تو پھر اس سے خوف کیسا۔ ورنہ حق بات یہ ہے کہ بغیر موت کے امتیاز عبد و معبود نہ ہوتا، دنیا میں ہل چل اور بدنظمی کا عالم ہوتا اور خدا جانے کیا کیا صعوبتیں پیش نظر ہوتیں۔ خدائے واحد کی یہ بہت بڑی حکمت ہے کہ موت کی کڑی کو ایک وسیلہ بنایا۔ ہم کو اس کے مقابلہ میں اپنی کمتری کا احساس ہوا اور اس کو حق جانا۔ ورنہ اغلب تھا کہ ہستی کے مکیں گستاخی کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتے۔ اقبال کی تعلیم روحانی موت کو اپنا طغرائے امتیاز سمجھتی ہے۔ موت کی ہلکی سی خلش ہمارے احساسات و جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک مستقل جہد اور انسانی فرائض کی ادائیگی میں اس کا معمولی سا نقش تندہی تیزی کا باعث ہوتا ہے۔ سکوت و ثبات کے سرد لہو میں گرمی آجاتی ہے اور حشر کا بھیانک تصور طلبِ عفو اور اقرارِ گناہ کا حامل ہوتا ہے۔ امامت کی تعریف میں اقبال نے موت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اس کے نزدیک زمانے کا وہی امام برحق ہے جو

موت کے آئینہ میں دکھا کر رخِ دوست
زندگی و موت سے تجھے بیزار کرے

یہیں سے اقبال نے ایک تنوع شروع کیا ہے۔ موت کے آئینہ میں اسے رخِ دوست نظر آتا ہے — وہی دوست جس کے سبب سے موت آئی ہے۔ . . اپنی کامیابی عشق کی پہلی منزل وہ موت کو خیال کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر موت سے اظہارِ بیزاری کے معنی رخِ دوست سے بیزاری ہوئی۔ یعنی خود اپنی ہستی سے انکار ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انحراف "کافر" کے ذیل میں آگیا۔ پس لازمی طور پر نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ موت کا دوسرا نام . . . . . . وصل اور دعوتِ عشق ہے، پیہم جستجو اور مستقل جد و جہد کی تعلیم ہے۔

نپولین بوناپارٹ کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ اس نے اپنی قوتِ ارادی کو قوتِ عملی کا تابع کر لیا تھا۔ موت اس کے یہاں ایک مہمل لفظ تھا۔ ناممکن اس کی لغت میں نہیں پایا جا سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ ضرب المثل ہے۔ اپنے بہادر سپاہیوں کو وہ اکثر ان الفاظ میں جوش دلاتا تھا "جب بہادر سپاہی موت سے مرعوب نہیں ہوتا ہے اور اس کا بہادری سے مقابلہ کرتا ہے تو موت دشمنوں کی صف میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے۔"[1] بس یہی اقبال کی تعلیم ہے وہ

---

1. 'Napolean' by R. W. Emerson.

موت کے آئینہ میں کامیابی کا رُخ دیکھنا چاہتا ہے۔ زندگی کی اہمیت ایک کشمکش سے زیادہ نہیں جو موت سے نبرد آزمائی کی وجہ سے سامنے آتی ہے۔ یہ موت کے متعلق پہلا تنوع تھا ؎

آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل — مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کیلئے لیکن زباں — ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گُل کا باغ سے گلچیں کا دُنیا سے سفر

اِن اشعار میں موت کو اقبالؔ نے دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ میرؔ نے حیاتِ مابعد کو مرگ میں پایا، غالبؔ نے موجودہ زندگی کے نشاط کو موت سے اخذ کیا، خود اقبالؔ نے اس آئینہ میں رُخِ دوست کو دیکھا۔ لیکن اب وہ فنا میں ایک نئے خدائی نظام کے خواب دیکھتا ہے جو شرمندۂ تعبیر بھی ہوتے رہے ہیں۔ وہ نظام یہ ہے۔ ہر خوشی انحطاط کی طرف ضرور مائل ہوگی اور ہر غم میں خوشی کے نقوش ملیں گے۔ اس کے برعکس ہر خوشی میں غم پنہاں ہوگا۔ جس طرح کالے بادلوں کی آڑ میں بجلی کی تڑپ مستور ہے اور پتھر کے سنگِ دل میں سیمابی شرارہ شعلہ فشاں ہے۔ اسی طرح ہر قنوط میں رجاء کا سامان مہیا ہے۔ خزاں میں سوسن کی زباں درازیاں، زلفِ سنبل کی عطر بیزیاں، گالوں کی گلاب پاشیاں، سرو کی رعنائیاں اور نرگس کی دیدہ درازیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن اس سکوت اور مہر خموشی میں ایک مہکسا اور ایک نقش اب بھی باقی رہتا ہے اور وہ ہے انتظارِ بہار — کیسی بہار ؎

نرمک نرمک نسیم، زیرِ گلاں می خزد — غبغبِ ایں می مکد، عارضِ آں می مزد
سنبل ایں می کشد، گردنِ آں می گزد — گہ بہ چمن می چمد، گہ بہ سمن می وزد

گاہ بشاخِ درخت گہ بہ لبِ جویبار — (قاآنی)

یا

یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہے ہے رنگ می دارد — یکے از گل بوجد آید کہ زہ زہ بوئے یار آید
یکے اینجا گسارد می یکے آنجا نوازد نے — صدائے ہائے و ہوئے ہے زہر سوئے ہزار آید

زہر کوئے صدائے ارغنون و چنگ و نے خیزد — زہر سوئے صدائے بربط و طنبور و تار آید
یکے بر لالہ می غلطد یکے در سبزہ می رقصد — یکے گاہے رود از ہوش، یک گہ ہوشیار آید

الا یا ساقیا اے دہ، بجانِ من پیاپے دہ
دمادم مے خورد مے دلا زمی ترسم خمار آید — (قاآنی)

خزاں والے ایک ایسی بہار کا انتظار کرتے ہیں جس میں شراب و شباب ہو، گرمیاں ہوں، سرمستیاں ہوں، صدائے چنگ و رباب ہو۔

لیکن وقت کا تیز رفتار قافلہ بے ثبات ہے، ہرجائی ہے۔ اس کے پاؤں کو قرار نہیں۔ ابد سے دوڑ رہا ہے اور ازل تک دوڑتا رہے گا۔ ہزاروں تہذیبوں کا کمال و زوال اُس نے دیکھا ہے۔ ہزاروں قوموں کو اپنی "تیز گامی" میں "کچل" ڈالا ہے۔ ایک نظام میں اس کا عمل محدود ہے۔ کسی کو وہ شراب بانٹتا ہے تو کسی سے وہ شباب چھینتا ہے۔ کسی کو وہ مسکراہٹ دیتا ہے تو کسی سے نازآفریں تبسم چھین لیتا ہے۔ چمن کو بہار دیتا ہے لیکن واپسی میں خزاں کو بھی بخت چمن دلواتا ہے۔ جاتے جاتے ہر ایک کو پیام دیتا جاتا ہے کہ ؎

ابھی آرام سے لیٹے رہو، میں پھر بھی آؤں گی!
سُلاؤں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی!

وُہی چمن جہاں شراب اُڑ رہی تھی، صدائے ہائے دہو تھی اور پُر کیف بے خودی و سرمستی تھی، وہاں اب ؎

اکڑنا گئے سرو سب اپنا بھول — اُڑانے لگیں قمریاں سر پہ دھول،
ترانے سے بلبل کا جی ہٹ گیا — گُلوں کا جگر درد سے پھٹ گیا
اُڑا نور نرگس کی آنکھوں کا سب — ہوئے بال سنبل کے ماتم کی شب
پڑا ماتم اک باغ میں بسکہ سخت — ہوئے نخلِ ماتم تمامی درخت
لگے تھے جو پتے درختوں کے ساتھ — وہ مل مل کے مَلتے تھے آپس میں ہاتھ
کہاں وہ کنویں اور کہاں آبشار — کوئی دل میں رُوئے کوئی دھاڑ مار

جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ
لگے بولنے واں منڈیروں پہ زاغ

(مثنوی میر حسن سحر البیان)

لیکن یہ خزاں ماتم کُناں ضرور ہے دیرپا نہیں۔ بہار آئے گی اور ضرور آئے گی اور کچھ اس شان سے ؎

سماں قمریاں دیکھ اُس آن کا — پڑھیں باب پنجم گلستان کا

بالکل اس میں بھی ایک حقیقت موجود ہے۔ خزاں صرف بہار کی تمہید ہی نہیں ہے بلکہ گلستاں کو قیام کا بھی سبب ہے۔ اگر ایک طرف خزاں و بہار اور بہار و خزاں کا نظام ہے تو دوسری طرف تشکیل گلشن کے بھی سامان مہیا ہیں۔ خزاں کا تیر تاریکی میں چمن کے سینہ کو فگار کرتا ہے اور پیہم بیداد اس کی آرزوؤں کو خون رلواتی ہے گویا اجل نشانہ ہلاکر چمن والوں سے کہہ رہی ہے کہ اُٹھو وقت سونے کا گزر گیا۔ کمر ہمت باندھو،

اور میدانِ عمل میں آؤ۔ یہی زندگی ہے ع ــــ ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیامِ گلستاں!
موت سے متعلق یہ اقبالؔ کا دوسرا تنوع تھا۔

آئینہ کے لئے زنگار، دن کے لئے شب، حسن کے لئے عیب، اسلام کے لئے کفر، حق کے لئے باطل، انسان کے لئے حیوان اور آگ کے لئے آب کا امتیاز ضروری ہے۔ اسی طرح بہار کے لئے خزاں ایک ملزوم شئے ہے۔ اگر زنگار نہ ہوتا تو آئینہ کو کیسے پہچانا جاتا، اس میں اپنی صورت کیسے نظر آتی، اگر شب نہ ہوتی تو دن کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہوتی، اگر کفر نہ ہوتا تو اسلام کی رونق کیسے ہوتی، اگر حق ہی حق ہوتا تو حق کو کوئی کیا جانتا، اگر صرف حسن ہوتا تو اس جنس کی بازار میں کیا قیمت ہوتی، اگر انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات نہ ہوتیں تو کس طرح ہم اپنے کو اشرف المخلوقات کہلواتے۔ غرض یہ کہ مقابلہ اور روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو روشنی اور حقانیت کا سبب ہے۔ مقابلہ ابدی وازلی ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں مقابلہ ہے۔ خدا نے انسان پیدا کئے، فرشتے پیدا کئے، کائنات میں ہزاروں قسم کی مخلوق کو پیدا کیا ــــــ کس لئے؟ تاکہ ہم اُس کو اپنے سے برتر جانیں اُس کی حکمت اور اس کی قدرت کو مانیں۔ یہی عبد ومعبود کا رشتہ ہے۔ موت اِس کی درمیانی کڑی ہے ــــــ جو جتنا اُس کی حکمت، قدرت کو مانے گا، سمجھے گا اور عمل میں لائے گا۔ اتنی ہی اس کی اپنے خالق سے قربت بڑھتی جائیگی۔ حتیٰ کہ وہ اس کا جزو لاینفک بن جائے گا۔ جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔ یعنی مقابلہ اور تاریکی تشکیل کا ایک نظام ہے۔ تاکہ برتر چیزیں عرصہ دراز تک قائم رہ سکیں۔ جتنا مقابلہ دیرپا ہوگا اتنی ہی وہ ــ شئے دیرپا ہوگی۔ یہی ابدیت ہے۔

فنائے کامل کے معنی مقابلہ کا کُلّی اختتام ہے۔ انسان کا مقابلہ لافانی ہے۔ اس لئے لازم اور ملزوم دونوں ابدیت کے متحمل ہیں۔ لیکن پھر بھی ملزوم لازم سے برتر نہیں ہے۔ قدر صرف آئینہ کی ہے زنگار کی نہیں۔ حالانکہ صفت صورت گری کا سبب زنگار ہے۔ پس خزاں بہار کی ملزوم ہے اور اس کا تاریک پہلو ہے۔ محض خزاں کا عنوان پوری داستانِ بہار کی تمہید ہے۔ اگر یہ عنوان نہ ہو تو ساری رام کہانی کا وجود نہیں کے برابر ہے۔ چنانچہ خزاں یعنی فنا پورے گلستاں یعنی کائنات کے قیام کا سبب ہے۔ یہ اقبالؔ کا تیسرا تنوع ہے ؎

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل   عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

انقلاب کا دوسرا نام دُنیا ہے۔ ثبات وسکون سے یہ فانی عالم کوسوں دور ہے۔ ہزاروں قومیں بنی اور بگڑی ہیں۔ تاریخ کے اوراقِ پارینہ ان حقیقی داستانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

"تاریخ[1] کے ہزاروں واقعات ہمارے دماغ میں چھائے ہوئے ہیں۔ مصر، بابل، نینوا، ہندوستان کی قدیم تہذیب ـــ ہندوستان میں آریوں کا آنا اور پورے ایشیا و یورپ پر چھا جانا ـــ چینی تہذیب کا تعجب خیز افسانہ ـــ کنوسوس[2] اور یونان ـــ روم کی شہنشاہیت اور بائی زن ٹیم[3] ـــ عربوں کی فاتحانہ نقل و حرکت اور دونوں بڑے براعظموں میں ادخال ـــ ہندی تہذیب و تمدن کا عروج و زوال امریکہ کی غیر معروف مایا اور ازٹک[4] تہذیب ـــ منگولوں کی زبردست فتوحات ـــ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کی گوتھک تہذیب اور ان کے حیرت فزا معبد ـــ ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مغل سلطنت ـــ مغربی یورپ میں ادب و فن کا کمال ـــ امریکہ کی دریافت اور مشرق کے بحری راستے ـــ مغرب کی مشرق میں فتوحات ـــ مشینوں کا دور دورہ اور سرمایہ داری کی ترقی ـــ یورپ میں عروجِ صنعت اور اقتدارِ اعلیٰ و شہنشاہیت ـــ اور سائنس کے جدید دنیا میں شعبدے۔"

"بڑی بڑی عالیشان سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں۔ ہزاروں سال تک فراموشی کا نقاب ان پر پڑا رہا۔ لوگ بالکل بھول گئے۔ حتیٰ کہ مستقل کھدائی سے ریت کے نیچے ان کے نشانات ملے۔ لیکن حکومتوں کے مٹنے سے ہزاروں خیالات نے قوت پکڑی اور شاعرانہ ذوق کی ازسرِ نو تکمیل ہوئی جو ان سلطنتوں سے زیادہ مستحکم ہیں ؎

"مصر کا تختہ الٹ چکا ہے۔
خیالات کی بیسیوں تہوں کے نیچے۔
یونان اور ٹرائے ختم ہو چکے ہیں،
فاتح روم اپنا تاج کھو چکا ہے،
وینس کی شان و شوکت مٹ چکی ہے۔
لیکن وہ خواب جو ان کے بچوں نے دیکھے تھے۔
بے معنی، بہتے ہوئے، بے کار،
تاریک جیسا سایہ معلوم ہوتا ہے،
ظاہراً کچھ نہیں، جیسا انھوں نے سوچا تھا،
وے باقی رہتے ہیں ـــ، اس طرح میری کا آرج گاتی ہے۔"

---

1. Glimpses of World History by Pandit Jawahar Lal Nehru
2. Knossos کریٹ کا ایک قدیم شہر جس میں کھدائی کے بعد پرانی تہذیب کے نشانات ملے ہیں
3. Byzantium موجودہ قسطنطنیہ
4. Aztec

اِن خیالات کی اقبالؔ نے اس طرح ترجمانی کی ہے ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا   قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم   داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے   جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

(بزمِ انجم)

یا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار   رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار   رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں   دیکھتا بے اعتنائی سے ہے اک منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار   ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگزر   چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں   دفترِ ہستی میں اُن کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے   عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آزاری اُٹھا برسا گیا

(گورستانِ شاہی)

ماضی نے حال کی تشکیل کی۔ اب حال مستقبل کی تشکیل کر رہا ہے۔ یہی مستقبل کچھ زمانہ بعد حال ہو جائیگا اور حال ماضی۔ یہی زمانہ کا چکر ہے۔ اسی کو ارتقاء سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بہت پہلے ایک تہذیب تھی لیکن زمانہ کے ہاتھوں وہ مٹ گئی، اس کی جگہ کسی موجودہ تہذیب نے لے لی ــــ لیکن خیالات میں تصادم نہ ہوا، تاریخ بنتی رہی اور تاریخ کے ساتھ ساتھ زاویۂ نگاہ، جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا، تاریخ کے اوراق میں اضافہ ہوتا گیا۔ جن کی وجہ سے خیالات وسیع ہوئے اور عمدہ کلچر کا وجود ہوا ــــ یعنی ماضی نے حال کو بنایا۔ گو وہ تہذیب مٹ گئی، ان اسلاف کے نقوش پر پانی پھر گیا، اس تمدن

کے باقی منوں مٹی کے نیچے دب گئے لیکن آفرینش کا کام ہوتا رہا۔ اب بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ زندگی ایک کارواں ہے جس کے پیروں کے نیچے ہزاروں قومیں کچل چکی ہیں۔ لیکن ان کی روایات ہنوز زندہ ہیں جن سے حال معرضِ وجود میں ہے۔ تاروں کا بھی ایک کارواں ہے۔ بہت سے ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور بہت سے پوشیدہ لیکن یہ ہماری نظروں کا قصور ہے۔ پوشیدہ تارے بھی مجلس انجم کے افراد ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ قومیں جو نظروں سے نہاں ہیں انسان کی برادری کا ایک جزو ہیں۔ یہ باہمی اتحاد ہی آنیوالی اور موجودہ نسلوں کی زندگی کا سبب ہے۔ حال بغیر ماضی کے اور مستقبل بغیر حال کے بے معنی اور مہمل شئے ہے یعنی ماضی کی موت حال کی زندگی ہے۔

قوموں کی مجموعی تشکیل میں اگر ایک جامع نظام ہے تو انفرادی آفرینش میں بھی ضوابط موجود ہیں۔ جس طرح ایک قوم کا مرنا دوسری قوم کی زندگی کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح ایک فرد کی موت دوسرے فرد کی آفرینش کا سبب ہوتی ہے۔ جب صحنِ چمن میں کلی مرتی ہے تب پھول کا وجود ہوتا ہے۔ جب لاکھوں تارے مرتے ہیں تب آفتاب مشرق سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

اگر کلی نہ ہوتی تو پھول ایک مہمل چیز سے زیادہ نہ ہوتا۔ ہما اور عنقا جیسے وہم مثالِ شاعری ہوتے بس یہی ہوتا کہ گُل ایک خوبصورت پھول کا نام ہے جو کوہِ قاف کے کسی گوشہ میں پایا جاتا ہے اور شاید یہ بھی ہوتا کہ اس کو سونگھنے کے بعد ہفت اقلیم کی بادشاہت مل جاتی ہے۔ پس نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ فنا خواہ کسی رنگ میں ہو فنا نہیں ہے۔ وہ سبب آفرینش ہے۔ اگر ایک طرف فنا خود اپنی بقاء کا سبب ہی تو دوسری طرف وہ نظامِ عالم اور تشکیلِ عالم میں ممد و معاون ہے۔ بجنسہٖ یہی خیال غالب کا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ اقبالؒ کا چوتھا تنوع تھا۔

علاوہ ازیں اقبالؒ کے یہاں موت کے مضامین بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دیگر شعراء کے مقابلہ میں سطح سے بلند اور فنِ شعریت کے علمبردار ہیں ؎

ہر مشتِ خاک میں رحمت کش بیداد ہے
گو جگر گردنے ہوا جس دم نفس فریاد سے
زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ! کیا آئے، ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے! زندگی کی شاخ سے پھولے کھلے مُرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے
سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار
یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر بے کسی اس کی ذرا دیکھے کوئی وقتِ سحر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا (گورستانِ شاہی)

نظم "کنارِ راوی" کا آخری بند ہے ؎

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دُور گئی
جہازِ زندگیِ انسان کا رواں ہے یونہی ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

قرآن حکیم کی بھی یہی تعلیم ہے" وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ سورۂ بقر

ترجمہ:- اور تھے تم مُردے پس جلایا تم کو پھر مُردہ کریگا تم کو پھر جلا دیگا تم کو پھر طرف اُس کے پھر جاؤ گے"

عیاں اور نہاں کا فلسفہ بالکل واضح ہے۔ انسان کی کشتیِ حیات ابد کے ناپیدا کنار سمندر میں رواں ہے۔ طوفان اُٹھتے ہیں، موجیں ٹکراتی ہیں لیکن کشتی سبک روی سے مثل نگاہ رواں ہے۔ اہلِ دید لبِ ساحل سے دیکھتے ہیں لیکن محدود نظر کی وجہ سے نہیں دیکھ پاتے۔ خیال گزرتا ہے کشتی فنا ہو گئی لیکن حقیقتاً وہ فنا نہیں ہوتی، صرف نظر سے روپوش ہو جاتی ہے۔ اگر حلقۂ نگاہ وسیع ہو تو ہمیشہ وہ ایک ہی سمت کو بہتی نظر آئے۔ موت دراصل روپوشی کا نام ہے۔ جہازِ زندگیِ انسان بعد الموت ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ ہم اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے اس کو نہیں پاتے۔ چنانچہ اس عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں۔ حالانکہ ایک وقت ایسا بھی آنیوالا ہے کہ پھر یہ کشتی برملا سامنے آجائے گی۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ دوبارہ پیچھے کو لوٹی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ہماری کشتی بھی اس کے دوش بدوش ہے۔ یہ حشر کے دن ہوگا۔ سب کشتیاں لنگر انداز ہوں گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا:-

"ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" پھر طرف اس کے پھیرے جاؤ گے۔ "ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ مَوْلٰـھُمُ الْحَقِّ" پھر پھیرے جاتے ہیں طرف اللہ کے جو کارساز اُن کا ہے۔ "وَھُوَ الَّذِیْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ" اور وہ ذات ہے کہ طرف اس کے اکٹھے کئے جاؤ گے ؎

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

بہت سے ناعاقبت اندیش کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ، حور و غلماں اور سرور انبساط کی ابدی زندگی محض دل کا بھلاوا ہے، مشرق کا صرف یہ وہم ہے جس کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ہزار سالہ خوشی کے خواب دیکھتے ہیں۔ بجز مسلمانوں کے دنیا کی کوئی اور قوم جنت و دوزخ کی قائل نہیں ہے بلکہ یوں کہئے کہ ایک سرے سے منکر۔ وحدت کے پجاری نظر تو ضرور آئیں گے لیکن ان کا راستہ بدلا ہوا ملے گا۔ تاویلات نے جادۂ حق پر کانٹے بکھیر دئے ہیں۔ تعصب نے اندھا گونگا اور بہرہ کر دیا ہے۔ حالت اس درجہ ابتر ہے کہ ہم اس کی حکمت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق "اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ" (تحقیق بدتر سب جانوروں سے ہیں نزدیک اللہ کے بہرے گونگے ہیں وہ جو نہیں سمجھتے ہیں) جانوروں سے بدتر ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی حکمت کے سب ہی قائل ہیں ؎

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا   حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہی ضرور   بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا (حالی)

خصوصی طور پر اہلِ ہنود کو لے لیجئے۔ یہ حضرات آواگون کے قائل ہیں۔ جنت میں اعمال کے مطابق محدود زندگی کو مانتے ہیں۔ جیو کے ساتھ بندھن کو ضروری شئے قرار دیتے ہیں۔ مُکتی بار بار جنم اور کرموں سے نجات کا نام ہے۔ . . . . گیتا سے اقتباس ہے[1]

نہ تدْ بھاسیتے سوُریو نہ شَشانکو نہ پاوَکہ
یدْ گتوا نہ نورتنتے تدْ دھام پرمم ممہ

(جس کو حاصل کرنے کے بعد عابد واپس نہیں ہوتے۔ وہ میرا بلند مقام ہے۔ جہاں نہ آفتاب چمکتا ہے نہ ماہتاب

---

[1] بحوالہ مباحثہ غازی آباد جو پروفیسر سید شوکت علی سبزواری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (عربی۔ فارسی۔ اردو) ریسرچ اسکالر اور پنڈت رام چندر دہلوی کے مابین ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مسئلۂ نجات پر ہوا۔

روشنی دیتا ہے اور نہ آگ جلتی ہے) بھگوت گیتا ادھیائے ۱۵ اشلوک ۶۔

بَرَہْمَ ۔ لُوکَمْ ۔ اَبھی سَمْپَدْ تَیے ۔ نَہ ۔ چِہ ۔ پُنَرْ اَوَرْتَتے

نَہ ۔ چِہ ۔ پُنَرْ ۔ اَوَرْتَتے (چھاندوگیہ ۔ ادھیائے ۸ ۔ کھنڈ ۱۵)

(مکت جیو) برہم لوک یعنی جنت کے طبقۂ عالیہ کو حاصل کر لیتے ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں ہوتے۔

. . . .

وِیدَاہَمْ ۔ اِتَمْ ۔ پُرُشَمْ ۔ مَہَانْتَمْ ۔ آدِتیَہ وَرْنَمْ ۔ تَمَسَہ ۔ پَرَسْتَاتْ

تَمیوْ ۔ وِدِتْوَا اَتِی ۔ مِرِتْیُمْ ۔ اِیتی ۔ نَہ ۔ اَنیَہ ۔ پَنتھَا ۔ وِدْیَتے ۔ اَیَنَائے

(میں اس عظیم الشان پرش (خدا) کو جانتا ہوں۔ جو سورج کی طرح روشن اور تاریکی سے دور ہے۔ اسی کو جان کر لوگ موت سے چھوٹتے ہیں۔ اِس کے سوا مکتی کی اور کوئی راہ نہیں) یجروید ادھیائے ۳۱۔ منتر ۱۸

مَنْشِیَہ ۔ تَمیوْ ۔ پُرُشَمْ ۔ پَرْمَاتْمَانَمْ ۔ وِدِتْوَا ۔ اَتِی مِرِتْیُمْ ۔ مِرِتْیُمْ اِتی

کَرَانْتَمْ ۔ مُکْتْیُو ۔ پَرْمَکْ بھُوتَمْ ۔ مُوکْشْ ۔ آکھیَمْ ۔ آنَنْدَمْ ۔ اِتی ۔ پَرَاپْنُوتی ۔

(انسان اس پرماتما کو جان کر موت سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور موت کو چھوڑ کر موکش (نجات) ناتی آنند (سُرور) حاصل کر لیتا ہے) بھومکا ص ۱۳۳

حقیقت یہ ہے کہ عبد و معبود کا رشتہ آئینہ اور آفتاب کا سا ہے۔ آفتاب تنگ ظرف نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اپنی روشنی دیتا ہے۔ آئینہ میں جتنا جذب کرنے کا مادّہ ہوگا اتنی اس میں چمک پیدا ہو جائے گی۔ جس طرح ذرّات آفتاب کی ضَو میں ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں۔ اسی طرح آئینہ کا بھی چمکنا ممکن ہے۔ غبار کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آئینہ روشنی ایک ایسے عالم میں حاصل کرتا ہے جہاں نور ہی نور ہے۔ غبار نام کو بھی نہیں۔ اور اس آئینہ کی صفا موت سوز و ساز و درد عمل پیہم ہے۔ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" کے مصداق ہم کو روشنی برابر ملتی رہے گی۔ بس یہی حیاتِ ابدی ہے۔ قرآن حکیم کے کتنے پیارے اور موزوں الفاظ ہیں "قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝"

ترجمہ:۔ (کہہ اگر ہے واسطے تمہارے گھر آخرت کا نزدیک اللہ کے خالص سوا اُن لوگوں کے پس آرزو کرو تم موت کی اگر تم ہو سچے)۔ حکیم الامت کی تائید بھی ملاحظہ ہو ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام

خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

یا مرنے سے چند گھنٹے پہلے جو رونیوالوں کو تسلی دی تھی ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

خدا کرے یہی اسپرٹ ہمارے جدید رجعت پسند طبقہ میں پیدا ہو جائے!

ثباتِ زندگی

ثبات اور سکون بے عملی کے دو نام ہیں۔ فطرتاً انسان سکون کی زندگی پسند کرتا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ سکون کے لغوی معنی آرام اور ثبات کے لغوی معنی قرار کے ہیں۔ زندگی جب عمل کے دیار سے کوسوں دور ہوتی ہے تب ہستی کو سکون سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اقبالؒ کے یہاں اس ذیل میں عمق ہے۔ ثبات و سکون صرف چین و آرام کا ہی حامل نہیں ہے بلکہ اس میں غم و اندوہ کا عنصر نہاں ہے۔ ظاہراً ثبات و سکون آرامِ دل کا باعث ہوتا ہے لیکن حقیقتاً وہ سوہانِ روح کا سبب ہے۔ سکون سے مراد فقدانِ سوز و ساز ہے۔ "گلِ رنگیں" بے گدازِ آرزو ہے اس لئے اس کی ہستی میں سکون ہے اور وہ ثبات سے ہم کنار ہے۔ اسی طور پر ہر وہ جسم جس کی روح سوز سے محروم ہے قریب قریب ایک قبر ہے جس نے روح کو بند کر رکھا ہے۔ اکبر الہ آبادی اپنی ایک نظم "لبِ ساحل اور موج" میں عمدہ اشارہ کرتے ہیں ؎

دور کوہ لبِ ساحل سے جو گزری اک موج — کوہ نے اس سے کہا "تو نے نہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دمِ چند" — بولی "سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند
ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل — اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل"
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب — "پوچھئے موج سے یہ بھی اسے رک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تسلی کیسی؟ — اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی؟"
بہہ گئی موج یہ کہہ کر "کہ میں مغرور نہیں — تجھ میں اے کوہ مگر روشنئ طور نہیں"
بلبلا ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

موج کی زندگی مستقل جد و جہد، سوز و ساز اور طوفانیت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس کوہ ثبات کا حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کوہ کا اوج اور اس کی رفعت موج سے بلند تر چیزیں ہیں لیکن بنظرِ باطن موج جیسی سالک کی حیات کوہ کے لئے درسِ عبرت ہے۔ موج کا یہ اوج ہے کہ اس کی گرم رفتاری اس کو سمندر سے ہم کنار کر دیتی ہے جس کا وہ خود ایک جزو ہے۔ جتنی اس کی روانی میں سرعت اور سوز و ساز ہوتا ہے اتنی ہی جلدی وہ اپنے مرکز سے ملحق ہو جاتی ہے۔ کوہ کو یہ بات میسر نہیں۔ وہ اپنی جگہ سے

سے اٹل ہے۔ اپنی نگاہوں سے وہ صرف فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کا تماشہ دیکھا کرتا ہے اِ
کے باوجود اس کو اپنی شکل بدلنے پر قدرت حاصل نہیں۔ اُس رمز کو اقبالؒ نے صرف ایک شعر میں ادا کر دیا

زندگی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس میں کچھ فطری لگاوٹ بھی ہے، کہ سکون پسندی کے آرام کے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ نیند کی کیفیت ہر شخص کو بھاتی ہے۔ ذرا فضا سازگار ہوئی اور آنکھ لگی۔ کے برعکس فطرت عمل کی طرف راغب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ حسین تصورات اور بلند خیالات دماغ میں کھیلتے رہتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں پریسٹلے[1] لکھتا ہے: ۔

"ہم نے کچھ نہیں کیا، نہ کوئی اسکیم مرتب کی، نہ کچھ سوچا۔ حد ہے کہ ہم نے ڈینگ تک نہ ماری جو سوسائٹی میں دو دوستوں کا عام طریقہ اور دل خوش کرنے کی بہترین صورت ہوتی ہے۔ تصورات میں ہمارے دوست واقرباء دھیمی آوازوں میں بھنبھناہٹ کی طرح بات کرتے نظر آرہے تھے۔ یہ بھی نظر آتا تھا کہ وہ آپس کے لین دین میں مصروف ہیں۔ لیکن ہم گویا دیوتا تھے۔ بالکل خوش، بے عمل ــــ دماغ صرف ایک خلا تھا۔"

لیکن کیا حقیقتاً یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ مصلّے بچھائیے، کسی بن میں پیڑ کے نیچے احرام باندھ کر بیٹھ جا۔ آنکھیں بند کیجئے اور مراقبہ میں ڈوب جائیے۔ درست۔ لیکن اشتہا کو کیا کیجئے گا۔ کیا آسمان سے خوان آئیں گے یا من و سلوی برسے گا۔ ایک ایسی بے عمل زندگی میں فردوسی خوانوں کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔؟ ممکن ہے کسی گوشہ سے کوئی مُلّا کہہ اُٹھے کہ یہ بھی ممکن ہے ــــ بے شک خدا کی کار کے ہم قائل ہیں۔ اُس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ خود آپ نے پھر ایسا تجربہ نہیں کیا، بن کا رُخ کیوں نہیں کیا، فردوس کے لذیذ میوے اور شراب و اکل کی نعمت کو کیوں ٹھکر محض اس وجہ سے کہ آپ ابھی شبہ کے سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایسا کر سکتا ہے، یہ نہیں کہتے کہ خدا تعالیٰ ایسا کرتا ہے۔ یوں کہیں گے کہ لذیذ میوے اور پھل مل سکتے ہیں۔ لیکن وثوق سے کہیں گے لذیذ میوے اور پھل ضرور ملیں گے۔ شبہ پاؤں پکڑتا ہے اور بن جانے سے روکتا ہے۔ پس شبہ، بے یقینی اور محض انتظار کی زندگی کو بھی ثبات کہتے ہیں ؎

شباب آہ کہاں تک امید وار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے

---

[1] J. B. Priestley.

ن کا حاصل کر لینا عیش کے مترادف ہے لیکن شبہ کی بنا پر اس کا صرف انتظار کرنا عیش نہیں سوہانِ
ح ہے۔ عمل کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ دل سے شبہ اور انتظار ختم کر دیتا ہے خود اعتمادی پیدا
اتی ہے۔ مالی زمین کھودتا ہے، کھاد ڈالتا ہے، بہترین بیج بکھیرتا ہے، پانی دیتا ہے اور نگہداشت کرتا ہے، اس کے
رہ یہ کہنے کا حقدار ہوتا ہے کہ "اب کی بار پھول بڑے جوردار (زوردار) اُگیں گے" یعنی اس کے عمل اور
جہد نے اس کی بے یقینی کو فنا کر دیا۔ محنتی طالب علم ہر وقت کہدیتے ہیں کہ ہم اوّل یا دوئم پاس ہو رہے ہیں،
کے چہروں پر بشاشت جھلکتی ہے۔ لیکن کاہل طلبا ہر وقت متفکر اور پریشان نظر آتے ہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں "فلاں
بگڑ گیا ہے لیکن ماسٹر صاحب بہت عمدہ آدمی ہیں، سترہ نمبر تو آہی جائیں گے" یعنی ہر وقت شبہ کے خیالات
کے دماغ پر محیط رہتے ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہی وہ زبردست کمزوری ہے جو طالب علم کے مستقبل کو فنا کر دیتی ہے۔

سکون پسندی پر نظر ڈالنے سے ایک اور نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے ؎

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار　　　ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ساکن ہے لیکن انقلاباتِ زمانہ کا وہ بھی شکار ہے۔ اس کی شکل و شباہت میں ضرورت کے مطابق فطرت نے تبدیلیاں
ہیں۔ اس کی طبیعت کو روزگار سے لگاوٹ ہے۔ فطرت ــــ "کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی" کے
مذاق اس کی زندگی میں معاون رہی ہے اور برابر تبدیلیاں کر کے مائل بہ ترقی رہی ہے۔ چنانچہ اقوام کی زندگی یونہی
ہے۔ اس پر میں کافی بحث کر چکا ہوں، زیادہ لکھنا تضیع اوقات ہے۔ مدعا یہ ..... کہ سکون و ثبات دنیا میں امر
اور خیالِ عبث ہے۔ دنیا ایک مستقل عمل کا نام ہے۔ گردشِ روزگار ہی لیل و نہار کا سبب ہے۔ چنانچہ موت کو اگر
عنوان کے ماتحت دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ساکن زندگی کو معدوم کرنے کے لئے وہ کتنی ضروری چیز ہے۔ دراصل
ت کے اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں ساکن حیات بدترین زندگی ہے۔ وہ عیش نہیں سوہانِ روح ہے۔ ثبات دنیا میں محال ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ــــ ہے زمانے میں

رت خود بخود اس کو ایک انقلاب سے آشنا کر دیتی ہے۔ دنیا ساکن سے سالک ہوئی ہے، سالک سے
ن نہیں۔ اس لئے گردشِ روزگار سکون سے عمل کی طرف ہے۔ اگر درمیان میں کہیں زمانہ کا پہیہ رک بھی
ئے گا تو وہ پھر اسی سمت کو روانہ ہو جائے گا۔

ادیب بریلوی

تسخیرِ دل!

(از مولانا حالی پانی پتی مرحوم)

آخر اے دانا حکیموں کچھ سبب اس کا بتاؤ؟ ہے بنی آدم کو کیوں قتلِ بنی آدم کا چاؤ؟
جبکہ حق اور راستی ہے خاص رحمانی صفت پھر تعجب ہے کہ جباری کا ہو اُس میں لگاؤ
جبکہ ہے سرچشمۂ مہر و محبت ذاتِ حق پھر منانی چاہئے کیوں اسکی شریعت بے دباؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ؟ دینِ حق کو اے ابنائے جنس زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ
یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے اور اچھے خلق سے جلوہ الفت کا دکھاؤ
دل کرو اہلِ جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقیں اُن پر دلاؤ

راہِ حق کو خار و خس سے پاک ہونا چاہئے
گلشنِ دیں بے خس و خاشاک ہونا چاہئے

۴- یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ!

خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب

(از مولوی سعید احمد صاحب مارہروی مرحوم)

میں بہت خوش نصیب ہوں کہ میرے پاس بعض اوقات بڑی بڑی عمدہ اور عجیب چیزیں پہنچ جاتی ہیں۔ مثلاً ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی نے جبکہ وہ علی گڑھ میں منصف تھے۔ بلنٹ کی مشہور کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اردو میں ترجمہ کرکے شایع کرایا تھا۔ میرے پاس ترجمہ مذکور کا اصل مسودہ حضرت اکبر الہ آبادی کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں۔ ابھی حال میں مولوی محمد امین صاحب زبیری نے علی گڑھ سے بھوپال کے لئے ترک سکونت کی تو اپنی دانست میں اپنی بہت سی غیر ضروری کتابیں کچھ اور معلوم و نامعلوم مسودات مجھ کو دے گئے ——— انھیں مسودات میں ذیل کا مضمون برآمد ہوا۔ جو شاید مولوی سعید احمد صاحب مارہروی مرحوم نے بغرضِ نظرِ ثانی کسی زمانہ میں زبیری صاحب کو دیا تھا۔ زبیری صاحب ہر چیز کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھنے کے عادی ہیں اور چونکہ اس معیار پر مضمون نہ اترا ہوگا جیسا کہ جگہ جگہ حاشیوں پر "ہدایات" سے ظاہر ہے۔ اس لئے مضمون تشنۂ تکمیل رہا۔ حتیٰ کہ صاحبِ مضمون بھی اُسے واپس لینا بھول گئے اور ۱۹۴۶ء میں اُن کا انتقال بھی ہوگیا۔ اب وارثِ مضمون کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا کہ میں جناب محمد امین صاحب زبیری کی ہدایات کے بموجب مضمون پر نظرِ ثانی کرتا اور مولوی بشیر الدین صاحب کے اس وقت (۱۹۴۷ء) تک کے حالات مکمل کرتا مگر میں اس طریقہ کا قائل نہیں۔ میں ہر مفید چیز کو اس کی ظاہری حالت سے نہیں جانچتا ہوں ——— بلکہ اُس کی افادیت پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ حشو و زوائد کی موجودگی، مضمون کی تشنگی، اُردو زبان کی خامی وغیرہ میری نگاہ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ اردو کا دامن تنگ ہے۔ اُس کی وسعت کی خاطر جیسا بھی جوڑ پیوند میسر آئے میں اُسے کارآمد بنا لیتا ہوں۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے ذاتی حالات پر میری نظر سے اب تک کوئی مضمون نہیں گزرا۔

لہٰذا ایک مضمون چھپنا چاہئے اور بس! مولوی صاحب موصوف کے دوسرے عقیدت مند آئندہ اس میں اصلاح و اضافہ فرمائیں گے۔!

صاحب مضمون نے تحریر فرمایا ہے " آج مولوی بشیر الدین صاحب کی عام طور سے قدر نہیں کی جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا (انشاء اللہ بدیر) کہ اُن کے واسطے لوگ لوگ خون کے آنسو روئیں گے "۔ افسوس مولوی صاحب کے غمخوار سید احمد صاحب مارہروی اپنے ممدوح سے پہلے دنیا سے چل بسے۔ مرحوم بڑے ایثار پیشہ ذی علم اور خاموش قومی کارکن تھے۔ اُن کی قیمتی یادگار شعیب محمدیہ انٹر کالج آگرہ ہے۔ جس کے وہ بانی اور روحِ رواں تھے۔

یہ مضمون مولوی بشیر الدین صاحب کے ۱۹۲۹ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ گزشتہ اٹھارہ سال میں موصوف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ویسے ہی محنتی۔ جفاکش۔ اور قوم کے درد میں سرشار ہیں۔ اور اُن کی انتھک کوشش سے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ انٹر کالج کے درجہ تک پہونچ گیا ہے مولوی صاحب کی خان بہادری اور کانگریسیت میں بھی کوئی فرق نہ آیا اور اب تو اُس کی بہار کے دن ہیں۔ خدا اُن کو دراز سے دراز تر عمر عطا فرمائے۔

سید الطاف علی بریلوی

تمہید مولوی بشیر الدین صاحب بانیٔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میرے مخدوم اور عزیز ہیں۔ مجھے مدت سے اُن کی قومی خدمات اور خانگی زندگی کا کچھ نہ کچھ علم ہے، اور اکثر اُن کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ۹ اپریل ۱۹۲۹ء کو اٹاوہ میں اُن کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا تو بوجہ علالت ضعیف العمری اور پے در پے مسلسل صدمات اور چند غیر معمولی اور پُر درد اسکول کی مشکلات اور پریشانیوں کے اُن کو بہت ہی نحیف پایا۔ اُن کی موجودہ حالت دیکھ کر اور پریشان کُن واقعات کو سُنکر قلب پر چوٹ لگی۔ اثنائے گفتگو میں خیال آیا کہ اگر خدانخواستہ یہ چراغ سحری گل ہوگیا تو اُس کے بہت سے واقعات گمنامی کے پردہ میں چھپ جائیں گے۔ ہماری قوم مُردہ پرست ہے۔ اُن کی زندگی میں خدامِ قوم کی قدر نہیں کی جاتی اور اُن پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کیا جاتا ہے۔ بمصداق "قدر نعمت بعد از زوال"۔ مرنے کے بعد جب اُن کے کارناموں کی قدر معلوم ہوتی ہے تو اُن کے گزشتہ واقعات کی تلاش و جستجو کی جاتی ہے اور اُن کی سوانح عمریاں مُرتب و شائع کی جاتی ہیں۔

آج مولوی بشیر الدین صاحب کی عام طور سے کوئی قدر نہیں کی جاتی اور زیادہ سے زیادہ وہ اسکول کے ممبر سمجھے جاتے ہیں اور گویا یہ کام وہ اپنی ذاتی اغراض یا شہرت ونام ونمود کے لے کر رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اُن کے واسطے لوگ خون کے آنسو روئیں گے ن کے بے لوث کارنامے فخر وعزت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔

یہ خیال آنے پر مولوی صاحب سے واقعاتِ زندگی کے متعلق میں نے اُن سے چند سوالات کے (ج)واب پانے کی استدعا کی جس کو بمشکل اور با اصرار تمام شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور میں نے ایک پر انہیں لکھ لیا کہ کسی وقت یادداشت آئندہ بکار کے مصداق ثابت ہوں۔

نوٹ ابتک میرے پاس پڑے رہے۔ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۳ء کو مولوی بشیر الدین صاحب کا والا نامہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳ء موصول ہوا جس میں نہایت محبت وخلوص آمیز الفاظ کے ذریعہ پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ اٹاوہ کی شرکت کی دعوت تھی۔ دوسرے دن اتفاق سے ایک کاغذ تلاش میں یہ یادداشت نظر سے گزری اور فوراً خیال آیا کہ حیاتِ مستعار کا کیا اعتبار کہیں ایسا کہ یہ ضائع ہو جائے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس کو قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے۔ تاکہ آئندہ ی بشیر الدین صاحب کے سوانح نگاروں کے واسطے کارآمد ہوں۔ متذکرہ یادداشت اور ذاتی فیت نیز چند گزشتہ تحریروں کی امداد سے یہ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاندان۔ پیدائش۔ بچپن۔ تعلیم

مولوی بشیر الدین صاحب اُن شیوخ قریشی سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلعم کے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی حضرت زبیرؓ سے ملتا ، اور جو شیوخ زبیری اور ایک مقامی نسبت کی وجہ سے کنبوہ کہلاتے ہیں۔

مولوی بشیر الدین صاحب کا سلسلۂ نسب حسب ذیل پندرہ ۱۵ واسطوں سے حضرت شیخ عبد اللطیف ۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، جو سلطان محمود غزنوی کے زمانہ کے مشائخ اور مجاہدین سے تھے اور اسی انہ میں ہندوستان میں آکر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔

مولوی بشیر الدین ابن حاجی قمر الدین۔ ابن نظام الدین۔ ابن عظیم الدین۔ ابن محمد اعظم۔ ابن جعفر خان ن اکرام خان۔ ابن شیخ محمد۔ ابن [illegible]۔ ابن [illegible] خواجہ حسن ملتانی المداہوی ن خواجہ بڈھی یا خواجہ بڈھے۔ ابن خواجہ [illegible]۔ ابن شیخ [illegible]۔ ابن شیخ جعفر المعروف بہ محمد ظفر۔

ابن شیخ عبداللطیف ؒ۔

سنہ ۹۳۸ھ / ۱۵۳۱ء میں خواجہ حسن مُلتانی مع اپنے بھائی خواجہ محمد آمین کے ملتان سے بسلسلہ طلب علمی مارہرہ تشریف لائے جو کمشنری آگرہ اور ضلع ایٹہ کا مشہور اور قدیم قصبہ ہے۔ یہاں اُس زمانہ میں مخدوم ظہیر الدین قدس سرہٗ ایک مشہور بزرگ سکونت پذیر تھے جو علوم ظاہری و باطنی میں شہرۂ آفاق تھے اُنکی خدمت میں دونوں بھائیوں نے علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے ان کے ایک عزیز خواجہ عماد الدین نام پہلے ہی سے حضرت کی خدمت میں موجود تھے اُن کی لڑکیوں سے اِن دونوں بھائیوں کا حضرت نے عقد کردیا اور یہی سلسلہ ان کے قیام مارہرہ کا باعث ہوا۔

مخدوم صاحب کی دُعاؤں کی برکت سے اِن دونوں بھائیوں اور اُن کی اولاد میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی۔ سنہ ۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء شیر شاہ سوری نے خواجہ حسن کو پرگنہ مارہرہ کا چودھری اور قانون گو مقرر کیا۔ اُس عہد میں یہ عہدے نہایت معزز اور باوقعت سمجھے جاتے تھے اور جو مالی اختیارات اُن کو حاصل تھے وہ آج کلکٹر ضلع کو بھی حاصل نہیں۔

خواجہ حسن کے بیٹے عمر خاں شہید فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور صلاح و تقویٰ اور شجاعت و بہادری میں شہرۂ آفاق تھے۔ شہنشاہ اکبر اعظم نے اُن کے حُسنِ انتظام اور خوش سلیقگی سے خوش ہو کر پانچ ہزار بیگہ پختہ اراضی بنام مقبوضہ خاص ملحق آبادی قصبہ مارہرہ مرحمت فرمائی۔ اور اِسی اراضی میں اُنھوں نے اپنا جداگانہ محلہ مسجد سرائے اور بازار تعمیر کرایا۔ یہ محلہ اب کنبوہ محلّہ کے نام سے مشہور اور قصبہ کا سب سے زیادہ آباد محلہ ہے۔ سنہ ۹۷۳ھ / ۱۵۶۶ء میں عمر خاں کسی سیّد کی حمایت میں شہید ہوئے۔

عمر خاں شہید کا خاندان بفضلہ تعالیٰ خوب پھولا پھلا اور مدت تک ریاست و امارت اور حکومت کے مزے اُٹھاتا رہا۔ جس کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے پردادا عظیم الدین بزرگ کامل۔ ذاکر و شاغل اور اہلِ معرفت تھے۔ اُن کی کرامات کی اکثر روایتیں مشہور رہیں۔

دادا نظام الدین کلکتہ میں کسی عہدہ پر متعین تھے۔ جنھوں نے مارہرہ سے ترک سکونت کرکے بانس بریلی میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے والد حاجی قمر الدین مرحوم صوفی مشرب۔ آزاد وضع۔ قلندر دوش۔ مستغنی المزاج بزرگ تھے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کا سلسلۂ نسب ننھیال کی طرف سے نواب خیر اندیش خاں میرٹھی تک پہنچتا ہے جو عہد عالمگیری کے مشہور و معروف امیر تھے اور جن کا خاندان میرٹھ میں ابتک معزز و محترم ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب شعبان ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ حاجی قمر الدین صاحب مرحوم کے ایک دوست نے یہ قطعہ تاریخ آپ کی پیدائش کے وقت موزوں کیا تھا ؎

حاجی قمر الدین صاحب را خدا   کرد عطا از فضل خود نورِ سعید

گفت تاریخ ولادت عارفے   عارفِ باللہ فرزندِ رشید

مولوی بشیر الدین صاحب کے بچپن کے حالات پر لاعلمی کا پردہ پڑا ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ ابتدائی اور فارسی کی رسمی اور مروجہ تعلیم مفتی حافظ اشرف خاں مرحوم میرٹھی سے حاصل کی جو ایک سادہ مزاج مقدس ہستی اور بزرگانِ قدیم کا نمونہ تھے۔

اس کے بعد گورنمنٹ اسکول میرٹھ میں چھٹے درجہ تک انگریزی کی تعلیم پائی۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں خصوصاً شرفا میں انگریزی پڑھنا پڑھانا کفر سمجھا جاتا تھا۔ سوائے حاجی قمر الدین مرحوم کے کل خاندان اس تعلیم کا مخالف تھا۔ حاجی صاحب اسکول میں داخل کرا آتے تھے۔ اہل خاندان جا کر نام کٹوا دیتے تھے۔ اِسی کشمکش میں کسی نہ کسی طرح چھٹے درجہ تک پہنچے۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجہ کی تعلیم اپنے چچازاد بھائی قطب الدین صاحب کے ساتھ بریلی کالج میں پائی۔

بچپن میں مولوی بشیر الدین صاحب کو ورزش کرنے اور کُشتی لڑنے کا خاص شوق و انہماک رہا۔

قیام میرٹھ کے زمانہ میں مولوی نور اللہ صاحب مرحوم نامی ایک بابرکت بزرگ خیر نگر کی مسجد میں رہتے تھے جو مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے ہمراہیوں میں سے تھے مولوی بشیر الدین صاحب اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اِنھیں بزرگ کی فیضِ صحبت سے آپ کے دل میں شرک و بدعات سے نفرت اور توحید سے اُلفت پیدا ہوئی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے شوق و ذوق کی بُنیاد پڑی۔

ملازمت سرسید سے الفت و ارادت وغیرہ

تعلیم سے فارغ ہو کر فکرِ معاش دامن گیر ہوئی سب سے پہلے ضلع میرٹھ میں دہلی کے پُل جمنا پر محرر تجارت مقرر ہوئے۔

اس کے بعد میرٹھ کے قومی اسکول میں مبلغ چار روپیہ ماہوار تنخواہ پر مانیٹر یا خلیفہ ہو گئے جہاں بچوں کو انگریزی پڑھاتے اور اِسی نسبت سے مدتوں ماسٹر کہلاتے رہے ۱۸۵۳ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

حاجی ممتاز علی خاں مرحوم نے جو میرٹھ کے اصلی باشندے اور قبیلہ زبیری کے مشہور و معروف

اور ممتاز بزرگ اور قومی لیڈر اور مذہبی معاملات میں غیر معمولی انہماک رکھتے تھے۔ اٹاوہ کی سکونت اختیار کر لی تھی اور یہاں کے مشاہیر رؤسا میں شمار ہوتے تھے وہ ابتداء میں سرسید احمد خاں مرحوم کے دوست تھے لیکن جب اُن کی تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریک شروع ہوئی تو اُس زمانہ کے عام راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی طرح مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ "نجم الاخبار" نام اخبار اُن کے بیٹے حافظ رُوح اللہ خاں مرحوم اور حافظ اعلیٰ صاحب مرحوم کی ملکیت میں اٹاوہ سے نکلتا تھا اور سرسید مرحوم کی تحریک کی مخالفت میں سب سے پیش پیش تھا۔

مولوی بشیر الدین صاحب بھی اُس زمانۂ جاہلیت میں اِس تحریک کے خلاف تھے اور اخبار "طوطی ہند" میرٹھ میں سرسید کے خلاف مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے اِن مضامین کو دیکھکر اور پسند کرکے حاجی ممتاز علی خاں مرحوم نے مولوی بشیر الدین صاحب کو سرسید کے خلاف ایک پُر جوش نوجوان سمجھکر ۱۸۸۳ء میں اٹاوہ بُلا لیا اور اخبار مذکور کا اڈیٹر مقرر کر دیا جس میں آپ ۱۸۸۸ء تک سرسید مرحوم کے خلاف دھواں دھار مضامین لکھتے رہے اور اخبار کو خوب چمکا دیا۔ اکتوبر ۱۸۹۷ء تک "نجم الاخبار" کے اڈیٹر رہے۔ اِس کے بعد مالکانِ اخبار اور آپ کے درمیان میں اخبار کی پالیسی کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، جس کی وجہ سے اخبار مذکور بند کر دیا گیا۔

فروری ۱۸۹۹ء میں آپ نے اپنا ذاتی اخبار "البشیر" نام کا جاری کیا۔ جو ۱۹۰۸ء تک نہایت آب و تاب اور غیر معمولی شہرت کے ساتھ جاری رہا اور اب آپ کے مسلسل صدماتِ علالت اور ضعیف العمری کی وجہ سے برائے نام جاری ہے۔

سرسید سے پہلی ملاقات

۱۸۷۹ء میں مولوی بشیر الدین صاحب کو سرسید احمد خاں مرحوم کی شرفِ صحبت یا بیعت کا فخر حاصل ہوا۔ آپ اب تک محض سُنی سُنائی باتوں کی بنا پر سرسید کے مخالف بنے ہوئے تھے اور اُن کو مذہب و ملت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ اِسی زمانہ میں مولانا حالی مرحوم کا شہرۂ آفاق "مسدس حالی" شائع ہو چکا تھا اور مخالف اخباروں میں اُس پر لے دے ہو رہی تھی۔ اخبار "تیرھویں صدی" آگرہ میں جو سرسید اور اُن کی تحریک کا سب سے بڑا مخالف تھا، اُس کا جواب چھپا۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے اِس جواب کو پڑھکر خود بھی اِس پر اضافہ کرنا چاہا۔ اِسی عرصہ میں اتفاق سے خان بہادر سید جعفر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو سرسید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے "مسدس حالی" مولوی بشیر الدین صاحب کو دیا۔ اُنھوں نے جواب لکھنے کے ارادہ سے اُس کو پڑھا، پڑھتے ہی آنکھیں کھل گئیں اور بجائے جواب لکھنے کے خود

شکار ہو گئے۔ طبیعت نے فوراً پلٹا کھایا اور سرسید کی تعلیمی تحریک سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس کے متعلق کچھ عرصہ تک حاجی ممتاز علی خاں مرحوم اور خان بہادر حافظ روح اللہ خاں مرحوم اور دیگر مخالفین سرسید سے بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔

سب سے پہلے ۱۸۸۹ء کی ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں آپ نے شرکت کی اور انگریزی کی جو ایسی کتابیں داخلِ نصاب تھیں جن میں اسلام پر حملہ کیا گیا تھا اُن کے نصاب سے خارج کئے جانے کا رزولیشن پیش کیا۔ اِس بحث پر آپ پوری تیاری کر کے گئے تھے۔ سرسید مرحوم نے اِس کی تائید میں نہایت پُرجوش و پُرزور تقریر فرمائی جس کا کافی اثر آپ پر پڑا۔

اِسی زمانہ میں "ٹرسٹیز بل" پاس ہو چکا تھا جس میں سرسید کی جانشینی کے واسطے سرسید کے بیٹے سید محمود مرحوم کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔ سرسید اور اُن کے رفیقِ کار مولوی حاجی سمیع اللہ خاں مرحوم کی باہمی مخالفت کا عام چرچا تھا۔ مولوی بشیر الدین صاحب حاجی صاحب کے حامی اور اُن کی موافقت میں مضامین لکھ چکے تھے۔ اِسی کانفرنس میں "ٹرسٹیز بل" کی موافقت میں ایک رزولیشن پیش تھا جس کی مخالفت میں حاجی صاحب کی پارٹی کی تقریریں ہوئیں۔ اِن مخالف تقریروں کے بعد مولوی بشیر الدین صاحب کھڑے ہوئے اور ایک پُرجوش صلح کن تقریر کی، جس کا ماحصل یہ تھا کہ اب جبکہ قانون پاس ہو چکا ہے، اُس کے حُسن و قبح پر تقریریں کر کے مسلمانوں میں باہمی مزید تفریق پیدا کرنا لاحاصل ہے۔ ایسی کوشش ہونی مُناسب ہے کہ موجودہ اختلاف کا خاتمہ ہو کر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کیا جائے۔ تاکہ اصل مقصد کو نقصان نہ پہنچے۔ اس تقریر سے سامعین خصوصاً سرسید مرحوم بہت متاثر ہوئے اور جلسہ کے بعد آپ سے خاص طور سے ملاقات کر کے اِس تقریر اور خیال کی تعریف کی اور خواہش کی کہ اِس باہمی کشمکش اور تُو تُو میں میں کی روئداد جلسہ یا اخبارات میں اِشاعت نہ کی جائے۔ مولوی بشیر الدین صاحب اور سرسید مرحوم کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

اِس مُلاقات کے بعد آپ نے نہایت غور اور تلاش و جستجو سے کالج کے ہر صیغہ کو دیکھا اور یہ معلوم کر کے کہ جو افواہیں سرسید یا کالج کے خلاف مشہور اور پبلک اور اخبارات کا ذریعۂ مشغلہ ہیں اُن کا کوئی وجود نہیں اُن کی ہمدردی سرسید اور اُن کی تحریک سے بڑھی۔ جس میں سلسلۂ آمد و رفت شروع ہونے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات ہونے سے برابر اضافہ ہوتا گیا۔

سرسید مرحوم کا رُعب ایسا غالب تھا کہ عام طور سے کسی شخص کی ہمت اُن کے خلاف تقریر کرنے یا رائے دینے کی نہ پڑتی تھی لیکن مولوی بشیر الدین صاحب پر یہ رُعب غالب نہ تھا اور وہ

اکثر معاملات میں نیک نیتی اور مخلصانہ طور سے سرسید کے خلاف تقریر کرتے یا رائے دیتے رہے۔ سرسید عام طور سے اپنی مخالفت برداشت نہ کرتے تھے۔ مگر آپ کے ایثار۔ محبت اور خلوص کا ایسا اثر تھا کہ آپ کی آزادانہ گفتگو کا برا نہ مانتے تھے۔

خطاب خان بہادری

سنہ ۱۹۱۶ء یا سنہ ۱۹۱۷ء میں لارڈ میسٹن صاحب لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے عہدِ حکومت میں آپ کی تعلیمی خدمات کے صلہ میں خان بہادری کا خطاب مرحمت ہوا

وظیفہ حیدرآباد

سنہ ء سے سرکار نظام حیدرآباد سے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ عطا ہوا جو اب تک مل رہا ہے۔

قومی خدمات

مولوی بشیر الدین صاحب نے جس ایثار و انہماک سے اپنی تمام عمر مخلوق خدا کی خدمت اور قوم کی فوائد و بہبودی میں صرف کی ہے اُس کی نظیر موجودہ مسلمانوں میں اگر بے نظیر نہیں تو کمیاب ضرور ہے، وہ ایک غریب باپ کے بچے تھے جنھوں نے چار روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی۔ ابتدا سے لیکر اِس وقت تک کوئی زمانہ اُن کا فارغ البالی سے نہیں گزرا۔ طرح طرح کی تکلیفیں اور انواع واقسام کی پریشانیاں اور مصیبتیں اُنھوں نے اُٹھائیں اور اُٹھا رہے ہیں۔ اُن کے راستہ میں بہت سی مخالفتیں اور رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ کئی سال تک صوبہ کا حاکم اعلیٰ اُن کا سب سے بڑا مخالف اور اُن کی گرفت کی فکر میں رہا مگر کبھی اُنھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تحریر و تقریر میں جس امر کو سچا اور قوم کی بہبودی کا باعث سمجھا اُس کے اظہار میں صداقت و خلوص سے دوست دشمن یا مخالف و موافق کی تمیز نہیں کی۔ سخت سے سخت خطرے کی حالت میں بھی وہ ثابت قدم رہے اور اُن کا قدم دُنیوی مصلحتوں کی لغزش سے پاک وصاف رہا۔ اُن کا دورِ حیات تا ایں دم مختلف حالتوں میں گزرا۔ ایک زمانہ میں وہ سرسید اور اُن کی تعلیمی اور مذہبی تحریک کے سخت تر مخالفین کی صف میں نظر آتے ہیں تو دوسرے عہد میں اُن کے معتقدین خاص کی مجلس میں۔ ع

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

کے مصداق معلوم ہوتے ہیں۔ ایک صوبہ کا حاکم اعلیٰ اُن کو غلطی سے اگر گورنمنٹ کا مخالف سمجھتا ہے تو دوسرا حاکم اعلیٰ اُن کی قومی اور تعلیمی خدمات کے صلہ میں خان بہادری کا خطاب مرحمت کرتا ہے جو علی العموم طبقۂ اُمرا کے واسطے مخصوص ہے۔ باوجود اس کے امرِ حق کے اظہار میں وہ کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہیں کرتے اور ایسی مجالس میں بھی جہاں متفقہ طور سے کوئی فرد اُن کی رائے سننے یا ماننے پر آمادہ نہیں۔ ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

ڑھتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی یہی صداقت اور عادت اُن کو قومی مجنوں بنائے ہوئے ہے اور اکثر بزرگ ان کو اِس معزز لقب ہی سے موسوم کرتے ہیں۔

منشی فیض احمد مرحوم نے اپنی کتاب "المشاہیر" میں اُن کے اوصاف و کمالات کا مختصر مگر نہایت خوشنما الفاظ میں فوٹو کھینچا ہے، فرماتے ہیں:-

"نہایت ہوشمند۔ نیک خیال۔ زمانہ شناس۔ ملک و قوم کی خدمات میں انتہا درجہ کا پُرجوش۔ اسی دُھن میں اپنی ہستی کو مٹائے عافیت کو برباد کئے ہوئے۔ دیکھنے میں بہت ہی بے تکلف پرلے درجہ کا سیدھا پر نہایت ہی آزاد۔ حُبِ قومی میں دل دادہ۔ ہر دل عزیز۔ سب کا پیارا۔ غرضکہ عجیب و غریب شخص ہے۔ نہ صرف اپنے خاندان بلکہ تمام قوم میں اپنے اوصافِ خاص میں عزیز الوجود اور اپنا آپ ہی نظیر ہے۔ باوصف نحافت و قصرِ قامت پُر دماغ۔ بلند خیال۔ عالی ہمت "ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" اس فقرہ کا پورا مصداق ہے۔ گرہ میں کوڑی نہ پیسہ پر قومی بہبودی کے بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی اور بھاری سے بھاری بوجھ اُٹھا لینے میں نہایت دلیر ...... قوم کی دُھن میں اس چھوٹے سے کیکل کے مرسید نے وہ کام کئے ہیں جو بڑوں سے نہیں ہوسکتے ...... فکر اچھی۔ خیالات نیک۔ زبان گویا۔ دل۔ قوی ہمت۔ بلند حوصلہ۔"

سودیشی تحریک

اِس زمانہ میں سودیشی تحریک کا زور و شور ہے اور دیسی ساخت کے پارچہ خصوصاً کھدر پوشی کو مہاتما گاندھی کی باعظمت تحریک اور رسائی ذہن کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اور موجودہ سیاسی تحریک میں گورنمنٹ کے مقابلہ میں سب سے بڑا آلہ سمجھا جا رہا ہے۔ مگر بہت کم لوگوں کو اِس کا علم ہوگا کہ آج سے نصف صدی بیشتر ۱۸۸۰ء میں ایک نوجوان مسلمان مجنوں قوم نے اپنے ملک کی صنعت و حرفت کی عام بربادی اور روز افزوں تنزل سے متاثر ہو کر ایک انجمن "معین صنعتِ ہند"

انجمن صنعتِ ہند

کے نام سے قائم کی تھی جس کے مقاصد میں ہندوستان کی عام صنعتوں کے علاوہ صنعت پارچہ بافی کے بقا و ترقی پر خاص زور دیا گیا تھا۔ انجمن کا ہر ممبر تحریری حلف نامہ داخل کرتا تھا کہ صرف دیسی ساخت کے کپڑے استعمال کرے گا اور امکانی کوشش دیسی مصنوعات کی ترقی میں کرے گا۔ اس انجمن میں پچاس ممبر تھے۔ جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ اِٹاوہ میں اِس انجمن کی کوشش اور عملی تائید سے صنعت پارچہ بافی کو بہت ترقی ہوئی اور وہاں کی موجودہ مشہور [illegible] مولوی [illegible] صاحب نے ہندوستا

یٔ مختلف مقامات سے دیسی کپڑوں کے عمدہ عمدہ نمونے منگواکر کپڑے بنوائے اور لاگت پر ممبران میں
وخت سکئے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں کے صناع بطور خود اس کام کو کرنے لگے۔ اگرچہ مسلمانوں میں
ہتی سے عام طور پر یہ تحریک بارآور نہ ہوئی لیکن مولوی بشیر الدین صاحب اور اُن کے گھر والے
ایت سختی سے اِس کے اب تک پابند ہیں اور سر سے پاؤں تک خالص سودیشی نظر آتے ہیں۔

مولوی بشیر الدین صاحب علی العموم سرسید مرحوم کی تحریکات کے پُرجوش حامی بلکہ عاشق تھے
راکثر مذہبی مسائل کے علاوہ انگریزی تمدن کے سخت مخالف اور اُس کو قومی تباہی اور بربادی کا
بردست پیش خیمہ سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر میں اُس کی مخالفت کرتے رہے۔ افسوس کہ
مانہ کی روش اور مسلمانوں کی بدقسمتی سے اِس مخالفت کا کچھ اثر نہ ہوا اور آج اُس کے بُرے نتائج
سلمان بھگت رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک بھگتیں گے۔

کمپنی افزائش نسل مویشیاں مسلمانوں کی تجارتی کساد بازاری سے متاثر ہو کر اپنی برادری اور احباب
کے مشترکہ سرمایہ سے ۱۸۹۶ء میں ایک کمپنی موسومہ "افزائش نسل مویشیان"
ی قائم کی تھی جس کا دفتر اٹاوہ میں اور کاروبار مضافات اٹاوہ میں شروع ہوگیا تھا مگر بدقسمتی سے اسی
سال قحط پڑگیا جس کی وجہ سے دانہ اور چارہ میسر نہ آسکا اور بہت سے مویشی فوت ہوگئے اور سرمایہ کا
ڑا حصہ برباد ہوگیا جس کی وجہ سے مجبوراً کمپنی کو توڑنا پڑا اور آیندہ اس قسم کے کاروبار کی ہمت نہ ہوئی۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ مولوی بشیر الدین صاحب کی قومی خدمات یا کارناموں میں سب سے بڑا اور
شاندار کارنامہ جس کو ان کی کرامات کہنا یا سمجھنا زیادہ موزوں ہے "اسلامیہ
ئی اسکول اٹاوہ" کا وجود ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب میں قومی خدمات کا شوق و ذوق تو بچپن
سے تھا۔ سرسید مرحوم کی صحبت سے اُس میں مزید ترقی اور جلا پیدا ہوگئی۔ ۱۸۸۳ء میں وہ بحیثیت
ڈیٹر "نجم الاخبار" اٹاوہ آئے۔ جہاں عالمگیر کے عہد میں اُن کے جدِ مادری نواب خیر اندیش خاں حاکم
تھے جنھوں نے یہاں رفاہ عام کے واسطے ایک عالی شان شفاخانہ تعمیر اور جاری کیا تھا۔ یہاں آکر
نھوں نے مسلمانوں کی عام پس ماندگی، افلاس و جہالت کی حالت دیکھی اور یہ معلوم کرکے کہ غدر کے
مانہ یعنی ۱۸۵۸ء سے یہاں گورنمنٹ انگریزی اسکول قائم ہے۔ مگر اب تک صرف ایک مسلمان لڑکا
امیاب ہوا ہے اُن کے تعجب اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ دیسی زبان کے سرکاری مدرسہ میں اُس وقت
ک صرف ہندی زبان میں تعلیم ہوتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں پر اُس کے دروازے بند تھے۔ پہلی
وشش اُنھوں نے یہ کی کہ حاجی ممتاز علی خاں مرحوم کے ذریعہ سے کوشش کرکے اردو کی تعلیم جاری کرائی

اور وہاں مسلمانوں کی تعلیم کا دروازہ کھولا۔ پھر انگریزی اسکول میں مسلمان بچوں کے داخلہ کی کوشش کی مگر اس میں اُن کو ناکامیابی ہوئی اور آخر میں یہی ناکامیابی اسلامیہ اسکول کے وجود کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم اور مولوی بشیرالدین صاحب میں اخبار نویسی کے سلسلہ سے تعارف حاصل تھا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ حُسن اتفاق سے اُن سے ملنے اٹاوہ آئے۔ آپ نے اِس موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن کے دورانِ قیام میں ایک جلسہ منعقد کرا کر اُن کی تقریر کرائی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک انجمن اسلامیہ قائم ہوئی۔

انجمن اسلامیہ اٹاوہ

جس کے سکریٹری منشی صادق حسین صاحب مختار اور نائب سکریٹری مولوی بشیرالدین صاحب منتخب کئے گئے۔ اشاعت تعلیم۔ اصلاح رسوم۔ تجہیز و تکفین لاوارثان۔ امداد یتامیٰ اس انجمن کے مقاصد قرار پائے۔ کچھ مدت تک انجمن کے برائے نام سکریٹری منشی صادق حسین صاحب رہے۔ مگر اصل کارکن اور روح رواں مولوی بشیرالدین صاحب ہی تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اتفاق سے نواب محسن الملک مرحوم حیدرآباد سے اپنے وطن اٹاوہ میں تشریف لائے۔ انجمن کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک ایڈریس دیا گیا جس کے جواب میں موصوف نے ہر قسم کی امداد کا وعدہ اور خوشنودی کا اظہار کر کے ہمت افزائی فرمائی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ مبلغ پانچسو روپیہ کا عطیہ بھی مرحمت فرمایا۔

۱۴ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایک کرایہ کے مکان میں چندہ سے اسلامیہ اسکول کا افتتاح عمل میں آیا اور حسب ذیل اسٹاف مُہیا کیا گیا۔ مدرس انگریزی عہ ۱۵ ماہوار۔ ایک مولوی ۱۲ ماہوار۔ ایک مولوی ۱۰ ماہوار۔ مدرس قرآن مجید ۵ ماہوار۔ مدرس حساب ۵ ماہوار۔ بمشکل گھیر گھار کر چند طلبہ جمع کئے گئے۔

اسکول کی موجودہ عمارت کی اراضی مولوی محمد محسن صاحب مرحوم کاکوروی وکیل مین پوری کی ملکیت تھی اور اُس میں اُن کے دادا کی قبر تھی۔ اُن کا ارادہ اِس جگہ ایک عربی مدرسہ بنانے کا تھا مولوی بشیرالدین صاحب کی اِستدعا پر اُنھوں نے یہ اراضی اسکول کو دیدی۔

منشی نصیرالزماں خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس ساکن رائے پور تحصیل قائم گنج ضلع فرخ آباد سے مولوی بشیرالدین صاحب کی دوستی تھی ۱۸۹۵ء میں انکے بھائی منشی محمد زماں خاں صاحب وکیل کے مبارک ہاتھوں سے اسکول کی موجودہ عمارت کی بُنیاد رکھی گئی۔ مبلغ ایک ہزار پانچسو روپیہ (۱۵۰۰) کا عطیہ بھی موصوف نے مرحمت فرمایا۔

ابتدا میں صرف آٹھویں درجہ تک تعلیم کا انتظام تھا۔ ۱۸۹۹ء سے ہائی اسکول تک ترقی ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں مسٹر ماریسن مشہور پرنسپل علی گڑھ کالج کی کوشش سے اِس کا الحاق سررشتہ تعلیم سے منظور

وابستہ ۱۹۲۳ء تک محض توکل پر کام چلتا رہا اور گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں لی گئی سنہ ۱۹۲۴ء سے گورنمنٹ کی امداد لینا منظور کی گئی۔

معاونین اوّل

یوں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے چھوٹے بڑے چندوں اور امداد و ہمدردی سے اسلامیہ اسکول موجودہ درجہ پر پہنچا ہے۔ لیکن اس کی امداد و ہمدردی اور معاونین میں اصحاب ذیل کو اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا فخر حاصل ہے۔ اللہ پاک ان صاحبان کو بہترین جزا مرحمت فرمائے۔ آمین۔

خان بہادر سید منور حسین صاحب انجینیر۔ [2] حاجی محمد ممتاز علی خاں صاحب مرحوم۔ خان بہادر حافظ [3] فتح اللہ خاں صاحب مرحوم۔ [4] میر محمد حسین صاحب شوق۔ [5] میر نثار حسین صاحب سب اوورسیر۔ منشی [6] محمد زماں خاں صاحب وکیل۔ [7] منشی محمد طیب صاحب انسپکٹر پولیس۔ [8] شیخ عنایت حسین صاحب مرحوم مختار۔ [9] حکیم قربان حسین صاحب سوداگر چرم۔ [10] حافظ محمد حلیم صاحب سوداگر چرم اور مولانا سید طفیل احمد صاحب جسٹرار۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نہ صرف صوبہ متحدہ بلکہ غالباً تمام ہندوستان کے اسلامیہ اسکولوں میں خاص فوقیت رکھتا ہے، یہ ایک فردِ واحد کی جو دُنیوی حیثیت سے کوئی وجاہت نہیں رکھتا تھا مسلسل کوشش و ہمت اور اُولوالعزمی و ایثار اور حُسنِ انتظام اور کفایت شعاری کا بہترین نمونہ ہے اس کی عالی شان عمارت مسلمانوں کی موجودہ مالی حالت اور معمولی چھوٹے چھوٹے چندوں کے لحاظ سے مدتوں تک بانی کی نیک نیتی۔ خوش انتظامی۔ بلند ہمتی اور عمارتی واقفیت کی یادگار رہے گی۔ یہ کوئی معمولی ہائی اسکول یا مقامی درسگاہ نہیں بلکہ اس کی شہرت و حالت مرکزی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہے اور تقریباً ہندوستان کے ہر حصہ اور دُور و دراز مقامات کے طلبہ اس سے فیض اُٹھا رہے ہیں۔ یہ پہلا اور غالباً اس وقت تک آخری اسکول ہے جو علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کے نمونہ پر خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا كَدَرَ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اقامتی اُصول پر جاری ہے اور جس کے تقریباً کُل طلبہ بورڈر ہیں جن کی مذہبی۔ اخلاقی اور تمدنی حالت پر خاص توجہ کی جاتی ہے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر سید محمود یہیں کے فارغ ہیں۔

مولوی بشیر الدین صاحب بدقسمت۔ تنزل پذیر مسلمان قوم کے ایک فرد ہیں۔ جس کے بازار میں ایثار تقریباً نایاب ہے۔ کیونکہ کوئی اُس کا خریدار نہیں۔ جس چیز کا کوئی خریدار نہیں وہ بازار میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگر کسی دوسری قوم کے کسی فرد کا ایسا کارنامہ ہوتا تو اُس کی قوم اُس کو سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ سونے کے تول تولتی اور اُس کی امداد و ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتی۔ یہاں کس مپرسی کا عالم ہے۔ مشکلات پر مشکلات۔ مصیبت پر مصیبت۔ پریشانی پر پریشانی پیش آ رہی ہے۔

اخراجات روزافزوں، آمدنی روز کمی پر ہے۔ بہتیرا اینچا چلایا جاتا ہے مگر کوئی خبر نہیں لیتا۔ کس قدر افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ مسلمان ابتک صوبہ کے اِس بہترین اسکول کو بھی اعلیٰ درجہ کا کالج تو کیا معنی انٹرمیڈیٹ کالج تک نہیں بنا سکے۔ اب مولوی بشیر الدین صاحب کے بھتیجے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ نے اٹاوہ میں مستقل سکونت اختیار کر کے کمر ہمت باندھی ہے: دراُمید کی خفیف مگر خوشنما جھلک نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ اُن کی کوششیں جلد بار آور ہوں، اور اسکول جلد از جلد کالج کے مرتبہ پر پہنچے۔ آمین۔

علمی عجائب خانہ

مولوی بشیر الدین صاحب کا دوسرا عملی کارنامہ وہ نایاب علمی عجائب خانہ ہے جو گریسی میوزیم کے نام سے موسوم ہے، اِس کا افتتاح مسٹر گریسی صاحب کلکٹر اٹاوہ کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اِس میں نہایت نادر و نایاب قلمی کتابیں۔ فرامین اور اکثر دیگر قدیم اسلامی صناعیوں کے نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے تمام ہندوستان میں سفر کر کے یہ بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ فرامین شاہی کا تو اتنا بڑا مجموعہ غالباً ہندوستان میں کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ افسوس کہ مولوی صاحب کی مسلسل علالت پے درپے خانگی صدمات۔ ضعیف العمری اور اسکول کی دیگر مصروفیتوں کے باعث اِس بیش قیمت کتب خانہ ...... اور فرامین کی فہرست جدید طریقہ پر مرتب نہیں ہو سکی نہ اُنھیں کوئی ایسا مددگار یا ملازم دستیاب ہو سکا جو عمدہ طور سے اس کام کو انجام دے سکتا۔

تعلیم صنعت و حرفت

مولوی بشیر الدین صاحب کو صنعت و حرفت کی تعلیم کا بھی خاص خیال ہے اور وہ متعدد اسکیمیں اس کے متعلق بنا اور بگاڑ کر چکے ہیں مگر بیچارے "گانٹھ نہ مٹھی پھڑ پھڑا اُٹھی" کے مصداق ہیں اپنی عالی ہمتی سے ایک مرتبہ پارچہ بافی کا اسکول کھولا جو آخر کار کافی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد پھر ہمت باندھی اور نجاری کا اسکول کھول دیا ہے جو اِس وقت تک بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے جملہ قومی خدمات کا انحصار اِس مختصر مضمون میں ناممکن ہے وہ تقریباً ہندوستان کی تمام اسلامی تعلیمی سیاسی اور مذہبی تحریکات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے ہر اجلاس میں شریک اور "پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے بانی اور سکریٹری۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور خدا معلوم کس کس دیگر انجمنوں کے ممبر ہیں۔ باوجود پیرانہ سالی نہایت جواں ہمت اور جہانیانِ جہاں گشت ہیں۔ سفر کو بجائے سقر کے باعث ظفر سمجھتے اور ہر ایسے اسلامی جلسے میں جو اُن کے خیال میں مسلمانوں کی ترقی اور بہبودی کا باعث ہو سکتا ہے۔ خواجہ خضرؑ کی شکل میں

نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ مدت دراز تک اُن کو تندرست اور زندہ رکھے۔ آمین۔

مضمون نگاری۔ اخبار نویسی۔ شاعری

مولوی بشیر الدین صاحب کی عمر دس برس کی تھی کہ ایک مرتبہ اُن کے والد بیمار ہوئے یہ اُن کی دوا لینے کے واسطے عطار کی دوکان پر جایا کرتے تھے سب سے پہلے وہاں ردّی میں آپ کو اخبار دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا اور مضمون نویسی کا ذوق و شوق پیدا ہوا ۱۸۷۵ء میں تعلیم کے واسطے بریلی گئے۔ مولوی فدا حسین صاحب مرحوم منصف کے پاس متعدد اخبار آتے تھے وہاں خوب اخبار بینی کی اور سب سے پہلا مضمون اسی سنہ میں "نجم الاخبار" میرٹھ میں شائع کرایا۔ اس کے بعد "وکٹوریا گزٹ" "سیالکوٹ" "طوطی ہند" میرٹھ وغیرہ اخبارات میں مضامین شائع کراتے رہے۔ اُسی زمانہ میں سر سید کی تحریک شروع ہوئی تھی اور اخبارات کا سب سے بڑا مشغلہ اور ذریعۂ اشاعت سر سید کی مخالفت میں مضامین شائع کرنا اور اُن پر پھبتیاں اُڑانا تھا۔ چنانچہ اسی مضمون پر آپ بھی "طوطی ہند" میرٹھ میں قلم فرسائی فرمایا کرتے تھے۔ ملک میں آپ کے یہ مضامین بے انتہا مقبول اور پسند کئے جاتے تھے جو آپ کی ہمت افزائی کا باعث تھے۔ یہی مضامین ۱۸۸۳ء میں آپ کی "نجم الاخبار" اٹاوہ کی اڈیٹری کا سبب ہوئے۔ جہاں ۱۸۸۸ء تک زیادہ تر اسی مضمون پر آپ اپنا زور قلم دکھاتے رہے ۱۸۸۹ء میں یہ دَور جہالت ختم ہوا اور آپ سر سید کے نظر بُسحر سے مسحور ہو کر اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل اور فرقۂ نیچری میں شامل ہوئے۔

"نجم الاخبار" کی اڈیٹری کے زمانہ میں آپ موجودہ اصطلاح کے مطابق پکّے قوم پرست تھے۔ کانگرس اور ہندو مُسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اور اب بھی بدستور ہیں۔

البشیر اٹاوہ

۱۸۹۷ء میں "نجم الاخبار" کے مالکان سے اخبار کی پالیسی کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور آپ نے اُس کی اڈیٹری سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اخبار نویسی یا اڈیٹری کا نشہ ایسا نہیں کہ زائل ہو سکے۔ لہٰذا باوجود بے سروسامانی کے فروری ۱۸۹۹ء میں آپ نے اپنا ذاتی اخبار "البشیر" جاری کیا جو بچپن۔ نوجوانی۔ جوانی کے پُرجوش و شاندار مراحل طے کر کے اب شیخوخیت کی حالت میں آپ کی رفاقت کا حق ادا کر رہا ہے۔

اُردو اخبارات میں سب سے پہلے صرف البشیر کو انگریزی خواں معزز طبقہ اور حکام میں مقبولیت عام کا فخر حاصل ہوا۔ اِس ہفتہ وار اخبار کے لیڈنگ آرٹکلوں کا ناظرین کو ہفتہ تک اشتیاق و انتظار رہتا تھا۔ متانت۔ سلامت روی۔ با اصولی۔ قومی ہمدردی اور سر سید کی تعلیمی تحریک کی اشاعت میں یہ بے نظیر اخبار برسوں مقبولِ عام رہا۔ لارڈ میکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اپنے

عہدِ حکومت میں جب ہندی کو اردو کا ہم پلّہ بنا دیا تو اُردو و ہندی کے مسئلہ پر متواتر سنوا کے قریب لاجواب مضامین (لیڈنگ آرٹیکل) اُردو کی حمایت میں اِس میں شائع ہوئے۔ مشہور ہے کہ لارڈ میکڈانل صاحب پابندی سے البشیر کے مضامین کا ترجمہ اِس غرض سے مُلاحظہ کرتے رہے کہ کسی قانونی گرفت میں اڈیٹر کو پھانس سکیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

تعلیمی اُمور میں البشیر سرسیّد مرحوم کی پالیسی کا مقلّد اور سیاسی میں نیشنل کانگرس کا حامی رہا۔ جو اصحاب اس اخبار کو اُس کی جوانی کے عالم میں پڑھ چکے ہیں وہ اب تک اُس کے پُرجوش تعلیمی۔ اخلاقی۔ سیاسی اور تمدّنی مضامین کو یاد کرتے ہیں۔ البشیر کے گزشتہ فائل مولوی بشیرالدین صاحب کی عام اور ادبی قابلیت کی بہترین یادگار ہیں۔

مولوی بشیرالدین صاحب اپنے موجودہ تعلیمی انہماک اور فرائض کی وجہ سے اگرچہ عملاً سیاسی امُور سے دستکش ہیں مگر ذاتی طور سے وہ موجودہ سیاسی تحریک کے حامی اور "انڈیا فار انڈینس" (ہندوستان ہندوستانیوں کے واسطے ہے) کے مؤید خاص ہیں۔

شاعری مولوی بشیرالدین صاحب کے کثیرالاحباب اصحاب میں غالباً بہت کم اصحاب کو اِس کا علم ہوگا کہ ایامِ جہالت میں آپ کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ جس کی ابتدا ۱۸۷۵ء میں بریلی کالج کے کلاس روم میں ہوئی تھی یہ کلاس میں زیادہ تر مشق سخن کی مشقیں حل کیا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے اور فخر یہ اپنے اشعار سُنایا کرتے تھے۔ تاریخ نکالنے کا اچھا مادّہ پیدا ہوگیا تھا۔ جب قومی خدمات کا زیادہ جوش ہوا اور سخن فہمی کی قابلیت پیدا ہوئی تو یہ خیال کرکے کہ میں اچھا شاعر نہیں ہوسکتا شاعری سے توبہ کرلی اور اپنا تمام کلام ضائع کردیا۔ آپ نے اپنا تخلص عاقل رکھا تھا۔ آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو جو بمشکل تمام مُہیا کیا گیا ہے۔ ایامِ جہالت میں سرسیّد مرحوم کی تعریف یا ہجو میں فرماتے ہیں ؎

ڈانٹ کر جاکٹ و پتلون بنے صدرِ صدور — اُردو ہوتا تیرا قانون پلٹ دیتے ضرور
پر قرآں میں نہ تغیر تھا خدا کو منظور — زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

دیگر

منہ میں جلتا ہوا پائپ تھا بنیٹی سے نہ کم — تھا گلوبند و کالر جنھیں پٹہ کہیں ہم
شکل بُلڈاگ کی اِس وہم سے یا شاہِ اُمم — نسبتِ اُو بہ سگت کردم و بس منفعلم

[illegible]

دہرے یادِ رُخِ پُر نُور سر دَر لے چلا | ہیں اندھیرے کے لئے مشعل جلا کر لے چلا
داغِ ہجراں۔ دردِ فرقت۔ رشکِ دشمن اشکِ غم | الغرض میں آفتوں کی پوٹ بھر کر لے چلا
.. .. | صدمے کیا کیا عشق کے اللہ اکبر لے چلا
میں نے مجنوں کو اٹھایا مجھکو مجنوں لے چلا | مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا

جب سوا نیزہ پہ ہوگا روزِ محشر آفتاب | مجھ کو ہوگا سایۂ لطفِ پیمبر راستہ

جب میں عاقل بیٹھتا ہوں لکھنے نعتِ مصطفٰے | چوم لیتا ہے میرے خامہ کو جھک کر آفتاب

مذہبی اور اخلاقی حالت مولوی بشیر الدین صاحب بہ لحاظ خاکساری۔ انکساری۔ غیر تعصبی۔ سادگی۔ صوفی مشرب ہیں اُن کے کثیر الاحباب اصحاب میں امیر سے امیر اور غریب سے غریب۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ۔ جاہل۔ ہر مذہب و ملت اور مختلف الخیال اصحاب شامل ہیں۔ وہ سب سے اِس خلوص و محبت سے ملتے ہیں کہ ہر شخص اُن کو اپنا سچا دوست اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ اُن کی دلی تمنا اور آرزو ہے کہ اُن کے سب احباب اور اسکول و بورڈنگ کے جملہ اساتذہ اور ملازم یکساں طور پر مثل ایک خاندان کے محبت و اخلاص سے رہیں اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے درد دکھ اور شادی و غم میں شریک رہیں وہ حتی الامکان خود اِس پر عامل ہیں اور شب و روز اس کی تحریک میں سرگرم رہتے ہیں۔ مذہباً حنفی المذہب ہیں۔ شرک و بدعت سے متنفر اور سچے توحید پرست ہیں۔ تمام عمر رسومِ بد کی اصلاح میں کوشش فرماتے رہے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم گنج مُراد آبادی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے اور وظیفہ کے واسطے استدعا کی۔ موصوف نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا موجودہ ورد و وظیفہ یعنی خدماتِ قومی سب سے بہتر وظیفہ ہے۔ مسلمانوں کی خدمت سے بڑھکر اور کوئی وظیفہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کے اِس ارشادِ عالی سے خدماتِ قومی کا مزید جوش پیدا ہوا اور اب یہ حال ہے کہ چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے، اِسی نشہ میں سرشار اور سوچ بچار میں مستغرق رہتے ہیں اور جب کوئی ہمدرد مل جاتا ہے تو قومی معاملات اور تجاویز میں گھنٹوں اُس سے تبادلۂ خیالات کرتے اور اپنے پُر درد دل کی کہانیاں سُنایا کرتے ہیں اور ایسے محو ہوجاتے ہیں کہ کھانے پینے تک کی بھی فکر نہیں رہتی۔

درمیانی عہد میں کچھ عرصہ تک قومی خدمات کا ایسا غیر معمولی جنون بڑھا کہ خود رفتگی کی حالت پیدا ہو کر مذہبی فرائض سے غفلت رہی مگر اب عرصہ سے نہایت پابند صوم و صلوٰۃ اور روزانہ پابندی سے باترجمہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے اور نکاتِ قرآنی کے سمجھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

اختلافی مسائل میں علماء کی کشمکش اور بحث و مباحثہ اور باہمی مذہبی مناظرہ کو افسوس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندو منعقد اٹاوہ کے اجلاس میں آمین بالجہر کا ایک مقدمہ دائر تھا اُس کی باہمی تو تو میں میں کو دیکھ کر اس قدر رنجیدہ اور متاثر ہوئے کہ اس قسم کے اختلاف دُور کرنے کی کوشش میں مختلف علما سے خط و کتابت شروع کی اور اُن سے ملے مگر کسی پر اُن کا رنگ نہ چڑھا۔ سلسلہ [illegible]ء میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے زیرِ صدارت "مدرسۂ فیض عام کانپور" میں دستاربندی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے مشاہیر علماء مولانا محمد علی صاحب کانپوری۔ مولانا عبدالحق صاحب مؤلف تفسیرِ حقانی اور مولانا سید سلیمان صاحب پھلواری وغیرہ شریک تھے۔ مولوی بشیر الدین صاحب کسی ایسے موقع کی تاک میں تھے فوراً جا پہنچے اور اسی بحث پر جلسہ میں ایسی پُر درد اور پُرجوش تقریر کی۔ کہ صدرِ جلسہ اور سامعین متاثر ہو کر رونے لگے۔ اسی تقریر کے بعد آپ کی تحریک سے علماء کی کانفرنس کا انعقاد منظور ہوا۔ مولانا محمد علی صاحب کانپوری کی تائید و امداد بھی اس تحریک کی کامیابی کا باعث ہوئی اور اس طرح "ندوۃ العلماء" کی بُنیاد پڑی اور دوسرے سال ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

اولاد

[illegible]۷۷ء میں مولوی بشیر الدین صاحب کی شادی ہوئی اور سنہ [illegible] میں اُن کی رفیقۂ حیات نے رفاقت سے منہ موڑ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے بشیر احمد اور بشیر پاشا اپنی یادگار چھوڑے۔ مولوی بشیر الدین صاحب کی خانگی زندگی بھی قابلِ تقلید اور لائقِ داد ہے۔ اُن کی عمر کا بہت بڑا حصہ کمال عسرت میں بسر ہُوا۔ مگر جہاں تک علم ہے کبھی اُنھوں نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور اپنی آمدنی کے مطابق سادہ سے سادہ طرزِ معاشرت اختیار کر کے اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ غریب اعزا اور دیگر اہلِ احتیاج پر صرف کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ سے اپنے چھوٹوں پر باپ کی طرح شفیق ہیں اور بڑوں کی پوری عزت کرتے ہیں۔ مہمان نوازی۔ غربا پروری۔ اُن کا خاص وصف ہے۔ نام و نمود سے متنفر اور نہایت صابر و شاکر بزرگ ہیں۔ اس ضعیف العمری کی حالت میں پے در پے دو جوان شادی شدہ لڑکیوں نے انتقال کیا۔ بڑا لڑکا فاتر العقل ہو گیا۔ چھوٹے اور ہونہار بیٹے بشیر پاشا مرحوم نے جو بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی پاس اور نہایت ذکی۔ بلند خیال۔ عالی ہمت اور صالح نوجوان تھا اور جس سے نہ صرف اُس کے ضعیف العمر باپ بلکہ کل قوم کی بہت سی اُمیدیں

وابستہ تھیں، ایسی حالت میں کہ باپ اور براتی مارہرہ سے اُس کی شادی کر کے اور دُلھن کو رخصت کرا کر اٹاوہ لا رہے تھے، اٹاوہ کے قریب ریل سے گر کر ایسا صدمہ اُٹھایا کہ چوتھے پانچویں دن داغِ مفارقت دے گیا۔ یہ پُر درد حادثہ ایسا تھا کہ ضعیف العمر باپ اور اعزا کا تو کیا ذکر جس نے سُنا کلیجہ تھام لیا۔ تمام ہندوستان میں جہاں جہاں اُس مرحوم یا اُس کے باپ کے احباب و شناسا تھے ایک عام تہلکہ مچ گیا۔

اخباروں میں رنج و افسوس اور تعزیت کے پُر درد مضامین شائع ہوئے۔ مگر آفریں ہے اِس صابر و شاکر بزرگ باپ پر کہ اُس نے اِن سب صدمات کو کمال صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا اور قومی خدمات سے مُنھ نہ موڑا۔ کسی بزرگ نے سچ کہا ہے ؎

آزمایش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اُسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

(سعید احمد مارہروی)

تاریخی نوادر

آگرہ کی شاہی عمارات اور اُنکے کتبات

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ جہاں بادشاہ کے چار لڑکے تھے :۔
ایک دارا شکوہ۔ دوسرا شاہ شجاع۔ تیسرا اورنگ زیب عالمگیر۔ چوتھا مراد بخش۔
اور چار لڑکیاں تھیں :۔
ایک انجمن آرا۔ دوسری گیتی آرا۔ تیسری جہاں آرا۔ چوتھی دہر آرا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ دہر آرا پیدا ہونے سے پہلے ممتاز محل کے پیٹ میں روتی تھی۔ بیگم صاحبہ اُس کا رونا سُنکر اپنی زندگی سے مایوس ہوگئیں۔ شہنشاہ کو اپنے پاس بلایا اور گریہ وزاری کے عالم میں فرمایا:

رُباعی

ایام وداع و افتراق است امروز | بادر فراق اتفاق است امروز
اے دیدہ جمال یار دیدی یک چند | خوں بار کہ نوبتِ فراق است امروز

یہ بات مشہور ہے کہ جب بچہ پیٹ میں روتا ہے اُس کی ماں ہرگز نہیں بچتی۔ اب یہی میری قسمت میں ہے کہ جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کروں۔ اے بادشاہ۔ میرے کہے سُنے کو معاف فرماؤ۔ اور جو قصور سرزد ہوا ہو، بخش دو کہ عنقریب سفر کرنے والی ہوں۔

جب بادشاہ نے جدائی کی اور رنج کی باتیں سُنیں۔ بے شمار محبت والفت کے تقاضے سے نعرہ مارا اور مینہ کی طرح اپنی آنکھوں سے آنسو برسانے لگا ؎

عالم گریہ چہ سال آہ بہ تحریر شود | ور نویسیم چہ مقدور کہ تقریر شود

افسوس۔ صد افسوس۔

القصہ بیگم صاحبہ ارجمند بانو بیگم نے گریہ وزاری کے بعد فرمایا کہ اے بادشاہ قید کے زمانہ میں میں تمہارے ساتھ رہی اور اب کہ خدائے عزوجل نے تمہیں بادشاہی عطا فرمائی اور جہاں کا حکمراں بنایا میں حسرتوں سے بھری ہوئی انتقال کرتی ہوں۔ اور جاتی ہوں۔

میری دو وصیتیں ہیں۔ اُمید ہے کہ قبول ہوں گی۔ بادشاہ نے اقرار کرکے پوچھا۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو چار لڑکیاں اور چار لڑکے عطا فرمائے ہیں۔ نام و نشان کے لئے یہی کافی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دوسری نسل کسی سے پیدا ہو جو آپس میں لڑے۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ میرے لئے ایسا مکان تعمیر ہو جو روئے زمین پر نایاب ہو۔ اور نہایت عمدہ اور عجیب و غریب ہو۔

اعلیٰ حضرت نے دونوں وصیتیں دل وجان سے قبول کیں۔

جب دہر آرا پیدا ہوئی۔ بیگم صاحبہ کا دل مٹھیوں میں تھا۔ اُسی وقت بیگم صاحبہ انتقال کر گئیں۔ اور جنت کی حوروں کے ساتھ باغ فردوس میں ملیں ؎

نماند بگیتی کسے جاوداں　　ز دستِ اجل کس نہ بُرد ست جاں
نہ بست است پیماں بکس روزگار　　کہ نگسست آنرا بہنگام کار
چہ خوش گفت آں کاملے نکتہ سنج　　کہ از گوہر دانش اندوخت گنج
جہاں اے برادر نماند بکس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

انتقال کے بعد بیگم صاحبہ کو چھ مہینے روضے سے باہر چوک کے دروازے پر دوسری زمین میں امانت رکھا۔ مقبرے کے نقشوں کے کاغذات ہر ایک استاد لاتا تھا۔ اور پیش کرتا تھا۔ ایک نقشہ بادشاہ کو پسند آگیا۔ اُس کے موافق عمدہ لکڑی کا روضہ تیار ہوا۔ اُس کے بعد روضۂ مقدسہ مطہرہ کا نقشہ عجیب و غریب پتھر دل سے کل سترہ برس میں تعمیر ہو کر آراستہ ہوا۔

تاریخ انتقال بیگم صاحبہ ممتاز محل

زیں جہاں رفت چو ممتاز محل　　در جنت بر خش حور کشاد
بہر تاریخ ملائک گفتند　　جائے ممتاز محل جنت باد
سنہ ۱۰۴۰ھ مقدس

تصنیف شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی در تعریف روضۂ منورہ مقدسہ مطہرہ ممتاز محل یعنی ارجمند بانو بیگم

زہے مرقدِ پاک بلقیس عہد　　کہ بانوئے آفاق را گشتہ مہد
منور مقامے چو باغِ بہشت　　معطر چو فردوس عنبر سرشت

بصحنش ز خالِ معنبر بحور / بجاروب مژگان درش گفته حور
هوا برنگارست دیوار و در / هوا تازه و تر ز آبِ گهر
عمارت گر این مقدس جناب / ز سرچشمهٔ فیض آورده آب
برین بقعهٔ پاک و الا مقام / ترشح کنان ابرِ رحمت مدام
اجازت کند از پئے هر نزول / قبول است این جا عبادت قبول
سراسر مقیمانِ این بارگاه / به مهمان نوازی مثل در جهان
هوائے گرت هست در سر بیا / که بے فیض نگذشت زین در صبا
شگفته گلِ مغفرت باغ باغ / ز بوئے گلش قدسیان تر دماغ
نخندد گل اینجا مگر در نقاب / نبارد مگر ابرِ رحمت سحاب
اگر مجرم آرد به این در پناه / شود همچو مغفور پاک از گناه
تبسم بود غنچه اش را هوس / نسیمش نخیزد بتحریک خس
هوایش ز عفت حجاب آفرین / نسیمش ز غنچه است خلوت نشین
نگیرد کسے برکس این جا پناه / برین روضه وقف است عفوِ اله
در دیا ربی از دلے سر نزد / که آمرزشش حلقه بر در نزد
اگر عاصی آرد باین روضه رو / کند نامهٔ خویش را شست و شو
ز رقت بنظارهٔ این مزار / شود چشم خورشید و مه اشکبار
درین بارگاهِ فلک احتجاب / زر و زینه داران یکے آفتاب
فلک رزق خود از درش چشم داشت / که هر شام می گیرد و هر چاشت
خداوند روزی رسانِ حیات / برین در کند رزق مردم برات
بقایش ازین سایهٔ سر نداشت / قضا صورتِ این بنا را نگاشت
نمود این عمارت بنا روزگار / که ظاهر شود قدرتِ کردگار
اساسش بود چون زمین پایدار / چو بانیِ صاحبِ لال استوار
ندانم به نیرنگ رنگش که ریخت / گهر ریختن در بنایش که بیخت
چو در سلکِ هاشش پرداختند / برائے بقا مامنے ساختند

چو دستِ بقا این بنا رنگ ریخت
خرد از رهِ حشت بهیه اگر بخت

ابیات سکندره که بالائے مقبرهٔ حضرت اکبر بادشاه نوشته

بنامِ شهنشاهِ ملکِ قدم ‏ ‏ ‏ ‏ که ذاتش مبرا بود از عدم
همه بادشاهانِ روئے زمین ‏ ‏ ‏ ‏ ازو صاحبِ تاج و تخت و نگین
کند از عدم آشکارا وجود ‏ ‏ ‏ ‏ بود ذاتِ او مظهرِ عدل و جود
ز لطفش که و مه طلبگار کام ‏ ‏ ‏ ‏ بود درگهش قبلهٔ خاص و عام
نگارندهٔ جوهرِ آب و خاک ‏ ‏ ‏ ‏ طرازندهٔ گوهرِ جانِ پاک
دو عالم ز فیضِ ازل آفرید ‏ ‏ ‏ ‏ یکے کرد پنهان و دیگر پدید
ببخشید زانگه سرائے سپنج ‏ ‏ ‏ ‏ بشاهان با افسر و تاج و گنج
که از عدل ایشان شود روزگار ‏ ‏ ‏ ‏ شگفته تر از باغ در نوبهار
رهِ داوری را چو گیرند پیش ‏ ‏ ‏ ‏ شناسند بیگانه را همچو خویش
شهے کو چنیں زیست در روزگار ‏ ‏ ‏ ‏ بود سایهٔ ذاتِ پروردگار
ز نهصد فزوں بود شصت و دو سال ‏ ‏ ‏ ‏ که شاه اکبر آں سایهٔ ذوالجلال
ببالائے زرینه مسند نشست ‏ ‏ ‏ ‏ که به تختِ او گشت افلاک پست
جهاں را بیاراست از عدل و داد ‏ ‏ ‏ ‏ دلِ اهلِ عالم ازو گشت شاد
برمایهٔ بخشش از هر گروه ‏ ‏ ‏ ‏ شده جمع مردانِ صاحب شکوه
بمهر ار فگندی نظر سوئے خاک ‏ ‏ ‏ ‏ بگوهر شدی بهتر از جانِ پاک
گرفتی بیک حمله ملکے برزم ‏ ‏ ‏ ‏ بایمائے ابرو بدادی به بزم
چو لطفِ خدا لطفِ او عام بود ‏ ‏ ‏ ‏ بهر کار چشمش بانجام بود
بدرگاهِ او هر که بردے پناه ‏ ‏ ‏ ‏ چو اندیشه رفتے ز ماهی بماه
چناں پُر شد آوازه اش در جهاں ‏ ‏ ‏ ‏ که در دل نگنجد ز راز نهاں
بپرداخت زاں گونه روئے زمیں ‏ ‏ ‏ ‏ که کرد آفرینش جهاں آفریں
یکی کم دو و افزود پنجاه سال ‏ ‏ ‏ ‏ چنیں کرد شاهی ز روئے جلال
چو از عدل آباد کرد ایں جهاں ‏ ‏ ‏ ‏ سوئے آں جهاں رفت روشن جناں
شهِ هفت کشور از ایں پیش بود ‏ ‏ ‏ ‏ کنوں هشت جنت مسخر نمود
به نزدِ خرد مند هشیار دل ‏ ‏ ‏ ‏ سرائیست ایں عالمِ آب و گل

مجو مهر از جو هر نه سپهر — که با کس بپایان نه برداشت مهر
سپهراست پر کینه و گردش مدار — که با کینه ور مهر ناید بکار
جهان است مانند موج سراب — ازاں بسته دل کے شود کامیاب
نه بست است پیماں بکس روزگار — که تشکست آں را بهنگام کار
نماند بگیتی کسے جاوداں — ز دستِ اجل کس نه برجست جاں
چه خوش گفت آں کاملے نکته سنج — که از گوهر دانش اندوخت گنج
جهاں اے برادر نماند بکس — دل اندر جهاں آفریں بند و بس
شد از عدل شاه اکبر کامگار — بسانِ بهشتِ برین روزگار
جهاں گشت خرم بدورانِ او — زمین و زماں شد بفرمانِ او
دلِ دهر بے مهر پیماں گسل — ز کین مهر او کرد بیروں ز دل
ز تاثیر بے مهریِ این جهاں — رواں شد سوئے عالمِ جاوداں

رواں‌ش همیشه ز حق شاد باد
از و عالمِ قدس آباد باد

ابیات که اندرونِ دروازهٔ سکندره گرداگرد نوشته شده

بفرمانِ شاهنشهٔ ذو الجلال — که باشد شهنشاهیش بے زوال
شد آراسته آنچناں روزگار — که حیراں شد اندیشهٔ هوشیار
بگیتی ز فیضِ ازل بادشاه — بود سایهٔ نورِ ذاتِ اِله
چو از دهر آں سایه گردد نهاں — فتد سایهٔ دیگر اندر جهاں
بدینساں بود تا سرانجام کار — به نزدِ خرد گردشِ روزگار
زمانه دگرگوں شود هر نفس — نگردد دگرگونه با هیچ کس
فلک زینه شاه اکبر عرش گاه — که از هیبتش کوه گشتے چو کاه
نشستے چو بر تختِ شاهنشهی — گرفتے جهاں فرّ ظلّ اللهی
فروزندهٔ افسر و تخت بود — کریم و رحیم جواں بخت بود
دلِ روشن و جاں آگاه داشت — جهاں خورد و داد و گرفت و گذاشت
بباغِ جهاں تخم تنگی نکشت — ز بیرا آں گرفت از ریاضِ بهشت

روانش چو انوار خورشید و مه
فروزنده باد از نور الٰہ

ابیات کہ بر پیشانی دروازۂ سکندرہ بطرف شمال نوشتہ شد

طاقیکہ از رواق نہم چرخ برتر است — روشن ز سایہ اش رُخِ تابندہ اختر است
ایں طاق زیب نہ فلک و ہفت کشور است — در روضۂ منورۂ شاہ اکبر است

نوشتہ بر توپ کلاں

عمل استاد سلطان محمد وزن یکہزار و چہار صد و — و چہار و شش آثار سنہ باد
در دورِ اکبر شاہ الفقیر سلطان محمد ابن عبد الغفور دہلوی سنہ ۱۰۳۸ ہجری مقدس ۵

فتح دکن کرد بلطفِ اللہ — شاہ جہاں گیر ابن اکبر شاہ

مکتوب بر توپ ظفر بخش

ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی سنہ ۱۰۸۵ ہجری مقدس کل سی و پنج آثار
عمل متھرا داس ابن رام جی اسیر قلعہ نو پریزی سنہ ۱۸ جلوس عالم گیر بادشاہ۔

تخت سنگ موسے کہ در قلعہ اکبر آباد است

بلندی	طول	عرض
۱ فٹ ۱۱ انچی	۱۰ فٹ ۳ انچی	۶ فٹ ۶ انچی

سمت دوم مابین تعویذ جنوب رُویہ تاریخ نوشتہ بر تربتِ شاہجہاں بادشاہ
غازی اندرون تہ خانۂ اوّل جنوب رُویہ بسمت مابین تعویذ!

مرقدِ منور و مضجعِ مطہر بادشاہ رضوان دستگاہ خلد آرامگاہ اعلیٰ حضرت علیین مکانی فردوس آشیانی صاحبقرانِ ثانی شاہجہان بادشاہ غازی طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ در شب بست و ششم شہر رجب سنہ ہزار و ہفتاد و شش ہجری از جہانِ فانی بہ نزہت گاہ جاودانی انتقال گردید

کتابہ موتی مسجد کہ در قلعہ مستقر الخلافہ اکبر آباد است

ایں کعبۂ نورانی و بیت المعمور ثانی کہ صبح در جنب صفائی آں شامیست تیرہ و خورشید از فرطِ ضیا آں چشمیست خیرہ۔ کرسی پائے نیازش تا ساق عرش ہمدوش و گنبد فیض بارش بارواقِ فردوس ہم آغوش، بنیانِ عالی شانش .... و ذروۂ سپہر افزایش برحمن۔

ہر گلدستہ اش نورے بانوارِ کواکب بستہ یا فوارۂ فیضے از چشمۂ آفتاب جستہ، ہر گلِ
.زنیش شمع فروغ بخش قنادیلِ آسمانی ہر محراب نور آگینش ہلال نوید رسانِ عید جاودانی،
راطرافش قلعۂ لعل فام مستقر الخلافت اکبرآباد کہ بازمردیں حصار سبع شداد بپیوستہ است
لوئے ہالہ ایست ودر بدر منور کہ برفیضانِ سحاب رحمت بُرہانیست متین یا دائرہ ایست گرد
رانور کہ بر ترشح امطار کرامت نشانیست مبین۔ ہمانا بہشتے قصریست والا از یک لولوئے لالاکہ
ر آغاز معمورہ و بنا مسجدے سراسر از سنگِ مرمر مصفّا عدیل آں بروئے کار نیامدہ واز ظہورِ عالم
بدے سراپا منور متجلی، نظیر آں جلوہ ظہور ندارد۔ بفرمانِ خاقان سلیمان احتشام وسلطان
لیل احترام چہرہ افروز مسلمانی بانی مبانی جہانبانی شہنشاہ عرش بارگاہ ظل اللہ خلائق موسس
رکانِ خلافت مرصّص بنیانِ عدل و رافت کہ بہ یمن قدمش زمین را بر آسمان ہزاراں ناز واز
نورِ نعمتش آسمان را بازمین فراواں انباز، بخت و دولت را از عشق خدمتش دوام بیداری،
ں وملت را با جمال طلعتش کمال ہواداری، باد بہشت را از خاک درگاہ فلک جاہش
ریوزہ گری۔ آتشِ دوزخ از آبِ شمشیر و سخن گاہش وظیفہ خورے ؎

بنائے ملک راز داستواری — لباسِ عدل راز و پائداری
مدام از چشمۂ تیغ ظفر خیز — کُند پیمانۂ کفار لبریز
جنابش را فلک خدمت گزارے
جبینش را سحر آئینہ دارے

لب آسمانِ دیں پروری و شریعت نوازی، مرکز دورانِ عدل گستری و مملکت طرازی ابوالمظفر
ہاب الدین محمد صاحبقرانِ ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی بنا یافتہ و در عرض ہفت سال
صرف ۳ لکھ روپیہ او اخر سال بست ششم جلوس اقبال مانوس مطابق ؎
سنہ ہزار و شصت و سہ ہجری بہ انجام یافت۔ در بر موج احتشام
بسر گرفتہ ایزد۔ ہمال بمیامنِ من نیت حق طویت ایں . . . . . .
دشاہ دیں پناہ ہمگناں را توفیق ادائے طاعات و اقتنائے حسنات روز افزوں کناد۔
اجر ضلالت و ہدایت آں را بروزگار فرخندہ آثار ایں حق گزیں وحقیقت آگاہ عائد گردا
ناد۔ اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

تاریخ دیوانِ خاص قلعۂ مستقر الخلافہ اکبرآباد

ازیں دلکشا قصرِ عالی بناء — سر اکبرآباد شد عرش سا
بود کنگرش از جبینِ سپہر — نمایاں چو دندانِ سینِ سپہر
سجودِ در ایں سرائے سرور — کشد سرنوشتِ بد از جبہ دور
شرافت یکے آیہ در شانِ او — سعادت در آغوشِ ایوانِ او
رہِ جور از بیش و کم بستہ است — بزنجیر عدلش ستم بستہ است
بنازم بزنجیر کز عدل شاہ — ہمہ چشم شد در رہِ دادخواہ
در ایوان بصد احتشام — چو خورشید بر چرخ بالائے بام
چو ایوانِ او عالم آرائے شد — سرِ خاک از و آسماں سائے شد
شہنشاہِ آفاق شاہِ جہاں — کہ نازد باو روحِ ماجقراں
بایں رونق و زیب و زینت مکاں — ندیدہ بروئے زمیں آسماں
بود صحنِ بامش چو سیمائے مہر — بزیرش فتادہ چو سایہ سپہر
بتاریخش اندیشہ آورد رُو — درِ فیض شد باز از چار سو

چنیں گفت طبعِ حقائق شناس
سعادت سرائے ہمایوں اساس
سنہ ۱۰۴۰ ہجری

آگرہ کی شاہی عمارات کے یہ کتبات ایک نہایت پرانی اور بوسیدہ قلمی کتاب کے متفرق اجزا سے جو ردی میں دستیاب ہوئے تھے نقل و ترجمہ کئے گئے ہیں۔ (مدیر)

نئی کتابیں

(ادارہ "مصنف" کی طرف سے جنرل قدوائی صاحب کی نظر میں)

فلسطین و مسئلۂ یہود قیمت ۸ر مجلد	مطبع انوار احمدی الہ آباد نے مسٹر محمود بریلوی کی یہ کتاب شائع کرکے ایک بڑی کمی پوری کردی ہے۔

فلسطین کے متعلق بہت کم لوگوں کو ضروری باتیں معلوم ہیں اور جو خونی ڈراما وہاں انگریزی سیاست اور یہودی شرارت نے آراستہ کیا ہے۔ یہ کتاب اس کا تاریخی پس منظر پیش کرتی ہے۔

تین ۳ نقشے اور دو ۲ تصویریں اس کتاب میں شامل ہیں۔ نقشے زیادہ مفصل ہوں تو یہ کتاب طالبعلموں اور پبلک کے لئے اور بھی زیادہ مفید ہو جائیگی۔ مضامین کا نظام یہ ہے:-

۱۔ فلسطین ۲۔ القدس ۳۔ قوم یہود اور یہودیت ۴۔ سامی دشمنی ۵۔ صیہونی تحریک ۶۔ حکومت برطانیہ کا حل ۷۔ مفتی اعظم امین الحسینی ——،

کتاب عجلت میں چھپنے کی وجہ سے صفحہ ۱۹ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رحمت اللہ علیہ لکھا رہ گیا ہے۔ اسی صفحہ پر حضرت امیر معاویہؓ کو صرف "پہلے اُموی خلیفہ امیر معاویہ" لکھا گیا ہے۔ جمہور مسلمین نے متفقہ طور پر حفظ مراتب کے لئے جو القاب انبیاء، صحابہ، صلحاء اور شہداء کے لئے اختیار کرلئے ہیں اُن سے انحراف میں کوئی شان نہیں ہے۔ لیکن کاتب اور پروف ریڈر جو ستم ڈھاتے ہیں اُن سے یہ کتاب بھی نہ بچی۔

اُمید ہے کہ جب حضرتِ مصنف نظرِ ثانی فرمائیں تو اُن غلطیوں کو درست کر دیں گے۔ نیز عبارت میں جو اسقام نظر آئیں اُن کو بھی ٹھیک کر دینا بہتر ہوگا۔ مثلاً صفحہ ۳۶ پر "صیہونیت اور جدید آزاد خیال یہودیت کے درمیان بہت اختلافِ خیال ہے" یا صفحہ ۴۶ پر "جس نے قوم یہود کی عام بغاوت کی سرکردگی کی"۔

مسلمانوں میں شعورِ سیاسی کی بیداری نے ایسی کتابوں کی ضرورت بہت بڑھا دی ہے جو متعلقہ مسائل کو سمجھنے میں معین ہوں اور اگر کوئی باضابطہ تعلیمی پروگرام ہوتا تو سستی عام فہم کتابیں شائع کرنیکا ایک موثر انتظام بہت کچھ نفع بخش ہو سکتا تھا۔

حمود بریلوی صاحب اچھے لکھنے والے ہیں اور کتاب اُنھوں نے سادہ اور سلیس پیرایہ میں لکھی ہے۔ یہ اُمید بیجا نہ ہوگی کہ اِسے قبولیتِ عامہ حاصل ہو۔ مسائلِ فلسطین کو اِس کی مدد سے پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

اختلالِ یورپ کے سلسلہ میں یہودیوں کو عالم میں منتشر کرنے کی جو سعی آج ہے اِس سے قبل بھی ہو چکی ہے اور کوچین (ہندوستان) میں ایک خاندان اِن یہود کا آباد ہے جو بخت نصر کے حملۂ فلسطین پر قتلِ عام سے بچ کر یقیناً خود کوچین کے جہازمیں بھاگے تھے۔ یہ براؤن جیوز (گندم گوں یہودی) کہلاتے ہیں اور تاریخ ہند کی ایک اہم کڑی ہیں، کیونکہ اِس سے خود انکے تجارتی استیلاء کی ساتھ ہی ہندوستان کی جہازرانی اور برآمد ودرآمد کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہودیوں کے بہت کچھ اطوار اِس مُلک میں جاری ہیں اور ایک گروہِ محققین کا گمان ہے کہ خود ہنود بنی اسرائیل کے گم شدہ قبائل ہیں، جو یہاں آکر اس رُوپ میں رہ پڑے بہت کچھ تصدیق و توثیق اِس سلسلہ میں ہر دو قوموں کے مخفی عقائد سے ہوسکتی ہے۔ اور اِس پر القبلہ (کا بالا) اور اپنشیدوں کے مقابلہ سے روشنی پڑے گی ـــ فلسطین کے احوال میں اس حاشیہ سے مزید دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے۔

حات ـ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس | ایک سو باسٹھ صفحات کی یہ بسنتی لباس کتاب ملک کے نامور
قیمت ـــ ۲/عہ | ادیب پروفیسر ضیاء احمد بدایونی صاحب نے اپنے برادر بزرگ

ہرت رضی بدایونی رحمت اللہ علیہ کے کلام اور اُس پر موقر سخن فہم حضرات کی رایوں اور تبصرہ کے تھ شائع فرماکر ایک نمایاں ادبی خدمت انجام دی ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے اور کلام کا حُسن ب کی کرم نمائی سے بڑی حد تک محفوظ ہے۔

تعارف، پیش لفظ اور مقدمہ کچھ اپنی اہمیت اس طرح کھو چکے ہیں کہ عموماً اِن کو بے پڑھے گزر جانیکی ت ہوگئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جو کچھ بطور تعارف، تقریب، تبصرہ و تذکرہ کے لکھا گیا ہے اِس ظمت آپ اپنی ضامن ہے۔

کسی شاعر کا کلام بقول جوشؔ ملیح آبادی کے سمجھنے کی کوشش میں ہم بہت سے پہلو نظر انداز تے ہیں۔ خود اسی کتاب میں جو مثالیں لکھی ہیں اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ذہن کی نارسائی رجہ بعض اوقات خاص سخن فہم حضرات کو مفہوم تک پہنچنے سے محروم رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی عر کے متعلق ضروری باتیں معلوم ہوں تو اس کے کلام کو سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ شاعر کا نقطۂ نظر ہمیشہ اس کی صلاحیتوں، علم اور ماحول سے قائم ہوتا ہے

اور جس نقطۂ نظر سے وہ چیزوں کو دیکھتا اور جس حوالہ سے پرکھتا ہے اُس سے کچھ واقفیت اگر ہم پہنچ سکے تو فہم کلام میں یقینی مدد ملے۔
حضرت رضی ایک عالی خاندان بلند حوصلہ تخلص تھے اور ان کی شاعری کی محرک ان کی طبعی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ سرچشمہ اگر بھرپور ہے تو دھارا تنگ پہاڑیوں میں ٹکراتا، پیچ و تاب کھاتا ہے، تا اینکہ اپنے لئے ایک نکاس پیدا کر کے وسیع میدان کے سینہ پر پھیلاؤ اور شان کے ساتھ بہنے لگتا ہے۔ سب انسپکٹری کی گھس گھس، تعزیرات ہند، پیشی، روزنامچہ کی پتھریلی حدوں میں رضی کی حوصلہ مندی نے مرگِ دوام کو قبول نہ کیا اور میدانِ شعر و سخن کی ابد انصرام وادی میں قدم رکھا۔ گویا ایک بلبل تھی چمن سے دُور، جس نے قفس کی تیلیوں سے اپنے لئے گلستاں کی جانب ایک جھروکہ بنا لیا تھا اور وہیں سے بہار کی نزہت آفرینیوں کی مبارکباد یاں جوانانِ چمن کو اپنے سوز و ساز میں سُناتی رہی۔ عشقِ رسول، محبتِ اہلبیت اور خودی کے پورے احساس میں ڈوبے ہوئے نالے، قافیہ ردیف کے تعینات میں شعر بن بن کر موتیوں کی طرح — ع

ناموسِ شاہِ ہر دوسرا پر نثار تھے

در رضی عہدہ کے لحاظ سے سب انسپکٹر تھے، جیسا کہ ان کے ایک انگریز افسر نے لکھا تھا اور حقیقتاً ایک صاحبِ نظر اہلِ دل شاعر۔

شعر دو ہی قسم کے ہوتے ہیں مکمل اور ناقص۔ مکمل شعر تو وہ ہے جس میں شاعر نے جو کچھ کہنا چاہا اسی طرح مقررہ اصولوں کی پابندی کے ساتھ کہہ لیا اور ناقص شعر کے لئے ہمیشہ ایک معذرت کی ضرورت ہوتی ہے خواہ اس کے الفاظ مضحکہ خیز ہوں یا سنجیدہ یعنی پورے غرور کے ساتھ یہ کہا جائے ہمارے یہاں یونہی ہے۔ یا سادگی کے ساتھ وہ نقص تسلیم کر لیا جائے۔ رضی کے کلام کے ساتھ کسی معذرت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ؎

اقبالِ سکندر بجہانگیری "شعرم" — برداشت بیک دست قلم را و علم را

اخلاقیات پر شعرا کو بہت کم توجہ رہ گئی ہے، جو اس سطحیت کا انجام ہے، جو عہدِ حاضر کی سوسائٹی نام نہاد تعلیم کی ماتم خیز خصوصیت ہے اور اختلالِ عمومی کا ماحصل۔

سوسائٹی کا نظام ہمیشہ اقدارِ مسلمہ کے تابع ہوتا ہے اور اسی معیار کے حوالہ سے افکار و اعمال، نجات و مشاغل، علم و ادب، شعر و سخن کی جانچ ہو سکتی ہے۔ رضی صاحب اُس سوسائٹی کے فرد تھے جو زمانی اقدار پر مبنی تھی اور مغربی انفرادیت نے جس میں اختلالِ فکری سے رخنہ نہیں ڈالا تھا، اسی لئے اس کے اسلوب بیان میں وہ ادھار [illegible]

یہ ایک "کامیاب" کتاب ہے جو توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے اور نوخیز شعرا اور طلباء کے لئے ہی نہیں، صاحبانِ ذوق و دعویدارانِ سخن سنجی کے لئے بھی مفید ٹھہرے گی۔ ہم محترم پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم۔ اے کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں ــــــ،

سالنامہ آجکل

"آجکل" کا معیار بلند۔ اڈیٹوریل اعلیٰ اور مضامین منتخب ہوتے ہیں اور جس قدر بھی کہ پابندیِ وقت، روائتی حیثیت سے ممکن ہے اس کا التزام بھی رہتا ہے۔

ادب کے متعلق جتنی بھی رائیں ہیں اپنے اختلافات کے باوجود اُس پر متفق ضرور ہیں کہ اسے بلند پایہ ہونا چاہئے۔ اور جیسے کہ میرے نزدیک زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے جس کی تبدیلی و ترقی وسعت و آرائش قوم کے ذہنی و فکری ارتقاء کے تابع ہے ویسے ہی ادب بھی۔ آزاد ہندوستان کا ادب مصروفِ پیکار ہندوستان سے مختلف ہوگا۔ اور اس کے آثار آجکل کے زیرِ نظر سالنامہ کے مضامین کی ترتیب و آرائش میں نمایاں ہیں۔

بعض عبارتیں البتہ ضرورت سے زیادہ "قبل از وقت" ہیں اور غالباً ادارہ کی اُن پر نظر نہیں پڑی۔ بہ اصرار مضمون طلب کرنے، بغیر نظرِ ثانی کے بھیجنے اور بلا دیکھے چھاپ دینے میں بھی ایک عظمت اور لطف ہے۔ لیکن اب اور بھی دلچسپیاں اس میدان میں فراہم ہو چکی ہیں، اس لئے کیا ہی ہے اگر اس جھگڑے سے قطع نظر کیجائے .... مثلاً صفحہ ۱۳۰ کے پہلے پیراگراف میں ــــ "میری رائے ... ملنے والوں کو یہ ہے کہ" ذرا غیر مانوس عبارت ہے۔ "میری رائے" کی جگہ "میرا مشورہ" یا "میری صلاح" بیجا نہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ بھی شدھ بھاکھا میں مستعمل ہیں۔ یا پھر "سوچنا" زیادہ ٹھیٹھ ہے۔ تیسرے پیراگراف کے آخر میں" ان کے ظرف کی بلندی" بہت زیادہ انقلابی ناپ ہے۔ چوتھے میں "جذبات کی تندی و تیزی، نظر کی تیزی و دراکی" ــــ "حقیقت سے آنکھیں چار نہ کر سکنے کے باوجود" آگے صفحہ ۱۳۴ سطر ۱۱ "جس طرح ڈاکٹر جانسن کی ہمہ گیر شخصیت کا تنقید ایک چھوٹا سا پہلو ہے اسی طرح ...... صاحب کا حال ہے"... ذرا انفراد کے محتاج رہ گئے ہیں۔

مضامین میں "آنریری یا اناڑی" کے معیاری ہونے میں کسی کو کلام ہوگا۔ حسینی کا "اڈا" ــــ تسنیم کی "بھول" ــ قرۃ العین حیدر کا "دوسرا کنارہ" ایک سلسلہ میں پڑھنے سے آدمی خواہمخواہ تھکن محسوس کرتا ہے۔ "دوسرا کنارہ" اپنے دامن میں بہت سے فکری جھکولوں کا غماز ہے اور اس کی ابتدا کو انتہاء سے مربوط کرنے کی سعی خود پڑھنے والے کے ذمہ ہونا ایک نما سا ٹیکس ہے۔ بہت سی سرخیاں "پیوٹوں کی جلن" سے یقیناً پیدا ہو سکتی ہیں۔ جس کے اسباب

ظی "سُرخ" ہو سکتے ہیں اور ایسی حالت کے اثرات فکر و نظر پر ظاہر ہیں ......

—————— x ——————

علمی مضامین بھی سالنامہ کے ویسے ہی بلند پایہ ہیں جیسے ادبی - انتخاب لائق داد ہے۔ حصّہ
شعر و سخن کا بھی یہی حال ہے - ادارہ اس کارنامہ پر سچی مبارکباد کا مستحق ہے - ہم اُمید کرتے ہیں کہ
دورِ حاضر میں بھی "آجکل" کی عظمت غیر ملوّث اور مسلّمہ رہے گی - گو لکھنے والوں سے زیادہ لکھنے
والیوں کے رحم و کرم پر بہت کچھ اِس کا انحصار ہے ....

گیا وہ وقت ہمکو ناصحوں کی جب ضرورت تھی!

(از علامہ سلیم پانی پتی مرحوم)

ا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر

ا وہ وقت ہم کو ناصحوں کی جب ضرورت تھی
فلک نے کردیا ایک اک کو آپ اپنا نصیحت گر

ئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سر تاسر

رورت اب ہے گر ہم کو تو بس ہے اُن بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر

ط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر

س گریہ تو بس اک گرمیٔ صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثئے، یہ وعظ، یہ ا[illegible] سپیچ، یہ لکچر،

ب و سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

بس جو کام ہیں در پیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پر آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

ی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر

ی کچھ کچھ مہک باقی ہے اِن مُرجھائے پھولوں میں
ابھی کچھ کاٹ ہے اس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر

جس بات کی یا نقص جو تم میں ہے وہ یہ ہے
کہ تم اُن قوتوں کا صَرفِ بیجا کرتے ہو اکثر

سنبھلنا تم اگر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی

بزمِ مصنّف

مرزا علی اظہر صاحب منیجر روزنامہ "ڈان"

آپ کا تحفہ پہونچا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی بیگم صاحبہ کا مضمون "حضرت محل" کے متعلق بہت خوب ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک پیش کر دیجئے گا۔ "غلام قادر خاں" کی بابت بعض اسبابِ مخالفت آپ نے اچھے پیش کئے ہیں اور تخفیفِ جرم کے لئے موید ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ ——
"غازی الدین خاں" نے جو سلوک عالمگیر ثانی کے ساتھ اور غلام قادر نے جو برتاؤ شاہ عالم ثانی کے ساتھ کیا ہے، اُس نے شاہانہ وقار کو دھکا پہونچایا اور اُس جسمِ مُردہ کو بے نقاب کر دیا جس کو مغل بادشاہت سے لوگ تعبیر کرتے تھے۔ نتیجہ جو ہوا وہ آپ پر مخفی نہیں۔ امید کرتا ہوں کہ گاہے گاہے اپنے علمی انتخاب سے مجھ کو یاد کر لیا کیجئے۔

سید انیس الرحمن صاحب ایڈیٹر "نئی زندگی" الٰہ آباد

ہم "نئی زندگی" کا ایک خاص نمبر "مسلمان کیا کریں؟" نکال رہے ہیں۔ جس میں تمام مضامین اسی موضوع پر ہوں گے۔ موجودہ دَور مسلمانوں کے لئے بڑا نازک دَور آیا ہے اور اس وقت مسلمانوں کے سامنے صحیح حالات اور صحیح چیزیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ہم یہ نمبر نکال رہے ہیں۔ ملک کے مقتدر رہنمایان اور مفکرین نے بہت ہمت افزائی کی ہے۔ اور اپنے مضامین بھیجے ہیں —— جناب سے بھی درخواست ہے کہ اس موضوع پر قلم اُٹھائیں اور اپنے خیالات سے مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ بیگم صاحبہ سے بھی کچھ لکھنے کی درخواست ہے۔ اس نمبر کے لئے کسی مسلم خاتون کا مضمون نہیں آیا ہے۔

مولوی امین الدین صاحب قریشی ایڈیٹر اخبار "دین" و "نظام" احمد آباد

"مصنّف" اور رسائل "غلام قادر روہیلہ شہید" و "نواب دوندے خاں" ملے۔ آپ کی اس عنایت کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں؟

غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ "غلام قادر روہیلہ" کا گجراتی ترجمہ تو عرصہ ہوا "دین" میں شائع ہو چکا —— بہرحال "نواب دوندے خاں" کے لئے آپ شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس مرتبہ "دین" میں "حضرت محل" بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ اخبار کی نقل حسب وعدہ آپ کو بھیج دی جائے گی "مصنف" بھیجتے رہیے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔

آپ کی تصنیف "حیاتِ حافظ رحمت خاں" دیکھنے کی ایک عرصہ سے آرزو ہے۔ اب تو

نی آپ اسے "زیورِ طبع" کے جھنجھٹ سے نکال کر "زیورِ طبع" سے آراستہ کیجئے۔
صی اختر صاحب سے کہئے وہ حالاتِ اقبال کی جلد مرتب کریں۔ اب اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔

بلام معین الدین صاحب ایڈیٹر انجمن اردو حیدرآباد دکن | مجلس مصنفین علی گڑھ کے سہ ماہی علمی رسالہ "مصنف" کے دو مشترکہ نمبرات پر مشتمل ایک جلد وصول ہوئی۔
نہ پانچ چھ سال سے سید الطاف علی صاحب بریلوی بی۔ اے (علیگ) جس محنت اور سلیقہ کے سا
ال رہے ہیں اُس کی ستائش مشکل ہے۔ تجارتی اعتبار سے تو غیر اس وقت ہندوستان کے
ہ میں بیسیوں رسالے نکل رہے ہیں۔ لیکن اس پایہ کے ضخیم مجلّے نکالنا اور ان کے حسنِ ظاہری
برقرار رکھنا صرف اُن بے جگروں کا کام ہے جو صرف "خدمت" کو اپنی زندگی کا نصب العین
بنالیتے ہیں۔ بہرحال "مصنف" ہندوستان کی علمی اور ادبی زندگی کا وہ خلا پُر کر رہا ہے جو اس سے
تھا۔ زیرِ نظر اشاعت میں بہت سے اعلیٰ درجہ کے ٹھوس اور تحقیقی مضامین و مقالے پیش کئے گئے ہیں۔

میاں صاحب اختر جوناگڑھی | تین کرم نامے لاجواب پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ ناسازیٔ طبع۔ کچھ مصروفیات اور کچھ غمِ دوستاں باعثِ تاخیرِ جواب ہیں۔ میرے محترم دوست
نظام الدین قریشی صاحب مدیر اخبار "دین" احمدآباد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایک
ت محبت کرنے والا امیری علمی کاوشوں کا مداح اور زندگی کے نازک لمحات میں مجھے سنبھالنے وا
سوس! "مصنف" مل چکا ہے۔ بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک پڑھ لیا گیا ہے۔

لطیف صاحب عربی کالج راندیر | ہم نے سنا ہے کہ آپ کا رسالہ "مصنف" علمی، ادبی، اخلاقی مضامین سے پُر اور بہت ہی مفید و بے نظیر ہے۔ نیز یہ ہندوستان
ن و خوبی فریضۂ تعلیم کو انجام دے رہا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس کی دید کے مشتاق ہیں۔ برائے مہربانی
سالہ نمونۃً ارسال فرمادیں، انشاء اللہ اس کے مضامین کے مطالعہ کے بعد رسالۂ ہذا کی خریداری
کریں گے۔ لہٰذا فوراً ایک رسالہ روانہ کریں تاکہ تڑپتی ہوئی روحوں کو آبِ حیات کا کام دے۔

عبدالباسط صاحب ایم اے پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی | حال ہی میں کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوکر کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔ تردد ہوا۔ خدا آپ کو
ں عطا فرمائے۔ شاید آپ کو علم ہوگا کہ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر مشہور مورخ کی مشہور تصنیف "ہمارے
ستانی مسلمان" کا جواب سرسید نے اپنے مضامین میں شائع کیا تھا۔ مجھے سرسید کے ان مضامین

میری خاطر سے کسی پُرانے پڑھے لکھے بزرگ سے دریافت فرما کر میری رہنمائی فرما دیں گے (کاش اس وقت محترم سید طفیل احمد صاحب ہوتے تو عقدہ کشائی فوراً فرما دیتے۔) شاید مفتی انتظام اللہ صاحب میر ولایت حسین صاحب یا ان جیسے اور کسی بزرگ سے ضرور پتہ مل سکتا ہے وہ کتاب یا مضامین کہاں سے مل سکتے ہیں۔ صرف چند روز کے لئے استعار ضرورت ہے۔ 'مصنف' کا پرچہ پریس میں کب جائیگا۔ شاید اس مرتبہ آپ کیلئے کچھ پیش کر سکوں۔ جواب باصواب کا بیتابی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

اردو کے سلسلے میں بمبئی شہر اور صوبہ کو جو اہمیت حاصل ہے اُس کا اقتضاء یہ ہو کہ یہاں ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جو اُردو سے متعلق ہر قسم کی تحریکوں اور کاموں کا مرکز ہو۔ چنانچہ تقریباً سات سال سے اس سلسلے میں کوشش کی جارہی تھی اور خوشی کی بات ہی کہ اب یہ کوشش کامیاب ہوگئی ہے۔

یہاں کی حکومت نے صوبہ کی دوسری تین زبانوں مرہٹی، گجراتی اور کنڑی میں سے ہر ایک کو اسی قسم کے مرکز کے قیام کے لئے بارہ ہزار روپے کی رقم دینی منظور کی تھی۔ انجمن اسلام اُردو زبان کے لئے بھی اسی قسم کی مراعات کی طالب تھی، اگرچہ اُس نے اپنی طرف سے ادارہ کے لئے عمارت کرسی لائبریری کا ذخیرہ اور دفتری اخراجات کی ذمہ داری لی تھی۔ لیکن علمی تعلیمی اور ادبی کاموں کے لئے اتنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ اساتذہ و رفقاء کی تنخواہوں وغیرہ کے لئے مستقل سرکاری امداد ضروری تھی۔ اِس سال سے حکومت نے انجمن کو دس ہزار روپے سالانہ کی مستقل رقم چند شرطوں کے ساتھ دینا منظور کرلی ہے اور انجمن نے کسی تاخیر کے بغیر اس کام کو شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس وقت مندرجۂ ذیل کام ادارہ کے پیش نظر ہیں:۔

(۱) اردو پوسٹ گریجوئٹ تعلیم۔ (اس سلسلے میں یونیورسٹی کو درخواست بھیج دی گئی ہے۔ انشاءاللہ یونیورسٹی بہت جلد اس ادارہ کو اس کام کے لئے منظور کرلے گی اور جون سے ایم۔ اے کی باقاعدہ تعلیم شروع ہو جائے گی)۔

(۲) ریسرچ ——— ایم۔ اے کے بعد ڈاکٹریٹ کے لئے کام کرنیوالوں کی ہدایت۔

(۳) علمی کام کرنے والوں کی حتی الامکان ادبی امداد۔

(۴) اردو کے ایک مکمل کتب خانہ کا قیام۔

(۵) ایک خالص علمی رسالے کا اجراء۔

۶) مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو ادب پر کام کرنے والوں کے کاموں سے متعلق معلومات کی فراہمی۔
۷) کرمی لائبریری اور کتب خانہ جامع مسجد کی کتابوں کی مفصل فہرست کی ترتیب۔
۸) اُردو کی قلمی اور نایاب کتابوں کا حصول اور ان کی صحیح اشاعت۔ وقت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا کام بھی انشاء اللہ بڑھتا جائے گا۔ اِس وقت ادارہ میں ایک ناظم (ڈائرکٹر) ایک نائب ناظم (اسسٹنٹ ڈائرکٹر) اور ایک رفیق (فیلو) کام کریں گے۔

ناظم صاحب مظفر میموریل لائبریری دربھنگہ

اکثر پرچوں میں آپ کے رسالے سے مضامین نقل کئے جاتے ہیں۔ ابھی ساقی کے "سالنامہ" میں کوئی مضمون نقل تو نہیں کیا گیا مگر پروفیسر عبدالقادر نے اپنے مضمون "رشید احمد صدیقی" میں ایک جگہ 'مصنف' سے سلطان حیدر جوش کی تحریر نقل کی ہے۔ اس طرح مجھے آپ کے پرچہ کی واقفیت ہو سکی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس لائبریری کے لئے ملک کے تمام معیاری رسائل منگائے جائیں۔ لہٰذا ازراہِ کرم 'مصنف' کی تازہ اشاعت کا کوئی پرچہ بطور نمونہ بھیج دیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ اس کا سالانہ چندہ کیا ہے؟

جناب فکر ندوی صاحب ایڈیٹر "شیدا" دہلی

علمی، ادبی اور فنی اغراض کے پیش نظر ایک پندرہ روزہ پرچہ "شیدا" نکلنا شروع ہوا ہے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں شیدا کی مناسبت سے پرچہ کا نام 'شیدا' رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے تعاون کے بغیر ہم اس ادبی مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بنابریں آپ سے مخلصانہ درخواست ہے کہ "مصنف" کے حلقہ میں "شیدا" کو مناسب الفاظ میں تعارف کرائیں۔ یہ امر آپ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

مولوی عبدالشکور صاحب پرنسپل رضا کالج رامپور

'مصنف' کا تازہ شمارہ پہونچا ممنون کرم ہوا۔ ڈاکٹر بسمل نے جن خطوط کے تراجم پیش کئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ شمارہ کا معیار بلند ہے اور کئی مضامین غور و خوض سے لکھے گئے ہیں۔ آپ کی مساعی مبارکباد کے قابل ہیں۔

مرزا علی اظہر صاحب منیجر اخبار 'ڈان' (۲)

آپ کا سرفراز نامہ پہونچا۔ اور باعثِ صد انبساط ہوا۔ "مسلمان کی دنیا" ملی۔ آپ نے شریف خاندانوں کی تباہی اور سوسائٹی کی بے رحمی کا صحیح مرقع کھینچا ہے اُس کو پڑھ کر مسلمانوں کے زوال کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور آنسو ڈبڈبا آئے۔ "گنجینۂ سلیمانی" اور "چمنستانِ مظفر" میں نے نہیں دیکھیں۔ بہت مشتاق ہوں۔ فوراً ایک ایک کاپی وی پی کر دیجئے اور بذریعہ کارڈ مطلع فرمائیے۔

"واجد علی شاہ" کے مضامین شاید ختم ہو گئے ہیں۔ اگر کچھ کاپیاں ہوئیں تو آپ کی خدمت میں

انہ کروں گا۔ کوئی صورت اگر اُن کے یک جا چھپنے کی ہو سکے تو کوشش کرنا چاہئے۔ کیونکہ اکثر اُن
مامین کی لوگ خواہش کرتے ہیں۔ مگر کاپیوں کے نہ ہونے سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ ترمیم شدہ
عدہ ضوابط آل انڈیا مسلم نیوز پیپرس کنونیشن چھپنے کے لئے دیدئے ہیں۔
میں امید کرتا ہوں کہ اُردو صدا و رہ و ہیلکھنڈ کے متعلق جو کچھ مواد آپ کے پاس ہو اُس سے ضرور
ملع فرمائے گا اور ممکن ہو تو مستفید کیجئے گا۔

لوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن | مصنف، ملا۔ شکریہ ۱۸۵۷ء کا رومان نہ صرف تاریخی لحاظ سے بلکہ ادبی حیثیت سے واقعی نوادرات سے ہے۔ میں نے اپنے
مون کے چار تراشے طلب کئے تھے۔ اُمید کہ براہِ کرم چار رسالے نہیں بلکہ صرف میرے مضمون کے
ر تراشے ارسال فرمائیں تو موجب کرم ہوگا۔
پھر آپ نے اس امر سے مطلع نہیں فرمایا کہ بیگم صاحبہ کے تاریخی مضامین کب شائع ہوں گے۔
مولوی عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر جامعۂ عثمانیہ سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے
ن کا ایک نوٹ جو البیرونی کے متعلق تھا آپ نے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر اب تک وہ شائع نہیں ہوا۔

ولوی محمد ہارون خاں صاحب شروانی پرنسپل "اینگلو عربک کالج" دہلی | جب آپ کُل ہند مسلم جرائد کے اجتماع میں تشریف لائے تھے تو میں نے کانفرنس کے
وران میں ایک مختصر سی تقریر میں عرض کیا تھا کہ جناب براہِ کرم اس کالج کی تاریخی، ثقافتی اور امکانی
یت کے مدِ نظر اس کے مکاتب کی خاطر خواہ تشریح فرمائیں گے اور اس کی منتقلی کے اہم مسئلہ پر اپنے
یح اور کافی مشہور جریدے میں ناظرین کی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جناب نے اس
رے میں ضرور کوئی نہ کوئی مضمون یا مضامین تحریر فرمائے ہونگے۔ میں ممنون ہوں گا اگر جناب براہِ کرم
پنے مضمون یا مضامین کو میرے پاس روانہ فرمائیں گے۔ انشاء اللہ بہت جلد اطرافِ ہند کو یہاں
ے دفود جائیں گے اور آپ کی مزید امداد درکار ہوگی۔

ولوی محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح ایڈیٹر "قومی اخبار" کانپور | دہلی سے ملاقات کے بعد بس آپ غائب ہو گئے نہ کوئی خط، نہ کانفرنس گزٹ و مصنف میں کتاب دررِ روزانہ
نبار کا کوئی تذکرہ! ــــ اِس طرزِ جفا کو بدل دیجئے۔
یکم جولائی سے بفضلہٖ روزانہ "قومی اخبار" شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ علی گڑھ کے فاضل
فاص کے پیغامات جلد از جلد روانہ کرائیے۔ خود اپنا پیغام بھی بھیجئے۔ اپنے مشوروں سے مفصل طور پر آگاہ کیجئے۔

سید محمد جمیل صاحب جالبی کراچی | ”سوانح عمری“ ”تمہید“ اور ”پانی پت کا خونیں میدان“ ارسالِ خدمت ہو چکی ہیں۔ وصول یابی سے جلد مطلع کر کے ممنون فرمائیں۔

رہی قسط وار شائع کرنے کی یا ایک بار ہی۔ یہ مضمون کی نوعیت دیکھ کر آپ خود حقیقتاً مجھ سے اچھا فیصلہ کر سکیں گے۔ مجھے فی زمانہ کتاب شائع کرانے کی دقتوں کا بخوبی اندازہ ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں، تو تمام زحمتوں اور زحمتوں کو دور کر سکتے ہیں۔ جالب صاحب مرحوم پر جتنا میرا حق ہے اتنا ہی غالباً آپ کا بھی۔ وہ آپ کے بھی شفیق بزرگ تھے اور میرے بھی، عزیز محترم۔ اگر میں اور آپ مشترکہ سعی و محنت سے ان کے نام پر سے فراموشی کا دبیز پردہ نہیں اُٹھائیں گے تو کون اس کام کو انجام دے گا۔ اگر میں اور آپ اُن کے کارناموں کو اُجاگر نہیں کریں گے تو کون دوسرا اس کام کو کرے گا۔ بہرحال یہ مضمون غالباً پانی پت پر اس قدر بے بہا اور گراں قیمت ہے کہ اُردو میں تو کیا دیگر مغربی زبانوں میں مشکل ہی سے ملے گا۔ اس کو پڑھ کر آپ پر خود روشن ہو جائیگا۔ میں کیا لکھوں۔

رہی میری نوشتہ سوانح عمری اس میں اُن کی موٹی موٹی باتیں لکھ دی ہیں۔ اور غالباً ایک خاکہ ان کے کردار، فضائل، عادات و اطوار اور مشغولیت کا سامنے آجاتا ہے۔ میں نے اس کو دائرۂ ادبیہ انجمن ترقیٔ اردو میرٹھ میں پڑھا تھا۔ شوکت صاحب وغیرہ نے کافی سراہا۔ خیر۔ اگر دہلی گیا تو حسن ریاض صاحب سے بھی ضرور ملوں گا۔ کیونکہ میرا ارادہ دادا جی کے ”ڈائریوں“ کو کئی جلدوں میں (محض انتخاب) شائع کرانے کا ہے۔

پروفیسر سید بشیر علی صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ’مصنف‘ ملا۔ شکریہ۔ ۱۶-۱۷ نہیں ملے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ’مصنف‘ کا اتنی باقاعدگی سے نکلتے رہنا تعجب انگیز ضرور ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ کے اتنے متفرق مشاغل و فرائض کی موجودگی میں ’مصنف‘ کے لئے بھی آپ کو وقت مل جاتا ہے۔ اور مضامین کی فراہمی کی مشکلات کے ساتھ ساتھ کاغذ کا اہتمام اور طباعت کی دقتوں کو بھی آپ عبور کر لیتے ہیں۔

آپ کی یہ دھن قابلِ ستائش اور آپ کی یہ لگن قابلِ صد آفریں۔!

مولوی محمد امین صاحب زبیری ریاست بھوپال | اس مرتبہ تو ’مصنف‘ کا اداریہ غضب کا ہے مگر یہ تو اُس سلیس تربیت کے جو ”روشن مستقبل“ دیتا ہے بالکل متضاد ہے

بہرحال میں تو یہی کہوں گا کہ ع ——— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

”ذکرِ شبلی“ طبع تو ہو گئی شائع بھی ہونے والی ہے۔ ’مصنف‘ تو شاید کیا یقینی اس پر ریویو کرنے سے گھبرائیگا۔ ہاں الطاف علی کی شخصیت سے بدگمانی حرام ہے۔ سر سید لیاقت علی صاحب کی

ت نے مجھے افسردہ کردیا ہے۔ اب ایک دن کو یہاں طبیعت نہیں لگتی۔

بر احمد صاحب علوی ناظر کاکوروی۔ لکھنؤ

گرامی نامہ ملا۔ میں آج کل کسی اخبار کا اڈیٹر نہیں ہوں۔ مشفق صاحب سے روزانہ ملاقات ہوا کرتی ہے۔ آپ کا خط دیکھ کر بے حد ہنسے۔
ب صاحب منیجر تنویر کی وجہ سے رات کا زیادہ حصہ میر اتنویر کے دفتر ہی میں گزرتا ہے۔ میری دلچسپی
شغلہ ہے۔ اس لئے قدرتاً تنویر کو عزیز رکھتا ہوں۔ فی الحال ہماری 'آواز' بند کردیا ہے۔ لیکن
ریب ایک ادبی بلند پایہ 'دار الاشاعت' قائم کرنے کی فکر میں ہوں۔ جس کا مقصد 'اسٹڈی سرکل'
ا۔ اور ساتھ ہی ایک 'ریفرشمنٹ روم' بھی۔ اس سلسلہ میں انشاء اللہ ہم لوگ آپ کو دعوت دیں گے۔
تی صاحب بھی اس مجوزہ دار الاشاعت کے ایک ڈائرکٹر ہوں گے۔ آپ کی اور آپ کی رفیقہ
ت کی کوئی تصنیف ضرور شائع کی جائے گی۔

ال احمد صاحب سرور اکبر آبادی

مبارکباد کا لفظ اتنے بڑے موقع کے لئے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے پاکستان حاصل کرلینے پر مخصوص آپ کو تہنیت پہنچاؤں
ں لئے ایسے سعید و مفتخر موقع کے لئے آپ ہی کوئی مناسب لفظ تہنیت منتخب کرلیجئے۔ مجھے کوئی لفظ
ہیں۔ اور ملت کے لئے جب اتنا عظیم الشان دن اسلامی تاریخ میں نہیں آیا تو اس کے لئے لفظ
ے بن جاتا۔

خیر، اگر پاسپورٹ ملنے میں دشواریاں نہ ہوئیں تو نیاز حاصل کرنے کے لئے وہیں حاضری دوں گا۔

"انتقادیات" کا مسودہ آپ نے کس پبلشر کو دیا ہے؟

لوی حمید الدین صاحب نظامی ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں

آپ نے "علی گڑھ چلو" والی اسکیم تو خوب نکالی ہے۔ اب اس کو جلد کرنا چاہئے۔
ے جلسہ کردیجئے تاکہ سب لوگ جمع ہوکر کچھ تبادلۂ خیالات کرسکیں۔

لوی محمد امین صاحب زبیری ریاست بھوپال (۲)

اگست کا 'مصنف' پڑھا۔ اداریہ بہت اچھا اور برمحل ہے اس میں بعض فقرے جو دبے ہوئے جملے ہیں نکال
انگریزی میں اشاعت کیجئے۔ تمام مسلم پریس کو اردو۔ انگریزی میں بھیجئے۔ اخراجات کے لئے خاص
ستوں سے چندہ کرلیجئے، میں اپنا حصہ فوراً ادا کردوں گا۔
سر سید لیاقت علی بغیر وصیت نامہ مر گئے۔ پچاس ہزار نقد۔ لاکھوں کے شیرز۔ بہترین لائبریری۔
پ ان کے خاندانی حالات سے واقف ہوں تو لکھئے۔ اسلامیہ کالج بریلی کے لئے ممکن ہے کچھ نفع ہوجائے۔

"ذکرِ شبلی" پڑھا یا نہیں۔ ریویو تو آپ کر ہی نہیں کرسکتے۔ اگرچہ کرسکتے ہیں۔ تبصرہ کی اشاعتِ ثانی کا ارادہ ہے۔ اور خاص شان کے ساتھ تصاویر ہوں گی۔

شیخ محمد اکرام آئی۔سی۔ایس کا مصنفہ "شبلی نامہ" ضرور پڑھئے۔ شیخ عبدالرشید صاحب جو ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں ہیں اُن کے پاس ضرور ہو گا۔ وجد کر جاؤ گے۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح ایڈیٹر روزنامہ "قومی انجار" کانپور (۲) آپ کا اور جنرل قدوائی صاحب کا خط مختلف تاریخوں میں موصول ہوا۔ انشاءاللہ "قومی انجار" آپ کے پاس آنا شروع ہو جائے گا اور یہ اس لئے بھی کہ آپ دونوں حضرات سے اچھے اچھے برمحل مضامین ملنے کی امیدیں ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ ہم لوگوں کا ایک خاص مقصد ہے جو رل مل کر ہی پورا ہو گا۔ یہ کوتاہی نسیان کار کی بناء پر ہوگئی جو کثرتِ کار میں ہونا لازمی ہے۔

چھپائی کی مشین بریلی میں بھی برائے فروخت ہے۔ اُس کے ایجنٹ آئے تھے مگر تفصیلات مجھے یاد نہیں رہیں۔ کانپور میں جن صاحب کے پاس مشین ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی سے اپنا سودا پکا کر چکے ہیں۔ کتاب پر ریویو کا شکریہ۔ مگر معلوم نہیں کب شائع ہو گا۔

جناب جنرل قدوائی صاحب کو بعد سلام کے معلوم ہو کر یہ واقعہ ہے کہ کتاب (قرآنی فیصلہ) کی رُوح خود مجھ میں بھی باقی نہیں رہی۔ تاہم دل کی بھٹی میں راکھ ٹٹول رہا ہوں۔ اگر کوئی دبی ہوئی چنگاری نکل آئی تو پھر سے مُردہ لہو گرمانے کی کوشش کروں گا۔ ملّاح کشتی منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ہم کو خود ہی ملّاح بننا چاہئے۔ بہتر ہو گا کہ موجوں سے ٹکرا کر نہیں بلکہ موجوں سے بچا کر کشتی پار کرنی چاہئے۔ جب آپ لوگوں کے پاس انجار آنے لگے گا تو آپ خود ہی محسوس کر لیں گے کہ قلم کے ناتواں چپوؤں سے کشتی کھینے کی کوششوں میں میں بھی مصروف ہوں۔

آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب پٹنہ آپ کا مقالہ افتتاحیہ دیکھا۔ دل تڑپ گیا۔ میں بھی اِسی اُدھیڑ بُن میں پڑا ہوں۔ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم غریب یہی چلاتے تھے مگر ہم لوگ "غدار" تھے۔ ابھی ہم کو بہت کچھ دیکھنا ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں اور کیا ہو سکتا ہے۔

پروفیسر محمد ہارون خان صاحب شروانی پرنسپل عربک کالج دہلی (۲) "مصنف" بابت ۱۹۴۷ء ملا۔ یوں تو ہر شمارے کی بات نرالی ہوتی ہے اور پہلے ہی دن سے جی چاہتا ہے کہ اِسے بسم اللہ سے آخر تک ختم کر کے چھوڑا جائے۔ لیکن اِس شمارے میں پہلا ہی مضمون جس کا عنوان "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما" ہے۔ ایسا ہے کہ گویا ہم سب کے دلوں کا آئینہ ہے

جنھوں نے سب سے زیادہ چیخ چیخ کر "پاکستان لیکے رہیں گے" کا نعرہ لگایا تھا وہی زبانِ حال سے وہ سب کہہ رہے ہیں جو آپ نے لکھ دیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو پہلے بھی ہمت کر کے یہی باتیں آج نہیں دو سال سے کہہ رہے تھے لیکن کوئی سُن لیتا تو غدار بن جاتے۔ بہت سے ایک نئی اسلامی سلطنت کے صحیح جوش میں ایسے منہمک تھے کہ اُن کی نظر آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔ بہت سوں کا خیال تھا ۶۰ فی صد کو پاکستان مل گیا تو ۴۰ فی صد کی قربانی میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن انھیں یہ اندازہ نہ تھا کہ ۱۴ فیصد کو پاکستان ملے گا اور ۶۰ فی صد ان قربانیوں پر مجبور رہیں گے جو اِس وقت انھیں اور اُن کی عورتوں بچوں کو کرنی پڑ رہی ہیں۔ یا جو خدا پناہ میں رکھے ممکن ہے کہ آگے کرنی پڑیں۔ میں عملی سیاسیات کا شخص نہیں ہوں، نہ عملی سیاسیات میں میں نے تیس برس سے حصّہ لیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے اِس وقت مسلم لیگ کے نام کو کان ترستے ہیں۔ اِس وقت عام مسلمان اپنے آپ کو یتیم و لیسیر سمجھنے لگا ہے اور مجھ جیسا شخص تو جو دیکھتا سُنتا ہے اُس کا تھوڑی دیر تک یقین نہیں آتا۔ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں کہ ہمیں ازسرِ نو ایک لائحۂ عمل بنانا پڑے گا۔ ورنہ ہم فنا ہو جائیں گے۔ حکومت سے پورا تعاون لازم ہے۔ کیونکہ خود حکومت بھی تو نہیں چاہتی ہوگی کہ ہماری یا کسی جزو آبادی کی خودداری مٹ جائے

میں آپ سے متفق ہوں کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا ایک اجتماع ہونا چاہئے جو سوچے کہ کیا کرنا ہے۔ تاکہ ہمارے ملک اور ہماری جماعت کو بہبودی حاصل ہو۔ جوش کا زمانہ گیا۔ اب تو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا زمانہ ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب نقوی ایم-اے پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی معلوم نہیں آپ کہاں ہیں اور کس مصروفیت میں ہیں۔ کل اصغر علی شاہ صاحب ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ سے تشریف لائے تھے اور صاحبزادہ شہزاد احمد خاں صاحب کا ایک خط و ایک رسید ٹکٹ بابتہ مولانا طفیل احمد مرحوم میموریل فنڈ میرے لئے لائے تھے موصوف سے میں نے آپ کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ البتہ اس قدر بتلایا کہ آپ آجکل بڑی بڑی اسکیموں میں مشغول ہیں۔ مزید معلوم ہوا کہ آپ نے علی گڑھ میں یونیورسٹی پریس بھی خرید لیا ہے۔ خدا مبارک کرے۔

مولوی ابوالسیدین رضوی صاحب ایڈیٹر رسالہ 'امتیاز' کانپور کانپور سے ایک ماہوار علمی رسالہ "امتیاز" عنقریب اجرا ہوگا۔ جس کے لئے ادارہ کو آپ کے ادبی تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ اس رسالہ کے لئے صرف ایسے ادیبوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کا ادب اس دور میں ایک امتیازی حیثیت اور انفرادی اسلوب کا حامل ہے [illegible]

برہان

نمبر ۲۱

مجلس مصنفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

اپریل ۱۹۴۸ء

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی، بی، اے، (علیگ)

قیمت سالانہ:- للعہ (چار روپے)

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باہتمام مولوی منظور احمد خان منیجر

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ طبع شد

مُصنِّف

جلد ۶	بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء	نمبر ا

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل "مصنف" علی گڑھ بابتہ اپریل ۱۹۴۷ء

بات اور صرف ایک بات!!

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

آٹھ مہینے ہونے کو آئے۔ بات ایک ہی ہے۔ مصنف ہو یا اخبار نویس۔ جاہل ہو یا پڑھا لکھا۔ لیڈر ہو یا والنٹیر۔ غریب ہو یا مالدار۔ صناع ہو یا کاریگر۔ تاجر ہو یا ملازمت پیشہ۔ عورت ہو۔ مرد ہو۔ بوڑھا ہو یا بچہ۔ ہر ایک کی زبان پر ایک اور صرف ایک بات۔ اور یہ بات ختم ہی ہونے کو نہیں آتی۔ صبح۔ دوپہر۔ شام اور رات۔ سفر ہو یا حضر۔ شادی ہو یا غمی۔ ایک اور صرف ایک بات۔ چپکے چپکے۔ اور کبھی کبھار ادھر اُدھر دیکھ کر۔ زور سے بھی

پاکستان جائیں۔ یا نہ جائیں؟

ہوا یہ کہ ہندوستان میں تحریک آزادی ہند ہندو اور مسلمان دونوں نے ملکر چلائی اور ایک ساتھ ہی دونوں قوموں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ یہ نہ ہوا کہ ترقی کی دوڑ میں ایک قوم آگے بڑھ گئی اور دوسری پیچھے رہ گئی ہو۔ اچھے کام کئے تو دونوں نے اور بُرے کام کئے تو دونوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان ملکر انگریزوں سے لڑے شکست ہو گئی تو انگریز سے وفاداری اور اُسکی حکومت کو مضبوط بنانے میں ایک نے دوسرے سے بازی لیجانے میں برابر کی کوشش کی۔ غدر کے بعد کانگرس، خلافت کمیٹی، جمعیت العلماء، جمعیت الاحرار اور خدائی خدمتگاروں وغیرہ کو انگریز کے حکم سے ہم ہندو مسلمان۔ اور سکھوں نے کچلنے اور دبانے میں برابر کا حصہ لیا۔ سرحد آزاد۔ افغانستان۔ ایران۔ ترکی اور عرب کے خلاف جنگ کرنے میں انگریز نے ہر مذہب وملت کے لوگوں سے کام لیا۔ مشہد مقدس پر گولہ باری، بیت اللہ شریف کی بیحرمتی۔ عرب ممالک کو غلام بنانے۔ ترکوں کے سینوں پر گولیاں چلانے۔ خاص اپنے ملک کے رہنماؤں پر آئے دن لاٹھی چارج کرنے۔ گولی چلانے جیل میں سختیاں کرنے اور پھانسی کے تختہ پر لٹکانے میں ہم سب "ملا" "مہاشے" اور "سردار" شریک ہوئے۔

ابھی حال میں بمبئی، احمدآباد۔ کلکتہ۔ نواکھالی۔ گڑھ مکتیشر۔ بہار۔ پنجاب۔ مغربی یو پی دہلی اور دیسی ریاستوں کے قتل عام میں وہ کونسا فرقہ ہے جس نے اپنے ہاتھ بیگناہوں کے خون سے نہیں رنگے۔

— کلچرل میدان میں ہندوؤں نے ہندو یونیورسٹی قائم کی اور مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی۔ شہر شہر اور قصبہ قصبہ اسلامیہ اسکولوں کے ساتھ ہی ساتھ 'آریہ سماج'، 'دھرم سماج' اور 'خالصہ' اسکول بنے۔ طرح طرح کی 'انجمنوں' کے ساتھ قسم قسم کی 'سبھائیں' وجود میں آئیں۔ 'اردو' کی جد و جہد کے ساتھ 'ہندی' کے پرچار کا بھی ہنگامہ ہوا۔ ہندوؤں نے 'شدھی سنگھٹن' چلائی۔ مسلمانوں نے 'تبلیغ و تنظیم'۔ ہندوؤں نے 'مہا سبھا' اور 'راشٹریہ سنگھ' کا زور باندھا۔ مسلمانوں نے 'مسلم لیگ' اور 'نیشنل گارڈ' کی تحریک اٹھائی۔ ہندوؤں نے 'آل پارٹیز مسلم کانفرنس' کے چودہ نکات ٹھکرائے۔ مسلمانوں نے تقسیم ملک کی ہٹ دھرمی شروع کر دی۔ "کرپس مشن" اور "کیبنٹ مشن" کی آمد کے موقع پر دونوں نے غیر ضروری ضد اور تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ تکلیف دہ حجت و تکرار کے بعد مسلم لیگ نے 'کیبنٹ مشن' کی تجاویز کو مان لیا تو کانگرس نے "آسام" کا قضیہ کھڑا کر دیا۔ اور تقسیم پنجاب و بنگال کے مطالبے پیش کر دئے۔ بڑی کش مکش کے بعد تقسیم در تقسیم ہو کر ہندوستان و پاکستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوئیں۔

---

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے دونوں مملکتوں کی بدنصیب اقلیتوں کے بارے میں بھی ایک متفقہ اعلان شائع ہوا کہ :- "پچھلے گناہ معاف - جملہ حقوق محفوظ - اور جان کی امان ملے گی"۔

لیکن توبہ کیجئے - یہ اعلان ایک دن بھی یاد نہ رہا - کاغذ کی سیاہی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ عفریت انتقام اپنی پوری ہیبت ناکی اور درندگی کے ساتھ لاچار و مجبور انسانوں کی چیر پھاڑ میں مصروف ہو گیا۔

اس چیر پھاڑ کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ——————— :-

"بزدلی کو بہادری اور کمینہ پن کو شرافت کا نام دیا گیا !!"

جس وقت تک انگریز کی پولس - فوج اور اس کے حکم بردار حاکم موجود رہے - پاکستانی و ہندوستانی علاقوں کے سارے کے سارے "مجاہد" اور "سورما" سخت سے سخت اشتعال انگیزی کے باوجود اپنے اپنے گوشۂ ملامت میں منہ چھپائے پڑے رہے - لیکن جوں ہی کمزور کے لئے انگریز کی سرپرستی مشترکہ فوج کی حفاظت اور مختلف مذاہب و ملل کی مخلوط "سول سروس" ختم ہوئی "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا" جس مفسد و بزدل کو دیکھو مدبر و رستم زماں بنا پھر رہا ہے - ہم پوچھتے ہیں کہ اپنی جماعت و تنظیم اور ہتھیاروں کے پرائیویٹ ذخیروں کے باوجود ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ لوگ کہاں تھے - محلہ محلہ اور گاؤں گاؤں ہندوستان میں مسلم لیگ کے کارکن اور پاکستان میں اکالی پارٹی اور راشٹریہ سنگھ کے "ورکر" ایک دوسرے کے خلاف زہر پھیلاتے پھرتے تھے - مگر کوئی نہیں تو کہتا تھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں - آج کیا بات ہے کہ ایک ہی شخص چند منٹ پہلے سرحد کے اس پار کمزور و بزدل اور

چند منٹ بعد سرحد کے اُس پار درندگی و خونخواری کا بھوت بن جاتا ہے۔

اصلی بہادر ہر جگہ اور ہر وقت بہادر ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ جب زبردست کا مقابلہ ہو تو بھیگی بلّی اور کمزور سے واسطہ ہو تو ببر شیر۔ کوئی بھی قوم ہو اُس کی تہذیب و شرافت میں سب سے بڑی اور سب سے بنیادی صرف یہی ایک چیز دیکھی جاتی ہے۔

غریبوں۔ کمزوروں اور بے بس مخلوقِ خدا پر ہندوستان اور پاکستان میں جو بیتا پڑی۔ اُس نے ساری دُنیا میں دونوں قوموں اور ملکوں کا نہ صرف ہمیشہ کے واسطے منہ کالا کر دیا بلکہ آزادی و حکومت کا بھی نااہل قرار دے دیا۔

"سکندر" نے پنجاب کے راجہ "پورس" کو شکست دی۔ شکست خوردہ راجہ گرفتار ہو کر فاتح کے سامنے پیش ہوا تو سوال کیا گیا کہ:۔

"بتاؤ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔؟"

جواب دیا:۔ "جیسا ایک بہادر۔ بہادر کے ساتھ کرتا ہے۔"

سکندر نے پورس کو گلے سے لگا لیا اور مفتوحہ ملک اُس کو واپس کر دیا۔ اِسی بہادری اور جوہرِ شرافت نے رہتی دُنیا تک کے لئے سکندر کو "سکندرِ اعظم" بنا دیا۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے:۔

"میں فوج کا ایک ادنٰے اور غریب سپاہی ہوں۔ میرے جنرلوں نے مجھ سے دغا کی۔ میدانِ جنگ میں مجھے چھوڑ کر خود بھاگ گئے۔ میں گرفتار ہوا۔ میں نے اپنی غلطی کی گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگی۔ مجھے علی الاعلان معاف بھی کر دیا گیا۔ مگر جب میں خوش خوش گھر لوٹنے لگا تو پیچھے سے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ میرا مکان چھین لیا۔ اور میرے بے قصور بال بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو یا تو تہہ تیغ کر دیا گیا اور یا خانماں برباد کر دیا گیا۔"

بتاؤ! کیا یہ بہادری ہے؟ کیا یہ پابندئ عہد ہے؟ کیا یہ شرافت ہے؟ دُنیا اِس واقعہ کو کس نام سے پکارے گی؟ اور آیندہ کا مورخ اس حادثہ کو کس طور پر لکھے گا۔؟

انسانیت و شرافت۔ امن و انصاف اور آزادئ وطن کے دیوتا مہاتما گاندھی نے

پاکستان سے سرِدست قطع نظر کر کے صرف ہند باشیوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ عدیم المثال اخلاقی جرأت و حق پرستی کا ثبوت دیا۔ مشرقی و مغربی بنگال اور بہار میں امن قائم کیا۔ مظلوموں کی داد رسی کرائی۔ لیکن دہلی و پنجاب کی آگ میں آکر وہ کودے تو خود جل کر بھسم ہو گئے۔ شر خیر پر غالب آگیا۔ ایک 'مہاویر' ٹوٹے ہوئے دلوں کا آخری سہارا تھا۔ اُس کی زندگی سے کروروں بے کس انسانوں کو ڈھارس تھی۔

اُس کی موت بھی ضائع نہ گئی اور بہت بڑا کام کر گئی۔ انسان اور درندوں میں پہلے جو پہچان مشکل ہو گئی تھی وہ کھل کر سامنے آگئی۔ غلط کار افراد اور جماعتیں رائے عامّہ کی تائید سے محروم ہو گئیں۔ دودھ اور پانی الگ الگ ہو گیا۔ اب صرف یہ دیکھنا اور باقی رہ گیا ہے کہ اس دودھ میں بھی تو آگے چل کر زہر نہیں نکلے گا۔

اخبارات کی اطلاعوں اور پیش آنے والے روزانہ واقعات پُر امید بھی ہیں اور مایوس کن بھی۔ ایک سانس تقویت کا سبب ہوتی ہے تو دوسری اضمحلال کا باعث۔ یہ اُمید و بیم۔ یہ کشمکش۔ اور یہ بے اطمینانی عارضی ہے یا مستقل؟ اس کا فیصلہ دشوار اور سخت دشوار ہو گیا ہے۔ قوتِ عمل مفلوج اور اچھی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔

کیا ملک و قوم کو ہماری خدمت کی ضرورت نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو اُس کے واسطے باعزت اور سازگار ماحول کب پیدا ہوگا؟ کروروں انسانوں کی ایک تربیت یافتہ اور کارآمد جماعت کا زیادہ عرصہ بے کار رہنا بہت بڑے ملکی و قومی نقصان کی بات ہے۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سیّد الطاف علی بریلوی
(مدیر)

علی گڑھ — ۲۵ مارچ ۴۸ء

شذرات

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ ڈی۔ایس۔سی۔سی۔آئی۔ای۔ایم۔ایل۔اے (سنٹرل) سابق وائس چانسلر و ریکٹر مسلم یونیورسٹی کا سانحۂ ارتحال ہمارے ملی و ملکی حادثات میں ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ مرحوم ایک غریب گھر کے فرد تھے۔ ذاتی محنت و قابلیت سے ترقی کی وہ تمام منزلیں طے کیں جنکا کوئی اولوالعزم سے اولوالعزم انسان تصور کر سکتا ہے۔ ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کے اعتبار سے اُن کا تبحر علمی بے مثل تھا لیکن اُنکی ہمتِ بلند نے اِسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ سیاسی۔ مالیاتی اور تعلیمی میدانوں میں بھی اُنھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ تقریباً پون صدی تک سر سید اور اُنکے رفقائے کار نے تعمیر ملی کے کاموں میں لامحدود و لاتناہی جد و جہد کی جو روایات قائم کی تھیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اس سلسلہ اور مکتبۂ خیال کے آخری فرد تھے۔ اب قومی نظریات اور قومی کام کی قدریں یکسر منقلب ہوگئیں اور اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایک کرکے پُرانے کام کرنے والے بھی یا تو رخصت ہوگئے اور یا موجود ہیں تو بے کار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی بے کار رہیں۔ اس لئے اپنی ضرورت ختم ہوتے دیکھ کر خود بھی ختم ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اپنی زندگی میں مقبول بھی تھے اور نامقبول بھی اور یہ صورت حال ہر بڑے آدمی کے واسطے ناگزیر ہے۔ نامقبولیت انتقال کے بعد فراموش ہوگئی۔ صرف مقبولیت ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی رحلت سے مسلمانوں کا جس طرح نقصانِ عظیم ہوا۔ اسی طرح برادرانِ وطن میں ڈاکٹر مونجے اور بھائی پرمانند آنجہانی کی موتیں بھی ناقابل فراموشی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ مسلمانوں سے اُنکا معاملہ کیسا تھا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اپنے کردار و نظریات میں وہ کس قدر مضبوط۔ دلیر۔ مستقل مزاج تھے اور اُن کو عملی جامہ پہنانے میں عیش و راحت اور دُنیوی ترقی کی اہمیت ترک کرکے اُنھوں نے کیسی کیسی زبردست قربانیاں کیں اور تکالیف اُٹھائیں تیس سال سے ان ہندو مشاہیر کے ناموں اور

(مخالف یا موافق) غور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گزشتہ سہ ماہی میں بہت سے معرکہ کے علمی آدمی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ بالخصوص مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری کے انتقال سے تصنیفی دُنیا میں ایک ایسا خلاء ہوگیا جس کو پُر کرنا آسان نہ ہوگا۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد یہ دوسرے بلند پایہ مؤرخ تھے۔ اُنکی معرکۃ الآرا تالیفات "البرامکہ" اور "نظام الملک طوسی" نے قابلِ رشک شہرت و مقبولیت حاصل کی اور یہ کتابیں رہتی دُنیا تک اہلِ علم کے وردِ زباں رہیں گی۔ دُعا ہے کہ جس طرح دُنیا میں آن مرحوم کی خدمت مقبول ہوئی بارگاہِ خداوندی میں بھی اُن کو صلۂ وافر نصیب ہو۔ آمین۔

حضرت ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی مدظلہ کے نامِ نامی کی 'غبارِ خاطر' اور 'کاروانِ خیال' (مجموعہ ہائے مکاتیب مابین نواب صاحب و مولانا آزاد) کے ذریعہ جو نشأۃ ثانیہ ہوئی اُس نے موصوف کی دوسری تشنۂ طباعت تصانیف کو بھی منصۂ شہود پر لانے میں مدد دی۔ چنانچہ آپ کے علمی۔ تاریخی۔ ادبی بلند پایہ مقالات کا پانچسو صفحات کا مجموعہ "مقالاتِ شروانی" چھپ کر مشاہیر اہلِ علم اور ملک کے مشہور کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کو بلا قیمت تحفۃً روانہ کر دیا گیا۔ جس طرح علامہ شبلی نعمانی نے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح عمری "الفاروق" لکھی تھی۔ اُسی طرح ایک زمانہ گزرا نواب صدر یار جنگ بہادر نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لائف "سیرۃ الصدیق" تالیف فرمائی تھی۔ کتاب کا شمار نہایت مشہور و معیاری کتابوں میں تھا۔ الفاروق کی طرح اس کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ مولانا ظفر علی خانصاحب نے 'الفاروق' کا انگریزی ترجمہ کیا تو خیال تھا کہ نواب صاحب کی یہ قیمتی کتاب بھی اس بین الاقوامی زبان میں منتقل ہو جائے۔ اللہ کا احسان ہے کہ یہ کام ہو گیا۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی استاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور "شیخ محمد اشرف لاہوری" نے بہت نفیس طریقہ سے اُس کی طبع و اشاعت کا انتظام کر دیا۔ اب آجکل نواب صاحب کا 'اردو دیوان' مدینہ پریس بجنور میں اور 'دیوانِ فارسی' ہماری "نیشنل پرنٹرس کمپنی" کے زیر اہتمام ہمارے "مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ" میں زیرِ طبع ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نئے آنریری جوائنٹ سکریٹری شفاء الملک حکیم محمد عبداللطیف صاحب

فلسفی ایک ذہین وطباع عالم وادیب ہیں۔ آپ کی قریب ایک درجن چھوٹی بڑی تصانیف ہیں۔
ہندی، اُردو زبان ورسم الخط کا آج کل جو افسوسناک وجارحانہ قضیہ درپیش ہے۔ اس پر
بے نتیجہ شور وغوغا کرنے کے بجائے آپ نے پنڈت سندر لال صاحب اور ڈاکٹر بھگوان داس صاحب
کی "ہندوستانی کلچر سوسائٹی" کی تقلید میں اپنی تازہ تصنیف "ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا"
ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں متوازی کالموں اور لائنوں میں چھپوائی ہے۔ اس طریقۂ
طباعت کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہندی یا اُردو رسم الخطوں سے قطعاً ناواقف لوگ اُن کو آسانی اور
بہت جلد سیکھ جائیں گے۔ نیز کسی بھی رسم الخط کے ساتھ ناانصافی کا محل باقی نہ رہے گا۔

شفاء الملک صاحب کی رہنمائی سے علیگڑھ کی "نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ" نے بھی استفادہ کیا
ہے۔ اور اس کا بچوں کا ماہوار رسالہ "دھنک" (دھنش) بھی اسی ماہ اپریل میں نہایت
دیدہ زیب اور ہندی اُردو متوازی رسم الخطوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ اِس رسالہ کی زبان عام فہم
اور روز مرہ کی بول چال ہوگی۔ اِس کی ایڈیٹری کے لئے مشہور اہل قلم مرزا شبیر بیگ صاحب سابق
اسسٹنٹ ایڈیٹر وایڈیٹر "مدینہ" بجنور۔ "زمزم" لاہور۔ "منشور" دہلی۔ "غنچہ" اور "صبح وطن"
کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ حکیم صاحب کی کتاب اور رسالہ "دھنک" کا حسب دلخواہ خیر مقدم
ہوا تو ارادہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر اس کام کو وسعت دی جائیگی۔ انشاء اللہ!

تہافت الفلاسفہ: ۔ امام غزالیؒ کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس میں اُنھوں نے فلاسفۂ
قدیم کے اُن نظریات کی جو مذہب اسلام کے اصول اور عقائد کے خلاف ہیں تردید کی ہے۔ اس کتاب
کی افادیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ جس قدر اعتراضات اور جوابات انسانی تخیل میں آسکتے
ہیں وہ سب پیش کر کے فلاسفہ کے اصول کی عظمت پر خاک ڈال دی ہے۔ اس کتاب کا پہلا مسئلہ
بہت ہی اہم ہے کیونکہ قدامت عالم پر فلاسفہ اور متکلمین میں بہت لمبی چوڑی بحثیں خلفائے عباسیہ کے
زمانہ میں چھڑی رہیں۔ اس کتاب میں صرف فلاسفہ کے نظریات کی تردید کی گئی ہے۔ کوئی بات ثابت
نہیں کی گئی ہے۔ انگریزی یا اُردو میں ابتک اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ اِس سلسلہ کی امام غزالیؒ
کی ایک دوسری کتاب "مقاصد الفلاسفہ" کا البتہ حیدرآباد میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اِس کا
ترجمہ شروع کیا تھا مگر نہ معلوم کیوں چھوڑ دیا۔

ابوالقاسم محمد میاں صاحب انصاری بحر العلومی خلف مولانا عبدالرشید صاحب فرنگی محلی بی اے

(ریسرچ اسکالر فلاسفی ڈپارٹمنٹ ہماری "کانفرنس اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ" میں زیر نگرانی خاص جناب پروفیسر میاں محمد شریف صاحب و شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب ترجمہ کر رہے ہیں۔

کانفرنس اکیڈمی کے ایک دوسرے ریسرچ اسکالر مسٹر فصیح احمد کمالی ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی اصل ترجمہ کو انگریزی زبان میں منتقل کر رہے ہیں ——— ہر دو تراجم کافی مقدار میں ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ جلد اشاعت پذیر ہو سکیں گے۔

تہافت الفلاسفہ کی طرح الجواہر العالیہ کا بھی اکیڈمی ترجمہ کرا رہی ہے۔ یہ کتاب علامہ خیرآبادی کا شاہکار نامہ ہے جس کی حلقۂ فلاسفہ میں جتنی قدر کی گئی اور کی جا رہی ہے کم ہو گی۔ اس رسالہ میں شمس العلماء علامہ عبدالحق خیرآبادی نے مابعد الطبیعات کے تمام اہم مسائل کے متعلق قابل ذکر فلاسفہ کے خیالات کا نہایت مختصر طور پر تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ علامہ نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی مسئلہ کو تشنہ نہ رکھا جائے۔ جہاں کہیں دوسرے فلاسفہ کے خیالات انھیں صحیح معلوم ہوئے انھیں برقرار رکھا اور جہاں کہیں ان میں کسی قسم کی کوتاہی پائی انھوں نے اپنے دلائل پیش کر کے صحیح نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مابعد الطبیعات پر اس قسم کی کتابیں عام طور پر کم لکھی گئی ہیں۔

یہ کتاب ترجمہ ہونے کے بعد غیر عربی داں فلسفیوں کیلئے ایک بڑی مدد ثابت ہو گی۔ جہاں تک ہمارا علم ہے ابھی تک نہ تو انگریزی اور نہ ہی اردو میں کوئی ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں عربی فلسفہ کے تمام نکات کو بیان کیا گیا ہو۔ اس کتاب کے ترجمہ کے بعد مغرب و مشرق کے ان حلقوں میں جہاں فلسفۂ اسلام کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ثابت ہو جائیگا کہ مسلمان مابعد الطبیعاتی مسائل میں کس قدر غور و خوض کر چکے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب فلسفہ کا ایک نہایت بیش قیمت خزانہ ہے جس سے ابھی تک کم لوگ متمتع ہو سکے ہیں۔ ہماری کانفرنس اکیڈمی کے تیسرے ریسرچ اسکالر مسٹر عمر حیات خاں ایم۔اے "الجواہر العالیہ" کے ترجمہ کی خدمت پر مامور ہیں اور جناب شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب اور پروفیسر میاں محمد شریف صاحب ان کے کام میں بھی نگرانی خاص فرماتے ہیں۔

اللہ رب العزت مندرجہ بالا جملہ علمی و تصنیفی کاموں کے واسطے وہی سہولتیں اور ان کی تکمیل و اشاعت کے لئے ضروری اسباب و عافیت ارزانی فرمائے۔ آمین!

سید الطاف علی بریلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانی پت کا خونیں میدان

(از سید جالب مرحوم دہلوی)

۲

پانی پت پر دونوں فوجوں کی صف آرائی

بھاؤ نے قصبۂ پانی پت کی آبادی کو اپنے لشکر کے بیچ میں لے کر اپنے لئے مضبوط لائن تیار کی جس کے گرد ساٹھ فیٹ چوڑی اور بارہ فیٹ گہری خندق کھدوائی اور جو مٹی اس کھدائی میں نکلی اس سے اونچا دمدمہ تیار کرا کے اس پر اپنی بھاری توپیں قائم کیں اور اس مضبوط حصار کے اندر مرہٹہ سرداروں کے کمپ الگ الگ قائم ہوئے۔ ہر کمپ کے گرد پہرہ چوکی کا انتظام تھا اور سردار کے خیام کمپ کے وسط میں نصب کئے گئے۔ جن میں ایک حصہ زنانہ ڈیروں کا تھا۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے پیچھے جب پانی پت پر پہنچا۔ اور اس نے مرہٹوں کو مضبوط لائن کے اندر دیکھا تو چار کوس آگے بڑھ کر ایک مقام کو جو شمال مغرب کی طرف قصبہ پانی پت کے عین مقابل تھا اپنے لشکر کے قیام کے لئے پسند کیا اور افغانوں نے اپنے ملک کے دستور کے موافق پتھروں اور درختوں کے تنوں سے سنگرین حفاظت کے لئے بنائیں اور ان کے عقب میں توپیں لگائیں لشکرگاہ کے اندر افغان و روہیلہ سرداروں کے کمپ الگ الگ قائم کئے گئے اور ہر سردار کی طرف سے اپنے کمپ کے سامنے دیدبانی اور حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ دن کو ایک کمپ کے آدمی دوسرے کمپ میں

جاتے اور مشاغل تفریح میں شریک ہوتے تھے۔ شاہ ابدالی نے اپنے خیام قریباً وسط لشکر میں لگائے تھے اور کیمپ کے اگلے حصے میں بھی ایک لال ڈیرہ نصب کیا تھا۔ جس میں شاہ روزانہ چند گھنٹہ گذارتا اور دشمن کے لشکر کی خبریں سنتا تھا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے کیمپ کے گرد چکر لگاتا اور بعض اوقات پانی پت کی طرف بڑھ جاتا تھا۔

گردونواح کی لڑائیاں

بھاؤ نے پانی پت پہنچنے سے قبل ہی گوبند راؤ پنڈت بوندیلے کو جو پیشوا کی طرف سے بوندیلکھنڈ اور انتربید (دوآبہ مابین گنگ وجمن) کے غربی حصوں کوڑہ جہان آباد۔ اٹاوہ وغیرہ کے علاقوں میں تحصیل وصول مالگذاری پر مامور تھا۔ یہ حکم بھیجدیا تھا کہ اپنے علاقے سے وہ مرہٹوں کی امداد کے لئے فوج فراہم کرے اور افغانوں کے لشکر کی رسد کو روکے۔ گوبند راؤ بوندیلے اس کام میں خاص مہارت رکھتا تھا اور نجیب الدولہ پر مرہٹوں کی چڑھائی کے وقت اس نے گنگا کو عبور کر کے روہیلوں کے سینکڑوں گانوں تباہ و ویران کر دیئے تھے۔ بھاؤ کے حکم سے اُس نے دس بارہ ہزار فوج اکٹھی کی اور میرٹھ کو اپنا مستقر بنایا۔ اُس کے رسالے والے شاہ ابدالی کے لشکر کے عقب میں دُور دُور رہ کر گانوؤں کو تاراج کرتے اور رسد لانے والی پارٹیوں کو لوٹتے رہے۔ پانی پت سے لیکر دہلی تک ذرائع آمد و رفت پہلے ہی مرہٹوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس لئے گوبند راؤ بوندیلے نے جب روہیلوں اور بنگش کے علاقوں سے لشکر ابدالی میں رسد پہنچنے کی روک تھام کی تو افغانوں کو قلتِ اجناس خوراک سے بیحد تکلیف پہنچنے لگی اور بعض روایات کے بموجب چاول کا بھاؤ دو روپے سیر اور آٹا و گندم کا ایک روپے سیر تک لشکر ابدالی میں چڑھ گیا۔ افغان اس طریقۂ جنگ کے عادی نہ تھے۔ اس لئے وہ پریشان ہوئے لیکن اُن کے ہندوستانی رفیقوں نے شاہ کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی صلاح دی اور وزیر اعظم کے بھانجے عطائی خان کو جس کا باپ سردار عبدالصمد خاں کنج پورہ میں مرہٹوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ پانچ ہزار افغان سواروں کے ساتھ گوبند راؤ کی دستبرد کی روک تھام کے لئے مامور کیا گیا اور عنایت خان خلف حافظ رحمت خان رئیس بریلی کے رسالے کے پانسو جوان افغانوں کی رہنمائی و امداد کے لئے دیئے گئے۔ عطائی خان سہ پہر کو لشکر شاہ سے خاموشی کے ساتھ نکل کر غازی الدین نگر کو جس کے نواح میں بوندیلے کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی روانہ ہوا اور رات بھر میں چالیس کوس کی منزل طے کر کے طلوع آفتاب کے ساتھ اس مقام پر جا پہنچا جہاں گوبند راؤ پنڈت ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے ساتھ ایک آموں کے باغ میں مقیم تھا۔ افغانوں کو

یکایک اپنے سروں پر پاکر گوبند راؤ پنڈت اور اُس کے سواروں سے کچھ بن نہیں پڑا اور چونکہ بوندیلے کا سن پچھتر سال سے متجاوز ہوچکا تھا اور جسم بہت فربہ تھا اس لئے جلد سوار ہوکر نکل بھاگنے کا اس کو موقعہ نہیں ملا اور عطائی خان کے سواروں نے اُس کو قتل کرڈالا۔ اُس کے سپاہیوں کا سامان لُوٹ لیا اور گوبند راؤ پنڈت کا سر کاٹ کر ساتھ لائے اور احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں اُس کو نذر گذرانا۔ شاہ موصوف نے اِس مہم کے سر کرنے پر اُس کو خلعت دیا۔ اور اس کے بعد لشکرِ شاہ میں فرخ آباد اور روہیلکھنڈ سے رسد پہنچنے لگی۔

گوبند راؤ پنڈت بوندیلے جیسے قابل و تجربہ کار سردار کے مارے جانے سے بھاؤ کو قدرتی طور پر سخت رنج پہنچا۔ اور شجاع الدولہ کی معرفت اندرونی طور پر جو گفت وشنید صلح کی بابت قریب قریب علانیہ ہو رہی تھی اور جس میں مرہٹہ بتدریج شاہ ابدالی کے افغانستان واپس چلے جانے کے سابق مطالبہ کو چھوڑ کر پہلے لاہور اور بعد ازاں سرہند تک افغانوں کی حکومت میں داخل ہونے اور شجاع الدولہ وسردارانِ روہیلہ و نواب بنگش کے علاقوں پر کوئی دست درازی کئے بغیر اپنی فوجوں کو دکن واپس لیجانے پر رضامند ہوگئے تھے وہ بند ہوگئی۔ بھاؤ کا دعویٰ تھا کہ گوبند پنڈت صرف اپنے لشکر کے لئے رسد فراہم کرتا تھا اور اُس کو اس طریقے پر دھاوا کرکے قتل کرڈالنا جائز نہیں تھا۔

اِس واقعہ کے بعد شاہ ابدالی نے جہان خان کو چھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ مرہٹوں کی رسد لانے والی پارٹیوں کی گرفتاری کے لئے اور شاہ پسند خان کو اسی قدر جمعیت کے ساتھ پانی پت کے آس پاس کے دیہات کو تباہ کرنے کے لئے مامور کیا اور بہادر خان کو چھ ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کی لائن کی نگرانی سپرد کی۔ جہان خان کے آدمیوں سے مرہٹوں کی رسد لانیوالی جماعتوں سے کئی بار مقابلے ہوئے اور اُن کی رسد افغانوں نے چھین لی۔ بہادر خان کے سپاہی مرہٹہ کمپ کے گرد لگے رہتے تھے اور جو آدمی باہر نکلتے تھے اُن کو گرفتار کر لاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نے پہلے عہ اور بعد ازاں صہ رفی سر انعام مقرر کیا تھا اور احمد خان بنگش مرہٹوں کو زندہ گرفتار کرکے لانے پر دو روپے سے صہ رفی کس تک انعام دیتے تھے۔ اِن ماخوذین کو احمد خان دن بھر قید رکھتے اور آدھی رات کو غلہ وغیرہ دے کر چھوڑ دیتے تھے۔ اِسی دوران میں مرہٹوں کو ایک اور بھی نقصان پہنچا کہ نارو شنکر برہمن نے دہلی سے اپنے آدمیوں کے ہاتھ نقد اور سامانِ رسد ایک فوجی بدرقہ کی زیرِ حفاظت مرہٹوں کے لشکر کو روانہ کیا تھا۔ پانی پت کے

قریب بیرونگ افغانوں کے خوف سے شب کو سفر کر رہے تھے۔ شب کی تاریکی میں اتفاق سے اِس بدرقہ کا ایک حصّہ جس کے پاس روپیہ تھا راستہ بھول کر شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف چلا گیا جہاں افغانوں نے تمام آدمیوں کو قتل کر کے اُن کا روپیہ چھین لیا۔

اِن وجوہ سے مرہٹوں کی طرف سامانِ خوراک کی قلّت شروع ہوئی۔ اور جس قدر ذخائر غلّے کے قصبۂ پانی پت میں موجود تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے کھاپی کر برابر کر دیئے۔ سورج مل اور راجپوتانہ کے راجہ اپنے علاقوں سے کچھ رسد مرہٹوں کو بھیجتے تھے اور سورج مل نے کئی مرتبہ روپیہ بھی روانہ کیا۔ مرہٹوں کی ایک دستاویز سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سورج مل نے ایک کروڑ کی رقم بھیجی جو مرہٹوں کے لشکر میں پہنچ بھی گئی مگر چونکہ بنجارے وغیرہ جو غلّہ جان جوکھوں اُٹھا کر لاتے تھے اُس کی وہ بہت بڑی قیمت طلب کرتے تھے۔ اس لئے روپیہ کی قلّت بھی محسوس ہونے لگی اور آخری ایّام میں تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ عورتوں کے زیورات اور طلائی و نقرئی ظروف و سامان کو گلوا کر اُن کی اشرفیاں اور روپئے اُن ٹکسالوں میں ڈھالے گئے جو مرہٹہ کیمپ میں قائم کی گئیں تھیں۔ الغرض اب مرہٹے گویا محاصرے میں آگئے اور اس کی مدّت جسقدر طوالت پذیر ہوتی گئی اُن کی تکالیف و مشکلات بڑھتی گئیں۔

بین درمیانی لڑائیاں

ملہار راؤ ہولکر اور جنکوجی سیندھیا اس طریقۂ جنگ کے پہلے سے مخالف تھے مگر بھاؤ نے ان کے مشوروں پر کان نہیں دھرا۔

ن روز نارو شنکر کا دہلی سے بھیجا ہوا روپیہ اور غلّہ افغانوں کے ہاتھ آگیا تو ہولکر نے شمن پر حملہ کرنے کی رائے دی۔ چنانچہ اس کے بعد ایک لڑائی مرہٹوں اور افغانوں کے درمیان ڑی۔ مرہٹہ مورخین اس کو وزیر کی لائن پر باقاعدہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہولکر کی زیر کمان پندرہ ہزار میوں کی جمعیت سے کیا گیا تھا اور مرہٹے دھاوا کرتے ہوئے افغانوں کی صفوف کو توڑ کر وزیر ے کیمپ میں گھس گئے تھے مگر چاروں طرف سے وزیر کو کمک پہنچی تو مرہٹوں پر دباؤ پڑا اور وہ پیچھے ٹے آنے کے لئے مجبور ہوئے۔ مرہٹوں نے ابتدائی حملے میں دو ہزار پٹھانوں کو قتل کر ڈالا تھا مگر بعد میں کو بھی بقول گرانٹ ڈف ایک ہزار اور فارسی تاریخوں کے بموجب تین چار ہزار آدمیوں کا نقصان نا پڑا اور پٹھانوں نے مرہٹہ کیمپ تک ان کا تعاقب کیا۔

دوسری لڑائی کی ابتدا کے متعلق بھی اِسی طرح مرہٹہ و فارسی روایات کا اختلاف ہے۔ مرہٹہ ات کے بموجب بھاؤ نے وسواس راؤ۔ ملہار راؤ ہولکر۔ بلونت راؤ گنپت مینڈلی اور کئی دیگر نامی

سرداروں کی معیت میں شاہ ولی خان وزیر اعظم پر جو ایک مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے حملہ کیا اور وزیر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، مگر انہوں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور کیمپ میں اطلاع بھیجی نجیب الدولہ و دیگر سرداران کی امداد کے لئے دوڑے اور سخت خون ریز لڑائی واقع ہوئی۔ نجیب الدولہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مرہٹوں کو دباتے ہوئے آگے نکل آئے اور مرہٹوں کے کیمپ کے قریب پہنچ گئے اُس وقت بلونت راؤ کئی ہزار آدمیوں کے ساتھ نجیب الدولہ پر حملہ آور ہوا اور تین ہزار آدمی نجیب الدولہ کے مارے گئے۔ سردار موصوف پر یہ ایک نازک وقت تھا اور مرہٹہ مورخین کا دعویٰ ہے کہ مرہٹے اس روز کی لڑائی قریب قریب جیت چکے تھے۔ نجیب الدولہ اس طرح گھرے تھے کہ وہ شاید زندہ پلٹ کر شاہ ابدالی کے لشکر میں نہ جا سکتے اور قتل یا گرفتار ہو جاتے۔ مگر شام کے قریب ایک بندوق کی گولی بلونت راؤ کے لگی۔ جس سے اُن کی حالت غیر ہونے لگی۔ بھاؤ اپنے برادر نسبتی و مشیر خاص کو مہلک زخم پہنچنے سے بدحواس ہو گیا اور اُس نے مرہٹوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ سیر المتاخرین و خزانۂ عامرہ کی روایات کے بموجب شاہ ولی خان وزیر کو مرہٹوں نے نہیں گھیرا تھا بلکہ خود افغانوں نے شاہ کے حکم سے مرہٹوں کے توپ خانے پر باقاعدہ حملہ کیا تھا اور ان کے تمام سردار اپنی فوجوں کے ساتھ اس حملے میں شریک ہوئے تھے۔ مرہٹے حملے کی خبر پا کر مقابلے کو نکلے اور دونوں فوجوں میں باہم لڑائی ہوتی رہی۔ نجیب الدولہ نے اس موقعہ پر زیادہ جوش دکھایا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ بندوقیں مارتے ہوئے مرہٹوں کے مورچوں میں گھس گئے جہاں وہ مرہٹوں کے درمیان گھر گئے۔ مگر نجیب الدولہ کے رفقا نے مرہٹوں کے سردار بلونت سنگھ کو بندوق کا نشانہ بنایا جس سے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ نجیب الدولہ کے کئی ہزار آدمی ضائع ہوئے مگر وہ بخیریت مرہٹوں کی لائن سے نکل کر اپنے لشکر میں آ گئے۔

تاریخ فرخ آباد میں ایک شبخون کا ذکر ہے جو ابراہیم خان گاردی نے احمد خان بنگش کی برج پر مارنا اور ایک دم ہلہ کر کے اُن کی توپوں کو چھین لینا چاہا تھا مگر احمد خان کے آدمی ہوشیار تھے اور اُن کی توپوں میں گراب بھرا رہتا تھا، جب مرہٹوں کی آمد کا اُن کو پتہ لگا تو انہوں نے توپوں کو آگ دکھائی۔ جب توپیں چلیں تو گاردی کے سینکڑوں آدمی مجروح و مقتول ہوئے اور وہ واپس چلے گئے۔

اسی قسم کے ایک شبخون کا تاریخ رام پور میں حوالہ دیا گیا ہے جو نواب فیض اللہ خان کے تحت سردار رضی خان کی فوج پر گاردی کے بھائی فتح خان نے مارنا چاہا تھا لیکن ...

بڑی سرگرمی کے ساتھ دشمن کی مدافعت کی اور مرہٹے تین سو آدمیوں کا نقصان اٹھا کر اور اپنی چند توپیں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ نواب فیض اللہ خاں نے جنگ ختم ہونے کے بعد رام پور واپس آکر رضی خان کو اُس روز کی فتح پر خلعت دیا اور ایک موضع جاگیر میں عنایت کیا۔ مرہٹہ مؤرخوں کی کتابوں میں ان دونوں شبخونوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ وہ افغانوں پر الزام لگاتے ہیں اور فارسی تاریخوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے شب کو دھوکے سے جنگل میں مرہٹوں کے گھسیاروں اور لکڑہاروں وغیرہ پر حملہ کیا اور کئی ہزار آدمیوں کو جان سے مار ڈالا شاہ ابدالی نے صبح کو جا کر دیکھا تو لاشوں اور سروں کے انبار پائے اور مرہٹوں کو جب اِس ہولناک واقعہ کی خبر ہوئی تو غم و غصہ کے ساتھ عالم ہراس و اضطراب اُن پر چھا گیا۔

مصالحت کی سلسلہ جنبانی

یہ لڑائیاں فریقین میں ہو رہی تھیں اور دونوں طرف سے روزآنہ توپیں بھی چلتی تھیں مگر اندرونی طور پر مصالحت کی سلسلہ جنبانی بھی قائم تھی۔ بھاؤ کے پیام شجاع الدولہ کے پاس اور ملہار راؤ ہولکر کے نجیب الدولہ کے پاس آتے تھے اور معتمد علیہ اشخاص بھی آتے جاتے تھے۔ چنانچہ شجاع الدولہ نے راجہ دیبی دت و کاشی راؤ کو بھاؤ کے پاس بھیجا اور بھاؤ نے بھوانی شنکر برادر راجہ نارو شنکر و گنیش راؤ کو روانہ کیا۔ نواب شجاع الدولہ صلح کی طرف مائل تھے اور انہوں نے وزیر کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو بھی مطلع کیا۔ احمد شاہ نے کہہ دیا تھا کہ میں آپ لوگوں کا بلایا ہوا آیا ہوں اگر آپ مرہٹوں سے صلح کرنی چاہیں تو آپ کو اس بارے میں کامل اختیار ہے لیکن اگر جنگ ہوئی تو اس وقت آپ لوگوں کو میری مرضی پر چلنا ہوگا۔ نجیب الدولہ چونکہ مرہٹوں کے ہاتھوں بہت اذیت پا چکے تھے، اور اُن کے علاقے کو گوبند راؤ پنڈت نے ویران کر دیا تھا نیز بھاؤ کے غرور کا حال ان کو معلوم تھا جس میں مذہبی تعصب کا رنگ بھی صاف جھلکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ صلح کی مخالفت کی اور کہا کہ اس وقت مرہٹے مجبور و لاچار ہیں۔ اس لئے تمام شرائط ماننے کو تیار رہیں۔ لیکن اس خطرے سے چھوٹنے کے بعد وہ کسی عہد و پیمان کی پرواہ نہ کریں گے۔ شاہ ابدالی اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے اور یہاں ہم سب کے علاقوں کو مرہٹے جی بھر کے تاراج کریں گے اور ہندوستانی امراء کو نان شبینہ سے محتاج کر دیں گے۔ نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کی خدمت میں جا کر بھی اپنے یہی خیالات بیان کئے اور ان کے وزیر اعظم شاہ ولی خان کو بالکل اپنے موافق

کرلیا۔ اس لئے شجاع الدولہ کی کوششیں مصالحت کے متعلق کامیاب نہ ہوسکیں۔ لیکن ہندوستان کے دستور کے موافق آخری معرکہ شروع ہونے کے وقت تک نامہ و پیام بھاؤ اور شجاع الدولہ کے درمیان جاری رہے۔ ملہار راؤ ہولکر اور نجیب الدولہ کے درمیان بھی خفیہ نامہ و پیام ہوتے تھے اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رعایت برتنے کا معاہدہ کرلیا تھا۔ جس کا عملی طور پر نفاذ بھی کیا گیا اور ملہار راؤ ہولکر کے نکتہ چیں اس پر برابر یہ الزام لگاتے رہے کہ اس نے معرکہ پانی پت میں کافی بہادری نہیں دکھائی اور جان چرا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وتھل راؤ شیدیو اور ملہار راؤ ہولکر کی ایک مشترکہ عرض داشت بنام بالاجی باجی راؤ پیشوا جو اصل فارسی زبان میں موجود ہے اور جس کا ترجمہ کنکیڈ و پارسنس کی تاریخ مرہٹہ میں دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشوا کو اسی بنا پر ان سے رنج تھا اور یہ اس کے موردِ عتاب تھے۔ انہوں نے پیشوا کو یقین دلایا ہے کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی معرکۂ جنگ میں نہیں ہوئی اور یہ محض اتفاق ہے کہ وہ اپنے زخموں سے شفا پاگئے۔

مرہٹوں کی زار و نزار حالت

مرہٹوں کی حالت ڈھائی ماہ تک حصار کے اندر پڑے پڑے برابر خراب ہوتی گئی اور جب رسد ملنے کا کسی طرف سے سہارا نہیں رہا اور قصبۂ پانی پت کے اصلی باشندے بھی جن کے ذخائرِ اجناس کو مرہٹے ختم کرچکے تھے۔ ان کے ساتھ بھوک کے مرنے لگے۔ مویشی جو دانہ چارہ میسر نہ آنے کے باعث ہلاک ہوتے تھے۔ ان کی لاشوں کو پھینکنے یا دبانے کا بھی موقعہ نہ ملتا تھا۔ گویا ایک انگریزی مورخ کے الفاظ میں لاکھوں آدمی مرغیوں کی طرح ایک بڑے کھانچے میں بند تھے۔ جس میں زندوں کی غلاظت اور مرنے والوں کی لاشوں کے سڑنے سے سخت عفونت پھیلی ہوئی تھی۔ جو لوگ حصار سے باہر قدم رکھتے تھے ان کو پٹھان جو روز افزوں سختی کے ساتھ نگرانی کر رہے تھے سنگوا لیتے تھے۔ آخر میں دو روز تک برابر جب سپاہ کو آذوقہ میسر نہ آیا اور سینکڑوں آدمی گرسنگی سے جاں بلب اور بعض ہلاک بھی ہوگئے تو ہولکر اور بڑے بڑے مرہٹہ سردار بھاؤ کے خیمے پر آئے اور انہوں نے لشکر کی صورتِ حال بیان کرکے کہا کہ بھوک اور وبائی امراض سے تڑپ تڑپ کر مرنے کی بجائے یہ بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں مردانہ وار جان دی جائے۔ اور کم از کم بزدلی و نامردی کا الزام اپنے اوپر نہ لیا جائے۔ بھاؤ پہلے ہی صورتِ حال سے بے حد ملول و پریشان تھا۔ اس نے سرداروں کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور سرداروں کے رخصت ہونے پر اپنے ہاتھ سے

پان کے بیڑے ان کو دیئے۔ جو غلّہ وغیرہ لشکر میں باقی تھا وہ سب لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تاکہ وہ لڑائی پر جانے سے پہلے آخری کھانا پیٹ بھر کھالیں۔ اس کے ساتھ ہی فوج کے تمام حصّوں کو لڑائی کے لئے کمر بندی کا حکم سنا دیا گیا اور سرداروں اور سپاہیوں نے "کیسری بانے" (زرد لباس) زیب تن کئے جس سے یہ مراد تھی کہ وہ اپنی جان قربان کرنے کو جا رہے ہیں۔ آدھی رات کو بھاؤ نے بدست خاص ایک پرچہ دیوان کاشی رائے نواب شجاع الدولہ کے معتمد کارندے کو جس کی وساطت سے گفتگوئے مصالحت ہوتی رہی تھی لکھ کر بھیجا کہ وہ نواب سے کہے کہ "پیالہ اب لبریز ہو چکا ہے اور ایک قطرے کی بھی گنجائش نہ رہی تھی۔ اگر دوست کو کچھ کرنا ہے تو اس کا یہ آخری وقت ہے ورنہ صاف جواب دینا چاہیئے کیوں کہ نوشت وخواند کا وقت گذر چکا ہے۔"

مرہٹوں کی لڑائی کیلئے پیش قدمی

یہ تحریر بھاؤ کی کاشی رائے کو نصف شب کے بعد پہنچی اور وہ تین بجے کے قریب اس کا مضمون نواب شجاع الدولہ کو پڑھ کر سنا رہا تھا کہ دیوان موصوف کے جاسوس یہ خبر لائے کہ مرہٹے آلات حرب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر حصار سے نکل رہے ہیں اور بارادۂ جنگ شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نواب شجاع الدولہ یہ سن کر فی الفور شاہ ابدالی کے ڈیرے پر گئے اور وہ شاہ کو جگانے کیلئے آدمیوں سے کہہ رہے تھے کہ شاہ موصوف ہتھیار لگائے حقّہ خواب گاہ سے برآمد ہوئے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مرہٹہ لائن کی طرف چلے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کاشی رائے کے بلانے کے لئے نواب شجاع الدولہ سے کہا اور جب دیوان موصوف آیا تو اس کے جاسوسوں کی لائی ہوئی خبر کے متعلق اس سے مزید تفصیلات دریافت کر رہے تھے کہ چند افغان سپاہیوں کو اپنے لشکر سے پون کوس آگے ان کو مرہٹہ لائن کی طرف سے واپس آتے ہوئے دیکھا جن کے پاس کچھ مال غنیمت بھی تھا۔ شاہ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ مرہٹوں نے پیش قدمی کرنی چاہی تھی مگر اقبال شاہی سے وہ پیچھے ہٹا دیئے گئے اور ان کا سامان وہ لوٹ لائے۔ شاہ کو یہ متضاد خبر سنکر تعجب ہوا اور انہوں نے متانت و اطمینان کے ساتھ قلیان (حقّہ) کا سرا اپنے ملازم کے حوالے کرتے ہوئے شجاع الدولہ سے کہا کہ "تمہارے آدمی کی اطلاع کو میں درست پاتا ہوں۔" اس کے بعد فوج کو جلد آگے بڑھنے کا حکم سنایا اور مقابلے کے انتظامات کی بذات خود نگرانی کرنے لگے۔ ابھی شب کی تاریکی قدرے باقی تھی۔ جب صبح کی ابتدائی روشنی ہوئی تو مرہٹوں کی سیاہ قطار در قطار توپوں کو آگے لئے ہوئے بڑھتی نظر آئی۔ دونوں لشکروں میں

مختلف سرداروں کی فوجیں جس ترتیب کے ساتھ قیام پذیر تھیں وہ نقشہ میں دکھائی گئی ہے۔ مرہٹوں نے پیش قدمی میں بڑے درجے تک اِس ترتیب کو قائم رکھا تھا اور شاہ ابدالی نے بھی اپنے سرداروں کو قریباً وہی ترتیب قائم رکھنے اور آہستہ آہستہ دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ نواب احمد خان بنگش کے ساتھ چوں کہ فوجی قوّت بہت کم تھی اِس لئے اُن کو عورتوں کی حفاظت کیلئے چھوڑنا چاہا مگر نواب موصوف نے کہا کہ عورتوں کی حفاظت محلیوں اور خواجہ سراؤں کے سپرد ہونی چاہیئے۔ میرا کام میدانِ جنگ میں لڑنے کا ہے اور شاہ میری جمعیت کے قلیل ہونے کی پرواہ نہ کریں کیوں کہ انہی تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ میں نے بڑے بڑے میدانوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اِس پر شاہ نے اُن کو میسرہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور خود اُس لال ڈیرے میں چلے گئے جس میں وہ دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے اور جاسوسوں کی رپورٹ سننے کے لئے آخری حصّہ شب میں اور سہ پہر کو اکثر بیٹھا کرتے تھے اور اب فوج کے آگے بڑھ آنے کی وجہ سے وہ ڈیرہ پیچھے رہ گیا تھا۔

گاردی کی پلٹنوں کا افغانوں پر حملہ

مرہٹوں کی توپوں کے گولے پہلے تو شاہ کی فوج تک نہ پہنچتے تھے اور سامنے میدان میں گرتے تھے۔ اب کچھ گولے فوج کے درمیان گرے جن سے کچھ آدمیوں کو نقصان پہنچا، مگر چوں کہ دونوں فوجیں متحرک تھیں اِس لئے جلد توپوں کے گولے فوج کے اُوپر سے گذرنے لگے اور سپاہیوں کے لئے بے ضرر ہوگئے۔ یہ کیفیت جب ابراہیم خان گاردی نے دیکھی تو اُس نے بھاؤ کے سامنے جو قلب سپاہ میں بسواس راؤ کے ساتھ جاگزین تھا حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں جب اپنے آدمیوں کی تنخواہ کا تقاضہ کرتا تھا تو آپ کو ناگوار گذرتا تھا، آج ملاحظہ فرمائیں کہ جو تنخواہ ان لوگوں کی ملی ہے وہ ضائع نہیں ہوئی ہے اس کے بعد اس نے ایک جھنڈی ہاتھ میں لی اور اپنے آدمیوں کو جو بندوقیں چلاتے بڑھ رہے تھے حکم دیا کہ وہ فیر بند کردیں اور بندوقوں پر سنگینیں چڑھاکر افغانوں پر حملہ آور ہوں۔ گاردی کی باقاعدہ فوج کے سنگینوں کے ساتھ ہلّہ کرنے سے روہیلوں کی جو اس وقت ان کے مقابل تھے صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگنے لگے مگر حافظ رحمت خاں نے جو بوجہ علالت اب تک صفِ جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے اور پالکی میں پڑے ہوئے آرہے تھے جب ان کو بھاگتے دیکھا تو روہیلوں کو سخت ملامت کی اور اُن کو ساتھ لے کر میدان کی طرف چلے اور عنایت خان خلف حافظ رحمت خان نے افغان سرداروں کے ساتھ گاردی کے دستوں پر حملہ کیا اور احمد خان بنگش بھی اس کی مدد کو آگئے۔ گاردی کے آدمیوں نے انتہائی شجاعت و استقامت کا

تو تیمیا اندا اُن پر دباؤ پڑتے دیکھ کر دوسرے چھوٹے سردار بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کی مدد کو آ گئے اور سخت خون ریز لڑائی ہونے لگی۔ دتاجی گائیکوار معہ اپنے آدمیوں کے ابتدا سے گاردی کے ساتھ تھا اور مرہٹے برابر گھسے چلے آتے تھے لیکن اس وقت ابراہیم خان گاردی عنایت خان کے آدمیوں کے ہاتھوں بیہم زخم کھا کر اپنے آدمیوں کو لڑانے کے ناقابل ہو گیا اور دتاجی گائیکوار کے بھی چار زخم لگے۔ اب دونوں فوجیں آپس میں مل گئیں تھیں اور شپاشپ تلوار یں چل رہی تھیں۔ مرہٹے چابک دست تھے اور اُن کے سوار تیزی کے ساتھ نقل و حرکت کرتے تھے مگر جب دست بدست لڑائی ہونے لگی تو افغانوں کے بھاری جسم اور ہتھیاروں کا اُن پر بوجھ پڑا۔

وزیر شاہ ابدالی پر تنگ وقت

مین اس حالت میں بھاؤ نے خود اپنی درمیانی تازہ دم فوج کو بڑھا کر وزیر پر دباؤ ڈالا ان کا بھتیجا عطائی خان جس نے گوبند پنڈت بوندیلے کو شبا شب چالیس کوس کا دھاوا مار کر غازی الدین نگر مین پہنچ کر معہ اُس کے آدمیوں کے قتل کیا تھا وزیر کے برابر مارا گیا اور بعض دیگر افغان سردار بھی قتل ہوئے۔ یہاں اِس قدر خون ریز لڑائی ہوئی کہ آٹھ دس ہزار پیادے کابلی اور ایک ہزار اونٹ زنبورک کے جو وزیر کی خاص جمعیّت میں شامل تھے مرہٹوں کے ہاتھوں قتل و بیکار ہوئے اشرف الوزرا معہ دو تین سو سواروں اور ۵۰ اونٹ زنبورک کے اُن کے آگے باقی رہ گئے مگر وزیر نے جو از سرتا پا غرقِ آہن تھا اپنی جگہ نہیں چھوڑی اور اپنے آدمیوں کو برابر للکارتا تھا۔ اِس اثنا میں نواب شجاع الدولہ نے اپنے وکیل سے کہا کہ وزیر کی طرف سے آواز نہیں آتی ہے اس کا کیا سبب ہے؟ خبر لاؤ۔ وکیل گھوڑا دوڑا کر اُدھر گیا تو دیکھا کہ وزیر پر بڑا نازک وقت ہے وہ سر دے دے پٹکتا تھا، منھ سے کف جاری تھا اور اپنی فوج کے آدمیوں پر جو جان بچانے کے لئے بھاگے جاتے تھے سخت الفاظ میں غیظ و غضب ظاہر کر رہا تھا کہ نامردو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ولایت یہاں سے بہت دُور ہے، مگر آدمیوں پر بظاہر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت مین وکیلِ شجاع الدولہ کو دیکھ کر وزیر نے کہا کہ شجاع الدولہ سے جا کر کہو کہ اس وقت مجھ پر تنگ وقت ہے اگر اب بھی انھوں نے مدد نہ دی تو کب دیں گے۔ وکیل نے فوراً واپس آ کر نواب شجاع الدولہ کو اطلاع دی۔ نواب نے کہا کہ اس وقت وہاں تک پہنچنا سخت مشکل ہوگا۔ ابتک نواب کا لڑائی پر بڑے طور سے مشغول نہ ہونا بھی کچھ نہیں ... نہ ہوئی تھی تیار تھیں۔

ئی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ مرہٹے ان پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور برچھیاں اور تلواریں چمکتی نظر آئیں مگر
دنوں فوجیں بھڑنے نہیں پائیں۔ اب شجاع الدولہ نے خود اپنی فوج کو مرہٹوں پر دباؤ ڈالنے کا حکم
یا اور وزیر کو مدد دینی چاہی مگر وہاں تک پہنچ نہیں سکے۔

یب الدولہ کی ہوشیاری

نواب شجاع الدولہ کے بائیں طرف نجیب الدولہ اپنی فوج کو جس کی تعداد روہیلہ سرداروں کی سپاہ موجودہ
یدان پانی پت میں سب سے زیادہ تھی اِس طریقے پر آگے بڑھا رہے تھے کہ پیادے آگے آگے
ر سوار اُن کے پیچھے تھے اور ایک مستند روایت کے بموجب خود نجیب الدولہ بھی اُس وقت
وڑے سے اُترے ہوئے اپنے آدمیوں کے ساتھ اگلی صف میں چل رہے تھے۔ بیلدار پیادوں
سے آگے بیلچے اور کدالیں لئے ہوئے مٹی کھود کھود کے ڈالتے جاتے اور ایک ہاتھ اونچی دیوار
ٹھاتے تھے جس کی اوٹ میں پیادے بڑھتے تھے اور سوار بندوقوں کو اُٹھا کر گولیاں چلاتے
تے تھے جو پیادوں کے سروں کے اُوپر سے سن سن کرتی ہوئی مرہٹوں کی طرف جاتی تھیں اور
یادے بھی دیوار کی آڑ میں ہو کر بندوقیں چھوڑتے تھے۔ اِس اثنا میں بیلدار گولی کے نصف ٹپے پر
گے مٹی کی دیوار اٹھاتے تھے۔ نجیب الدولہ بہت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ لڑ رہے تھے
دان کے پاس گولی بارود بھی بافراط موجود تھی اور بانون کے بیسیوں چھکڑے ساتھ تھے۔
ب الدولہ کے بالمقابل جنکوجی سیندھیا کی پوری سپاہ اور ہولکر کے دستے تھے۔ یہی جنکوجی
نے اپنے چچا دتاجی سیندھیا کے ساتھ سکرتال پر نجیب الدولہ کو بہت تنگ کیا تھا اور اُس کے
اتے کے سینکڑوں دیہات کو تباہ کر ڈالا تھا۔ لہٰذا نجیب الدولہ اِس لڑائی سے اپنا خاص تعلق
مجھتے تھے اور یہی کہہ کر اپنے آدمیوں کو ہمت دلاتے تھے جنکوجی خاص طور سے نجیب الدولہ کی
ریں تھا اور وہ بھی اُس کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔

ولکر اور نجیب الدولہ کے تعلقات

برخلاف ازیں ملہار راؤ ہولکر کی نسبت نجیب الدولہ کے دل میں عداوت کے کوئی خیالات نہیں تھے
ریہاں تک مشہور تھا کہ اِن دونوں میں باہم دوستانہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ جنگ میں ایک
سرے کے حال سے تعرض نہ کرے گا۔ کم از کم ملہار راؤ ہولکر کو اُس کے معاصر مرہٹہ سردار
بریہ طعنہ دیتے رہے اور بالاجی باجی راؤ پیشوا کے دل میں بھی اِس قسم کا شبہ تھا اور وہ ملہار راؤ
ے معرکۂ پانی پت سے زندہ نکل کر نکلنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ دتھل راؤ شند

درتحریر کرتے کمپ گنگرونی واقع مالوہ سے جوخط رگھناتھ راؤ برادر پیشوا کو بھیجا تھا اُس میں رگھوبا کے خطوط صوبیدار ملہار راؤ ہولکر کے پاس آنے کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ "ہم دونوں ایک ہی کمپ میں ساتھ رہتے ہیں ۔۔۔۔ پیشوا جو ہم کو خط نہیں لکھتے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اِس بات پر ناراض ہیں کہ ہم میدانِ جنگ میں کام نہیں آگئے ۔ یہ سچ ہے کہ کوئی شخص موت سے بچ نہیں سکتا مگر جتنا زمانہ کسی کی حیات کا مقدر ہے اس میں اُس کا موت سے بچ جانا بھی ناگزیر ہے ۔ یہ محض خدا کی ایک مہربانی تھی کہ ہمیں سخت مجروح ہونے کے بعد بھی آرام ہوگیا ۔ یہ کس قدر صحیح ہو کہ "زندگی کے معنی فرض کے ہیں اور حیات خود قوتِ لایموت مہیا کرتی ہے "۔ باوجود اس کے ہم کو ندامت کا سخت ناگوار احساس ہے ، جو کچھ کہ گذرا ہے اُس کو ہم بھولے نہیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام کوششیں میدانِ جنگ میں بُری بھلی جیسی کچھ بھی تھیں خدائے قادر و توانا کے غصّے کی وجہ سے بیکار ثابت ہوئیں "۔

اِسی طرح ہولکر کے دیوان کی جو چٹھی رگھناتھ راؤ کے نام کنکیڈ نے جلد سوم تاریخ مرہٹہ میں دی ہے اس میں بھی دیوانِ موصوف نے اِس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ "گذشتہ ایام میں شُرگباشی پیشوا باجی راؤ نے اپنے مفاد ملہار راؤ ہولکر کو تفویض کئے ۔ مگر امسال شریمنت (پیشوا) کے سر و پنج سے پلٹنے کے وقت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبیدار (ہولکر) کو ان کا وہ اعتماد حاصل نہیں ہے ۔ ملہار راؤ ہولکر کی طرف سے ادائے فرض میں کوئی غفلت نہیں ہوئی ۔ جنگِ پانی پت میں شریک ہونے والے جو لوگ بھاگ کر بچ رہے ہیں وہ آں جناب سے ملے ہوں گے اور انہوں نے صحیح احوال آپ سے بیان کیا ہوگا ، ایک شکست کو سر اپنے سر لینے سے بھلا کیا فائدہ ہے ؟ یہ سب لوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ سرکار کے قدیم ملازمین سیندھیا اور پنوار کا لڑائی میں کیا حال ہوا ؟ آں جناب نے صوبیدار کے معاملات دکن میں قرق کئے جانے کی جو اطلاع لکھ کر بھیجی ہے اُس سے اُن پر سخت رنج و مایوسی طاری ہے ۔ وہ اکثر شکایات کرتے ہیں کہ اُن کی کوشش کا اگر یہ ثمرہ ہے تو آیندہ کی کیا امید ہوسکتی ہے "؟

اِن تحریروں سے عیاں ہے کہ ملہار راؤ ہولکر کے میدان پانی پت پر دشمن کے مقابلے میں طرح دینے کا خیال پیشوا سے لے کر ادنیٰ اہل کاروں تک سب لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھا اور اس پر پیشوا کا عتاب بھی ہولکر کی جاگیرات دکن کی ضبطی کی صورت میں نازل ہوا تھا ملہار راؤ ہولکر نے خود لڑائی کا جو حال لکھا ہے اس میں بھی اپنی صفائی پیش کی ہو مگر نانا فرنویس کی

ایک مشہور تحریر میں جو حال معرکۂ جنگ کے احوال پر مشتمل ہے ہولکر اور دیگر سرداروں پر بھاؤ کو میدانِ کارزار میں چھوڑ دینے کا صاف الزام لگایا گیا ہے اور خود آخر دم تک "آقا کے ساتھ رہنے" پر فخر کیا گیا ہے۔

نجیب الدولہ اور جھنکوجی سیندھیا کی آویزش

نجیب الدولہ نے اپنے پیادوں کے ساتھ جھنکوجی سیندھیا کی فوج پر دباؤ ڈالا۔ اور بیک وقت دو دو ہزار گولے ان کے سپاہیوں نے مرہٹوں پر پھینکے۔ ان کی آواز سے دل دہلتے تھے اور دھوئیں کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی دھوئیں کی آڑ میں نجیب الدولہ کے آدمی آگے بڑھتے رہے اور مرہٹے بوجہ تاریکی اُن پر گولیاں چلانے یا بھالوں سے حملہ آور ہونیکا پورا موقعہ نہ پاسکے۔ اس کے بعد پیادوں نے دو طرفہ ہٹ کر توپوں کو آگ برسانے کا موقعہ دیا۔ جس سے جھنکوجی سیندھیا کی فوج اور ملکر کے دستوں کو پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا اور مرہٹہ لائن میں اسطرف خمیدگی واقع ہوئی۔

شاہ پسند خان اور نیواڑ

نجیب الدولہ کی بائیں طرف شاہ پسند خان افغانوں کا مشہور سردار معہ اپنی فوج کے بڑھتا آیا۔ یہ دلاور و آزمودہ کار سردار ایسی قوت کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ مرہٹوں کو اس کے سامنے دَم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی اور نیواڑ کے جو دستے اس کے مقابل تھے اُن کی قوت برابر گھٹتی جاتی تھی۔

شاہ ابدالی کا آخری زبردست حملہ

اسی طرح پورے خطِ حرب پر صبح سے دوپہر تک لڑائی جاری رہی۔ ہر چند گاردی کے زخمی ہونے کے بعد اُس کی پلٹنوں کا زور ٹوٹ گیا تھا اور افغانوں کی نسبت مرہٹوں کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا تاہم مرہٹے ایسی شجاعت کے ساتھ لڑ رہے تھے اور افغان سپاہ کے قلب میں اِس قدر گھسے ہوئے تھے کہ بظاہر غلبہ انہیں کا معلوم ہوتا تھا اور وزیر شاہ ولی خان جو شاہ ابدالی کے قلبِ لشکر کا محافظ تھا اپنی جان کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ شجاع الدولہ کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر مدد وزیر کو نہیں پہنچ سکی۔ اگرچہ ان کی فوج نے مرہٹوں کی بعض جمعیتوں کو اُن پر مزید دباؤ ڈالنے سے روکا۔ اِسی اثناء میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے محافظ دستوں کا ایک حصّہ وزیر کی کمک کے لئے بھیجا جس سے افغانوں کے پاؤں پھر جم گئے۔ مگر اب تک مرہٹوں کا زور پڑ رہا تھا اور افغانی لائن کا زیادہ دیر تک قائم رہنا دشوار نظر آتا تھا کہ اِس نازک وقت میں شاہ ابدالی نے اپنی زبردست حربی قابلیت کا اظہار کیا اور اپنے بقیہ محافظ دستوں کو ساتھ لیکر

اور وزیر کی فوج کے پسپا شدہ آدمیوں کو سمیٹ کر ایک زبردست حملہ کیا جس نے میدانِ کارزار کی حالت بدل دی۔ مرہٹے شاہ کے اِس آخری طاقتور حملے کی تاب نہ لاسکے۔

بھاؤ پر عالمِ یاس طاری ہوا

بسواس راؤ کے جب مہلک زخم لگا تو بھاؤ کی آنکھوں میں جہان تاریک ہوگیا کیوں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ اُس کی جان پر زد پڑنے سے بھاؤ کی گویا کمر ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی خود بھاؤ کے بھی کئی زخم لگے۔ اس نے بسواس راؤ کو ہاتھی کے ہودے میں لٹانے کا حکم دیا اور خود ہاتھی سے اُتر کر اپنے عربی گھوڑے پر بیٹھا اور لڑائی کے بھنور میں کود پڑا۔ فوج جب اپنے سپہ سالار کی رہنمائی سے محروم ہوگئی تو اُس کے پاؤں میدان سے اکھڑنے لگے۔ اِس سے پٹھانوں کو پہلے تو تعجب ہوا مگر پھر اُن کی ہمت بڑھ گئی اور نیا جوش پیدا ہوگیا۔ وہ تمام سمتوں سے مرہٹوں کو رگیدتے ہوئے چلے حتیٰ کہ چار بجتے بجتے سارا میدان مرہٹہ جنگ جویوں سے خالی ہوگیا اور ہر طرف لاشوں کے انبار نظر آنے لگے۔ مرہٹہ سپاہی میدان کے چاروں طرف بھاگے اور افغان سوار اُن کے تعاقب میں چلے۔ یہ حالت شام ہونے کے بعد شب میں بھی قائم رہی اور چوں کہ چاندنی رات تھی اِس لئے افغان سواروں نے مفرور مرہٹوں کا دس بارہ کوس تک پیچھا کیا اور سب کو قتل کرکے اُن کا سامان لُوٹ لیا۔

کئی ہزار مرہٹہ سپاہی بہ امید پناہ پانی پت کو واپس گئے اور بڑی دقت سے خندق کو طے کرکے اور دمدمہ پر چڑھ کر حصار کے اندر داخل ہوئے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں خندق میں کودنے کے وقت ٹوٹے اور جو لوگ حصار کے اندر پہنچ گئے تھے اُن کو بھی کوئی امن نہیں ملا بلکہ وہ رات بھر بھوکے پیاسے پڑے رہے اور افغانوں نے شب ہی میں قصبہ کے گرد پہرے لگا دیئے اور علی الصباح آکر جسقدر بھی مرد عورتیں اور بچے حصار کے اندر ملے اُن سب کو گرفتار کرلیا۔ عورتوں اور بچوں کو افغانوں کے پُرانے دستور کے موافق بطور کنیز و غلام اپنے ساتھ لے جانے کے لئے الگ رکھا اور اُنہیں کچھ کھانے کو دیا۔ کیوں کہ دو ہفتے سے مرہٹوں کے لشکر میں سامانِ رسد کی کمی تھی اور تیس بتیس گھنٹے سے اُنہیں مطلق غذا نہیں ملی تھی۔ مرد قیدیوں کے ساتھ افغانوں نے بظاہر بہت ظالمانہ مگر بہ باطن شاید ہمدردانہ سلوک کیا کہ انہیں غیر ملک میں ذلّت و مصیبت کی زندگی بسر کرنے کے لئے باقی رکھنے کے بجائے قیدِ ہستی ہی سے چھڑا دیا اور سب کو قتل کر ڈالا۔

افغانوں نے قیدیوں کو کیوں قتل کیا؟ کپتان گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ "شاید خوں خوار ترین جنگلی اقوام کو بھی مرہٹوں کی زار و نزار حالت دیکھ کر اُن پر کچھ ترس آتا۔ مگر افغانوں کو مطلق رحم نہیں آیا اور انہوں نے اپنی قوم اور بنی نوع انسان کے دامن پر بدنامی کا مستقل دھبّا اِس طریقے سے لگایا کہ دوسرے روز صبح کو وہ اُن بدنصیب اسیروں کو وہاں سے نکال کر لے گئے اور اپنے لشکر میں لے جاکر اُن کو تقسیم کر لیا۔ عورتوں اور بچّوں کو تو انہوں نے لونڈیوں اور غلاموں کے طور پر زندہ رہنے دیا لیکن مردوں کو قطار میں بندھوا کر کھڑا کیا اور اُن کے سر اُتار کر اپنے دل کو محظوظ کرتے رہے اور بعد میں انہوں نے ڈیروں کے آگے بطور نشاناتِ فتح کے اُن سروں کو اُوپر تلے رکھ کر انبار لگائے اور کلہ منار بنائے"۔

دیگر انگریز مؤرخوں نے بھی اِس معاملے پر اسی طریقے سے رائے زنی کی ہے اور بعض نے شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کو بھی اِس میں شریک سمجھا ہے اور اِس سے مسلمانوں کی بے رحمی اور ہندو مسلمانوں کی عداوت باہمی کا نتیجہ نکالا ہے۔ حالاں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ مرہٹہ قیدیوں میں سے کئی ہزار مردوں کو ضرور قتل کیا گیا لیکن نواب شجاع الدولہ تو درکنار جو آخر وقت تک مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کئے جانے میں ساعی رہے، روہیلہ سردار یا نواب بنگش حتیٰ کہ نجیب الدولہ بھی جنہوں نے مرہٹوں کے ہاتھوں سے سخت اذیت اٹھائی تھی اور جن کے بیٹے اور پوتے کو مرہٹوں ہی نے تباہ و برباد کیا اِس عام خون ریزی میں شریک یا اُس پر رضامند نہیں تھے اور اگر اُن کا بس چلتا تو وہ ضرور اِن بدنصیبوں کی جانیں بچانے میں کوشش کرتے۔ جیسا کہ آگے چل کر دیگر حالات سے ظاہر ہوگا۔

رہے افغان۔ اُن کے اِس ہولناک فعل کی بابت کوئی معذرت پیش کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اوّل تو اُن کی جبلّت ہی ایسی ہے کہ قتل و خوں ریزی کو وہ ایک معمولی بات سمجھتے ہیں اور خصوصاً جس زمانے میں یہ واقعات رونما ہوئے اُس وقت ہندوستان تو کیا سارے مشرق اور مغرب کے اکثر ملکوں میں بھی انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی پھر شاہِ ابدالی کے سپاہیوں کی نسبت اِس امر واقعہ کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ ایک بیرونی حملہ آور کی فوج کے آدمی تھے جو اس ملک میں بالکل اجنبی تھے اور یہاں کے لوگوں کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو صرف مالِ غنیمت جمع کرنے کی فکر تھی اور

اپنی روزمرہ کی خوراک بھی اُن کو شاہ کے ہندوستانی رفقا رکے علاقوں سے بہم پہنچتی تھی اور ان ہندوستانی رفیقوں کی نسبت ان کو یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک ان کا ساتھ دیں گے پانی پت کے اردگرد کے دیہات کو پندرہ پندرہ کوس تک مرہٹوں نے خود تباہ کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ ان ہزارہا قیدیوں کی خوراک کا کیا انتظام کرتے ؟ اور اُن کو ساتھ لئے پھرنے میں جو خطرہ متصوّر تھا اُس کو جنگی کارروائیوں کے دوران میں کس طرح اٹھاتے وہ معرکۂ پانی پت میں مرہٹوں کے شکست کھانے کو بھی ایک لطیفۂ غیبی سے تعبیر کرتے تھے اور اُن کو لڑائی کے دوسرے روز یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ کل کی لڑائی کے نتیجے نے مرہٹوں کی قوت پر ایک شدید ضرب لگا دی ہے۔ بلکہ پانی پت سے چالیس پینتالیس میل کے فاصلے پر دارالسلطنت دہلی میں مرہٹوں کا ایک سردار (راجہ بہادر) نارو شنکر فوج کی ایک جمعیت کے ساتھ موجود تھا اور دکن سے پیشوا کے ایک لشکر جرار کے ساتھ اپنے بھائی اور بیٹے کی کمک کے لئے آنے کی خود مرہٹوں کو امّید تھی۔ جس سے افغانوں کا معرکۂ پانی پت کے بعد اپنی شکستہ قوت کے ساتھ عہدہ برآ ہونا یقیناً دشوار ہوتا اور اُس زمانے میں اسیران جنگ کی کسی بڑی تعداد کو قید رکھنے کا دستور بھی نہیں تھا بلکہ یا تو انہیں قتل کر ڈالا جاتا تھا یا مقتدر اشخاص کو بھاری فدیہ کی توقع پر یا بطور یرغمال رکھ کر اور دیگر آدمیوں سے ان کے اسلحہ و سامان چھین کر اور لڑائی میں شامل نہ ہونے کا قول لے کر سرحد پار اُتار دیا جاتا تھا۔ مگر مرہٹوں کا اصلی ملک پانی پت سے سینکڑوں کوس دُور تھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر اُن کے دوست راجپوتھان میں موجود تھے اور مرہٹوں کی کمک آنے پر ان رہا شدہ قیدیوں کو گھوڑے اور ہتھیار بہ آسانی حاصل ہو سکتے تھے۔ اِس لئے افغانوں نے اُن بدنصیب قیدیوں کو قتل کر دینا اپنی عافیت کے لئے ضروری سمجھا اور اگر مرہٹوں کو فتح نصیب ہوتی تو وہ بھی غالبًا افغانوں کے ساتھ اس سے کچھ بہتر سلوک نہ کرتے۔

افغانوں کو بھی مرہٹوں سے مذہبی عداوت نہیں تھی

ہزارہا مجبور قیدیوں کا ایک دم قتل کر دیا جانا یقیناً ایک ہولناک و دردانگیز واقعہ تھا مگر اس میں افغانوں کی جبلت کے سوا مذہبی عداوت یا قومی افتراق کا کوئی شائبہ بھی شامل نہیں تھا۔ چنانچہ کپتان گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ میں ایک سچے برہمن کی روایت اِن الفاظ میں نقل کی ہے کہ " افغانوں نے اُن مرہٹہ قیدیوں کی قطاریں

ندھوائیں اور ہر بدنصیب کو تھوڑے تھوڑے سے بُھنے ہوئے چنے دیئے (کیوں کہ وہ دو شبانہ
وز سے بھوکے تھے اور بہشتی اُن کے چلوؤں میں پانی ڈالتے جاتے تھے۔ (یہ چنے کھانے اور
انی پینے کے بعد) پھر اُن کے سر قلم کر دیئے جاتے تھے۔ نارو بھگونت کُلکارنی مقام ارلانے
قتل کی غرض سے لے جائے جانے والے اشخاص میں شامل تھا اپنے بچ جانے کا حال اِس طرح
یان کیا کہ" وہ مرہٹہ فوج میں کارکن تھا اور افغان جو بھاؤ کے توپ خانے میں تھے اُن کی ایک
اعت کا حساب دکن سے روانگی کے وقت اُس کے ہاتھ میں تھا۔ جب مرہٹوں نے اُن
گوں (افغانوں) کے ہم وطنوں پر حملہ کیا تو حسین خان نے جو ایک مشہور شخص تھا بھاؤ سے
ر کہا کہ جو آدمی اُس کے ساتھ ہیں وہ اِس وقت لڑنے سے گھبراتے ہیں کیوں کہ روہیلوں اور
بدایوں دونوں نے اُن کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ اپنے بادشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھاتے
ئے جائیں گے تو فوراً ہی قتل کر دیئے جائیں گے (فارسی بیان میں اس کا صاف تذکرہ ہے
ا افغان مرہٹوں کی سروس میں تھے انہیں اُن کے ہم قوموں کی طرف سے پہلے کئی قسم کی ترغیبات
ی گئیں اور جب اُن کا اثر نہ ہوا تو نہ صرف اُن کو بلکہ اُن کے بال بچوں اور اعزہ کو بھی جو
فغانستان میں تھے قتل کر دیئے جانے کا خوف دلایا گیا۔ بعض لوگ اس دھمکی سے خوف زدہ
و گئے مگر اکثر نے اِس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور گاردی کے زیر حکم پانی پت کے میدان میں
ی توپوں پر کام کرتے رہے اور جان دے کر اپنے آقا کے حق نمک سے ادا ہو گئے) حسین خان
نے بھاؤ کی منت سماجت کی اور اپنا نام کٹوا لیا مگر سداشیوراؤ (بھاؤ) کو یقین دلایا کہ جب بھی
س کو اطمینان کے ساتھ موقع ملے گا وہ اپنے کام پر حاضر ہو جائے گا، اُس نے اُن کا نمک کھایا
ہے اور اُسے بہت رنج ہے کہ اس وقت وہ اُن کی نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ بعد میں
سین خان برابر بھاؤ کو چٹھیاں بھیجتا رہا جن سے وہ (روایت کا بیان کرنے والا برہمن) آگاہ تھا
س روز جس بہشتی نے اُس (برہمن) کے چلو میں پانی ڈالا وہ وہی تھا جو حسین خان کے یہاں
م کرتا تھا۔ وہ (بہشتی) فوراً ہی جمعدار (حسین خان) کے پاس دوڑا ہوا گیا اور کہا کہ "ہمارا
ھمن قطار میں ہے اور ابھی قتل ہونے والا ہے۔" حسین خان آگے بڑھ آیا اور اُس نے
پنے ہم وطنوں سے اُن کی مادری زبان میں کچھ کہا۔ جس کو راوی نے یہ سمجھا کہ " میں اُس شخص کو
نا غلام بنانا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر حسین خان نے اس (برہمن) کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو
سیٹتا ہوا اپنے ڈیرے کی طرف لے گیا جہاں وہ ایک روز مقیم رہا۔ اس کے بعد جمعدار نے

ایک مترجم کے ذریعے سے اس سے دریافت کیا کہ وہ اُس کے پاس رہنا پسند کرے گا یا دکن واپس جائے گا" اس پر راوی نے جواب دیا کہ وہ خوشی سے اُن کے پاس رہے گا" جمعدار نے مترجم سے کہا کہ" اس سے کہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہے" اس کے تھوڑی دیر بعد حسین خاں نے اُس کو ایک طرف بلایا اور ہندوستانی زبان میں (جس کو وہ جب اُس کا جی چاہتا تھا تو اچھی طرح بول سکتا تھا) اس سے کہا کہ سواروں کی ایک جماعت جو اُس کے ایک دوست کے آدمی ہیں اُسکو لشکر سے بحفاظت لے جاکر بیس کوس پر چھوڑ آئے گی۔ اس فیّاض افغان نے اُسی وقت اُس کو پانچ طلائی مہریں بھی دیں اور کہا کہ وہ اِس کی احتیاط رکھے کہ اُس کے محافظوں کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوگ جب کچھ دُور تک گئے تو راوی کو جمعدار کے مشورے کا خیال آیا اور یہ سوچ کر کہ شاید اس کے محافظ اُس کی تلاشی لیں۔ اس نے مہروں کو اپنے منہ میں رکھ لیا اور اُس کے تھوڑی دیر بعد جب وہ سوار اپنے لشکر کی طرف مُڑے تو اس نے اپنے مال کو محفوظ خیال کیا لیکن ان میں سے ایک شخص نے جو دوسروں سے زیادہ چالاک تھا اُس کو اشرفیاں منہ میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جب اُس کے ساتھی کچھ دُور نکل گئے تو وہ اُس مال کو لینے کے لئے چل تھوڑی دیر میں راوی نے جو جہاں تک اُس کے پاؤں یاری دیتے تھے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگ رہا تھا اپنے پیچھے سے آواز سُنی کہ " او باھمن" اور پیچھے مڑکر دیکھا تو ایک افغان جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور ڈاڑھی بہت لمبی تھی اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ راوی اُسے دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوا۔ افغان نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہا" او باھمن تیرے منہ میں کیا ہے ؟" آخر افغان نے راوی کو وہ پانچوں اشرفیاں دینے پر مجبور کردیا۔ اس کے بعد افغان نے کہا " اَب چل دے" اور خود گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں سے جا ملنے کے لئے واپس چلا گیا۔

اس مرہٹہ برہمن پر جو واردات گذری اُس سے عیاں ہے کہ افغانوں کا لُوٹ کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا اور چوں کہ مرہٹوں کی کمک دکن سے آنے کا ہر وقت کھٹکا تھا اور دارالسلطنت دہلی ان کے قبضے میں تھا اس لئے افغان آیندہ جنگ کے خطرے کو مدّنظر رکھ کر دشمن کے آدمیوں کی قوت گھٹانی چاہتے تھے اور مقتولین کا مال ومتاع اور ہتھیار بھی بآسانی ہاتھ آجاتے تھے اگر مذہبی عداوت کا جذبہ افغانوں کے دلوں میں ہوتا تو حسین خان جمعدار توپ خانہ بھاؤ ج

خود افغان تھا اپنی جماعت کے سابق محاسب کی جان نہ بچا تا اور اگر اس نے مروّت کی تھی تو دیگر افغان سوار جن کی زیرِ حفاظت حسین خان نے برہمن مذکور کو لشکرِ ابدالی سے باہر بھجوا دیا تھا راستے میں اُس "کافر" کو قتل کر دیتے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بھاؤ کے غرور اور غلطیوں نے افغانوں کے دلوں میں مذہبی عداوت کے جذبات بھی پیدا کر دیئے تھے اور وہ کافروں کے قتل سے خود ثواب حاصل کرنے اور اپنے متوفی اعزّہ کو ثواب پہنچانے کی ڈینگیں مارتے تھے۔

ہندوستانی رفقائے ابدالی کا ہمدردانہ برتاؤ

شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کا دامن مرہٹہ قیدیوں کے اِس قتلِ عام سے پاک ہے اور ہم وطنی و دوستی کے تعلقات کا اثر برابر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ روہیلہ سرداروں میں نجیب الدولہ کو سب سے زیادہ مرہٹوں کا خوف تھا اور اُن کے بیٹے ضابطہ خان کو مرہٹوں نے بعد میں جس طریقے پر تباہ کیا اُس کے لحاظ سے یہ خوف کچھ بے جا بھی نہیں تھا لیکن پانی پت کا میدان سر ہو جانے کے بعد نجیب الدولہ کی طرف سے بھی کسی عداوت کا اظہار نہیں ہوا۔ اگرچہ اُن کی غلطی سے دو ممتاز مرہٹہ سرداروں کی جانیں گئیں۔ شجاع الدولہ کھُلّم کھُلّا مرہٹوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے رہے اور بقول کاشی رائے جن چھ سات ہزار مرہٹوں نے اُن کے کیمپ میں پناہ لی تھی۔ اُن کو دُرّانیوں کی بے رحمی سے محفوظ رکھنے کے لئے نواب نے اپنے آدمیوں کے پہرے لگا دیئے تھے۔ اِن مرہٹوں کی خور و نوش کا انتظام نواب نے اپنی طرف سے کیا اور بعد ازاں کپڑے اور کچھ خرچ دے کر ان کو رخصت کر دیا اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخ جنگ مرہٹہ و شاہ ابدالی میں لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے دارالخلافہ (دہلی) میں پہنچنے کے بعد تیس ہزار دکھنی مردوں اور عورتوں کو جو دُرّانیوں کے ہاتھوں میں اسیر تھے اور شاہ دُرّانی کی معاودتِ وطن کے وقت قید سے چھوٹے تھے۔ اپنی حمایت و پناہ میں لے کر اور زادِ راہ دے کر اور کچھ فوج ان کے ہمراہ کر کے بھوپل نگر میں جو سوبج مل جاٹ کے علاقے میں تھا پہنچوا دیا۔

مرہٹوں کا نقصان جان و مال

کاشی رائے لکھتا ہے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد تمام بڑے بڑے سرداروں نے شاہ ابدالی کو تہنیتِ فتح کی نذریں پیش کیں اور شاہ میدانِ جنگ کا سرسری معائنہ کر کے جس میں کُشتوں کے پُشتے

اور لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اپنے خیمے کو واپس ہو گیا اور تمام دیگر افسران بھی اپنے اپنے ڈیروں میں چلے گئے اور ادنیٰ افسران اور یکہ سپاہیوں کو اپنی مرضی کے موافق لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کے لئے چھوڑ دیا۔ مرہٹوں کے لشکر میں صرف غلہ نہیں تھا اور آخر وقت میں روپیہ کا بھی توڑا ہو گیا تھا اور عورتوں کے زیورات اور ظروف گلوا کر روپے اشرفیاں بنوانی پڑی تھیں۔ لیکن اور سب اقسام کا سامان بافراط موجود تھا۔ بقول کاشی رائے ایک ایک افغان سوار آٹھ آٹھ دس دس اونٹ قیمتی سامان سے لدے ہوئے لاتا دیکھا جاتا تھا۔ گھوڑے بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانکے جا رہے تھے اور ہاتھیوں کی بھی بڑی تعداد پکڑی گئی۔ علی ابراہیم خان نے لکھا ہے کہ پانسو ہاتھی۔ پانچ ہزار گھوڑے۔ دو لاکھ بیل (مویشی) بہت سا قیمتی جواہر و زر نقد اور بے شمار اسلحہ و ظروف کثیر المقدار اسباب اور ہزارہا خیمے معہ سامان آرائش وغیرہ لشکر ابدالی کے ہاتھ آئے۔

ہر افغان سپاہی کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ اس کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ مرہٹوں نے اول مرتبہ شمالی ہند کی جنگی کارروائیوں میں اپنی عورتوں کو ساتھ لیا تھا۔ کیوں کہ بھاؤ کو اپنے فتح پانے کا پورا یقین تھا۔ معرکۂ پانی پت کے بعد بیچاری عورتیں افغانوں کے ہاتھوں میں پڑیں اور معزز خاندانوں کی صرف چند عورتوں کا حال بعد میں سننے میں آسکا ورنہ وہ سب ایک دم غائب ہو گئیں۔ فارسی تاریخوں میں بھاؤ کے لشکر کے آدمیوں کی تعداد مبالغے کے ساتھ پانچ لاکھ سے دس لاکھ تک بیان کی گئی ہے اور اسی بنا پر مقتولین کا شمار بھی تین سے آٹھ لاکھ تک لگایا گیا ہے لیکن گرانٹ ڈف کے نزدیک تین لاکھ نفوس بمقام پانی پت لشکر بھاؤ میں موجود تھے۔ منجملہ ان کے جنگجویوں میں سے ½ کے قریب اپنی جان سلامت لیجا سکے اور بھیر و بنگاہ کے آدمیوں میں سے بھی چوتھائی سے زیادہ نہیں بچے۔ اس طرح قریباً دو لاکھ مرہٹے اور دکھنی میدان پانی پت میں قتل و ہلاک ہوئے شاہ ابدالی اور اُن کے ہندوستانی رفقا کی افواج نے بھی کافی نقصان اٹھایا اور اُن کے مقتولین کی تعداد بیس ہزار سے کم نہیں رہی مگر فتح کی خوشی نے اس نقصان پر کسی کو توجہ نہیں کرنے دی۔

مرہٹہ سردار جو لڑائی میں بچے

مرہٹوں کے سربرآوردہ سرداروں میں صرف تین اشخاص ملہار راؤ ہولکر۔ وِٹھل شیدیو اور دتّاجی گائیکواڑ کی جانیں معرکۂ پانی پت کے زخموں سے شفا پانے کے بعد محفوظ رہیں۔ انتا منکیسر اور شمشیر بہادر بھی زخمی ہونیکے

باوجود میدان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر جن گانوؤں کو پہلے مرہٹوں نے لوٹا کھسوٹا تھا۔ ان کے دیہاتیوں کو اب ان شکست خوردہ لوگوں سے اپنے سابق نقصان کا بدلہ لینے کا موقع تھا۔ چنانچہ جو مرہٹے افغانوں کے ہاتھ سے بچ نکلے تھے ان میں سے سینکڑوں کو دیہاتیوں نے راستہ میں قتل کرکے اُن کا سامان و اسباب لوٹ لیا۔ سردار انتاجی منکیسر زمیندار فرخ نگر کے آدمیوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ باجی راؤ پیشوا کا بیٹا شمشیر بہادر جو سخت زخمی تھا معہ تین چار آدمیوں کے سورج مل جاٹ کے قلعہ ڈیگر میں پہنچا۔ علی ابراہیم کی روایت کے بموجب پاربتی بائی زوجۂ بھاؤ بھی معہ اپنے چند محرموں کے اُسی کے ساتھ تھی۔ ڈیگر میں زوجۂ بھاؤ نے دو تین روز ٹھہر کر اپنے خاوند کی مراسم تعزیت ادا کیں اور بعد ازاں سورج مل نے معقول بدرقہ و محافظین کے ساتھ اُس کو دکن کی طرف رخصت کر دیا۔ شمشیر بہادر اپنے زخموں کی شدت کے باعث ڈیگر میں ٹھہرنے پر مجبور رہا اور بعد میں وہیں اُس کا انتقال ہو گیا۔ مرہٹہ روایات میں بھاؤ کی بیوہ پاربتی بائی اور وسواس راؤ کی بیوہ لکشمی بائی کو راجا نو بھنڈٹ کے گوالیار پہنچانے کا ذکر ہے۔ غالباً یہ دونوں خواتین اپنے گرامی قدر شوہروں کی طرح لڑائی کے بگڑنے پر پانی پت سے ایک ساتھ روانہ ہوئیں اور دکن پہنچنے تک ساتھ ہی رہیں۔ ملہار راؤ ہولکر پانی پت سے پہلے کرنال کی طرف گیا اور وہاں سے متھرا ہو کر بھرت پور میں پہنچا اور سورج مل کی میزبانی سے مستفید ہوا۔ دتاجی گائیکواڑ نے میدانِ پانی پت سے نکل کر پہلے دہلی کا رُخ کیا اور وہاں سے وہ راجہ نارو شنکر کے ساتھ بڑودہ اور پھر دکن پہنچا۔ وٹھل شیدیو کچھ روز بعد ملہار راؤ ہولکر کے ساتھ شامل ہو گیا اور پیشوا کا دل چونکہ ان دونوں کی طرف سے صاف نہ تھا جیسا کہ سردار وٹھل شیدیو کے متذکرۂ صدر خط بنام رگھناتھ راؤ سے عیاں ہے۔ اس لئے ایک عرصہ کے بعد پونا میں گیا۔ مادھوجی سیندھیا اور نانا فرنویس بھی جو بعد میں اس قدر عروج پر پہنچے۔ میدانِ پانی پت سے بمشکل اپنی جانیں بچا لے گئے۔

مادھوجی سیندھیا پر کیا گذری؟

مادھوجی سیندھیا اُس روز کے واقعات اپنے دوستوں سے خود بیان کیا کرتے تھے کہ وہ ایک اصیل گھوڑی پر سوار تھے جو پچاس ساٹھ کوس کا دم رکھتی تھی۔ جب وہ میدان سے ایک طرف کو نکل کر چلے تو متعدد افغان سواروں نے اُن کے قیمتی ساز و سامان کو دیکھ کر لوٹ کی امید میں ان کا تعاقب کیا لیکن ان کی گھوڑی نے اپنی تگ و تاز میں ان سب کے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہاں ایک طاقت ور اور

گراں ڈیل افغان کا گھوڑا بہت اعلیٰ درجے کا تھا وہ برابر ان کے پیچھے لگا رہا۔ انہوں نے اپنی گھوڑی کو بہت گرمایا اور دوڑایا مگر افغان سوار نے ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ اسی طرح وہ دونوں بہت دور نکل آئے۔ آخر ساٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُن کی گھوڑی تھک کر کھڑی ہوگئی۔ افغان کے گھوڑے میں ابھی دم باقی تھا۔ وہ فوراً ہی اُن کے سر پر آپہنچا اور انہیں اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا۔ گھوڑی چوں کہ بے کار ہو چکی تھی اس لئے وہ فنون سپہ گری کے استعمال پر مجبور تھے اور افغان جسمانی حیثیت سے اُن سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اگر وہ قتل کرنا چاہتا تو بآسانی اُس میں کامیاب ہو جاتا مگر اُس کو صرف مال لوٹنے کا خیال تھا۔ چناں چہ اُس نے ان کے قریب آتے ہی ایک تبر اُن کے مارا جس سے ان کا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد افغان نے ان کی پگڑی میں سے جیغہ۔ گلے میں سے مالا۔ اور زین پر سے دیگر قیمتی سامان لیا، خورجیوں کو ٹٹولا اور سب چیزوں کو اپنے گھوڑے پر رکھ کر اپنے لشکر کو واپس چلا گیا۔ ان کو گھٹنے کے ٹوٹنے سے بڑی تکلیف تھی مگر گھوڑی آگے چل نہیں سکتی تھی اور جنگل میں رات گذارنی مشکل تھی۔ اِس لئے انہوں نے گھوڑی کو آہستہ آہستہ بڑھایا۔ اتفاق سے ایک بستی قریب ہی مل گئی وہ بہ مشکل اس کے سرے تک پہنچ سکے اور وہاں گھٹنے کی تکلیف اور پیاس کی شدّت سے بے ہوش ہونے لگے ایک چھپّر سامنے تھا انہوں نے اُس کے دروازے پر پہنچکر پانی مانگا۔ وہاں سے ایک عورت پیالے میں پانی لئے ہوئے نکلی۔ اِس نازک حالت میں ان کے لئے اس کی ذات و عقیدے کا خیال کرنا مشکل تھا۔ انہوں نے پانی پی لیا اور اُس سے مدد چاہی۔ عورت نے ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر ایک مرد کو بُلا کر اُس کی مدد سے ان کو گھوڑے سے اتارا اور چھپّر کے اندر لے جاکر لٹایا اور تین شبانہ روز پیہم ان کی تیمار داری و خدمت گزاری کی۔ تین روز کے بعد جب ان کو گھٹنے کی چوٹ سے ذرا افاقہ ہوا تو انہوں نے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر چلنے کا قصد کیا۔ ان کے میزبانوں نے ان کو روکنا چاہا مگر ان کو ڈر لگا ہوا تھا کہ مبادا افغانوں کے لشکر کے لوگ اِدھر آنکلیں اور گھوڑی اور بقیہ سامان چھین لیں۔ لہٰذا یہ نہ رُکے اور روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت تک ان کو اپنے ہمدرد معاونوں کی بابت کچھ معلوم نہیں ہو سکا مگر اس بستی کے مقام اور راستہ کو انہوں نے یاد رکھا اور کتنے ہی سال کے بعد جب اپنی جمعیت کے ساتھ ان کا ادھر کے علاقے میں گذر ہوا تو انہوں نے بستی میں جاکر اپنے میزبانوں کو تلاش کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور مفلوک الحال ہو کر اس بستی میں آرہے ہیں جس عورت نے اُن کی اُس وقت

رمت کی تھی وہ موجود تھی اُس کو ان کے شناخت کرنے میں دقت ہوئی مگر انھوں نے اس کو فوراً پان لیا اور بعد میں اُس کو اور اُس کے بیٹے کو گوالیار میں لے جاکر بڑی عزت کے ساتھ رکھا اور شہ وہ خاندان ان کا موردِ عنایات رہا۔

اِس واقعہ سے عیاں ہے کہ لڑائی کی اسپرٹ دیہات میں نہیں پہنچی تھی اور ہندو مسلمانوں کے دل آپس میں بالکل صاف تھے۔

ولکر پہ الزام

بسواس کے مہلک زخم لگنے پر بھاؤ نے اس کو ہاتھی کے ہودے میں لٹا دیا تھا اور خود ہاتھی سے اُتر کر اور اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہوکر بہادروں کی موت نے کے لئے اُس مقام پر چلا گیا تھا جہاں معرکۂ جنگ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایک روایت ہے کہ خود لڑائی کے بھنور میں کودنے سے پہلے بھاؤ نے ملہار راؤ ہولکر کو ان "ہدایات" پر کاربند ونے کا پیام بھیجا جو اسے دی جاچکی تھیں مگر نہ اُن ہدایات کا کہیں ذکر ہے نہ بھاؤ کا وہ یام ہولکر کو پہنچنے کا واقعہ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ البتہ لڑائی کے شاہدوں کا بیان ہے کہ اؤ کے گھوڑے پر چڑھ کر صفوفِ قتال میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملہار راؤ ہولکر ہ اپنے چند رفقا کے میدان سے ایک طرف نکل گئے اور ان کے بعد ہی دتاجی گائیکواڑ بھی انہ ہوگئے۔ ہولکر کے نکتہ چین مرہٹوں کے پاؤں میدان جنگ سے اکھڑنے کا ان ہی کو باعث قرار یتے ہیں کیوں کہ اِس وقت تک مرہٹے بڑے جوش کے ساتھ لڑ رہے تھے اور افغانوں کی فوں میں گھسے ہوئے تھے۔

سواس راؤ کا حشر

بہرحال بھاؤ کے اُتر جانے کے بعد ہی بسواس راؤ کا ہاتھی کے ہودے ہی میں دم نکل گیا۔ کنکیڈ کی روایت کے بموجب بھاؤ کی بیوی پاربتی بائی ی اس وقت ہاتھی پر اس کے ساتھ موجود تھی اور بسواس راؤ کے جب مہلک زخم لگا تو بھاؤ نے ل حسرت و اندوہ کے ساتھ پاربتی بائی سے کہا کہ وہ اپنے بھائی پیشوا کو اب منھ نہیں دکھا سکتا روایت اگر درست ہے تو پاربتی بائی کا افغانوں کے ہاتھوں میں پڑ سے بچ رہنا بہت تعجب انگیز ہے۔ کیوں کہ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواصی کا ہاتھی چوں کہ بہت بڑا اور خوب آراستہ پیراستہ تھا اس لئے برخوردار خان کی جمعیت کے افغان سپاہیوں نے جب اُس کو دیکھا تو ہ زیور و سامان کے لالچ میں اُس کے گرد ہوگئے۔ جو مرہٹہ سردار خواصی میں بیٹھا تھا اُس کو رہٹوں نے مار گرایا یا ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا کی ناموس پاربتی بائی کو اُس قیامت خیز ہنگامہ سے

کال لے جانے کی غرض سے خاتون موصوف کو ساتھ لے کر ہاتھی سے اُتر گیا ہو۔ اور افغان سپاہیوں نے فقط فیلبان کو لاش کا نگہبان پایا ہو۔ انہوں نے زیور وغیرہ کو تو لاش پر سے اُتار لیا اور لاش کو جس سے سرداری کی شان عیاں تھی پالکی میں ڈال کر لے چلے۔ پالکی اتفاقیہ نواب شجاع الدولہ کے ڈیرے کے سامنے سے گذری۔ نواب نے افغانوں سے حال دریافت کیا اور جب اُن کو بسواس راؤ کی لاش دستیاب ہونے کا پتہ لگا تو نواب نے ان افغانوں کو دو ہزار روپے اُسی وقت بطور انعام دے کر لاش کو اپنے کیمپ میں ایک خیمے کے اندر رکھا۔ ان افغان سپاہیوں نے اپنے لشکر میں پہنچکر بسواس راؤ کی لاش کے ملنے اور شجاع الدولہ کے اُس کو لے لینا کا ذکر کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر شاہ نے سُنی اور اپنے خاص آدمی نواب کے پاس بھیجکر لاش کو دیکھنے کے لئے منگایا۔ اُسوقت کُلہ افغان سردار اور سپاہی لاش کو دیکھکر بے اختیار اُس کے حُسن وجمال اور تناسب اعضاء کی تعریف کرتے تھے۔

ایک افغان جو لاش کے معائنہ کے وقت موجود تھا اس کا بیان ہے کہ بسواس راؤ کے دونوں ہاتھ زانو تک پہنچتے تھے۔ چہرے کا رنگ مرنے پر بھی نہیں بدلا تھا بلکہ وہی شباب کی آب و تاب رکھتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور کسی قدر کھلی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے سو رہا ہے۔ ایک زخم تلوار کا گردن کے پیچھے دونوں کانوں کے درمیان آدھ اُنگل گہرا تھا اور تیر کا زخم بائیں طرف کی بھوں پر لگا تھا لیکن اِن زخموں کے لگنے سے اس کی پوشاک پر آگے کی طرف خون مطلق نہیں گرا تھا اور نہ اُن کے صدمے سے چہرا بگڑا تھا۔ ہر شخص عین عالم شباب میں اُس کی موت پر متاسف تھا۔ افغانوں نے وسواس راؤ کی لاش پر شور مچایا کہ وہ اُسکو خشک کرکے اور مصالحہ بھر کر افغانستان پہنچائیں گے۔ شاہ ابدالی نے اُس وقت کچھ جواب نہیں دیا مگر لاش نواب شجاع الدولہ کو واپس نہیں بھجوائی بلکہ برخوردار خان کی جس کے آدمیوں نے لاش کو ہاتھی پر پایا تھا سپرد کردی اور وہ برخوردار خان کے دیوان موتی لال کھتری کے ڈیرے کے متصل ایک خیمے میں رکھی گئی۔ نواب شجاع الدولہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سوار ہوکر شاہ ابدالی کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ آپ افغانستان سے ہماری امداد اور سرکشوں کی تادیب کیلئے تشریف لائے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ ہم اور سرداران روہیلہ اِس ملک میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہیں اور باشندگانِ ملک سے ہمارا ہر وقت کا ساتھ ہے لہٰذا ہم کو اِس ملک کے رسم ورواج پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ قواعد اخلاق بھی اِسی امر کے

معتقد ہیں کہ کسی شخص سے خواہ کیسی ہی سخت دشمنی ہو وہ اُس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور بعد مرگ کوئی اثر خصومت کا باقی نہیں رہتا۔ اِس ملک کا دستور یہ ہے کہ مقتولین جنگ کی لاشیں ان کے ورثا کے حوالے کر دی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے مذہبی طریقے پر اُن کو اول منزل پہنچائیں۔ وسواس راؤ کی لاش اگر ولایت لے جائی جائے گی تو ہماری سخت بدنامی ہوگی۔ اور مرہٹوں سے ایک مستقل دشمنی قائم ہو جائے گی۔ لہٰذا اِس کی لاش کو ہندوؤں کی مذہبی مراسم کے بموجب جلانے کا حکم دیجئے۔ دیگر سرداران ہندوستانی نے بھی شجاع الدولہ کے بیان کی تائید کی اور شاہ نے برخوردار خان کو حکم بھیجا کہ وہ وسواس راؤ کی لاش نواب شجاع الدولہ کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ نواب نے اپنے وکیل کاشی رائے کی معرفت اُس لاش کو منگایا اور گنیش شنکر پنڈت اور دیگر ہندو کارندوں کی وساطت سے پورے سامان کے ساتھ صندل کی لکڑیوں میں اُس کے پھونکنے کا انتظام کر دیا۔

بھاؤ کی لاش کی دستیابی

بھاؤ کی لاش اب تک دستیاب نہ ہوئی تھی اور اُس کی مسلمہ شجاعت کے باعث سرداران روہیلہ کو اندیشہ تھا کہ بھاؤ اگر میدان جنگ سے زندہ نکل گیا ہے تو وہ پانی پت کے آس پاس مرہٹوں کی منتشر قوت کو سمیٹ کر پھر مقابلے کی تیاری کرے گا۔ نواب شجاع الدولہ کو بھاؤ کا انجام متحقق ہونے کا خیال تھا اِس لئے انھوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر اور گنیش راؤ پنڈت شیشادھر پنڈت۔ کاشی رائے اور دیگر اشخاص کو جو بھاؤ کے گھر سے شناسا تھے اپنے ساتھ لے کر میدان جنگ کا گشت لگایا اور لاشوں کے انبار میں ڈھونڈھنا شروع کیا۔ جس پر جسونت راؤ پنوار۔ سنبھاجی ماگھ۔ بنلاجی اور دیگر نامی سرداران مرہٹہ کی لاشیں ملیں۔ اِن سبھوں نے اپنے سینوں پر تلواروں اور بھالوں کے زخم کھائے تھے۔ سنبھاجی ماگھ کا بدن تلواروں کے زخموں سے چور چور تھا۔ جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں تھی مگر بھاؤ کی لاش ہنوز دستیاب نہیں ہوئی تھی کہ ایک مقام پر جہاں کئی نامور سرداروں اور خاصہ رسالے کے افسران کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لاش بلا سر کے نظر آئی۔ اُس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو تین بیش بہا و آب دار موتی اُس کے نیچے سے نکلے اور پھر چند موتی اور بھی کپڑوں میں دبے ہوئے پائے گئے۔ ان موتیوں کو مرہٹوں کے وکیل سندر پنڈت نے پہچانا کہ یہ اُس مالا کے ہیں جو بھاؤ کے گلے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد لاش کو بغور دیکھا گیا تو پاؤں میں ایک چھوٹا سا گول اور پیٹھ میں لمبا نشان اور زخم کا پایا گیا۔ جس سے اِس لاش پر بھاؤ کی ہونے کا احتمال اور قوی ہوا

دن کہ دکن کی ایک لڑائی میں بھاؤ کے پانوں میں بندوق کی گولی لگی تھی اور مظفر خان توپ خانہ پیشوا کے کمانیر تھے جس کو بھاؤ نے موقوف کر دیا تھا۔ اپنے داماد حیدر خان کو بھاؤ کے مارنے پر آمادہ کیا تھا اور ایک شخص نے پونا کے قریب دربار کے موقعہ پر سردار موصوف کی پشت میں تلوار ماری تھی۔ لاش کے ہاتھوں اور گھٹنوں پر گھٹے بھی پڑے ہوئے تھے کیوں کہ بھاؤ علی الصباح ہر روز سو دفعہ سورج دیوتا کو ڈنڈوت کیا کرتا تھا۔ نواب شجاع الدولہ نے لاش کے تمام ٹکڑوں کو مرتب کرایا مگر سر باوجود تلاش کے نہ مل سکا لہٰذا اسی حالت میں لاش کا کریاکرم ہندوؤں کے مراسم کے بموجب مرہٹوں کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ اس کے بعد سردار برخوردار خان کی فوج کا ایک افغان سوار ملا جو اپنے ہاتھ میں کوئی چیز کپڑے میں لپٹی ہوئی لٹکائے تھا۔ اس کو جب لالچ دیا گیا تو اس نے کپڑے کو کھول کر ایک سر نواب شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ لاش جو خاک پر پڑی ہے، اس کا سر یہ ہے جو میں نے اسی تن پر دیکھا تھا۔ یہ ایک چالاک و بارعب شخص تھا اور بیش بہا مالائیں گلے میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا جسم اور گھوڑے کا ساز جواہر سے آراستہ تھا اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ افغانوں پر حملے کر رہا تھا۔ جب اس کے گھوڑے کے بندوق کی گولیاں لگیں اور وہ چلنے سے عاجز ہو گیا تو یہ جوان اس پر سے اتر کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسی طرح لڑتا رہا۔ پھر اس دوسرے گھوڑے کے بھی خستہ و بے کار ہو جانے پر ایک اصیل گھوڑی لی۔ اس اثناء میں یہ برابر چابک دستی سے بھالے اور تلوار مارتا تھا اور میدان نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر اس کے دو زخم گولیوں اور نیزے کے کاری لگے اور گھوڑے کے زین پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی تو یہ زمین پر گرا۔ ہم پانچ افغان سواروں نے بہ طمع جواہر جو یہ پہنے ہوئے تھا اس کا تعاقب کیا اور چوں کہ یہ پیدل آہستہ آہستہ جا رہا تھا اس لئے ہم بہت جلد اس کے سر پر پہنچ گئے اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اور کس مرہٹہ لشکر کا سردار ہے۔ سچ سچ بتا دے اور ہم سے جان کا خوف نہ کر۔ ہم جہاں تو کہے گا تجھ کو پہنچا دیں گے۔ مگر اس نے ہمارے سوالات کا کچھ جواب نہیں دیا جس پر ہمارے ساتھ کے ایک سوار نے بڑھ کر اس کے نیزہ مارا۔ یہ جوان اگرچہ پیدل تھا لیکن اس نے افغان سوار کے نیزے کو پھرتی سے اپنے بھالے پر روکا اور اس کا نیزہ بیکار کر کے اس کو زخمی کیا۔ یہ دیکھ کر ہم نے اس کو مغلوب کرنے کا ارادہ کر لیا تاہم اس نے دو تین سواروں کو اس حالت میں بھی زخمی کر دیا۔ بعد ازاں زخموں کی کثرت سے چور ہو کر یہ زمین پر گرا۔ اس وقت میرے ساتھ کے ایک سوار نے گھوڑے سے اتر کر

اس کا سر کاٹ لیا اور اُس کے بدن پر جو جواہر تھا وہ اتار کر ہم نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ سر کو وہ لئے جاتا تھا مگر میں نے اُس سے لے لیا۔

یہ حال سنکر نواب شجاع الدولہ نے اُس افغان سے سوال دجواب کیا تو ظاہر ہوا کہ سر درحقیقت اِسی نے کاٹا ہے اور یہ اُس کو چھپانے جا رہا تھا تاکہ زیور و جواہر کی بابت اُس سے کوئی پرسش نہ ہو۔ اس سر کو نواب شجاع الدولہ کے اپنے مرہٹہ ساتھیوں کو دکھایا تو انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ دکھن کا نامور بہادر سردار (بھاؤ) یہی ہے۔ نواب شجاع الدولہ نے کچھ اور انعام کا وعدہ کر کے وہ سر اُس افغان سے لے لیا اور بعد ازاں اُن ہی برہمنوں کے ہاتھ سے ہندو مراسم کے موافق اُس کو اوّل منزل کرا دیا۔ جس مقام پر بھاؤ کی لاش ملی تھی وہاں ایک آم کا درخت تھا جو قریب ستر پچھتر سال بعد تک باقی تھا۔ اب گورنمنٹ پنجاب نے اُس جگہ ایک یادگاری نشان بنوا دیا ہے۔ دیگر مرہٹہ سرداروں کی لاشیں بھی اسی طرح جلا دی گئیں اور افغان مقتولین میں سپاہیوں کی لاشیں گڑھے کھود کھود کر بعد یک جائی نماز کے دبا دی گئیں اور افسروں کی الگ الگ قبریں بنائی گئیں، اور نماز جنازہ بھی پڑھی گئی۔

مرہٹہ مقتولین کی لاشیں بھی کچھ گڑھوں میں دبائی یا مٹی سے چھپا دی گئیں۔ خاص کر وہ جو افغان سرداروں کے ڈیروں کے قریب پڑی ہوئی تھیں اور باقی لاشیں یوں ہی کھلے میدان میں پڑی ہوئی ہفتوں بعد تک طعمۂ زاغ وزغن ہوتی رہیں اور بیسیوں برس بعد تک مُردوں کی ہڈیاں کھیتوں میں ہل چلانے کے وقت نکلتی رہیں اور اب بھی گاہے گاہے برآمد ہوتی ہیں قصبۂ پانی پت کے لڑکے میدانِ کارزار میں کھیلتے ہوئے اکثر سکّے اور دیگر اشیاء پاتے تھے اور قصبے کے چاروں سمتوں میں چالیس چالیس کوس تک مرہٹوں کے سامان کی دھات کی اشیاء لوگوں کو ملتی رہیں۔

کنکیڈ کی یہ روایت کہ امراؤ گر نے جو شجاع الدولہ کی فوج میں گوسائیوں اور ناگوں کے دستوں کا افسر تھا وسواس راؤ، تنکوجی سیندھیا اور سنبھاجی واگھ اور جسونت راؤ پنوار کی لاشیں کریا کرم کے لئے تین لاکھ روپیہ دے کر افغان سے حاصل کیں درست نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ مرہٹہ سرداروں کی لاشوں کو تلاش کرنے اور اوّل منزل پر پہنچانے میں کاشی راؤ برابر شریک رہا اور اگر امراؤ گر جو اس کا دوست وہمعصر تھا اور دونوں ایک ہی سرکار د

(نواب شجاع الدولہ کے ملازم تھے) روپیہ دے کر لاشوں کو حاصل کرتا تو وہ اپنے رسالے میں ضرور اس کا حوالہ دیتا۔

جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کا اتلافِ جان

بسواس راؤ کی لاش کے سلسلہ میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ جس کے باعث دو نامور و ممتاز مرہٹہ سرداران جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانیں حسرت انگیز طریقے پر تلف ہوئیں۔ اس واقعے کی پوری کیفیت دیوان کاشی رائے معتمد نواب شجاع الدولہ نے اُس بیان میں لکھی ہے جو اُس نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے جانشینوں کی واقفیت کیلئے جنگِ سوم پانی پت کے متعلق بزبانِ فارسی مرتب کیا تھا اور جس کا وانا پور کے کرنیل جیمس براؤن نے انگریزی ترجمہ کر کے فروری ۱۷۹۱ء میں اُس کو چھپوایا تھا۔ کاشی رائے کی یہ کتاب اٹھارھویں صدی مسیحی کے آخری اور انیسویں صدی مسیحی کے ابتدائی سالوں میں بہت مشہور و مروّج تھی اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخ جنگِ مرہٹہ و ابدالی لکھنے میں اس سے بڑی مدد لی۔ مگر اب عرصہ دراز سے کاشی رائے کی اصل فارسی کتاب بہت کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اور کرنل جیمس براؤن کا انگریزی ترجمہ ہی اس کی یادگار ہے جو انگلستان و ہندوستان میں دو تین دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

کاشی رائے نے اپنی کتاب کو اگرچہ جنگ پانی پت کے کتنے ہی سال بعد قلمبند کیا مگر وہ اُس معرکے کی نسبت ایک نہایت مستند و باوثوق بیان سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ کاشی رائے نے تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے یا اُن کی صحیح اطلاع معتبر وسائل سے اُس کو ملی، اور اُس نے خود رسالۂ مذکور میں تحریر کیا ہے۔ کہ گو وہ اِن واقعات کو ایک عرصے کے بعد لکھ رہا ہے مگر حتّی الامکان اس نے کوئی ضروری امر فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ خصوصاً جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانیں ضائع ہونے کی نسبت اُس کا بیان یقیناً درست و قابلِ اعتبار ہے۔ کیوں کہ وہ خود اِس معاملے میں ایک کارکن تھا۔

کاشی رائے کا بیان جنکوجی سیندھیا کے واقعے کی نسبت

کاشی رائے بسواس راؤ کی لاش کے متعلق افغان سپاہیوں کے مذکورۂ بالا مطالبہ اور ہندوستانی امراء کی اُس کو ہندو مذہب کی مراسم کے بموجب جلانے کی جدّوجہد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ یہ معاملہ کوئی دو روز تک زیرِ بحث رہا۔

نجیب الدولہ اور فی الحقیقت جملہ ہندوستانی رؤسا اِس درخواست میں شریک تھے (کہ بسواس راؤ کی لاش جلانے کے لئے ہندوؤں کے سپرد کر دی جائے) میں بھی اسی وجہ سے میگھراج وکیل نجیب الدولہ کے ساتھ برخوردار خان اور اُن کے دیوان موتی لال کے ڈیروں پر بھیجا گیا۔ دوسری دفعہ میں تنہا گیا۔ اس وقت موتی لال نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں صرف اسی کام (بسواس راؤ کی لاش حاصل کرنے) کے لئے آیا ہوں۔ یا کوئی اور کام اس کے علاوہ بھی اپنے سپرد لے سکتا ہوں، میں نے کہا کہ جس کام کو بھی وہ کہیں میں تا بمقدور اُس کے سر انجام دینے کو تیار ہوں۔ اِس پر وہ (موتی لال) چپکے سے مجھے اندر کے دو ڈیروں میں لے گیا۔ ایک ڈیرے میں میں نے راجہ بالو پنڈت بھاؤ کے وکیل کو پایا۔ جو زخمی تھا۔ اُس کے ساتھ میں کچھ دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ اس کے بعد میں دوسرے ڈیرے میں گیا جہاں راؤ جنکوجی سیندھیا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بندوق کی گولی کا زخم تھا اور ہاتھ میں برچھی لگی تھی جس کو وہ رومال کی گلجندڑی میں ڈالے ہوئے تھا اور کوئی تیئیس[23] سال کی عمر کا مضبوط جوان تھا۔ وہ برہان پوری چیرہ نافرمانی رنگ کا سر پر باندھے اور گجراتی مشروع کا گھٹنا پہنے تھا، مجھے دیکھکر اس نے سر نیچا کر لیا میں نے یہ دیکھکر کہا کہ "آپ ایسا (اظہار ندامت) کیوں کرتے ہیں۔ انسان سے جس بہادری و جاں فشانی کی امید ہو سکتی ہے وہ آپ نے کی، اور اِس لڑائی کے کارنامے ہمیشہ انسانوں کو یاد رہیں گے۔"

یہ سُن کر جنکوجی نے اپنا سر اٹھایا اور کہا کہ سچ ہے۔ تقدیر پر کسی شخص کا زور نہیں چل سکتا مشیتِ ایزدی میں دم مارنے کی جگہ نہیں ہے۔ کاش کہ میں میدانِ جنگ میں مارا جاتا، مگر میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ یہاں لایا جاؤں۔ اب یہ لوگ مجھ سے روپیہ مانگتے ہیں اور جو کچھ یہ طلب کرتے ہیں اس کا ادا کرنا میرے لئے کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ مگر اُس کو اس وقت یہاں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ تم میرے باپ (جیاپا سیندھیا) کے دوست تھے اور ہمارے اور نواب (شجاع الدولہ) کے خاندان میں ہمیشہ مراسم اتحاد رہے اور میرے باپ نے ان کی بہت کچھ خدمت کی ہے۔ اگر نواب صاحب اپنی سرکار سے اس وقت میری رہائی کے لئے روپیہ دے دیں تو یہ ایک ایسا احسان ہوگا جس کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

جنکوجی سے یہ سُنکر) میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ نواب اِس موقع پر کوتاہی نہ کریں گے اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ کتنا روپیہ درکار ہے، موتی لال نے کہا کہ سات لاکھ روپیہ مانگ لیتے ہیں

میں نے جواب دیا کہ اتنا روپیہ تو اس وقت کوئی نہ دے سکے گا۔ البتہ مناسب رقم ہو تو نواب صاحب ضرور دے دیں گے۔ موتی لال نے کہا کہ شاید اس سے کم رقم پر معاملہ طے ہو جائے۔ میں فوراً نواب صاحب کی خدمت میں واپس آیا۔ اس وقت نواب موصوف نجیب الدولہ کے ساتھ ایک مسند پر بیٹھے ہوئے ناچ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے تمام وہ گفتگو بیان کی جو اُس کام (بسواس راؤ کی لاش کی ہندوؤں کو حوالگی) کی بابت ہوئی تھی جس کے لئے انہوں نے مجھے بھیجا تھا لیکن چوں کہ مجھے اس خصومت کا حال خوب معلوم تھا جو نجیب الدولہ کو جنکوجی سے گھرانے اور ذات سے تھی، اور یہ خیال تھا کہ نجیب الدولہ بہت ہوشیار ہے اور اُس نے جنکوجی کے زندہ ہی گرفتار ہونے کی کچھ سُن گن پائی ہوگی۔ اس واسطے میں نے جنکوجی کا احوال اس وقت نواب صاحب سے کہنا مناسب نہ سمجھا اور ڈیرے کے دوسرے حصّے میں چلا گیا۔ لیکن نجیب الدولہ نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور بعد میں نواب (شجاع الدولہ) سے کہا کہ کاشی راجہ کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور کچھ بات بھی کہنا چاہتا ہے جس کو میرے سامنے نہیں کہہ سکتا۔ شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے اور فوراً مجھے بلایا اور گنگاجی کی قسم مجھے دلا کر کہا کہ نجیب الدولہ کے موجود نہ ہونے کی صورت میں جو کچھ میں کہتا وہ بیان کردوں۔ اس طرح مجبور ہو کر میں نے (جنکوجی اور بابو پنڈت کے برخوردار خان کے ڈیروں میں موجود ہونے اور اُن سے روپیہ طلب کئے جانے اور جنکوجی کے نواب صاحب سے مدد چاہنے کا) سب حال بیان کر دیا۔ نجیب الدولہ جو اپنے دل کی باتیں چھپانے اور ظاہر داری برتنے میں کمال رکھتا تھا۔ اُس کو سُن کر بظاہر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اپنے دشمنوں سے مصیبت کے وقت نیک کرنا بہت مناسب ہے اور اس سے مردوں کی نیک نامی ہمیشہ رہتی ہے۔ آپ جنکوجی کی رہائی کے لئے سعی کریں اور جو کچھ روپیہ طے ہوگا اُس کا نصف حصّہ میں دوں گا۔ نجیب الدولہ کا یہی طریقہ تھا۔ مگر نواب سے رخصت ہونے کے بعد وہ سیدھا اشرف الوزراء کے ہاں گیا اور اُن کو تمام باتوں سے مطلع کر دیا۔

چوں کہ ایک طرف نجیب الدولہ سیندھیا کے خاندان کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا اور دوسری جانب وزیر بھی برخوردار خان کا دشمن تھا جس کو وہ اُس کے خفیہ نامہ و پیام کا حال ظاہر کر کے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ اُسی وقت سوار ہو کر شاہ ابدالی کے

س گیا اور جنکوجی سیندھیا کا برخوردار خان کے ڈیرے میں ہونے کا حال اُن سے کہا۔ اہ موصوف نے برخوردار خان کو بلایا اور جنکوجی کو چھپائے رکھنے کی بابت اُس سے دریافت کیا س نے وزیر کو بیٹھے دیکھ کر صاف انکار کیا کہ مجھے اِس کا کچھ علم نہیں۔ اُس وقت وزیر نے مجھے ہادت دینے کیلئے بُلایا۔ لیکن میرے سب حال کہہ دینے کے بعد بھی برخوردار خان انکار ہی رتا رہا جس پر شاہ نے اپنے نسقچیوں کو حکم دیا کہ جاکر برخوردار خان کے ڈیرے کی تلاشی یں۔ اس طرح جب برخوردار خاں بالکل مجبور ہو گیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم بھیجا کہ شاہ ے نسقچیوں کے پہنچنے سے پہلے جنکوجی اور بابو پنڈت دونوں نظربندوں کو ٹھکانے لگا کر ہ دوں کے اندر ہی دفن کر دیں برخوردار خاں کے ملازموں نے اس کے حکم کی تعمیل کی راس طرح ان دونوں بدنصیبوں کی جان گئی۔

یب الدولہ کا طریق عمل | کاشی رائے کے مندرجۂ بالا بیان سے نجیب الدولہ پر ان دونوں سرداروں کے اتلافِ جان کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ، مگر کاشی رائے کا محض قیاس ہے جو خاندان سیندھیا کے ساتھ نجیب الدولہ کے جذبات وومت کو مدِنظر رکھکر قائم کیا گیا ہے اور ان جذبات کا ہونا اس تکلیف و پریشانی کو نظر رکھتے ہوئے چنداں تعجب انگیز نہیں جو نجیب الدولہ کو سُکرتال میں مہینے برابر اُٹھانی پڑی جب کہ دتاجی و جنکوجی سیندھیا نے اُس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ہٹے اُس کے علاقے کو بے رحمی سے تاراج کر رہے تھے۔ نجیب الدولہ نے اگر فی الحقیقت ذاتی ی سے جیا یا سیندھیا کے نوجوان ہونہار فرزند جنکوجی کی جان پانی پت میں ضائع کرائی۔ ررت نے اس کا بہت ہولناک انتقام نجیب الدولہ کی اولاد سے لے لیا جس کے بیٹے ضابطہ خان رہٹوں نے اِس طرح تباہ کیا کہ آج تک "سبل گڈھ" کے کھنڈر اُس واقعہ پر نوحہ کناں ہیں اور ب الدولہ کے پوتے غلام قادر خان کو بھی خاندان سیندھیا ہی کے ایک ممبر نے شاہ عالم پر ستم کرنے پر شدید ترین عقوبت میں گرفتار کیا۔

مگر اس وقت کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دوسرا قیاس کرنا بھی ممکن ہے کہ نجیب الدولہ شاہ ابدالی کو ہر طریقے پر خوش کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ شاہ موصوف نے اُس کو اُس کے وں کے خطرے سے بچایا تھا وہ جنکوجی کو قتل کرانے کے درپے نہ ہو بلکہ صرف اس کا اور پنڈت کا زرفدیہ بجائے برخوردار خان کے جو اس معاملے کو پوشیدہ طور پر بالا بالا طے کر کے

ود فائدہ اٹھانا چاہتا تھا وزیر و شاہ کو دلانا چاہتا ہو، وزیر کو اس سے برخوردار خان کو زک ش
دینے کا ایک موقعہ دستیاب ہوا اور برخوردار خان نے وزیر کی اندرونی خصومت سے خود کو
محفوظ رکھنے کے لئے اُن دونوں سرداروں کو جلد سے جلد قیدِ حیات سے چھڑانا ضروری سمجھا۔
بہر حال نجیب الدولہ کی نیت خواہ بُری ہو یا بھلی۔ مگر جنکوجی سیندھیا جیسے بہادر نوجوان اور
بابو پنڈت جیسے مدبّر کا اِس حسرت انگیز طریقے پر مارا جانا بہت دردناک تھا۔ اور
شجاع الدولہ و نجیب الدولہ و دیگر سردارانِ روہیلہ اس کا ہمیشہ رنج و افسوس کے ساتھ
ذکر کیا کرتے تھے۔

ابراہیم خان گاردی کا انتقال مراٹھوں کا نامور افسر توپخانہ ابراہیم خان گاردی میدان پانی پت میں سخت زخمی ہوگیا تھا مگر اُس کے بچ جانے کی اُمید تھی۔ وہ بحالتِ زخمداری نواب شجاع الدولہ کے کیمپ میں پہنچ گیا تھا اور نواب نے اُس کو پناہ دی تھی اور پوشیدہ طور سے اودھ میں بھیجنے کا انتظام کر رہے تھے۔ کیوں کہ نواب اس کی جنگی قابلیت کے معترف و مدّاح تھے اور اس کی تیار کردہ پلٹنوں نے میدانِ کارزار میں جو زبردست مہارتِ فنونِ حرب دکھائی تھی اُس کا اُن کے دل پر کافی اثر تھا۔ مگر افغانوں کو جب گاردی کے نواب شجاع الدولہ کے پاس ہونے کی خبر ملی تو چوں کہ اس کی پلٹنوں کے حملے سے ان کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا اور اُن کے بہت سے اعزّہ و اقارب میدانِ پانی پت میں مارے گئے تھے اِس لئے انہوں نے شاہ ابدالی کے پاس جاکر گاردی کو اپنے عزیزوں کے خون کے عوض قتل کئے جانے کا مطالبہ کیا۔

شاہ نے شجاع الدولہ سے پوچھا تو پہلے انہوں نے انکار کیا مگر قسم دیئے جانے پر مان لیا کہ وہ ان کے ہاں موجود ہے اور اُس کی شجاعت و نمک حلالی کی تعریف بھی کی۔ افغانوں نے اُس کی حوالگی پر زور دیا تو نواب نے کہا کہ جو شخص میری پناہ میں آیا ہے خواہ وہ دشمن ہو۔ مگر اُس کی حفاظت مجھ پر فرض ہے۔ افغانوں نے کہا کہ ہمارے ہزاروں بھائیوں کا خون اُس کی گردن پر ہے اور وہ کافروں کی طرف ہوکر شاہ اسلام سے لڑا۔ شجاع الدولہ نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور فارسی تاریخوں میں لکھا ہے کہ افغانوں کے زیادہ شور مچانے پر نواب شجاع الدولہ اپنی سپر و شمشیر ہاتھ میں لے کر لڑائی کے ارادے سے کھڑے ہوگئے۔ اُس وقت اشرف الوزراء نے افغانوں کا ہجوم اور جوش دیکھ کر شجاع الدولہ کو الگ لیجا کر سمجھایا کہ

فی الحال گاردی کو ہمارے لشکر میں بھیج دیجئے۔ میں اُس کی حفاظتِ جان کا ذمہ دار ہوں اور افغان سپاہیوں کو ٹھنڈا کر کے ایک ہفتے بعد اس کو تمہارے پاس واپس بھیج دوں گا اور اِس اثنار میں اس کا علاج برابر انہیں جراحوں سے کرایا جائے گا جن کو آپ نے مقرر کیا ہے۔

شجاع الدولہ نے وزیر سے گاردی کی حفاظتِ جان کا حلفیہ وعدہ لے کر اس کو اُن کے پاس بھجوا دیا۔ وہ اگرچہ اس وقت سخت زخمی تھا مگر اس حالت میں بھی اُس نے شاہ اور وزیر کے سوالوں کے مردانہ وار جوابات دیئے۔ اور جب کسی نے اُس کی حالت اسیری پر چڑانا چاہا تو گاردی نے کہا کہ "مشیت ایزدی سے انسان مجبور ہے۔ بھاؤ جیسا لاثانی دلاور میدانِ کارزار میں مارا گیا اور میری یہ حالت ہوئی مگر میں نے اپنے مالکوں کا حق نمک ادا کیا اور آیندہ جو کوئی مجھ سے خدمت لے گا اُس کے کام میں ایسی ہی جان فشانی کروں گا۔"

شاہ نے اس کو اشرف الوزرار کے سپرد کر دیا اور علاج کے لئے تاکید کی مگر ایک ہفتہ بعد جس روز شاہ ابدالی دار السلطنتہ دہلی میں داخل ہوئے۔ گاردی کا انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ افغانوں نے جراحوں سے مل کر اُس کے زخموں پر زہر آلود مرہم کے پھائے رکھوا دئیے تھے۔ گاردی شہر دہلی کے باہر قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مگر اب اس کی قبر کا نشان نہیں ملتا۔

بھاؤ کا زبردست رسوخ واثر

دوست دشمن دونوں کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ مرہٹوں نے پانی پت میں کافی تہور وبسالت کا اظہار کیا۔ اور بالخصوص اُن کے سپہ سالار (بھاؤ) نے وہ جوان مردی وشجاعت دکھائی جو افغانوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہی۔ بھاؤ کو ملہار راؤ ہولکر سے پہلے اپنی جان بچا کر میدان سے نکل جانے کا موقع تھا اور اگر وہ اس موقعے سے کام لیتا اور دہلی کا رُخ کرتا تو وہاں تیسرے چوتھے ہی روز راجہ نارو شنکر کی جمعیت کی بنیادوں پر پانی پت کے بچے ہوئے آدمیوں کی ایک خاصی بڑی فوج تیار ہو سکتی اور جو کمک دکن سے چلی آ رہی تھی اُس کے ملنے پر مرہٹوں کی قوت پھر شمالی ہند میں خاصی مضبوط ہو جاتی۔ مگر بسواس راؤ کو اپنے پہلو میں مہلک زخم کھا کر گرتے دیکھ کر بھاؤ دل شکستہ و مایوس ہوگیا اور اپنے نوجوان بھتیجے کی موت اور بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کی عورتوں اور بچوں کی افغانوں کے ہاتھوں میں گرفتاری

کے بعد اُسے دکن واپس جانے اور اپنے بھائی پیشوا کو منہ دکھانے کی ہمّت باقی نہیں رہی۔ اِس لئے اس نے میدانِ جنگ میں بہادروں کی موت مرنا پسند کیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی پیدل ؤزخمی ہونے کے باوجود پانچ افغان سواروں کے مقابلے سے منھ نہیں پھیرا۔ بھاؤ کے لاشۂ بے سر کو خود پیشوا کے وکیل اور دیگر خیر خواہوں اور ملازمون نے شناخت کر لیا تھا۔ بعد میں سر بھی دستیاب ہوگیا تھا۔ مگر تن اور سر کے الگ الگ ملنے سے لاش کی اصلیّت کے متعلق جو شبہ پیدا ہوگیا تھا اُس کے باعث بھاؤ کے میدانِ جنگ سے زندہ نکل جانے کی افواہیں شمالی ہند سے اُڑکر دکن پہنچیں۔ اور پہلے تو صرف اس کے قریبی عزیزوں اور مدّاحوں نے ان ضعیف توقعات کو اپنے دل میں جگہ دی مگر بعد ازاں پونا کی مرکزی قوت میں جو اضمحلال و انتشار پیدا ہوا اس نے دیگر اشخاص کو بھی اُن افواہوں کے قبول کرنے پر مائل کر دیا اور جن دو شخصوں نے "بھاؤ" ہونے کا دعویٰ کیا۔ اُن میں سے ایک شخص کو بھاؤ کے سسرالی رشتہ داروں کی اِس قدر تائید حاصل ہو گئی کہ اس نے ایک مختصر جمعیت اپنے گرد فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور مرکزی حکومت کے ارکان کو اُس کے خلاف فوجی کارروائیاں کرنی پڑیں۔

اِس خانہ جنگی میں سینکڑوں جانوں کا نقصان ہوا اور چوں کہ زوجۂ بھاؤ کے اِس شخص کے فریب میں آجانے سے اس کے جرم کی نوعیت بہت سنگین ہوگئی تھی۔ اِس لئے اس کو بہت سخت سزا دی گئی اور ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر سارے شہر میں اس کی لاش کی تشہیر کرائی گئی۔ دوسرے شخص کو چوں کہ چنداں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اِس لئے صرف قید کی سزا اُس کے لئے کافی سمجھی گئی اور اُس کی گرفتاری کا فرض بھی دوستوں نے ادا کیا۔

اِن واقعات سے عیاں ہے کہ بھاؤ کی مرہٹوں کے دل میں کتنی زیادہ وقعت و عزّت تھی اور اگر وہ پانی پت میں بحالتِ یاس و حرمان اپنی جان نہ گنواتا تو گو اُس زبردست شکست کی ہرگز تلافی نہیں کر سکتا تھا جو اُس کے لشکرِ عظیم کو پانی پت میں اٹھانی پڑی۔ تاہم اِس شکست کے مضرت رسان اثرات میں ضرور کمی ہو جاتی اور پیشوا کے زوالِ اقتدار کی وہ کچھ روک تھام کر سکتا۔

معرکۂ پانی پت فنِ حرب کے پہلو سے | شاہِ ابدالی پانی پت میں اپنے ہندوستانی

یقوں سے کہا کرتا تھا کہ اُن کو اِس کا پورا اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو مرہٹوں سے صلح کر لیں
ر صلح کی جو شرائط اپنے نزدیک مناسب سمجھیں۔ وہ قرار دادیں۔ وہ اُس کے لشکر میں اطمینان
ے ساتھ پاؤں پھیلا کر سوئیں۔ کیوں کہ وہ اُن کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور اس کے افغان
سپاہی اُن کے پسینے کی جگہ اپنا خون گرانے کو تیار رہیں۔ لیکن اگر جنگ کی نوبت پہنچے گی تو ہندستانی
سرداران کو اس کی رہ نمائی قبول کرنی پڑے گی اور اِس میں کلام نہیں کہ اگرچہ روہیلہ سردار و
نواب احمد خان بنگش نے لڑائی میں ہر قسم کی جانفشانی و تن دہی سے کام لیا اور نواب
اع الدولہ نے بھی جو ابتدا میں لڑائی سے الگ رہے تھے آخری نازک وقت میں اشرف
ندار کو قیمتی مدد پہنچائی۔ لیکن تمام فوجی افسران جنہوں نے سوم جنگ پانی پت پر خالص فن
بے کے پہلو سے نظر ڈالی ہے۔ اِس بارے میں ہم آہنگ ہیں کہ شاہ ابدالی نے باغپت کے
ٹ پر جمنا کو عبور کرنے کے وقت سے لے کر پانی پت کے میدان کارزار میں مرہٹوں کے
کرِ عظیم کو شکست فاش دینے کے وقت تک اِس پورے وقت میں اعلیٰ مہارت فن حرب
وت دیا اور دکنی سردار جس طریقۂ حرب میں مشاق تھے اسی کو خود بڑی مستعدی اور
شیاری کے ساتھ برت کر اُن کی ہزیمت کا سامان بہم پہنچایا۔

بھاؤ نے پانی پت کے گرد خندق اور دمدمے تیار کرکے اور اُن پر زنجیرہ بند توپیں
ر اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا مگر بعد میں یہی حصار اُن کی کمزوری کا باعث ہوا اور مرہٹوں
شکر خود اپنی تیار کردہ لائن کے اندر محصور ہو گیا۔ مرہٹے فی الحقیقت سیواجی کے وقت
، "گوریلا وارفیر" یعنی قزاقی لڑائیوں یا اُردو کے سب سے بڑے شاعر حضرت میر کے
ا میں جو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکر میر" میں جنگ سوم پانی پت کا
، دیتے ہوئے مرہٹوں کے طریقہ جنگ کی نسبت استعمال کئے ہیں "جنگِ گریزپائی" میں مشاق
اور کھلے میدان میں بڑی فوجوں کے ساتھ قوت آزمائی پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔
جی کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو پہاڑوں اور جنگلوں میں متفرق
پوشیدہ رکھتا تھا اور جب موقع دیکھتا تھا تو شہروں قصبوں یا شاہی قلعوں پر طوفان
وباد کی سُرعت سے یکایک ٹوٹ پڑتا تھا اور شہنشاہی افواج کی آمد سے پہلے لوٹ مار
نکل جاتا تھا۔

شائستہ خان سپہ سالار افواجِ شہنشاہی پر شب کو خاص اُس کے محل میں حملہ کرنا۔

جس میں خان موصوف کا ایک بیٹا کام آیا اور خود اُس کو اپنی گردن شمشیر کے وار سے بچانے میں اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے دست بردار ہونا پڑا سیواجی کا ایک خاص کارنامہ تھا اور اس کے جانشینوں نے بھی اُسی کا طریقہ جنگ اختیار کیا کہ مرہٹہ سوار ہلکے سامان کے ساتھ بھالوں اور تلواروں سے مسلح تیز رفتار گھوڑوں پر چڑھ کر کوسوں کے دھاوے مارتے تھے اور جس علاقے میں پہنچتے تھے۔ اُس کو اپنی تاخت و تاراج سے بے چراغ کر دیتے تھے۔ دشمن کا رسالہ اگر ان کے ایک دستے کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجاتا تھا تو دوسرا دستہ دائیں بائیں سے یکایک اُس پر آپڑتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے ساتھ رسالے کا سامان بھی لوٹ لے جاتا تھا۔ بعد میں جب شاہی فرامین کی رُو سے بڑے بڑے علاقوں کی حکومت ان کو حاصل ہوئی تو انہیں بتدریج میدان داری بھی سیکھنی پڑی۔ مگر جنگِ پانی پت سب سے بڑی میدانی لڑائی تھی جو مرہٹوں کو اپنے دورِ اقتدار میں لڑنی پڑی۔

اگر بھاؤ اپنے خیرخواہ سورج مل جاٹ اور ملہار راؤ ہولکر کے مشورے کو رعونت کے ساتھ مسترد نہ کرتا اور شاہ ابدالی کے جمنا سے عبور کر لینے کے بعد بھی وہی قزاقی لڑائی کی طرح ڈالتا تو عجب نہیں کہ وہ شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفیقوں کو شاہ کے لشکر سے اپنے علاقوں کی حفاظت کے لئے جانے اور مرہٹوں کے ساتھ مناسب شرائط پر صلح طے کر لینے پر مجبور کر دیتا اور شاہ ابدالی بھی سرہند تک جو ہندوستان کی سمت میں پنجاب کا آخری مقام ہے اپنا تسلط قائم کرکے اپنے وطن واپس چلا جاتا۔ مگر بھاؤ کو ابراہیم خان گاردی کی قواعد دان پلٹنوں اور توپ خانے پر بڑا بھروسہ تھا جن کو وہ دکن کی لڑائیوں میں مضبوط قلعوں کو بہ آسانی مسخّر کرتے اور طاقت ور فوجوں کو شکست دیتے دیکھ چکا تھا۔

حقیقت میں فوج کا یہ حصہ مرہٹوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ اور بھاؤ کو اُس کی مجبوریوں اور کوتاہیوں پر غور کرنے کا ابھی موقعہ نہیں ملا تھا بلکہ دہلی اور کنجپورہ کے قلعوں کے دروازے گاردی کی توپوں کے چند فیروں کے بعد ہی کھُل جاتے دیکھ کر اُس کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔ برخلاف ازیں شاہ ابدالی نے اپنی فراست سے یہ سمجھ لیا تھا کہ بھاری توپیں قلعوں کی تسخیر یا حفاظت میں تو کام آسکتی ہیں مگر رسالے کے ساتھ اُن کا

اتحادِ عمل زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس نے نقشۂ جنگ اِس قسم کا تجویز کیا کہ اُسے خود مرہٹوں کی لائن پر حملہ آور ہونے اور اپنی سپاہ کو گارڈی کی توپوں کی زد میں لانے کا موقعہ پیش نہ آئے بلکہ وہ مرہٹوں کو اپنے حصار سے نکل کر حملہ آور ہونے پر مجبور کرے ۔ اِس صورت میں اُن کی زیادہ بھاری توپیں پیش قدمی کے وقت ان کا ساتھ نہ دے سکیں گی اور دوسری توپیں بھی دونوں طرف کے سواروں کی باہمی آویزش کے وقت بیکار ہوجائیں گی ۔

چنانچہ شاہ موصوف کا یہ خیال بالکل درست نکلا اور گارڈی کی توپوں نے میدان کی دست بدست لڑائی میں کچھ زیادہ کام نہیں دیا ۔ البتہ اُس کی پلٹنوں نے اپنی قواعددانی کی بدولت ابتدائی حملہ میں غلبہ حاصل کرلیا اور افغانوں کے آٹھ دس ہزار آدمیوں کو گرا کر اُن کی لائن توڑدی اور افغان سپاہی ان کے مسلسل فیروں کی تاب نہ لاکر پیچھے ہٹنے اور بھاگنے لگے ۔ لیکن چوں کہ اِس قواعدداں فوج کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی اِس لئے جب دشمنوں نے دوبارہ ہجوم کیا تو وہ چاروں طرف سے گھر گئیں اور توپیں ان کو مطلق مدد نہ پہنچا سکیں ۔ کیوں کہ اگر اُن سے کام لیا جاتا تو اُن کی آتشباری پہلے خود ان پلٹنوں کا ستھراؤ کردیتی ۔ اِس اثنا میں گارڈی کے شدید مجروح ہونے کے باعث وہ اپنے ہوشیار قائد سے بھی محروم ہوگئیں کیوں کہ مرہٹہ سرداروں میں سے کوئی اِن قواعدداں پلٹنوں کو اُن کے مقررہ طریقے کے موافق لڑانے کی قابلیت نہ رکھتا تھا ۔

ایک انگریز جرنیل نے اپنے جنگِ سوم پانی پت کے مشہور تبصرہ میں یہ بہت پتے کی بات کہی ہے کہ شاہ ابدالی کی جنگی چالیں فی الحقیقت مرہٹوں کو اُن کے مضبوط حصار ہی کے اندر بھوکا مار کر مغلوب کرچکی تھیں مگر مرہٹوں کے لئے اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دینا اور اجنبیوں کی اطاعت قبول کرلینا سخت دشوار اور اُس وقت کے طریقوں کے لحاظ سے قریباً محال تھا خصوصاً جب کہ انہیں افغانوں کی بے رحمی اور خوں خواری کا بھی علم تھا ۔ لہٰذا جنگ کی بازی کے ہر جانے کا یقین رکھنے کے باوجود انہوں نے میدانِ جنگ میں بہادروں کی موت مرنا پسند کیا اور وہ اپنے حصار سے مہم کو سر کرنے کے لئے نہیں بلکہ مردوں کی طرح مرنے کے لئے باہر نکلے اور بہت جان

ر لڑے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔

بھاؤ کو چونکہ حالات نے سخت پریشان و مایوس کر دیا تھا۔ اِس لئے اس نے اُن
ولی احتیاطوں کو بھی جو اتنے بڑے معرکۂ کارزار کے لئے لازمی تھیں استعمال نہیں کیا
اپنی پوری قوت شروع ہی سے لڑائی میں لگادی۔ برخلاف ازیں شاہ ابدالی نے ایک
شیار و آزمودہ کار جرنیل کی طرح اپنے خاص محافظ دستوں کو ریزرو میں رکھا اور
ع الدولہ پر بھی صفوفِ زد و خورد میں داخل ہونے کے لئے زور نہیں دیا اور جب
ٹوں کا زور کئی گھنٹے مسلسل شمشیر زنی و نیزہ بازی کے بعد گھٹنے لگا تو اس نے اپنے
نظ دستوں اور نواب کی فوج سے جو تازہ دم تھیں مرہٹوں پر جو خستہ ہو چکے تھے
ف سامنے کے رُخ سے ہلّہ کر دیا بلکہ اپنی محافظ سپاہ کے ایک حصّے کو کسی قدر چکّر
کر مرہٹوں کے بازو پر گرنے کا بھی حکم دیا اور مرہٹوں کی صفوف اِس دو طرف کی
سے بالکل اُلٹ گئیں۔ اگر اِس وقت بھاؤ کے پاس بھی کوئی ایسا ہی ریزرو موجود ہوتا
شاہ ابدالی کی یہ جنگی چال ایسی آسانی سے کامیاب نہ ہو سکتی اور کم از کم مرہٹوں کو
یب کے ساتھ میدان سے ہٹ آنے کا موقعہ مل جاتا۔ گو اپنے سامان و اسباب
عورتوں کو جو حصار کے اندر تھیں وہ اِس حالت میں بھی افغانوں کے ہاتھ میں پڑنے
سے نہیں بچا سکتے تھے۔ کیوں کہ حصار کے اندر واپس ہونا فاقوں سے مرنے کے
رادف تھا۔

بھاؤ کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنی اور بسواس راؤ کی پائیگاہوں کی
ص افواج کو آخری یا مناسب وقت کی کوشش کے لئے ریزرو میں رکھتا لیکن جیسا کہ
نے اوپر لکھا ہے مرہٹے کسی باقاعدہ میدان داری کے لئے حصار سے نہیں نکلے تھے
فاقہ کشی اور وبائی امراض سے ہلاک ہونے کے بجائے دشمنوں سے لڑکر مرجانا چاہتے
تھے اور اُن سخت ناگوار حالات میں ان کے لئے کامیابی کی صرف ایک صورت تھی
وہ ایک دم زبردست حملہ کرکے افغانوں کے پاؤں میدان سے اکھیڑ دیتے مگر شاہ
الی ایک ہوشیار جرنیل کی طرح مرہٹوں کی ایسی کوشش کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی
رتھا اور جاسوسوں کے ذریعے سے اپنے آپ کو مرہٹوں کے کیمپ کی حالت سے باخبر
ھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے فنِ حرب کے مسلّمہ اصول سے مرہٹوں کے طاقت ور حملے کو

برداشت کیا۔ اور آخر میں اپنے ریزرو کو بڑی ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ استعمال کر کے ان کو شکست دے دی جس نے اس وقت کے حالات کی وجہ سے ہزیمت کی صورت قبول کر لی۔

شاہ ابدالی بانیٔ آزاد افغانستان

شاہ آبدالی کا ایک طاقت ور حکمران اور ہوشیار جرنیل ہونے کے علاوہ ملیئے ہم قوم افغانوں پر ایک یہ احسان عظیم بھی ہے کہ اُس نے اُن کو غیروں کی ماتحتی سے چھڑایا اور اس آزاد افغانستان کی بنیاد رکھی۔ جو آج کل اپنے جوان بخت وجوان سال حکمران کی سرپرستی و رہنمائی میں اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا ہے اور قرائن و آثار کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایشیا کی ایک اہم طاقت بننے والا ہے۔ شاہِ ممدوح ایک باسطوت وجبروت حکمران کے بجائے ایک خوددار قومی لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں جو افغانستان کے تمام باشندوں کو بلاتفریق نسل وعقیدہ ایک طاقت ور قوم بنا دینا چاہتے ہیں اور مشرق جو ڈیڑھ صدی سے مغربی سرمایہ داروں کے عالمگیر اقتدار کی ہوس کا تختۂ مشقِ ستم بنا ہوا ہے اُس کو قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے دیگر مشرقی اقوام کے ساتھ برادرانہ اتحاد پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس میں ہندوستان کے جملہ محبانِ وطن بلکہ تمام ہمدردبنی نوعِ انسان کی نیک خواہشیں اُن کے شاملِ حال ہیں۔

تاریخ سے عیاں ہے کہ افغانستان زمانۂ قدیم سے مختلف قبائل کا مسکن تھا جو اپنے کوہستانی علاقوں میں آزادانہ زندگی بسر کرتے اور باہم دگر برسرپیکار رہتے تھے۔ اُن کی اِس آخرالذکر عادت سے ہمسایہ ملکوں کے حوصلہ مند اشخاص نے فائدہ اٹھایا اور اگر ہندوؤں کی قدیم افسانہ نما روایات کا جن کی آثار قدیمہ کے اکتشافات سے برابر تصدیق ہو رہی ہے لحاظ نہ کیا جائے تو بھی تاریخ کے زمانے کی مستند روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان کا ملک دشوار گذار کوہستانی علاقوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنی ہمسایہ اقوام کی ترکتازیوں کا جولانگاہ بنا رہا اور غزنی وغوری خاندانوں کے اقتدار کے مختصر درمیانی وقفہ کے سوا کوئی باقاعدہ مستقل حکومت اس میں اس وقت تک قائم نہیں ہوئی جب تک نادرشاہ کی وفات کے بعد ملک ایران کی خانہ جنگی اور

مغلیہ سلطنت ہندوستان کی کمزوری کے وقت میں جرنیل احمد خان ابدالی نے اپنے ہم قوم افغان سرداروں کی رضامندی و تائید سے تاج شاہی اپنے سر پر نہیں رکھا اور افغانستان میں ایک مستقل و مضبوط مرکزی حکومت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ یہ بنیاد شاہ موصوف کے ہاتھ سے ایسے مبارک و مسعود وقت میں رکھی گئی کہ اگرچہ اُس کے بعد اندرونی حکومتِ افغانستان میں خاندان اور شخصیتوں دونوں کے انقلابات ہوئے اور شاہ ابدالی کے کمزور و غیر ہر دل عزیز پوتے کو انگریزی افواج نے ہندوستان سے ساتھ لے جاکر اپنی سنگینوں کے سایہ میں تختِ کابل پر بٹھایا لیکن شاہ ابدالی نے اپنی مسلسل شاندار فتوحات سے افغانوں کے تمام قبائل میں باہمی عداوت و خانہ جنگی کے باوجود حب وطن و حمایت آزادی کے ایسے طاقتور جذبات پیدا کر دیئے تھے کہ شاہ شجاع کو اپنے انگریز حمایتیوں کے بھروسے پر زیادہ عرصے تک تختِ کابل پر متمکن رہنے کا موقعہ نہیں ملا اور تحریکِ آزادی کے قائد اعظم امیر دوست محمد خان کے ایک معرکہ میں فتح پانے کے بعد ہی اپنے آپ کو انگریزی کیپل واجینٹ کے حوالے کر دینے اور کلکتہ میں لاکر رکھے جانے کے باوجود جہاں ان کا بڑا مشغلہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے ساتھ شطرنج کھیلنا تھا۔

ان کے نامور و شجیع فرزند اکبر خان نے افغانستان میں انگریزی فوج کو نہ صرف شکست دی بلکہ بالکل تہس نہس کر دیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مسلمہ ہوسِ ملک گیری کے باوجود انگریزی حکومت کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ امیر دوست محمد خان کو کلکتہ سے کابل میں باقاعدہ مسندِ امارت پر بیٹھنے کے لئے واپس بھیجیں اور اُن سے عہد و پیمان کریں۔ اس کے بعد جب امیر دوست محمد خان کے پوتے امیر یعقوب خان نے اپنی کمزوری سے انگریزوں کو امور مملکت میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ افغان ایک مرتبہ پھر حمایت آزادی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اوّل جنگِ افغانستان کے بعض واقعا میجر کیوگناری انگریز ایجنٹ اور اُن کے رفقاء و عملہ کے قتل وغیرہ کی صورت میں د دہرائے گئے۔

اگرچہ انگریزی فوج نے لارڈ ابرٹس آف قندھار کی زیر قیادت اس ناپسندید کارروائی کا انتقام لیا اور غزنی کے شہر اور کابل کے مشہور قلعۂ بالاحصار کو تباہ

منہدم کر دیا۔ لیکن افغانستان پر مستقل قبضہ کرنے کی اس وقت بھی انگریزی حکومت کو ہمت نہیں ہوئی اور امیر یعقوب خان کو اپنی کمزوری اور اپنے ہم قوموں کے مقابلے میں غیروں کی پناہ ڈھونڈھنے کا خمیازہ اپنے تخت سے محرومی اور دہرہ دون کے مقام پر طویل نظر بندی کی صورت میں بھگتنا پڑا اور انگریزوں کے قومی خصائل میں بہادری و حبِّ وطن کی قدردانی جس حد تک شامل ہے۔ اُس پر اِس واقعہ سے ایک روشنی پڑتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے امیر یعقوب خان کے چھوٹے بھائی سردار ایوب خان مشہور فاتح میوند کے ساتھ باوجودیکہ وہ صرف ایک صوبہ (ہرات) کے گورنر تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سے بہتر سلوک کیا۔ یعنی اُن کے ایران کی نظربندی سے نکل آنے کے بعد اُن کو امیر یعقوب خان سے کئی گنا زیادہ وظیفہ بھی دیا گیا اور سرحد سے نسبتاً قریب لاہور میں کئی سو رفقاء و خدّام کے ساتھ مقیم ہونے کی اجازت دی گئی۔

افغانستان کی حکومت امیر دوست محمد خان کے دوسرے پوتے امیر عبدالرحمٰن خاںؒ مرحوم کو روسی ترکستان سے بلا کر سپرد کی گئی جنھوں نے اپنی زبردست ڈپلومیسی سے انگریزوں اور روسیوں کے درمیان افغانستان کو بطور ایک "بفر اسٹیٹ" کے محفوظ رکھا اور فوجی قوت کو اُس وظیفہ کی مدد سے جو اُنھیں گورنمنٹ ہند سے ملتا تھا اور مضبوط کیا اور فوجی اسلحہ و سامان کے علاوہ بعض مصنوعات کے کارخانے بھی کابل میں قائم کئے۔ امیر عبدالرحمٰن خان مغفور گویا" افغانستان جدید" کے بانی تھے اور اُن کے اقبال مند و بیدار مغز جانشین .... اِس معاملہ فہم و دُور اندیش امیر کی قائم کردہ بنیادوں ہی پر دولتِ مستقلۂ افغانستان کی عظمت و قوت کا ایوان فلک فرسا تعمیر کر رہے ہیں۔

اگر شاہ ابدالی مملکتِ افغانستان کی بنیاد نہ ڈالتا تو وہ ملک پہلے کی طرح برطانوی ہند و روسی ترکستان کے درمیان تقسیم ہو جاتا اور ہندوستان کو روسی حملے کا خطرہ کہیں زیادہ شدّت کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا جس کی روک تھام کی تدابیر میں اربوں روپے اور ہزارہا قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا۔ لہٰذا شاہ ابدالی کے افغان سپاہیوں نے گو پانی پت کے میدان میں ہزارہا مرہٹوں کو قتل کیا مگر شاہ موصوف نے افغانستان میں ایک مستقل حکومت قائم کر کے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ترکمانوں اور روسیوں کی پیہم تاخت و تاراج سے محفوظ کر دیا۔

نارو شنکر کا دہلی کو چھوڑ دینا | جنگ پانی پت کے نتیجے کی جب دہلی میں راجہ نارو شنکر کو

خبر پہنچی تو وہ بہت مضطرب ہوا اور چونکہ دکن سے جلد کمک [illegible] سے کوئی امید نہیں رہی تھی اِس لئے وہ دارالسلطنت کو چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ دہلی اُس وقت مرہٹوں کی فوجی مہم کے لئے ایک مستقر کی حیثیت رکھتا تھا اور یہیں سے روپیہ و سامان رسد بھاؤ کے لشکر کو بھیجا جاتا تھا۔ اس وقت بھی غلّہ و دیگر اشیاء کے وسیع ذخائر نارو شنکر کے پاس موجود تھے مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ شاہ ابدالی نے دہلی کا رُخ کیا ہے تو وہ بالکل گھبرا گیا اور اگرچہ اپنی جمعیت سپاہ کے ساتھ وہ کچھ عرصے تک بہ آسانی شہر کی حفاظت کرسکتا تھا لیکن اس نے شاہ کی آمد سے قبل وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔

اوپر لکھا جاچکا ہے کہ بھاؤ نے دہلی کو چھوڑنے سے قبل شاہزادہ جوان بخت عرف "جہان قدر" خلفِ اکبر شاہزادہ عُلی گوہر کو جنہوں نے بعد میں شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا اُن کے باپ کی نیابت میں تخت پر بٹھا دیا تھا اور شاہزادہ موصوف اپنی دادی زینت محل زوجۂ شہنشاہ عالمگیر ثانی کی ہدایات پر عمل پیرا تھا جو ایک دانش مند و باہمّت خاتون تھیں اور اپنے فرزند کے لئے تخت شہنشاہی کو محفوظ کرنا چاہتی تھیں۔ اور ایک طرف مرہٹوں کو گستاخ نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں اور دوسری جانب شاہ ابدالی کے افغان سپاہیوں کی دست بُرد سے بھی دارالسلطنت اور اُس کے باشندوں کو محفوظ رکھنا چاہتی تھیں چنانچہ "مرأت آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ " نواب زینت محل صاحبہ نے عنایت و مہربانی کی راہ سے اور حقوقِ بندگیِ قدیم پر نظر کرکے اگرچہ مرہٹوں سے کچھ حرکاتِ ناشائستہ بھی صادر ہوئی تھیں (یہ اشارہ ہے بھاؤ کے اسباب شہنشاہی و سامانِ مقابر پر دستِ تصرف دراز کرنے کی طرف) ان سے اغماض برت کر نارو شنکر کو شاہ ابدالی کی فوج کے پہنچنے کی آفت سے آگاہ فرمایا کہ مال و متاع اور نقدی میں سے جس قدر بھی ممکن ہو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے ہٹ جائے۔

بہرحال بیگم صاحبہ کی حمایت کی بدولت وہ دارالخلافت سے نکل آیا مگر اوباشانِ شہر کے ہاتھوں اُس کا بہت سا مال تلف ہوا اور راؤ مذکور (نارو شنکر) نے روانگی کے وقت ۳ ½ لاکھ روپیہ نقد اور دکن کی اجناس ملازمانِ حضرت بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیں۔ اور جو ذخائر کہ منتشر تھے اور جابجا رکھے ہوئے تھے ان کے اٹھانے کا بوجہ اضطرار اُن کو وقت نہیں ملا۔ لہٰذا وہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ آگئے۔"

دیکھئے میدانِ پانی پت میں مرہٹوں نے اِس قدر زبردست شکست کھائی لیکن ان کا جو قائم مقام دہلی میں تھا اس کو ولی عہد اور اُن کی دادی صاحبہ نے ایسے طریقے پر رخصت کیا جس طرح کوئی اپنے وفادار ملازم کی خطرے سے حفاظت کرتا ہے۔ نارو شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے مفرورین پانی پت کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہا اور جو بدنصیب بھوکے پیاسے منزلیں طے کرتے وہاں پہنچے۔ انھیں جب دار السلطنت میں پناہ نہ مل سکی تو وہ سخت مایوس ہوئے اور دکن کی طویل و دشوار گذار راہ کا طے کرنا اُن کے لئے محال ہوگیا۔ چنان چہ سینکڑوں آدمی دہلی اور اُس کے گرد و نواح میں زندگی کے مصائب سے چھوٹ گئے اور ہزاروں آدمی دہلی سے متوا ہجکی علاقہ بھرت پور میں داخل ہوئے اور سورج مل جاٹ کی مہربانی سے آذوقہ حیات و زادِ راہ پاکر دکن چلے گئے۔

شاہ ابدالی کا داخلہ دار السلطنت میں

شاہ ابدالی پانی پت کی لڑائی جیتنے کے آٹھویں روز دار السلطنت دہلی میں داخل ہوئے۔ نواب زینت محل صاحبہ اور شاہزادۂ ولی عہد بہادر نے ان کا استقبال کرکے شہر کے شاہی محلات میں اُن اتارا اور ایک لاکھ روپیہ بطریقِ ضیافت شاہ کی خدمت میں اور پچاس ہزار اشرف الوزراء کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ عرصے بعد امیر الامراء عماد الملک نے جو سورج مل کے قلعے میں مقیم تھا۔ اپنے معتمد علیہ دیوان ناگر مل کو شاہ ابدالی کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ اگر شہنشاہ دہلی کی وزارتِ عظمیٰ کا منصب شاہ اس کو دلادیں تو وہ ستر لاکھ روپے کا زر و جواہر نذر کرنے کو تیار ہے۔ شاہ نے اِس کو قبول کیا اور اپنے معتمد علیہ یعقوب علی خان کو جس نے بھاؤ کے حملے سے ابتداء میں قلعہ دہلی کی حفاظت کی تھی دیوان ناگر مل کے ساتھ وصول نذرانہ کی غرض سے بھیجنا چاہا۔ مگر نواب زینت محل صاحبہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے عماد الملک کے خلاف ایک دفترِ شکایت شاہ ابدالی کے سامنے کھولا اور احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے ساتھ اُس کی گستاخیاں اور مظالم یاد دلاکر کہا کہ ہم اُس بانیٔ فساد کو ہرگز وزیر نہیں بنائیں گے۔ شاہ نے بیگم صاحبہ و شاہزادۂ ولی عہد کو قدرے اطمینان دلایا مگر یعقوب علی خان کا عماد الملک کے پاس بھیجنا ملتوی نہیں کیا۔

عماد الملک نے ایک عرصے تک یعقوب علی خان کو لیت و لعل میں رکھا۔ آخر میں ظاہر

ہوگیا کہ عماد الملک خود مفلوک الحال اور دوسروں سے اعانت کا امیدوار رہے۔ اِس اثنا میں شاہ ابدالی اپنی سپاہ کے تقاضے سے مجبور ہوگئے اور اپنی ایسی عظیم الشان فتح سے کوئی اور فائدہ اٹھائے بغیر اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔ البتہ پنجاب و سندھ کے دونوں صوبے معہ کشمیر اسوقت سے دہلی کے شہنشاہی اقتدار سے نکل گئے۔

جنگ پانی پت کے اثرات جملہ مورخ اِس امر پر متفق الرائے ہیں کہ پانی پت کی شکستِ عظیم نے مرہٹوں کی قوتِ اقتدار پر ایک ایسی ضرب لگائی جس سے وہ پھر پنپ نہیں سکی اور شمالی ہند میں اُن کو مستقل اقتدار پیدا کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ نارو شنکر جو چھ سات ہزار مرہٹہ سواروں اور پیادوں کی جمعیت کے ساتھ دہلی پر قابض اور امور سلطنت پر حاوی تھا۔ جنگ پانی پت کے نتیجے کو سُنکر کچھ ایسا خوف زدہ ہوا کہ دہلی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی اِس کارروائی سے مرہٹوں کو مزید نقصان پہنچا۔ کیوں کہ جنگِ پانی پت کے بہت سے مرہٹہ مفرورین نے دہلی کا رُخ کیا۔ اگر نارو شنکر وہاں موجود رہتا تو ان مفرورین کو سہارا ملتا اور نارو شنکر کے پاس جو مرہٹہ فوج اس وقت تھی اس کی قوت اِن مفرورین کی شمولیت سے بڑھ جاتی اور کم ازکم وہ دارالسلطنت پر بآسانی اُس وقت تک قابض رہ سکتے تھے کہ پیشوا کی دکن سے بھیجی ہوئی کمک آجاتی۔ نارو شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے ان مفرورین کے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی اور ہزاروں آدمی دہلی سے مایوس واپس ہونے کے بعد راجستھان میں سر ٹکراتے پھرے۔

دہلی سے لے کر متھرا تک پانی پت کے فلاکت زدہ مرہٹہ مفرورین مہینوں پھرتے نظر آئے اور سورج مل جاٹ نے بعض روایات کے بموجب اپنا دس لاکھ روپیہ پانی پت کے مفرورین کو زادِ راہ دے کر دکن کی طرف روانہ کرنے میں خرچ کیا جس پر مرہٹے ہمیشہ اس کے احسان مند رہے۔ مگر اس زمانے کی ملکی سیاسیات کا عجیب رنگ تھا اور مرہٹوں نے لوٹ مار کو اپنا ایک مستقل پیشہ قرار دے لیا تھا۔ چنان چہ ملہار راؤ ہولکر اگرچہ پانی پت سے بھاگ کر خود متھرا و بھرت پور پہنچا اور سورج مل جاٹ کا مہمان رہا مگر تھوڑے عرصے بعد ہی اپنے محسن کے بیٹے اور جانشین جواہر مل کے قلعوں پر تاخت کرنے میں کچھ تامّل نہیں ہوا۔ چنان چہ "خزانۂ عامرہ" کی روایت کے بموجب نواح اکبرآباد (آگرہ) میں دھول پور

کے قریب عید کے روز ہولکر کا سولہ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ جواہر مل کی فوج سے مقابلہ ہوا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہولکر کی فوج روبفرار لائی۔ جواہر مل کی فوج قتل و غارت کرتی ہوئی اُس کے تعاقب میں چلی اور مفرورین کے ہاتھیوں گھوڑوں اور ساز و سامان کو چھین کر ایک بڑی تعداد کو انھوں نے تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ ہولکر کے آدمیوں نے قلعۂ دھول پور میں پناہ لی اور جواہر مل کی فوج والوں نے قلعۂ مذکور کا محاصرہ کیا۔ اور دس روز میں محصورین پر فتح پاکر پانچ سرداران فیل نشین کو دس ہزار آدمیوں سمیت قید کر لیا۔

ملہار راؤ ہولکر نے جب یہ خبر ہوش رُبا سنی تو اس کی ہمّت ٹوٹ گئی اور وہ اُس علاقے سے بھاگا اور بقرعید سے ایک روز قبل جھانسی میں انتقال کر گیا۔ پیشوا بالاجی باجی راؤ کو پانی پت کی خبریں برابر ملتی تھیں اور آخری ایّام میں بسواس راؤ نے اُس کو ایک خط اِس مضمون کا لکھا تھا کہ یہاں ہم لوگوں پر وقت تنگ ہے اور اگرچہ میرے مانند لڑکے آپ کو مل جائیں گے مگر بھاؤ کا سا دلاور بھائی نہیں ملے گا۔ لہٰذا آپ کو اُن کی امداد ضرور کرنی چاہیئے۔ اِن خبروں سے پیشوا پریشان ہوا اور پہلے وہ پونا سے احمد نگر آیا اور پھر دریائے گوداوری کے کناروں تک پہنچا۔ یہاں پہنچ کر مزید تشویش انگیز اخبار اس کے گوشزد ہوئے۔ اسی وقت میں جانوجی بھونسلے دس ہزار آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ اس سے آکر ملا اور پیشوا کی فوج ہندوستان کی طرف بڑھی اور تین ہفتے بعد جب وہ نربدا کو عبور کر رہا تھا تو ایک قاصد اس کے پاس پہنچا جس کو ساہوکاروں نے بھیجا تھا اور اُس نے نو دن میں پانی پت سے اورنگ آباد پہنچ کر جہاں پیشوا پہلے مقیم تھا چٹھی پیشوا کے لشکر میں پہنچا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ قاصد پیشوا کے روبرو حاضر کیا گیا تو اُس نے اپنی چٹھی پیش کی۔ پیشوا نے اس کو اپنے ہاتھ سے کھولا تو یہ حال پڑھا کہ :-

"دو موتی گھُل گئے۔ ۲۷ اشرفیاں ضائع ہوگئیں اور چاندی اور تانبہ جس قدر ضائع ہوا اُس کی کوئی میزان نہیں لگائی جاسکتی۔"

اس زمانے میں مہاجن اور ساہوکار ملک کے واقعات پر نظر رکھتے تھے اور اپنی کاروباری اغراض کے لئے اہم واقعات کی جلد سے جلد اپنے گماشتوں اور بیوپاریوں کو اطلاع دیتے تھے اور اپنی چٹھیوں میں اکثر رمزیہ عبارت استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا چٹھی میں بھی

بظاہر مال تجارت کا ذکر تھا اور کوئی ناواقف شخص اُس سے کوئی معنی پیدا نہیں کرسکتا تھا مگر پیشوا نے اُس کا مطلب سمجھ لیا اور اپنے نامور بھائی سداشیوراؤ بھاؤ اور عزیز فرزند بسواس راؤ اور دیگر سرداروں اور فوج کی تباہی اُس کو معلوم ہوگئی۔ اس کے بعد ہی فوج کے کچھ لوگ بھی پہنچے اور انہوں نے اِس خبر کی تصدیق کی۔

ابتدائی مفرورین میں بابوراؤ پنڈت وکیل پیشوا کا جس کی جان جھنکوجی سیندھیا کے ساتھ ضائع ہوئی بھتیجا بالاجی جنار دھن تھا جو بعد میں نانا فرنویس کے لقب سے مرہٹہ حکومت کے ایک ممتاز افسر کی حیثیت سے تاریخ میں مشہور ہوا اس کی ماں ان افغانوں کے ہاتھ پڑ گئی۔ مگر بیوی بچ رہی اور بھاؤ اور بسواس راؤ کی بیوائیں کی طرح دکن پہنچ گئیں۔

مہاراشٹر میں تہلکہ

پانی پت کی شکستِ عظیم کا حال جب لوگوں کو معلوم ہوا تو سارے مہاراشٹر میں تہلکہ پڑ گیا۔ کیوں کہ کوئی ممتاز گھرانا ایسا نہیں تھا جس کے کچھ لوگ پانی پت کے میدانِ کارزار میں ضائع نہ ہوئے ہوں۔ اکثر بڑے گھرانوں کی عورتیں جو اپنے مردوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئیں اور نربدا سے لے کر دریائے کرشنا تک پورے علاقے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

پیشوا کے قلب پر اِس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ اُسی وقت سے اُداس اور مضمحل ہوگیا اور اپنا ہندوستان کا عزم فسخ کرکے آہستہ آہستہ پونا واپس چلا گیا جہاں چند ماہ کا زمانہ اُس نے بڑی اُداسی کے ساتھ گذارا۔ اس کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور آخر واقعۂ پانی پت کے چھ ماہ کے اندر وہ اپنے مستقر میں پاربتی کے مندر کے اندر انتقال کرگیا۔ جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری ایّام گیان دھیان میں گذارتا تھا۔

مرہٹوں کا شیرازۂ قوت بکھر گیا

واقعۂ پانی پت کے وقت سے مرہٹوں کا عروج ختم ہونے لگا اور اُن کی قوت کا شیرازہ بکھر گیا گو جسونت راؤ ہولکر اور مادھوجی و دولت راؤ سیندھیا نے اِس کے بعد شمالی ہند کے علاقوں میں ترکتاز کی۔ اور اول الذکر شمال میں وسط پنجاب اور مشرق میں بنگال

ہار تک پہنچا اور سیندھیا نے دارالسلطنت [illegible] قریب سے طلاقوں پر متصرف ہو کر
ذاتِ شہنشاہی پر اپنا اثر قائم کیا اور پیشوا کے لئے "وکیل مطلق" کے موروثی عہدے
کا جو سلطنت میں سب سے بڑا معتمد منصب تھا اور اپنے لئے دیوان اور وزارت
کا فرمان شاہ عالم سے حاصل کیا۔ مگر یہ فی الحقیقت سیندھیا کی ذاتی فتوحات تھیں
اور ہمارے مرہٹہ مورخ اس پر متفق ہیں کہ مرہٹہ حکومت کی مرکزی قوت جو پیشوا کے
ہاتھ میں تھی واقعۂ پانی پت کے بعد بڑے درجہ تک زائل ہو گئی تھی اور ماتحت سرداروں
پر اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ نانا فرنویس کا سا ہوشیار مدبر اپنی حکمتِ عملی سے
یک عرصے تک پیشوا کی قوت کو سنبھالے رہا مگر آخر میں وہ بھی مجبور ہو گیا اور ایسٹ
نڈیا کمپنی کی روز افزوں قوت نے اپنی حکمت عملی سے ان کو فرداً فرداً آہستہ آہستہ مغلوب
کر لیا اور باجی راؤ خلفِ رگھوبا آخری پیشوا بھی سیندھیا۔ ہولکر۔ گائیکواڑ۔ پورندھر۔
ھونسلے وغیرہ سربرآوردہ ارکانِ حکومت کے انگریزوں سے مل جانے پر ہر طرف سے
مجبور و لاچار ہو کر سر جان مالکم مشہور اینگلو انڈین افسر سے رجوع لایا جس سے اس کی
رانی دوستی تھی۔ چنانچہ سر جان مالکم نے دوستی کو نباہا اور باوجودیکہ بعد میں اُس پر
علیٰ حکامِ کمپنی کی طرف سے سخت اعتراضات ہوئے مگر اُس نے جو پیشوا سے وعدے
کئے تھے اُن کو پورا کرایا اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ خزانۂ کمپنی سے اُس کو دلایا
رکانپور میں وفات پانے تک اُس کو ملتا رہا۔

پیشوا کے بڑے بھائی امرت راؤ کو بھی جسے اُس کی ولادت سے قبل رگھوبا نے
متبنّٰی کر کے مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا تھا اور تکوجی ہولکر نے پونا پر قابض ہو کر
جی راؤ کے بجائے اُس کو پیشوا بنا دیا تھا آٹھ لاکھ کا وظیفہ دیا جا چکا تھا۔ اس نے بنارس
میں قیام اختیار کیا تھا۔ باجی راؤ کی جس وقت وفات ہوئی اُس وقت لارڈ ڈلہوزی
ٹش انڈیا کے گورنر جنرل تھے۔ جو اپنی ہندوستانی ریاستوں کو غصب کرنے کی منحوس
لیسی پر عمل کر رہے تھے لارڈ موصوف کی گورنمنٹ نے باجی راؤ کے پسر متبنّٰی ڈھوندو پنت
رف "نانا صاحب" کا اُس کے باپ کے وظیفہ میں کوئی حق تسلیم نہیں کیا۔ حالاں کہ
ڑکوں کا متبنّٰی کرنا ہندوؤں کا قدیم دستور ہے اور ان کے مذہبی احکام کی رُو سے
ہر متبنّٰی تمام صورتوں میں صُلبی فرزند کے برابر ہو جاتا ہے اور اپنے والد [illegible]

تعزیت ادا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ حق بعد میں انگریزی حکومت نے تمام ریاستوں کے لئے تسلیم کیا اور اُس پر آج تک برابر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

"نانا صاحب" کو اپنے باپ کا وظیفہ نہ ملنے پر سخت مایوسی ہوئی اور سارے ہندوستان میں عام طور پر انگریزی حکومت کا یہ فعل بددیانتی اور معاہدے کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا گیا۔ نانا صاحب اِس کانٹے کو اپنے دل میں لئے رہا اور تھوڑے عرصہ بعد ہی جب پُوربیہ سپاہ نے بظاہر چربی ملے ہوئے کارتوسوں کے باعث مگر فی الحقیقت دوسرے بہت گہرے اسباب کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے سرکشی اختیار کی تو نانا صاحب کو اِس امر کا جس کو وہ اپنے نزدیک بدعہدی سے تعبیر کرتا تھا بدلہ لینے کا موقعہ مل گیا۔ اور اس نے اپنے علاقے کی سرکش فوج کی سرپرستی اختیار کر کے اپنے آبائی مرتبے کو دوبارہ حاصل کرنا چاہا۔ جس کے سلسلے میں وہ ہولناک و دردانگیز واقعہ پیش آیا جو "خون ریزیِ کان پور" کے لقب سے مشہور ہے۔

تھوڑے عرصے کے لئے "نانا صاحب" کا اقتدار کان پور اور آس پاس کے علاقوں پر قائم ہو گیا اور اُس نے بُندیلکھنڈ اور وسطِ ہند کے سرکشوں سے اتحادِ عمل کر کے دکن تک پہنچنا چاہا مگر اپنے رفیقوں کی خودغرضی و ناتجربہ کاری و عمّال کمپنی کی ہوشیاری اور ہندوستانی والیانِ ریاست کی غدّاری کے باعث نانا صاحب کو بھی فتنۂ ۱۸۵۷ء کے دیگر لیڈروں کی طرح آخر میں ناکام رہنا اور اپنی جان چھپا کر بھاگنا پڑا۔ برسوں تک اُس کی تلاش جاری رہی اور کئی بے گناہ اشخاص اس کے دھوکے میں گرفتار کئے گئے۔ آخر میں معلوم ہوا کہ علاقۂ نیپال میں کسی مقام پر دامنِ کوہ نے اُس کا پردہ ڈھانک لیا۔

مرہٹہ اقتدار کی یادگار چند ریاستیں بڑودہ۔ گوالیار۔ اندور۔ دیواس۔ دتیا وغیرہ باقی ہیں اور کولھاپور کے مہاراجگان براہِ راست سیواجی کی نسل میں ہیں۔ ستارہ میں سیواجی کے خاندان کی بڑی شاخ حکمراں تھی جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج نے عملی نظربندی کی حالت سے جو پیشواؤں نے اُس پر عائد کر رکھی تھی چھڑایا۔ مگر بعد میں کمپنی مذکور نے ایک معمولی سے بہانہ پر ستارہ کے راج کو خود ضبط کر لیا۔ آخری راجۂ ستارہ کا ایک وفادار ملازم باوجود عُسرت اور طرح طرح کی مشکلات کے اپنے آقا کے

نوق کی بحالی کے لئے کامل بتیس سال تک انگلستان میں مسلسل جدو جہد کرتا رہا اور
اگرچہ اُسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر وفاداری اور استقلال کی ایک زبردست
ثال اُسنے تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دی اور مسائلِ ہند پر انگلستان میں ایجی ٹیشن
رنے کی راہ بھی اپنے ہم وطنوں کو دکھائی۔

ک سوم پانی پت سے مغلیہ اقتدار شہنشاہی کو نقصان

پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے شکست پانے
ے اگرچہ بظاہر مسلمانوں کی زوال پذیر قوت شمالی ہند میں کچھ عرصے کے لئے پھر بحال ہو گئی
غور کیا جائے تو اِس جنگ کے نتیجے سے بالواسطہ مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو بھی سخت
ہمان پہنچا۔ کیوں کہ قدیم اُمرائے سلطنت میں بعض مقتدر اشخاص نے شاہ ابدالی کے
تھ جو ایک بیرونی حملہ آور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا وفاداری برتنی ضروری
ہی اور اسی نسبت سے دہلی کے تخت شہنشاہی کے ساتھ اُن کی وفاداری گھٹتی گئی
ر وہ مطلق العنان و خود رائے ہوتے گئے۔ یہ خرابی تو عہد محمد شاہ سے شروع ہو گئی
ا کہ ایک ہی عہدہ کے سلطنت اور صوبیداری و فوج داری کے دو دو تین تین عہدیدا
بار و ملک میں موجود ہوتے تھے اور اُن کے باہمی جوڑ توڑ اور کشمکش سے مرکزی
ست کے اقتدار کو ضعف پہنچا تھا۔
سلطنت کے دُور افتادہ صوبے مثلاً بنگال۔ بہار۔ اوڑیسہ۔ مالوہ و گجرات علاوہ
ے دکن کے عملی طور پر شہنشاہ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور اپنی اندرونی کشمکش
بتلا تھے اب مرکزی حکومت کے قریب کے علاقوں پر بھی ایسے لوگوں کا قبضہ قائم
ا جو اپنے کو شہنشاہِ دہلی کی ماتحتی سے قریباً آزاد سمجھتے تھے اور شاہ ابدالی سے اپنے
ں کی سند حاصل کر چکے تھے۔ افغان مرہٹوں سے کچھ کم لُوٹ کے حریص نہ تھے۔ اور
سے زیادہ ظالم و خون خوار تھے اور اپنی جنگی فتوحات کے زعم میں دہلی کی شہنشاہی کی
کے دلوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ برخلاف ازیں مرہٹے مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو
ر رکھنا چاہتے تھے اور اُس کی آڑ میں اپنی حریصانہ اغراض پُوری کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ
کے باشندوں کو وہ جشنِ تہنیت عرصے تک یاد رہا جو سوم جنگ پانی پت کے قریباً
صدی بعد اس وقت منایا گیا تھا جب کہ مادھوجی سیندھیا مغلیہ سلطنت کے سب سے

بڑے عہدے "وکالت مطلق" کا موروثی فرمان شاہ عالم ثانی سے پیشوا کے واسطے لے کر گیا تھا اور جس کے ساتھ ہی شہنشاہ موصوف نے سارے ہندوستان میں گاؤ کشی موقوف کرنے کا فرمان بھی صادر کیا تھا اور خود سیندھیا کو وزیرِ اعظم کا عہدہ اور "فرزندِ عالی جاہ" کا خطاب دیا تھا۔

نانا فرنویس کی ایک اہم تحریر

اِس واقعہ سے تیرہ چودہ سال پہلے جب رگھناتھ راؤ کی ہوسِ اقتدار نے اس کو انگریزوں کا آلۂ کار بنا دیا تھا تو اس وقت بھی مرہٹہ ارکانِ دولت اپنی ریاست کے قیام کے لئے دہلی کے تختِ شہنشاہی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مرہٹہ حکومت کے سب سے بڑے کارکن نانا فرنویس نے رگھناتھ راؤ کی پیدا کردہ لڑائیوں کے آخری زمانے میں جب حکامِ ایسٹ انڈیا کمپنی مادھو راؤ سیندھیا سے خفیہ مفاہمت کرنے میں ساعی تھے ایک چٹھی سیندھیا کو لکھی تھی جو اس وقت تک بجنسہٖ محفوظ ہے۔ اِس میں مرہٹوں کے اُس مدبرِ اعظم نے مادھو راؤ سیندھیا کو جتایا ہے کہ :-

"ہمیں ہرگز کمپنی کے علاقوں کو فتح کرنے کی خواہش نہیں تھی اور ہم نے کبھی اُن کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ خود انھوں نے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور پورے چھ سال تک ہم کو بھاری نقصانات پہنچاتے رہے۔ انھوں نے ہماری ریاست کے دو ارکان گائیکواڑ اور بھونسلے کو اپنی طرف توڑ کر ہماری حکومت کے ڈھانچے کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ اگر ہم ان کو ان کی مَن مانی کارروائیاں کرنے دیں گے تو ایک آفت و مصیبت اپنے اوپر لیں گے اور اپنے راج کو اُن کا ماتحت بنائیں گے۔ ہم ہرگز نہ اُن سے کسی رعایت کے خواستگار رہوں گے نہ خود کوئی رعایت کریں گے بلکہ نہایت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ اُن سے عہدنامہ کریں گے ہم کو نہ صرف اپنے نقصانات کی تلافی پر مصر ہونا چاہئے بلکہ بڑے سیواجی کی فتوحات کرناٹک میں سے جن حصوں پر اس وقت انگریز قابض ہیں اُن کو واپس لینے کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔ ہم اپنی اغراض کو انگریزوں کے ہاتھوں قربان کئے بغیر اپنے مقاصد کو دہلی میں ضرور حاصل کرلیں گے۔ اگر مرہٹے باہم متحد رہیں اور قوت کیساتھ کام کریں تو انگریز اپنا اقتدار کبھی دہلی میں قائم نہیں کرسکتے۔"

یہ خط غالباً اوائل ۱۷۸۲ء میں لکھا گیا تھا۔ بیچارے نانا فرنویس کو کیا خبر تھی کہ ہندوستانی رئیسوں کی یہ غفلت و عیش پسندی اور مرہٹہ سرداروں کی تنگ خیالی و خود غرضی کی بدولت انگریزوں کی قوت اس قدر بڑھ جائے گی کہ بیس سال کے بعد وہ دار السلطنتِ دہلی پر بھی متصرف ہو جائیں گے اور اندھا شہنشاہ اپنے نمک خوار ملازمین کی سازشوں اور شرارتوں سے تنگ آکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تائید و حمایت کو غنیمت سمجھنے لگے گا۔ مگر نانا فرنویس کی امیدیں مرہٹوں کے متحد رہنے اور قوت کے ساتھ کام کرنے پر مبنی تھیں اور یہ دونوں باتیں پوری نہیں ہو سکیں۔

حوصلہ مند مگر ناعاقبت اندیش رگھوبا نے اپنے ہم قوموں کو دبانے کے لئے اغیار سے مدد لے کر مرہٹوں کے اقتدار کی بنیادوں میں سرنگیں لگائیں اور اس کے بیٹے نے حکومت کے شوق میں اُس دانش مند مدبر کو ناراض و دل شکستہ کر دیا جو اِن سُرنگوں کو پھٹنے سے روکے ہوئے تھا۔ جن لوگوں نے اِس کام میں اس کو مدد دی انھوں نے اپنی اغراض پوری کرنی چاہیں اور دوسری طرف امیر تیمور کے آخری جانشین اگرچہ نیک دل و رعایا پرور مگر انتہا درجہ کے کاہل و سادہ لوح تھے۔ جو خود اغراض اشخاص کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پُونا میں "وکیل مطلق" (پیشوا) کی مسند خالی ہونے کے چالیس برس کے اندر دہلی میں تختِ شہنشاہی بھی خالی ہو گیا ؎

گیا حُسن خوبانِ دل خواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پانی پت کی آخری خونیں غذا

انگریزی عملداری کے قیام کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کی جو گوروں سے زیادہ ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھیں ہندوستان کے رئیسوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں پانی پت کے خون آشام میدان کو اُس کی مرغوب خونیں غذا نہیں ملی۔ البتہ سکھوں کی لڑائیوں کے سلسلے میں انگریزی فوجیں اس میدان کے مختلف حصّوں سے گذرتی رہیں اور کرنال میں ایک عرصہ تک فوج کی مستقل چھاؤنی بھی رہی جس کی یادگار اس وقت تک "کرنال کے بوٹوں" کی شہرت سے قائم رہے۔

فتنۂ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جب دہلی کو دوبارہ فتح کیا تو اِس خون آشام میدان کے ایک سرے پر "باؤلی کی سرائے" میں انگریزی فوج کی ایک چھوٹی سی لڑائی

"باغیوں" سے ہوئی اور دہلی سے نکل کر بھاگنے والوں کو علاقہ ہٰذا کے دیہاتیوں نے لوٹا کھسوٹا اور قتل بھی کیا۔ اب قریباً ستر سال سے وہ علاقہ انگریزی حکومت کی بدولت مسلسل امن وامان کی برکات سے بہرہ ور رہا۔ جنہوں نے اہلِ ملک کے قویٰ کو مضمحل کر دیا۔ اور جن گھرانوں کو تہائی صدی قبل تک اپنی دلیری وشجاعت اور فنونِ سپہ گری کی مہارت پر ناز تھا اُن کی موجودہ نسلیں استعمالِ اسلحہ تو درکنار جنگی اصطلاحات کو بھی فراموش کر چکی ہیں اور قلم کو تلوار سے زیادہ طاقت ور سمجھتی ہیں جس کی ایک جنبش اُن کو اُن کی اُس آبائی وراثت سے محروم کر دیتی ہے جس کو اُن کے اسلاف نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

پانی پت کے خونیں میدان کی لڑائیوں کے متعلق جدول سنین

(۱) مہابھارت (قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی جنگ کوروؤں اور پانڈوؤں میں)۔	میدان کوروکشیتر پر	کئی ہزار سال قبل ولادت حضرت عیسیٰ
(۲) سلوکس یونانی جرنیل کی آمد۔	دوآبہ میں	..
(۳) رضیہ سلطانہ کی لڑائی امرائے دہلی سے	..	سنہ ۱۲۳۹ء
(۴) نصرت خان بن فیروز شاہ تغلق اور شاہ محمود تغلق کی باہمی معرکہ آرائیاں	پانی پت وجھجر وغیرہ	سنہ ۱۳۹۵-۱۳۹۷ء
(۵) امیر تیمور صاحبقران کی پیش قدمی	دہلی پر	سنہ ۱۳۹۸ء
(۶) "اول جنگ پانی پت" (مابین بابر وسلطان ابراہیم لودی)	میدان پانی پت پر	سنہ ۱۵۲۶ء
(۷) "دوم جنگ پانی پت" (مابین اکبر اعظم وہیمو بقال)	"	سنہ ۱۵۵۶ء
(۸) بندا بیراگی کے ماتحت سکھوں کی تاخت	سرہند پر	"
(۹) مغلیہ افسر سلطان قلی خان کے ہاتھوں سکھوں کی تادیب	پانی پت وسرہند پر	"
(۱۰) نادر شاہ کی چڑھائی اور فوج محمد شاہ سے لڑائی	میدان کرنال پر	سنہ ۱۷۳۵ء
(۱۱) احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی اور محمد شاہ سے لڑائی (مغل شہنشاہی کی آخری شاندار فتح)	سرہند پر	سنہ ۱۷۴۸ء
(۱۲) عماد الملک وزیر کے بلانے سے مرہٹوں کی دار السلطنت پر آمد	قریب دہلی	سنہ ۱۷۵۳ء
(۱۳) مرہٹوں کی سورج مل جاٹ پر چڑھائی	بھرت پور پر	"

(۱۴) مرہٹوں کی دارالسلطنت پر نجیب الدولہ کے خلاف یورش	دہلی پر	سنہ ۱۷۵۸ء
(۱۵) مرہٹوں کی یورش پنجاب پر پیش قدمی کے سلسلے میں	سرہند پر	سنہ ۱۷۵۸ء
(۱۶) احمد شاہ ابدالی کا سرہند کو مرہٹوں سے واپس لینا	"	سنہ ۱۷۶۰ء
(۱۷) شاہ ابدالی کا دتّا سیندھیا کی فوج کو تباہ کرنا	براؤں گھاٹ قریب دہلی	سنہ ۱۷۶۱ء
(۱۸) بھاؤ کی روانگی مہم ابدالی پر	پٹدور علاقہ اورنگ آباد دکن	۱۴ مارچ سنہ ۱۷۶۰ء
(۱۹) بھاؤ کا برہان پور پہنچنا	برہان پور	۴ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۰) بھاؤ کا دریائے نربدا پر پہنچنا	ہنڈیا پر	۱۰ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۱) بھاؤ کا داخلہ وسط ہند راجپوتانہ و بندیلکھنڈ میں	سیہور۔ بھوپال سرونج۔ اورچھا	۲۸ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۲) اہیروں کی سرکشی	مقام آرن پر	۱۴ مئی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۳) بھاؤ کا دریائے چمبل پر پہنچنا	"	۴ جون سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۴) جنکوجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہولکر کا مع افواج بھاؤ کے لشکر سے آملنا	مکند تیرتھ پر	۶ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۵) بھاؤ کے لشکر کا جمنا پر پہنچنا	متھرا پر	۱۶ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۶) بھاؤ کے لشکر کا دارالسلطنت کے سامنے پہنچنا	دہلی	۳۰ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۷) دارالسلطنت میں بھاؤ کا داخلہ۔	"	یکم اگست سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۸) بھاؤ کا شاہزادہ جواں بخت ولی عہد کو نیابتہً تختِ شہنشاہی پر بٹھانا۔	"	۱۱ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۹) بھاؤ کا کنجپورہ کو چھین لینا	کنجپورہ ضلع کرنال	۱۵ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۰) شاہ ابدالی کا جمنا کو عبور کرنا	باغپت ضلع میرٹھ پر	۲۵ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۱) بھاؤ کا کنجپورہ سے کوچ	گنور ضلع کرنال پر	۲۸ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۲) بھاؤ کی گنور سے آمد	پانی پت پر	یکم نومبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۳) مرہٹوں کی شاہ ابدالی کے لشکر سے مڈبھیڑ۔	"	۲ نومبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۴) جنکوجی سیندھیا کا نجیب الدولہ پر حملہ	"	۲۳ نومبر سنہ ۱۷۶۰ء

۳۰، مرہٹوں اور افغانوں کی دوسری لڑائی	پانی پت پر	۷ر دسمبر سنہ ۱۷۶۰ء
۳) مرہٹوں اور افغانوں کی تیسری لڑائی	"	۲۲ر دسمبر سنہ ۱۷۶۰ء
۳) معرکۂ عظیم مابین لشکران مرہٹہ و افغان	"	۱۴ر جنوری سنہ ۱۷۶۱ء
۳) نارو شنکر کا دارالسلطنت کو چھوڑ دینا	دہلی پر	۱۹ر جنوری سنہ ۱۷۶۱ء
۳، شاہ ابدالی کا داخلہ دارالسلطنت میں	"	۲۰ر جنوری سنہ ۱۷۶۱ء
۴، شاہ ابدالی عازم افغانستان	"	۲۲ر مارچ سنہ ۱۷۶۱ء

منقول از "زمانہ" کانپور بابتہ مارچ و اپریل سنہ ۱۹۲۹ء
ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم آنجہانی

گویا (جہان آبادی)

(از جناب ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل)

(۲)

جناب سید ضامن حسین نقوی گویاؔ کے اجداد تقریباً تین سو سال قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں آباد رہے۔ آپ جنوری ۱۸۹۲ء میں سٹ پورہ ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد سید مشرف حسین پولس آفیسر تھے۔ شاعری کا مذاق طبیعت میں خلقی اور فطری ہے۔ ابتدائے شباب سے شعر کہنے لگے۔ کئی سال تک ہندوستان کے مشہور نکتہ سنج شاعر حافظ پیلی بھیتی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خداداد ذہانت وطباعی سے ایسا ملکہ پیدا ہوگیا کہ اپنے تمام ہمعصروں سے بازی لے گئے۔ گویاؔ کی پہلی تصنیف "فغانِ صبح ومسا" ہے جو کہ ۱۳۳۸ھ (یا ۱۹۱۹ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جناب حافظ پیلی بھیتی نے قطعۂ تاریخ لکھا جس میں گویاؔ کے کردار اور نقش ونگار پر نہایت ہی مختصر لیکن جامع الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے ؎

اِس کا مصنف ہے گویاؔ — خوش رُو۔ خوش خُو۔ خوش مذہب
مخبرِ سال ہے یہ مصرع — متکف ۔ صوفی مشرب

۳۸ ۵ ۱۳

اِس وقت تک گویاؔ صاحب تیرہ تصنیفات کے مالک ہیں جن میں سے پانچ نثر میں ہیں اور باقی نظم میں ـــــ "فلسفۂ نفس" کے عنوان سے آپ نے حقائقِ نفس پر نثر میں ایک معرکتہ الآرار کتاب لکھی ہے جسے ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اپنے مطبوعات میں شامل کرلیا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں اِس موضوع پر یہ پہلی تصنیف ہے۔

کسی مصوّرِ نفسیات کا اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے شعروسخن کا ذریعہ اختیار کرنے سے کیا مقصد ہے؟ اِس کا جواب خود گویاؔ کے الفاظ میں سنئے :۔

"کسی ترجمانِ فطرت و مصوّرِ نفسیات کا کام منظرِ عام کی حجابِ چشم و نظر صورتوں کی نقاشی کرنا ہرگز نہیں۔ البتہ دنیائے نقش و نگار کے پیچیدہ حجابوں کو اٹھا کر دلوں کو اُس جمالِ منتہا سے متعارف کرانا ہے جس سے متعارف ہونے کی تڑپ ہر بیدار زندگی میں پائی جاتی ہے۔ مگر بیدار زندگیاں اپنی رسائی کے لئے کسی واسطۂ درمیانی کی طالب ہوتی ہیں۔ وہی "واسطۂ درمیانی" ادبِ جمیل و نقاشیِ نفسیات ہے"

(دیباچۂ دورِ نو)

مذہب گویاؔ فقۂ حنفی کے پیرو ہیں۔ سیّد ہیں۔ "نقوی" ہیں، اور حضرت غالبؔ کی طرح ولائے اہلِ بیت اطہار کو اپنا وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں۔ آپ نے اہلِ بیت اطہار کی شان میں جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں جذباتِ عقیدت و محبت کی کثرت و فراوانی ہے لیکن آپ بے روح رسم و رواج کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے تعزئیے اور عزاداری پر جو اشعار تحریر فرمائے ہیں اُن سے آپ کی قلبی کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ؎

حقیقتوں سے جو رسم و رواج خالی ہوں — نظر زمانہ میں کیوں آئے کچھ مآل اُن کا
عمل سے دے نہیں سکتے جو زندگی کا ثبوت — کوئی زمانہ میں کرتا نہیں خیال اُن کا
حیات کا وہ سبق لیں گے کب شہیدوں سے — سوال کرتا ہے خود اُن سے خاص حال اُن کا
حذر اے ملتِ خوابیدہ خواب کی حد ہے
بس اب تباہیٔ خانہ خراب کی حد ہے (فتوحات)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گویاؔ کے دماغ پر "نقویت" کے جذبات حد سے زیادہ طاری ہیں۔ میں یہاں ایک رباعی پیش کرتا ہوں جس میں گویاؔ نے اپنے مذہبی مسلک کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے ؎

مُسلم کا ہے بس دینِ حقیقی اسلام — شاہد مرا گویاؔ ہے خدا کا پیغام!
ہوں معتقدِ مذہبِ فطرت دل سے — خود ساختہ راہوں کو مرا جھک کے سلام

گویاؔ کا عقیدہ ہے کہ صداقت ہر جگہ قابلِ قدر ہے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے

ف نہیں۔ اِس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل نظم کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو کہ گویاؔ نے
اب کرشن اور ارجن" کے زیرِ عنوان سپردِ قلم فرمائی ہے :۔

کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں

سمجھ ارجن ہے ہستی جاودانی — فقط فانی ہے رنگ زندگانی
شعاعوں کے ہزاروں پیرہن ہیں — حجاباتِ رخِ جلوہ فگن ہیں
بدلتے ہیں حجابِ مادئیت — ہیں موتیں انقلابِ مادئیت
جہاں میں جب کبھی وہ دور آئے — غلام انسان۔ انساں کو بنائے
سکھائے جب غلامی بُت پرستی — زمانہ جب بھلائے حق پرستی

ہمیشہ اہلِ حق تلوار اٹھائیں
سرِ باطل پہ خنجر آزمائیں (فیضان)

شاعرانہ کردار

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے الفاظ میں گویاؔ
کوئی پیشہ ور غزل گو نہیں ہیں۔ نہ تو آپ نے کبھی اپنے ضمیر کو کسی
لہ یا ستائش کی آرزو میں فروخت کیا اور نہ کسی سرمایہ دار کی تعریف میں قصیدے لکھے
رنہ کسی فلم کمپنی کے آستانہ پر دستک دی۔ آپ نے ایک شعر میں اپنے مشرب کی اِس طرح
ضاحت کی ہے ؎

بادہ جو غیر کے قدموں پہ جھکائے — مشربِ عشق میں مطلق ہے حرام

گویاؔ کا شاعری سے کیا مقصد ہے ؟ اِس پر آپ نے مندرجہ ذیل اشعار میں کافی
نی ڈالی ہے ؎

میں ہوں اور قافلۂ حال کا دردِ پیہم — یادِ اسلاف ہے اور حسرتِ دلگیر مری
شمعِ منزل جو ترے سینہ میں روشن ہو جائے — میں یہ سمجھوں کہ منور ہوئی تقدیر مری

شعر کی کیا تعریف ہے ؟ شاعرِ کامل کسے کہتے ہیں ؟ اور شاعر پر کب وجدانی کیفیات
ی ہوتی ہیں۔ یہ سب باتیں آپ گویاؔ کے الفاظ میں سنئے ؎

شعر کیا شئے ہے اِک نولائے راز

نالۂ نے کو شعر کہتے ہیں دل ہی کی شے کو شعر کہتے ہیں
شعرِ کامل ہے روح کی آواز پھونک ہی ڈالتا ہے پردۂ ساز
دردِ مقصود اِس کی منزل ہے شعر دراصل ہر طرح دل ہے
مختصر یہ پیامِ راز ہے شعر رہبرِ خلق سوز و ساز ہے شعر
جو ہو ایسے پیام کا حامل
اُس کو کہتے ہیں شاعرِ کامل (فیضان)

برق چمکی، گرجے بادل، کوک اٹھیں کوئلیں فطرتِ شاعر کو پھر اِک وجد سا آنے لگا
اپنی ہستی پھر نظر آتی نہیں چاروں طرف
دل کی دنیا پر مسلسل پھر کوئی چھانے لگا

سیاسی اور سماجی رجحانات

ہر شاعر کے خیالات زمانہ کے سیاسی اور سماجی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں

اگر شاعر کا تعلق حقائق و معارف کی ترجمانی سے ہے تو وہ انسانی ذہن کی نشو و نما میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے اور اِس کے لئے اُسے بصیرت۔ تاثر اور قوتِ بیان سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی اور اگر ایک سخنور اپنے زمانہ کے سیاسی۔ معاشی اور سماجی رجحانات سے علیحدہ ہو کر غور و فکر کا خوگر ہو گیا ہے تو اُس کے "شہ پاروں" کے لئے بھی اِس کائنات میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اُس کا تمام کلام ایک جسم ہے بے روح اور ایک نغمہ ہے بے کیف، اِس موضوع پر گویاؔ کے حقیقت افروز جذبات ملاحظہ فرمائیے ؎

کعبہ نہ اگر دل ہو تو ہستی بُت ہے انسان کی ہر رفعت و پستی بُت ہے
یہ سچ ہے مگر ہستی کے بُت خانہ میں سب سے بڑی سرمایہ پرستی بُت ہے

غلام آدمی۔ آدمی کا جہان ہے جہاں میں وہی ملک ہندوستان ہے

ظلم و ظلمت کی انتہا ہو جب کیوں قیامت نہ بے نقاب آئے
(طلوع سحر)

فخرِ غلامی

بڑا فخر ہے خاکِ پائے صنم ہیں — قدم بوس کہتے ہیں افلاک ہم ہیں
بہ ظاہر غلاموں کو دیکھو تو حیرت — بڑے کرّ و فر ہیں بڑی شان و شوکت

(طلوعِ سحر)

لیا کرتی ہیں تو ہیں کام جن سے صورِ محشر کا — وہ نالے تا بلب آتے نہیں ہیں لائے جاتے ہیں

(طلوعِ سحر)

زندگی اور جہاد ایک حقیقت کے ہیں نام — روح کی موت ہے بس عیش کے گہواروں میں

(طلوعِ سحر)

علیؓ ولی ہی کے ہاتھوں میں ذوالفقار بھی تھی — جہاد لازمی ہے مسلکِ حجازی میں

(دورِ نو)

مثنوی اور رباعی

گویاؔ نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں مجازی جذبات کے بجائے عشقِ حقیقی کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے۔ آپ نے پُرانے راستوں سے ہٹ کر ایک جدید شاہراہ پر چلنے کی کوشش کی ہے جو بہت حد تک کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ مثنوی کے علاوہ رباعی گوئی میں بھی گویاؔ کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ افسوس ہے کہ اُردو زبان میں اب تک کسی شاعر نے عمر خیام کی طرح صرف رباعی کو اپنا مستقل موضوعِ شاعری قرار نہیں دیا۔ اُردو میں جناب امجد حیدرآبادی کو بہترین رباعی گو کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جناب مولانا وحید الدین سلیم رح کے الفاظ میں " امجدؔ کی رباعیوں میں وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوشربا ہے میرے خیال میں جناب امجدؔ کے بعد اُردو زبان کے رباعی گو شاعروں میں اگر کسی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ گویاؔ کا نام ہو سکتا ہے۔ گویاؔ کی رباعیاں حکیمانہ مضامین اور مسائلِ اخلاق سے لبریز ہیں۔ گویاؔ کی رباعیاں واعظ کے صرف پند و نصائح نہیں ہیں بلکہ ایک پیامِ عمل ہیں، چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے ؎

طوفان گھٹاؤں کے سمٹ جاتے ہیں — دل برق کی اِک ضرب سے پھٹ جاتے ہیں
اللہ غنی۔ زلزلۂ ضربِ حیات — طبقے بھی پہاڑوں کے اُلٹ جاتے ہیں

کردار سے پہچان مقامِ ایمان ایمانِ حقیقی سے مقامِ انسان
تو دام میں تزویر کے پھنسنا نہ کہیں سبزے کی طرح ہوتی ہے کائی نادان

پیدا ہو۔ بڑھو۔ کھاؤ۔ پیو کیا منزلِ ہستی ہے یہی! بادہ کشو
یہ محشرِ عالم ہے بس اتنے کے لئے کس کھیل تماشے میں ہو آنکھیں کھولو

غزل گوئی گویا ایک غزل گو کی حیثیت سے بھی بہت حد تک ایک کامیاب شاعر ہیں سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے مذاقِ سخن کو عامیانہ جذبات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ نہ تو آپ کے یہاں المیہ شاعری (ٹریجیڈی) کی فراوانی ہے اور نہ طربیہ شاعری (کمیڈی) کی کثرت ہے۔ بلکہ آپ کی شاعری حزن و مسرت کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ نے خیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلو کو کسی جگہ نظر انداز نہیں کیا ہے ؏

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

اِس مصرعہ میں علامہ اقبالؒ نے جس دنیا کی طرف اشارہ کیا ہے گویاؔ اُسی دنیا کے خیالی مشاہدات کو نظم کرنا اپنا کمالِ شاعری سمجھتے ہیں۔ گویاؔ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ایسے اشعار صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جن کے دل و دماغ دونوں بیدار ہوں سے

ہیں کچھ پیام کے معنی پیام کے بھی سوا غمِ نظر ہے سکوت و کلام کے بھی سوا
ہیں جس کے کیف سے لبریز اشکبار آنکھیں تجلیاں ہیں وہ مینا و جام کے بھی سوا
یہ کائنات نہیں آپ اپنا خود حاصل کچھ اہتمام ہے اِس اہتمام کے بھی سوا

محیطِ آب میں خود بن گیا کنول کا پھول غموں میں عشق عجب شادماں ہے کیا کہنا

اقتضائے فطرتِ انساں ہے حشرِ انقلاب بخش کر آزاد دل عالم کو زنداں کر دیا

تعمیر کا جو کام لب ساطِ خزاں سے لے بڑھ کر چمن میں اُس سے کوئی دیدہ ور نہ

اشارے خدا جانے کیا ہو رہے ہیں نگاہوں میں سجدے ادا ہو رہے ہیں

گویا کا کلام ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ چکا ہے. زیادہ حصّہ رسالہ ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا ہے۔ رسالہ حرم سیلی بھیت کو بھی کچھ نظمیں شا[ئع] کرنے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

گویا کا کلام قریب قریب تمام اصنافِ سخن میں موجود ہے۔ حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مثنو[ی] غزل۔ قطعہ۔ رباعی وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور ہر صنف میں آپ کا کلام قادر الکلامی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ آورد کے ساتھ ساتھ سلاست۔ روانی شگفتگی۔ ندرتِ خیال۔ جدتِ مضامین اور رفعتِ تخیل آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ میرا منشا یہ نہیں ہے کہ گو[یا] کا کلام تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ میری رائے میں اگر گویا کے کلام میں کوئی لغز[ش] ہو بھی تو وہ قابلِ توجہ نہیں ہے ؎

نہیں عیب کچھ اُن میں گر ہو بھی حسرت
تو ہم لوگ ہیں صرف آگاہِ خوبی (حسرت موہانی)

حقیقی شاعری صرف الفاظ کی بندش، استعارات اور تشبیہات کے گورکھ دھندے کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل اُن جذبات کی مصوّری کا نام ہے جو "روح کو گرما دیں او[ر] قلب کو تڑپا دیں" ——— اور یہ خصوصیات گویا کے کلام میں پورے طور پر موجود ہ[یں]

افلاطون کا اعتقاد تھا کہ "ادبیات میں بلند خیالی اور حسنِ بیان کا تعلق مصنف کے ذاتی اخلاق کی بلندی سے ہے" ——— اگر اِس معیار پر گویا کے کلام کو جانچا جا[ئے] تو آپ کو ایک شعر بھی ایسا نہ مل سکے گا جو کہ مصنف کی پست خیالی اور کمزوری اخلاق پر دلالت کرتا ہو۔

یہاں میں چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ جن سے گویا کے جذبات کی رفعت اور خیالات کی گہرائی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب اشعار "دورِ نو" سے لے گئے ...

نظر آتی نہیں تعمیر کی کوئی جہاں صورت　　وہاں سجدے ہی رکھتے ہیں نئی بنیاد یں امکاں کی

سکوتِ شب میں مضرابِ نفس سے کام لے کوئی　　ہزاروں محو نغمے ہیں ابھی تارِ رگِ جاں میں

دل کی بیداریاں خوابیدہ نظر کیا جانیں　　شبِ ظلمات کے بدمست سحر کیا جانیں

تعینِ مہ و پروین و اشک و شبنم کیا　　تو مسکرا سرِ عنواں مرے فسانوں میں

ستاروں کا بکھرنا ہی قیامت کی نشانی ہو　　تسلسل توڑ کر خود ہی ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

عکاسیٔ تبسّمِ رنگیں خیالِ خام　　تا حشر موجِ گریہ اگر گل فشاں رہے

گزرا کوئی ضرور ہے راہِ سرِ نیاز سے　　سجدوں میں نور آ گئے حُسنِ خرام راز سے

گویاؔ کی مختلف تصانیف سے کچھ اشعار بطور اقتباس کے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں
اِن سے لطف حاصل کیجئے ؎

فغانِ صبح و مَسا

یہ ایک منظوم قومی مناجات گویاؔ کی اوّلین کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ الفاظ نہایت سادہ ہیں۔ جذبات معصومانہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بن کے پکھیرو صبح و مسا　　پڑھتے ہیں تیرا کلما
تیری ہی سب کایا ہے　　تیری ہی سب مایا ہے
یا اللہ یا من موہن　　ہے تیرا سب تن من دھن
من میں ایسی آگ لگے　　جس سے یہ ہر دم سُلگے
اللہ اپنی رحمت سے　　ہم کو فتح و نصرت دے

دینِ نبی کو رونق دے   چمکا دے سب دینوں سے

مثنوی اسرارِ ہستی

اُردو زبان میں پہلی فلسفیانہ مثنوی ہے۔ "مسئلہ خودی پر ایک جامع مقالہ ہے"
(ہمایوں۔ لاہور۔ ۱۹۲۳ء)

(چند اشعار)

یہ پھول پتّے، مہکنے والے   یہ بیل بُوٹے طرح طرح کے!
کھلائے کس نے اُگائے کس نے   دکھائے کس نے سُنگھائے کس نے؟

یہ چھوٹی چڑیاں چہکنے والی   وہ ننھی کلیاں، مہکنے والی
چہک رہی ہیں مہک رہی ہیں   پُھدک رہی ہیں چٹک رہی ہیں

شہود کیا ہے۔ مشاہدہ کیا   کہ خود ہی شاہد ہے جلوہ آرا

جمیل جن کو سمجھ رہے ہو   تم اپنا دل جن کو دے چکے ہو
فقط وہ تصویرِ آئینہ ہیں   فقط وہ تنویرِ آئینہ ہیں

زبانِ تبسّم سمجھ میں نہ آتی   ادائیں ہوئیں ترجمانِ تبسّم

صہبائے راز

یہ ایک مختصر مثنوی ہے۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں شائع کرائی گئی ہے۔

(چند اشعار)

خود مے میں فنا ہے موجِ مے کی   ہستی ہی نہیں ہے اور شے کی

میخانہ بدوشش ہر نظر ہے   ساقی کے جمال کا اثر ہے

ایک ایک نظر ہزار جلوے   میخانہ طرب بہار جلوے

اِس بزمِ جہاں کا ذرّہ ذرّہ   اِس کون و مکاں کا ذرّہ ذرّہ
ایک ایک ورق ہے معرفت کا   ایک ایک سبق ہے معرفت کا
عرفاں کے لئے کھُلا ہو سینہ   عالم ہے بھر نظر سفینہ

میخانہ میں آ کے گھر بنا لے   مغموم حوادثِ زمانہ
جتنا ہو بلند ذوقِ سجدہ   اُتنا ہے بلند آستانہ

شعر الحکم

گویاؔ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے اور دو زبانوں میں منقسم ہے۔ بابِ اوّل غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے اور بابِ دوم نعت و مناقب کا مجموعہ ہے۔

(بابِ اوّل کے چند اشعار)

آنسوؤں میں سینکڑوں اسرار ہیں   بہہ رہا ہے ایک دریا راز کا

ایک بڑھتے حوصلے کے ساتھ ساتھ   دائرہ بڑھتا گیا امکان کا

زندگی معلوم ہوتی ہے مسلسل انقلاب   سلسلہ دیکھیں کہاں پہنچائے اِس زنجیر کا

یہ دورِ زندگی تو مبتدا ہے   خبر اس کی نہیں اسے بے خبر کیا

اہلِ دل کرتے ہیں منزل کی تلاش   اور منزل کرتی ہے دل کی تلاش

ڈوبنے والے پھر اُبھرتے ہیں   ڈوب کر حسرتوں میں ساحل کی

طلوعِ سحر

سنہ ۱۹۴۳ء میں طبع کرائی گئی۔ سنہ ۳۶-۴۳ء تک کلام کا مجموعہ ہے۔

(چند اشعار)

فطرتِ پردہ پوشش کو دیکھو — شرم آجاتی ہے گناہ کے بعد

لفظوں سے آنسوؤں کے بنائے عبارتیں — گویا یہی زباں ہے فقط ترجمانِ دل

نقوشِ تعیّن کبھی تو مٹیں گے — جبیں گھس رہا ہوں غمِ بندگی میں

بہار کے سے کچھ آثار پائے جاتے ہیں — سحر سے زخمِ جگر مسکرائے جاتے ہیں

تیرے چہرے کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا ہوں — جب سمجھتا ہے کوئی بے سروساماں مجھ کو

یہ تیرے آنسو بتاتے ہیں خود تجھے گویاؔ — ہے میکدہ ترے دل میں چھپا ہوا کوئی

دَورِ نو

ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۹۴۴ء کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اِس میں گویاؔ کا بہترین کلام ہے اور آپ کے تمام اشعار "شہ پارے" ہیں۔ راقم الحروف نے اِس تبصرہ میں زیادہ تر اشعار "دورِ نو" سے لئے ہیں۔

فتوحات

جون سنہ ۱۹۴۵ء کے پندرہ دن کے تلاطمِ جذبات کے نتائج ہیں۔

(چند اشعار)

ہیں اوّل و آخر کی سرحدیں مجھ میں — یہ درمیاں سے مری داستاں ہے کیا کہنا

خود بخود جب فرض کر سکتا نہیں اپنا وجود　　کس طرح مانوں کہ ہیں قائم جہاں تیرے بغیر

حدودِ جام و مینا سے ہے تھوڑا میکدہ آگے　　بڑھا تو اپنی ہستی سے قدم میکش ذرا آگے

لے لیے رحمت نے دامن میں یہ کہہ کر اشکِ درد　　کیا سمندر اپنے قطروں میں سما سکتا نہیں؟

فیضان

ساقیٔ ازل کی فیاضی سے تین ماہ کے عرصہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو یہ مجموعۂ کلام ترتیب دیا گیا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ چاندنی رات میں ستاروں کے جھرمٹ کے نیچے صحنِ گلستاں میں بیٹھے ہوں۔

میں نے گویاؔ کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور شعر و سخن کے تشنہ لب حضرات کی پیاس بجھانے کے لئے یہ چند قطرے ایک بحرِ بیکراں سے لے لئے ہیں ؎

فسانہ دل کا ہے شاید شفق کی سُرخی میں
جبینِ صبح کی پڑھنا پڑی شکن مجھ کو　　(دورِ نو)

میری دُعا ہے کہ گویاؔ کا کلام موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے ایک نشانِ راہ کا کام دے۔

بسمل

شفائی میڈیکل ہال پیلی بھیت۔
۲۹۔جنوری ۱۹۴۸ء

تین گھنٹے

مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم کے ساتھ

(از سیّد الطاف علی بریلوی)

۵ر اگست ۱۹۳۱ء ـــــ آج صبح ایک تکلیف دہ سفر کا خاتمہ ہوا۔ واقعہ اِس طور پر ہے کہ ۶ر جولائی ۱۹۳۱ء کو دوبارہ ایل ایل۔ بی کے امتحان میں ناکامیابی کا نتیجہ آیا تو مجھ پر یہ دُھن سوار ہوگئی کہ میں بریلی میں رہ کر اِس امتحان کو پاس نہیں کرسکتا۔ صدہا قسم کے قومی کام نیز مکان کی پریشانیاں اطمینان و دل جمعی کے ساتھ قانون پڑھنے کا ہرگز موقع نہ دیں گی۔ چنانچہ میں نے اپنے اِس خیال کا اظہار اپنے احباب اور اعزّا میں عام طور پر کرنا شروع کردیا۔ لوگوں کی صلاح یہ ہوئی کہ مجھے لکھنؤ جانا چاہیئے۔ جہاں ایل ایل۔ بی کا بہت عمدہ نتیجہ رہتا ہے۔ ذاتی طور پر میں لکھنؤ کے علاوہ علی گڑھ کو بھی پسند کرتا تھا۔ کیوں کہ وہاں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک رہ چکا تھا مگر احباب و اعزّا نے لکھنؤ ہی کیلئے اصرار کیا اور لکھنؤ ہی جانا طے بھی ہوا۔

یکم اگست کو یونیورسٹی کھلنے والی تھی۔ والد صاحب اور ماسٹر احمد شاہ خاں صاحب میرے بریلی سے باہر جانے کے مخالف تھے۔ والد صاحب یہ فرماتے تھے کہ تم نے گزشتہ سالوں میں کسی ایک سال بھی معمولی محنت نہیں کی ہے کم ازکم ایک مرتبہ محنت کرکے امتحان دو پھر بھی اگر خدانخواستہ ناکامیابی ہو تو باہر کا خیال کرنا چاہیئے۔ دوسرے اُنہیں میری جدائی پسند نہ تھی۔ حالات تبدیل ہوگئے تھے اور ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی ہر وقت ضرورت تھی۔ والد صاحب ’شاہد‘ اور ’ساجد‘ کا بھی ذکر کرتے تھے کہ بچے تمہاری عدم موجودگی میں بہت پریشان ہوں گے۔ نیز بلا سبب اچھا خاصہ آباد گھر صرف تمہارے باہر چلے جانے سے برباد سا ہوجائے گا۔

مذکورہ بالا امور کو دن رات سوچتا رہا اور قریب قریب روز ہی والد صاحب ا
دوسرے لوگوں کے خیالات سنتا رہا تاکہ صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ بالآخر ۲ اگس
کی شام کو لکھنؤ کی روانگی ہو ہی گئی۔

۲ اگست کی دوپہر سے سارا گھر لوٹ پوٹ تھا۔ سب گھر والے جمع تھے اور ہر شخ
میرے جانے کا شدید صدمہ تھا۔ سہ پہر سے والد صاحب بھی سامانِ سفر کی تیاری میں
دینے کو میرے پاس آ گئے۔ شاہد کو بھی باوجود نو عمری میرا جانا بہت شاق تھا۔ اور
پانچ منٹ بعد یہ سوال ہوتا تھا کہ "چچا کہاں جا رہے ہو؟" —— میں جواب دی
"میاں لکھنؤ جا رہا ہوں"۔ اس پر ارشاد ہوتا "ہم بھی جائیں گے"۔ یا کسی وقت بھاگ
آتے اور چمٹ کر کہتے —"کیا ہمیں اکیلا چھوڑ جاؤ گے"۔ میں نے اطمینان دلایا کہ "تم
تمہیں بھی لے چلیں گے"۔ اس پر اِن حضرت نے بھی اپنی تیاری شروع کر دی اور
بجے تانگہ آیا تو 'شاہد' بھی بیٹھ گئے۔ خیال کیا کہ اسٹیشن سے لوٹا دوں گا۔ مگر وہ
لوٹنے والے تھے مجبوراً 'بنتھرا' تک ساتھ لے گیا اور وہاں جب وہ سو گئے تو اُنہ
محمد امین صاحب کے سپرد کر کے میں لکھنؤ چلا گیا۔

مکان جس وقت تانگہ میں بیٹھ رہا تھا تو سامنے دروازہ میں گھر کی تمام چھوٹی بڑ
عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ 'بھائی میاں' مرحوم کے بچے "مصطفےٰ علی مرتضائی اور مصطفائی" خا
طور پر بہت اداس تھے۔ تانگہ کے قریب والد صاحب کھڑے تھے اور اُس وقت
اُن کی صورت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں اور گہری گہری سانسیں لے رہے
تھے۔ تانگہ چلا تو بہ جبر مسکراہٹ سے 'خدا حافظ' کہا۔ والد صاحب کی یہ کیفیت میرے
لئے ناقابلِ برداشت تکلیف کا باعث ہوئی۔ دل بھر آیا اور جی چاہا کہ خوب پھوٹ
پھوٹ کر روؤں۔ اُسی وقت میں نے نہایت گہرے قلبی تاثرات کے ساتھ یہ مضبو
ارادہ کیا کہ امسال خوب محنت کروں گا اور اپنے غم نصیب والد کو آئندہ اِس قسم
تکلیف کا موقع نہ دوں گا۔

※

۳ اگست کی صبح کو لکھنؤ پہونچا۔ یہ خوب صورت شہر مجھے ہمیشہ سے بہت پسند
لیکن اب کے نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی دل بھانے والی چیز نظر نہ آ

خیال ہوا کہ صبح کا وقت ہے جب دن چڑھنے پر بازار وغیرہ کھلیں گے اور آدمیوں کی چہ
پہل ہوگی تو لکھنؤ پھر لکھنؤ معلوم ہونے لگے گا۔

اپنے عزیز دوست مسعود الحسن صاحب ایم۔اے کے مکان پر قیام کیا۔ اُن سے
بڑے بھائی محمود الحسن صاحب بی۔اے ایل ایل بی بڑی مہربانی اور محبّت سے پیش آ۔
لیکن چوں کہ اُن سے تکلّف کے تعلقات تھے اِس وجہ سے غریب الوطنی اور تنہائی
احساس ہونے لگا۔ محمود صاحب کو اُس دن کچہری میں بھی بہت کام تھے اِس لئے انھوں
دو بجے تک یونیورسٹی داخلہ کی غرض سے ساتھ چل سکنے کے لئے فرمایا۔ اِس عرصہ میں
مولوی ظفر الملک صاحب اور مولوی امین احمد صاحب عباسی ایڈیٹر روزنامہ "حقیقت
سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ راستہ میں شوکت تھانوی صاحب سے بھی سلام دُعا ہوئی او
اُن سے میں نے ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ندوہ گیا۔ مولوی مسعود
صاحب ایڈیٹر عربی رسالہ "الضّیاء" اور عبدالمجید صاحب چینی سے ملاقات ہو
مسعود عالم صاحب بڑی عزّت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔ جمعہ کا روز تھا ندوہ کی
مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ اِس مسجد کی جب رسم افتتاح ہوئی تھی تو میں موجود تھا۔ آ
اُس دن کی سی رونق کہاں۔ تھوڑے سے نمازی تھے اِس لئے وہاں بھی دل نہ لگا

بعد نماز محمود صاحب کے ساتھ یونیورسٹی گیا۔ پہلے رجسٹرار کے سامنے پیشی ہو ا
اور داخلہ کے فارم پر یہ لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ کئی مرتبہ اِس سے قبل امتحان میں
شریک ہو چکا ہوں، مجھے اِس بات کے بتانے یا لکھنے سے کہ میں دوبار فیل ہو چکا ہ
سخت شرمندگی ہوئی۔ فوراً دل برداشتہ ہو کر آفس سے نکل آیا۔ سارا جسم پسینے پسینے
تھا اور میں بدحواس اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ محمود صاحب کو زیادہ فرصت نہ تھی اور جب
میں اکیلا رہ گیا تو میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا اور اندازہ لگایا کہ یہ سب
خمیازہ کام نہ کرنے کا ہے۔ اگر کام کر لیا جاتا تو کاہے کو دربدر کی ٹھوکریں کھانی
پڑتیں۔ نہ بچوں اور والد سے جدائی اختیار کرنی پڑتی۔ اب بھی یہ ممکن ہے کہ
گزشتہ را صلوٰۃ آیندہ را احتیاط کے اصول پر ایمان داری کے ساتھ عمل پیر
ہو لیا جائے۔

اِن خیالات سے دل میں مضبوطی پیدا ہوئی اور سوچا کہ جب محنت اور کام ہی

کرنا ہے تو بریلی میں رہ کر بھی امتحان پاس کیا جا سکتا ہے۔ اب ایک ایک کرکے بچوں، بیوی اور والد صاحب کی حسرت زدہ صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ دل خون کے آنسو رونے لگا۔ طبیعت میں زبردست ہیجان پیدا ہوا کہ پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر مکان پہنچ جاؤں، والد صاحب کے قدموں پر سر رکھ دوں کہ میری حماقتوں کو معاف کر دیجئے میں گوشہ گیر ہوا جاتا ہوں اور جب تک امتحان نہ پاس کر لوں گا کسی غیر ضروری کام میں مطلق حصّہ نہ لوں گا۔ اب میں نے یونیورسٹی کی طرف سے منہ پھیر لیا اور تانگہ کرکے اپنی قیام گاہ کو چل دیا۔ دریائے گومتی، چھتر منزل، قیصر باغ ایک سے ایک اچھے مناظر اور عمارتیں نظر پڑیں مگر سب میں ایک قسم کی ویرانی اور اجنبیت کی فضا دکھائی دی۔ سارا لکھنؤ ایک اُجاڑ بستی تھی اور اُس کے مقابلہ میں اپنے شہر بریلی کی آبادی و رونق کی خیالی تصویر آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

امین آباد پہونچ کر تانگہ سے اُترا۔ سوچا کہ محمود صاحب گھر نہ ہوں گے۔ گاڑی کے چھوٹنے میں دیر ہے۔ اِس عرصہ میں کہاں جاؤں۔ صدیق بک ڈپو گیا۔ میری کتاب 'حیاتِ حافظ رحمت خاں' کی اُس کے مالک صدیق حسن صاحب نے قدر دانی کی ہے سلام دعا کے بعد کتاب کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے کہا کوئی کام بتائیے جس سے نفع ہو۔ آج کل خالی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کیا کام بتاؤں۔ اِس زمانے میں کتاب کو کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا، تاہم سوچ کر لکھوں گا۔ اس کے بعد انہیں کہیں جانا تھا مجھے باقاعدہ رخصت کئے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور منہ پھیر کر چل دیئے میں نے خیال کیا کہ یہ پبلشر لوگ کتنے بے نیاز اور خوش حال ہیں۔ محنت ہم مصنف کریں اور مزا ان کو آتا ہے۔

محمود صاحب کے مکان پر آنے اور ریل کے وقت میں اب بھی دیر تھی اِس لئے قریب ہی شوکت تھانوی صاحب ایڈیٹر سرپنچ کے درِ دولت پر گیا۔ آج پہلی مرتبہ نسیم انہونوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہر دو اصحاب بڑی محبت سے ملے۔ 'حیاتِ حافظ رحمت خاں' کی دیر تک دونوں صاحب تعریف کرتے رہے۔ شوکت صاحب نے رسالہ 'شباب' میں نسیم صاحب کا لکھا ہوا ریویو بھی دکھایا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

"مدت العمر میں" تاریخ اسپین" اور "حیاتِ حافظ رحمت خاں" سے بہتر انھوں نے کوئی تاریخ نہیں دیکھی۔"

شوکت صاحب ایک ہوشیار و کامیاب ادیب ہیں۔ میں نے اُن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور مشورہ کیا کہ مجھے لکھنؤ رہنا چاہیئے یا بریلی چلا جانا چاہیئے۔ انھوں نے فرمایا آپ فوراً بریلی چلے جائیں، میرے بھی جب سے بچے ہو گئے ہیں دو روز اطمینان سے باہر نہیں رہا جاتا۔ ہر وقت فکر لگی رہتی ہے، آپ فکرمند رہیں گے اور اِس طرح جس اطمینان و سکون کی تلاش میں آپ یہاں آئے ہیں وہ نصیب نہیں ہو سکتا۔

شوکت صاحب نے میری دل کی بات کہی اور میں واپسی بریلی کے ارادہ میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ شوکت صاحب کے مکان سے قیام گاہ آیا۔ محمود صاحب بھی آ گئے تھے۔ چائے پی۔ اُس کے بعد چونکہ گاڑی کے وقت میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اِس لئے اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے ارادہ کا اظہار کیا وہ چونک پڑے اور پہلی گاڑی چھڑوا کر رات کے ۹ بجے تک طرح طرح سے سمجھاتے رہے۔ اِس عرصہ میں یونیورسٹی کے بورڈنگوں میں بھی لے گئے۔ وہاں کے لوگوں سے ملایا۔ غرض سب ہی کچھ کیا جس سے کسی دوسرے آدمی کا دل ضرور پسیج جاتا مگر مجھ پر تو واپسی کا پورا جنون سوار ہو گیا تھا اِس لئے میں نے نہ مانا اور سواری منگا کر اسٹیشن پہونچ گیا اور ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ کی گاڑی سے بریلی روانہ ہو گیا۔ ریل میں بیٹھتے ہی یہ معلوم ہوا کہ کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو سینہ سے ہٹ گیا اور میں پورے اطمینان خاطر سے بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ اتنے میں کسی اسٹیشن سے بارش شروع ہو گئی۔ دماغ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی۔ دن بھر کا تھکا ہوا تو تھا ہی۔ سکون پاتے ہی سو گیا۔ کٹرہ کے اسٹیشن پر صبح کے چار بجے آنکھ کھلی۔

※

آنکھ کھلی تو اب رنگِ طبیعت از سرِ نو دگرگوں تھا۔ بریلی قریب آ رہی تھی۔ سارے شہر میں میرے لکھنؤ جانے کی شہرت ہو چکی تھی۔ اب واپس آؤں گا تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی اور لوگوں کو میری بزدلی اور پھوہڑپن پر کیسا افسوس ہوگا۔ نہیں۔ مجھے لکھنؤ سے نہ آنا چاہیئے تھا، کچھ دنوں میں ضرور وہاں دل لگ جاتا۔ ابتدا میں زیادہ پریشا

ں وجہ سے ہوئی کہ نئی جگہ تھی اور عرصہ کے بعد وطن چھوڑنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مگر
ب کیا لکھنؤ پھر واپس جاؤں۔ نہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ بریلی اسٹیشن پر اِس وقت
ی گڑھ کی گاڑی تیار کھڑی ہوگی۔ علی گڑھ میں چار سال رہ چکا ہوں، وہاں کی سرزمین میرا
سرا وطن ہے۔ ہر شخص مجھے جانتا ہے، خوب دل لگے گا اور بڑے اطمینان کی زندگی
رہے گی۔

بریلی اپنے عزیز وطن کے اسٹیشن پر پہونچا اور فوراً علی گڑھ کا ٹکٹ لے کر علی گڑھ
گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے اِس اقدام سے بے حد مسرت ہوئی اور میں نے خیال
کہ واقعی اب میں صحیح راستہ پر جا رہا ہوں۔ میں نے ریل ہی میں غسل کیا۔ چندوسی اسٹیشن پر
ستہ کیا اور بڑے اطمینان سے اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔

ساڑھے دس بجے علی گڑھ پہونچا۔ اپنے دوست مسٹر محمود احمد بہاری ایم اے۔
ں ایل بی لکچرر شعبۂ فلاسفی کے کمرہ پر قیام کیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ
یورسٹی میں داخلہ کی رسومات پوری کرنے کے لئے چل پڑا۔ پہلے مولوی طفیل احمد صاحب
سے ملا۔ مولانا صاحب نے اُس خصوصی محبت کی بنا پر جو انہیں مجھ سے ہے میرا خیر مقدم
۔ لیکن میری وجہ حاضری پر کسی خاص خوشی کا اظہار نہ فرمایا۔ مولانا صاحب سے مل کر
وفیسر حبیب صاحب سے ملنے گیا۔ کیوں کہ میں علی گڑھ اِس ارادہ سے گیا تھا کہ تاریخ
، ایم اے میں داخلہ کراؤں گا اور ایل ایل بی کا پرائیویٹ امتحان دوں گا۔ کیوں کہ ایک
بہ میں علی گڑھ میں بھی فیل ہو چکا تھا۔

حبیب صاحب نہ کلاس میں ملے اور نہ ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کے باوجود اپنے
لہ پر۔ اب پھر طبیعت پر کوفت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ سہ پہر تک وہی لکھنؤ والا
ت و گھبراہٹ کا جنون سر پر سوار ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا علی گڑھ رہنے سے والد صاحب
بچّوں سے علیٰحدگی نہ ہوگی۔ اب علی گڑھ میں وہ پُرانی دلچسپیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ تمام
ئے لوگ ہیں، ان کے ساتھ کیسے زندگی بسر ہوگی۔ اکیلا کمرہ دیر ہو جانے کی وجہ سے نہیں
سکتا۔ کسی دو طالب علموں کے رہنے والے کمرہ میں جگہ ملے گی، نہ معلوم ساتھی کس قسم کا ہوگا
ھائی کے لئے یکسوئی اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں ناممکن ہے۔ اس سے تو بریلی
ہی کے مکان کا وہ کمرہ جس میں میں رہتا ہوں اچھا ہے۔ وہاں اگر میں نہ چاہوں تو

میرے پاس کون آسکتا ہے۔ یہاں اگر میں کسی کو نہ بلاؤں گا تو میرے ساتھی کے ملنے والے تو آئیں گے۔ اب طبیعت کی وہ جوانی باقی نہیں ہے کہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کردیا جائے۔ ضرور بالضرور سخت روحانی تکلیف ہوگی۔ آخر اِس میں کیا قباحت ہے کہ جس طرح یہاں رہنا چاہوں اُسی طرح اپنے مکان پر رہوں۔ جہاں نہ زیادہ مصارف ہوں گے اور نہ بچوں اور والد صاحب سے علیٰحدگی ہوگی۔

※

مذکورۂ بالا امور دماغ میں اچھی طرح چھاگئے اور اب جوں جوں غور کرتا ہوں علی گڑھ آنا بھی حماقت معلوم ہونے لگا! اور ارادہ کیا کہ ابھی کچھ نہیں گیا ہے فوراً واپس ہوجانا چاہیئے۔ اچھا ہوا کہ علی گڑھ کی بھی حسرت نکل گئی۔ آیندہ بریلی میں کسی دوسری جگہ جانے کا خیال نہ آیا کرے گا۔

پانچ بجے گاڑی چھوٹتی تھی۔ چار بجے اپنے میزبان محمود صاحب سے اِس ارادے کا اظہار کیا اور وہ بھی لکھنؤ والے محمود صاحب کی طرح چونک پڑے اور سر سے پیر تک مجھے دیکھ کر ترحم آمیز نگاہوں سے یہ اندازہ کرنے لگے کہ میرا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا جس کا خمار صبح سے اِس وقت تک تو نہیں ہوا مگر اب ہورہا ہے۔ مجھے پکڑ کر بٹھالیا اور لگے طرح طرح سے سمجھانے۔ برعکس اِس کے میری نگاہ گھڑی پر تھی۔ بہ مشکل وہ تانگہ منگانے پر راضی ہوئے۔ سامان کا ڈھیر تھا بڑی بھاگ دوڑ کرکے اسٹیشن پہونچا تو بدقسمتی سے گاڑی چھوٹ گئی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں بارہا سفر کا اتفاق ہوا اور بہت دفعہ گاڑیاں چھوٹ گئیں لیکن جیسا اِس گاڑی کے چھوٹنے کا صدمہ ہوا ایسا کبھی نہ ہوا۔ گاڑی مل جاتی تو کس قدر جلد منزلِ مقصود پر پہونچ جاتا۔ رات کو اطمینان سے گھر سوتا۔ دو راتیں تکلیف اٹھاتے ہوگئی تھیں۔ صبح سے پھر اصلی زندگی شروع ہوجاتی۔

تانگہ پر اسباب لدا ہوا ہے اور میں ان خیالات میں غرق ہوں۔ تانگے والے نے کہا "حضور بورڈنگ واپس پہونچا دوں"۔ بورڈنگ کا نام سنتے ہی اور ہوش اُڑ گئے مارے بورڈنگ والے دیکھ کر کہیں گے۔ یہ کون دیوانہ ہے جس کا آج دن بھر اسباب لا مارا پھر رہا ہے۔ وہ لوگ وجہ دریافت کریں گے اور میری بنے وقوفیوں پر خوب

تالیاں بجیں گی. محمود صاحب بڑے سمجھ دار اور فلسفی ہیں مجھے دل کھول کر سمجھائیں گے اور ایسا گرفتار کریں گے کہ پھر بریلی جانا نصیب نہ ہوگا۔

*

معاً مولوی طفیل احمد صاحب قبلہ کا خیال آیا کہ دوسری گاڑی تک جو آٹھ گھنٹے بعد ملے گی۔ اُن کے ساتھ قیام کروں۔ میرے ارادے کی تبدیلی کو وہ بھی پوچھیں گے مگر اُن کے سامنے اپنا دل کھول کر دکھانے میں زیادہ شرمندگی اٹھانی نہ پڑے گی. سچے ہمدرد ہیں میری دماغی الجھنوں پر بجائے غصّہ کرنے کے صحیح رہ نمائی کریں گے۔ عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ خود بھی ممکن ہے اِس قسم کی کیفیاتِ دماغی سے اپنی زندگی میں گزر چکے ہوں۔

اسٹیشن سے "مولانا" کی قیام گاہ ولایت منزل لوٹ کر آیا۔ اُن کے کمرے میں سامان رکھوایا۔ مولانا صاحب کہیں تشریف لے گئے تھے۔ گھنڈ سوا گھنٹہ میں آئے۔ اِس عرصہ میں میں خواجہ حسن نظامی صاحب کے اخبار منادی کے پرچے اور اخبار "سرگزشت" پڑھتا رہا سر میں سخت گرانی اور آنکھوں کے حلقوں میں درد تھا۔ اخبار پر نظر تھی مگر کچھ بھی ذہن نشین نہ ہو رہا تھا۔ یُوں بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر کے بین السطور میں مجھے دنیا سازی نظر آیا کرتی ہے آج خصوصیت سے بہت تکلیف ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ "بہادر شاہ ظفر کے حالاتِ مقدمہ" ضرور پُراثر تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ اِس ضمن میں حسن نظامی صاحب نے جو لٹریچر ملک کے سامنے پیش کیا ہے وہ اُن کا ایک قابلِ قدر کام ہے۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ جب کبھی حالات سازگار ہوں گے۔ حضرت بہادر شاہ ظفر کی سوانح عمری" مرتب کروں گا اور یہ سوانح عمری سچے حالات پر مشتمل ہوگی۔

ساڑھے چھ بجے مولانا صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کو دیکھ کر قلب و جسم میں ہمیشہ ایک تازہ روح پیدا ہو جایا کرتی ہے. سارے ملک میں اُن سے زیادہ میرے دل میں کسی کی قدر و منزلت نہیں. کسی حال میں ہوں سچّی اور حقیقی محبت سے لبریز مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا کرتے ہیں اور اُن کے اِس عمل سے میری ساری فکریں اور تکلیفیں دُور ہو جایا کرتی ہیں۔

مولانا صاحب بہ یک نظر میری موجودہ کیفیت دماغی کو سمجھ گئے اور کپڑے اُتار کر مجھ سے انتہا درجہ محبت و ہمدردی کی باتیں کرنے لگے. میں نے اپنے قیام علی گڑھ کے

ارادے کی تبدیلی اور اچانک بریلی چلے جانے کے خیال کو بلا پس وپیش اُن سے بیان کیا اور انہوں نے فرمایا کہ تمہارا یہ اقدام مجھے بہت پسند آیا اور مسرت ہوئی۔ مولانا صاحب سے میں دل کھول کر باتیں کیا کرتا ہوں اور اپنے گناہوں اور غلطیوں کا بھی بے کم وکاست اظہار کرکے اُن سے رہنمائی کا طالب ہوا کرتا ہوں۔ مجھے اپنی غلطیاں اور گناہ مولانا صاحب کے سامنے بیان کرنے میں ایسی ہی روحانی خوشی ہوتی ہے جیسی کہ عیسائیوں کو پادری کے سامنے کنفیشن (اقرارِ گناہ) کرکے۔ مولانا صاحب اُن کو خوب غور وخوض سے سنتے ہیں اور ہر ایک تکلیف کا علاج تجویز فرما دیتے ہیں۔ رات کے نو بجے تک مولانا صاحب نے اپنی پُر از حقائق ومعارف گفتگو کو جاری رکھا۔ ہر لفظ جو اُن کی زبان سے ادا ہوتا تھا میری بیمار وضعیف روح کو فرحت وتازگی بخشتا تھا۔ کاش جس طرح "باسول" "ڈاکٹر جانسن" کی تمام گفتگو کو لکھ لیا کرتا تھا۔ میں بھی مولوی طفیل احمد صاحب کے اقوال کو آبِ زر سے لکھ لیا کرتا۔

اِس موقع پر مولانا صاحب کی پند ونصائح کا خلاصہ یہ تھا کہ:۔

"وکالت کا امتحان پاس کرنا اِس وقت میرا اوّلین فرض ہے اور جب تک میں امتحان پاس نہ کرلوں، ہر ایک دوسرے بڑے سے بڑے نفع آور کام کی طرف توجہ نہ کروں"

"وکالت کا امتحان پاس کرلینے کے بعد میں آزاد ہوں گا کہ وکالت نہ کروں اور کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرلوں۔ مگر اِس ڈگری کو ضرور حاصل کرلوں۔ اِس سے "سوشل اسٹیٹس" میں اضافہ ہوگا۔ نیز کسی دوسرے کام میں ناکامیابی کی صورت میں مجھے یہ موقع حاصل رہیگا کہ اس پر بھروسہ کرکے اُسے اختیار کرسکوں"

"وکالت کا امتحان پاس کرنے کی چوں کہ والد صاحب کی دلی تمنا اور آرزو ہے۔ اِس لئے اِس کام کو فرض اور "ڈیوٹی" سمجھ کر انجام دُوں"

"اپنے والد کے جذبات کا بہت زیادہ احترام کروں، کیوں کہ وہ غیر معمولی بڑے کیرکٹر اور سمجھ کے انسان ہیں"

(مولانا صاحب نے فرمایا کہ تمہارے والد صاحب جیسے چہرے کا انسان میں نے نہیں دیکھا اور گو وہ لکڑی کی تجارت کرتے ہیں مگر بہت بڑے کام مثلاً کسی ضلع کی امارت

وریاست کے اہل ہیں۔" والد صاحب کے متعلق اِسی قسم کی رائے کا اظہار اِس سے قبل منشی عظیم الشان خاں صاحب ماہر السنۂ مشرقیہ بھی فرما چکے ہیں)۔

مولانا صاحب نے فرمایا کہ "میں فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کرنے کا منصوبہ بناؤں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے بشرطیکہ دل لگا کر مضمون میں دلچسپی پیدا کر لی جائے۔"

"مجھے بریلی کالج ہی سے امتحان دینا چاہیئے اور وہیں سے کامیابی حاصل کرنے میں عزّت ہے۔"

"مجھے تمام قومی کام دو سال کے لئے یک لخت ترک کر دینے چاہئیں۔ نیز ایسے مشاغل سے بھی کنارہ کشی کر لینی چاہیئے جو قانون پڑھنے میں میری توجّہ کو ہٹائیں۔"

"مجھے قوم و ملک سے پہلے اپنی ذات کی خدمت کرنی چاہیئے اور حسب ذیل مسلّمہ لائحہ عمل پر کاربند ہونا چاہیئے۔"

(۱) اوّل درجہ پر اپنی جسمانی صحت کو بڑھانا چاہیئے۔

(۲) دوسرے درجہ پر حصولِ معاش کی فکر کرنی چاہیئے جس سے جسم کی خدمت ہو سکے۔

(۳) تیسرے درجہ پر اپنے اہل وعیال اور اہل خاندان کی خدمت کرنی چاہیئے۔

(۴) چوتھے درجہ پر اگر پہلے تین فرائض سے فراغت حاصل ہو تو ملکی و قومی خدمت کے کاموں میں حصّہ لینا چاہیئے۔

(۵) پانچویں درجہ پر تفریحی مشاغل میں حصّہ لینا چاہیئے۔"

میں نے قومی خدمت کو چوتھا درجہ دینے پر اعتراض کیا اور عرض کیا کہ جب ہر چہار جانب عام تباہی پھیلی ہو اور ملک و ملّت نازک دور سے گزر رہے ہوں تو انسان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ملّی و ملکی خدمت کو اپنا فرض اوّلیں بنائے۔

اس پر مولانا صاحب نے فرمایا "ابھی وہ نازک دور نہیں ہے۔ نہ کوئی قومی جنگ ہو رہی ہے اور نہ مذہبی جہاد۔ بغیر ان دو صورتوں کے پیش آنے کے تم اپنے ذاتی فرائض فراموش نہیں کر سکتے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ اہلیتِ کار اپنے میں پیدا کر کے انسان کو میدانِ عمل میں آنا چاہیئے۔ تاکہ پھر قدم پیچھے نہ ہٹے اور ثبات و استقلال کے ساتھ کام کیا جا سکے۔"

مولانا صاحب سے مذکورۂ بالا طرز پر ۹ بجے تک سلسلۂ کلام جاری رہا۔ اس کے بعد

میر ولایت حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تشریف لائے۔ مولانا صاحب ان سے مخاطب ہوئے اور مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا۔ مولانا صاحب نے اپنا پلنگ چھوڑ دیا۔ اور میں انتہا درجہ سکونِ قلب کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر سوگیا۔

رات کے بارہ بجے مولانا صاحب نے مجھے جگایا کہ تانگہ آگیا۔ اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔"

۵ اگست کی صبح کو میں بریلی پہونچ گیا۔ سب گھر والوں کو میری واپسی کی عام طور پر خوشی ہوئی اور میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ گویا دو سال کی جیل سے چھوٹ کر گھر آیا ہوں۔"

والد صاحب کو تو ایسی مسرت ہوئی جیسی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مل کر ہوئی ہوگی۔ (میری ڈائری)

مطبوعات مسند پریس بجنور، اور دوسری اہم کتابیں

نظم خیر مقدم[له] نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

از علامہ کیفی چریا کوٹی

برزمینے، آسماں آید ہمی — وندراں، مہ ضوفشاں آید ہمی
نیک تا بد، بخت یونیورسٹی — یعنی **اسمٰعیل خاں** آید ہمی
ازخدا ہیں، از پئے کشتی قوم — ناخدائے مہرباں آید ہمی
بحرِ طوفاں موج اندر موج بود — کشتیٔ ما برکراں آید ہمی
بازناید سوئے موجِ بیکراں — برکراں لنگرکناں آید ہمی
قوم کاندر یاس دل افگار بود — وعدۂ حق بے گماں آید ہمی
آستیں اندر کفِ مایوس بود — از کرم دامن فشاں آید ہمی
آں، دعائے دل زشوقِ بے قرار — از لبِ پیرو جواں آید ہمی
بازبکشاید درِ علم و ہنر — فاتح نصرت نشاں آید ہمی
بود پیکر، آں مگر بے روح بود — سوئے پیکر شکلِ جاں آید ہمی
کشتِ ما بے آب و ہم بے تاب بود — ابر دہم گوہر چکاں آید ہمی
تشنگیٔ لب بہ جاں آوردہ بود — رحمتِ حق بے گماں آید ہمی
شیوۂ حق ناشناساں را بگو — رہنمائے گمرہاں آید ہمی
پیش گوئیِ سلیماں زندہ باد — از نہاں اندر میاں آید ہمی
نورِ چشم و دیدۂ **اسحٰق خاں** — یعنی فخرِ دودماں آید ہمی
آنچہ شد در طالعِ قومِ عزیز — باز سوئے ما ہماں آید ہمی
ایّد اللہ بنصرہٖ دائماً — برزبانم ہر زماں آید ہمی
سوئے بزم و دیدۂ نظارگی — شمعِ نورِ دل کشاں آید ہمی
آمدہ آں قدردانِ علم و فن — ہر نفس ایں برزباں آید ہمی
آمدہ شمعِ شبستانِ ہمم — چوں نہ پروانہ دواں آید ہمی

مژدہ اے یاران سربزمِ شما

له بوزن ... مصنف کے تھے

مسلم یونیورسٹی

لٹن لائبریری کے اُردو مخطوطات

(از جناب مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شروانی)

لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے عربی، فارسی اور اُردو قلمی نوادر کی وجہ سے بڑی اہمیت کی مالک اور دُور ونزدیک مشہور ہے۔ مولوی سبحان اللہ خاں گورکھپوری، مولوی عبدالسلام خاں مولوی محمد عثمان الہ آبادی (والدماجد شاہ محمد سلیمان مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) اور حضرت احسن مارہروی وغیرہم کے کتاب خانے بھی یہیں آگئے ہیں، ان میں بھی قلمی نادرات کی کمی نہیں۔ سیّد بشیرالدین صاحب لائبریرین کے زیرنگرانی جناب مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مؤلف الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) واورنٹیلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سب سے پہلے لائبریری کے اپنے اُردو مخطوطات پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے متعلقہ کتب خانوں کے "اُردو مخطوطات" ہدیۂ ناظرین ہوتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ پسند کیا گیا تو عربی وفارسی مخطوطات بھی ملاحظہ میں لائے جاسکیں گے۔ مندرجہ ذیل کتب میں سے اکثر مطبوعہ ہیں، اسی لئے کسی خصوصیت کے بغیر مختصر تذکرہ ہی سے کام لیا گیا ہے۔

سیّد الطاف علی بریلوی

ادب منظومات

شمارہ	نام کتاب	نام مصنّف	کیفیت
۱	برکھارت اور مناظرۂ رحم وانصاف	شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی	حالی کی بلند پایہ نظمیں ہیں۔ خوش خط لکھی ہوئی اور چھوٹی تقطیع ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲	بیاض	شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی	مختلف شعراء کے اردو، فارسی کلام کا مجموعہ ہے، خط بھی مختلف ہیں۔ دو چار مقام پر "بقلم رام نرائن" تحریر ہے۔
۳	پوتھی رامائن	"	عہد شاہ عالم بادشاہ عرف عالی گوہر، میں ۶ جمادی الاخری سنہ ۱۲۰۳ھ کو جین سکھ نے نقل ختم کی ہے۔ چند اجزاء لالہ خوب لال نے بھی لکھے ہیں۔ خط اوسط پختہ، کاغذ وصل شدہ سنی ۔ ۲۰۳۔ سنہ ۱۲۴۳ھ کے آگے چہل و چہارم بھی لکھا ہے جس کا سبب یہ کہ سنہ ۱۲۴۴ھ سال اختتام ہے۔
۴	دیوان آتش	خواجہ حیدر علی آتش	خط معمولی، کاغذ وصل شدہ، ناقص الآخر ہے، سنہ ۱۲۵۵ھ میں سید امید علی واسطی نے بمقام اٹاوہ منشی عبد الحکیم صاحب کی فرمائش پر نقل کیا ہے۔ آتش کا انتقال سنہ ۱۲۶۳ھ میں ہوا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی زندگی میں ہی لکھا گیا ہے۔
۵	دیوان حشم	حشم	۸۳ صفحات ہیں، خط صاف معمولی سنہ ۱۲۶۷ھ کا لکھا ہوا ہے بعض اشعار سے معلوم ہوا کہ دو بار طبع ہو چکا ہے۔ آخر میں دو فارسی کی غزلیں بھی درج ہیں۔
۶	دیوانِ ذکی	شیخ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی	۲۴ جمادی الاخری سنہ ۱۲۶۴ھ کو شروع کرکے ۲۵ رجب ۱۲۶۴ھ کو ایک ماہ کے اندر، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نسخہ کتاب خانے سے حسین ۔۔۔ محتسن نے نقل کیا ہے۔ خط معمولی پختہ ۲۶۲ صفحات۔ زبان شستہ ہے۔ ایک صدی پہلے کی زبان تقریباً موجودہ مروجہ زبان ہی معلوم ہوتی ہے۔
۷	دیوانِ سودا	مرزا محمد رفیع سودا	خط پختہ معمولی، کاغذ وصل شدہ، سر ورق پر محمد حمید اللہ کے دستخط اور ۱۳ سنہ ۱۳۶۰ء تاریخ پڑی ہے۔
۸	ریاض المصطفیٰ	محمد تفضل حسین خاں میرٹھی	مرتب نے سنہ ۱۲۷۷ھ میں شعراء قدیم و جدید کا نعتیہ کلام، ردیف وار جمع کرکے کتابی شکل دی ہے۔ معروف و غیر معروف

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		سب ہی قسم کے شعرا نظر آتے ہیں۔ قصائد، غزلیات وغیرہ مختلف اصنافِ سخن کو بالترتیب جمع کیا گیا ہے اور ہر ایک ردیف و قافیہ کے مختلف شعراء کے کلام کو ایک ہی جگہ رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں گلدستۂ سخن عجیب بہار دکھا رہا ہے۔ مرتب کا حسنِ مذاق اور والہانہ ذوق و شوق قابلِ داد ہے۔ "ریاض المصطفوی" ۱۲۷۷ھ تاریخی نام ہے۔
قصۂ یوسف زلیخا	مولوی راحت	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ تقطیع خورد۔ صاف خط۔ ۸۸ صفحات۔ ۱۲۵۶ھ میں شیخ حسین بخش نے کتابت کی ہے۔ اس مثنوی کی زبان تقریباً موجودہ مروجہ زبان ہی معلوم ہوتی ہے۔
کلیاتِ سودا	مرزا محمد رفیع سودا	لمبی تقطیع کے ۵۲۴ صفحات ہیں۔ خط معمولی ہے۔
کلیاتِ مومن	حکیم مومن خاں	خط پاکیزہ۔ اکثر کاغذ وصل شدہ۔ غزلیات، مثنویات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ خاتمہ پر "غرہ محرم الحرام ۳۰ سنہ جلوسی از خط بد خط بندہ جیون لال کایستھ بوقت شام بانجام رسید" تحریر ہے۔ غالباً یہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اکبر شاہ ۳۲ سال تک تخت نشین رہے ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔ اس حساب سے ۳۰ سنِ جلوسی مطابق ۱۸۳۴ء / ۱۲۴۹ھ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر کے زمانے ہی میں لکھا گیا ہے۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۸ھ میں یعنی قمری حساب سے ۵۳ سال کی عمر میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ ۱۲۱۵ھ میں پیدائش ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی مدتِ حکومت کل بیس سال ہے اس لیے ۳۰ سنہ جلوسی کا سوال وہاں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مومن کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			فضل حق خیرآبادی، مرزا غالب، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور امام بخش صہبائی وغیرہم جیسے اکابر و افاضل کی ہم نشینی وصحبت نے اس عمر سے بہت پہلے ہی صاحبِ کلیات و دیوان بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔
۱۲	مثنوی میر حسن	میر غلام حسن حسن	لالہ مان سنگھ کی پیش کش کے لئے خیوراج سنگھ نے ۲۱ شعبان ۱۲۰۶ھ مطابق ۳۳ سنہ جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی، نقل کی ہے۔ خط صاف اوسط پختہ۔
۱۳	مثنوی نلدمن	رائے بھگونت رائے کاکوروی	۲۳ رفروری ۱۸۵۶ء کی لکھی ہوئی ہے۔ ۱۳۲ صفحات۔ خط معمولی پختہ، زبان غنیمت۔

تفسیر

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۴	تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام	سرسید احمد خاں	کتاب کے مباحث نام سے ظاہر ہیں، سید صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب کا حصہ سوم ہے۔ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
۱۵	ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم	"	واقعہ سے متعلق مرتب کتاب ہے، ۹۰ صفحات پر مشتمل [illegible] عربی، اُردو دونوں عبارتیں خوش خط ہیں۔ آخر میں مسٹر ایس بانگ گولڈ ایم اے کی کتاب کیوریس متھس آف دی مڈل ا[illegible] کا ترجمہ بھی شامل ہے ۱۸۹۰ء سنِ کتابت ہے۔
۱۶	تفسیر وہابیہ (جلد دوم)	...	سورۂ اعراف سے سورۂ کہف تک کی تفسیر ہے خط جلی معمولی کاتب و مصنف و سنِ کتابت سب غائب۔ بہت پرانی اُردو زبان استعمال کی گئی ہے۔ "تمہارا" کی جگہ "تمہارا" "وہ" کی جگہ "او"۔ "تم کو" کی جگہ [illegible] "چیزوں" کی جگہ "چیزاں" اور اسی قسم کے دوسرے صد[illegible]

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیر ہے بلکہ ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سرورق پر "مالک این تفسیر وہابیہ میر نظام الدین علی خاں است" تحریر ہے۔
۱۷	رسالہ تحریر فی اصول التفسیر و رسالہ الدعاء والندار	سر سید احمد خاں	سرسید مرحوم کی تفسیر القرآن پر نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں سے مراسلات کا مجموعہ ہے۔ نواب صاحب کے اعتراضات وشبہات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ خط صاف ہے۔ آخر میں شکست خط میں بعض انہیں خطوط کی نقل ہے۔ رسالہ کے آخر میں دعاء وندار کے لغوی معنی اور ان کے ترادف پر قرآنی آیات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ دعاء کی حقیقت پر حدیث سے استدلال کیا ہے۔ آخر میں تقریباً تمام قرآنی دعائیں نقل کر دی ہیں۔ رسم الخط سید صاحب کا نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ دستخط کہیں کہیں موصوف ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔
۱۸	قصۂ اصحابِ کہف	"	اصحاب کہف سے متعلق مسودہ ہے۔ اس میں اصحاب کہف کی تعداد، کہف ورقیم کے معنی اور اس سے مراد، نام بادشاہ عہد، ان کا مذہب اور دوسری ضروری معلومات جمع کی گئی ہیں۔ آخر میں اسی سے متعلق بعض تفاسیر اور کتب سیر کی عبارتیں درج ہیں۔
۱۹	یادداشت متعلق تفسیر معراج	"	سرسید مرحوم نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں واقعۂ معراج سے متعلق آیات واحادیث اور روایات کو جمع کیا ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت

فقہ

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۰	تحفۃ الاکرام فی جواز المواکلۃ مع الکتابی فی دین الاسلام	مولوی اکرام رسول میدنی پوری اسسٹنٹ ڈپٹی کلکٹر بھدرک	یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا مذہبی طور پر جائز ثابت ۸۳ صفحات ہیں، کافی بدخط ہے۔

کلام

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۱	بقائے روح اور بعث ونشر (ترجمہ گرانٹ الن)	..	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ ۲۰ صفحہ کا رسالہ ہے۔ خط صا پختہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حشر جسد سب سے پرانی صورت اور بقائے روح کا اعتقاد بعد میں پیدا ہوا ہے۔
۲۲	رسالہ ہو الموجود	سر سید احمد خاں	خدا کی علّیت اور اس کے صفات پر فلسفیانہ انداز میں بح کی ہے ۲۰ صفحات کا رسالہ ہے۔

تصوف

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۳	ہادی الناظرین ترجمہ آداب الصالحین	مولوی محمد قطب الدین	حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ کی کتا آداب الصالحین کا ترجمہ ہے۔ پرانی زبان مستعمل ہے۔ یہ ک آداب طعام، نکاح، صحبت، حق اسلام و قرابت، گوشہ نش سفر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دوسرے امور مشتمل ہے۔ مترجم نے کہیں کہیں حاشیہ لکھ کر فائدے بھی بڑ ہیں۔ آخر میں شاہ صاحبؒ کے لوح مزار کے کتبہ کا ترجمہ درج کر دیا ہے۔ خط شکستہ مگر صاف ہے۔

تعلیم

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۴	آرٹکل	سر سید احمد خاں	اِس مضمون میں مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم [illegible] پڑھنے کے

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			گورنمنٹ کا وفادار بننا اور بنا رہنا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کو باغیوں کی جماعت بتلایا ہے۔ مساوی حقوق طلبی کے سوال پر کانگریس کے صدر کے نام حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے خط کا تذکرہ بھی ہے کہ کونسلوں، میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈوں میں ہندو اور مسلمان بہ تعداد مساوی منتخب کئے جائیں۔ ۱۲ صفحات کا رسالہ ہے۔
۲۰	کم عمر مسلمان بچوں کی تعلیم	مفتی عصمت اللہ میرٹھ	اجلاس پنجم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں "کم عمر مسلمان بچوں کی تعلیم" پر [illegible] مضمون لکھا ملے ہوا تھا انعام دوسو روپیہ رکھا گیا تھا اور اس کے لئے ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سیّد احمد خاں سیکریٹری کانفرنس کی طرف سے اشتہار بھی شائع ہوا تھا۔ اسی پر عصمت اللہ صاحب نے ۱۳۶ صفحات کی کتاب مرتب کر کے سیکریٹری صاحب کے پاس اپنے خط مورخہ ۲۹ جون ۱۸۹۲ء کے ساتھ بھیجی (یہ خط بھی چسپاں ہے) مقرر کردہ کمیٹی نے اس کو پڑھ کر حسب مقصد نہ پاتے ہوئے محنت کا لحاظ کر کے دوسو کے بجائے پچاس روپیہ کے انعام کی سفارش کی ہے۔ آخر میں ارکانِ کمیٹی (کرامت حسین، ذکاء اللہ، محمد بشیر الدین ایڈیٹر نجم الاخبار) کی آراء درج ہیں۔ آخرالذکر نے ایک مستقل ومبسوط تنقید کر ڈالی ہے۔
	نواب محسن الملک کے لیکچر "تعلیم مسلمانان" پر تنقید	عبدالسلام	نواب محسن الملک نے الہ آباد کے اجلاس پنجم میں "تعلیم مسلمانان" پر لیکچر دیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے تنزل کے پانچ اسباب بتائے تھے (۱) سلطنت جمہوری کا نہ ہونا (۲) مذہب میں اختلاف پیدا ہو جانا (۳) مسلمانوں میں آزادی کا نہ ہونا۔ (۴) تعلیم کی کمی (۵) مذہب میں غلطیوں کا بڑھ جانا۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			سالہ ہی مسلمانوں کی ترقی میں مذہب کو سدِّ راہ بتایا تھا۔ اسپر عبدالسلام صاحب نے فاضلانہ تنقید کی ہے۔ اپنے ایک خط کے ساتھ جو آخر میں چھپاں ہے۔ سیّد صاحب کے پاس انا ڈسی یہ مضمون بھیجا، پانچوں اسباب پر تنقید کرتے ہوئے ہر جگہ مذہب کا بول بالا رکھا ہے۔ ایک بات بڑے مزے کی لکھی ہے "اہلِ یورپ کا استاد علم ہے مگر اہلِ اسلام کا استاد مذہب ہے" یہ رسالہ لمبی تقطیع پر ۷۰ صفحات کا ہے۔ خط صاف ہے۔

سیر و سوانح

۲۷	سلطان عبدالقادر جزائری	..	امیر عبدالقادر المتوفی ۱۸۸۳ء کی سوانح حیات ہے۔ ۳۶ صفحات ہیں۔
۲۸	سیرۃ فریدیہ	سرسیّد احمد خاں	سرسیّد مرحوم نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ وزیر اکبر شاہ ثانی کے حالاتِ زندگی ۶۵ صفحات میں لکھے ہیں۔

موسیقی

۲۹	کتاب در فن موسیقی	..	۵۱۲ صفحات، کاغذ وصل شدہ، خط پختہ معمولی ناقص الاول، محررہ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۲۳ھ (عہد محمد شاہ بادشاہ) ہندی زبان میں ۴۸۹۶ راگ اور گیت ہیں۔

تاریخ

۳۰	انتخاب جلالتہ	..	نہایت خوشخط صفحات ۲۶۱ مجلد و مطلا مشہور خوشنویس

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
	نجیب الدولہ	..	علی گڑھ نے لٹن لائبریری کے لئے نقل کی ہے۔ ۲۲، مارچ ۱۹۴۳ء خاتمہ پر درج ہے، اس تاریخ کا مسودہ جس کی یہ نقل ہے لائبریری میں موجود ہے۔ نہایت بوسیدہ حالت میں ہے، حاشیہ پر کاغذ گل گیا ہے۔ خط شکستہ اور خراب ہے۔ ۵ا
۳۱	تاریخ دلیر جنگی	احمد علی خاں	۳۸۹ صفحات پر مشتمل ۱۲۶۴ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ خط صاف اور اوسط درجہ کا ہے۔ اس میں ریاست شاہ نور کے ناظمان کی دولت وحکومت اور فرماں روائی و شجاعت کا تذکرہ ہے۔ نواب دلیر خاں بہادر دلیر جنگ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔
۳۲	تحفۃ الملوک (ترجمہ تاریخ فرشتہ)	حیدر علی سہسوانی	مسٹر ڈینزل ابٹسن قائم مقام ڈائرکٹر ممالک پنجاب کی ہدایت پر حیدر علی سہسوانی صاحبؒ سلطان التواریخ نے تاریخ فرشتہ کے پہلے اور دوسرے مقالے کو جن میں سلاطین لاہور و دہلی کے مفصل حالات ہیں، ترجمہ کیا ہے دو باب اور چند فصلوں میں منقسم کر کے تحفۃ الملوک اس کا نام رکھا۔ آخر میں ۹ صفحات از ۶۶۱ تا ۶۶۹ نورالدین جہانگیر سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ کے حالات سیرالمتاخرین اور دوسری کتب تواریخ سے مترجم نے بڑھا دیئے ہیں، صفحات ۶۶۹۔ خط اوسط پختہ۔ نام کاتب اور سن کتابت درج نہیں۔
۳۳	ترجمہ کتاب تواریخ فارس (جلد چہارم)	..	رولن صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ناقص الآخر ہے۔ تیرہ سال کی سرگذشت درج ہے۔ یونان وغیرہ کا جنگی تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۴	تواریخ ہندی	..	۳۶۹ صفحات پر مشتمل، بخط اوسط صاف، مصنف اور کاتب کا نام درج نہیں۔ ۱۲۹۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ حالات حضرت آدم و سرور کائنات علیہما السلام بھی درج ہیں۔ ہندستان کے صوبوں کا تفصیلی ذکر اور سلاطین دکن کا تذکرہ بھی ہے۔ انگریزوں کے تسلط دکن کا بھی کچھ حال ہے۔
۳۵	سرسید کی کتاب یادداشت	سرسید احمد خاں	سرسید نے تصانیف کی سہولت کے لئے یادداشتیں مختلف کتابوں سے جمع کی ہیں۔ تاریخ طبری، ترجمہ فارسی، السنۃ المکللہ، صراط المستقیم، شرح سفر السعادۃ، العقود اللؤلؤیہ، کے اقتباسات نظر پڑے۔ شروع میں از حضرت آدم تا سرکار دو عالم علیہما السلام شجرہ درج ہے، ۴۰ واسطے درمیان میں ہیں۔ صرف آٹھ ورق میں اردو، فارسی، عربی عبارتیں ہیں۔ باقی پوری کتاب میں انگریزی نوٹس ہیں۔ مسٹر ظفر عمر نے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لائبریری کے لئے عنایت فرمائی۔
۳۶	کاغذات متعلق سرکشی ہائے ہندوستان	..	یہ مئی و جون ۱۸۵۷ء کے انقلاب ہندوستان کا روزنامچہ ہے جو ہر دو ایوان ہائے پارلیمنٹ میں حسب الحکم ملکہ وکٹوریہ پیش کیا گیا تھا۔ اس میں حکام کی رپورٹیں، وزیر ہند وغیرہ کی ہدایتیں۔ ہندوستانیوں کی وفاداری کی درخواستیں سب ہی کچھ تفصیل سے درج ہیں۔ آخر میں ۶۴ باشندگان کلکتہ کے دستخطوں سے ایک عرضی درج ہے جس میں وفاداری کا یقین دلایا گیا ہے، ان میں زمیندار، عہدیدار، مدرس و مولوی اور کلکتہ کے قاضی القضاۃ مولوی فضل الرحمٰن قاضی صدر کلکتہ اور مولوی عبدالباری

...ہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			قاضیٔ کلکتہ کے نام بھی نظر آئے۔ بخط صاف جلی، ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔
	کتابِ تاریخ	..	چوتھی صدی ہجری کے قرطبہ، اندلس [illegible] کے حالات ہیں۔ ۳۳۲ھ سے ۳۷۹ھ تک حالات درج ہیں۔ خلیفہ مستنصر باللہ کا جگہ جگہ ذکر خیر ہے۔ کاتب و مصنف و سنِ کتابت کا پتہ نہیں ناقص الاول والآخر ہے۔
	گرجا کی بیرونی اور اندرونی تاریخ	..	عیسائی مذہب اور تہذیب و تمدن سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں ناقص ہے۔
	مسودہ ترجمہ قدیم تاریخ یونان	..	رولن صاحب کی قدیم زمانہ کی تاریخ کا ترجمہ ہے ۳۴۶ صفحات کی ناقص الآخر کتاب ہے۔ مضمون نام سے ظاہر ہے تقریباً ہر صفحے پر بیاضیں ہیں یعنی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔
	مالگزاری صوبجات عہد اکبر، جہانگیر، شاہجہاں عالمگیر، محمد شاہ	..	مغلیہ عہد کی مال گزاری صوبہ وار درج ہے۔ ۲۴ صفحات ہیں۔
	مسلمانوں کے عہد حکومت میں حقیتوں کی نوعیت، قانونِ ہندستان کے بموجب (ریلپ ڈم)	..	مصنف کا نام درج نہیں، خط شکستہ اور ناقابلِ قرارِ ہے۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حکومت، والیٔ ملک، زمیندار، اور کاشتکار، ان میں سے زمین کا اصلی مالک کون ہے۔ اس پر بحث کی گئی ہے۔ مغل بادشاہوں کا ہر دور میں تعامل بھی دکھایا گیا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے کاشتکار کو مالک قرار دیا ہے زمیندار صرف ایک واسطہ بیان کیا گیا ہے جسے ہر وقت درمیان سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ کاشتکار کو حکومت بھی خاص وجوہ کے بغیر بے دخل نہیں کر سکتی ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۲	مبینضۂ اسباب سرکشئ ہندستان	سرسید احمد خاں	انقلاب ۱۸۵۷ء کے پانچ اسباب بیان کئے ہیں :- (۱) غلط فہمی رعایا (۲) اجرار ناروا احکام و قوانین۔ (۳) حالاتِ رعایا سے ناواقفیت گورنمنٹ (۴) ترک امور ضروریہ (۵) بدانتظامئ فوج۔ اِس رسالہ میں ہندستانیوں کو خطاوار بتاتے ہوئے کسی منظم سازش سے انکار کیا ہے مسلمانوں کو گورنمنٹ کا مستامن بتاکر شرکتِ ہنگامہ میں قصوروار اور گنہگار مذہب ہونا ثابت کیا۔ یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحب ای۔ ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندستانی عہدیداروں کے نام گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ " برٹش راج میں تمام ہندستان میں ایک عملداری ہو گئی ہے ، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی ، ریلوے ، سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی ، مذہب بھی ایک چاہیے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ " صفحات ۱۰۳ ، خوشخط ، سنِ کتابت و نام کاتب ندارد۔

خطبات

۴۳	اسپیچ در تہنیت شصت سالہ سلطنت ملکہ وکٹوریہ	سرسید احمد خاں	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ ۲۰ ر جون ۱۸۹۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت شصت ۶۰ سالہ کی خوشی منانے اور مدرسہ (حال مسلم یونیورسٹی) کے در و دیوار پر چراغاں کرنے کیلئے چندہ کی اپیل کے سلسلہ میں جلسہ کیا گیا تھا۔ اس میں جو تقریر پڑھی گئی وہ کتابی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔ اِس تقریر کا خلاصہ سلطنتِ برطانیہ کے استحکام اور بقار و دوام کی خواہش

شمارہ	نام کتاب	نام مصنّف	کیفیت
			سمجھنا چاہئیے، ۱۶ صفحات پر تقریر مندرج ہے۔
۴۴	اسپیچ نواب عماد الملک کانفرنس میرٹھ	عماد الدولہ مولوی سید حسین بلگرامی	۱۸۹۶ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس یازدہم میرٹھ کی صدارت کرتے ہوئے نواب عماد الملک نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اسے کتابی شکل دیدی گئی ہے اس خطبہ میں نواب صاحب نے مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک کرنے اور ان کی ترقی کو ملکی ترقی سمجھنے کی پُر زور الفاظ میں اپیل کی ہے۔ ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہر موقعہ پر وفاداری کا ثبوت پیش کرنا فرائض میں سے قرار دیا ہے۔ قوم کو کالج اور کانفرنس کی مالی اور اخلاقی امداد کی طرف توجہ دلائی ہے مروجہ تعلیم کی ضمنی طور پر مذمت بھی کی ہے۔ الفاظ پُرشکوہ اور عبارت لیاقت سے استعمال کی گئی ہے۔ صاف اور جلی خط میں ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے

صرف

۴۵	فرائد الصرف	..	جلی قلم خوشخط ہے، ۲۷۹ صفحات ہیں۔ مضمون نام سے ظاہر ہے کتاب مبتدیوں کے لئے بہت مفید ہے۔ مصنف و کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ البتہ کتاب کی چیٹ پر مصنّف کا نام مولوی سید نا ور الدین پروفیسر معقولات و مددگار اول مدرس دار العلوم سرکاری لکھا ہوا ہے۔

بلاغت

۴۶	ترجمہ حدائق البلاغت	..	منشی لچھمن پرشاد مدرس سوم مدرسہ سرکار نے جولائی ۱۸۴۲ء

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			نقل کرائی ہے۔ میر شمس الدین فقیر المتوفی ۱۱۸۶ھ کی فا کتاب خدائق البلاغت کا ترجمہ ہے۔ مسٹر ٹرس پرنـ مدارس شاہجہاں آباد (دہلی) نے مولانا امام بخش صہبـ مدرس اول فارسی سے ترجمہ خدائق البلاغت کی خواہشـ صہبائی نے مترجم کو اس پر مامور کیا۔ مترجم نے مفید معلـ اور اُردو اشعار کا جابجا اضافہ بھی کر دیا ہے ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء ترجمہ کیا گیا۔ افسوس مترجم نے اپنا نام نہیں لکھا۔ نسخۂ خدا فارسی قلمی بھی بقلم میر نواب مونس محررہ ۱۲۶۳ھ لٹن میں موجود ہے۔

عروض

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۷	رسالہ عروض	مولوی سلامت اللہ	عروض میں مفید رسالہ ہے۔ آخر میں فن تاریخ گوئی کافی معلومات ہیں۔ شروع میں شاہزادہ وکٹر ولی عہد آمد لکھنؤ ۱۸۹۰ء پر قطعہ تاریخ ہے الہی! قسمت مری شہزادۂ وکٹر آئے ۱۸ ۶ ۹۰

قواعد

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۸	قواعد زبان عبرانی	..	۱۶۰ صفحات کی کتاب ہے۔ خط ما بقرا اور صاف مضمون نام سے ظاہر ہے، اس کو سمجھ کر دیکھا جا استاد کا کام دے سکتی ہے۔ عبرانی زبان پر انسان مدد سے کافی عبور حاصل کر سکتا ہے۔ زبان سلیس کی گئی ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۹	اصولِ سیاستِ مدن	رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن دہلوی	رائے بہادر صاحب نے نہایت فصیح اور سلیس اُردو میں مسٹر جون سٹوراٹ مِل کی کتاب کے مقالۂ اولیٰ کا ترجمہ کیا ہے. تیرہ بابوں اور ۴۶۹ صفحات پر مشتمل ہے. خط پختہ صاف اور بہتر ہے بحث نام سے ظاہر ہے "محنت اور کفایت ذریعہ ہے سعادت کا" اس کا خلاصہ ہے. مترجم کی قابلیت اور زبان دانی برادرانِ وطن کے لئے لائقِ توجہ ہے۔ عربی، فارسی الفاظ کا استعمال، موضوع کی وسعت معلومات پر دال ہے۔ اپریل ۱۸۶۸ء میں بعد اختتام سر سید احمد خاں مرحوم کو پیش کی گئی ہے۔ ڈھائی سال میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

زراعت

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۰	چھوارے کی پیداوار ہندستان میں	ڈاکٹر بونیو سول سرجن اٹاوہ	مصنف نے اس درخت کے لگانے اور پھلوں کی حفاظت کا طریقہ اور اُن کے فوائد تفصیل سے بیان کئے ہیں ۵ صفر ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ جون ۱۹۰۰ء کو اس کی کتابت ہوئی ہے خط معمولی ہے۔ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے. خشک آب و ہوا اس کے لئے بہت مفید ہے۔ کم محنت سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سید عبد النبی نے نقل کیا ہے۔

حساب

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۱	اصولِ حساب	..	مضمون نام سے ظاہر ہے، ۳۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

قصص

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۲	باغ و بہار	میر امن دہلوی	خط معمولی خام، میر امن دہلوی نے مضامین گلکرسٹ کی

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			فرمائش پر قصہ چہار درویش مولفہ حضرت امیر خسرو کا ترجمہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں شروع کرکے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں ختم کیا۔ تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا۔ ڈیڑھ سو سال قبل ترجمہ ہوا ہے مگر موجودہ مروجہ زبان کی کافی جھلک پائی جاتی ہے۔ کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال قبل کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ نام کاتب و سن کتابت درج نہیں۔

ہیئت

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۳	رسالہ علم ہیئت	پنڈت رادہاکشن	۱۸۷۲ء میں پنڈت رادہاکشن نے انگریزی سے اُردو میں حسب حکم مسٹر ایچ لیپوردین انڈر سیکریٹری گورنمنٹ ہند، ترجمہ کیا ہے۔ افلاک، کواکب، ثوابت، سیارات اور بروج کا تفصیلی بیان ہے۔ جدید تحقیقات اور مفید معلومات سے مملو ہے، ۲۹۹ صفحات ہیں۔ خط معمولی مگر صاف ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔
۵۴	شمسی حسابات	مولوی نظام الدین حسین بی۔ اے	مولوی صاحب نے معیار وقت بلدۂ لکھنؤ تیار کیا تھا جو شائع ہوا۔ اسی سے بلدۂ علی گڑھ کا معیار وقت ترتیب دے لیا گیا۔ اوقات افطار و سحر بھی بتا دیے گئے۔ سال بھر کا، ہر مہینہ کا علیحدہ علیحدہ نقشہ ہے۔ یہ نقشہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔
۵۵	قانون مسعودی (ترجمہ اُردو)	شمس العلماء محمد امین الدین عباسی۔ چڑیاکوٹی	قانون مسعودی کے مقالہ اول و ثانیہ کا ترجمہ ہے۔ ناقص الاول والآخر ہے۔ اس میں سنین و شہور عرب و فارس وغیرہما کے استخراج کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ مترجم کے ہاتھ کا مسودہ ہے۔ پہلے مقالے کے ۱۲۹ صفحات ہیں۔ کافی حصہ

شماره	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			دوسرے مقالہ کا بھی ہے پھر مختلف مسودات ہیں ۔
۵۶	قانون مسعودی (ترجمہ اُردو)	محمد المہدی الجعفری جونپوری	آٹھویں مقالہ کا ترجمہ ۱۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو ختم کیا ہے۔ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی سر شاہ محمد سلیمان کی ہدایت پر ترجمہ کیا گیا ہے۔ خط معمولی خام صاف ، صفحات ۱۰۵ ۔
۵۷	قانون مسعودی (ترجمہ اُردو) ۷ جلد	مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی	ڈاکٹر شاہ سر محمد سلیمان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ہدایت پر مترجم نے ۱۵ر مئی ۱۹۴۰ء کو تیسرے مقالہ کا ترجمہ ختم کیا۔ اس کے بعد ۹ و ۱۰ و ۱۱ مقالوں کا ترجمہ بھی ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء تک ختم کیا۔ اصل مسودہ معلوم ہوتا ہے۔ خط معمولی شکستہ اور گنجلک ترجمہ کی دشواری پیش آنے کی وجہ سے ہر صفحہ پر قلم زدکی ہوئی سطریں اور عبارتیں پائی جاتی ہیں صفحات ۲۵۵ ترجمہ کی دشواری پیش آنے کی وجہ سے ہر صفحہ پر قلم زدکی ہوئی سطریں اور عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ خط معمولی شکستہ گنجلک صفحات ۲۵۵ ۔ اصل کتاب عربی میں ابو الریحان البیرونی کی علم ہیئت میں معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کے اس مکتوب سے کیجئے جو لٹن لائبریری کے قلمی نوادر کے رجسٹر پر چسپاں ہے۔ "قانون مسعودی کا ایک نادر نسخہ لٹن لائبریری میں تھا۔ قدیم خط نسخ میں لکھا ہوا۔ کاغذ چکنا ہلکا گلابی ، ٹائٹل پیج پر شاہی مہریں تھیں۔ بہت پرانا لکھا ہوا نسخہ تھا۔ نواب اسحاق خاں مرحوم کی سیکریٹری شپ کے زمانہ میں گم ہوا۔ نواب صاحب نے مجھ کو لکھا تو جواب میں میں نے

ہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			یہ الفاظ لکھے :- اگر نسخہ تلف ہوگیا تو علمی دنیا کا حادثہ ہے۔ دوسری جگہ محفوظ ہے تو ہمارے کالج کا حادثہ ہے " حبیب الرحمٰن خاں شروانی خدا کا شکر ہے کہ لائبریری میں ایک قدیم نسخہ خط نستعلیق اوسط درجہ صاف میں لکھا ہوا موجود ہے۔ کاغذ کرم خوردہ، وصل شدہ مگر اچھی حالت میں ہے۔ افسوس ہے کاتب اور سن کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے علاوہ ایک مکمل نسخہ گیارہ جلدوں میں گم شدہ نسخہ کی نقل موجود ہے۔ سیّد اوصاف علی مشہور خوشنویس علی گوشہ نے ۱۹۱۳ء میں خط نسخ میں نہایت خوشخط لکھا ہے۔ کسی صاحب نے اپنی بدخطی کا جا بجا مظاہرہ کرکے اس نسخہ کو بگاڑ دیا ہے۔ افسوس ہے کہ کتابت کے بعد اصل سے مقابلہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ نسخہ گم ہوگیا۔ گم شدہ نسخہ کی تسوید سے ابوالفتح نصر بن محمد بن ہبتہ اللہ نے سلخ ربیع الآخر ۵۶۲ھ موافق روز آبان ماہ اسفندارمد ۵۵۶ یزدجردی میں فراغت حاصل کی تھی۔ یہ ترجمہ سید اوصاف علی کے تحریر کردہ نسخہ سے کیا گیا ہے۔ ایک عکسی نسخہ بھی نامکمل حالت میں موجود ہے لٹن لائبریری بڑی خوش نصیب ہے کہ کئی نسخے اس نادر الوجود کتاب کے اس کے پاس محفوظ ہیں سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قانونِ مسعودی رکھا گیا ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			متفرقات
۵۸	دستور العمل تھانہ داران	..	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ چھوٹی تقطیع پر ۲۳۲ صفحات کی کتاب ہے۔ خط معمولی، سطریں ٹیڑھی۔ کاغذ وصل شدہ ہے۔
۵۹	کتاب المواضع	..	علاقہ یتیم پور وغیرہ کے دیہات کا تذکرہ ہے۔ قصبہ بنڈرادل سے اس کی ابتدا ہے اور موضع علی پور پر خاتمہ۔ کچھ مواضع کے عنوانات قائم کرکے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مواضع کی مالی حالت، رقبۂ کاشت وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ اکثر دیہات فرمانی ہیں بعض خرید کردہ۔
	کتاب عین الحکمۃ	بابو گوپال چند گھوش ماسٹر ریاضی مشن سکول گورکھپور	۵۶ صفحات پر مشتمل، ان مضامین مختلفہ کا مجموعہ ہے جو جلسہ ہائے "مسٹر دی کلب" میں مختلف اوقات میں پڑھے گئے۔ عنوانات حسب ذیل ہیں:- ۱ انسان مجبور ہے یا مختار، ۲ جسم اور بعد کا بیان، ۳ بازداری، ۴ صداقت اور راستی، ۵ دوسرے کی نسبت رائے قائم کرنا، ۶ ہوا کا بیان، ۷ مادی جسم کا بیان، ۸ زمین کی اصل و ابتدا، ۹ ابطال بطلان ذات باری، ۱۰ علت اول کا بیان، ۱۱ مذہب اور فلسفہ، ۱۲ خدا خلقت میں کس طرح موجود ہے، ۱۳ حصول اور شغل، ۱۴ عدم اور وجود کا بیان، ۱۵ سقراط کا حال، ۱۶ سقراط اور ڈکارٹس کی رائے، ۱۷ کپلہ اور شانکھ شاستر، ۱۸ عنصر کا بیان، ۱۹ شانکھ فلسفہ بیان علت اول، ۲۰ از روئے شانکھ فلسفہ روح کا وجود اور اس کی خاصیت، ۲۱ خلقت کا ہونا لازم تھا بجواب شانکھ شاستر۔ خط اور زبان حد تک پاکیزہ ہیں۔

ن...	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
٦	مسل بابت مولوی عبداللہ انصاری	—	مولوی عبداللہ انصاری ناظم دینیات مدرستہ العلوم علی گڑھ کی موقوفی سے متعلق ہے۔ اس میں ایک خط حضرت استاذ العلماء مولانا محمد لطف اللہ صاحب ممبر کمیٹی کا بھی ہے جس میں مولانا عبداللہ کی تعریف اور ان پر اعتماد کا اظہار ہے۔ ۱۳۲۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ زبان بالکل آج کل کی مروجہ ہے۔ ۴۶ سال پہلے یہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ایک لفظ بھی ایسا مستعمل نہیں ہے جو اب متروک ہو۔
٦	مسل محکمہ بندوبست ریاست بھوپال	—	مضمون نام سے ظاہر ہے۔
٦١	"	—	" " " بابت ۱۳۱۴-۱۵ھ
٦	"	—	" " " بابت ۱۳۰۷-۱۳ھ

عبدالشاہد خاں شروانی

تاریخی نوادر

سندھ قدیم میں ہندو مسلم تعلقات

(از جناب پنڈت بشیر الدین صاحب ایم اے اسلامیہ کالج شاہجہاں پور)

عہد عباسیہ میں سندھ فتح ہونے کے ۲۵، ۳۰ برس بعد ہی جب کہ بنو امیہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ دمشق میں حکمراں تھے۔ سندھ کے اصلی باشندے پایۂ تخت تک پہنچ کر سیاست میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ فوجی خدمت کے لئے تو سندھ کے بعض علاقے بہت ہی موزوں تھے چنانچہ قیقان کے جاٹ فوج میں بہت بھرتی ہوئے اور ۱۲۲ھ میں جب زید بن علی بن حسینؓ بن علیؓ کا واقعہ پیش آیا تو سرکاری فوج میں تین سو جوان قیقانی (سندھی) بھی تھے جنھوں نے جناب موصوف کا محاصرہ کیا تھا اور پھر جناب موصوف کا وہ غلام[۱] بھی سندھی تھا جس نے آن جناب کی قبر کا پتہ بتلایا۔" اسی طرح ۱۲۶ھ میں جب بنو امیہ کا گیارھواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک قتل کیا گیا تو قاتلوں میں ایک شخص سندھی بھی تھا جس کا نام ابن زیاد بن ابی کیشہ ہے[۲]

۱۶۹ھ میں جب حسین ابن علی بن حسن بن حسن مثنیٰ بن حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب نے

---

[۱] قبر بتانے کے سلسلہ میں ایک دوسری روایت بھی مشہور ہے کہ جب زید بن علی زخموں سے چور رات کے وقت میدان جنگ سے پلٹے تو ان کی پیشانی میں ایک تیر پیوست تھا۔ بہت تلاش کے بعد کسی گاؤں سے تیر نکالنے کے لئے حجام لایا گیا۔ اس سے زیدیوں نے اخفائے راز کا عہد لے کر تیر نکلوایا، ادھر اس نے تیر نکالا ادھر ان کی روح قفس عنصری سے نکل گئی۔ اس کے بعد کفن دفن میں وہ حجام برابر کا شریک رہا صبح کو اس نے یوسف بن عمر ثقفی (والی بصرہ) سالار فوج سے جاکر سارا حال کہدیا اور قبر کا نشان بتادیا جو ایک ماج ہے (نہر) میں بنائی گئی تھی اور جس کے اوپر پانی رواں تھا (مروج الذہب و معادن الجوہر صفحہ ۴۲) بہت ممکن ہے کہ اس نشان دہی میں سندھی غلام نے بھی برابر کا حصہ لیا ہو اس لئے یہ دونوں روایتیں اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہیں۔ (مؤلف)

[۲] [illegible]

خلیفہ ہادی کے تخت نشین ہونے پر مدینہ میں خروج کیا تو بعض ترک اور سندھی غلاموں نے حسین کا ساتھ دیا۔ یہ سندھی غلام برہمن نژاد تھے جو عبداللہ اشتر کے مقتول ہونے پر ان کے لڑکے اور بیوی کے ہمراہ قید ہو کر بصرہ و بغداد ہوتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے تھے کیونکہ خلیفہ منصور نے ان سب کو رہنے کے لئے مدینہ منورہ بھیجدیا تھا۔ حسینؓ بن علی کی مکہ معظمہ میں آکر ماہ ذیقعد ۱۶۹ھ عباسی لشکر سے آخری لڑائی ہوئی جس میں وہ شہید ہوگئے ان کے بعض ساتھی مارے گئے اور بعض کسی نہ کسی طرح بچ گئے۔ ان میں سے بعض سندھی بھی فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح سندھ پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہیں لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ کربلا کے میدان میں ان کا موجود ہونا تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے البتہ حسین بن علی بن حسنؓ مثلث کو امام عالی مقام سیدنا امام حسینؓ کی جگہ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ حسینی برہمن آج بھی سندھ و پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ہندو مسلمانوں کے قدیمی ہمدردانہ تعلقات کا زندہ ثبوت ہیں[1]

سندھ کے علمی تعلقات تو خلیفہ منصور ہی کے زمانہ سے بغداد سے قائم ہوچکے تھے اور خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں تو اسے اور بھی ترقی ہوئی، ویسے بھی سندھ کے نومسلم دربار خلافت میں باریاب ہو کر اہم سیاسی امور میں حصہ لینے لگے تھے چنانچہ خلیفہ امین الرشید بن ہارون رشید کے زمانہ میں ایک سندھی الاصل "سندھی بن شابک" وزارت کے عہدہ تک پہونچا۔ یہ خلیفہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا[2]

سندھی فوجوں کا عرب میں ہونا تو ۱۲۲ھ سے ثابت ہے جب کہ انہوں نے حضرت زیدؓ بن علی کو محصور کرنے میں حصہ لیا۔ ۲۰۰ھ کے بعد یعنی خلیفہ معتصم کے زمانہ میں ان کی جماعت عرب کے اندر بہت طاقت پکڑ گئی اور بصرہ و واسط کے درمیان ان کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ خلیفۂ وقت کو ان کی طاقت منتشر کرنے کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ مسعودی کے بقول خلیفہ معتصم نے ان کو خراسان کے راستہ سے خانقین اور جلولا کے ملکوں میں اور شامی سرحد

---

[1] بحوالہ تاریخ آئینہ حقیقت نما ج ا صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰

[2] التنبیہ والاشراف صفحہ ۳۴۳ و صفحہ ۳۴۹ [illegible]

کی طرف سے مِلن زر بہ کے ملک میں خارج کر دیا۔[۱] اسی طرح اُن کو ہندوستانیوں کے بحری جہازوں کو گرفتار کر کے جن میں ہندوستان کی طاقت ور فوج بھری ہوئی تھی اور ان کے قدم فارس اور عمان کے ساحلی مقامات پر پورے طور سے جم گئے تھے اِدھر اُدھر منتشر کرنا پڑا۔[۲]

سماجی تعلقات

مسلم فاتحین اور بالخصوص عرب جہاں بھی گئے اِس ملک کو مستقلاً اپنا وطن بنالیا۔ چنانچہ سندھ کو فتح کرنے کے بعد وہ وہیں رہ پڑے اور اپنی ہمسایہ ہندو و بدھ اقوام کے لئے اچھے دوست اور اچھے معلم ثابت ہوئے۔ آپس کے میل جول و نیز سیاسی تعلقات کی وجہ سے سب سے گہرا اثر ایک دوسرے کی زبان پر پڑا چنانچہ مسلمانوں نے سندھی اور ہندوؤں نے عربی زبان سیکھی۔[۳] اس محبت و دوستی و ہم آغوشی کا اثر آج بھی سندھی زبان کے رسم الخط اور خود سندھی زبان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سندھی زبان میں ماں کو اُمُّو اور عربی میں اُم کہتے ہیں۔ سندھی زبان میں باپ کو اَبُّو اور عربی میں اَبّ بولتے ہیں۔ بیوی کو سندھی میں صاجبان اور عربی میں صاحبہ، سندھی میں بات کو گھال اور عربی میں قال کہتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہزارہا الفاظ ہیں جو موجودہ سندھی زبان میں عربی کے بولے جاتے ہیں۔

ابنِ حوقل جب ہندوستان آیا ہے تو ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ رہتے ہوئے کم و بیش ڈھائی سو سال ہو چکے تھے۔ اس مدت میں دونوں کے تمدنوں کی آمیزش سے ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کو ہم ہندی عربی تمدن کہہ سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے تمدن سے اس حد تک متاثر نہیں ہوئے جتنا کہ ہندوؤں نے ان کے تمدن کے اثر کو قبول کیا تھا اور یہ ایک نفسیاتی قانون تھا جس کے ماتحت ایسا ہونا لازمی امر تھا کیونکہ مسلمان اوّل تو فاتح جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کا اثر سندھی مفتوحین پر پڑنا ایک بدیہی بات ہے۔ دوسرے مسلمانوں کا تمدن اپنے زمانہ کا بہترین تمدن تھا اور ان

---

[۱] تنبیہ و اشراف صفحہ ۲۲۵ و صفحہ ۲۲۹ از مسعودی

[۲] کتاب التنبیہ و اشراف صفحہ ۲۲۵

[۳] [illegible] صفحہ ۲۲۲ از [illegible] صاحب ندوی۔

ر اور برتر معاشرت اس زمانہ کے لئے قابلِ تقلید تھی یہی وجہ ہے کہ نہ صرف سندھ بلکہ
یا کے ہر گوشہ میں ان کی عفت و قعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ بہرحال سندھ میں ایک
ت تک ایک ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے دونوں میں اتحاد و یگانگت کے ساتھ ساتھ یکسانیت
ی پیدا ہو چلی تھی اور لباس و وضع قطع کے لحاظ سے دونوں ایک تھے چنانچہ ابنِ حوقل
تا ہے کہ یہاں (یعنی سندھ و ملتان میں) ہندو مسلمانوں کا لباس ایک ہے، بال بھی ایک
طرح رکھتے ہیں۔ ان کا لباس ازار اور کرتا ہے کیوں کہ ان ملکوں میں گرمی سخت
تی ہے ... مگر تاجروں کا لباس قمیص اور چادر ہے جس طرح عراق اور فارس والوں
ہے[۵۱]" اس کے علاوہ "یہاں کے مسلمان امراء ہندوؤں کی طرح کان میں سوراخ کرا تے
تھے[۵۲]" اور زیور پہننے لگے تھے۔ یہ غالباً ہندوؤں سے شادی بیاہ کا اثر تھا۔ اس میں کوئی
شبہ نہیں کہ ملتان و منصورہ صدہا قبائل کا منبع و مرکز رہے ہیں اور ان سے تعلق رکھنے
الے سب کے سب عربی النسل سمجھے جاتے ہیں، یہ سب یقیناً عربی باپوں اور ہندی
ؤں کی اولاد ہیں۔ یہ عربی قومیں غزنوی دورِ حکومت میں پنجاب اور اس کے بعد تمام
مالی ہند میں پھیل گئیں۔ چنانچہ پنجاب کے 'اعوان' کشمیر کے 'کھلے' اور 'بھیے' اور انہیں کی
طرح 'ارائیں' اور 'ملتانی' بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنے پیشوں کی وجہ سے
ب اپنی حیثیت کو بہت کچھ گھٹا اور مٹا دیا ہے۔

مختصر یہ کہ عرب اپنی تلوار کے سایہ میں جس محبت و مدارات کو اپنے ساتھ لائے تھے
وہ ہرگز ضائع نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک ایک شخص غالباً ایک ایک قوم کا مورث اعلیٰ بنا،
اور ان قوموں نے ہندو مسلم تعلقات کو پائیدار و استوار بنانے میں وہ کام کیا کہ
آج تک باوجود سخت کوششوں کے ہندو مسلم تعلقات کے جوڑ بند جدا کرنا بے حد دشوار
ثابت ہو رہا ہے۔

تجارتی تعلقات

ہندو مسلمانوں کے برادرانہ تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں عرب و سندھ کے تاجرانہ تعلقات کو بھی بڑا دخل ہے

---

۵۱ سفرنامہ ابن حوقل بحوالہ تاریخ سندھ ص۳۳۳

۵۲ احسن التقاسیم بشاری مقدسی بحوالہ تاریخ سندھ ص۳۴۲

اس وقت تاریخی شواہد کی کمی کی وجہ سے یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن گمان غالب ضرور ہے کہ عرب تاجروں نے جس طرح دنیا کے اور ممالک کی غیر مسلم آبادیوں کو متاثر کیا اور اس اثر کی وجہ سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتی گئیں[1] اسی طرح سندھ کے غیر مسلموں کو بھی اپنی راست بازی، ذہانت و لیاقت اور بہتر تہذیب سے متاثر کر کے اسلام کی طرف مائل کیا ہوگا۔

سندھ مسلمانوں کا مفتوحہ ملک تھا اس لئے ان کو تجارت کے لئے کاٹھیاواڑ، گجرات، مالابار، مدراس و لنکا وغیرہ کی بہ نسبت سندھ میں زیادہ آسانیاں میسر تھیں۔ اس کے علاوہ سندھ میں ان کی تجارت کو فروغ پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اور جگہ ان کی تجارت صرف بندرگاہ اور پایۂ تخت تک محدود رہتی تھی۔ ان کا لایا ہوا مال ملکی تاجر اُن سے لے کر اندرون ملک میں پھیلاتے تھے لیکن سندھ میں عرب تاجر خود اپنا مال لے کر اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے اور اِس طرح بہت زیادہ نفع اٹھاتے تھے۔ تجارت کے لئے خشکی و تری کے دونوں راستے ان پر کشادہ تھے۔ سندھ کا علاقہ خشکی کے ذریعہ خراسان و ایران سے ملا ہوا ہے اور یہ آج کل کی طرح دونوں اسلامی ملک تھے انہیں ملکوں میں ہو کر سندھ کا تجارتی مال وسط ایشیا اور روس تک پہونچتا تھا۔ ابوزید سیرافی نے سندھ کے تجارتی راستوں کا جو حال تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان تاجر سندھ کے ہر

---

[1] 'پریچنگ آف اسلام' ص ۸۴، ۳۸۳ از ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔

[2] خراسان جانے کے لئے ہند اور سندھ کے راستے قندھار پر مل جاتے ہیں اور وہاں سے خراسان جاتے ہیں خشکی سے عرب تاجروں کا قافلہ عراق سے کرمان ہوتا ہوا یا تو تیز مکران کی بندرگاہ میں پہنچتا تھا اور وہاں سے مکران کے پایۂ تخت کیز (کیچ) چلا جاتا اور پھر وہاں سے چل کر پنجبور یا پنج گور پہنچ جاتا اور جو شخص بندرگاہ یا پایۂ تخت نہ جانا چاہے تو وہ کرمان سے کسرکند، پھلی پورہ، راسک وغیرہ ہوتے ہوئے پنج گور آجاتا، یہاں سے قزدار اور پھر کیز کانان (قلات) ہو کر قندھار جاتا۔ یہ مکران سے طوران کا راستہ ہوا جس کا پایۂ تخت قزدار تھا۔ جو قافلہ بدھ کے ملک میں جانا چاہتا وہ قزدار سے گنداوی (قندابیل) چلا جاتا اور وہاں سے سیبی اور شال (کوئٹہ) ہوتا ہوا گندھار کی طرف چل جاتا۔ اگر یہی قافلہ سندھ جانا چاہتا تو گنداوی سے سیوستان ہو کر منصورہ اور وہاں سے ملتان پہنچتا۔ (باقی بر صفحہ ۱۱۲)

ـت میں پھیلے ہوئے تھے اور اگر ان کا جی چاہتا تھا تو بیرون سندھ بھی قنوج تک
چکر لگا آتے تھے خشکی کی طرح سمندر میں بھی عرب تاجر ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے وہ بغداد
سے اٹھتے اور چین تک چلے جاتے تھے۔ سندھ چوں کہ نزدیک تر ملک تھا اس لئے اس
ملک آمد و رفت زیادہ تھی۔

عرب تاجروں کی طرح سندھ اور ہند کے تاجر بھی دریائی سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔
وہ بھی بہ سلسلۂ تجارت بیرون ہند پھیلے ہوئے تھے چنانچہ ابوزید سیرافی لکھتا ہے کہ "لنکا،
الدیپ، جاوا، اور دوسرے جزائر میں ہندوؤں کی کافی آبادی ہے"[1] اور جب ہندو تاجر
عراق کے بندرگاہوں میں آتے ہیں تو عرب ان کی دعوتیں کیا کرتے ہیں[2]" اس کے بعد
ان کے الگ الگ کھانے کا طریقہ بتایا ہے۔ بزرگ بن شہریار نے عجائب الہند میں ہندی تاجروں
کے لئے لفظ با استعمال کیا ہے اور لکھا ہے کہ" وہ عراق، بحرین، عمان، سوڈان اور
بصرہ وغیرہ میں آباد ہیں اور بے تکلف عربی بولتے ہیں[3]"

علمی تعلقات مناظرہ و مکالمہ

خلفاء عباسیہ کا عہد شروع ہی سے تصنیف و تالیف اور تراجم کے لئے مشہور رہے۔ اس سلسلہ میں دنیا کے مختلف گوشوں سے حکماء و فضلاء نہایت قدر و منزلت کے ساتھ بغداد بلائے گئے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ گزشتہ) جو قافلہ مکران سے براہ راست سندھ جانا چاہے تو وہ تیز سے کیز
آتا اور کیز سے کلوان، ارمائیل، قنبلی کے راستہ دیبل آجاتا اور یہاں سے یزدن، مسوری، بھرج،
سیوستان ہوکر گندادی جاتا اور جو دریا کو عبور کرنا چاہے تو دیبل سے یزدن، مخاپوری اور
یہاں سے دریائے سندھ کو عبور کرکے منصورہ پائیتخت پہونچتے پھر یہاں سے ملڑی، کاٹری، اتری
اور ملتان تک چلے جاتے اس کے بعد کسی کا جی چاہتا تو کنوج کا بھی چکر لگا آتا ...... اگر کوئی قافلہ ہندستان
جانا چاہتا ہے تو وہ منصورہ سے برہمن آباد، بانیہ، قامہل، سندان ہوتے ہوئے کتمبایت چلا جاتا۔
(بحوالہ تاریخ سندھ ص۲۶-۳۳۵ از سید ابوظفر صاحب ندوی)۔

[1] ابوزید سیرافی ص۹۷

[2] ابوزید سیرافی ص۱۴۶

[3] عجائب الہند ص۱۶۵-۱۴۷ از بزرگ بن شہریار۔

اور ان کی کما حقہٗ خدمت و عزت کی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی ادب مختلف قسم کے علوم و فنون سے تھوڑے ہی عرصہ میں مالامال ہوگیا۔ اس علمی قدردانی سے دو فائدے ہوئے اوّلاً یہ کہ دنیا کے تمام حکمار کو یکجا ہوکر اسلام کے مطالعہ کا موقعہ ملا اور دوسرے یہ کہ حکمت و فلسفہ نے مذہبی عقائد اور اعمال کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کا موقع بہم پہونچاکر مذہبی رواداری کا دروازہ کھول دیا۔

سندھ میں بھی مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوؤں اور بودھوں نے اپنی اپنی سمجھ اور قابلیت کے موافق عقائد اسلامی پر آزادانہ اعتراض کرکے اور اُن کے تسلّی بخش جواب پاکر اسلام کی صداقت کا اقرار کیا۔ یہ گویا ہندوؤں اور بودھوں کے مسلمان ہونے کا نیا باب تھا۔

اب تک یعنی خلفار بنو امیہ کے عہد میں جو سندھی اسلام پر ایمان لائے تھے ان کو اسلام کے محض عملی نمونہ نے اپنی طرف کھینچا تھا لیکن اب یہ صورت دوسری تھی چنانچہ 'جہم بن صفوان' سے جو علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا شاگرد اور فرقہ جہمیہ کا بانی ہے۔ چند بودھوں نے وجود باری تعالیٰ کے مسئلہ پر بحث کی۔ بودھ مذہب والے ہستیٔ باری تعالیٰ کے قائل نہ تھے۔ اس مباحثہ میں جہم اپنے حریفوں کو خاموش نہ کر سکا اس نے بودھوں کے اعتراضات لکھ کر' واصل' کے پاس بصرہ روانہ کئے۔ وہاں سے جو جوابات لکھ کر آئے انہیں جہم نے جب بودھوں کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ جس شخص نے یہ جوابات لکھ کر بھیجے ہیں ہم کو اس کا پتہ بتاؤ تاکہ ہم خود اُس سے گفتگو کر سکیں۔ آخر یہ بودھ علمار بصرہ پہونچے۔ واصل سے گفتگو کی اور اسلام کی صداقت کے دلائل سُن کر ایمان لے آئے لہ

اِسی طرح ہارون رشید کے زمانہ میں اس ملک کے ایک بودھ راجہ نے اسلام کی حقّانیت کے دلائل سُن کر اپنا میلانِ طبع اسلام کی طرف ظاہر کیا۔ درباری پنڈتوں نے اسلام کے خلاف دلائل پیش کرکے راجہ کے خیالات کو پھیرنا چاہا تو اس نے ہارون الرشید کو لکھا کہ کوئی ایسا شخص بھیجئے جو دلائل عقلی سے بحث کر سکے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے معمر یا ابن خلدہ نامی ایک متکلم کو روانہ کیا۔ اب اس کے آگے دو روائتیں ہیں۔ ایک یہ کہ

لہ [illegible] "ہند و عرب کے تعلقات" آئینۂ حقیقت نما جلد اوّل ص ۱۲۵

اس متکلم سے اِن پنڈتوں میں جو سب سے بڑا تھا وہ کسی موقع پر مباحثہ کرکے ہار چکا تھا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس پنڈت نے اپنا ایک آدمی بھیج کر اس متکلم کے بغداد سے روانہ ہونے سے پہلے ہی اس کی قابلیت کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ عقلیات کا بڑا فاضل ہے۔ اِس لئے دونوں روائتوں میں پھر اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس پنڈت نے اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر قبل اس کے کہ وہ متکلم راجہ کے دربار میں پہونچے اسے راستے ہی میں زہر دلوا دیا[۱]۔ مروج الذہب مسعودی جلد اوّل صفحہ ۲۵۴ میں کھمبایت کے ایک مناظر راجہ کا ذکر ہے جو مسلمانوں سے مناظرہ کیا کرتا تھا۔

تحصیل علم کا شوق

سندھ کے بہت سے نومسلموں نے مکہ و مدینہ کا سفر کیا اور تحصیل علم کے شوق میں وہاں برسوں رہے اور ان میں سے بعض وہیں رہ پڑے۔ چنانچہ فن مغازی و سیر کے امام ابو معشر نجیح سندھی نے عرب ہی کو اپنا وطن بنالیا اور جب ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے تو خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اسی طرح رجاء نامی ایک بزرگ تھے جو تاریخ میں رجاء السندھی الفرائینی کے نام سے مشہور ہیں یہ علم حدیث کے استاد اور سندھی نژاد تھے اور بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جنہوں نے سندھ سے باہر جاکر علم کی تحصیل کی جس طرح علم حاصل کرنے کے لئے سندھ سے باہر کا سفر کیا گیا۔ اسی طرح باہر سے بھی تحصیل علم کے لئے لوگ ہندوستان میں آئے۔ چنانچہ محمد بن اسمٰعیل تنوخی تیسری صدی ہجری میں آیا۔ اِس کا زیادہ حال معلوم نہیں البتہ ابوریحان بیرونی سے دنیا واقف ہے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا کام انجام دیا ہے اس نے ایک کو دوسرے کے علوم سے آگاہ کرنے کے لئے بہت سی کتابیں عربی سے سنسکرت میں (ہندوؤں کے لئے) اور سنسکرت سے عربی میں (مسلمانوں کے لئے) لکھیں اُس کی بعض کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(ہندوؤں کے لئے)

(۱) جوتشیوں کے سوالات کا جواب۔ (۲) کشمیر کے پنڈتوں کے دس سوالات کا جواب اوراُن کے شبہات کا حل۔ (۳) اصطرلاب پر ایک رسالہ۔ (۴) بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ

---

[۱] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۲۱، ہند و عرب کے تعلقات صفحہ ۲۳۵، فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۴۴۶

(۵) اقلیدس کے مقالے (۶) علم ہیئت پر ایک کتاب۔

(مسلمانوں کے لئے)

(۱) کتاب الہند (ہندوؤں کے عقائد اور علوم و فنون کی تحقیقات پر)۔ (۲) برہم گپت کی پانی ساسی ذہانت کا عربی میں ترجمہ۔ (۳) برہم گپت کی برہم سدھانت کا ترجمہ۔ (۴) سورج گرہن اور چاند گرہن پر ہندی تحقیقات۔ (۵) ہندی اربعہ متناسبہ۔ (۶) سانکھیہ کا ترجمہ۔ (۷) پتنجلی کا ترجمہ۔ (۸) لگھوجاتکم کا ترجمہ۔

اِن دو طرح کی کتابوں کے علاوہ تیسرے قسم کی کتابیں بھی ہیں مثلاً "سدھانت پر تنقیدی نظر" یعنی جوامع الموجود بخواطر الہنود۔ یہ پانچسو صفحات کی تنقیدی کتاب ہے۔ اسیطرح قانونِ مسعودی بھی البیرونی کی نہایت ہی قابلِ قدر تصنیف ہے۔

ویسے تو کئی ایک ہندو راجہ ہیں جو اسلام کی حقانیت و صداقت پر دلائل سُن کر ایمان لائے لیکن ۲۷۰ھ میں الرور (الور) کے راجہ مہروک بن رائک نے باقاعدہ کلام پاک کی سندھی زبان میں تفسیر پڑھی تھی اُس نے منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کر کے ایک مسلمان عالم کو جو متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا اپنے دربار میں بلوایا اور اُس کو تین سال تک اپنے یہاں رکھا۔ ۲۷۳ھ میں جب، وہ عالم عبداللہ ہباری سے ملا تو راجہ کے متعلق سوال کرنے پر اُس نے کہا کہ :-

"جس وقت میں وہاں سے آرہا تھا تو راجہ سچّے دل سے مسلمان تھا لیکن سلطنت چھن جانے کے خوف سے اِس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منجملہ اور واقعات کے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا کہ اس نے سندھی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی، وہ روزآنہ اُس کو تھوڑا تھوڑا کر کے تفسیر سناتا جاتا تھا .... جب سورۃ یٰسین کی آیت "من یحیی العظام وھیٔ میمم" کی تفسیر بیان کی تو وہ اس وقت جواہرات سے مرصع سونے کے ایک تخت پر بیٹھا تھا .... وہ فوراً تخت پر سے اُتر پڑا اور زمین پر چند قدم چل کر اپنا گال زمین پر رکھدیا حالاں کہ زمین پانی چھڑکنے کی وجہ سے اُس وقت تر تھی۔ وہ یہاں تک رویا کہ اُس کا رخسار گرد آلود ہوگیا، پھر اس نے کہا کہ بے شک یہی رب معبود ہے جو ازلی و ابدی ہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے لئے ایک مکان تیار کرایا جہاں تنہائی میں وہ خدا کی عبادت کیا کرتا اور وقت پر نماز پڑھتا مگر لوگوں پر یہ اظہار کیا کرتا کہ وہ وہاں جا کر سلطنت کے اہم معاملات پر

ر کیا کرتا ہے۔[51]

ذہنی انقلاب سیاسی، تجارتی، معاشرتی اور علمی تعلقات کا لازمی نتیجہ ذہنی انقلاب ہے۔ جس زمانے میں مسلمان سندھ کے اندر داخل ہوئے تھے وہاں کے ہندوؤں اور بودھوں میں بُت پرستی کا عام رواج تھا۔ ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہونے کی وجہ سے اعلیٰ و ادنیٰ پتھر کی مورتیوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھا جا رہا تھا لیکن مسلمانوں کے ساتھ دن رات کے میل جول کی وجہ سے اُن کے دلوں میں وحدانیت کا عقیدہ راسخ ہونے لگا اور بتوں کی قدر و منزلت نظروں سے گرنے لگی۔ چنانچہ ۲۲۲ھ (۸۳۷ء) کے قریب کشمیر و کابل اور ملتان کے درمیان عُسیفان کے راجہ نے اپنے ایک عزیز بیٹے کی شفا یابی کے لئے اپنی حکومت کے سب سے بڑے مندر کے سب سے بڑے بُت کے سامنے التجا کی۔ پوجاریوں نے راجہ کو یقین دلایا کہ بُت نے دُعا قبول کر لی ہے لڑکا صحت یاب ہو جائے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکا مر گیا۔ راجہ پنڈتوں کی فریب بیانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے بُت خانہ کو مسمار کرا دیا اور اس کے پجاریوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پھر اپنی حکومت میں چند پھرتے پھراتے مسلمان سوداگروں سے اسلام کی صداقت کے دلائل سُن کر مسلمان ہو گیا[52]۔ یہ واقعہ خلیفہ معتصم کے زمانہ کا ہے۔

اسلام سے پیشتر سندھ میں عدل و انصاف کا یہ معیار تھا کہ مجرموں کی شناخت کے لئے اُن کو جلتی ہوئی آگ میں سے گذرنا پڑتا تھا، اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ کبھی لوہے کا گولا انگارے کی مانند سُرخ کر کے مجرم کے ہاتھ پر رکھا جاتا تھا۔ کبھی گہرے پانی میں مشتبہ شخص کو اتنی دیر تک ڈبا رکھا جاتا تھا کہ ایک شخص تیر کمان میں رکھ کر چھوڑے اور دوسرا شخص اُس تیر کو جا کر اٹھا لائے۔ اس عرصہ میں اگر پانی کے اندر دم نکل گیا تو مجرم تھا اور زندہ نکل آیا تو بے گناہ۔ جادو ٹوٹکے کا عام رواج تھا، غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی گرم بازاری تھی۔ محرمات

---

[51] عجائب الہند ص۳ از بزرگ بن شہریار بحوالہ تاریخ سندھ ص۱۹۱ سید ابوظفر صاحب ندوی۔

[52] فتوح البلدان ص۴۴۶ از بلاذری

ابدی کے ساتھ شادی کرنے میں بھی تامل نہ تھا۔ چنانچہ راجہ داہر نے پنڈتوں کے ایماء سے اپنی حقیقی بہن "مائی" کے ساتھ شادی کی تھی۔ بعض بعض مندروں میں بتوں کے اوپر انسانی جانوں کی قربانی کا بھی رواج تھا۔ بشاری مقدسی نے مندروں میں دیوداسیوں کی کثرت دیکھی۔ اُن کی بدکاری کا ایک حصہ پجاری لیتا تھا[۵۱]۔ لوگ اپنی لڑکی کی عزت بڑھانے کے لئے اس کو دیوداسیوں میں شامل کر کے مندر کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

مسلمانوں نے سندھ میں آکر یہاں کے باشندوں کے دینی یا دنیوی توہمات میں قطعی دخل نہیں دیا۔ نہ ان کو ان کے مذہب کے تبدیل کرنے پر مجبور کیا لیکن انہوں نے اپنے عدل و انصاف اور اعلیٰ اخلاق کا جو نمونہ پیش کیا اُس کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے مفید سبق حاصل کر کے اپنے اخلاق و معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کیں مسلمانوں سے دوستی بڑھائی، شادی و بیاہ اور سرکاری درباریں برابر مسلمانوں کے شریک رہے۔ وحشیانہ سزائیں اور وحشیانہ طریق انصاف موقوف ہوئے۔ توہمات کے بادل چھٹ گئے، اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ خیال کے لوگوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ ۲۵۹ھ میں جب کہ سندھ کا تعلق بغداد کی مرکزی حکومت سے برائے نام باقی رہ گیا تھا ہندوستان (سندھ کے متصل سرحدی علاقہ) کا ایک راجہ اپنی خوشی سے مسلمان ہوگیا اس نے سونے کی ایک زنجیر جو زمرد و یاقوت سے پچکاری کی ہوئی تھی بطور نذر بیت اللہ الحرام میں کعبہ کے لئے بھیجی جس کے ساتھ سبز رنگ کا یاقوت (زمرد) بھی تھا۔ بغداد میں جب یہ چیز پہونچی تو خلیفہ معتمد علی اللہ کے سامنے پیش کی گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ اس کو کعبہ میں آویزاں کیا جاوے، اس حکم کی تعمیل کی گئی[۵۲]۔

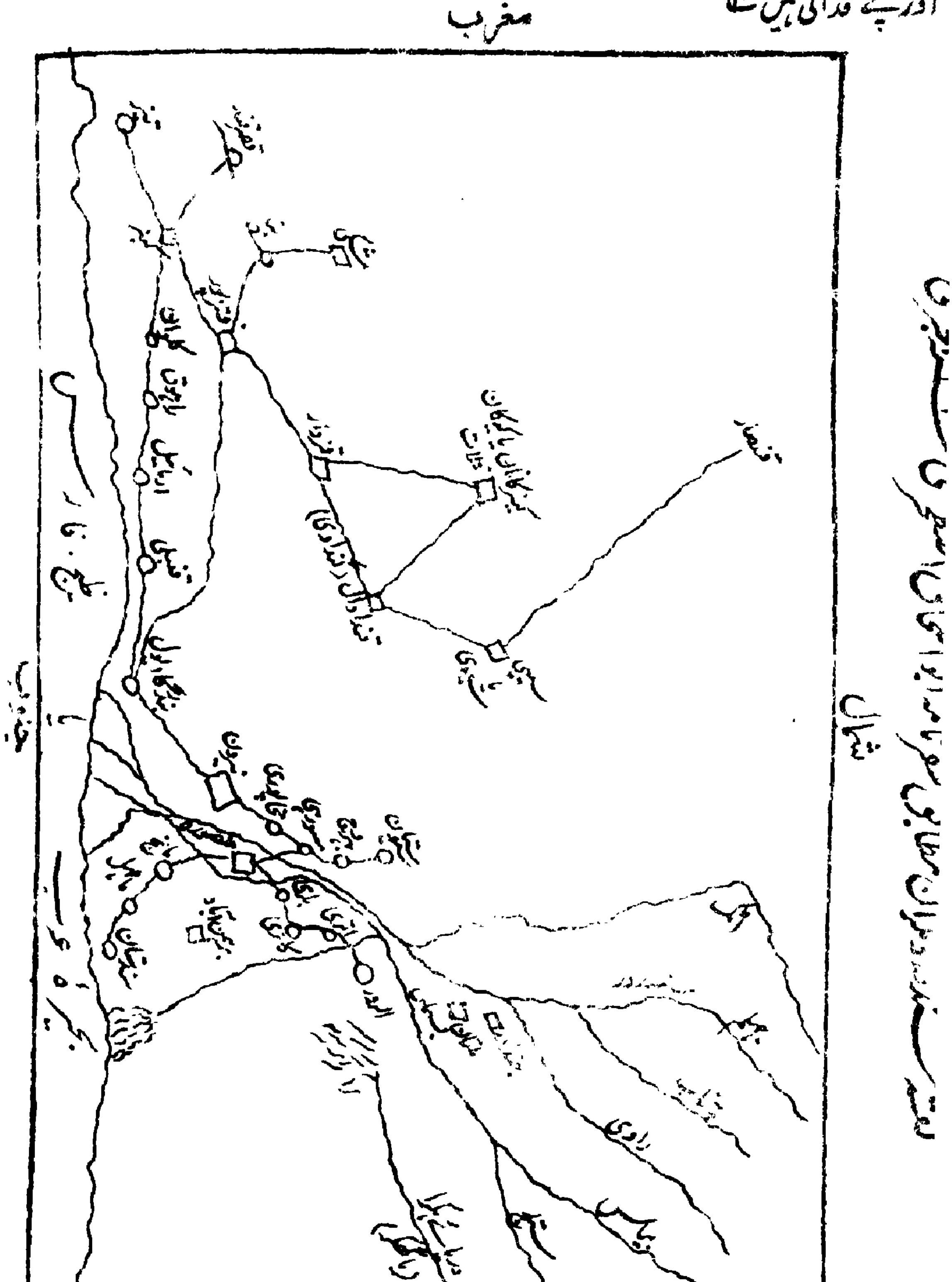
راجہ جے سنگھ (جے سیہ) بن داہر کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ بعد میں اس کی اولاد بھی مسلمان ہوگئی جو آج بھی قوم ڈاہر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح ایک قوم

ابن ندیم بحوالہ تاریخ سندھ صفحہ ۱۹۲ از ابوظفر صاحب ندوی۔

بشاری مقدسی بحوالہ تاریخ سندھ صفحہ ۲۴۷، ابن رستہ بحوالہ تاریخ سندھ صفحہ ۲۰۲

اعلام بیت اللہ الحرام صفحہ ۴۲ (حاشیہ) بحوالہ تاریخ سندھ صفحہ ۱۹۰ از سید ابوظفر صاحب ندوی۔

چاچڑ ہے جو اپنے آپ کو راجہ داہر کے وزیر کی اولاد بتاتے ہیں اور اسلام کے بڑے پابند اور سچے فدائی ہیں[1]



[1] "آئینہ حقیقت نما" جلد اوّل ص ۱۳۶

پنڈت بشیر الدین

موت کے فرشتے

(از سیّد لطیف حسین ادیب بریلوی)

اُجڑی بستی کو بسا لوں تو چلوں — اشک آنکھوں سے بہا لو
جاؤں کس منھ سے خدا کے آگے — عہدِ خفتہ کو جگا لو
کیا ابھی شام گئی ہے کہ سحر — نقشِ ہستی کو مٹا لو
شرکتِ غیر گوارا ہی نہیں — اپنا کعبہ میں بنا لو
کارواں تک نہیں منزل میری — خود کو مقصود بنا لو
گرمیٔ حسن پہ جلنا ہے مجھے — شمعیں آہوں سے جلا لو
کعبہ بن جاؤں صنم خانہ میں — بت کو سجدہ میں گرا لو
فاش کر دے نہ کہیں رازِ کفن — اپنی رسوائی چھپا لو
رہ نہ جائے کوئی وحشی باقی — دامنِ گل بھی سِلا لو
بھبکیاں دیتے ہیں ابنائے زماں — ان شغالوں کو بھگا لو
جھانکتے ہیں جو قفس سے بے کس — ان اسیروں کو چھڑا لو
نہ چلوں تنگِ مسیحا بن کر — مردہ زندوں کو جلا لوں
کس طرح ہوتی ہے تعمیرِ حیات — یہ سبق پھر سے پڑھا لو

ہو نہ محشر میں بپا حشر ادیب
داغِ سینہ کا چھپا لوں تو چلوں

نئی کتابیں

ادارۂ تصنیف کی طرف سے جنرل قدوائی کی نظر میں

(الثورۃ الھندیہ)

باغی ہندستان"

۲۷۲ صفحات کا یہ 'بغاوت نامہ' جو علامہ فضل حق خیرآبادی کے رجز یہ رسالہ اور نایاب
غدریہ کے اصل متن، مرتب کے اُردو ترجمہ اور ایک آگاہی بخش پس منظر پر مشتمل ہے
ندستان کے سامنے مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی نے پیش کیا ہے۔ یہ انقلاب
) ملبوس مجلد، مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی اور قیمت
دپیہ ہے۔

آنریبل علامہ آزاد کا مقدمہ اور ان کا تجویز کردہ نام 'الثورۃ الہندیہ' کتاب سے اُن کی
کے شاہد اور اس کے مضامین کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

عبدالشاہد خاں صاحب زاداللہ علمہٗ وعملہٗ ایک دلیر اہل قلم ہیں جن کی جرارت و
نے ـــ" برداشت بیک دست قلم را وعلم را" ـــ کا ابتدا ہی سے امتیاز حاصل
ہے۔ تحریر میں آمد کی بے باکی سے ایک خاص رنگ پیدا ہے اور جس اصول کے وہ
ہیں اُس کی علم برداری میں ان کا انہماک بقدر اخلاص ان کے جوان ساز آہنگ سے
ہے کل کا مورخ ایک جلد میں ۱۸۵۷ء کے مجاہد کبیر کے ملفوظات اور ۱۹۴۷ء کے
، استنباط و تعمق کے لئے یکجا پا کر سید الطاف علی صاحب سیکریٹری یوپی مسلم ایجوکیشنل
رنس کا ممنون ہو گا جن کی تائید نے شروانی صاحب کے خامۂ سیف زبان کو تیز روانی
اور اعوان و انصار کی تائید و ترغیب نے اس کتاب کی طیاری پر ان کو کمربستہ کیا،

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ علم و حکمت را

علامہ خیرآبادی کے قصاید و رسالہ سے ان حالات کا بلا زحمت اندازہ کیا جاسکتا ہے

جنھوں نے اہلِ ہند کو غلامی کے بند ھنوں میں جکڑا اور ان کی ہلی آزادی کی تڑپ نے کس طرح ا
جکڑبند کو سخت تر بنایا۔ شروانی صاحب کا دیباچہ اور مختصر بائیوگرافیکل مضامین جو ان کے عہد
حالات سے ملکر ایک تاریخی خاکہ اس تحریک کا مرتب کرا دیتے ہیں جو یہاں "بغاوت" کہلا
رہی ہے۔ اس دنیا میں جہاں کامران لیٹرے شہنشاہ کہلائے اور کامیاب خام کار مفکر و فلس
ٹھہرے، جہاں دعوتِ غاراں سے لیکر فتح مکہ تک، تکمیل دین سے لیکر وداعِ ظاہری تک
اُس وقت سے شہادتِ ذی النورینؓ تک، وہاں سے جنگِ جمل، جنگ صفین، واقعۂ کربلا
تخریب بغداد تک، اُس وقت سے ۱۸۵۷ء تک اور تب سے آج تک ہر ذی قوت
کمزور حق پژوہ کو غدار اور باغی ہی گردانتا ہے۔ اختلافِ رائے میں تشدد کا یہ پہلو ہمارے
اندرونی اختلافات کی بنا، اور بربادی کا اصلی سبب ہے جو رحمت کے حتمی مطمح نظر اور بنیاد
اصول سے فکری اور عملی بیگانگی کا نتیجہ اور فقدانِ اخوت و ہمدردی کا اصلی باعث ہے، اس
رحمت تمام صفاتِ حسنہ کی نفسیاتی بنا ہے جس کے بغیر ساری اصلاحی کوششیں بے اثر
ہیں اور تمام مساعی نامربوط و سطحی۔ رحمتِ فطرت کی مانگ، آتما کی پکار، خدا کی مشیت اور اسا
کا ــ ت ہے۔ خلق، تبلیغ و ہدایت ابتدائیت، رحمت اللعالمینی انتہائیت۔ ہندوستان
صد سالہ جہادِ آزادی کی خونیں داستان کا یہ روح پرور اور افتخار انصرام پہلو محمدیت
شیوع اور اُس کی ابدیت سامانی کی بے پایاں اور تعین شکن تنویر ہے ؎

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمت اللعالمینی ہم بود

لیظہرہ دین الحق کلمۃ (تاکہ صحیح اصول زندگی پوری طرح واضح ہو) امرِ مشیت ہے مح
تفویض نسب نہیں۔ یعنی مخلوق میں انسانیت کا بعمومیت قائم ہونا اور رحمت کا عالم میں جاء
اور موثر ہونا وعدہ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ (اللہ اپنے نور کو پوری طرح عیاں کرے گا) کی تکمیل
اور صداقتِ باہرہ کی حقیقی تفسیر ہے۔ جو علمبردارانِ حریت و مساواتِ انسانی کے کیر کٹر سے و
ہوتی رہی۔ اسی قدر نہیں بلکہ وہ قطعی اقدار، و بلند معیار، اور اُن کے حصول کے لئے محکم اصول
کے عیاں ہو جانے سے جو فطری اور آسان ہیں۔ فکری پس منظر اور حقیقی مطمح نظر کے سا
کردار میں ایک ایسی ہمہ گیر جان بخشی پیدا ہوئی کہ رحمتِ مختتمہ کی عالم آرائی ہر جانب
پوری شان کے ساتھ جلوہ فرما و تابش آموز رہی .... اصول بدلے، مقا
[illegible]

ندی کا رحمہ عبارت سے زمانہ انحطاط ور ملی ہوئی بربادی کے خطرات کے مقام
حب الوطن المن الایمان (وطن کی محبت ایمان کا فیض ہے) کی روح افزائی
اظہار فرما ہوئی اور اس آفتاب صدق و رحمت کے پر تو سے تمام ذرے علی قدر مراتب
ہوئے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے کیرکٹر کی یہ بلندی تھی کہ جب ثبوت کی کمی کی وجہ سے انکا
رہائی کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ عدالت میں انھوں نے خود اپنے فتوائے جہاد کی
توثیق کی اور افضل الجہاد کلمۃ الحق عند السلطان الجابر (سب سے بڑا
حاکم کے سامنے حق بات کہنا ہے) کی سعادت کو تمام مفاد پر ترجیح دی ؎
گو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے
لذتِ دردِ جگر صدموں کی جانکاہی میں ہے
و قصائد کی عبارت یکساں بلا مبالغہ سلاست و بلاغت کا معیاری نمونہ ہے، جس پر
صاحب نے بے لوث تبصرہ فرمایا ہے۔ ابنائے زمانہ کا حال کس کمال سے بیان ہوتا ہے ؎
رجونا سارجا من المحلوسحبا قد اقلعت بعد ابراق وارعاد
نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج
چھٹ گئے ہوں امیدیں باندھ لیتے ہیں) صورت محن و ملال کا ذکر کس قدر مکمل ہے ؎
دمی کلیلی وسومد تقت النجوم فیہ کان شدت باوتاد
ن رات کی طرح ہے اور میری رات کو دوام ہے۔ آسمان پر ستارے ایسے رکے
میں میخوں سے باندھ دیا گیا ہے)۔
لیف و ثبات، اخلاص و استحکام کا یہ عالم کہ ان تمام شدائد کے باوجود بنیان مرصوص
یواروں کی طرح) مقام معۂ پر بہ سکون خاطر بے دھڑک قائم ہیں ؎
الولاء وہم اعادی من لہٗ خلق السماء والارض والانشاء
فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را
شگفتہ، سلیس اور کامیاب ہے جس کی سند خود آزیبل علامہ آزاد کا اعتراف
کی بلند پایگی کا کیا پوچھنا۔ ابن خلدون نے اپنے استاد سے سوال کیا تھا کہ کیا وجہ
ن کے شعرا کے کلام سے انکا کلام زیادہ بلند پایہ ہے اور اُن کی اجازت سے

خود جواب دیا تھا کہ "ہمارے سامنے قرآن و حدیث کے بلند معیار موجود ہیں جن سے وہ محروم رہے"۔ جن کی زندگی ہی قرآن و حدیث کے انوار میں سموئی گئی ہو ان کی صحت فکر اور کمال بیان کا کہنا ہی کیا۔ "ذرۂ آفتاب تابانیم"۔

اس کتاب سے ایک اہم بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ ولی اللٰہی دبستانِ خیال (اسکول آف تھاٹ) عملی اسلام کا علمبردار تھا اور آخرکار یہی اسپرٹ سارے ملک میں بلاتخصیص مذہب و ملت پھیل کر تطہیر فکر و اصلاح اعمال کے ساتھ آزادیٔ وطن کا باعث ہوئی۔ ہندوستانی اسلام یعنی وہ ہدایتِ حقہ جو رب العالمین نے بِلِسانِ قومہٖ (اسی قوم کی زبان میں) یہاں نازل فرمائی اور قرآنی اسلام جو بفحوائے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ تمام مراسلات پر حاوی ہے۔ بنیاداً جُدا نہیں اور یہ قدغنیں بھی جو بما اختلفوا فیہ کہی جاسکتی ہیں، اپنی بھیانک تفریق کاریاں مشیت کے وحدتِ انصرام ہاتھوں دوادانجام ہوکر رہیں گی اور حقیقت کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً واحدۃً (تمام انسان ایک برادری ہیں) اپنی پوری امن آرائی کے ساتھ نافذ ہوگی۔ ع

اے خوشا آں روز کہ آئی و لبصد ناز آئی

ان اکابر میں سے جن کے سوانح حیات شروع میں دئے گئے ہیں مولانا غلام معین الدین اجمیری مرحوم سے مجھے نیاز حاصل تھا جن کے درس میں میں نے حاضری دی ہے وہ ایک دلیر مجاہد اور ذی شعور سیاستداں تھے جن کے صدق و ایثار نے تحریک خلافت و آزادی وطن کو بیحد تقویت پہنچائی اور میرے لئے یہ اندازہ مشکل نہیں ہے کہ شروانی صاحب کے شعورِ ادبی کو یہ نوعیت کیسے حاصل ہوئی ؎

پروانہ وار ہستیٔ خود را نہ باختیم　　　　یا شمعِ آفتاب حریفانہ زیستیم

اس کتاب میں یہ درس بھی موجود ہے کہ باہمی عداوتوں اور اختلافات نے ہی ہندوستان کو غلام بنایا تھا اور آیندہ کے لئے صحیح راہ ذاتی صدق و حق رسی پر اصرار نہیں بلکہ "ایثار" ہے، تنقید نہیں بلکہ تائید ہے ..... ایثار یکجہتی کے لئے، اختلافات کو کم کرنیکے لئے، تائید ہمدستی کے لئے اور پارٹیوں کو بلا کدر و تعصب مدغم کرنیکے لئے، کیونکہ اتحاد کی بنیادیں صرف دلوں کے اخلاص پر قائم کی جاسکتی ہیں اور آہنی دیواروں سے بھی زیادہ مستحکم فصیلیں باہمی اطمینان و اعتماد کے پکی اساس پر قائم ہوسکتی ہیں :۔ ع

گر یہ نہیں تو پیارے باقی کہانیاں ہیں

مجموعہ نشری تقاریر

شر ادارۂ نشریات حیدرآباد دکن قیمت عہ

مولوی عبدالرحمن خاں صاحب، سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی نشری
اریر کا یہ مجموعہ حیدرآباد کے معیارِ علم و ادب کی عظمت کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔
یڈیو کا مصرف غلامی کے زمانہ میں صرف غم غلط کرنا تھا، جو زیادہ تر بے وقت کی راگنیوں
در مخش نغموں سے ایک طوفانِ بے تمیزی کی صورت میں کم سوادوں کی بلند نشینی کا اثر
ما، لیکن حیدرآباد کا پروگرام جہاں اور حیثیتوں سے بہتر ہوتا رہا وہاں علمی اور ادبی
الات کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہے۔

یہ تقریریں کافی محنت سے تیار کی گئی ہیں اور مضامین دلچسپ و مفید ہیں
لاً ستاروں پر زندگی کے (مکانات، دم دار ستارے، اسلامی معاشیات، سائنس
ر روزانہ زندگی، تاروں کی بستی پُراسرار روشنی وغیرہ۔

اِس قسم کی تقریروں کی اشاعت یقیناً ایک موثر خدمت ہے اور یہ امید بیجا نہ ہوگی
س مثال کی نہ صرف اشاعت میں بلکہ نشریات میں بھی اتباع کی جائے گی۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے اور ان داموں گویا مفت ہے۔

اہلِ ہند نے فلکیات میں جو تحقیقاتیں کی تھیں وہ خود اپنی جگہ پر حیرت انگیز ہیں لیکن
سے عدم واقفیت کے باعث گفتگو صرف یوروپین تنقیحات پر رہ جاتی ہے، اس طرح
سے سائنٹفک مسائل پر بھی اہلِ ہند کی آگاہی کے بارے میں ہمیشہ تنگ نظری برتی
ہے۔ خدمت علم کا جذبہ اس کا مقتضی ہے کہ اِن مسائل پر گفتگو میں نشر کی جائیں۔
واقفیت کی افزائش کے لئے عبارت کی سادگی اور بیان کی دل پذیری میں مولوی
لرحمن خاں صاحب کی اتباع کی جائے۔

جنرل قدوائی

بزمِ مصنّف

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب آگرہ "گرامت نامہ ملا۔ جلسہ کی شرکت سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ دید کو عرصہ سے آنکھیں ترس گئیں۔ احباب و اقربا سے بُعدِ مکانی ہو جارہا ہے۔ جو ہیں اُن کا دم غنیمت ہے۔ کیا ہونیوالا ہے خدا جانے۔ اُسی کا سہارا ہے اور بس۔ 'مصنف' ملا اور پھر آپ کا خط۔ نشاطِ تازہ حاصل ہوئی۔ وہاں آنیکا ارادہ ہے۔ جلدی موقع نکالوں گا۔ اب ذرا کاموں کا بوجھ ہلکا ہوا ہے۔ ورنہ گزشتہ چار پانچ ماہ میں تو پس گیا۔ 'مصنف' میرے نام ابتک آتا رہے گا۔ چندہ قرضِ حسنہ ہے۔ ادا کیا جائے گا۔ جلدی۔ یہ 'بزمِ مصنف' بھی خوب شے ہے۔ سل۔ احمد صاحب کا خط خوب چھاپا۔ دعوت نقد و نظر ہے۔ قیاس آرائیوں کا موقع ملا۔ آپ کو بھی نئے شگوفے چھوڑنے آتے ہیں۔ 'مصنف' پر کون تبصرہ کرے! خدا کرے آپ اور بھی بہتر مواقع علمی و ادبی خدمات کے پائیں۔ جزاک اللہ۔ آخر میں یہ بھی سُن لیجئے کہ اگر آپ نے یہ خط چھاپا تو بس . . . ."

مفتی صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے اب وہ مائل بہ تجارت ہیں۔ سنّت ادا کر رہے ہیں۔ خواجہ احمد صاحب فاروقی دو ماہ سے ہمارے کالج میں آگئے ہیں۔ یہیں قیام فرما ہیں۔ دُعا کیجئے کہ میں وہاں تک آنیکا موقع نکالوں۔ ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ 'مصنف' نے بیگم الطاف سے بھی تو واقفیت پیدا کرا دی ہے۔ اس لئے سلام لکھنے کا حق پہونچتا ہے۔

سیٹھ احمد ابراہیم ہارون جعفر صاحب کراچی میں کل ہی ولایت سے کئی ماہ کے دورہ کے بعد کراچی واپس آیا ہوں اور غالباً ایک ہفتہ یہاں قیام رہے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم کے انتقال نے تمام ہندوستان میں ماتم بپا کر دیا ہے در حقیقت مسلمانوں کو یہ ایسا زبردست نقصان پہونچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ میں نے ولایت میں اُن سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ ستمبر کے آخر میں ہوٹل پر اُن سے ٹیلیفون میں میری بات چیت ہوئی تھی۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ میں پیرس جا رہا ہوں واپسی پر ملاقات ہو گی۔ اس کے بعد ۸ر اکتوبر تک لندن میں ملاقات کے لئے جاتا رہا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ اُس کے بعد مجھے باہر جانا پڑا۔ بہرحال مجھے اُن سے وہاں ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ اور اب اِس حادثۂ فاجعہ سے سخت

افسوس ہے اور میں ڈاکٹر صاحب کیلئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔
ں نے آج ایک خط ڈاکٹر صاحب کے فرزند مسٹر ذکاء الدین احمد کو بھی لکھا ہے مگر میری یہ
ں ہے کہ آپ میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کے تمام خاندان سے اظہارِ تعزیت فرمادیں۔
۔ آپ بخیر ہوں گے۔ کارِ لائقہ سے یاد فرماتے رہیں۔

عبد الغفور صاحب بسمل پیلی بھیت | الطاف نامہ صادر ہوا۔ اور 'مصنف' کے دو پرچے بھی موصول ہوئے۔ اس لُطفِ خاص کا شکریہ قبول فرمائیے۔

مبلغ دس روپیہ ذریعہ منی آرڈر ارسال خدمت ہیں۔ یہ "مصنف" کا نذرانہ ہے۔ آیندہ
ےکی اور کوشش کروں گا۔ میری ایک نظم کا یہ شعر ہے:

حُسن کی سرکار میں پُر اضطراب آیا ہوں میں!
ھدیۂ دردِ پرستش نذر کو لایا ہوں میں!

آپ نے اپریل کے 'مصنف' میں (مکتوباتِ فرنگ کا مضمون جہاں ختم ہوتا ہے) گویا جہان آبادی
ایک رُباعی شائع کی ہے۔ اِس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آپ گویا جہان آبادی کے کلام کو قدر
نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ اسلامیہ ہائی اسکول پیلی بھیت کے
ے علمی و ادبی جلسہ میں میں نے گویا جہان آبادی کے کلام پر "تبصرہ و تعارف" کے زیرِ عنوان
ی مضمون پڑھا تھا۔ علم دوست حضرات نے اُسے پسند فرمایا تھا۔ وہ مضمون ارسال کر رہا ہوں۔

ران صاحب ہاشمی ایم۔ اے (لک) ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) | رسالہ آپ کا کل یونیورسٹی کے پتے پر ملا۔ آپکی عنایت

مون ہوں۔ نئے سال کا چندہ آج ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ آجکل جبکہ خلفشار، سراسیمگی اور بیچارگی
عالم ہے، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے، آپ کا استقلال کے ساتھ اپنے رسالہ کو نکالتے رہنا اور
ب چاپ اپنا کام کرتے رہنا ایک کرامت سے کم نہیں، خدا کرے علی گڑھ میں قطب بنے آپ
شہ چمکتے اور دمکتے رہیں۔

ایک امر دریافت طلب ہے ۳۹ء میں میں نے رسالہ اُردو (انجمن ترقی اُردو) میں ایک صاحب
ے ایک قدیم اُردو روزنامچہ کو تلخیص کر کے "اُردو میں سب سے پہلی ڈائری" کے عنوان سے شائع
روائی تھی جو ابتدا ۴۰ء کی جنوری تک نکلتی رہی۔ اب میں نے اُس میں ترمیم اور اضافہ کر دیا ہے
چاہتا ہوں کہ وہ کتابی صورت میں شائع ہو جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے ...

اس ڈھنگ سے اُسے بہ اقساط شائع کرنا شروع کریں کہ صفحات کی ترتیب بھی قائم رہے اور آخر میں وہ کتاب بھی مکمل ہو جائے۔ ڈائری مذکور دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے ۱۸۶۷ء سے دسمبر ۱۹۱۱ تک کے حالات روزانہ لکھے گئے ہیں اور ہر ملک کے ہیں اور ہندوستان کے تو خصوصاً ہر قسم کے حالات سیاسی۔ معاشی۔ سماجی اُس میں درج ہیں۔ غرضکہ اپنے زمانہ کی یہ ایک دلچسپ ڈائری بھی اور ایک اہم تاریخ بھی۔ کتاب غالباً دو سو صفحات میں آجائے گی۔

ریورنڈ بشیر احمد صاحب ملک ملتان

وہ دن جو گزرے بے حد مصروفیت کے تھے۔ یک انار و صد بیمار کا مصداق بنا رہا۔ اُمید ہے کہ آپ کامل خیریت سے اور خوش ہونگے ایامِ گزشتہ میں بہیمیت اور درندگی کے وہ منظر پیشِ نظر رہے کہ الامان الحفیظ! انسانی خون سے وہ ہولی کھیلی گئی کہ زمین لالہ زار بن گئی۔ اور انسانی بے شرمی اور بے حیائی کے وہ سین پیشِ نظر رہے کہ اُن کے بیان سے بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی انسان نے جنگلی حیوانوں سے بدرجہا زیادہ اپنی وحشت اور بربریت کا ثبوت پیش کیا۔ انسانی اخلاق۔ شرافت اور مروت کا دیوالہ نکل گیا۔ فرقہ وارانہ کشمکش نے انسانوں سے انسانیت کے جوہر چھین لئے اور اپنی حیوانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں ڈھکیل دیا۔ کاش ہمارے ملک کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھی ترقی کی راہ میں اقوامِ عالم کے دوش بدوش ہو سکیں اور ہمارا پیارا ملک حُسنِ اخلاق۔ شرافت اور شائستگی کی بلندیوں کی طرف اُڑ سکے! اور یوں "ہمارے ملک کی" بلند انسانیت پستی کے قعرِ مذلت سے اُٹھ کر آسمانی فضا میں سانس لے سکے! ورنہ "ہمارا پیارا ملک" بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین کھوئے ہوئے بیش قیمت موتیوں کو جنھیں وہ کُتّے کی طرح اپنے پاؤں کے نیچے رُوند چکا ہے۔ پھر سے اُنھیں کیچڑ کی دلدل سے نکالے۔ خدا ہماری مدد کرے۔ تاکہ ہم اپنی کھوئی میراث پر قبضہ کر سکیں۔ اور اپنی بگڑی دُنیا کو از سرِ نو تعمیر کریں۔ ہماری موجودہ نسل نے شرم و حیا کے پردے چاک کر دئے! ہم شرم اور رُسوائی کے مارے دُنیا کی اقوام کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کاش کہ ندامت کے آنسوؤں سے اس سیاہی کو ہم دھو سکیں۔ اور گزشتہ را صلوٰۃ کے مصداق اب آگے کو ہم ایک دوسرے کو تعاون اور شراکت کا ہاتھ دے سکیں۔ ع

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اپنے مفصل حالات سے آگاہ کریں۔ "مصنف ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء" کے بعد کوئی پرچہ موصول نہیں ہوا۔ مصنف کے پرچے میرا روحانی وظیفہ ہیں ان سے محروم نہ رکھا کریں۔

خان بہادر میرزا ابو جعفر صاحب جب آپ نے تو اس کڑے وزن سے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا ہے کہ گویا میں مکر چکا ہوں۔ یا عنقریب مکرنے والا ہوں۔ لے حضرت۔ میں اگر مجرم ہوں تو اقراری مجرم ہوں۔ ہانکے پکارے کہتا ہوں کہ بیشک میں نے وعدہ کیا تھا۔ اب رہا یہ معاملہ کہ پھر رقم ارسال خدمت کیوں نہ کی؟ تو اس میں آپ کا میرا برابر کا قصور ہے۔ میرا یہ کہ روپے روانہ نہیں گئے۔ اور آپ کا یہ کہ تقاضا نہیں فرمایا۔ اتنے وصہ پبلک سے سروکار رہنے کے باوجود آپ معصوم کے معصوم رہے! میاں۔ بغیر مطالبہ کے کہیں چندہ وصول ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو سہل راستہ بتائے دیتا ہوں۔ اگر ۱۰ فروری تک آپ کو میرا منی آڈر مل جائے تو فہو المقصود۔ ورنہ آپ وی پی کر دیجئے گا۔ ہچکچایئے گا نہیں ــــــ میرے سے نادہند دل کا علاج یہی ہے۔

عالیجناب حضرت نواب صاحب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں سلام و نیاز۔

سید مطلبی صاحب فریدآبادی دہلی آپ کے توسط سے ادیب بریلوی سلمہ کی نظم پہنچی۔ نظم بہت اچھی ہے ان عزیز سے اتنی بات فرمادیں کہ اس کائنات میں جب سے انسان ہیں تونگر و غریب دو طبقے پیدا ہوئے ہیں گلے نہیں ملائے جا سکے اور اس آرزو کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے کہ تونگر تونگر رہے نہ غریب غریب۔ ہزاروں سال سے غریب کو یہی فریب دیا جاتا رہا ہے کہ تونگر و غریب بھائی بھائی ہیں۔ ایک حقیقی ماں جائے بھائیوں میں جب یہ تفریق پیدا ہوتی ہے تو پھر وہ اُن تک کو گلے نہیں ملنے دیتی۔ اِس لئے ہم بھی اپنے ناظرین کو چونکہ اس مغالطے میں رکھنے کا جرم نہ کر سکتے تھے، اس لئے ان کی نظم تونگر و غریب کے بجائے "غریب و غریب" لکھ کر چھپنے دی جا رہی ہے۔ اِس مداخلت کو آں عزیز یقیناً معاف کریں گے۔ باقی امید ہے کہ وہ اپنے کلام سے ہمیشہ نیا دَور کو ممنون بھی فرماتے رہیں گے۔

رزاق صاحب راز ترقی" علیگڑھ "مصنف" انجمن مصنفین کی جانب سے تقریباً چار پانچ سال سے نکل رہا ہے، اس مختصر عرصہ میں جو اس رسالہ نے ترقی کی وہ ضرور قابل ستایش ہے۔ اِس کے اندر تمام مضامین اساتذہ اور علیگڑھ کے کہنہ مشق ادباء کے چھپتے ہیں۔

احمد صاحب اکبرآبادی دسمبر کے "مصنف" میں "غلط زاویے" پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ کا "پس چہ باید کرد؟" صحیح زاویہ تھا۔ رستے چھوٹے۔ ورنہ پاسپورٹ وغیرہ کی زحمتیں سامنے تھیں۔ آپ نے بڑی سہولت پیدا کردی اس کا شکریہ قبول فرمایئے +

دھنک

بچوں کا باتصویر ہندی۔اردو رسالہ!

موسم برشگال میں ابر و آفتاب کی بازی گری آسمان پر قوس قزح کا یکسا خوشنما منظر پید
ہے اور بچے دھنک کو دیکھ کر کیسی خوشیاں مناتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

علمی و تعلیمی دنیا میں انکی اس خوشی و لطف اندوزی اور ساتھ ساتھ نفع خیزی کے لئے آسمانِ علم
پر قریب ایسی ہی خوشنما دھنک علیگڑھ سے رونما ہونے والی ہے۔

دھنک میں بچوں کی ذہنی تربیت، ملی ترقی اور تعلیمی دلچسپی کے رنگارنگ سامان نہایت سلیقہ
مہیا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

مضامین کے تنوع، زبان کی سلاست، انداز تحریر کی دلنشینی اور بچوں کی نفسیات کے تقاضوں
ضرورتوں کی مناسبت طریقوں پر تکمیل کے لحاظ سے دھنک نہایت بلند مقام کا مالک ہوگا۔

معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن و خوبصورتی کے اعتبار سے بھی دھنک اسم با مسمیٰ ہوگا، سرورق بلا
سہ رنگی جاذب نظر اور مضامین مصور ہوں گے۔

اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اس کا ہر مضمون دوہرے رسم الخط میں ہوگا۔ ایک طرف ایک کالم
اردو دوسرے میں ہندی۔ اس سے بچوں کو ہندی سیکھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی اور وہ بچے جو صرف
ہندی پڑھتے ہیں اردو سے بھی نامانوس نہیں رہیں گے

رسالہ ماہوار ہوگا اور ہر انگریزی مہینے کی ۷ کو شائع ہوگا۔ نیز ۴۸ صفحات پر مشتمل
چندہ سالانہ صہ پانچ روپے۔ ششماہی ۸/۳ تین روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ دھنک نیشنل پرنٹرس کمپنی سوسائٹی گارڈن علی گڑھ (یو۔پی)